تفسیر سورۃ فاتحہ

تحقیق وترتیب

محمد طاہر ہاشمی

ایم اے علوم اسلامیہ

ایم اے تاریخ

اشاعت	2024
ای بک	پی۔ڈی۔ایف
نظم وترتیب	محمد طاہر ہاشمی ایم اے علوم اسلامیہ وہسٹری
ٹائیٹل معاونت	پروفیسر محمد حسان ہاشمی
تکنیکی تعاون	محمد انس ہاشمی
ہدیہ	دعائے خیر
بار	اول

برائے رابطہ

hashmipk786@gmail .com

برائے ایصال ثواب

والد گرامی ووالدہ محترمہ

مولایَ صلِّ وَسَلِّم دائماً ابداً

علیٰ حَبِیبِكَ خَیرِ الخَلقِ کُلھِمِ

انتساب

ان نفوس قدسیہ کے نام جن کے دم قدم
سے اس گلستان میں علوم کی نیرنگیاں ہیں

اِعْتِذار

ایک مسلمان دینی کتابوں میں دانستہ غلطی کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ غلطیوں کی تصحیح واصلاح کے لئے ہمہ وقت تیار۔ اگرچہ کتاب کی طباعت کے دوران اغلاط کی تصحیح پوری توجہ سے کی جاتی ہے تاہم انسان غلطی کا پتلا ہے۔ غلطی رہ جانے کا امکان موجود ہے۔ لہٰذا احباب سے گذارش ہے کہ جو غلطی نظر آئے تو مطلع فرمائیں تاکہ اسے درست کیا جاسکے۔ نیکی کے کام میں آپکا تعاون یقیناً صدقہ جاریہ ہوگا۔

رابطہ: hashmipk786@gmail.com

فہرست

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ

تمام تعریفیں اس اللہ کی ہیں جس نے متقین کے دلوں کو اپنی کتاب مبین کے نور سے منور کیا اور قرآن کریم کو دلوں کی بیماریوں کے لئے شفا بنایا اور اہل ایمان کے لئے رحمت و ہدایت بنایا اور صلوٰۃ وسلام اور خاتم الانبیاء، اشرف المرسلین سیدنا محمد عربی نبی الامین پر جن کی ذات بابرکات کے فیض سے رب تعالیٰ نے ہماری اندھی آنکھوں کو بینا کیا، ہمارے بند کانوں کو کھولا اور دلوں پر سے غفلت کے پردے کھینچ دیے اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ذات گرامی کی برکت سے لوگوں کو اندھیروں سے نکال کر نور کی طرف لائے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر قبروں میں سے اٹھائے جانے اور میدان حشر میں اکٹھا کیے جانے کے بعد تک ہمیشہ صلوٰۃ وسلام ہو۔ اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طیب وطاہر آل اور اولاد پر اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ہدایت یافتہ نیکوکار حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین پر بھی صلوٰۃ وسلام ہو اور ان پر بھی جو قیامت تک نیکی کے ساتھ ان کے (سچے) پیروکار ہوں گے۔ امابعد!

قرآن کریم ہمیشہ سے علوم و معارف کا ایک گہرا سمندر رہا ہے، جو اس کے موتی اور گوہر حاصل کرنا چاہتا ہے اسے اس کی گہرائی میں اترنا ہوگا۔ قرآن کا فصاحت وبلاغت کے اساطین اور قادر الکلام علماء کو قیامت تک کے لئے اس بات کا چیلنج ہے کہ یہ ایک ”معجز کتاب“ ہے جو نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر اتری ہے، جو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے صدق کی شاہد اور گواہ ہے، یہ کتاب اپنی جلد کے دونوں پٹھوں کے درمیان اپنے کمال کی دلیل، اپنے اعجاز (اعجاز قران سے مراد یہ ہے کہ اس کی نظیر پیش کرنا انسانی قدرت سے باہر ہے، اس وجہ سے اس کو سرور کونین (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا معجزہ کہا جاتا ہے۔ (علوم القرآن ص 278) ”اعجاز، عربی زبان میں دوسرے کی طرف عجز کی نسبت

کرنے کو کہتے ہیں، اور معجزہ اسی لئے کہتے، کہ انسان اس کی مثل لانے سے قاصر ہوتا ہے۔ اعجاز قرآن کا مطلب ساری انسانیت کا "فرد فرد کا، گروہ گروہ کا، اس کی مثل لانے سے عاجزی ثابت کرنا ہے"

(نسیم البیان شرح البیان فی علوم القرآن ص302) "نسیم"۔)

کی نشانی، اور اس بات کی دلیل لئے ہوئے ہے کہ یہ حکیم و علیم ذات کی اتاری ہوئی کتاب ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

نزل به الروح الامين على قلبك لتكون من المنذرين بلسان عربي مبين

(سورۃ الشعرا:195-193)

ترجمہ: "اس کو امانت دار فرشتہ لے کر اترا ہے (یعنی اس نے) تمہارے دل پر (القا) کیا ہے تاکہ (لوگوں کو) نصیحت کرتے رہو (اور القا بھی) فصیح عربی زبان میں (کیا ہے)۔"

باوجود یہ کہ جلیل القدر کتاب قرآن کریم کی خدمت کرنے کے لئے علماء کرام نے بے شمار کتابیں لکھی ہیں جن سے ضخیم کتب کا ایک مستقل اسلامی کتب خانہ وجود میں آگیا ہے، لیکن پھر بھی قرآن کریم (ابھی تک) عجائیات سے لبریز، موتیوں اور جواہر سے لبالب باقی ہے۔ یہ قرآن وقتاً فوقتاً ہمیں ان موتیوں سے واقف کراتا رہتا ہے، جن سے عقلیں دنگ رہ جاتی ہیں اور اہل فہم حیران اور انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں، کیونکہ اس کتاب میں وہ قدسی فیوض، الٰہی روشنیاں اور نورانی خوشبوؤں کے جھونکے ہیں، جو انسانیت کے لئے بدبخت اور جہنم کی آگ میں سلگتی جھلستی زندگی کے لئے چھٹکارہ اور نجات کی ذمہ دار ہیں، ہر علم ختم ہو کر فنا ہو جائے سوائے "علم تفسیر" کے کہ یہ ہمیشہ ایک متلاطم اور اتھاہ سمندر بن کر زندہ رہے گی اور ان کے انتظار میں رہے گا جو اس کی گہرائیوں اور پنہائیوں میں اتر کر اس کے قیمتی خزانوں کو نکال لائیں اور اس کے نہایت عمدہ اور نفیس اسرار کو تلاش کر لائیں، علما کرام علم کے اس سمندر کے ساحل پر آکر اس کے چشمہ صافی سے (ان کے علوم کا آب حیات) پیتے رہیں، مگر سیر اب نہ ہوں گے اور بھلا کون ایسا ہو سکتا ہے جو رب ذوالجلال والاکرام کے اس کلام کا علمی احاطہ کر سکے اور اس کے بھیدوں کو جان سکے اور اس کے دقائق و حقائق تک رسائی حاصل کر سکے اور اس کی اعجاز نمائیوں تک پہنچ سکے اور پھر اپنے تئیں یہ گمان کر بیٹھے کہ میں نے قرآن کریم کے علوم کے حصول میں کمال حاصل کر لیا بہت حاصل کر لیا (کہ اس کو جتنا بھی حاصل کرتے جائیں گے وہ کم ہی ہوگا)۔

یہ ایک معجزہ نما کتاب ہے جو انسانیت کو اپنے ان علوم و معارف اور بھیدوں اور حکمتوں سے نوازتی رہے گی جو ان کے اس ایمان ویقین کو بڑھاتی رہیں گی کہ یہ کتاب نبی امی وعربی حضرت محمد بن عبد اللہ صلوٰاللہ علیہ وسلامہ کا ایک "دائمی معجزہ" اور رب حکیم وحمید کی اتاری ہوئی ہے۔

جب مسلمانوں کو معاشی فکروں نے گھیر لیا، ان بڑی بڑی تفسیروں تک رسائی کے لئے ان کے پاس وقت تنگ ہو گیا جو ہمارے اسلاف رضوان اللہ علیہم اجمعین نے رب تعالیٰ کی کتاب کی خدمت کے لئے لکھیں تھیں، جن میں انہوں نے اس کی آیات کی تفصیل و وضاحت کی، اس کی بلاغت کو ظاہر کیا، اس کی معجز نمائی کو واضح کیا، اور جس شریعت و تہذیب اور اخلاقی، تربیتی اور اصلاحی احکام پر یہ مشتمل تھی ان کو کھولا تھا، تو آج کے علماء کی یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ لوگوں کے لئے قرآن کو سمجھنے کو آسان کرنے کے لئے اپنی کوششیں خرچ کریں، اس کے لئے ایسا واضح اسلوب اور عمدہ پیرائیہ بیان اختیار کریں، جو طوالت، (فنی) پیچیدگیوں اور (بیانی فصاحتوں اور بلاغتوں کے) تکلفات سے خالی ہو، اور قرآن کریم کے اعجاز اور بیان کی اس شان و شوکت اور حسن و جمال کو ظاہر اور واضح کریں جو عصر حاضر کی روح کے مناسب ہو اور آج کے اس مہذب و تعلیم یافتہ نوجوان کی (قرآنی تفسیر کو جاننے کی) ضرورت و حاجت کو پورا کرے جو قرآن کریم کے علوم و معارف کا توشہ اکٹھا کرنے کی پیاس رکھتا ہے۔ میں نے اب تک اس طرز پر کوئی تفسیر نہیں دیکھی، باوجود یہ کہ ایک ایسی تفسیر کی ضرورت تھی اور لوگ نہ صرف یہ کہ اس کے بارے میں پوچھتے تھے، بلکہ اپنے شوق ورغبت کا اظہار بھی کرتے تھے، چنانچہ میں نے ایک ایسی تفسیر لکھنے کا عزم کر لیا (اور اس کے لئے کمر ہمت باندھ لی) حالانکہ یہ ایک بڑا مشکل اور تھکا دینے والا کام تھا اور اس کے لئے کافی وقت کی بھی ضرورت تھی جو اس دور میں بڑی مشکل سے میسر آتا ہے، جس نے رب کریم سے مدد مانگی، اس پر بھروسہ کیا اور اس سے التجا کی کہ وہ مجھے اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے میں مدد دے اور مجھے ایسے طرز پر یہ تفسیر لکھنے کی توفیق دے، جو کتاب اللہ کی شان کے لائق ہو، جو مسلمانوں کو کتاب اللہ کی آیات سمجھنے میں مدد دے اور اس کے بیان و تفصیل سے اس کو وہ توشہ آخرت اکٹھا کرنے توفیق دے، جو ان کے ایمان ویقین کو بڑھائے اور اس کو اس نیک عمل کی راہ پر ڈالے جو اس کو رب تعالیٰ کی مرضیات کی توفیق نصیب کرے۔

عظمت قرآن

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے ،فبای حدیث بعدہ یومنون(الاعراف)اگر نزول قرآن کے بعد لوگ اس پر ایمان نہیں لائیں گے تو پھر اس کے بعد کون سی چیز آئے گی۔ جس پر وہ ایمان لائیں گے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے جسے اس نے انسانیت کی فلاح اور کائنات کی بہتری کے لیے نازل ہوئی ہے اب نہ کوئی نیا نبی آنے والا ہے اور نہ کوئی شریعت نازل ہو گی۔ اب اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی نوشتہ یا صحیفہ نازل نہیں ہو گا لہٰذا تمام انسانیت کا فرض ہے کہ وہ اس آخری کتاب پر ایمان لے آئیں کہ اسی میں ان کی فلاح ہے۔

قرآن پاک میں اللہ کا یہ فرمان بھی موجود ہے کہ قیامت کے دن جب محاسبے کی منزل آئیگی تو اللہ کا رسول اللہ تعالیٰ کی بار گاہ میں شکایت کرے گا وقال الرسول یارب ان قومی اتخذوا ھذا القرآن مھجورا (الفرقان) رسول عرض کرے گا اے پروردگار! میری اس قوم نے قرآن کو پس پشت ڈال دیا یعنی نظر انداز کر دیا۔ نظر انداز کرنے سے مراد یہ ہے کہ کافر لوگ تو اس پر ایمان نہیں لاتے مگر جو لوگ زبانی تسلیم بھی کرتے ہیں وہ لاپرواہی سے کام لیتے ہیں اس کی تعلیمات کو قبول نہیں کرتے اور نہ اس کے احکام پر عمل کرتے ہیں۔

جہاد کبیر

اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بھی قرآن کریم میں موجود ہے

فلاتطع الکفرین وجاھدھم بہ جھادا کبیرا (الفرقان)

اے پیغمبر! آپ کافروں کی بات نہ مانیں اور ان کے خلاف اس قرآن کے ذریعے بڑا جہاد کریں گویا جہاد بالسیف کو جہاد صغیر فرمایا قرآن کے ذریعے دنیا میں انقلاب برپا کرنے کو جہاد کبیر کہا گیا ہے، قرآن پاک تمام باطل ادیان و مذاہب تمام باطل رسومات کفر شرک اور الحاد کے خلاف تعلیم دیتا ہے اللہ کی یہ آخری کتاب صرف اسی چیز کی تعلیم دیتی ہے جو اللہ کے نزدیک برحق ہے لہٰذا اس کی تعلیمات کو دنیا میں عام کرنا بہت بڑا جہاد ہے جہاد بالسیف تو کسی نہ کسی وقت پر ختم ہو کر امن کی حالت قائم ہو جاتی ہے مگر جہاد بالقرآن ہمیشہ جاری رہتا ہے۔

امام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی الفوز الکبیر ہیں لکھتے ہیں (۱)(الفوز الکبیر فارسی ج ۳ باب اول مطبع مجتبائی دہلی) کہ قرآن میں سزا کی وعید سے متعلق جتنی آیات موجود ہیں ان کا شان نزول یہ ہے کہ دنیا میں جب تک برائی موجود ہے یہ آیات اس کو وعید سناتی رہیں گی اسی طرح اس کتاب میں بشارت والی تمام آیات دنیا میں پائی جانے والی ہر نیکی کے حق میں نازل ہوئی ہیں۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ قرآنی آیات کی شان نزول کے لیے کوئی لمبے چوڑے قصے کہانیوں کی ضرورت نہیں ہے بلکہ ہر برائی کے لیے وعید والی آیت نازل ہوئی ہے اور ہر نیکی کے کام کے لیے بشارت والی آیت اللہ نے نازل فرمائی ہے۔

اب جن برائیوں کے خلاف جہاد کرنے کا حکم دیا گیا ہے ان میں اعتقادی عملی اخلاقی انفرادی اور اجماعی ہر قسم کی برائیاں شامل ہیں قرآن پاک ان تمام برائیوں کی مذمت کرتا ہے اور اپنے نبی کو ان کے خلاف جہاد کبیر کا حکم دیتا ہے۔ لوگوں کو برائی سے ہٹا کر نیکی کی طرف لے آنا کوئی آسان کام نہیں ہے اس کے لیے بڑی محنت اور جد وجہد کی ضرورت ہے۔ جوامع الکلم والی حدیث حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا یہ فرمان (۱)

(مسلم ۱۱۸ ج ۱ کتاب الطہارت ب ۲ مسند احمد ص ۳۹۱ ج ۱ و ص ۴۵۲ ج ۱) موجود ہے القرأن حجة لك او عليك یعنی قرآن پاک تمہارے حق میں یا تمہارے خلاف دلیل بنے گا اگر تم قرآن پر ایمان لے آئے اسے اپنا لیا اور اس کے احکام پر عمل کیا تو یہ تمہارے حق میں دلیل بنے گا اور تمہارے حق میں گواہی دے گا اور اگر اس کو قبول نہ کیا اس میں کوتاہی کی یا عملی طور پر اسے پس پشت ڈال دیا تو یہی قرآن پاک تمہارے خلاف گواہی دے گا۔

قرآن بطور بہار دل

قرآن حکیم کی حیثیت اور عظمت حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اس دعا سے واضح ہوتی ہے جس میں آپ نے اس صحیفہ آسمانی کو آنکھوں کا نور اور دل کا سرور فرمایا ہے (۲)(امسلم ص۱۱۸ ج ۱ کتاب الطہارت ب ۱۲ احمد ص ۳۹۱ ج ۱ ص ۴۵۲ ج ۱)

اللهم اسئلك بكل اسم هو لك سميت به نفسك وانزلته فی کتابك او علمته احدا من خلقك اواستاثرت به فی علم الغيب عندك ان تجعل القرآن العظيم ربيع قلبی ونور بصری وجلاء حزنی وذهاب همی۔

اے اللہ! میں تجھ سے تیرے ہر اس اسم پاک کے واسطے سے سوال کرتا ہوں جس کے ساتھ تونے اپنے آپ کو موسوم کیا ہے یا اس کو کسی کتاب میں نازل فرمایا ہے اپنی مخلوق میں سے کسی کو بتایا ہے یا اسے اپنے ہی پاس رکھا ہے یا تیرے علم میں ہے میں ہر اس اسم کے واسطے سے درخواست کرتا ہوں کہ قرآن پاک کو میرے دل کی بہار بنادے یعنی جس طرح موسم بہار کے سبز پھول اور پھلوں کو دیکھ کر لوگوں کے دل مسرور ہوتے ہیں۔ اسی طرح اس قرآن پاک کو تیرے دل کی بہار بنادے کہ یہ اسے دیکھ کر باغ باغ ہو جائے۔ پھر عرض کیا اس قرآن کو میری آنکھوں کا نور بنادے۔ اس کے ذریعے میرے غم اور اندیشوں کو دور فرمادے۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو قرآن پاک کے ساتھ اس قدر محبت تھی اور آپ کے دل میں اتنی عظمت تھی کہ آپ اس کیلئے دعا فرمایا کرتے تھے۔

قرآن بطور معجزہ

حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد مبارک ہے (۱)(بخاری ص ۷۴۴ و ۱۰۸۰ ج ۲۔ مسلم ص ۸۶ ج ۱) کہ ہر نبی کو کوئی نہ کوئی معجزہ عطا کیا گیا مگر اکثر انبیاء کے معجزات وقتی طور پر ظاہر ہوئے لوگوں نے دیکھ لیا تو ختم ہو گئے فرمایا اللہ تعالیٰ نے مجھے جو خصوصی معجزہ فرمایا وحی اوحی اللہ الی یہ قرآن پاک ہے جو بذریعہ وحی مجھ پر نازل کیا ہے اسی لیے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ مجھے امید ہے کہ قیامت کے دن میرے پیروکار سب سے زیادہ ہوں گے

کیونکہ میرا معجزہ بھی دائمی ہے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) خود تو تریسٹھ سالہ زندگی گزار کر اس دنیا سے رخصت ہو گئے مگر آپ ﷺ پر نازل ہونے والا قرآن بطور معجزہ تا قیام قیامت موجود رہے گا اللہ کا یہ کلام حرف بہ حرف قائم و دائم رہیگا جس طرح حضور خاتم النبیین (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنی زبان مبارک سے پڑھ کر سنایا چنانچہ سلیم الفطرت لوگ اس قرآن پاک کو پڑھ کر ایمان کی دولت سے مالا مال ہو جاتے ہیں ہمارا ایمان ہے کہ قرآن کریم ابتداء سے انتہا تک وحی الٰہی اور حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا زندہ معجزہ ہے سورۃ جن میں موجود ہے کہ جب جنوں نے اس کلام الٰہی کو سنا تو پکار اٹھے انا سمعنا قراٰنا عجبا (الجن) ہم نے عجیب قرآن سنا فاٰمنا بہ پس اس پر ایمان لے آئے شاہ عبد العزیز فرماتے ہیں کہ قرآن پاک عجیب اس لیے ہے کہ عام کتب میں تو معلومات ہوتی ہیں مگر قرآن پاک میں معلومات کے علاوہ بیشمار ایسے معارف بھی موجود ہیں جنہیں لوگ ابد الآباد تک تلاش کر کے اپنے علم میں اضافہ کرتے رہیں گے مگر معارف ختم نہیں ہوں گے کیونکہ وہ غیر محدود ہیں۔

قرآن ذکر الٰہی ہے

ذکر ایک بہترین عبادت ہے جس کی کوئی تحدید نہیں ہر عبادت کی کوئی نہ کوئی حد ہوتی ہے مگر ذکر الٰہی غیر محدود ہے قرآن کریم کی ایک حیثیت ذکر الٰہی کی بھی ہے۔ سورۃ جمعہ آتا ہے واذکروا اللہ کثیرا لعلکم تفلحون۔ اللہ کو کثرت سے یاد کیا کرو تاکہ تمہیں فلاح نصیب ہو جائے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد مبارک بھی ہے

(۱) ترمذی ص ۱۷۵ ج ۲ باب ماجا فی فضل الذکر)

لا یزال لسانك رطبا من ذکر اللہ کسی شخص نے عرض کیا حضور! کوئی ایسی بات ارشاد فرمائیں جس کو ہمیشہ پڑھتا رہوں آپ نے فرمایا کہ تمہاری زبان ہمیشہ اللہ کے ذکر سے تر رہنی چاہیے زبانی ذکر سب سے آسان ذکر ہے خالی اللہ اللہ کرتا رہے یا سبحان اللہ کہتا رہے۔ یا رحمن یا رحیم کا ورد ہو یا حی یا قیوم پڑھتا رہے۔ الحمد للہ، اللہ اکبر استغفر اللہ لا الہ اللہ ذکر کی مختلف صورتیں ہیں۔

قرآن حکیم کی حیثیت علم کی بھی ہے اور ذکر کی بھی چنانچہ قرآن پاک تلاوت افضل اذکار میں سے ہے۔ سوائے ان اذکار کے جن کے متعلق خاص طور پر آگاہ فرمایا ہے قرآن کے برابر کوئی دوسرا ذکر نہیں ہے چنانچہ جزائے عمل کے وقت قرآن پاک کی تلاوت کرنے والوں کو دیگر اذکار کی نسبت زیادہ اجر و ثواب حاصل ہو گا بہر حال قرآن پاک ذکر بھی ہے۔

تلاوت قرآن کا اجر

بیہقی شریف (۱) فیض القدیر شرح جامع صغیر ص ۵۱۳ ص ج ۴ بحوالہ بیہقی شعب الایمان ب ۲ نسائی ص ۱۱۳ ج ۱ بخاری ص ۲۵۴ ج ۱ و فیض القدیر شرح جامع صغیر ص ۲۴۴ ج ۴ بحوالہ طبرانی کبیر ب ۳ مشکوۃ ص ۱۹۲ کتاب فضائل القرآن بحوالہ بیہقی شعب الایمان) اور دیگر کتب میں یہ حدیث موجود ہے کہ سب سے زیادہ افضل قرآن پاک کی وہ تلاوت تسبیح و تحمید سے افضل ہے یعنی ایک شخص سبحان اللہ الحمد للہ اللہ اکبر و غیرہ کا ذکر کرتا ہے اور دوسرا قرآن پاک کی تلاوت کرتا ہے تو تلاوت کرنے والا افضل ہے فرمایا تسبیح و تحمید صدقے سے زیادہ افضل ہے اور صدقہ روزے سے افضل ہے کیونکہ روزہ کی حیثیت انفرادی ہوتی ہے جب کہ صدقہ اجتماعی حیثیت کا حامل ہوتا ہے اس میں اللہ کی رضا بھی ہوتی ہے اور محتاج کی ضرورت بھی پوری ہوتی ہے۔ آپ نے روزے کے متعلق فرمایا (۲) **الصوم جنتہ یسجن بہا العبد من النار** ۔ خالص اللہ کی رضا کے لیے رکھا جانے والا روزہ دوزخ کے سامنے ڈھال بن جائے گا۔ بہر حال معلوم ہوا کہ مذکورہ تمام امور میں تلاوت قرآن پاک کو اول درجے کی حیثیت حاصل ہے آداب قرآن کے سلسلہ میں حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا یہ بھی فرمان (۳) ہے **یا اھل القرآن لا تتوسدوا القرآن** یعنی اے قرآن پاک کے ماننے والو! قرآن کو سرہانے کے نیچے نہ رکھا کرو۔ اس کو پس پشت نہ ڈالو بلکہ **واتلوہ** اس کو پڑھاؤ **وافشوہ** اور اس کو پھیلاؤ نیز فرمایا اس کے ثواب میں جلد بازی نہ کرو، اس کا ثواب یقیناً ملے گا

مقصد یہ ہے کہ قرآن پاک فلاح کا پروگرام ہے تمام لوگوں کو چاہیے کہ اس پر اعتقاد قائم کریں اس کو پڑھیں اس کو سمجھیں اور پھر اس پر عمل پیرا ہو جائیں۔(معالم العرفان)

فاتحۃ الکتاب

سورۃ فاتحہ کا تعارف

انسان کی تخلیق کا مقصد اللہ تعالیٰ کی عبادت ہے، اور قرآن مجید وہ مقدس کتاب ہے جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کا راستہ بتاتی ہے۔ سورۃ فاتحہ میں اس تفصیل کو اختصار کے ساتھ بطور دیباچہ بیان کیا جارہا ہے تاکہ قاری کے ذہن میں یہ بات راسخ ہو جائے کہ انسان کا منشور تخلیق اللہ تعالیٰ کی عبادت ہے اور اس کا دستور حیات اللہ والوں کا نقش قدم ہے جو صراط مستقیم پر گامزن ہیں۔

سورۃ فاتحہ دراصل ایک جامع دعا ہے۔ اس کی تلاوت سے اللہ تعالیٰ کی رحمت و نصرت اور قرآن مجید کی فہم و فراست کے دروازے کھلتے ہیں۔ اسی لیے اس کی ابتدا میں رکھا گیا ہے تاکہ قرآن سمجھنے میں آسانی ہو۔ یہ سورت کتنی عظیم ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کا نزول دو بار ہوا(ایک بار مکہ مکرمہ میں اور دوسری بار مدینہ منورہ

میں) اور ہر نماز میں اس کا پڑھنا واجب قرار پایا۔ سورۃ فاتحہ کی فضلیت میں حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا:

قسم ہے اس ذات اقدس کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے! توراۃ، انجیل، زبور اور قرآن میں سورۃ فاتحہ جیسی کوئی سورت نہیں ہے۔ (ترمذی:2875: ابواب فضائل قرآن: باب 1)۔۔ یہ سب سے عظیم سورت ہے۔

(صحیح بخاری:5006: کتاب فضائل قرآن باب 9)

مقامِ نزول

اکثر علماء کے نزدیک "سورۃ فاتحہ "مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی ہے۔ امام مجاہد (رح) فرماتے ہیں کہ "سورۃ فاتحہ "مدینہ منورہ میں نازل ہوئی ہے اور ایک قول یہ ہے: "سورۃ فاتحہ "دو مرتبہ نازل ہوئی، ایک مرتبہ "مکہ مکرمہ "میں اور دوسری مرتبہ "مدینہ منورہ "میں نازل ہوئی ہے۔

(خازن، تفسیر سورۃ الفاتحۃ، ۱/۱۲)

سورۃ فاتحہ مکی یا مدنی

سورۃ فاتحہ جمہور علماء کے نزدیک مکی ہے بعض علماء اس کے مدنی ہونے کی طرف گئے ہیں مگر یہ قول شاذ ہے۔ ابتداء بعثت میں سب سے پہلے اقرا باسم ربک چند آیتیں نازل ہوئیں جیسا کہ صحیحین میں ہے اور چند روز کے بعد پوری سورۃ فاتحہ مع بسم اللہ کے نازل ہوئی جیسا کہ مصنف ابن ابی شیبہ اور ابو نعیم اور بیہقی کی دلائل النبوت میں عمرو بن شرجیل (رض) سے مرسلاً مروی ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت خدیجہ (رض) سے یہ فرمایا کہ جب میں تنہا ہوتا ہوں تو غیب سے کچھ آوازیں سنتا ہوں خدا کی قسم مجھ کو اپنی جان کا اندیشہ ہے۔ حضرت خدیجہ (رض) نے فرمایا معاذ اللہ خدا تعالیٰ کبھی آپ کے ساتھ ایسا نہ کرے گا۔ خدا کی قسم آپ امانتیں ادا کرتے ہیں۔ صلہ رحمی کرتے ہیں۔ ہمیشہ سچ بولتے ہیں۔ اتفاق سے اسی وقت ابو بکر آ گئے۔ حضرت خدیجہ نے کہا اے ابو بکر تم محمد (رسول اللہ (صلی

اللہ علیہ وآلہ وسلم)) کو ساتھ لیکر ورقہ کے پاس جاؤ اور یہ واقعہ بیان کرو۔ چنانچہ ابو بکر (رض) حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ہاتھ پکڑ کر ورقہ کے پاس لے گئے۔ ورقہ نے آپ سے حال دریافت کیا اس پر آپ نے یہ فرمایا۔
فقال اذا خلوت وحدی سمعت نداء خلقی یا محمد یا محمد فانطلق هاربا فی الارض فقال لا تفعل اذا اتاك فاثبت حتی تسمع ما یقول ثم ائتنی فاخبرنی فلما خلا ناداه یا محمد قل بسم الله الرحمن الرحیم ۔ الحمد لله رب العالمین حتی بلغ ولا الضالین قال قل لا اله الا الله فاتی ورقة فذکر ذلك له فقال له ابشر ثم ابشر فانی اشهد انك الذی بشر به ابن میم وانك علی مثل ناموس موسیٰ وانك نبی مرسل الحدیث (تفسیر در منثور ص2ج1 و تفسیر قرطبی ص115ج1)
کہ جب میں تنہا ہوتا ہوں تو پیچھے سے غیبی آواز یا محمد یا محمد کی سنتا ہوں، جس کی دہشت سے بھاگنے لگتا ہوں۔ ورقہ نے کہا ایسا مت کرو ٹھہر کر اس کی بات سنو اور پھر جو کہے۔ اس کی آکر مجھ کو خبر دو۔ چنانچہ اس کے بعد آپ ایک جگہ تنہا تھے کہ آواز آئی۔ اے محمد یہ پڑھے بسم الله الرحمن الرحیم الحمد لله رب العالمین الی آخر السورة اس کے بعد کہا لا اله الا لا الله کہو آپ یہ سب سن کر ورقہ کے پاس آئے اور سارا واقعہ ذکر کیا۔ ورقہ نے کہا اے محمد تم کو بشارت ہو اور پھر بشارت ہو۔ تحقیق میں گواہی دیتا ہوں کہ تم بلاشبہ وہی نبی ہو کہ جن کی مسیح بن مریم نے بشارت دی ہے اور تمہاری شریعت موسیٰ کی شریعت کے طرز کی ہے اور میں گواہی دیتا ہوں کہ تم یقیناً نبی مرسل ہو۔

آغاز سورۃ

اس روایت سے صاف ظاہر ہے کہ یہ سورت ابتداء بعثت کے چند روز بعد اتری ہے کہ جب خدیجۃ الکبری اور ابو بکر صدیق مشرف باسلام ہو چکے تھے اور ورقہ بن نوفل ابھی بقید حیات تھے۔ ابتداء بعثت میں نزول وحی کی شدت اور اس کی عجیب وغریب کیفیت کیوجہ سے جو اس سے پہلے نہ کبھی دیکھی اور نہ سنی تھی آپ پر ایک خاص خشیت اور وحشت طاری ہو جاتی تھی۔ اور ظاہر ہے کہ جب آدمی پر کوئی خاص کیفیت اور شدت طاری ہوتی ہے تو دل کی تسلی اور تشفی کے لیے اپنے محرم خاص اور محب باختصاص سے ذکر کرتا ہے تاکہ دل کو سکون اور اطمینان ہو۔ (معارف)

سید عالم ﷺ ورقہ بن نوفل کے پاس کیوں گئے؟

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا حضرت خدیجہ سے ذکر کرنا اور ورقہ کے پاس جانا محض اس لیے تھا کہ یہ محرم راز اور ہمدم وہم ساز ہیں۔ حبیب اور لبیب ہیں۔ ہوشمند اور دانشمند ذی علم اور ذی فہم ہیں ان سے مل کر تسلی ہو گی۔ معاذ اللہ آپ کو اپنی نبوت ورسالت میں کوئی شبہ اور تردد نہ تھا اور نہ ورقہ سے کوئی تعلیم و تلقین مقصود تھی۔ ورقہ تو صرف توراۃ اور انجیل کے ایک عالم تھے۔ اور حضرت **تو اوتیت علم الاولین والاخرین** کے مصداق تھے۔ حضور ورقہ سے کیا علم اور فیض حاصل کرنے جاتے۔ اصل بات یہ تھی کہ ورقہ اگرچہ عالم تھے مگر صاحب حال اور صاحب کیفیت نہ تھے آپ کے قلب مبارک پر جو وحی کی کیفیت گزر رہی تھی۔ اس کی حقیقت اور اس کی لذت کی کیفیت تو آپ ہی کو معلوم تھی۔ ورقہ ذوقی طور پر نہیں جانتے تھے بلکہ محض علمی طور پر اتنا جانتے تھے کہ حضرات انبیاء پر نزول وحی کے وقت یہ کیفیات گزرتی ہیں۔ اس لیے وہ آپ کی تسلی کرتے تھے اور ایسے وقت میں تسلی اور تشفی وہی کر سکتا ہے کہ جس پر یہ حالت اور یہ کیفیت نہ گزر رہی ہو اور کچھ اجمالی طور پر اس قسم کی چیزوں سے واقف اور باخبر ہو۔ جیسے تیمار دار بیمار کی تسلی کرتا ہے۔ ورنہ جس پر یہ کیفیت گزرے گی اور جس پر یہ حالت طاری ہو گی وہ خود ہی خوف زدہ اور دہشت زدہ ہو جائے گا اسے اپنی ہی خبر نہ رہے گی۔ دوسرے کی کیا تسلی اور کیا تشفی کرے گا اور عقلاً یہ ضروری نہیں کہ تسلی دینے والا صاحب حال سے افضل اور اکمل یا اعلم اور افہم ہو۔ **فافهم ذلك واستقم**۔ ورقہ بن نوفل کا حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو تسلی دینا ایسا ہی ہے جیسا کہ انجیل متی کے باب سوم میں یوحنا حواری کا حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو تسلی دینا مذکور ہے۔ اس نکتہ کو خوب سمجھ لیا جائے۔ (معارف القرآن)

آیات، کلمات اور حروف کی تعداد

اس سورت میں 1 رکوع، 7 آیتیں، 27 کلمے اور 140 حروف ہیں۔ (خازن، تفسیر سورۃ الفاتحہ، ۱/ ۱۲)

شان نزول

مسلم اور نسائی میں حضرت عبد اللہ بن عباس (رض) سے وایت ہے کہ ایک دن حضرت جبرائیل آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس بیٹھے تھے کہ یکایک انھوں نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر کہا کہ آج آسمان کا وہ دروازہ کھلا ہے جو اس سے پہلے کبھی نہیں کھلا تھا۔ اتنے میں ایک فرشتہ رسول اللہ کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ آپ کو سورۃ فاتحہ اور امن الرسول سے سورۃ کے آخر تک ان آیتوں کے نازل ہونے کی خوش خبری سنانے آیا ہوں کہ یہ آیتیں لانے والے ایسے دو نور ہیں کہ آپ سے پہلے کسی نبی پر نازل نہیں ہوئے۔ (مظہر القرآن)

سورۃ فاتحہ کی جامعیت

قرآن کریم کے جملہ مطالب کے لیے سورہ فاتحہ کی جامعیت اس کا طرہ امتیاز ہے۔ بلکہ اگر یوں کہا جائے تو خلاف واقعہ نہ ہو گا کہ سورۃ فاتحہ تمام انبیا علیہم السلام کی تعلیمات کی اجمالی فہرست ہے چنانچہ امام رازی فرماتے ہیں کہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ اللہ تعالی نے انسان کی ہدایت کے لیے ایک سو چار کتابیں بھیجیں۔ پھر سو کتابوں کے علوم و معارف کا مجموعہ چار کتابیں (تورات، زبور، انجیل اور قرآن) قرار دیں۔ پھر ان چار کتابوں کے مضامین کا منبع قرآن مجید قرار دیا اور قرآن مجید کے علوم و معارف کے رموز کا امین سورۃ فاتحہ کو بنایا۔ پس جس نے سورۃ فاتحہ کی تفسیر سیکھی گویا اس نے اللہ تعالی کی طرف سے اتاری گئی تمام کتابیں سیکھیں۔ جس نے سورہ فاتحہ پڑھی ایسا ہے جیسا کہ اس نے چاروں کتابیں پڑھیں۔ (التفسیر الکبیر ج ۱/ ۱۷۸) ایک دوسری روایت کی رو سے حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے کہ اس کے مثل کوئی سورت نہ تورات میں اتری اور نہ انجیل میں اور نہ زبور میں اور نہ قرآن میں اور یہی سبع مثانی ہے، یعنی سات آیتیں ہیں جو بار بار ہر رکعت میں پڑھی جاتی ہیں اور یہی قرآن عظیم ہے، جو مجھے دیا گیا ہے۔ (1-عن أبي ہريرۃ أن رسول اللہ صلى اللہ عليہ وسلم قال:۔۔۔۔ وقرأ عليہ أبي بن كعب أم القرآن فقال: والذى نفسى بيدہ ما أنزلت فى التوراۃ ولا فى الإنجيل ولا فى الزبور ولا فى الفرقان مثلها وإنها سبع من

المثاني والقرآن العظيم الذي أعطيته۔ حديث صحيح: اخرجه الترمذي برقم: ۲۸۷۵ وقال هذا حديث حسن صحيح والنسائي في السنن الكبرى برقم: ۱۱۲۱)، واحمد في مسنده برقم: ۸۴۱۷، ۹۰۸۱ والحاكم في المستدرك برقم: ۳۰۱۹)

جامعیت کی وجوہات

قرآن مجید میں عموماً چھ مضامین پر زور دیا جاتا ہے اور یہی چھ مضامین قرآن کے اعلی مطالب ہیں: (۱) توحید (۲) رسالت (۳) احکام (۴) احوال قیامت (۵) ماننے والوں کے احکام (۶) نہ ماننے والوں کے احکام۔ سورۃ فاتحہ کے مطالعہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ چھ مضامین اس سورۃ میں اجمالی طور پر بیان ہوئے ہیں۔
عرفاً پورا قرآن چار حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ ابتدا سے لے کر سورۃ انعام تک ہے، اس میں زیادہ تر زور اللہ تعالی کی صفت خالقیت پر دیا جاتا ہے۔ دوسرا حصہ سورۃ کہف تک ہے، جس میں اللہ تعالی کی ربوبیت بیان ہوتی ہے۔ تیسرا حصہ سورۃ سبا تک ہے، اس میں اللہ تعالی کی صفت کارسازی زیادہ نمایاں ہے۔ اور آخری چوتھا حصہ قیامت کے احوال کا آئینہ ہے۔ یہی چار مضامین سورۃ فاتحہ میں اجمالی طور پر بیان ہوئے ہیں، اس طرح یہ سورۃ پورے قرآنی علوم کے لیے جامع ہے۔ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع فرماتے ہیں کہ پورے قرآن کے مقاصد ایمان اور عمل صالح میں دائر ہیں ۔ ان دونوں چیزوں کے بنیادی اصول اس سورۃ میں بیان کیے گئے ہیں۔ سورۃ فاتحہ کی جامعیت اس اعتبار سے بھی نمایاں ہے کہ قرآن انسان کو اس کے اصل مقام یعنی عبدیت اور رب کائنات کی قدرت کی ہمہ گیری اور آفاقی حیثیت کی نشاندہی کرتا ہے کہ انسان زندگی کے ہر شعبہ اور ہر حالت میں اللہ تعالی کی طرف محتاج ہے جب کہ اللہ تعالی صفات کاملہ سے موصوف ہو کر کسی کا محتاج نہیں اور یہی نسخہ تزکیہ نفس میں بنیادی طور پر استعمال ہوتا ہے جس

کی تعبیر احسان سے ہوتی ہے کہ "واعبد ربك كانك تراه فان لم تكن تراه فانه يراك" قرآن کے مطالعہ سے جابجا یہی حقیقت نمایاں رہتی ہے۔ سورۃ فاتحہ بنیادی طور پر ان دونوں حقائق کا جامع ہے۔ پوری سورۃ ایک طرف اللہ تعالی کی صفت ربوبیت، مالکیت اور قدرت کی ہمہ گیری سے بھرپور ہے تو دوسری طرف انسان کے اصل مقام کی نشاندہی کرتا ہے کہ انسان ہر حالت، ہر کام میں اللہ تعالی کی طرف محتاج ہے۔ اللہ تعالی کی ذات سے وابستگی، مشکلات میں اس سے مدد طلب کرنا اور مال و جان کا اللہ تعالی کے دربار میں نذرانہ پیش کرنا انسان کی لیے گراں قدر سرمایہ ہے۔ زندگی کے کسی مرحلہ پر انسان بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ ہر وقت ہدایت کا سوال کرنا اور منعم علیہم کے نقش قدم پر چلنا اس کا معراج ہے۔

ترتیب مصحفی میں سورۃ فاتحہ کی اہمیت

قرآن کریم میں ایک سو چودہ (۱۱۴) سورتیں ہیں۔ چھوٹی سی چھوٹی سورت سورۃ الکوثر ہے جو تین آیات پر مشتمل ہے۔ سورتوں کی موجودہ ترتیب "ترتیب مصحفی" ہے جس میں "سورۃ فاتحہ" کو اولین مقام حاصل ہے اور نزول کی ترتیب اس سے الگ ہے۔ ترتیب نزولی میں فاتحہ سے قبل سورۃ العلق، سورۃ ن، سورۃ المزمل اور سورۃ المدثر نازل ہوئی تھیں۔

بعض علماء کے نزدیک ترتیب مصحفی صحابہ کرام کے اجتہاد کی مرہون منت ہے۔ یہ اس دور کی یادگار ہے جب قرآن کریم کو ایک مصحف میں جمع کیا گیا لیکن جلال الدین سیوطی نے "الاتقان فی علوم القرآن میں جس قول کو ترجیح دی ہے وہ یہ ہے کہ ترتیب مصحفی میں بھی عقل یا قیاس کو کوئی دخل نہیں، بلکہ توقیفی ہے یعنی یہ ترتیب بھی وحی سے طے ہوئی ہے۔

لہذا اب ترتیب نزولی اور ترتیب مصحفی میں سے ترتیب مصحفی ہی قابل اعتبار ہے، اور جہاں تک ترتیب نزولی کا تعلق ہے تو اگرچہ بعض حضرات نے تمام سورتوں کی ترتیب نزولی نقل کی ہے، تاہم کسی صحیح سند کے ساتھ محفوظ و منقول نہیں یہی وجہ ہے کہ اس میں اختلاف بھی پایا جاتا ہے۔ چنانچہ علامہ سیوطی نے الاتقان میں مختلف سندوں کے ساتھ جو ترتیب نزولی نقل کی ہے اس میں بعض سورتوں کی ترتیب میں تقدیم و تاخیر بھی ہے۔

ترتیب مصحفی کے اعتبار سے سورتوں کی تقسیم

ترتیب مصحفی کے اعتبار سے سورتوں کے چار درجے ہیں:

1 السبع الطوال: یہ قرآن کی بڑی سورتوں کا سلسلہ ہے جو "سورۃ البقرۃ" سے شروع ہو کر "سورۃ توبہ پر ختم ہوتا ہے۔

2 المئون: قرآن کی وہ سورتیں جن کی آیات کی تعداد ایک سو سے متجاوز یا اس کے قریب ہے۔

3 المثانی: مئین کے بعد آنے والی سورتوں کا نام ہے۔

4 مفصل: وہ چھوٹی سورتیں جو مثانی " کے بعد ہیں۔ پھر مفصل کے تین درجے ہیں:

ا- طوال مفصل: اس کی تعیین میں متعدد اقوال ہیں۔ ایک قول کے مطابق سورۃ حجرات سے یہ سلسلہ شروع ہوتا ہے اور سورۃ النباء پر مسلسل ختم ہوتا ہے۔

۲- اوساط مفصل: سورۃ الضحیٰ تک یہ سلسلہ چلتا ہے۔

۳- قصار مفصل: سورۃ الضحیٰ سے آخر قرآن تک یہ سلسلہ چلتا ہے۔ (محاسن)

سورۃ فاتحہ کا اسلوب

اب غور کرو کہ ان باتوں کا خلاصہ اس سورت میں کس خوبی کے ساتھ جمع کر دیا گیا ہے! ایک طرف زیادہ سے زیادہ مختصر حتی کہ گنے ہوئے الفاظ ہیں، دوسری طرف ایسے جچے تلے الفاظ کہ ان کے معانی سے پوری وضاحت اور دل نشینی پیدا ہو گئی ہے۔ ساتھ ہی نہایت سیدھا سادھا بیان ہے۔ کسی طرح کا پیچ و خم نہیں۔ کسی طرح کا الجھاؤ نہیں۔

یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ دنیا میں جو چیز جتنی زیادہ حقیقت سے قریب ہوتی ہے۔ اتنی ہی زیادہ سہل اور دلنشین بھی ہوتی ہے اور خود فطرت کا یہ حال ہے کہ کسی گوشے میں بھی الجھی ہوئی نہیں ہے۔ الجھاؤ جس قدر بھی پیدا ہوتا ہے بناوٹ اور تکلف سے پیدا ہوتا ہے۔ پس جو بات سچی اور حقیقی ہوگی ضروری ہے کہ سیدھی سادھی اور دلنشین بھی ہو۔ دل نشینی کی انتہا یہ ہے کہ جب کبھی کوئی ایسی بات تمہارے سامنے آجائے تو ذہن کو کسی طرح کی اجنبیت محسوس نہ

ہو۔ وہ اس طرح قبول کرلے گویا پیشتر سے سمجھی بوجھی ہوئی بات تھی۔ اردو کے ایک شاعر نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

اب غور کرو کہ جہاں تک انسان کی خدا پرستی اور خدا پرستی کے تصورات کا تعلق ہے اس سے زیادہ سیدھی سادھی باتیں اور کیا ہو سکتی ہیں جو اس سورت میں بیان کیا ہو سکتا ہے؟ سات چھوٹے چھوٹے بول ہیں۔ ہر بول چار پانچ لفظوں سے زیادہ کا نہیں اور ہر لفظ صاف اور دل نشین معانی کا نگینہ ہے جو اس انگوٹھی میں جڑ دیا گیا ہے۔ اللہ کو مخاطب کر کے ان صفتوں سے پکارا گیا ہے جن کا جلوہ شب و روز انسان کے مشاہدے میں آتا رہتا ہے اگرچہ وہ اپنی جہالت و غفلت سے ان میں غور و تفکر نہیں کرتا۔ پھر اس کی بندگی کا اقرار، اس کی مددگاریوں کا اعتراف ہے اور زندگی کی لغزشوں سے بچ کر سیدھی راہ لگ کر چلنے کی طلبگاری ہے۔ کوئی مشکل خیال نہیں، کوئی انوکھی بات نہیں، کوئی عجیب و غریب راز نہیں۔ اب کہ ہم بار بار یہ سورت پڑھتے رہتے ہیں اور صدیوں سے اس کے مطالب نوع انسانی کے سامنے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ہمارے دینی تصورات کی ایک بہت ہی معمولی سی بات ہے لیکن یہی معمولی بات جس وقت تک دنیا کے سامنے نہیں آئی تھی اس سے زیادہ کوئی غیر معلوم اور ناقابل حل بات بھی نہ تھی۔ دنیا میں حقیقت اور سچائی کی ہر بات کا یہی حال ہے۔ جب تک سامنے نہیں آتی، معلوم ہوتا ہے اس سے زیادہ مشکل بات کوئی نہیں۔ جب سامنے آجاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے اس سے زیادہ صاف اور سہل بات اور کیا ہو سکتی ہے؟ عرفی نے یہی حقیقت ایک دوسرے پیرایے میں بیان کی ہے۔

ہر کس نشناسندہ راز ست، و گرنہ::: اینہا ہمہ راز ست کہ معلوم عوام ست!

دنیا میں جب کبھی وحیٔ الٰہی کی ہدایت نمودار ہوئی تو اس نے یہ نہیں کیا ہے کہ انسان کو نئی نئی باتیں سکھادی ہوں کیونکہ خدا پرستی کے بارے میں کوئی انوکھی بات سکھائی ہی نہیں جا سکتی۔ اس کا کام صرف یہ رہا ہے کہ انسان کے وجدانی عقائد کو علم و اعتراف کی ٹھیک ٹھیک تعبیر بتادے اور یہی سورۃ فاتحہ کی خصوصیت ہے۔ اس سورت نے نوع انسانی کے وجدانی تصورات ایک ایسی تعبیر سے سنوار دیے کہ ہر عقیدہ، ہر فکر، ہر جذبہ، اپنی حقیقی شکل و نوعیت میں

نمودار ہو گیا اور چونکہ یہ تعبیر حقیقت حال کی سچی تعبیر ہے اس لیے جب کبھی ایک انسان راست بازی کے ساتھ اس پر غور کرے گا بے اختیار پکار اٹھے گا کہ اس کا ہر بول اور ہر لفظ اس کے دل و دماغ کی قدرتی آواز ہے!

(ترجمان القرآن)

دین حق کی مہمات

پھر دیکھو اگرچہ اپنی نوعیت میں وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ ایک خدا پرست انسان کی سیدھی سادھی دعا ہے لیکن کس طرح اس کے ہر لفظ اور ہر اسلوب سے دین حق کا کوئی نہ کوئی اہم مقصد واضح ہو گیا ہے اور کس طرح اس کے الفاظ نہایت اہم معانی و دقائق کی نگرانی کر رہے ہیں!

(1) خدا کے تصور کے بارے میں انسان کی ایک بڑی غلط فہمی یہ رہی ہے کہ اس تصور کو محبت کی جگہ خوف و دہشت کی چیز بنالیتا تھا۔ سورۃ فاتحہ کے سب سے پہلے لفظ نے اس گمراہی کا ازالہ کر دیا۔

(الحمد للہ رب العالمین) اس کی ابتدا حمد کے اعتراف سے ہوتی ہے حمد ثنائے جمیل کو کہتے ہیں یعنی اچھی صفتوں کی تعریف کرنے کو، ثنائے جمیل اسی کی کی جاسکتی ہے جس میں خوبی و جمال ہو۔ پس حمد کے ساتھ خوف و دہشت کا تصور جمع نہیں ہو سکتا۔ جو ذات محمود ہو گی وہ خوفناک نہیں ہو سکتی۔

پھر حمد کے بعد خدا کی عالمگیر ربوبیت، رحمت اور عدالت کا ذکر کیا ہے اور اس طرح صفات الٰہی کی ایک ایسی مکمل شبیہ کھینچ دی ہے جو انسان کو وہ سب کچھ دے دیتی ہے جس کی انسانیت کے نشوو ارتقا کے لیے ضرورت ہے اور ان تمام گمراہیوں سے محفوظ کر دیتی ہے جو اس راہ میں اسے پیش آسکتی ہیں۔

(2) "رب العالمین "میں خدا کی عالمگیر ربوبیت کا اعتراف ہے جو ہر فرد، ہر جماعت، ہر قوم، ہر ملک اور ہر گوشہ وجود کے لیے ہے۔ اس لیے یہ اعتراف ان تمام تنگ نظریوں کا خاتمہ کر دیتا ہے جو دنیا کی مختلف قوموں اور نسلوں میں پیدا ہو گئی تھیں۔ اور ہر قوم اپنی جگہ سمجھنے لگی تھی کہ خدا کی برکتیں اور سعادتیں صرف اسی کے لیے ہے کسی دوسری قوم کا ان میں حصہ نہیں۔

(3) "ملك يوم الدين "میں "الدین "کا لفظ جزا کے قانون کا اعتراف ہے اور جزا کو "دین "کے لفظ سے تعبیر کر کے یہ حقیقت واضح کر دی ہے کہ جزا انسانی اعمال کے قدرتی نتائج وخواص ہیں۔ یہ بات نہیں ہے کہ خدا کا غضب و انتقام بندوں کو عذاب دینا چاہتا ہو۔ کیونکہ "الدین "کے معنی بدلہ اور مکافات کے ہیں۔

(4) ربوبیت اور رحمت کے بعد "ملك يوم الدين "کے وصف نے یہ حقیقت بھی آشکارا کر دی کہ اگر کائنات میں صفات رحمت و جمال کے ساتھ قہر و جلال بھی اپنی نمود رکھتی ہیں تو یہ اس لیے نہیں کہ پروردگار عالم میں غضب و انتقام ہے بلکہ اس لیے ہے کہ وہ عادل ہے اور اس کی حکمت نے ہر چیز کے لیے اس کا ایک خاصہ اور نتیجہ مقرر کر دیا ہے۔ عدل منافی رحمت نہیں ہے بلکہ عین رحمت ہے۔

(5) عبادت کے لیے یہ نہیں کہا کہ نعبدک، بلکہ کہا "ایاک نعبد "یعنی یہ نہیں کہا کہ "تیری عبادت کرتے ہیں"۔ بلکہ حصر کے ساتھ کہا "صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں"۔ اور پھر اس کے ساتھ "اياك نستعين "کہہ کر استعانت کا بھی اسی حصر کے ساتھ ذکر کر دیا۔ اس اسلوب بیان نے توحید کے تمام مقاصد پورے کر دیے اور شرک کی ساری راہیں بند ہو گئیں!

(6) سعادت و فلاح کی راہ کو "صراط المستقيم "یعنی سیدھی راہ سے تعبیر کیا جس کی اس سے زیادہ بہتر اور قدرتی تعبیر نہیں ہو سکتی کیونکہ کوئی نہیں جو سیدھی راہ اور ٹیڑھی راہ میں امتیاز نہ رکھتا ہو اور پہلی راہ کا خواہشمند نہ ہو۔

(7) پھر اس کے لیے ایک سیدھی سادھی اور جانی بوجھی ہوئی شناخت بتا دی جس کا اذعان قدرتی طور پر ہر انسان کے اندر موجود ہے اور جو محض ایک ذہنی تعریف ہونے کی جگہ ایک موجود و مشہود حقیقت نمایاں کر دیتی ہے۔ یعنی وہ راہ جو انعام یافتہ انسانوں کی راہ ہے۔ کوئی ملک، کوئی قو، کوئی زمانہ کوئی فرد ہو، لیکن انسان ہمیشہ دیکھتا ہے کہ زندگی کی دو راہیں یہاں صاف موجود ہیں۔ ایک راہ کامیاب انسانوں کی راہ ہے، ایک ناکام انسانوں کی۔ پس ایک واضح اور آشکارا بات کے لیے سب سے بہتر علامت یہی ہو سکتی تھی کہ اس کی طرف انگلی اٹھا دی جائے۔ اس سے زیادہ کچھ کہنا ایک معلوم بات کو مجہول بنا دینا تھا۔

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اس سورت کے لیے دعا کا پیرایہ اختیار کیا گیا ہے کیونکہ اگر تعلیم وامر کا پیرایہ اختیار کیا جاتا تو اس کی نوعیت کی ساری تاثیر جاتی رہتی۔ دعائیہ اسلوب ہمیں بتاتا ہے کہ ہر راست باز انسان کی جو خدا پرستی کی راہ میں

قدم اٹھاتا ہے صدائے حال کیا ہوتی ہے اور کیا ہونی چاہیے؟ یہ گویا خدا پرستی کے فکر و وجدان کا سر جوش ہے جو ایک طالب صادق کی زبان پر بے اختیار ابل پڑتا ہے۔ (ترجمان)

اسمائے سورۃ فاتحہ

سورۃ فاتحہ کے اسماء

سورۃ فاتحہ کے بہت اسماء ہیں، اور کسی چیز کے زیادہ اسماء اس چیز کی زیادہ فضیلت اور شرف پر دلالت کرتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ سورۃ فاتحہ بہت شرف اور مرتبہ والی سورت ہے، ان اسماء کی تفصیل حسب ذیل ہے:

(۱) فاتحۃ الکتاب

فاتحۃ الکتاب کے ساتھ اس سورت کو اس لیے موسوم کیا گیا ہے کہ مصحف کا افتتاح اس سورت سے ہوتا ہے، تعلیم کی ابتداء بھی اس سورت سے ہوتی ہے اور نماز میں قرأت کا افتتاح بھی اس سورت سے ہوتا ہے اور ایک قول کے مطابق کتاب اللہ کی سب سے پہلے یہی سورت نازل ہوئی تھی اور بہ کثرت احادیث میں تصریح ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس سورت کو فاتحۃ الکتاب فرمایا۔

حضرت عبادہ بن صامت (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جس شخص نے فاتحۃ الکتاب کو نہیں پڑھا اس کو نماز (کامل) نہیں ہوئی۔ (جامع ترمذی ص ٦٣، مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب، کراچی)

اس حدیث کو امام ابن ماجہ (امام ابوعبداللہ محمد بن یزید بن ماجہ متوفی ٢٧٣ ھ، سنن ابن ماجہ ص ٦٠ مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب، کراچی) اور امام احمد، ٢ (امام احمد بن حنبل متوفی ٢٤١ ھ، مسند احمد ج ٢ ص ٤٢٨، مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت، ١٣٩٨ ھ) نے بھی روایت کیا ہے۔

(۲)ام القرآن

کسی چیز کی اصل اور اس کے مقصود کو ام کہتے ہیں اور پورے قرآن کا مقصود چار چیزوں کو ثابت کرنا ہے، الوہیت (اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات) معاد (مر کر دوبارہ اٹھنا)، نبوت اور قضاء وقدر، سورۃ فاتحہ میں "الحمد للہ رب العالمین الرحمن الرحیم"۔ کی الوہیت پر دلالت ہے اور "مالك يوم الدين"۔ کی معاد پر دلالت ہے، "اياك نعبد واياك نستعين"۔ کی اس پر دلالت ہے کہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کی قضاء اور قدر سے ہے اور انسان مجبور محض ہے نہ اپنے افعال کا خالق ہے اور "اهدنا الصراط المستقيم صراط الذين انعمت عليهم غير المغضوب عليهم ولا الضالين"۔ کی نبوت پر دلالت ہے، کیونکہ اس آیت میں اس راستہ کی ہدایت کی دعا کی گئی ہے جو انعام یافتہ لوگوں کا راستہ ہے اور انعام یافتہ لوگ انبیاء (علیہ السلام) ہیں۔ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس سورت کو "ام القرآن" فرمایا ہے امام داری روایت کرتے ہیں حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: الحمد للہ "ام القرآن" ہے اور "ام الکتاب" ہے اور "سبع مثانی" ہے۔ (سنن دارمی ج ۲ ص ۳۲۱، مطبوعہ نشر السنۃ ملتان) اور امام مسلم (رح) نے حضرت عبادہ بن صامت (رض) سے روایت کیا ہے کہ "لاصلوۃ لمن لم یقرء بام القرآن" جو ام القرآن نہ پڑھے اس کی نماز کامل نہیں ہے۔ (صحیح مسلم ج ۱ ص ۱۶۹ مطبوعہ نور محمد اصح المطابع، کراچی، ۱۳۷۵ھ)

(۳)سورۃ الحمد

اس سورت کا نام "سورۃ الحمد" بھی ہے کیونکہ اس سورت میں اللہ تعالیٰ کی حمد ہے، جیسے سورۃ بقرہ اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس سورت میں بقرہ کا ذکر ہے، اسی طرح سورۃ اعراف، سورۃ انفال اور سورۃ توبہ کے اسماء ہیں، نیز مذکور الصدر "سنن دارمی" کی حدیث میں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس سورت کو الحمد للہ سے تعبیر فرمایا ہے۔

(۴) السبع المثانی

قرآن مجید میں ہے:

(آیت) ولقد اتینك سبعا من المثانی، (الحجر:۸۷) ہم نے آپ کو سات آیتیں دیں جو دہرائی جاتی ہیں۔

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: (آیت) "الحمد للہ رب العلمین"۔ السبع المثانی ہے اور وہ قرآن عظیم ہے جو مجھے عطا کیا گیا ہے۔ (صحیح بخاری ج ۲ ص ۶۴۹، مطبوعہ نور محمد اصح المطابع، کراچی، ۱۳۸۱ھ)

سنن دارمی کی مذکور الصدر حدیث میں بھی نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس سورت کو السبع المثانی فرمایا ہے۔

اس سورت کو السبع اس لیے فرمایا ہے کیونکہ اس میں سات آیتیں ہیں اور مثانی فرمانے کی حسب ذیل وجوہ ہیں:

(اول) اس سورت کے نصف میں اللہ تعالیٰ کی ثناء ہے اور نصف میں اللہ تعالیٰ سے دعا ہے (ثانی) ہر دو رکعت نماز میں اس کو دو مرتبہ پڑھا جاتا۔

(ثالث) یہ سورت دو بار نازل کی گئی ہے۔

(رابع) اس سورت کو پڑھنے کے بعد نماز میں دوسری سورت کو پڑھا جاتا ہے۔

كِتَابُ تَفْسِيرِ الْقُرْآنِ مَا جَاءَ فِي فَاتِحَةِ الْكِتَابِ صحيح حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ حَدَّثَنَا يَحْيَى عَنْ شُعْبَةَ قَالَ حَدَّثَنِي خُبَيْبُ بْنُ عَبْدِ الرَّحْمَنِ عَنْ حَفْصِ بْنِ عَاصِمٍ عَنْ أَبِي سَعِيدِ بْنِ الْمُعَلَّى قَالَ كُنْتُ أُصَلِّي فِي الْمَسْجِدِ فَدَعَانِي رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمْ أُجِبْهُ فَقُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنِّي كُنْتُ أُصَلِّي فَقَالَ أَلَمْ يَقُلْ اللَّهُ اسْتَجِيبُوا لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ ثُمَّ قَالَ لِي لَأُعَلِّمَنَّكَ سُورَةً هِيَ أَعْظَمُ السُّوَرِ فِي الْقُرْآنِ قَبْلَ أَنْ تَخْرُجَ مِنْ الْمَسْجِدِ ثُمَّ أَخَذَ بِيَدِي فَلَمَّا أَرَادَ أَنْ يَخْرُجَ قُلْتُ لَهُ أَلَمْ تَقُلْ لَأُعَلِّمَنَّكَ سُورَةً هِيَ أَعْظَمُ سُورَةٍ فِي الْقُرْآنِ قَالَ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ هِيَ السَّبْعُ الْمَثَانِي وَالْقُرْآنُ الْعَظِيمُ الَّذِي أُوتِيتُهُ (بخاری:4474)

سورۃ فاتحہ کی تفسیر سورۃ فاتحہ کا بیان ہم سے مسدد بن مسرہد نے بیان کیا، کہا ہم سے یحییٰ بن سعید قطان نے بیان کیا، ان سے شعبہ نے بیان کیا کہ مجھ سے خبیب بن عبد الرحمن نے بیان کیا، ان سے حفص بن عاصم نے اور ان سے ابو

سعید بن معلی رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ میں مسجد میں نماز پڑھ رہا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اسی حالت میں بلایا، میں نے کوئی جواب نہیں دیا (پھر بعد میں، میں نے حاضر ہو کر) عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں نماز پڑھ رہا تھا۔ اس پر حضورا نے فرمایا، کیا اللہ تعالیٰ نے تم سے نہیں فرمایا ہے۔ ((استجیبوا للہ وللرسول اذا دعاکم)) (اللہ اور اس کے رسول جب تمہیں بلائیں تو ہاں میں جواب دو) پھر حضورا نے مجھ سے فرمایا کہ آج میں تمہیں مسجد سے نکلنے سے پہلے ایک ایسی سورت کی تعلیم دوں گا جو قرآن کی سب سے بڑی سورت ہے۔ پھر آپ نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور جب آپ باہر نکلنے لگے تو میں نے یاد دلایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے قرآن کی سب سے بڑی سورت بتانے کا وعدہ کیا تھا۔ آپ نے فرمایا ((الحمد للہ رب العالیمین)) یہی وہ سبع مثانی اور قرآن عظیم ہے جو مجھے عطا کیا گیا ہے۔

(۵) ام الکتاب

سنن دارمی کی مذکور الصدر حدیث میں اس سورت کو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے "ام الکتاب" فرمایا ہے اور "صحیح بخاری" میں ہے: حضرت ابو سعید خدری (رض) نے ایک شخص پر سورۃ فاتحہ پڑھ کر دم کیا جس کو بچھو نے کاٹا ہوا تھا اور کہا: میں نے صرف ام الکتاب پڑھ کر دم کیا ہے۔ (صحیح بخاری ج ۲ ص ۷۴۹، مطبوعہ نور محمد اصح المطابع، کراچی، ۱۳۸۱ھ)

(۶) الوافیہ

سفیان بن عینیہ نے اس کا نام سورۃ وافیہ رکھا، کیونکہ صرف اس سورت کو نماز میں آدھا آدھا کر کے نہیں پڑھا جا سکتا لیکن یہ توجیہ صحیح نہیں ہے کیونکہ سورۃ الکوثر کو بھی ایک رکعت میں آدھا آدھا کر کے نہیں پڑھا جا سکتا لہٰذا یوں کہنا چاہیے کہ اس سورت کے مضامین جامع اور وافی ہیں اس لیے اس کو وافیہ کہا جاتا ہے۔

(۷) الکافیہ

اس سورت کا کافیہ اس لیے کہتے ہیں کہ دوسری سورتوں کے بدلہ میں اس سورت کو پڑھا جاسکتا ہے اور اس سورت کے بدلہ میں کسی سورت کو نہیں پڑھا جاسکتا۔ حضرت عبادہ بن الصامت (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "ام القرآن "دوسری سورتوں کا عوض ہے اور دوسری کوئی سورت اس کا عوض نہیں۔
(تفسیر کبیر ج ۱ ص۔۹ الجامع الاحکام القرآن ج ۱ ص ۱۱۳)

(۸) الشفاء

حضرت عبد الملک بن عمیر (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: فاتحۃ الکتاب ' ہر بیماری کی شفاء ہے۔ (سنن دارمی ج ۲ ص ۳۲۰ 'مطبوعہ نشر السنۃ 'ملتان)
امراض جسمانی بھی ہیں اور روحانی بھی 'کیونکہ اللہ تعالیٰ نے منافقین کے متعلق فرمایا ہے: (آیت) "فی قلوبھم مرض "۔ (البقرہ: ۱۰) ان کے دلوں میں بیمار ہے 'اور اس سورت میں اصول اور فروع کا ذکر ہے 'جن کے تقاضوں پر عمل کرنے سے روحانی امراض میں شفاء حاصل ہوتی ہے اور اس سورت میں اللہ تعالیٰ کی ثناء اور اللہ تعالیٰ سے دعا ہے جس سے جسمانی اور دیگر ہر قسم کی بیماریوں سے شفاء حاصل ہوتی ہے۔
حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایہ: سورہ الفاتحہ ہر بیماری کی شفاء ہے۔ (رواہ بہقی فی شعب الایمان بسند صحیح، مظہری)
حَدَّثَنِي مُحَمَّدُ بْنُ الْمُثَنَّى، حَدَّثَنَا وَهْبٌ، حَدَّثَنَا هِشَامٌ، عَنْ مُحَمَّدٍ، عَنْ مَعْبَدٍ، عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ، قَالَ: كُنَّا فِي مَسِيرٍ لَنَا، فَنَزَلْنَا فَجَاءَتْ جَارِيَةٌ، فَقَالَتْ: إِنَّ سَيِّدَ الْحَيِّ سَلِيمٌ، وَإِنَّ نَفَرَنَا غَيْبٌ، فَهَلْ مِنْكُمْ رَاقٍ؟ فَقَامَ مَعَهَا رَجُلٌ مَا كُنَّا نَأْبُنُهُ بِرُقْيَةٍ فَرَقَاهُ فَبَرَأَ فَأَمَرَ لَهُ بِثَلَاثِينَ شَاةً وَسَقَانَا لَبَنًا، فَلَمَّا رَجَعَ، قُلْنَا لَهُ: أَكُنْتَ تُحْسِنُ رُقْيَةً، أَوْ كُنْتَ تَرْقِي؟ قَالَ: لَا مَا رَقَيْتُ إِلَّا بِأُمِّ الْكِتَابِ، قُلْنَا: لَا تُحْدِثُوا شَيْئًا حَتَّى نَأْتِيَ أَوْ نَسْأَلَ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَلَمَّا قَدِمْنَا الْمَدِينَةَ ذَكَرْنَاهُ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقَالَ: وَمَا كَانَ يُدْرِيهِ أَنَّهَا رُقْيَةٌ، اقْسِمُوا وَاضْرِبُوا لِي بِسَهْمٍ، وَقَالَ أَبُو مَعْمَرٍ: حَدَّثَنَا عَبْدُ الْوَارِثِ، حَدَّثَنَا هِشَامٌ، حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ سِيرِينَ، حَدَّثَنِي مَعْبَدُ بْنُ سِيرِينَ، عَنْ

أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ، بِهَذَا.(بخاری:5007)

مجھ سے محمد بن مثنیٰ نے بیان کیا، کہا ہم سے وہب بن جریر نے بیان کیا، کہا ہم سے ہشام بن حسان نے بیان کیا، ان سے محمد بن سیرین نے، ان سے معبد بن سیرین نے اور ان سے ابو سعید خدری (رض) نے بیان کیا کہ ہم ایک فوجی سفر میں تھے)رات میں (ہم نے ایک قبیلہ کے نزدیک پڑاؤ کیا۔ پھر ایک لونڈی آئی اور کہا کہ قبیلہ کے سردار کو بچھو نے کاٹ لیا ہے اور ہمارے قبیلے کے مرد موجود نہیں ہیں، کیا تم میں کوئی بچھو کا جھاڑ پھونک کرنے والا ہے؟ ایک صحابی)خود ابو سعید (اس کے ساتھ کھڑے ہو گئے، ہم کو معلوم تھا کہ وہ جھاڑ پھونک نہیں جانتے لیکن انہوں نے قبیلہ کے سردار کو جھاڑا تو اسے صحت ہو گئی۔ اس نے اس کے شکرانے میں تیس بکریاں دینے کا حکم دیا اور ہمیں دودھ پلایا۔ جب وہ جھاڑ پھونک کر کے واپس آئے تو ہم نے ان سے پوچھا کیا تم واقعی کوئی منتر جانتے ہو؟ انہوں نے کہا کہ نہیں میں نے تو صرف سورۃ فاتحہ پڑھ کر اس پر دم کر دیا تھا۔ ہم نے کہا کہ اچھا جب تک ہم رسول اللہ ﷺ سے اس کے متعلق نہ پوچھ لیں ان بکریوں کے بارے میں اپنی طرف سے کچھ نہ کہو۔ چنانچہ ہم نے مدینہ پہنچ کر نبی کریم ﷺ سے ذکر کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ انہوں نے کیسے جانا کہ سورۃ فاتحہ منتر بھی ہے۔)جاؤ یہ مال حلال ہے (اسے تقسیم کر لو اور اس میں میرا بھی حصہ لگانا۔ اور معمر نے بیان کیا ہم سے عبدالوارث بن سعید نے بیان کیا، کہا ہم سے ہشام بن حسان نے بیان کیا، کہا ہم سے محمد بن سیرین نے بیان کیا، کہا ہم سے معبد بن سیرین نے بیان کیا اور ان سے ابو سعید خدری (رض) نے یہی واقعہ بیان کیا۔ (صحیح بخاری، کتاب فضائل القرآن)

(۹) سورۃ الصلوۃ

نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اس سورت پر صلوۃ کا اطلاق کیا ہے ‘امام مسلم (رح) نے حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت کیا ہے: میں نے رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ نماز (سورۃ فاتحہ) کو میرے اور میرے بندہ کے درمیان آدھا ‘آدھا تقسیم کیا گیا ہے اور میرے بندہ کے لیے وہ ہے جس کا وہ سوال کرے ‘پس جب بندہ کہتا ہے: (آیت) ”الحمد للہ رب العلمین“۔ تو میں کہتا ہوں: بندہ نے میری حمد کی۔ (صحیح مسلم ج ا ص ۱۷۰۔ ۱۶۹ ‘مطبوعہ نور محمد اصح المطابع ‘کراچی ۱۳۷۵ ھ)

(۱۰) سورۃ الدعا

یہ سورت اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا سے شروع ہوتی ہے 'پھر بندہ کی عبادت کا ذکر ہے 'پھر اللہ تعالیٰ سے صراط مستقیم پر ثابت قدم رہنے کی دعا ہے اور دعا اور سوال کا یہی اسلوب ہے کہ پہلے داتا کی حمد و ثناء کی جائے 'پھر دست طلب بڑھایا جائے، حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کی ہے 'پھر اپنے لیے دعا کی ہے:

(آیت) "الذی خلقنی فھو یھدین والذی ھو یطعمنی ویسقین واذا مرضت فھو یشفین والذی یمیتنی ثم یحیین والذی اطمع ان یغفرلی خطیئتی یوم الدین رب ھب لی حکما والحقنی بالصلحین واجعل لی لسان صدق فیی الاخرین واجعلنی من ورثۃ جنۃ النعیم (الشعراء:۸۵۔۸۷)

ترجمہ (وہ جس نے مجھے پیدا کیا تو وہی مجھے ہدایت دیتا ہے اور وہی مجھے کھلاتا ہے اور وہی مجھے وفات دے گا اور پھر زندہ فرمائے گا اور اسی سے مجھے امید ہے کہ قیامت کے دن وہی میری (ظاہری یا اجتہادی) خطائیں معاف فرمائے گا اے میرے رب! مجھے حکم عطا فرما اور مجھے نیکوں کے ساتھ لاحق کردے اور میرے بعد آنے والی نسلوں میں میرا ذکر خیر جاری رکھ اور مجھے جنۃ النعیم کے وارثوں میں شامل کردے۔

حضرت یوسف (علیہ السلام) نے دعا کی

(آیت) "فاطر السموت والارض انت ولی فی الدنیا والاخرۃ توفنی مسلما والحقنی بالصلحین۔

(یوسف:۱۰۱)

ترجمہ: اے آسمانوں اور زمینوں کو ابتداء پیدا کرنے والے 'تو ہی دنیا اور آخرت میں میرا کارساز ہے 'میری وفات اسلام پر کر اور مجھے نیکوں کے ساتھ لاحق کردے سو دعا کا یہی طریقہ ہے کہ پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کی جائے، پھر اس سے سوال کی جائے 'اور سورۃ فاتحہ میں اسی طریقہ سے دعا کرنے کی تعلیم دی ہے 'اس لیے اس کو سورۃ دعا کہتے ہیں۔

(۱۱) نور

ایک نور ہے جو صرف خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا۔

حضرت ابن عباس رضي اللہ عنھما سے روایت ہے کہ فرمایا کہ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ جبریل علیہ السلام نبي صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے تھے، کہ اچانک آسمان کی طرف سے آواز سنی تو اپنا سر اٹھایا اور فرمایا کہ یہ آواز آسمان اس دروازہ کے کھلنے کی وجہ سے ہے جو کبھی نہیں کھلا، آج کھولا گیا ہے، تو اس دروازہ سے ایک فرشتہ نازل ہوا، تو جبریل علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ فرشتہ جو زمین کی طرف نازل ہوا پہلے کبھی نازل نہیں ہوا مگر آج ہی نازل ہوا ہے، فرشتہ نے سلام کیا اور فرمایا کہ خوشخبری ہو آپ کو دو نوروں کی جو آپ کو عطا کیے گئے آپ سے پہلے کسی نبی کو ایسے دو نور نہیں عطا کیئے گئے، سورۃ الفاتحہ اور سورۃ البقرۃ کی آخری آیات، آپ ان دونوں میں سے جس حرف کو پڑھیں گے (یا ان دونوں کو پڑہیں گے) وہ آپ کو عطا کیا جائے گا۔ (یعنی سورۃ الفاتحہ کا نور اور سورۃ البقرۃ کی آخری آیات کا نور) (رواہ مسلم فی صحیحہ)

(۱۲) عرش کا خزانہ

عرش کے نیچے ایک خزانے سے نازل ھوئی ہے

حضرت معقل بن یسار رضي اللہ عنہ سے روایت ہے فرمایا کہ نبي صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: فاتحۃ الکتاب مجھے عرش کے نیچے (ایک خزانے سے) دی گئ ہے، اور مفصل (سورتیں یعنی سورۃ الحجرات سے آخر قرآن تک، اصح قول کے مطابق) اس سے زائد ہیں۔

(المستدرک علی الصحیحین » کتاب فضائل القرآن)

(۱۳) حافظہ

سوائے موت کے ہر چیز سے حفاظت کرتی ہے

حضرت أنس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

إذا وضَعتَ جنبَكَ علَى الفِراشِ وقرأتَ فاتِحةَ الكتابِ و قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ فقد أمِنتَ من كلِّ شيءٍ إلاَّ الموتَ.

(أخرجه البزار:7393 والهيثمي في مجمع الزوائد:10/124)

ترجمہ: جب تو اپنا پہلو بستر پر رکھے، اور تو فاتحۃ الکتاب اور قل ھو اللہ أحد پڑھ لے، تو سوائے موت کے ہر چیز سے محفوظ ہو جائے گا۔

(۱۴) اساس

ایک شخص نے امام شعبی سے اپنے پہلو میں درد کی شکایت کی تو امام شعبی نے کہا: تو اساس القرآن، فاتحہ الکتاب پڑھ۔ میں نے حضرت ابن عباس کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ ہر چیز کے لیے ایک اساس (بنیاد) ہوتی ہے، دنیا کی اساس مکہ ہے، کیونکہ اس سے زمین پھیلائی اور آسمانوں کی اساس عریب ہے یہ ساتواں آسمان ہے، زمین کی اساس عجیب ہے، یہ نچلی ساتویں زمین ہے، جنتوں کی اساس جنت عدن ہے، یہ جنتوں کی ناف ہے اس پر جنت کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ آگ کی اساس جہنم ہے اور نیچے والا ساتواں طبقہ ہے اس پر درکات کی بنیاد رکھی گئی ہے، خلق کی اساس آدم ہیں اور انبیاء کی اساس نوح ہیں، بنی اسرائیل کی اساس یعقوب ہیں، کتب کی اساس قرآن ہے، قرآن کی اساس سورۃ فاتحہ ہے، سورۃ فاتحہ کی اساس بسملہ ہے جب تو بیمار ہو یا تجھے تکلیف ہو تو تجھے سورۃ فاتحہ پڑھنی چاہیے، تجھے شفا ہو گی۔ (قرطبی)

اسماء میں نظم اور ربط

علامہ بقاعی نے ان اسماء کے علاوہ سورۃ فاتحہ کے اسماء میں اساس 'کنز 'واقعہ 'رقیہ 'اور شکر کا بھی ذکر ہے۔ علامہ بقاعی نے ان اسماء میں نظم اور ربط کو بیان کیا ہے 'وہ لکھتے ہیں

(۱) فاتحہ کے اعتبار سے ہر نیک چیز کا افتتاح اس سورت سے ہونا چاہیے۔

(۲) اور ام کے لحاظ سے یہ ہر خیر کی اصل ہے۔

(۳)اور ہر نیکی کی اساس ہے۔

(۴)اور مثنی کے لحاظ سے دوبار پڑھے بغیر یہ لائق شمار نہیں۔

(۵)اور کنز کی حیثیت سے یہ ہر چیز کا خزانہ ہے۔

(۶)ہر بیماری کے لیے شفا ہے۔

(۷)ہر مہم کے لیے کافی ہے۔

(۸)ہر مقصود کے لیے دافی ہے۔

(۹)واقیہ کے لحاظ سے ہر برائی سے بچانے والی ہے۔

(۱۰)رقیہ کے اعتبار سے۔

(۱۱)ہر آفت ناگہانی کے لیے دم ہے۔

(۱۲)اس میں حمد کا اثبات ہے صفات کمال کا احاطہ ہے۔

(۱۳)اور شکر کا بیان ہے جو منعم کی تعظیم ہے۔

(۱۴)اور یہ بعینہ دعا ہے 'جو مطلوب کی طرف توجہ ہے 'ان تمام امور کی جامع صلوۃ ہے۔(نظم الدررج اص ۲۰۔ ۱۹ 'مطبوعہ دارالکتاب الاسلامی 'قاہرہ '۱۴۱۳ھ)

علامہ آلوسی نے سورۃ فاتحہ کے بائیس اسماء کا ذکر کیا ہے 'ان میں فاتحہ القرآن 'تعلیم القرآن 'تعلیم المسئلہ 'سورۃ السوال 'سورۃ المناجاۃ 'سورۃ التفویض شافعیہ 'اور سورۃ النور بھی ہیں۔

سورۃ فاتحہ کے فضائل

احادیث میں اس سورت کے بہت سے فضائل بیان کئے گئے ہیں، ان میں سے 4 فضائل درج ذیل ہیں۔

نماز پڑھ رہے ہو حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم بلائیں تو

حضرت ابو سعید بن مُعلّٰی (رض) فرماتے ہیں، میں نماز پڑھ رہا تھا تو مجھے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بلایا لیکن میں نے جواب نہ دیا۔ (جب نماز سے فارغ ہو کر بارگاہ رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں حاضر ہوا تو) میں نے عرض کی: "یارسول اللہ !(صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، میں نماز پڑھ رہا تھا۔ تاجدار رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: "کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا: "اسۡتَجِیۡبُوۡا لِلّٰہِ وَلِلرَّسُوۡلِ اِذَا دَعَاکُمۡ " اللہ اور اس کے رسول کی بارگاہ میں حاضر ہو جاؤ جب وہ تمہیں بلائیں۔ (انفال:۲۴) پھر ارشاد فرمایا: "کیا میں تمہیں تمہارے مسجد سے نکلنے سے پہلے قرآن کریم کی سب سے عظیم سورت نہ سکھاؤں؟ پھر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے میرا ہاتھ پکڑ لیا، جب ہم نے نکلنے کا ارادہ کیا تو میں نے عرض کی: یارسول اللہ !(صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، آپ نے فرمایا تھا کہ میں ضرور تمہیں قرآن مجید کی سب سے عظمت والی سورت سکھاؤں گا۔ ارشاد فرمایا: "وہ سورت "اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ " ہے، یہی "سبع مثانی "اور "قرآن عظیم "ہے جو مجھے عطا فرمائی گئی۔

(بخاری، کتاب فضائل القراٰن، باب فاتحۃ الکتاب، ۳/ ۴۰۴، الحدیث:۵۰۰۶)

دو نور

حضرت عبد اللہ بن عباس (رض) فرماتے ہیں: ایک فرشتہ آسمان سے نازل ہوا اور اس نے سید المرسلین (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بارگاہ میں سلام پیش کرکے عرض کی: یارسول اللہ !(صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، آپ کو ان دو نوروں کی بشارت ہو جو آپ کے علاوہ اور کسی نبی کو عطا نہیں کئے گئے اور وہ دو نور یہ ہیں:

(۱) "سورۃ فاتحہ "(۲) "سورۃ بقرہ "کی آخری آیتیں۔ (مسلم، کتاب صلوۃ المسافرین وقصرہا، باب فضل الفاتحۃ۔۔ الخ، ص ۴۰۴، الحدیث:۲۵۴(۸۰۶))

بے مثل سورۃ

حضرت ابی بن کعب (رض) سے روایت ہے، حضور پر نور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے توراۃ اور انجیل میں "اُمُّ القُرآنْ" کی مثل کوئی سورت نازل نہیں فرمائی۔ "

(ترمذی، کتاب التفسیر، باب ومن سورۃ (الحجر)، ۵/ ۸۷، الحدیث: ۳۱۳۶)

(4)۔۔ حضرت عبد الملک بن عُمَیر (رض) سے روایت ہے، نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: " سورۃ فاتحہ ہر مرض کے لیے شفاء ہے۔"

(شعب الایمان، التاسع عشر من شعب الایمان۔۔ الخ، فصل فی فضائل السور والآیات، ۲/ ۴۵۰، الحدیث: ۲۳۷۰) (صراط)

بچھو کا علاج

حضرت ابو سعید خدری (رض) بیان کرتے ہیں کہ ہم ایک سفر میں تھے 'ہم نے ایک جگہ قیام کیا 'ایک لڑکی نے آکر کہا کہ قبیلہ کے سردار کو ایک بچھو نے ڈس لیا ہے اور ہمارے لوگ حاضر نہیں ہیں 'کیا تم میں سے کوئی شخص دم کر سکتا ہے ؟ ہم میں سے ایک شخص اس کے ساتھ گیا جس کو اس سے پہلے ہم دم کرنے کی تہمت نہیں لگاتے تھے 'اس نے اس شخص پر دم کیا جس سے وہ تندرست ہو گیا 'اور اس سردار نے اس کو تیس بکریاں دینے کا حکم دیا 'اور ہم کو دودھ پلایا 'جب وہ واپس آیا تو ہم نے اس سے پوچھا: کیا تم پہلے دم کرتے تھے ؟ اس نے کہا: نہیں 'میں نے تو صرف ام الکتاب (سورۃ فاتحہ) پڑھ کر دم کیا ہے 'ہم نے کہا: اب اس کے متعلق کوئی بحث نہ کرو 'حتی کہ ہم نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہو کر اس کے متعلق پوچھ لیں 'ہم مدینہ پہنچے تو ہم نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے اس کے متعلق پوچھا 'نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اس کو کیا معلوم کہ یہ دم ہے '(ان بکریوں کو) تقسیم کرو 'اور ان میں سے میرا حصہ بھی نکالو۔ (صحیح بخاری ج ۲ ص ۷۴۹ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع ' کراچی '۱۳۸۱ھ)

سورہ شفاء

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ سورۃ فاتحہ پڑھ شخص پر دم کرنا جائز ہے 'اس لیے سورت کو "سورۃ الرقیہ "اور "سورۃ الشفاء "بھی کہتے ہیں 'اور اس حدیث میں یہ تصریح بھی ہے کہ اس سورت کو "ام الکتاب "بھی کہتے ہیں 'اور یہ کہ قرآن پڑھ کر دم کرنے کی اجرت لینا جائز ہے اور اس قرآن مجید اور کتب دینیہ پر اجرت لینے کا بھی جواز ہے 'اور اس میں مصحف کو قیمۃ فروخت کرنے اور مصحف کی کتابت پر اجرت لینے کا بھی جواز ہے اور یہ کہ استاد کی تعلیم سے تلمیذ کو جو آمدنی ہو اس میں استاذ کا بھی حصہ ہوتا ہے۔ اگر یہ سوال کیا جائے کہ اب کسی بیمار کو سورۃ فاتحہ پڑھ کر دم کیا جائے اور وہ شفاء نہ پائے تو اس کی کیا وجہ ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ دم کرنے والے میں روحانیت کی کمی ہے 'سورۃ فاتحہ کے شفاء ہونے میں کوئی کمی نہیں ہے۔

سورہ مبارکہ کی اللہ اور بندے کے درمیان نسبت

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے فرمایا، میرے اور میرے بندے کے درمیان صلوۃ (سورۃ فاتحہ) کو آدھا آدھا تقسیم کر دیا گیا ہے 'اور میرے بندہ کے لیے وہ چیز ہے جس کا وہ سوال کرے 'اور جب بندہ کہتا ہے '(آیت) "الحمد للہ رب العالمین"۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، میرے بندہ نے میری حمد کی 'اور جب وہ کہتا ہے: "الرحمن الرحیم "تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندہ نے میری ثناء کی 'اور جب وہ کہتا ہے، (آیت)"۔مالك یوم الدین "تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے 'میرے بندہ نے میری تعظیم کی، اور ایک بار فرمایا، میرے بندہ نے (خود) کو میرے سپرد کر دیا 'اور جب وہ کہتا ہے (آیت)"۔ ایاک نعبد وایاک نستعین"۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، یہ میرے اور میرے بندہ کے درمیان ہے 'اور میرے بندہ کے لیے وہ ہے جس کا وہ سوال کرے، اور جب وہ کہتا ہے: (آیت)"۔ اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم ولا الضالین"۔ تو اللہ تعالیٰ فرمایا ہے، یہ میرے بندہ کے لیے ہے اور میرے بندہ کے لیے وہ چیز ہے جس کا وہ سوال کرے۔

(صحیح مسلم ج ا ص ۱۷۰۔۱۶۹ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع 'کراچی '۱۳۷۵ھ)

اس حدیث میں سورۃ فاتحہ کا ذکر ہے اور اس کے شروع میں "بسم اللہ الرحمن الرحیم" کا ذکر نہیں ہے ' اس سے علماء احناف اور مالکیہ نے یہ استدلال کیا ہے کہ "بسم اللہ الرحمن الرحیم" سورۃ فاتحہ کا جز نہیں ہے اور یہ ان کی بہت قوی دلیل ہے 'فقہاء شافعیہ نے اس کے جواب میں جو تاویلات کی ہیں وہ بہت ضعیف ہیں 'ہم نے "شرح صحیح مسلم" جلد اول میں ان کا ذکر کر کے ان کا رد کیا ہے۔

آسمان سے چر چراہٹ کی آواز

حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ جس وقت جبرائیل (علیہ السلام) نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس بیٹھے ہوئے تھے تو انھوں نے اوپر کی جانب سے ایک چر چراہٹ کی آواز سنی 'حضرت جبرائیل نے کہا: یہ آسمان کا ایک دروازہ ہے جو آج کھولا گیا ہے اور آج سے پہلے کبھی نہیں کھولا گیا۔ اس دروازہ سے ایک فرشتہ نازل ہوا 'حضرت جبرائیل (علیہ السلام) نے کہا: یہ فرشتہ جو زمین کی طرف نازل ہوا ہے یہ آج سے پہلے کبھی نازل نہیں ہوا تھا 'اس فرشتہ نے آکر سلام کیا اور کہا: آپ کو دو نوروں کی بشارت ہو جو آپ کو دیئے گئے ہیں اور آپ ﷺ سے پہلے کسی نبی کو نہیں دیئے گئے (ایک نور) فاتحۃ الکتاب ہے اور (دوسرا) سورۃ بقرہ کی آخری آیتیں ہیں 'ان میں سے جس حرف کو بھی آپ پڑھیں گے وہ آپکو دے دیا جائے گا۔ (سنن نسائی ج ۵ ص ۱۳۔ ۱۲ 'مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب ' کراچی)

ہر بیماری کی شفاء

عبدالملک بن عمیر (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: فاتحۃ الکتاب سے ہر بیماری کی شفاء ہے۔ (سنن دارمی ج ۲ ص ۳۲۰ 'مطبوعہ نشر السنۃ 'ملتان)

حضرت ابوزید (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ مدینہ کے کسی راستہ میں جارہا تھا 'آپ ﷺ نے ایک شخص کی آواز سنی جو تہجد کی نماز میں ام القرآن (سورۃ فاتحہ) پڑھ رہا تھا 'نبی کریم (صلی

اللہ علیہ وآلہ وسلم) کھڑے ہو کر اس سورت کو سنتے رہے حتیٰ کہ اس نے وہ سورت ختم کر لی، آپ ﷺ نے فرمایا: قرآن میں اس کی مثل (اور کوئی سورت) نہیں ہے 'امام طبرانی (رح) نے اس حدیث کو "معجم اوسط "میں روایت کیا ہے 'اس کی سند میں ایک راوی حسن بن دینار ضعیف ہے۔ (مجمع الزوائد ج ٦ ص ٣١٠ 'مطبوعہ دارالکتاب العربی ' بیروت '١٤٠٢ ھ)

ابلیس کا رونا

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ جس دن فاتحۃ الکتاب (سورۃ فاتحہ) نازل ہوئی اس دن ابلیس بہت رویا تھا اور یہ سورت مدینہ میں نازل ہوئی تھی اس حدیث کو امام طبرانی (رح) نے "معجم اوسط "میں روایت کیا ہے اور اس کی سند صحیح ہے (مجمع الزوائد ج ٦ ص ٣١١ 'مطبوعہ دارالکتاب العربی 'بیروت '١٤٠٢ ھ) (تبیان)

سورۃ فاتحہ کے مضامین

اس سورت میں یہ مضامین بیان کئے گئے ہیں:

(1)۔۔ اس سورت میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کا بیان ہے۔

(2)۔۔ اللہ تعالیٰ کے رب ہونے، اس کے رحمن اور رحیم ہونے، نیز مخلوق کے مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کئے جانے اور قیامت کے دن ان کے اعمال کی جزاء ملنے کا ذکر ہے۔

(3)۔۔ صرف اللہ تعالیٰ کے عبادت کا مستحق ہونے اور اس کے حقیقی مددگار ہونے کا تذکرہ ہے۔

(4)۔۔ دعا کے آداب کا بیان اور اللہ تعالیٰ سے دین حق اور صراط مستقیم کی طرف ہدایت ملنے، نیک لوگوں کے حال سے موافقت اور گمراہوں سے اجتناب کی دعا مانگنے کی تعلیم ہے۔

یہ چند وہ چیزیں بیان کی ہیں جن کا "سورۂ فاتحہ "میں تفصیلی ذکر ہے البتہ اجمالی طور پر اس سورت میں بیشمار چیزوں کا بیان ہے۔ امیر المومنین حضرت علی المرتضیٰ (رض) فرماتے ہیں: "اگر میں چاہوں تو "سورۃ فاتحہ "کی تفسیر سے ستر اونٹ بھروادوں۔ (الاتقان فی علوم القرآن، النوع الثامن والسبعون۔۔ الخ، ٢ / ٥٦٣) (صراط)

قرآن مجید کے حسب ذیل مضامین ہیں:

توحید

نزول قرآن کے وقت دنیا میں بالعموم بت پرستی کا دور دورہ تھا 'اور کفار عرب کے دعوی دار ہونے کے باوجود اپنے زعم میں اللہ کا تقرب حاصل کرنے کے لیے بتوں کی عبادت کرتے تھے 'اس لیے قرآن کا مطالبہ یہ ہے کہ صرف خالق اور رب ہونے کی حیثیت سے اللہ تعالیٰ کو واحد ماننا کافی نہیں ہے بلکہ استحقاق عبادت کے اعتبار سے بھی اس کو واحد ماننا ضروری ہے 'یعنی اس کے سوا اور کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے۔

نبوت

عام انسان کی عقل اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی وحدانیت کو جاننے کے لیے ناکافی ہے اور اللہ تعالیٰ کے احکام حاصل کرنے سے عاجز ہے 'اس لیے اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی رہ نمائی کے لیے انبیاء (علیہ السلام) کو مبعوث فرمایا اور نبی چونکہ اللہ کا نمائندہ ہوتا ہے 'اس کو ماننا اللہ کو ماننا اور اس کا انکار کرنا اللہ کا انکار کرنا ہوتا ہے 'اس لیے قرآن نے نبی کے ماننے کو ضروری قرار دیا ہے۔

عبادت

بدن 'مال اور ان دونوں کو اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق صرف کرنا عبادت ہے 'قرآن نے یہ بتایا ہے کہ انسان خود اور اس کا مال اس کی ملکیت نہیں ہے 'اللہ کی ملکیت ہے 'اب وہ کسی طرح اپنی جان اور مال کو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق صرف کرے، یہ قرآن نے تفصیل سے بتایا ہے۔

وعدہ کیا ہے اور بندہ کی نافرمانی کرنے اللہ تعالیٰ نے اس کو عذاب سے ڈرایا ہے 'اس وعد اور وعید کو اللہ تعالیٰ نے تفصیل سے قرآن مجید میں بیان فرمایا ہے۔

قصص اور امثال

گزشتہ امتوں کے صالحین کے واقعات اور نافرمانوں پر عذاب کی عبرت انگیز مثالیں۔

معاد

مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیے جانے اور مومنین کے لیے جزاء اور کفار کے لیے سزا کا بیان۔

دعا

تمام عبادات کا خلاصہ اور حاصل اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ دنیا میں انسان کو ہدایت عطا فرمائے اور اس پر تاحیات برقرار رکھے اور آخرت میں عذاب سے نجات ' جنت نعیم ' اپنی خوشنودی ' رضا اور دیدار عطا فرمائے، سورۃ فاتحہ میں ان تمام مضامین کو اجمال ' اختصار اور اشارات سے بیان کر دیا گیا ہے۔

حمد کا مستحق صرف اللہ تعالیٰ

سورۃ فاتحہ کے شروع میں فرمایا: (آیت) "الحمد للہ رب العلمین"۔ تمام تعریفیں اللہ ہی کے لائق ہیں جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے "یعنی حمد کا مستحق صرف اللہ تعالیٰ ہے ' کیونکہ ' زمین ' پہاڑ ' سمندر ' جمادات ' نباتات ' حیوانات ' انسان اور جن یہ سب اپنے وجود میں کسی موجد کے اور اپنی بقا میں کسی رب کے محتاج ہیں ' اور یہ سب ممکنات ہیں ' اس لیے ان کو پیدا کرنے والا اور ان کو باقی رکھنے والا ممکن نہیں ہو سکتا کیونکہ ممکن تو پھر انہی کی طرح اپنے وجود اور بقاء میں محتاج ہو گا ' اس لیے ضروری ہے کہ ان کا موجد اور ان کا رب واجب بالذات ہو ' اس کا کائنات رنگ و بو میں جو حسن اور کمال ہے وہ اسی کا دیا ہوا ہے ' اور حمد ' حسن اور کمال پر ہوتی ہے تو تمام محامد کا وہی مستحق ہے اور تمام تعریفیں اسی کے لائق ہیں ' اس آیت میں جہاں یہ بتایا ہے کہ تعریف کا مستحق صاحب کمال نہیں ہے خالق

کمال ہے 'وہاں یہ بھی بتادیا ہے کہ تمام کائنات کا خالق اور مربی اللہ تعالیٰ ہے اور یہ قرآن کا وہ پہلا مضمون ہے جس کا ہم نے ذکر کیا ہے۔

انعام یافتہ لوگ

سورۃ فاتحہ کی چھٹی آیت میں ہے:(آیت)"۔صراط الذین انعمت علیھم "۔ان لوگوں راستہ جن پر تونے انعام فرمایا:اور جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام کیا ان کا بیان اس آیت میں ہے:

(آیت) "انعم اللہ علیھم من النبیین والصدیقین والشھدآء والصلحین"۔(النساء۶۹)جن پر اللہ نے انعام کیا وہ انبیاء 'صدیقین 'شہداء اور صالحین ہیں۔

نیز فرمایا:

(آیت)اولٓئك الذین انعم اللہ علیھم من النبیین من ذریۃ ادم ،(مریم:۵۸)

جن پر اللہ نے انعام کیا وہ نسل آدم سے انبیاء ہیں۔

قرآن مجید کا دوسرا اہم مضمون نبوت ہے اور اس کی طرف اشارہ(آیت) "صراط الذین انعمت علیہم "میں ہے۔

عبادت صرف اللہ جل شانہ کی

قرآن مجید کا تیسرا اہم مضمون عبادت ہے 'اور اس کا ذکر(آیت) "ایاک نعبد "ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں " میں ہے۔

(۴)وعد اور وعید کی طرف اشارہ(آیت) "ملک یوم الدین "میں ہے۔

(۵) گزشتہ امتوں کے واقعات اور مثالیں 'نیکوں پر انعام اور بدکاروں پر غضب اور عذاب 'اس کی طرف اشارہ چھٹی اور ساتویں(آیت) "صراط الذین انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم ولا الضالین "میں ہے۔

(٦) مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیے جانے اور مومنین کے لیے جزاء اور کفار کے لیے سزا کی طرف اشارہ بھی (آیت) مالک یوم الدین "میں ہے۔

(٧) قرآن مجید کا بہت اہم مضمون اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا ہے اور اس سورت میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے کس طرح دعا کی جائے 'اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء کی جائے، جس کا ذکر (آیت) "الحمد للہ رب العلمین الرحمن الرحیم "میں ہے پھر خضوع اور خشوع کا اظہار کیا جائے جس کا ذکر (آیت) "ایاک نعبد وایاک نستعین "میں ہے 'پھر اپنے عجز اور احتیاج کو بیان کیا جائے جس کا بیان (آیت)"۔ایاک نعبد وایاک نستعین "میں ہے 'پھر حرف مدعا زبان پر لایا جائے اور اس سے مانگا جائے 'نیز یہ بھی بتایا کہ اللہ تعالیٰ سے کیا مانگا جائے اور کیا نہ مانگا جائے تو بتلایا اس سے صراط مستقیم پر برقرار رہنے کی ہدایت مانگو 'وہ راستہ جو اللہ تعالیٰ کے انعام یافتگان کا راستہ ہے نہ ان کا راستہ جن پر اللہ تعالیٰ نے غضب فرمایا اور نہ گمراہوں کا 'پھر جیسے ہی ہدایت کی دعا ختم ہوتی ہے تو اس کے جواب میں فوراہدایت آجاتی ہے۔(آیت) "الم ذلك الكتاب لا ريب فيه هدى للمتقين "یعنی تم نے ہم سے ہدایت مانگی تھی تو یہ پوری کتاب تمہارے لیے ہدایت ہے اور اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اگر تم اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے طریقہ سے دعا کرو گے تو اس دعا کی استجابت یقینی ہے۔

اسلامی عقائد کے اصول

اس سورت میں اسلامی عقائد کے بلند اصول 'اسلامی تصور حیات کے کلیات ومبادی اور انسانی شعور اور انسانی دلچسپیوں کے لیے نہایت ہی اہم اصولی ہدایات بیان کی گئی ہیں 'اور یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نماز کی ہر رکعت میں اس سورت کا پڑھنا ضروری قرار دیا ہے 'اور جس نماز میں اس سورت کی تلاوت نہ ہو اسے فاسد قرار دیا گیا ہے۔(ظلال)

خلاصہ اسماء

جناب سید محمد مدنی اشرفی جیلانی صاحب نے اس سورہ کے درج ذیل اسماء تفسیر اشرفی میں یوں بیان کئے ہیں:

اس کا نام سورۃ فاتحہ ہے۔۔ کہ ایک روایت میں وحی کا سلسلہ اسی سے شروع ہوا ہے۔
دوسرا نام: فاتحۃ ال کتاب ہے۔۔ کیونکہ قرآن کریم اسی سے شروع کیا گیا ہے۔
تیسرا نام: سورۃ کافیہ ہے۔۔ کیونکہ سارے قرآن کے مضامین کی بنیاد اس میں لکھی گئی ہے۔
چوتھا نام: سورۃ کنز ہے۔۔ کیونکہ سارے قرآن کی دولت کا خزانہ یہی ہے۔
پانچواں نام: سورۃ کافیہ ہے۔۔ یعنی نماز میں دوسری سورتوں کے بدلے میں اس کو پڑھنا کافی ہے لیکن اس کے بدلے میں کسی سورۃ کو نہیں پڑھا جا سکتا۔
چھٹا نام: سورۃ وافیہ ہے۔۔ کہ جب یہ سورۃ نماز میں پڑھی جائے گی تو پوری پڑھی جائے گی 'صرف دو تین آیتوں پر اکتفا نہ کیا جائے گا۔
ساتواں نام: سورۃ شافیہ ہے۔۔ کہ اس کو پڑھ کر دم کرنے سے بیماریاں دور ہوتی ہیں۔
آٹھواں نام: سورۃ شفا ہے۔۔ وجہ یہ ہے کہ اس سے شفا ملتی ہے۔
نواں نام: سبع مثانی ہے۔۔ کیونکہ سات آیتیں ہیں اور نماز کی ہر رکعت میں ان کی تکرار ہوتی رہتی ہے۔
دسواں نام: سورۃ نور ہے۔۔ کہ اس کے سارے مضامین نور ہی نور ہیں۔
گیارھواں نام: سورۃ رقیہ ہے۔۔ کیونکہ زہر کے اتارنے میں یہ سورۃ کریمہ منتر کا کام کرتی ہے۔
بارہواں نام: سورۃ دعا ہے۔۔ کیونکہ اس میں بہترین دعا سکھائی گئی ہے۔
چودھواں نام: سورۃ تعلیم المسئلہ ہے۔۔ کیونکہ بیشمار مسائل عقائد و اعمال کے اس میں موجود ہیں۔ اور تمامی مسائل کی اس میں بنیاد رکھی گئی ہے۔
پندرہواں نام: سورۃ مناجات ہے۔۔ کیونکہ اس سورۃ کریمہ کا سارا مضمون بندے کی اپنے رب سے مناجات ہے۔
سولھواں نام: سورۃ تفویض ہے۔۔ کیونکہ اس سورۃ کریمہ میں بندہ اپنے بالکل اپنے رب کے سپرد کر دیتا ہے۔
سترھواں نام: سورۃ سوال ہے۔۔ کیونکہ بندہ اس سورۃ شریفہ کی تلاوت کے وقت پورا سائل ہو جاتا ہے۔
اٹھارھواں نام: ام ال کتاب ہے۔۔ کیونکہ ہر آسمانی کتابوں کا جوہر اس میں ہے۔

انیسواں نام: فاتحۃ القرآن ہے۔۔ کیونکہ قرآن کی ابتداء اسی سے ہے۔ یہ نام اور دوسرا نام فاتحۃ ال کتاب ایک ہی وجہ سے ہے۔

بیسواں نام: سورۃ صلوٰۃ ہے۔۔ کیونکہ نماز اس کے بغیر نہیں ہوتی ہے۔

سورۃ فاتحہ سے متعلق شرعی مسائل

(1)۔۔ نماز میں "سورۃ فاتحہ " پڑھنا واجب ہے، امام اور تنہا نماز پڑھنے والا اپنی زبان سے "سورۃ فاتحہ " پڑھے گا جبکہ مقتدی امام کے پیچھے خاموش رہے گا اور جہری نماز میں اس کی قراءت بھی سنے گا اور اس کا یہی عمل پڑھنے کے حکم میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں تلاوت کے وقت مقتدی کو خاموش رہنے اور قراءت سننے کا حکم دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

"وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ﴿۲۰۴﴾ "(اعراف:۲۰۴)

ترجمہ کنزالعرفان: اور جب قرآن پڑھا جائے تو اسے غور سے سنو اور خاموش رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔

اور حضرت ابو موسیٰ اشعری (رض) سے روایت ہے، حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: "جب امام قراءت کرے تو تم خاموش رہو۔ (ابن ماجہ، کتاب الصلاۃ، باب اذا قرء الامام فانصتوا، ۱/ ۴۶۲، الحدیث: ۸۴۷)

حضرت جابر بن عبد اللہ (رض) سے روایت ہے، نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: "جس شخص کا کوئی امام ہو تو امام کا پڑھنا ہی مقتدی کا پڑھنا ہے۔

(ابن ماجہ، کتاب الصلاۃ، باب اذا قرء الامام فانصتوا، ۱/ ۴۶۴، الحدیث: ۸۵۰)

ان کے علاوہ اور بہت سی احادیث میں امام کے پیچھے مقتدی کے خاموش رہنے کے بارے میں بیان کیا گیا ہے۔

امامِ اعظم (رض) کا مناظرہ

امام فخر الدین رازی (رح) فرماتے ہیں: "مدینہ منورہ کے چند علماء امام ابو حنیفہ (رض) کے پاس اس غرض سے آئے کہ وہ امام کے پیچھے مقتدی کی قراءت کرنے کے معاملے میں ان سے مناظرہ کریں۔ امام ابو حنیفہ (رض) نے ان سے

فرمایا: سب سے مناظرہ کرنا میرے لیے ممکن نہیں، آپ ایسا کریں کہ مناظرے کا معاملہ اس کے سپرد کر دیں جو آپ سب سے زیادہ علم والا ہے تا کہ میں اس کے ساتھ مناظرہ کروں۔ انھوں نے ایک عالم کی طرف اشارہ کیا تو امام ابو حنیفہ (رض) نے فرمایا: کیا یہ تم سب سے زیادہ علم والا ہے؟ انھوں نے جواب دیا:

" ہاں۔ " امام ابو حنیفہ (رض) نے فرمایا: کیا میرا اس کے ساتھ مناظرہ کرنا تم سب کے ساتھ مناظرہ کرنے کی طرح ہے؟ انھوں نے کہا: "ہاں۔ " امام ابو حنیفہ (رض) نے فرمایا: اس کے خلاف جو دلیل قائم ہو گی وہ گویا کہ تمہارے خلاف قائم ہو گی؟ انھوں نے جواب دیا: "ہاں۔ " امام ابو حنیفہ (رض) نے فرمایا: اگر میں اس کے ساتھ مناظرہ کروں اور دلیل میں اس پر غالب آ جاؤں تو وہ دلیل تم پر بھی لازم ہو گی؟ انھوں نے کہا: "ہاں۔ " امام ابو حنیفہ (رض) نے دریافت کیا: وہ دلیل تم پر کیسے لازم ہو گی؟ انھوں نے جواب دیا: "اس لیے کہ ہم اسے اپنا امام بنانے پر راضی ہیں تو اس کی بات ہماری بات ہو گی۔ " امام ابو حنیفہ (رض) نے فرمایا: ہم بھی تو یہی کہتے ہیں کہ جب ہم نے ایک شخص کو نماز میں اپنا امام مان لیا تو اس کا قراءت کرنا ہمارا قراءت کرنا ہے اور وہ ہماری طرف سے نائب ہے۔ امام ابو حنیفہ (رض) کی یہ بات سن کر سب نے اقرار کر لیا (کہ امام کے پیچھے مقتدی قراءت نہیں کرے گا)

(تفسیر کبیر، البقرۃ، تحت الآیۃ: ۱۳۰، ۱/ ۴۱۲)

(2)۔۔ "نماز جنازہ "میں خاص دعا یاد نہ ہو تو دعا کی نیت سے "سورۃ فاتحہ "پڑھنا جائز ہے جبکہ قراءت کی نیت سے پڑھنا جائز نہیں۔

(عالمگیری، کتاب الصلاۃ، الباب الحادی والعشرون، الفصل الخامس، ۱/ ۱۶۴)

تعوذ

کو استعاذہ بھی کہا جاتا ہے۔

اعوذ باللّٰہِ من الشیطٰنِ الرجیم ط

قولہ اعوذ: استعاذہ۔ پناہ طلب کرنے کو کہا جاتا ہے۔

اب تعوذ کی تفسیر اس طرح ہو گی میں اللہ تعالیٰ کی اس کی تمام مخلوقات میں سب سے خصوصاً شیطان سے پناہ طلب کرتا ہوں کہ وہ مجھے میرے دین میں نقصان پہنچائے یا وہ مجھے میرے رب کے حق لازم سے مجھے روکے۔

الشیطٰن

(شیطن): یہ شطن سے بنا ہے، اس کے لفظی معنی دوری کے ہیں، شیطان مردود ہر بھلائی سے دور ہے اس لیے اس کو شیطان کہتے ہیں، سرکش اور شریر کو بھی شیطان کہتے ہیں۔

اہل عرب کے ہاں شیطان کا لفظ ہر سرکش پر بولا جاتا ہے خواہ وہ جن ہو یا انسان یا حیوان یا اور کوئی شے۔ قرآن مجید میں اسی طرح فرمایا گیا ہے "و كذلك جعلنا لكل نبی عدوا شياطين الانس والجن "(الانعام۔١١)

اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لئے شیاطین جن وانس کو دشمن بنایا۔

تو اس آیت میں شیاطین انسانوں کی طرح شیاطین جن کو بھی پیغمبروں کے دشمن قرار دیا گیا ہے۔ حضرت عمر (رض) نے اس وقت فرمایا جب کہ آپ چھوٹے گھوڑے پر سوار ہوئے اور وہ کلیلیں کرنے لگا آپ اسے مارنے لگے مگر جوں جوں مارتے تھے اس کی اچھل کود بڑھتی جاتی تھی آپ اس سے نیچے اترے اور فرمایا کہ تم نے مجھے شیطان پر سوار کر دیا۔ میں اس سے تبھی اترا کہ میرے دل میں اس کے متعلق ناپسندیدگی آئی۔

یہ روایت یونس نے اپنی سند کے ساتھ اسلم نے حضرت عمر (رض) سے نقل کی ہے۔

ابن جریر عرض کرتا ہے کہ ہر چیز کے سرکش کو شیطان کہا جاتا ہے اس لئے کہ وہ اپنی جنس کے تمام افعال اور اخلاق حسنہ سے جدا اور بھلائی سے دور ہوتا ہے۔

بعض نے کہا کہ یہ "شطنت داری عن دارك "سے لیا گیا ہے اور اس سے مقصود دوری کا اظہار ہوتا ہے جیسا کہ نابغہ شاعر نے کہا:

نأت بسعاد عنك نوى شطون

فباتت والفوائد بها رهين

ترجمہ: سعاد تجھ سے دور علاقے کا قصد کر کے دور چلی گئی ہے اور اس نے رات اس حالت میں گزاری کہ دل اس کے ہاں رہن رکھا ہوا تھا۔

نوی: جانب مقصودہ۔ شطون۔ دور۔

اس لحاظ سے شیطان یہ فیعال کے وزن پر شطن سے ماخوذ ہے۔

اور امیہ بن ابی الصلت کا قول بھی اس کی دلیل ہے:

ایما شاطن عصاہ عکاہ

ثم یلقی فی السجن والا کیال

ترجمہ: جو سرکش اس کی نافرمانی کرے وہ اس کو باندھ دیتا ہے پھر اس کو قید میں پابند سلاسل کر دیتا ہے۔

تنقید: اگر یہ فعلان کا وزن "شاط یشیط" سے ہوتا تو شائط کہا جاتا لیکن شاعر نے شاطن کہا کیونکہ یہ شطن یشطن فھو شاطن سے ہے۔

الرجیم

یہ اگر فعیل کا وزن ہے اور مفعول ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے "کف خضیب و لحیۃ رھین و رجل لعین" اس سے مقصود رنگی ہوئی ہتھیلی اور تیل سے تر داڑھی اور ملعون آدمی ہے۔

"الرجیم" کا معنی ملعون و مردود ہے اور مردود جو بری بات اور گالم گلوچ والا ہو وہ ملعون ہے۔

دھتکارا ہوا، مردود، ملعون، یہ فعیل کے وزن پر معفول کے معنی میں ہے شیطان کو رجیم اس لیے کہتے کہ جب وہ چوری سے کان لگا کر فرشتوں کی باتیں سننا چاہتا ہے تو اس کو شہاب ثاقب سے رجم کیا (مارا) جاتا ہے، جیسا کہ ارشاد باری ہے (آیت) "من السترق السمع فاتبعہ شھاب مبین"۔ (حجر ۱۸)

مگر جو کوئی چوری سے (فرشتوں کی بات) سنکر بھاگے تو دہکتا ہوا انگارا اس کے پیچھے لگتا ہے۔

روایۃ ابن عباسؓ

سب سے اول جب جبرائیل (علیہ السلام) آپ کے ہاں آئے تو آپ کو استعاذہ سکھایا چنانچہ ابو کریب نے اپنی اسناد سے حضرت ابن عباس (رض) سے روایت کی ہے کہ سب سے اول جبرئیل (علیہ السلام) آپ کے ہاں تشریف لائے تو انہوں نے کہا کہ اے محمد ﷺ! تم کہو "استعیذ بالسمیع العلیم من الشیطان رجیم" پھر کہنے لگے کہو "بسم اللہ الرحمن الرحیم" پھر کہا "اقرأ باسم ربك الذی خلق" (العلق)

یہ پہلی سورۃ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے جبریل (علیہ السلام) کی زبان سے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر اتارا۔ پس اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو حکم فرمایا کہ مخلوق کی بجائے اللہ تعالیٰ ہی کی پناہ طلب کیا کرو۔ (طبری)

اللہ جل شانہ وتعالیٰ کا ارشاد ہے

(آیت) "ان الشیطن لکم عدو فاتخذوہ عدوا، انما یدعوا حزبہ لیکونوا من اصحب السعیر"۔ (فاطر ٦)

بلاشبہ شیطان تمہارا دشمن ہے، پس تم اس کو دشمن ہی سمجھتے رہو، بس وہ تو اپنے گروہ کو بلاتا ہے تاکہ وہ اہل دوزخ میں سے ہو جائیں۔

شیطان کو انسان کی تباہی وبربادی میں مزہ آتا ہے کیونکہ اس نے انسان کو بہکانے اور گمراہ کرنے کا حلف اٹھایا ہوا ہے۔

(آیت) "فبعزتك لاغوينهم اجمعين"۔ (ص ٨٢)

تیری عزت کی قسم میں ان سب (بنی آدم) کو ضرور گمراہ کروں گا،

قرآن کریم کی تلاوت سے پہلے تعوذ پڑھ لینے سے آدمی شیطان مردود کی زد سے نکل کر اللہ تعالیٰ کی پناہ اور حفاظت میں آجاتا ہے اور شیطانی وسوسے سے دور ہو جاتے ہیں، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

(آیت) "فاذا قرات القرآن فاستعذ باللہ"۔ (نحل ٩٨)

جب تم قرآن کی تلاوت کرو تو شیطان مردود کے شر سے بچنے کے لیے اللہ تعالیٰ سے پناہ طلب کر لیا کرو،

دوسری جگہ ارشاد ہے۔

(آیت) "واما ینزغنك من الشیطن نزغ فاستعذ باللّٰه "۔(اعراف ۲۰۰)

اور جب تمہیں کوئی شیطانی وسوسہ آجائے تو اللہ تعالیٰ سے پناہ طلب کرو۔ (احسن البیان)

الفاظ استعاذہ

اعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم: شیطان مردود سے میں اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتا ہوں۔

1۔صاحب کشاف نے 2/343 میں حضرت ابن مسعود (رض) سے روایت نقل کی ہے کہ میں نے جناب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سامنے اعوذ باللّٰہ السمیع العلیم من الشیطن الرجیم پڑھا تو آپ ﷺ نے مجھے فرمایا اے ابن ام عبد تم اس طرح پڑھو اعوذ باللّٰہ من الشیطن الرجیم۔ مجھے جبرائیل نے لوح محفوظ سے لکھ کر اسی طرح پڑھایا ہے۔

2۔امام احمد کے بیٹے عبداللہ نے اپنی اسناد کے ساتھ المسند 5/318 میں حضرت ابن مسعود (رض) سے روایت نقل کی ہے کہ جناب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس طرح فرماتے تھے اللھم انی اعوذبك من الشیطان من همزه و نفثه و نفخه۔ اے اللہ میں شیطان کی طرف سے جنون، نفث اور تکبر سے تیری پناہ میں آتا ہوں۔

(ھمز، طعنہ زنی، جھاڑ پھونک) (ابن مسعود)

تلاوت قرآن کا آغاز کیسے کریں؟

قرآن کی تلاوت شروع کرتے وقت اعوذ باللّٰہ من الشیطن الرجیم پڑھ لینا چاہیے جیسا کہ سورت نحل میں ہے فاذا قرأت القرآن فاستعذ باللّٰہ من الشیطن الرجیم اور ابو سعید الخدری سے ایک روایت میں ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نماز میں سورت فاتحہ تعوذ پڑھ لیا کرتے تھے (ابن کثیر۔ قرطبی)

اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں سے ایک مخلوق وہ بھی ہے جسے شیطان کہتے ہیں۔ وہ آگ سے پیدا کیا گیا ہے۔ جب فرشتوں اور آدم (علیہ السلام) میں مقابلہ ہوا۔ اور حضرت آدم اس امتحان میں کامیاب ہوگئے۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم

دیا کہ وہ سب کے سب آدم کے آگے جھک جائیں۔ چنانچہ ان سب نے انھیں سجدہ کیا۔ مگر شیطان نے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا۔ اس لئے کہ اس کے اندر تکبر کی بیماری تھی۔ جب اس سے جواب طلبی کی گئی۔ تو اس نے کہا مجھے آگ سے پیدا کیا گیا اور آدم کو مٹی سے۔ اس لئے میں اس سے بہتر ہوں۔ آگ مٹی کے آگے کیسے جھک سکتی ہے؟ شیطان کو اسی تکبر کی بنا پر ہمیشہ کے لئے مردود قرار دے دیا گیا اور قیامت تک کے لئے اس پر لعنت کی گئی۔

عرض کرنے لگا اے پروردگار مجھے ایک وقت معلوم تک مہلت دے یعنی قیامت تک زندگی دے پروردگار عالم نے مہلت دی۔ تو اس نے کہا مجھے تیری عزت کی قسم تیرے بندوں کو اغواء کروں گا اور ان کو سیدھی راہ سے بھٹکا دوں گا اور ان کی برائیوں کو ان کی نظروں میں اچھا کر کے دکھاؤں گا تو اللہ رب العزت نے فرمایا کہ میرے بندوں پر تیرا بس نہیں چلے گا۔ ملائکہ اور حضرت آدم (علیہم السلام) میں مقابلہ ہوا اور آدم (علیہ السلام) کامیاب ہو گئے اور فرشتوں پر فضیلت علمی ظاہر ہوئی اور فرشتوں نے بھی تسلیم کر لیا تو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو سجدہ کا حکم دیا تمام فرشتے سجدہ میں جھک گئے سوائے ابلیس کے جس نے نافرمانی کی اور تکبر کیا بس اس وجہ سے وہ کافروں میں سے ہو گیا تھا۔

اللہ تبارک و تعالیٰ نے شیطان سے کہا کہ تجھے کس چیز نے آدم کو سجدہ کرنے سے روکا تو کہنے لگا کہ کیا میں ایک بشر کو سجدہ کروں جس کو تو نے مٹی سے پیدا کیا ہے بجنی مٹی سے اور مجھے آگ سے اس لیے میں اس سے بہتر ہوں چنانچہ وہ ہمیشہ کے لیے مردود بارگاہ قرار دے دیا گیا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا کہ ہم اس کے حضور اس طرح عرض کریں کہ وہ اس مردود کے شر سے پناہ میں رکھے کیونکہ یہ کھلم کھلا گمراہ کرنے والا دشمن ہے۔

اب شیطان نے اپنی اس ذلت کا بدلہ لینے کی ٹھان لی۔ کسی نہ کسی طریقہ سے حضرت آدم (علیہ السلام) اور ان کی بیوی حوا کو جنت سے نکلوا دیا۔ اور اس نے اس بات کا اعلان کر دیا۔ کہ میں قیامت تک آدم کی اولاد کو صحیح راستے سے ہٹانے کی کوشش کرتا رہوں گا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ شیطان ہمارا مستقل دشمن ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا کہ اس طرح اللہ کے حضور میں دعا کریں۔ "اے میرے رب میں آپ کی پناہ مانگتا ہوں شیطان کے وسوسوں سے۔ اور اے میرے رب میں آپ کی پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ شیطان میرے پاس بھی آئے"۔

حضرت رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا ہے کہ شیطان تمہارے رگ وریشہ میں اس طرح اثر کرتا ہے۔ جس طرح کہ خون تمام جسم میں دوڑتا ہے۔ شیطان آدمی کو دیکھتا ہے۔ مگر آدمی شیطان کو نہیں دیکھ سکتا۔

نہ اس کے حملہ سے آسانی کے ساتھ بچاؤ کر سکتا ہے۔ اس لئے ہر انسان کے لئے ضروری ہے کہ وہ شیطان کے اثر سے پناہ مانگے۔ قرآن مجید کی تلاوت کے آداب میں یہ بات شامل ہے کہ تلاوت کی ابتداء میں پڑھا جائے۔ تا کہ خدائے بزرگ و برتر ہمیں اپنی پناہ میں لے لے اور اس نیک کام میں شیطان کو بہکانے اور پھسلانے کا موقع نہ ملے۔ آیات کی غلط تاویل سے معنوں کی حقیقت بدل جاتی ہے اللہ تعالیٰ ہمیں ہر قسم کی گمراہیوں سے محفوظ رکھیں۔ (آمین)

(درس آسٹریلیا)

حدیث میں آیا ہے کہ جس مقام پر آیت الکرسی پڑھی جائے وہاں شیطان اور چور کو دخل نہیں۔ اس سے بچنے کا ایک اور طریقہ یہ ہے کہ لاحول ولاقوۃ الا باللّٰہ کا کثرت سے ذکر کیا جائے کیونکہ سید عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ہے کہ یہ عرش کے خزانوں میں سے نازل ہوئی ہے ظاہر ہے کہ جس کے پاس عرش کی امداد ہو شیطان کو کیا دخل ہو سکتا ہے۔

"اعوذ" کے فضائل احادیث کی روشنی میں

اس کے علاوہ احادیث میں اعوذ کے فضائل بیشمار آئے ہیں جن میں سے چند یہ ہیں۔ ایک شخص پر غصہ غالب تھا حتیٰ کہ منہ سے جھاگ نکل رہی تھی شافع محشر نور مجسم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ اگر یہ شخص اعوذ پڑھ لے تو اس کی یہ حالت دور ہو جائے گی۔

سرکار ابد قرار رحمت مجسم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جو شخص روزانہ دس بار اعوذ پڑھ لیا کرے حق تعالیٰ ایک فرشتہ مقرر کر دیتا ہے جو اسے شیطان سے محفوظ کر دیتا ہے۔ حضرت امام ابو حنیفہ نعمان بن ثابت (رض) اور حضرت امام شافعی (رح) کا استدلال قرآن کریم کی آیت فاذا قرات القرآن فاستعذباللّٰہ سے ہے جبکہ امام احمد امام ثوری امام اوزاعی (رح) کا استدلال اضافی ہے اور وہ اس آیت سے ہے۔ واما ینزغنك من الشیطن نزع فاستعذ باللّٰہ انہ ھو السمیع العلیم (پ ۲۴) (اگر شیطان تجھے کوئی وسوسہ ڈالے تو اللہ کی پناہ مانگ بیشک وہ سننے والا جاننے والا ہے) اور ان روایات سے استدلال ہے جس سے حضرت جبرائیل (علیہ السلام) کا اس طرح پڑھنا

منقول ہے استعذ باللہ السمیع العلیم من الشیطن الرجیم۔ اس کا جواب نص سے یہ ہے کہ حضرت حنہ بنت فاقوذا والدہ حضرت مریم رحمہم اللہ نے استعاذہ فرمایا تو ان کے الفاظ یہ تھے۔ انی اعیذھا بك وذریتھا من الشیطن الرجیم۔ (پ ۳)۔ تاہم دونوں طرح پڑھنے میں حرج نہیں۔ اضافہ باعث ثواب ہی ہے۔

مسئلہ

قرآن کریم کی تلاوت سے قبل اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم پڑھنا سنت ہے۔ (خازن) نماز میں امام اور منفرد کو سبحنک اللھم پڑھنے کے بعد آہستہ اعوذ پڑھنا سنت ہے۔ (شامی)(حسنات)

تعوذ بطور ذکر

جب آپ قرآن پاک پڑھیں تو پہلے اللہ کی ذات کے ساتھ شیطان مردود سے پناہ مانگیں تعوذ کا معنی پناہ طلب کرنا ہے قرآن و سنت میں مختلف شرور اور فتنوں سے پناہ مانگنے کی تعلیم دی گئی ہے چنانچہ قرآن پاک کی تلاوت سے پہلے اعوذ باللہ پڑھنا سنت ہے۔

تعوذ اللہ تعالیٰ کے ذکر کی ایک قسم ہے۔ سب سے آسان ذکر لسانی یعنی زبانی ذکر ہے۔ اس کی کل دس اقسام ہیں جن میں سے تعوذ بھی ایک قسم ہے ذکر الٰہی کی قرآن و سنت میں بڑی فضیلت آئی ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ فاذکرونی اذکرکم (البقرہ) تم میرا ذکر کرو میں تمہیں یاد کروں گا حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا فرمان مبارک ہے (ا)

(امسلم ص ۳۴۱ ج ۲ باب الذکر ۲ احکام القرآن الجصاص ص ۹۳ ج ۱) کہ اللہ تعالیٰ یوں فرماتا ہے ان ذکرتنی فی نفسه ذکرته فی نفسی جو مجھے اپنے جی میں یاد کرے گا میں بھی اس کو اپنی جی میں یاد کرونگا وان ذکرتنی فی ملاء ذکرته فی ملاء هم خیر منهم جو آدمی مجھے کسی مجلس یا گروہ میں یاد کرے گا تو میں اس کا ذکر ان سے بہتر گروہ میں کرونگا۔

ذکر کی دو اقسام

ذکر قلبی بھی ہوتا ہے اور لسانی بھی تاہم لسانی ذکر آسان ہے۔ امام ابو بکر جصاص فرماتے ہیں کہ قلبی یا نفسی ذکر کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ انسان اپنے قلب اور ذہن سے اللہ تعالیٰ کے انعامات کو یاد کرے اور پھر اس کا شکر ادا کرے یہ قلبی ذکر کا علمی انداز ہے البتہ اصحاب طریقت لوگوں کا معمول یہ ہے کہ وہ اندر جانے والے اور باہر آنے والے ہر سانس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے ہیں ان کا قلب خدا کا ذکر کرتا ہے مگر یہ چیز بڑی تربیت اور مشق کے بعد حاصل ہوتی ہے چونکہ لسانی ذکر ہی آسان تر ہے اس لیے عام لوگوں کو اسی ذکر کی تلقین کی جاتی ہے۔

لسانی ذکر کی دس اقسام

ا۔ تسبیح

یہ اللہ تعالیٰ کا بلند ترین ذکر ہے۔ سورۃ احزاب میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "یا ایھا الذین امنوا اذکروا اللہ ذکرا کثیرا وسبحوہ بکرۃ واصیلا" اے ایمان والو! اللہ کا خوب ذکر کرو اور اس کی تسبیح بیان کرو صبح بھی اور شام کے وقت بھی سورۃ بنی اسرائیل میں ارشاد ہے "وان من شیء الا یسبح بحمدہ ولکن لا تفقھون تسبیحھم " ہر چیز خدا تعالیٰ تسبیح بیان کرتی ہے مگر تم ان کی تسبیح کو سمجھ نہیں پاتے، وہ اللہ ہی جانتا ہے غرضیکہ شجر اور کائنات کا ذرہ ذرہ اللہ رب العزت کی تسبیح بیان کرتا ہے اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل و شعور اور فہم و فراست عطا کرکے اسے قانون الٰہی کا پابند (مکلف) بنایا ہے لہٰذا اس پر بطریق اولی لازم ہے کہ نہایت عقیدت و محبت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرے اپنی زبان سے سبحان اللہ کہے یعنی اے پروردگار تو ہر ساجھی شریک عیب نقص کمزوری اور ضعف سے پاک اور منزہ ہے۔

۲۔ تحمید

ذکر کی دوسری قسم تحمید ہے یعنی بندہ اپنے رب تعالیٰ کی تعریف بیان کرے اور کہے الحمد اللہ تمام تعریفوں کا مستحق صرف خدا تعالیٰ ہے کیونکہ تمام داخل اور خارجی انعامات کو وجود دینے والا وہی ہے تحمید نماز میں بھی کی جاتی ہے الحمدللہ رب العلمین چنانچہ نماز میں تسبیح کے بعد تحمید انہی الفاظ سے کی جاتی ہے پھر جب ایک رکعت کی قرات مکمل ہو جاتی ہے تو رکوع سے اٹھ کر کہتے ہیں ربنالك الحمد اے پروردگار! تعریف تیرے ہی لیے ہے بہر حال اللہ تعالیٰ کی تعریف بیان کرنا بلند ترین اذکار میں سے ہے تکبیر بھی ذکر ہے جس کے ذریعے اللہ کی بڑائی اور عظمت کا اظہار کیا جاتا ہے۔

۳۔ تکبیر

تکبیر بھی ذکر ہے جس کے ذریعے اللہ کی بڑائی اور عظمت کا اظہار کیا جاتا ہے جب کوئی اہم کام انجام دیا جائے تو اپنے ضعف کے پیش نظر زبان سے کہتے ہیں اللہ اکبر اللہ بڑا ہے۔ اس کے سوا کسی کے لیے بڑائی نہیں ہے۔ سورۃ مدثر میں ارشاد ہے وربک فکبر اپنے پروردگار کی بڑائی بیان کرو چنانچہ نماز کی ابتدا ہی اس لفظ سے ہوتی ہے اللہ اکبر اور پھر نماز میں ایک حرکت سے دوسری حرکت کی طرف جاتے ہوئے اس لفظ کو دہرایا جاتا ہے اور اس طرح اللہ رب العزت کی بڑائی بیان کی جاتی ہے۔

۴۔ تہلیل

لا الہ الا اللہ بھی ذکر ہے۔ اس کے ذریعے شرک کی نفی اور خدا تعالیٰ کی الوہیت کو ثابت کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اس کے سوا کوئی خالق، مالک اور مربی نہیں۔ وہ ذات وحدہ لاشریک ہے۔ تہلیل کے ساتھ توحید کا کلمہ بھی آتا ہے وحدہ لاشریک لہ اکیلا ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں۔ یہ بھی ذکر کی ایک قسم ہے۔

۵۔ حوقلہ

حوقلہ یعنی "لا حول ولا قوۃ الا باللہ" بھی ذکر کی ایک قسم ہے یہ تفویض اور توحید کا کلمہ ہے اور حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ارشاد (۱ مسلم ص۳۴۶ ج۲) کے مطابق عرش الٰہی کے خزانوں میں سے ایک خزانہ ہے۔ اس کے ذریعے انسان خدا تعالیٰ کے سامنے اقرار کرتا ہے کہ برائیوں سے باز رہنے اور نیکی کو انجام دینے کا عمل محض اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ہی ممکن ہوتا ہے۔ اس کلمے کا ورد کرنے سے بہت بڑا اجر حاصل ہوتا ہے۔

۶۔ حسبلہ

ذکر کی ایک قسم حسبلہ ہے جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھروسہ کیا جاتا ہے۔ اس کے لیے مفرد کلمہ **حسبی اللہ** اور جمع کا کلمہ **حسبنا اللہ** آتا ہے۔ ہر مشکل وقت میں اس کلمہ کا ورد خیر وبرکت کا باعث ہوتا ہے۔ احد کے موقع پر جب صحابہ کو سخت دشواری پیش آئی تو انھوں نے یہی کہا تھا **قالوا حسبنا اللہ ونعم الوکیل** (آل عمران آیت ۱۷۳) ہمارے لیے اللہ ہی کافی ہے اور وہی ہمارا کارساز ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ بھی ارشاد ہے کہ اگر لوگ آپ کی بات انکار کرتے ہیں **فقل حسبی اللہ لا الہ الا ھو** (توبہ) تو آپ کہہ دیں کہ میرے لیے اللہ ہی کافی ہے۔ وہی معبود برحق اور میرا اسی پر بھروسہ ہے۔

۷۔ بسملہ

بسملہ بھی ذکر ہی کی ایک قسم ہے ہم ہر کار خیر کی ابتداء "**بسم اللہ الرحمن الرحیم**" سے کرتے ہیں۔ سورۃ مزمل میں ارشاد ہے **واذکر اسم ربك** یعنی اپنے رب کا ذکر کرو۔ غار حرا میں سب سے پہلی وحی کا نزول بھی اسی طرح ہوا **اقرا باسم ربك الذی خلق** آپ اس پروردگار کا نام لے کر پڑھیں جس نے پیدا کیا۔ چنانچہ ہر اچھا کام کرتے وقت بسم اللہ کہنا اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے اور اس کی بڑی فضیلت ہے

۸۔ استعانت

استعانت یعنی اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرنا بھی ذکر میں شامل ہے۔ ہم ہر نماز میں کہتے ہیں ایاك نعبد و ایاك نستعین اے پروردگار! ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد کے طالب ہیں۔ مافوق الاسباب اعانت خدا تعالیٰ ہی کر سکتا ہے۔ اسی لیے فرمایا المستعان مدد کرنے والی ذات اللہ کی ہے لہٰذا امداد اسی سے طلب کی جاسکتی ہے۔

۹۔ تبارک

اللہ کا ذکر لفظ تبارک کے ساتھ کیا جاتا ہے جیسے فرمایا تبرك الذی بیدہ الملك (ملک) بابرکت ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں بادشاہی ہے نیز یہ بھی فرمایا فتبرك اللہ احسن الخلقین (المومنون) بڑی برکتوں والی ہے وہ ذات جو بہترین تخلیق کرنیوالی ہے۔ اللہ نے یہ بھی فرمایا تبرك الذی نزل الفرقان علی عبدہ اللہ کی ذات بڑی بابرکت ہے جس نے قرآن جیسی عظیم کتاب اپنے بندے پر نازل فرمائی، تاکہ اس کے ذریعے وہ تمام انسانوں کو خبردار کردے برکت کا معنی ایسی زیادتی ہوتا ہے جس میں تقدس کا معنی پایا جائے چنانچہ جب بھی کوئی اچھی چیز دیکھی جائے تو کہنا چاہیے بارک اللہ۔ اللہ تعالیٰ برکت عطا کرے یہ ذکر ہے عرب اسے محاورے کے طور پر بھی استعمال کرتے ہیں۔

۱۰۔ تعوذ

ذکر کی دسویں قسم تعوذ یعنی اعوذ باللہ کہنا ہے۔ اس کے لیے قرآن و سنت میں مختلف الفاظ آئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جب قرآن پڑھو تو اللہ تعالیٰ کا ذکر اس طرح کرو اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم چنانچہ آج تعوذ کے بارے میں کچھ عرض ہو گا۔

تعوذ کی ضرورت

اس دنیا میں انسان کوئی بھی کام کرنا چاہے خواہ وہ نیکی کا ہو یا برائی کا توفیق ایزدی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ کوئی کام از خود انجام دے سکتا ہے مگر یہ کہ ہر قدم پر نصرت خداوندی کی ضرورت ہو گی۔ خاص طور پر جب کوئی آدمی نیک کام انجام دینا چاہتا ہے تو اس کو طرح طرح کی رکاوٹیں پیش آتی ہیں تاکہ یہ کام پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکے۔ طرح طرح کے شرور اور فتنے راستے میں حائل ہوتے ہیں اسی لیے انسان کو تعلیم دی گئی ہے کہ کوئی بھی اچھائی کا کام شروع کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کی پناہ حاصل کر لے انسان کے حق میں علم اور عمل دو مفید ترین چیزیں ہیں اور ہر انسان ان دونوں چیزوں کا محتاج ہے۔ علم میں عقیدہ بھی شامل ہے اور ظاہر ہے کہ ہر انسان کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کا عقیدہ اور فکر پاک ہو مگر تمام انسان اس میں کامیاب نہیں ہو پاتے کیونکہ ہر انسان اپنی قوت کے بھروسے پر یہ چیز حاصل نہیں کر سکتا جب تک اللہ تعالیٰ کی مدد اس کے شامل حال نہ ہو عمل کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ کوئی بھی اچھا عمل اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اس کی اعانت و نصرت کے بغیر انجام نہیں دیا جاسکتا۔

حواس ظاہرہ وباطنہ

اللہ تعالیٰ نے انسان کے جسم میں بہت سے حواس ظاہرہ اور باطنہ ودیعت فرمائے ہیں جو اس ظاہرہ میں قوت باصرہ (دیکھنے کی طاقت) قوت سامعہ (سننے کی طاقت) قوت ذائقہ (چکھنے کی طاقت) قوت لامسہ (ٹٹولنے کی طاقت) اور قوت شامہ (سونگھنے کی طاقت) شامل ہیں اسی طرح حواس باطنہ میں وہم، خیال، حس مشترک، قوت متفکرہ، ذہانت اور قوت عاقلہ ہیں جو اللہ تعالیٰ نے انسان کے دماغ میں رکھی ہیں۔ ان ظاہری اور باطنی حواس کے علاوہ انسان میں شہوت اور غضب کا مادہ بھی ہے قوت جاذبہ جس کے ذریعے انسانی جسم غذا کو جذب کرتا ہے۔ قوت ہاضمہ ہے جس کے ذریعے کھائی جانے والی خوراک ہضم ہوتی ہے۔ یہ عمل معدے آنتوں اور جگر میں انجام پاتا ہے پھر قوت غاذیہ ہے جو غذا کو ٹھکانے پر پہنچاتی ہے۔ قوت دافعہ فضلات کو جسم سے باہر نکالتی ہے اگر یہ چیزیں اندر رک جائیں تو صحت بگڑ جائے گی۔ انسانی جسم میں قوت نامیہ بھی ہے جس کے ذریعے انسانی جسم کی ایک خاص حد تک نشوونما ہوتی ہے۔

ایک قوت مولدہ بھی ہے جو تولیدی مادہ کے ذریعے انسانی جسم کی ایک خاص حد تک نشو و نما ہوتی ہے۔ ایک قوت مولدہ نافذہ بھی ہے جو تولید مادہ کے ذریعے نسل انسانی کو آگے بڑھانے کا سبب بنتی ہے۔

شیطان سے پناہ طلبی

ان تمام قویٰ کا رخ عام طور پر نفس کی طرف ہوتا ہے اور نفس کا رخ شر کی طرف سورۃ یوسف میں جو ہے ان النفس لامارۃ بالسوء (یوسف) نفس انسان کو اکثر برائی کی طرف مائل کرتا ہے مثلاً آنکھ کا کام دیکھنا ہے مگر اچھی اور جائز چیز دیکھنے کی بجائے نفس اسے ناجائز حرام چیز دیکھنے پر آمادہ کرے گا۔ اسی طرح جب انسان کوئی عبادت یا دیگر نیک کام انجام دینا چاہتا ہے اور اپنے اوپر بعض پابندیاں عائد کرتا ہے تو آزادی پسند نفس نہ تو ایسی پابندیوں کو قبول کرتا ہے اور نہ ہی مشقت برداشت کرنا پسند کرتا ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اندرونی طور پر نفس اور بیرونی طور پر شیطان اس نیک کام کی انجام دہی میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان اندورنی اور بیرونی شرور سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان کام شروع کرنے سے پہلے خدا تعالیٰ کی پناہ میں چلا جائے اور یہ پناہ تعوذ کے ذریعے حاصل ہوتی ہے۔ جب کوئی شخص اعوذ باللہ کہتا ہے تو اس کا معنی یہ ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ مجھے میرے شدید دشمن شیطان سے پناہ میں رکھے تا کہ میں عبادت تلاوت یا دیگر نیکی کا کام انجام دے سکوں۔

شیطان کے مادے سے مشتق ہے اور اس کے دو معانی آتے ہیں اس کا ایک معنی دوری ہے گویا شیطان اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دور ہے اسی لیے اس کو رجیم یا مردود اور لعین بھی کہا جاتا ہے شطن کا دوسرا معنی ہلاکت ہے اور یہ بھی شیطان پر صادق آتا ہے کیونکہ وہ اپنے غرور و تکبر کی وحسد سے بالآخر ہلاک ہونے والا ہے چونکہ شیطان ہر اچھے کام میں داخل ہوتا ہے اس لیے اس کے شر سے بچنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی پناہ حاصل کرنا ضروری ہے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر سب سے پہلی وحی غار حرا میں نازل ہوئی تو

تعوذ کی تعلیم

جبرائیل (علیہ السلام) نے سورۃ علق کی پہلی پانچ آیات آپ کو پڑھائیں (بخاری ص ۷۳۹ ج ۲) اقرا باسم ربك الذی خلق خلق الانسان من علق اقرا وربك الا کرم الذی علم بالقلم علم الانسان مالم یعلم مفسر قرآن امام ابن جریر نے حضرت عبداللہ بن عباس روایت نقل کی (۲ مسلم ص ۸۸ ج ۱) ہے اول ماننزل جبریل علی النبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قال یا محمد استعذ ثم قال قل بسم الله الرحمن الرحیم یعنی پہلی آیات کے نزول سے متصلا اسی دن جبرائیل (علیہ السلام) حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس آئے اور کہا اے محمد! اللہ تعالیٰ سے پناہ حاصل کریں اور بسم الله الرحمن الرحیم پڑھیں۔ اس کے ساتھ ہی آپ کو اعوذ بالله من الشیطن الرجیم بھی پڑھا دیا گیا۔ پھر آپ ﷺ کو سورۃ فاتحہ کی تعلیم دی گئی اور وضو کا طریقہ بتلایا گیا اور پھر آپ ﷺ کو نماز کے لیے کھڑا ہونے کا حکم ہوا چنانچہ روایات (۳ تفسیر ابن جریر طبری ص ۵۰ ج ۱) سے ثابت ہے کہ وحی کے دوسرے دن (علیہ السلام) نے نماز باجماعت ادا کی۔ آپ ﷺ کے پیچھے حضرت ابو بکر صدیقؓ حضرت علیؓ اور حضرت خدیجہؓ تھیں بعض روایات میں حضرت زیدؓ کا ذکر بھی ملتا ہے۔
شریعت کا مسئلہ یہ ہے کہ قرات کے علاوہ باقی عبادات شروع کرتے وقت صرف بسم اللہ پڑھنا چاہیے جبکہ قرات سے پہلے اعوذ باللہ پڑھنا ضروری ہے۔ امام جعفر صادق اس کی وجہ یہ بیان (۴) کرتے ہیں کہ انسان کی زبان جھوٹ غیبت اور غلط باتوں سے اکثر ناپاک رہتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے پاک کلام کی تلاوت سے قبل زبان کا پاک ہونا ضروری ہے اس تعوذ کی تعلیم دی گئی ہے۔

ممنونہ تعوذات

روایات میں تعوذ (۱ تفسیر کثیر ص ۱۴ ج ۱ ب ۲) کے مختلف الفاظ آئے ہیں۔ جیسے اعوذ بالله من الشیطان الرجیم یا اعوذ بالله السمیع العلیم من الشیطن الرجیم یا اعوذ بالله السمیع العلیم من الشیطن الرجیم۔ بعض روایات میں من الشیطن اللعین الرجیم کے الفاظ بھی آتے ہیں۔ اس کے علاوہ

استعیذ باللہ اور نستعیذ باللہ بھی آتا ہے۔ حمید ابن قیس کی روایت میں یعنی میں اللہ کی پناہ حاصل کرتا ہوں جو قادر ہے شیطان سے بچنے کے لیے جو غدار ہے بعض محدثین نے یہ الفاظ بھی نقل کیے ہیں اعوذ باللہ القوی من الشیطان الغوی میں قوی اللہ کی پناہ میں آتا ہوں اس شیطان سے جو خود گمراہ کنندہ ہے۔

حضور کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جب حضرت حسن اور حسین کو دم کرتے تو یہ الفاظ ادا فرماتے (۳ترمذی ص ۵۷ ج ۱) اعیذ کما بکلمت اللہ التامات من کل شیطن وھامۃ و من کل عین لا مۃ میں تم دونوں کو اللہ تعالیٰ کے کلمات تامہ کی پناہ میں دیتا ہوں ہر شیطان سے اور کیڑے سے اور ہر نظر بد لگانے والی آنکھ سے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جب کسی منزل پر اترتے تو یوں (۴ عمل الیوم واللیلۃ مع ترجمہ نبوی لیل ونہار ص ۱۹۵ عمل الیوم والیۃ نبوی لیل ونہار ص ۳۴۱) کہتے اعوذ بکلمت اللہ التامات کلھا من شد ما خلق میں اللہ تعالیٰ کے کلمات تامہ کے ساتھ ہر اس برائی سے پناہ چاہتا ہوں جو خدا تعالیٰ نے پیدا کی ہے آپ نیند سے پیدا ہونے پر یہ کلمات ادا فرماتے۔ اعوذ بکلمت اللہ التامات من غضبہ و عقابہ و من شد عبادہ و من ھمذات الشیطین میں اللہ تعالیٰ کے کلمات تامہ کے ساتھ اس کے غضب سے عقاب سے اس کے بندوں کے شر سے اور شیاطین کی چھیڑ چھاڑ سے پناہ پکڑ تا ہوں۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) (اترمذی ص ۵۷ ج ۱) نماز کے لیے کھڑے ہوتے تو اس طرح استعاذہ فرماتے اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم من ھمذہ و نفخہ و نفثہ میں اللہ کی پناہ پکڑ تا ہوں شیطان مردود کی چھیڑ چھاڑ سے اس کے تکبر سے اور اس کے سحر سے آپ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ بیت الخلا میں داخلے سے پہلے کہو اللھم انی اعوذبک من الخبث والخبائث اے اللہ میں نر اور مادہ شیاطین سے تیری ذات کے ساتھ پناہ مانگتا ہوں۔ فرمایا جو شخص یہ کلمات ادا نہیں کرتا شیطان اس کے اعضائے مستورہ کے ساتھ کھیلتے رہتے ہیں۔ (۲ عمل الیوم واللیل نبوی لیل ونہار ص ۶۵ ترمذی ص ۷ ج ۱)۔ آپ نے یہ بھی سکھلایا کہ بیت الخلاء سے باہر آ کر کہو غفرانك الحمد للہ الذی اذھب عنی الاذی و عافانی اللہ تعالیٰ کا شکر ہے جس نے میرے جسم سے اذیت ناک چیز نکال دی اور مجھے عافیت عطا فرمائی۔

حضور(صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)نے سفر پر جانے کی یہ دعا سکھائی ہے اللھم انی اعوذبك من وعثاء السفر وكابة المنقلب ومن الحور بعد الكور اے اللہ!میں تیری ذات کے ساتھ سفر کی مشقت سے واپس پلٹ کر غمگین منظر دیکھنے اور ترقی کے بعد تنزلی میں جانے سے پناہ مانگتا ہوں(۳ عمل الیوم واللیل نبوی ونہار ص ۳۴، ترمذی ص ۱۸۲ ج ۲ کتاب الدعوات)۔

جب کسی کو غم واندیشہ لاحق ہو جائے تو نبی(علیہ السلام)نے اس طرح سکھایا اللھم انی اعوذبك من الھم والحزن والعجز ولكسل خداوند تعالیٰ!میں تیری ذات کے ساتھ پناہ چاہتا ہوں غم کے اندیشے سے عاجزی سے اور کم ہمتی سے۔(ابخاری ص ۹۴۱ ج ۲)۔ آپ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے اس طرح بھی استعاذہ فرمایا ہے اللھم الھمنی رشدی واعذنی من شر نفسی اے اللہ!مجھے میری نیکی کی بابت الہام فرما اور مجھے میرے نفس کے شر سے بچا۔(۲ترمذی ص ۱۸۶ ج ۲ کتاب الدعوت)۔ حضور(صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)سے یہ دعائیں بھی ثابت ہیں اللھم انی اعوذبك من عذاب جھنم اے اللہ!جہنم کے عذاب سے تیری ذات کے ساتھ پناہ پکڑتا ہوں(۳ بخاری ص ۹۴۳ ج ۲ ومسلم ص ۳۴۷ ج ۲)اعوذبک من عذاب القبر میں قبر کے عذاب سے پناہ چاہتا ہوں(سنن نسائی ص ۳۲۹ ج ۲)اعوذبك من فتنة المحيا والممات ومن الماثم والمغرم میں تیری پناہ چاہتا ہوں زندگی اور موت کے فتنے سے اور گناہ اور تاوان سے(۵ سنن نسائی ص ۳۴۶ ج ۲)

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ کہتی ہیں کہ حضور(صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)جب بھی نماز پڑھتے تو قبر کے عذاب اور فتنہ سے پناہ مانگتے اللھم انی اعوذبك من عذاب القبر والفتنة القبر اور دوسروں کو بھی تلقین فرماتے۔ آپ نے اس الفاظ کے ساتھ استعاذہ فرمایا اللھم انی اعوذبك من شر فتنة الغنی ومن شر فتنة الفقیه اے اللہ!میں تیری ذات کے ساتھ دولت مندی فقر کے فتنہ سے پناہ مانگتا ہوں غنیٰ اور فقر دونوں باعث آزمائش ہیں۔ بسا اوقات لوگ ان کے وجہ سے گناہ میں مبتلا ہو جاتے ہیں لہٰذا آپ نے ان فتنوں سے محفوظ رہنے کے لیے استعاذہ فرمایا۔ حضور(صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)نے یہ بھی فرمایا میں پناہ چاہتا ہوں من شر ما علمت ومن شر مالم اعلم اس چیز کے شر سے جس کو میں جانتا ہوں اور اس چیز کے شر سے بھی جس کو میں نہیں جانتا۔ آپ نے یہ

بھی فرمایا(۲ سنن نسائی ص ۳۲۰ ج ۲)من شر ما عملت ومن شر مالم اعمل میں ہر اس عمل کے شر سے پناہ پکڑتا ہوں جس کو میں نے کیا ہے اور جس کو میں نے نہیں کیا حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ہر قسم کے دشمن کے شر وسرور سے اس طرح پناہ سکھلائی (۳ عمل الیوم واللیہ امام نسائی ص ۳۲۵) اللھم انا نجعلك فی نحورھم ونعوذبك من شرورھم اے اللہ ہم تجھے دشمنوں کے مقابلہ میں کرتے ہیں اور ان کے شر سے تیری پناہ مانگتے ہیں۔ آپ نے رات کو پیش آنے والے فتنوں سے بھی پناہ سکھائی اعوذباللہ من طوارق اللیل میں رات کو آنے والے فتنوں سے اللہ تعالیٰ کی پناہ پکڑتا ہوں۔

قرآنی تعوذات

قرآن پاک کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض انبیاء (علیہم السلام) نے بھی بعض مواقع پر تعوذ کیا۔ سورۃ بقرہ میں موسیٰ (علیہ السلام) کا واقعہ موجود ہے کہ جب موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے کہا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں ایک گائے ذبح کرنے کا حکم دیتا ہے قوم نے کہا، کیا آپ ہمارے ساتھ مذاق کرتے ہیں اس کے جواب میں موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا اعوذباللہ ان اکون من الجھلین میں اللہ کے ساتھ پناہ مانگتا ہوں اس بات سے کہ میں جاہلوں میں سے ہو جاؤں۔ فرمایا ٹھٹھہ کرنا جاہلوں کا کام ہے میں تو تمہیں اللہ کا کلام سنا رہا ہوں۔ حضرت نوح (علیہ السلام) کے واقعہ میں آتا ہے کہ جب ان کی لغزش پر اللہ تعالیٰ نے تنبیہ فرمائی تو کہنے لگے انی اعوذبك ان اسئلك ما لیس لی به علم (سورۃ ہود) اے اللہ! تیری ذات کے ساتھ پناہ مانگتا ہوں اس بات سے کہ تجھ سے کسی ایسی چیز کا سوال کروں جس کا مجھے علم نہیں ہے حضرت یوسف (علیہ السلام) کے واقعہ کا مطالعہ کیجئے۔ جب عزیز مصر کی بیوی نے آپ کو برائی کی ترغیب دی تو آپ نے فرمایا معاذ اللہ انه ربی احسن مثوای (سورۃ یوسف) پناہ بخدا، وہ میرا مربی ہے اس نے مجھے عزت دی ہے میں اس کے ناموس میں کیسے خیانت کر سکتا ہوں۔ پھر جب یوسف (علیہ السلام) کے ایک بھائی کو چوری کے الزام میں روک لیا گیا تو بھائیوں نے کہا کہ اس کی جگہ ہم میں سے کسی ایک کو روک لو اور اس کو چھوڑ دو۔ اس کے جواب میں بھی یوسف (علیہ السلام) نے فرمایا معاذ اللہ ان ناخذ الا من وجدنا متاعنا

عندہ پناہ بخدا! ہم تو صرف اسی شخص کو روکیں گے جس کے ہاں سے ہمارا سامان بر آمد ہوا ہے حضرت مریمؑ کے حجرہ میں تنہائی کے دوران ایک فرشتہ انسانی شکل میں پہنچ گیا۔ آپ آ گئیں اور کہنے لگیں اعوذ بالرحمن منك ان كنت تقيا (سورۃ مریم) میں خدائے رحمان کی پناہ میں آتی ہوں تجھ سے اگر تو خدا سے ڈرنے والا ہے۔ اور جب مریم پیدا ہوئیں تو ان کی والدہ نے ان الفاظ کے ساتھ خدا تعالیٰ سے استعاذہ کیا انی اعیذھا بك وذريتها من الشيطان الرجيم (آل عمران) اے خدایا! میں اس بچی اور اس کی اولاد کو شیطان مردود کے شر سے تیری پناہ میں پناہ میں دیتی ہوں جب فرعون اور اس کے ساتھیوں نے موسیٰ (علیہ السلام) کو ہلاک کرنے کی دھمکی دی تو آپ نے کہا وانی عذت بربی وربکم ان ترجمون (الدخان) میں اپنے اور تمہارے رب سے اس بات کی پناہ پکڑ تا ہوں کہ تم مجھے سنگسار کر دو۔

سورۃ اعراف میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے واما ینزغنك من الشيطان نزغ فاستعذ بالله انه سميع عليم جب کبھی شیطان کی طرف سے چھیڑ چھاڑ ہو تو اللہ کی پناہ طلب کرو بیشک وہ سننے والا اور جاننے والا ہے قرآن پاک میں یہ حکم بھی موجود ہے قل رب اعوذبك من همزت الشيطن واعوذبك رب ان يحضرون خداوند کریم! تیری ذات کے ساتھ پناہ چاہتا ہوں شیاطین کی چھیڑ چھاڑ سے اور اس بات سے بھی پناہ چاہتا ہوں کہ وہ میرے نیک کام میں خلل اندازی کے لیے حاضر ہوں۔ قرآن پاک کی آخری دو سورتیں جن کا حال میں درس ہوا ہے استعاذہ کے مضمون پر ہی ہیں قل اعوذ برب الناس کہو کہ میں لوگوں کے پروردگار کی پناہ مانگتا ہوں غرضیکہ ان دو سورتوں میں مختلف قسم کی برائیوں سے پناہ پکڑنے کا طریقہ سکھلایا گیا ہے۔

قرآن و سنت میں تعوذ کے مختلف الفاظ بیان ہوئے ہیں جن میں سے کچھ عرض کر دیے گئے ہیں۔ قرآن پاک ایک عظیم نعمت ہے جب کوئی شخص اس سے استفادہ حاصل کرنا چاہے گا تو شیطان ضرور اس کے راستے میں رکاوٹ بنے گا اسی لیے اللہ تعالیٰ نے یہ تعلیم دی ہے کہ جب قرآن کریم کی تلاوت کرنا چاہو تو اعوذ باللہ من الشيطان الرجيم پڑھ لیا کرو۔ (معالم العرفان)

قرآن کریم خالق کائنات کا وہ سرچشمۂ ابدی ہے جس کے بارے کوئی دعویٰ حقیقت یہ نہیں کر سکتا کہ اس کو مکمل سمجھ گیا۔ صرف مثال کے طور پر یہاں بسم اللہ کے حرف ''ب'' کے متعلق تھوڑا سا بیان کیا جاتا ہے۔ اسی سے سمجھ لیں کہ کوئی ساری عمر بھی لگا رہے تو معارف و حقائق کو نہیں سمجھ سکتا۔

استعاذہ کا معنی ہے

کسی ناپسندہ چیز سے بچنے کے لیے کسی چیز کی پناہ میں آنا۔ شیطن چونکہ انتہائی ناپسندیدہ کیفیات کی حامل مخلوق ہے اس لئے اللہ کریم سے التجا کی جاتی ہے کہ ہمیں اس نادیدہ قوت کی زبوں کاری سے اپنی پناہ میں رکھیں۔ اس بات کو سمجھنے کے لئے شیطن کے لفظ پر غور کریں۔

شیطان کا لفظ ''شطن'' سے ماخوذ ہے 'اس کا معنی ہے خیر سے دور ہونا 'شیطان کا شیطان اس لیے کہتے ہیں کہ وہ اللہ کی رحمت سے دور ہو گیا 'ایک قول یہ ہے کہ شیطان ''شیط'' سے ماخوذ ہے 'اس کا معنی ہے: ہلاک ہونا 'اس بناء پر شیطان کو شیطان اس لیے کہتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے قہر و غضب میں ہلاک ہو گیا 'رجیم کا لفظ ''رجم'' سے ماخوذ ہے اس کا معنی ہے سنگسار کرنا 'قتل کرنا 'لعنت کرنا اور دھتکارنا 'چونکہ اللہ نے شیطان پر لعنت کی ہے 'اس کو دھتکار کر راندہ بارگاہ کر دیا ہے اس وجہ سے اس کو رجیم کہتے ہیں۔

اعوذباللہ کے صرف اور اعراب کا بیان

شیطان صفت مشبہ کا صیغہ ہے 'اگر یہ ''شیط'' سے بنا ہے تو اس کا وزن فعلان ہے اور اگر یہ ''شطن'' سے بنا ہے تو اس کا وزن فیعال ہے 'رجیم فعیل کے وزن پر صفت مشبہ کا صیغہ ہے اور مفعول کے معنی میں ہے 'اس کا معنی ہے: راندہ ہوا 'دھتکارا ہوا۔

'' من'' ابتداء کے لیے ہے اور جار مجرور '' اعوذ'' کے متعلق ہے 'اس کا معنی ہے: میں شیطان رجیم سے پناہ مانگنے کی ابتداء اللہ سے کرتا ہوں 'اور یہ من سببیہ بھی ہو سکتا ہے 'اور اس کا معنی ہو گا: شیطان رجیم کے سبب سے میں اللہ کی پناہ میں آتا ہوں۔

نماز اور غیر نماز میں اعوذ باللہ پڑھنے کے متعلق احادیث

حضرت ابو سعید خدری (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جب رات کو نماز میں قیام کرتے تو اللہ اکبر کہتے ' پھر پڑھتے:

" سبحانك اللهم وبحمدك وتبارك اسمك وتعالى جدل ولا اله غيرك " پھر تین مرتبہ "لا الہ الا اللہ " پڑھتے پھر تین مرتبہ پڑھتے: "الله اكبر كبيرا اعوذ بالله السميع العليم من الشيطن الرجيم من همزه ونفخه ونفثه " (میں اللہ کی پناہ طلب کرتا ہوں جو بہت سننے والا ' بہت جاننے والا ہے ' شیطان رجیم کے مجنون کرنے ' اس کے تکبر اور اس کے شر سے) اس کے بعد آپ قراءت کرتے۔

(سنن ابو داؤد ج ۱ ص ۱۱۳ ' مطبوعہ مطبع مجتبائی' پاکستان ' لاہور ۱۴۰۵ھ)

اس حدیث کو امام عبد الرزاق۔ ا (امام عبد الرزاق بن ہمام متوفی ۲۱۱ھ ' المصنف ج ۱ ص ۱۸۳ ' مکتب اسلامی ' بیروت ' ۱۳۹۰ھ) اور امام بیہقی (رح) (امام ابو بکر احمد بن حسین بیہقی متوفی ۴۵۸ھ' سنن کبری ج ۱ ص ۳۶۔ ۳۵ ' مطبوعہ نشر السنۃ' ملتان) نے بھی روایت کیا ہے۔

حضرت جبیر بن مطعم (رض) بیان کرتے ہیں کہ جب نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نماز شروع کرتے تو فرماتے: " اللهم انی اعوذبك من الشيطان الرجيم من همزه ونفخه ونفثه "۔ (المصنف ج ۱ ص ۲۳۸ مطبوعہ ادارۃ القرآن' کراچی' ۱۴۰۶ھ)

عطا نے کہا: اعوذ باللہ پڑھنا ہر قراءت میں واجب ہے خواہ وہ قراءت نماز میں ہو یا غیر نماز میں ' کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: پس جب آپ قرآن پڑھنے لگیں تو شیطان مردود سے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کریں۔ (النحل: ۹۸) ابن جریج نے کہا: ہاں! میں پڑھتا ہوں "بسم الله الرحمن الرحيم اعوذ بالله السميع العليم الرحمن الرحيم، من الشيطان الرجيم واعوذبك رب ان يحضرون اويد بيتى الذى يووينى " عطا نے کہا: یہ پڑھنا بھی تمہیں کفایت کرے گا ' لیکن تم "اعوذ بالله من الشيطن الرجيم "۔ سے زیادہ نہ پڑھا کرو۔

(المصنف ج ۱ ص ۸۳ ' مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت' ۱۳۹۰ھ)

عثمان بن ابی العاص بیان کرتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! میرے اور میری تلاوت قرآن کے درمیان شیطان حائل ہو جاتا ہے، بنی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اس شیطان کا نام خنزب ہے، تم جب اس کو محسوس کرو تو "اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم"۔ پڑھو، اور بائیں جانب تین بار تھوکو۔

(المصنف ج ا ص ۸۵ ،مطبوعہ مکتب اسلامی، بیروت، ۱۳۹۰ھ)

حضرت ابو سعید خدری (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قرآن مجید پڑھنے سے پہلے "اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم" پڑھتے تھے (المصنف ج ا ص ۸٦ ،مطبوعہ مکتب اسلامی، بیروت، ۱۳۹۰ھ)

ابراہیم نے کہا: ہر چیز سے پہلے "**اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم**"۔ پڑھنا کافی ہے (المصنف ج ا ص ۸۵ ، مطبوعہ مکتب اسلامی، بیروت، ۱۳۹۰ھ)

نماز میں اعوذ باللہ پڑھنے کے متعلق فقہاء مالکیہ کا مذہب

امام مالک فرض نماز میں اعوذ باللہ پڑھنے کے قائل نہیں ہیں ، اور تراویح میں پڑھنے کے قائل ہیں۔

(الجامع الاحکام القرآن ج ا ص ۸٦ مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو ایران، ۱۳۸۷ھ)

نفل نماز میں سورۃ فاتحہ سے پہلے اعوذ باللہ اور بسم اللہ پڑھنا (بلا کراہت) جائز ہے اور فرض نماز میں مکروہ ہے۔

(الشرح الکبیر علی ھامش الدسوقی ج ا ص ۲۵۱ ،مطبوعہ دارالفکر ،بیروت)

نماز میں اعوذ باللہ پڑھنے کے متعلق فقہاء حنبلیہ کا مذہب

نماز میں قرات سے پہلے اعوذ باللہ پڑھنا سنت ہے، حسن ابن سیرین ،عطا، ثوری ،اوزاعی ،شافعی اور اصحاب رائے کا یہی نظریہ ہے ،امام مالک (رح) نے کہا: نماز میں قرات سے پہلے اعوذ باللہ نہ پڑھے کیونکہ حضرت انس (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) حضرت ابو بکر (رض) اور حضرت عمر (رض) نماز کو (آیت) الحمد للہ رب العلمین "سے شروع کرتے تھے۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)" (المغنی ج ا ص ۳۴٦ ،مطبوعہ دارالفکر ،بیروت ،۵۔ ۱۴ھ)

حضرت انس (رض) کی حدیث کا محمل یہ ہے کہ رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نماز میں اعوذ باللہ اور بسم اللہ کو جہراً نہیں پڑھتے تھے 'سراً پڑھتے تھے اور جہراً قرات (آیت) "الحمد للہ رب العلمین " سے شروع کرتے تھے تاکہ اس روایت کا ان احادیث سے تعارض نہ ہو جس میں قرات قرآن سے پہلے "۔اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم "پڑھنے کی تصریح ہے۔

نماز میں اعوذ باللہ پڑھنے کے متعلق فقہاء شافعیہ کا مذہب

دعاء استفتاح (سبحانک اللہم) کے بعد "اعوذ باللہ میں الشیطن الرجیم "پڑھنا مستحب ہے 'ہمارے بعض اصحاب نے کہا ہے کہ "اعوذ باللہ السمیع من الشیطن الرجیم "پڑھے اور ہر اس لفظ کا پڑھنا جائز ہے جس سے یہ معنی حاصل ہو 'اور زیادہ یہ ہے کہ نماز سری ہو یا جہری اس کو سراً پڑھے 'ایک قول یہ ہے کہ جہری نماز میں جہراً پڑھے 'ایک قول یہ ہے کہ پڑھنے والے کو اختیار ہے 'ایک قول یہ ہے کہ مستحب یہ ہے کہ قطعا آہستہ پڑھے 'نیز مذہب یہ ہے کہ ہر رکعت میں اعوذ باللہ پڑھے اور پہلے رکعت میں پڑھنا زیادہ موکد ہے 'امام شافعی نے اس کی تصریح کی ہے۔(روضۃ الطالبین ج ١ ص ٣٤٦ 'مطبوعہ مکتب اسلامی 'بیروت '١٤٠٥ ھ)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

بِ سۡمِ اللّٰہِ (اللہ کے نام سے "شروع کرتا ہوں") الرَّحۡمٰنِ (جو نہایت مہربان) الرَّحِیۡمِ (بہت رحم کرنے والا ہے)

ہم سب سے پہلے اس کی لغوی تشریح کریں گے۔

حرف ب کی لغوی تشریح

"ب" ایک حرف ہے اور عربی زبان میں بہت سے حروف ہیں، جو الگ الگ معنی رکھتے ہیں، جن کی الگ الگ خصوصیات ہیں اور جو الگ الگ طریقے سے عمل کرتے ہیں، حرفِ ب ان حروف میں سے ہے، جن کو "حروف جارہ

"کہتے ہیں، حروف جارہ وہ حروف ہوتے ہیں، جو جر دینے والے ہوتے ہیں، یہ ہمیشہ اسم سے پہلے آتے ہیں اور اپنے مابعد اسم کے آخری سرے پر زیر دیتے ہیں۔

جیسے کہ قرآن کریم میں ہے

الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ

اس آیت مبارکہ میں الغیب سے پہلے ب حرف جار آیا ہے، اسی "ب" کی وجہ سے اس کے آخر میں زیر آئی ہے۔

ہم آپ کی آسانی کیلئے یہاں دو مثالیں مزید بھی قرآن کریم سے پیش کر دیتے ہیں۔

أَنْبِئُونِي بِأَسْمَاءِ هَٰؤُلَاءِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ

اس آیت مبارکہ میں اسماء سے پہلے "ب" حرف جار ہے، اس وجہ سے اسماء کے آخر میں زیر آئی ہے۔

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ

اس آیت مبارکہ میں الباطل سے پہلے "ب" حرف جار ہے، اسی کی وجہ سے الباطل کے آخر میں زیر آئی ہے۔

حرف ب کے معانی

عربی زبان میں حروف کے بھی معانی ہوتے ہیں، ب کے بھی بہت سے معانی ہیں، ان معانی کا تعین موقع و محل کی مناسبت سے کیا جاتا ہے۔

چند مثالوں سے اسے سمجھنے کی کوشش کیجیے

آپ نے یہ مثال سن رکھی ہوگی بیدک الخیر اس مثال کا ترجمہ یہ ہے تیرے ہاتھ میں بھلائی ہے

یہاں حرف ب، حرف فی کے معنی میں استعمال ہوا ہے

اسی طرح حرف ب کی دوسری مثال دیکھیں

قرآن کریم میں ہے وَإِذْ فرقنا بكم الْبَحْرَ اس مثال کا ترجمہ یہ ہے اور جب ہم نے تمہارے لیے سمندر کو پھاڑ دیا

اس مثال میں ب بمعنی ل ہے۔

ب بمعنی ل کی ایک اور مثال یہ بھی ہے

قرآن کریم میں ہے مَا خلقناھما إِلَّا بِالْحَقِّ

اسی طرح ب کی تیسری مثال دیکھیں کتبت بالقلم اس مثال کا ترجمہ یہ ہے میں نے قلم کی مدد سے لکھا

یہاں ب استعانت کے معنی میں ہے

ب کی تیسری مثال دیکھیں

قرآن کریم میں ہے والمستغفرین بالأسحار اس مثال کا ترجمہ یہ ہے اور سحری کے وقت مغفرت طلب کرنے والے

اس مثال میں ب عند کے معنی میں استعمال ہوئی ہے۔

یہاں یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ عربی زبان میں ب کی دو اقسام ہیں، زائدہ اور غیر زائدہ، غیر زائدہ ب کے نحویوں کے نزدیک تیرہ معانی ہو سکتے ہیں۔

حرف ب جن تیرہ معانی میں استعمال ہو سکتی ہے، وہ درج ذیل ہیں

الصاق، تعدیہ، استعانت، تعلیل، مصاحبت، ظرفیت، بدل، مقابلہ، مجاوزت، استعلاء، تبعیض، قسم، بمعنی الی۔

اب سے ہم ان تیرہ معانی کے متعلق بات کریں گے، جو حرف ب کے ذریعے ہمیں حاصل ہو سکتے ہیں۔

حرف ب اور اِلصاق کا معنی

ب کا پہلا معنی الصاق ہے الصاق کا معنی بیان کرتے ہوئے عبد القاہر جرجانی لکھتے ہیں "اتصال الشیء بالشیء"

ایک چیز کا دوسری چیز کے ساتھ ملنا الصاق کہلاتا ہے۔

الصاق کا معنی مزید واضح کرنے کیلئے ہم آپ کے سامنے دو مثالیں پیش کر رہے ہیں جو بنیادی طور پر دو تعریفات بھی ہیں۔

پہلی مثال یہ ہے۔ إلصاق الوجه بالأرض زمین کے ساتھ چہرہ ملانے کو سجدہ کہتے ہیں۔

دوسری مثال یہ ہے۔ الصاق الجلد بالجلد جلد سے جلد ملانے کو مباشرت کہتے ہیں۔

الصاق ب کا حقیقی معنی ہے، جو اس کے تمام معانی کے ساتھ بھی پایا جاتا ہے، یعنی ہم ب کا جو بھی معنی مراد لیں

گے، اس کے ساتھ یہ معنی بھی کسی نہ کسی درجے میں پایا جائے گا۔
یہی وجہ ہے کہ سیبویہ نے اس کو ذکر کرنے کے بعد کسی دوسرے معنی کو ذکر ہی نہیں کیا اور یہ کہہ دیا کہ ب کا معنی الصاق اور اختلاط ہی ہے۔
یہاں یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ

الصاق کی بھی دو قسمیں ہیں

الصاق حقیقی اور الصاق مجازی
الصاق حقیقی سے مراد یہ ہے کہ کوئی چیز حقیقت میں کسی دوسری چیز سے ملی ہوئی ہو۔
الصاق مجازی سے مراد یہ ہے کہ وہ چیز حقیقی طور پر تو اس سے ملی ہوئی نہ ہو لیکن وہ اس کے قریب تر ہو۔
الصاق حقیقی کی مثال یہ ہے
"بہ داء" ترجمہ: اس کے ساتھ بیماری ہے
یعنی بیماری اس کے ساتھ حقیقی طور پر ملی ہوئی ہے
الصاق مجازی کی مثال یہ ہے "مررت بزید" میں زید کے پاس سے گزرا یہاں اس کا ترجمہ یہ کرنا درست نہیں ہو گا میں "زید کے ساتھ مل کر گزرا"
کیونکہ یہاں الصاق حقیقی نہیں بلکہ مجازی ہے

حرف ب اور تعدیہ کا معنی

(تعدیہ یعنی لازم کو متعدی بنانا)

ب تعدیہ کیلئے بھی استعمال ہوتی ہے، تعدیہ سے مراد یہ ہے کہ فعل لازم کو حرف ب کے ذریعے فعل متعدی بنا دیا جاتا ہے، فعل لازم کسے کہتے ہیں یہ سمجھ لیجیے۔

فعل لازم کی تعریف:

فعل لازم وہ ہوتا ہے جو فاعل کے ساتھ مل کر بات مکمل کر دیتا ہے، اسے مفعول کی ضرورت نہیں ہوتی۔

فعل لازم کی مثال

جَاءَ الْحَقُّ ترجمہ: حق آیا۔

فعل متعدی کسے کہتے ہیں، یہ بھی سمجھ لیجیے۔

فعل متعدی کی تعریف:

فعل متعدی وہ ہوتا ہے، جو فاعل اور مفعول کے ساتھ مل کر بات مکمل کرتا ہے۔

فعل متعدی کی مثال

خَلَقَ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضَ ترجمہ: اُس نے آسمانوں اور زمین کو بنایا۔

جیسے حرف ب کے ذریعے فعل لازم کو متعدی بنایا جاتا ہے، ایسے ہی ہمزہ کے ذریعے بھی فعل لازم کو فعل متعدی بنایا جاتا ہے، حرف ب کا تعدیہ بھی ہمزہ ہی کی طرح ہوتا ہے، اس وقت بھی فاعل مفعول بن جاتا ہے۔

ہمزہ کیسے فعل لازم کو فعل متعدی بناتا ہے اور اس وقت کیسے فاعل مفعول بن جاتا ہے، اس کو مثالوں سے سمجھنے کی کوشش کریں، ہمارے خیال سے خرج اور اخرج کی مثال بہتر رہے گی۔

خرج اور اخرج کے معنی میں فرق:

خرج ایک فعل لازم ہے، اگر خرج کے شروع میں ہمزہ کا اضافہ کر دیا جائے اور اسے اخرج بنا دیا جائے تو یہ فعل لازم سے متعدی ہو جاتا ہے اور اس کا معنی بھی بدل جاتا ہے۔

خرج کا معنی ہے وہ ایک شخص نکلا اور اخرج کا معنی ہے اسے کسی دوسرے نے نکالا۔

اب اس کی قرآن کریم سے مثالیں ملاحظہ فرمائیں

سورۃ البقرہ کی آیت نمبر دو سو ترتالیس میں ہے:

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ خَرَجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ أُلُوفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ فَقَالَ لَهُمُ اللَّهُ مُوتُوا ثُمَّ أَحْيَاهُمْ

اس آیت کا ترجمہ یہ ہے:

کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو ہزاروں میں تھے اور (طاعون کی) موت کے ڈر (کی وجہ) سے اپنے گھروں سے

نکلے تھے، اللہ تعالی نے ان سے فرمایا، مر جاؤ، پھر انہیں (اپنے نبی کی دعا کی وجہ سے دوبارہ) زندہ کر دیا تھا۔

اس آیت میں خرجوا فعل لازم ہے جس کا معنی ہے: وہ نکلے۔

اس آیت کا پس منظر خاصا دلچسپ ہے اس لیے اس کو بیان کر دیتے ہیں پھر ہم دوبارہ اپنے اصل موضوع کی طرف چلتے ہیں، تفسیر جلالین کے مطابق یہ بنی اسرائیل کی قوم تھی، ان کے علاقے میں طاعون کی وباء آگئی تھی، یہ اس سے فرار ہو رہے تھے تو اللہ تعالی نے ان سے فرمایا مر جاؤ، یہ مر گئے تو پھر ان کے نبی نے ان کے لیے دعا کی، انہیں ان کے نبی حضرت حزقیل علیہ السلام کی دعا سے دوبارہ زندہ کر دیا گیا تھا۔

کرونا کی بیماری اور طاعون کی بیماری میں بہت سی باتیں مشترک ہیں، لوگ دونوں سے بہت خوفزدہ ہوتے ہیں، ان دونوں سے فرار کی کوشش کرتے ہیں اور یہ دونوں ہی بظاہر متعدی بیماریاں بھی ہیں، ہم نے جس وقت یہ تحریر لکھی تو اس وقت کرونا عروج پر تھا، اسی مناسبت سے ہم سے یہ واقعہ بھی بیان کر دیا ہے۔

اب ہم اپنے اصل موضوع کی طرف واپس چلتے ہیں اور آپ کے سامنے قرآن کریم سے اخرج کی مثال پیش کرتے ہیں۔

سورۃ الاعراف کی آیت نمبر ستائیس میں ہے:

يَابَنِي آدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطَانُ كَمَا أَخْرَجَ أَبَوَيْكُمْ مِنَ الْجَنَّةِ

اس آیت کا ترجمہ یہ ہے:

اے بنی آدم! شیطان تمہیں فتنہ میں نہ مبتلا کر دے جیسا کہ اس نے جنت سے تمہارے والدین کو بھی نکلوا دیا تھا۔

اس آیت میں اخرج فعل متعدی استعمال ہوا ہے، جس کا معنی ہے، اس ایک نے نکالا۔

یعنی خرج کا مطلب ہے وہ خود نکلے، اخرج کا مطلب ہے وہ خود نہیں نکلے بلکہ انہیں کسی دوسرے نے نکالا ہے۔

اب یقینا آپ کو سمجھ آگئی ہو گی کہ ہمزہ کی وجہ سے فاعل کیسے مفعول بن جاتا ہے۔

دخل اور ادخل کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے، ہم آپ کی سہولت کیلئے دخل اور ادخل کی مثالیں بھی قرآن کریم سے پیش کر دیتے ہیں تاکہ فرق مزید واضح ہو جائے

دخل اور ادخل کے معنی میں فرق:

دخل فعل لازم ہے اور ادخل فعل متعدی ہے، دخل کا معنی ہے وہ داخل ہوا، ادخل کا معنی ہے اس نے کسی دوسرے کو داخل کیا۔

دخل کی قرآن کریم سے مثال ملاحظہ فرمائیں

سورۃ نوح آیت نمبر اٹھائیس میں حضرت نوح علیہ السلام کے متعلق ہے کہ انہوں نے یہ دعا مانگی تھی۔

رَبِّ اغۡفِرۡ لِی وَلِوَالِدَیَّ وَلِمَنۡ دَخَلَ بَیۡتِیَ مُؤۡمِنًا

اس آیت کا ترجمہ یہ ہے:

اے میرے رب!

مجھے بخش دے، میرے والدین کو بخش دے اور جو میرے گھر میں حالت ایمان میں داخل ہوا، اسے بھی بخش دے۔

اب ادخل کی مثال قرآن کریم سے ملاحظہ فرمائیں:

وَلَوۡ أَنَّ أَهۡلَ الۡكِتَابِ آمَنُوا وَاتَّقَوۡا لَكَفَّرۡنَا عَنۡهُمۡ سَیِّئَاتِهِمۡ وَلَأَدۡخَلۡنَاهُمۡ جَنّٰتِ النَّعِیمِ

اس آیت کا ترجمہ یہ ہے:

اور اگر اہل کتاب (محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر) ایمان لاتے اور (کفر سے) بچتے تو ہم ضرور ان کے گناہ بخش دیتے اور ضرور انہیں نعمتوں والی جنت میں داخل کر دیتے۔

آپ نے دخل اور ادخل کا معنوی فرق جان لیا۔ یہاں ایک دوسری بات بھی بڑی قابل توجہ ہے، اس موقع کو غنیمت جانتے ہوئے ہم آپ کے ذہن کو اس طرف بھی لے جاتے ہیں۔

اہل کتاب سے متعلق ایک اہم سوال:

اہل کتاب یعنی یہود و نصاری وغیرہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان نہیں لائے تو کیا وہ جنت میں جا سکتے ہیں؟

اگر کوئی آپ سے یہ سوال پوچھے تو آپ اسے جواب میں یہ آیت سنا دیجیے گا، اسے اسلام کا حقیقی موقف معلوم ہو جائے گا، آپ بھی اس آیت پر غور کریں، آپ کو کچھ سوالات کے جوابات خود بخود ہی مل جائیں گے۔

چلیں ہم واپس اپنے موضوع کی طرف چلتے ہیں، آپ نے ہمزہ کا تعدیہ تفصیل سے سمجھ لیا ہے، اب ہم ب کا تعدیہ

آپ کو سمجھاتے ہیں، ذھب ایک فعل لازم ہے، اس کا معنی ہے وہ گیا، اگر اس کے ساتھ ب آجائے تو یہ فعل لازم سے متعدی ہو جاتا ہے، اس کا معنی بھی بدل جاتا ہے۔

مثلا

ذھب زید کا معنی ہے زید گیا اور ذھب بزید کا مطلب ہے وہ زید کو لے گیا۔

حرف ب اور ہمزہ کے تعدیہ میں فرق

بعض علماء کرام نے ایک بڑی دل چسپ بات لکھی ہے، وہ کہتے ہیں کہ ہمزہ اور ب کے تعدیہ میں ایک فرق ہے، وہ یہ ہے کہ جب حرف ب کے ذریعے متعدی کیا جائے تو اس وقت فاعل فعل میں مفعول کا مصاحب بن جاتا ہے، آسان الفاظ میں یوں سمجھ لیں کہ وہ بھی کام میں اس کا ساتھی بن جاتا ہے۔

جیسے اگر آپ کہتے ہیں ذھبت بزید۔ تو اس صورت میں آپ بھی جانے میں اس کے ساتھ ہیں۔

اس بات کا لطف آپ قرآن کریم کی اس آیت سے اٹھا سکتے ہیں جو نزول قرآن کے حوالے سے ہے۔

سورت الشعراء کی آیت نمبر ایک سو ترانوے میں ہے

"نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ" اس کا ترجمہ یہ ہے: اسے روح امین لے کر اترے۔

فائدہ:

یعنی جبریل نزول میں شریک سفر تھے۔

اس کا فائدہ آپ کو اس مثال میں بھی صاف نظر آئے گا، جس میں یوسف علیہ السلام کو کنویں میں پھینکنے کا تذکرہ ہے، اس وقت ان کے بھائی شریک فعل تھے۔

سورت یوسف کی آیت نمبر پندرہ میں ہے

"فَلَمَّا ذَهَبُوا بِهِ وَأَجْمَعُوا أَنْ يَجْعَلُوهُ فِي غَيَابَتِ الْجُبِّ"

اس کا ترجمہ یہ ہے:

پھر جب وہ (سب) بھائی یوسف علیہ السلام کو لے گئے اور انہوں نے عزم مصمم کے ساتھ اجماع کر لیا کہ وہ انہیں

گہرے تاریک کنویں میں پھینک دیں گے۔
لیکن یہاں ایک مسئلہ ہے جس کی وجہ سے کچھ علماء نے لکھا ہے کہ جمہور کا مذہب اس کے خلاف ہے، وہ یہ لازمی نہیں سمجھتے کہ جب حرف ب سے تعدیہ کیا جائے تو اس وقت فاعل بھی مفعول کا شریک فعل ہو جائے۔
اس کی وجہ ان جیسی آیات ہیں
قرآن کریم میں ہے
"**ذھب اللہ بنورھم**" ترجمہ: اللہ ان کے نور کے لے گیا۔
دوسری آیت دیکھیں جو سورت الاسراء کی آیت نمبر ایک ہے:
یہاں بھی بعبدہ کی ب تعدیہ کیلئے ہے
"سُبْحَانَ الَّذِي أَسْرَىٰ بِعَبْدِهِ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ إِلَى الْمَسْجِدِ الْأَقْصَى"
اس آیت کا ترجمہ یہ ہے:
پاک ہے وہ ذات جو لے گیا اپنے بندے کو راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصی تک۔
یہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالی کی ذات اس سے منزہ ہے اور باقیوں پر اس قاعدے کا اطلاق ہوتا ہے، یہ تسلیم کر لینا بھی ٹھیک ہے کہ ہم جمہور کے مذہب پر ہیں اور اس قاعدہ کو تسلیم نہیں کرتے، علامہ زمخشری نے اسے ایک مقام پر ذھب کے متعلق ذکر کیا ہے جبکہ بعض نے اسے مطلقاہی بیان کیا ہے، اس پر مزید تحقیق کرنی چاہیے، اس کے اسباب کیا ہیں، میں نے آپ کو ایک راہ دکھادی ہے۔

حرف ب اور استعانت کا معنی

حرف ب کا تیسرا معنی استعانت ہے، استعانت مدد طلب کرنے کو کہتے ہیں، جب حرف ب استعانت کے معنی میں استعمال ہوتی ہے تو اس وقت جس سے مدد طلب کی جائے حرف ب اس پر داخل ہوتی ہے اور اسے مجرور کر دیتی ہے۔
جیسے "کتبتُ بالقلم" میں نے قلم کی مدد سے لکھا۔
اس مثال کو یوں سمجھ لیں کہ فاعل نے اپنے مجرور قلم سے لکھنے کے لیے مدد مانگی ہے۔

اس کی قرآن کریم سے ملاحظہ فرمائیں

سورت البقرہ آیت نمبر بیالیس میں ہے

"وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ" ترجمہ: حق کو باطل کی مدد سے خلط ملط نہ کرو۔

کچھ علماء کرام کے نزدیک یہاں ب استعانت کیلئے ہے، مذکورہ بالا ترجمہ بھی ب کو استعانت کیلئے سمجھ کر ہی کیا گیا ہے۔

اگر حرف ب کو ملابست کیلئے مانا جائے تو ترجمہ اس طرح کیا جاسکتا ہے۔

"حق کو باطل کے ساتھ گڈ مڈ نہ کرو۔"

یا

حق کو باطل کے ساتھ نہ ملاؤ۔

یہ بات یاد رہے کہ اس مقام پر زیادہ تر اہل علم نے حرف ب کا معنی استعانت والا نہیں کیا، ہم نے فقط آپ پر بات کو واضح کرنے کیلئے یہ مثال دی ہے، ہم بھی جمہور کے ساتھ ہیں۔

حرف ب اور سبب یا تعلیل کا معنی

تعلیل کے معنٰی ہیں وجہ متعین کرنا یا وجہ بیان کرنا

حرف ب تعلیل یا سبب کیلئے بھی استعمال ہوتی ہے، اس وقت یہ سببِ فعل یا اس علت پر داخل ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ کام ہوا ہوتا ہے۔

اس کی مثال یہ ہے

"مات بالجوع" ترجمہ: وہ بھوک کی وجہ سے مر گیا۔

یہاں مرنے کی وجہ یا سبب بھوک ہے۔

اسکی دوسری مثال یہ ہے

"عرفنا بفلان" ترجمہ: ہم فلاں کی وجہ سے پہچانے گئے۔

اب قرآن کریم سے اسکی چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

سورت البقرہ آیت نمبر چوون میں ہے

"وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ" ترجمہ: اور جب موسی (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے فرمایا

اے میری قوم! بے شک تم نے بچھڑے کو (معبود) بنانے کی وجہ سے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے۔

قرآن کریم سے اس کی دوسری مثال ملاحظہ فرمائیں:

سورۃ المائدہ آیت نمبر تیرہ میں ہے

"فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ وَ جَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً" ترجمہ: پس ان کی بدعہدی کی وجہ سے ہم نے ان پر لعنت فرمائی اور ان کے دلوں کو سخت بنادیا۔

قرآن کریم میں اس کی تیسری مثال یہ ہے

سورت عنکبوت آیت نمبر چالیس میں ہے

"فَكُلًّا أَخَذْنَا بِذَنْبِهِ"

ترجمہ: (قارون، فرعون اور ہامان) پس ان میں سے ہر ایک کو ہم نے اس کے گناہ کی وجہ سے پکڑا۔

حرف ب کا مصاحبت والا معنی

حرف ب مصاحبت کیلئے جب استعمال ہوتی ہے تو اس کا معنی مع والا ہوتا ہے، مع کا معنی آپ کو درج ذیل آیت سے سمجھ آجائے گا۔

"ان اللہ مع الصابرین" ترجمہ: بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

الفاظ کو الگ الگ کرکے دیکھیں

ان اللہ: بے شک اللہ

مع الصابرین: صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے

ہم مزید چار مثالیں پیش کر رہے ہیں جن میں پہلی عام مثال ہے اور باقی تین قرآنی مثالیں ہیں، ان چاروں مثالوں میں حرف ب مصاحبت کیلئے استعمال ہوئی ہے۔

حرف ب کے مصاحبت کی عام مثال یہ ہے:

"بعتُكَ الفَرَسَ بسرجهِ والدارَ بأثاثها"

ترجمہ: میں نے تمہیں گھوڑا اس کی زین کے ساتھ اور گھر اس کے سامان کے ساتھ بیچ دیا۔

بسرجہ مع سرجہ کے معنی میں ہے، باثاثھا مع اثاثھا کے معنی میں ہے۔

اس کی قرآنی مثال یہ ہے

سورت ھود آیت نمبر اڑتالیس میں ہے:

"قِيۡلَ يٰنُوۡحُ اهۡبِطۡ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَبَرَكٰتٍ"

ترجمہ: فرمایا گیا اے نوح (علیہ السلام) آپ (کشتی سے) اتریں ہماری طرف سے سلامتی اور برکات کے ساتھ۔ بسلام مع سلام کے معنی میں ہے۔

اس کی دوسری قرآنی مثال یہ ہے

سورت المائدۃ آیت نمبر اکسٹھ میں ہے:

"وَإِذَا جَاءُوكُمۡ قَالُوا آمَنَّا وَقَدۡ دَخَلُوا بِالۡكُفۡرِ وَهُمۡ قَدۡ خَرَجُوا بِهِ"

ترجمہ: اور جب وہ آپ کے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے ہیں حالانکہ وہ کفر کے ساتھ ہی داخل ہوئے تھے اور کفر کے ساتھ ہی نکلے ہیں۔ بالکفر مع الکفر کے معنی میں ہے۔

اسکی تیسری قرآنی مثال یہ ہے

سورت الحجر آیت نمبر اٹھانوے میں ہے:

"فَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّكَ"

ترجمہ: پس آپ تسبیح کریں اپنے رب کی حمد کے ساتھ۔ بحمد مع حمد کے معنی میں ہے۔

توجہ طلب:

اللہ تعالی کے اس حکم پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عمل کرتے ہوئے یہ ذکر کیا کرتے تھے۔

"سبحان اللہ و بحمدہ" سبحان اللہ تسبیح ہے اور بحمدہ حمد ہے۔

نوٹ:

یہاں مصاحبت کے ساتھ الصاق والا معنی بھی خاصا نمایاں ہے۔

حرف ب اور ظرفیت کا معنی

حرف ب ظرفیت کے معنی میں بھی استعمال ہوتی ہے، ظرف کی دو قسمیں ہوتی ہیں، ظرف مکان اور ظرف زمان، ظرف کو آسان الفاظ میں یوں سمجھ لیں کہ ظرف کسی جگہ، مکان یا وقت کو کہتے ہیں، حرف ب جب ظرفیت کے معنی میں ہوتی ہے تو اس کا معنی فی جیسا ہی ہوتا ہے۔

اس کی قرآنی مثال یہ ہے:

سورت آل عمران آیت نمبر ایک سو تیئیس میں ہے

وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللَّهُ بِبَدْرٍ وَأَنْتُمْ أَذِلَّةٌ ترجمہ: اور بے شک اللہ تمہاری بدر میں مدد کر چکا ہے جب تم بہت کمزور تھے۔

ببدر فی بدر کے معنی میں ہے، یعنی مکان بدر میں۔

اسکی دوسری قرآنی مثال یہ ہے

سورت طہ آیت نمبر بارہ میں ہے: فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ إِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى

ترجمہ: (اے موسی علیہ السلام) آپ اپنے جوتے اتار دیجیے (کیونکہ) بے شک آپ مقدس وادی طوی میں ہیں۔

بالواد فی الواد کے معنی میں ہے۔

اسکی تیسری قرآنی مثال یہ ہے

سورت القمر آیت نمبر چونتیس میں ہے

إِنَّآ أَرۡسَلۡنَا عَلَيۡهِمۡ حَاصِبًا إِلَّآ ءَالَ لُوطٖۖ نَّجَّيۡنَٰهُم بِسَحَرٖ

ترجمہ: بے شک ہم نے ان پر پتھر برسانے والی اندھی بھیجی سوائے لوط (علیہ السلام) کے گھر والوں کے (کیونکہ) ہم نے ان کو سحر کے وقت میں بچا لیا تھا

اس مثال میں بسحر کا معنی فی سحر کے بجائے عند سحر کریں گے تو معنی زیادہ واضح ہو جائے گا، اوپر والی دونوں مثالیں ظرف مکان کی تھی، تیسری مثال ظرف زمان کی ہے۔ (تفسیر احسانی)

یہ بیان کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ قرآنی علم کی وسعت کا اندازہ ہو سکے ورنہ وہ اللہ کا کلام یہ نہیں کہ اس کوئی سمجھنے کا دعویٰ کرے، ناممکن ہے۔

آیت تسمیہ اور اس کے شان نزول کا بیان

ہمیں احمد بن محمد بن ابراہیم المقری نے، اسے ابو الحسین علی بن محمد الجرجانی نے اسے ابو بکر محمد بن عبد الرحمن الجوہری نے، اسے محمد بن یحییٰ بن مندہ نے، اسے ابو کریب نے، اسے عثمان بن سعید نے اور اسے بشر بن عمارہ نے ابو رق سے، اس نے الضحاک سے اور اس نے ابن عباس سے روایت کر کے خبر دی کہ جبرائیل امین سب سے پہلے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر جو وحی لے کر نازل ہوئے وہ یہ تھی کہ انھوں نے کہا اے محمد تعوذ پڑھیے، یعنی **اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم** کہیے پھر **بسم اللہ الرحمن الرحیم** کہیے۔ (اسباب نزول قرآن نیشاپوری)

{بِسۡمِ اللّٰہِ: اللہ کے نام سے شروع۔} علامہ احمد صاوی (رح) فرماتے ہیں: قرآن مجید کی ابتداء "بِسۡمِ اللّٰہِ" سے اس لیے کی گئی تا کہ اللہ تعالیٰ کے بندے اس کی پیروی کرتے ہوئے ہر اچھے کام کی ابتداء "بِسۡمِ اللّٰہِ" سے کریں۔ (صاوی، الفاتحۃ، ۱/ ۱۵) اور حدیث پاک میں بھی (اچھے اور) اہم کام کی ابتداء "بِسۡمِ اللّٰہِ" سے کرنے کی ترغیب دی گئی ہے، چنانچہ

حضرت ابو ہریرہ (رض) سے روایت ہے، حضور پر نور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: "جس اہم کام کی ابتداء "بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ" سے نہ کی گئی تو وہ ادھورا رہ جاتا ہے۔

(کنز العمال، کتاب الاذکار، الباب السابع فی تلاوۃ القراٰن وفضائلہ، الفصل الثانی۔۔الخ، ۱/ ۲۷۷، الجزء الاول، الحدیث: ۲۴۸۸)

لہٰذا تمام مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ ہر نیک اور جائز کام کی ابتداء "بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ " سے کریں، اس کی بہت برکت ہے۔

صحیح ابن خزیمہ میں حضرت ام سلمہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بسم اللہ کو سورۃ فاتحہ کے شروع میں نماز میں پڑھا اور اسے ایک آیت شمار کیا لیکن اس کے ایک راوی عمر بن ہارون بلخی ضعیف ہیں اسی مفہوم کی ایک روایت حضرت ابوہریرہ سے بھی مروی ہے۔ حضرت علی، حضرت ابن عباس، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عبداللہ بن زبیر، حضرت ابوہریرہ (رض)، حضرت عطا، حضرت طاؤس، حضرت سعید بن جبیر، حضرت مکحول اور حضرت زہری رحمہم اللہ کا یہی مذہب ہے کہ بسم اللہ ہر سورت کے آغاز میں ایک مستقل آیت ہے سوائے سورۃ برات کے۔ ان صحابہ اور تابعین کے علاوہ حضرت عبداللہ بن مبارک، امام شافعی، امام احمد اور اسحاق بن راہو یہ اور ابو عبیدہ قاسم بن سلام رحمہم اللہ کا بھی یہی مذہب ہے۔ البتہ امام مالک امام ابو حنیفہ اور ان کے ساتھی کہتے ہیں۔ کہ بسم اللہ نہ تو سورۃ فاتحہ کی آیت ہے نہ کسی اور سورت کی۔ امام شافعی کا ایک قول یہ بھی ہے کہ بسم اللہ سورۃ فاتحہ کی تو ایک آیت ہے لیکن کسی اور سورۃ کی نہیں۔ ان کا ایک قول یہ بھی ہے کہ ہر سورت کے اول کی آیت کا حصہ ہے لیکن یہ دونوں قول غریب ہیں۔ داؤد کہتے ہیں کہ ہر سورت کے اول میں بسم اللہ ایک مستقل آیت ہے سورت میں داخل نہیں۔ امام احمد بن حنبل سے بھی یہی روایت ہے ابو بکر رازی نے ابو حسن کرخی کا بھی یہی مذہب بیان کیا ہے جو امام ابو حنیفہ کے بڑے پایہ کے ساتھی تھے۔ (ابن کثیر)

قولہ بسم

اللہ تعالیٰ جل ذکرہ نے اپنے اسماء مبارکہ کو مقدم کر کے اپنے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ ادب سکھایا کہ اپنے تمام افعال سے اسماء باری تعالیٰ کو مقدم کیا کرو کرو اور اپنی تمام مہمات سے پہلے ان اوصاف کو بجالانے کا حکم فرمایا اور آپ کو جو ادب سکھایا اور اور تعلیم اسے اپنی تمام مخلوق کے لئے ایک طریقہ اور طرز عمل بنایا جس کو وہ اپنائیں اور

اختیار کریں اور اپنی گفتگو کی ابتدا اور خطوط اور کتب اور ضروریات کی ابتدا کے لیے اس کو راستہ بنا دیا یہاں تک کہ جو شخص بسم اللہ کہتا ہے تو باطنی فعل اور محذوف فعل پر اس کا یہ کہنا کسی دلالت کا محتاج نہیں ہے۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ بسم اللہ کی "ب" فعل کا تقاضہ کرتی ہے جو اس کو اپنی جانب کھینچنے والا ہو اور آخر میں کوئی فاعل یہاں موجود نہیں ہے تو گویا بسم اللہ کہنے والے نے سامع کو اس فعل کے تذکرہ سے بے نیاز کر دیا اس لیے کہ وہ اسے سمجھتا ہے اس لیے کہ ہر بولنے والا اپنے کام کے افتتاح کے وقت اس چیز کو بولنے سے پہلے یا بولنے کے وقت مستحضر کرنے والا ہے اور اس بات نے اس کے سامع کو اس چیز کے تذکرہ سے جسے افتتاح کر رہا ہے مشاہدے کا محتاج نہیں چھوڑا۔ تو سامع کا محذوف کے اظہار سے استغناء، یہ استغنا کی نظیر بن گئی کہ جب اس نے، کہ کوئی اسے کہہ رہا ہے "ما اکلت الیوم" تو جواب میں فقط کہے "طعاماً" تو فعل تو حذف کر دیا کیوں کہ سائل کے سوال میں موجود ہے۔ جواب میں دلالت کی وجہ سے اظہار کی چنداں ضرورت نہیں۔

اب اس سے یہ بات سمجھ آئی کہ جب کوئی بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھتا ہے پھر سورۃ کی تلاوت کو اسکے بعد شروع کر دیتا ہے تو وہ بسم اللہ الرحمن الرحیم کے قول سے یہ خبر دے رہا ہے اور اس سے سمجھا جا رہا ہے کہ وہ بسم اللہ الرحمن الرحیم میں "اَقْرَأُ" کا اضافہ کر رہا ہے۔ اسی طرح جب کوئی اٹھنے یا بیٹھنے یا اسی طرح دیگر افعال کے لئے بسم اللہ کہتا ہے تو اسکے بسم اللہ کہنے کا مقصد خود بخود سمجھ میں آ رہا ہوتا ہے کہ وہ بسم اللہ کے قول سے "اقوم بسم اللہ" یا "اقعد بسم اللہ" یا اسی طرح کے دیگر افعال مراد ہیں۔ (تفسیر طبری)

ب کی وجہ

ب۔ ساتھ، اسم۔ نام، اللہ۔ اللہ۔ الرحمن۔ بہت مہربان۔ الرحیم۔ نہایت رحم والا۔

عربی میں "ب" ملانے کے لیے آتی ہے۔ بسم اللہ کو "ب" سے شروع کیا گیا۔ عالم ارواح میں انسان نے سب سے پہلے لفظ بلیٰ بولا تھا اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔ "کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟" سب نے عرض کیا بلیٰ یعنی ہاں۔ تو سب سے پہلے انسان کے منہ سے ب نکلی۔

اللہ تعالیٰ نے بھی اپنا کلام "ب" سے شروع فرمایا۔ تاکہ تلاوت کرتے وقت وہ عہد میثاق یاد آجائے۔ کفار اپنے ہر کام کو بتوں کے نام سے شروع کرتے تھے ان کا یہ عقیدہ تھا کہ بسم الات۔ بسم العزی۔ بسم منات۔ بسم نائلۃ۔ کے نام سے اس چیز میں برکت ہو جائے گی۔

تعلیم مسلمان

اس میں ہر مسلمان کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ وہ اپنے ہر کام کو اللہ کے نام سے شروع کرے تاکہ لفظ اللہ سے برکت اور مدد حاصل ہو سکے۔

حضور پر نور سید یوم النشور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ تعلیم دی کہ ہر امر ذیشان **بسم اللہ الرحمن الرحیم** سے شروع کرو یہاں تک کہ دروازہ بند کرو تو اللہ کا نام لو، دیا بجھاؤ تو اللہ کے نام سے، برتن ڈھانپو تو اللہ کے نام سے، مشک کا منہ باندھو تو اللہ کے نام سے۔

یعنی ہر نیک کام بڑا ہو یا چھوٹا کرتے وقت اپنے خالق مالک حقیقی کا نام لے کر کرو تاکہ اس کی برکت سے مشکلیں آسان ہو جائیں۔

حدیث میں آیا ہے کہ کھانے کی ابتداء بھی بسم اللہ سے کی جائے اور اگر نہ پڑھی جائے تو شیطان کھانے میں شامل ہو جاتا ہے اس لیے جب بھی یاد آئے تو یوں پڑھے بسم اللہ اولہ واخرہ اور روایات میں ہے کہ بسم اللہ پڑھنے سے شیطان کھانے سے علیحدہ ہو جاتا ہے اور کھانے کی برکت لوٹ آتی ہے۔

جب **بسم اللہ الرحمن الرحیم** نازل ہوئی تو ایک ابر شرق کی طرف روانہ ہوا۔ ہوائیں ٹھہر گئیں۔ دریا جوش میں آیا۔ جانوروں نے سننے کے لیے کان لگائے۔ آسمان سے شیاطین کو شعلے مارے گئے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی عزت وجلال کی قسم کھا کر فرمایا کہ بسم اللہ جس شے پر پڑھی جائے میں اس میں برکت عطا کروں گا۔ (تفسیر عماد الدین ابو الفداء (رح))۔

حضرت ابو ہریرہ (رض) فرماتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا اے ابو ہریرہ جب تم وضو کرنے لگو تو بسم اللہ پڑھ لیا کرو جب تک تم وضو سے فارغ ہو گے فرشتے تمہارے لیے نیکیاں لکھتے رہیں گے۔

مسئلہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ مستقل ایک آیت ہے۔ مگر سورت فاتحہ یا کسی سورت کا جزو نہیں اس لیے نماز میں باآواز نہ پڑھ جائے۔

تراویح میں جو ختم کیا جاتا ہے اس میں ایک مرتبہ بسم اللہ باآواز ضرور پڑھی جائے تا کہ ایک آیت قرآن کی باقی نہ رہ جائے۔

قرآن کریم کی ہر سورت بسم اللہ سے شروع کی جاتی ہے سوائے سورت برات کے۔ سورت نمل میں آیت سجدہ کے بعد جو بسم اللہ آتی ہے وہ مستقل آیت نہیں بلکہ جزو آیت ہے اس آیت کے ساتھ ضرور پڑھی جائے۔

مباح کام بسم اللہ سے شروع کرنا مستحب ہے ناجائز کام پر بسم اللہ پڑھنا ممنوع ہے۔

حضرت امام اہل سنت عظیم البرکت محدث اعظم شاہ سید ابو محمد سید دیدار علی شاہ صاحب (رح) نے اس حدیث کو اس طرح بیان فرمایا۔

حضرت ابو داؤد سعید بن جبیر (رض) سے فرماتے ہیں کہ شافع محشر تاجدار عرب و عجم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مکہ معظمہ میں بسم اللہ الرحمن الرحیم نماز میں بلند آواز سے پڑھتے تھے۔ مکہ کے لوگ مسلیمہ کو رحمن کہتے تھے مشرکین مکہ نے کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہم کو معبود اہل یمامہ یعنی مسلیمہ کذاب کی طرف بلاتے ہیں لہٰذا حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حکم فرمایا کہ بسم اللہ پوشیدہ پڑھا کرو۔ پھر تا وقت وصال کبھی نماز میں باآواز بسم اللہ نہیں پڑھی۔

حضرت عبد اللہ بن عباس (رض) نے فرمایا کہ جب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) باآواز پڑھتے تو مشرکین ٹھٹھا اور مذاق کرتے اور کہتے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یمامہ کے مسلیمہ کی یاد کرتے ہیں جب بسم اللہ نازل ہوئی تو آپ نے فرمایا کہ نماز میں بسم اللہ باآواز نہ پڑھی جائے۔

حضرت عبد اللہ بن مغفل (رح) فرماتے ہیں کہ میرے والد ماجد (رح) نے مجھ کو باآواز نماز میں بسم اللہ پڑھتے سنا تو فرمایا! بیٹا یہ بدعت ہے۔

میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پیچھے نماز پڑھی میں نے ان کو آواز سے بسم اللہ پڑھتے نہیں سنا۔

فضائل بسم اللہ

حضرت شاہ عبد العزیز (رح) تفسیر عزیزی میں تحریر فرماتے ہیں کہ تمام علوم اللہ کی کتابوں کے قرآن کریم میں موجود ہیں اور تمام علوم قرآن سورۃ فاتحہ میں ہیں اور تمام علوم سورۃ فاتحہ کے بسم اللہ میں ہیں اور خلاصہ تمام علوم کا بسم اللہ میں ہے۔ حضرت سلیمان (علیہ السلام) نے جب ملکہ سبا بلقیس کو خط لکھا تو اس میں لکھا انہ من سلیمن وانہ بسم اللہ الرحمن الرحیم اس کی برکت سے بلقیس نکاح میں آئیں اور پورا ملک حضرت سلیمان (علیہ السلام) کے قبضہ میں آگیا۔

حضرت سیدنا فاروق اعظم (رض) کی خدمت میں روم کے بادشاہ۔ شاہ ہر قل نے خط لکھا جس میں درد سر کی شکایت تھی۔ آپ نے بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھ کر ٹوپی میں رکھ دی جب وہ ٹوپی پہن کر بیٹھتا سر درد کافور ہو جاتا تھا۔

حضرت خالد بن ولید (رض) نے بسم اللہ پڑھ کر زہر پی لیا زہر نے اثر نہ کیا۔

تفسیر باقوال حسنات

بسم اللہ شریف میں تین نام اختیار کئے گئے ہیں۔ اللہ، رحمن، رحیم۔ ہر کام کے اندر مدد ان تین ناموں ہی سے حاصل کی جاتی ہے اور ان اسماء کے اختیار کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ہر کام خواہ دنیوی ہو یا اخروی تین ہی چیزوں پر موقوف ہے۔

اول: اس کے اسباب جمع کرنا یہ اسم اللہ کے تصرفات ہیں اس لیے کہ یہ اسم ذات ہے جس میں تمام صفات مضمر ہیں۔

دوسرے: اس کام کی بقاء ابتداء سے انتہاء تک ہونا اور یہ اسم رحمن کے مقتضیات سے ہے کہ وہ رحیم و کریم اپنے بندوں کی مساعی رائیگاں نہیں فرماتا۔

تیسرے ہر کام کی ترتیب ضروری ہے تا کہ بالترتیب وہ کام انجام پذیر ہو اور یہ اسم رحیم کے مقتضیات سے ہے کہ وہ رحیم و کریم اپنے بندوں کی محنت کو ضائع نہیں کرتا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ان اللہ لا یضیع عمل عامل منکم۔ بیشک اللہ تم میں سے کسی کا عمل بھی ضائع نہیں کرتا۔ (حسنات)

لفظ اللہ کی تحقیق

اللہ: اس کی اصل الالہ ہے اس کی نظیر الناس کا لفظ ہے جس کی اصل اناس ہے ہمزہ کو حذف کر کے ابتدا میں الف لام کا اضافہ کر دیا الہ کا لفظ اسماء جنس میں سے ہے۔ ہر حق و باطل پر بولا جاتا ہے، پھر معبود حقیقی کے لیے اس کا استعمال غالب آگیا۔ جیسا کہ النجم کا لفظ ہر ستارے پر بولا جاتا ہے، پھر ثریا (کہکشاں) کے لیے اس کا استعمال غالب ہو گیا۔ اللہ کا لفظ حذف ہمزہ کے ساتھ فقط معبود برحق ہی بولا جاتا ہے، غیر پر اس کا اطلاق نہیں ہو سکتا یہ اسم ہے، صفت نہیں۔
دلیل 1: کیونکہ اس کو بطور موصوف لاتے ہیں خود اس کو بطور صفت استعمال نہیں کرتے، اس طرح یہ نہیں کہا جاتا شئی الہ، جس طرح کہ شئی رجل نہیں کہتے، بلکہ کہتے ہیں الہ واحد صمد الہ جو اکیلا بے نیاز ہے۔
دلیل 2: اللہ تعالیٰ کی صفت کے لیے ضروری ہے کہ کوئی ایسا موصوف ہو جس پر وہ صفات بولی جائیں، پھر اگر تمام کو صفات قرار دیا جائے تو کہنا پڑے گا کہ یہ صفات تو ہیں مگر ان کا موصوف کوئی نہیں، اور یہ بات درست نہیں۔

علماء نحو کا اختلاف

جلیل القدر علماء نحو خلیل، زجاج، محمد بن الحسین، حسین بن الفضل رحمہم اللہ نے اس کو مشتق نہیں مانا بلکہ اشتقاق کا انکار کیا۔

اشتقاق کا معنی

بعض نے کہا اشتقاق کا معنی یہ ہے کہ ترکیب اور معنی میں دو یا زیادہ لفظ مشترک ہو جائیں، اس اسم کا لفظ الہ یالہ (حیران ہونا) ہو۔ یہ لفظ حیرانی اور دہشت کو اپنے اندر شامل کرنے والے ہیں، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ معبود کی پہچان

میں وہم و گمان حیران ہیں، اور بڑے تیز عقل والے دہشت زدہ ہیں، اسی وجہ سے گمراہی کثرت سے ہے، اور باطل پھیل رہاہے، اور صحیح سوچ و فکر کی کمی ہے۔

دوسرا قول:

بعض نے کہا یہ الہ یالہ الاھا، اس نے عبادت کی، سے ماخوذ ہے یہ مصدر ہے جو مالوہ بمعنی معبود کے مستعمل ہے، جیس کہ آیت: (ھذا خلق اللہ) لقمان: 11۔ میں خلق کا لفظ بمعنی مخلوق استعمال ہوا ہے۔

اختلاف قرات

جب اس میں لام سے قبل ضمہ یا فتحہ ہو تو لام کو تفخیم پڑھا جائے گا، اور اگر لام سے پہلے کسرہ ہو تو ترقیق ہو گی بعض قرا نے ہر حال میں ترقیق کی ہے جبکہ دوسروں نے ہر حال میں تفخیم مگر جمہور کا قول وہی ہے جو ہم نے پہلے نقل کر دیا۔ (مدارک التنزیل نسفیؒ)

الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ

جو بہت مہربان رحمت والا ہے

امام فخر الدین رازی (رح) فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کو رحمن اور رحیم فرمایا تو یہ اس کی شان سے بعید ہے کہ وہ رحم نہ فرمائے۔ مروی ہے کہ ایک سائل نے بلند دروازے کے پاس کھڑے ہو کر کچھ مانگا تو اسے تھوڑا سا دے دیا گیا، دوسرے دن وہ ایک کلہاڑا لے کر آیا اور دروازے کو توڑنا شروع کر دیا۔ اس سے کہا گیا کہ تو ایسا کیوں کر رہا ہے؟ اس نے جواب دیا: تو دروازے کو اپنی عطا کے لائق کر یا اپنی عطا کو دروازے کے لائق بنا۔ اے ہمارے اللہ! عَزَّوَجَلَّ، رحمت کے سمندروں کو تیری رحمت سے وہ نسبت ہے جو ایک چھوٹے سے ذرے کو تیرے عرش سے نسبت ہے اور تو نے اپنی کتاب کی ابتداء میں اپنے بندوں پر اپنی رحمت کی صفت بیان کی اس لیے ہمیں اپنی رحمت اور فضل سے محروم نہ رکھنا۔ (تفسیر کبیر، الباب الحادی عشر فی بعض النکت المستخرجۃ۔۔ الخ، ۱/۱۵۳)

بِسۡمِ اللّٰہِ “ سے متعلق چند شرعی مسائل

علماء کرام نے ”بِسۡمِ اللّٰہِ “ سے متعلق بہت سے شرعی مسائل بیان کئے ہیں، ان میں سے چند درج ذیل ہیں:

(1)۔۔جو ”بِسۡمِ اللّٰہِ “ ہر سورت کے شروع میں لکھی ہوئی ہے، یہ پوری آیت ہے اور جو ”سورۂ نمل “ کی آیت نمبر 30 میں ہے وہ اس آیت کا ایک حصہ ہے۔

(2)۔۔ ”بِسۡمِ اللّٰہِ “ ہر سورت کے شروع کی آیت نہیں ہے بلکہ پورے قرآن کی ایک آیت ہے جسے ہر سورت کے شروع میں لکھ دیا گیا تاکہ دو سورتوں کے درمیان فاصلہ ہو جائے، اسی لیے سورت کے اوپر امتیازی شان میں ”بِسۡمِ اللّٰہِ “ لکھی جاتی ہے آیات کی طرح ملا کر نہیں لکھتے اور امام جہری نمازوں میں ”بِسۡمِ اللّٰہِ “ آواز سے نہیں پڑھتا، نیز حضرت جبرائیل عَلَیۡہِ السَّلَام جو پہلی وحی لائے اس میں ”بِسۡمِ اللّٰہِ “ نہ تھی۔

(3)۔۔تراویح پڑھانے والے کو چاہیے کہ وہ کسی ایک سورت کے شروع میں ”بِسۡمِ اللّٰہِ “ آواز سے پڑھے تاکہ ایک آیت رہ نہ جائے۔

(4)۔۔تلاوت شروع کرنے سے پہلے ”اَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ “ پڑھنا سنت ہے، لیکن اگر شاگرد استاد سے قرآن مجید پڑھ رہا ہو تو اس کے لیے سنت نہیں۔

(5)۔۔سورت کی ابتداء میں ”بِسۡمِ اللّٰہِ “ پڑھنا سنت ہے ورنہ مستحب ہے۔

(6)۔۔اگر ”سورۂ توبہ “ سے تلاوت شروع کی جائے تو ”اَعُوۡذُ بِاللّٰہِ “ اور ”بِسۡمِ اللّٰہِ “ دونوں کو پڑھا جائے اور اگر تلاوت کے دوران سورۂ توبہ آجائے تو ”بِسۡمِ اللّٰہِ “ پڑھنے کی حاجت نہیں۔(صراط)

اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم

میں شیطان مردود (کے وسوسوں) سے اللہ کی پناہ میں آتا ہوں:

اعوذ باللہ کے مفردات کے معانی:

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(آیت) "فاذا قرات القرآن فاستعذ باللہ من الشیطن الرجیم"۔(النحل:۹۸) پس جب آپ قرآن پڑھنے لگیں تو شیطان مردود سے اللہ کی پناہ طلب کریں۔

اسلامی تہذیب اور بِسۡمِ اللّٰهِ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

ہر ذی روح اپنی ضروریات کے حصول کے لیے اپنے معمولات کو انجام دینے کا پابند ہے کیونکہ کسی عمل کے بغیر اسے اپنی ضروریات میسر نہیں آسکتیں جب کہ ضروریات کے میسر آنے پر ہی اس کی زندگی کا دارومدار ہے جسے بھی اللہ نے جسم و جان سے نوازا ہے وہ اپنی جسمانی بقا کے لیے معمولات کا ایک طریقہ بنانے، اسے سرانجام دینے اور اس کے لیے محنت کرنے کا محتاج ہے اس میں کسی مخلوق کی خصوصیت نہیں بلکہ حشرات الارض سے لے کر انسان تک یہی ایک قدر مشترک ہے جو ساری مخلوقات میں نظر آتی ہے لیکن جہاں سے انسانی زندگی کا سفر شروع ہوتا ہے وہیں ہم ایک اور چیز بھی جنم لیتی ہوئی دیکھتے ہیں وہ یہ کہ ہر ذی روح مخلوق اپنی ضروریات زندگی کے حصول کے لیے محنت کرتی اور دکھ اٹھاتی ہے اور اس کے پیش نظر سوائے جسمانی زندگی کی ضرورتیں پورا کرنے کے اور کچھ نہیں ہوتا لیکن انسان میں انھیں معمولات کو انجام دیتے ہوئے ایک تقسیم شروع ہو جاتی ہے جسے ہم تہذیب کے نام سے جانتے ہیں جو مہذب انسان ہیں وہ ضروریات زندگی کے حصول کے ساتھ ساتھ ہر کام کرنے سے پہلے کچھ اور تصورات بھی رکھتے ہیں جو انھیں ان کی تہذیب سکھاتی ہے اور جو غیر مہذب لوگ ہیں وہ انسان ہوتے ہوئے بھی حیوانیت کے ان تصورات سے آگے نہیں بڑھتے جن کا ذکر ہم نے ہر ذی روح کے حوالے سے کیا ہے البتہ انسانوں میں مزید ایک یہ فرق بھی رہتا ہے کہ جن کی تہذیب اعلیٰ درجے کی ہے ان کے تصورات بھی اعلیٰ اور برتر قسم کے ہوں گے اور جن کی تہذیب پست اور حقیقی انسانی مقاصد تک نہیں پہنچی ان کے تصورات تہذیب کے نمائندہ ہوتے ہوئے بھی اعلیٰ اقدار کے نمائندہ نہیں ہوتے۔

اسلام نے اپنے ماننے والوں کو جو تہذیب دی ہے مسلمانوں کی پوری زندگی اسی تہذیب میں ڈھل کر نکلتی ہے ان کا ہر کام اسی تہذیب کا غماز ہوتا ہے چنانچہ اسی تہذیب کا ایک حصہ یہ بھی ہے کہ جب مسلمان کسی کام کو آغاز کرنا چاہیں تو

کیا وہ صرف یہ سوچ کر آغاز کریں کہ ہمیں اس کام کے نتیجے میں جسمانی ضرورتوں کے حصول میں مدد ملے گی یا ہماری خواہشات اور ہماری بہیمانہ ضروریات کو پورا کرنے میں آسانی ہو جائے گی یا اس کے علاوہ بھی ان کے کچھ تصورات ہونے چاہئیں چنانچہ ان کی تہذیب نے ان کو یہ سکھایا ہے کہ تمہارے مذہب، تمہارے دین اور اس سے پیدا ہونے والی تمہاری تہذیب کی بنیاد اللہ سے متعلق تمہارے صحیح تصور پر ہے اس لیے تمہارے ہر کام میں اسی تصور کو نمایاں مقام ملنا چاہیے چنانچہ نسل انسانی کے آغاز سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ تصور دیا گیا ہو گا پوری نسل انسانی کی تاریخ جو حضرت آدم (علیہ السلام) سے شروع ہوتی ہے چونکہ پوری طرح محفوظ نہیں رہی اس لیے نوح (علیہ السلام) سے پہلے اس بات کا تو یقین ہے کہ انھیں بھی اسی طرح کی ہدایت ملی ہو گی لیکن اس کی کوئی حتمی گواہی انسانی تاریخ میں موجود نہیں البتہ نوح (علیہ السلام) کے زمانے سے ہم جانتے ہیں کہ اس وقت کے مسلمانوں کو بھی یہ تہذیب سکھائی گئی تھی کہ تمہیں ہر کام کرنے سے پہلے اپنے ذہن میں اللہ کے تصور کو تازہ کرنا ہے اور اس کے بعد اللہ کا نام لے کر کام کا آغاز کرنا ہے چنانچہ حضرت نوح (علیہ السلام) کے حالات کو بیان کرتے ہوئے قرآن کریم نے بتایا ہے کہ کفار کے مسلسل کفر کے باعث جب اللہ تعالیٰ کا عذاب طوفان کی شکل میں آیا تو حضرت نوح (علیہ السلام) جو اللہ کے حکم سے کشتی تیار کر چکے تھے انھوں نے کشتی پانی میں اتاری اور اپنے تمام ماننے والوں کو حکم دیا کہ اس کشتی پر سوار ہو جاؤ یہی کشتی تمہارے ایمان کی وجہ سے تمہارے لیے نجات کا باعث بنائی گئی ہے چنانچہ انھیں کشتی میں سوار کرتے ہوئے آپ نے جو الفاظ کہے قرآن کریم نے اس کو نقل کیا ہے۔ ارشاد فرمایا:

وَقَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا ؕ اِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (ہود۔۱۱:۴۱)

(اور اس نے کہا کہ اس میں سوار ہو جاؤ، اللہ ہی کے نام سے ہے اس کا چلنا اور اس کا ٹھہرنا، بیشک میرا رب بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔)

اسی طرح سورۃ النمل سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمان (علیہ السلام) کو جب خبر ہوئی کہ یمن میں ایک ایسی حکومت ہے جس کی ملکہ اور اس کی رعایا ابھی تک کفر پر قائم ہیں تو آپ نے یمن کی ملکہ بلقیس کو جو خط لکھا اس کا آغاز انھیں الفاظ سے کیا گیا۔ قرآن کریم نے اس کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ (نمل۔۲۷:۳۰) یہ سلیمان کی جانب سے ہے اور اس کا آغاز بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ سے

ہوا ہے۔ ان دونوں مثالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ پروردگار نے آغاز ہی سے انسانوں کو یہ تہذیب سکھائی کہ تمہیں ہر کام کی ابتداء کرتے ہوئے اللہ کا نام لینا چاہیے بعض اہل علم کا خیال ہے کہ اللہ کا نام لینے کا حکم تو تمام سابقہ امتوں کو دیا گیا تھا لیکن بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ صرف قرآن کریم کی خصوصیت ہے لیکن یہ رائے صحیح معلوم نہیں ہوتی کیونکہ حضرت سلیمان (علیہ السلام) کے خط سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپ نہ صرف اس سے واقف تھے بلکہ ہر کام کی ابتداء اسی سے کرتے تھے جیسا کہ آپ نے اپنے خط کی ابتداء اسی سے کی۔

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بعثت سے پہلے مشرکین عرب اپنے کاموں کی ابتداء بتوں کے نام سے کیا کرتے تھے کیونکہ ان کی تہذیب کی بنیاد ان کی بت پرستی کے تصورات تھے لیکن آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر جو پہلی وحی اتری اس میں سب سے پہلا حکم یہی دیا گیا اِقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّكَ الَّذِیۡ خَلَقَ (۹۶:۱) پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے آپ کو پیدا کیا"۔ اس میں یہ ہدایت دی گئی کہ آئندہ آپ کو ہر کام اللہ کے نام سے کرنا چاہیے چنانچہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا اس کے بعد معمول ہو گیا کہ آپ ہر کام سے پہلے باسمک اللہ پڑھتے اور لکھتے تھے اور جب بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ نازل ہو گئی تو پھر آپ اور مسلمان ہر کام کے آغاز کے لیے نہ صرف کہ اسی کو پڑھنے لگے بلکہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ہر چھوٹے سے چھوٹے کام کے لیے اسی کے پڑھنے کا حکم دیا اور اس کی بار بار تاکید فرمائی۔ ایک حدیث میں ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "کہ گھر کا دروازہ بند کرو تو بِسۡمِ اللّٰہِ کہو، چراغ گل کرو تو بِسۡمِ اللّٰہِ کہو، برتن ڈھکو تو بِسۡمِ اللّٰہِ کہو، کھانا کھانے، پانی پینے، وضو کرنے، سواری پر سوار ہونے اور اترنے کے وقت بِسۡمِ اللّٰہِ پڑھنے کی ہدایات قرآن و حدیث میں بار بار آئی ہیں۔"

بِسۡمِ اللّٰہِ کی اس قدر تاکید کیوں؟

سوال یہ ہے کہ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ پڑھنے کی اس قدر تاکید کیوں کی گئی ہے حقیقت یہ ہے کہ جب ہم اس پر غور کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس چھوٹی سی ہدایت نے انسانی زندگی میں ایک بہت بڑی تبدیلی کا آغاز کر دیا ہے کوئی بھی شخص جب کسی کام کا آغاز کرتا ہے اگر اس کے ذہن میں یہ تصورات نہیں ہیں جو اس ہدایت سے

پیدا کرنا مقصود ہیں تو یقیناوہ ہر کام کرتے ہوئے یہ سمجھتا ہے کہ میں جو کچھ کر رہاہوں یہ سراسر میری ہمتوں، صلاحیتوں اور توانائیوں کا مرہون منت ہے میرے پاس جو ذہنی صلاحیتیں ہیں اور جسمانی توانائیاں ہیں اور میرے پاس جو وسائل میسر ہیں میں ان سے کام لے کر ایسا کوئی سا بھی کام کرنا چاہوں تو میرے لیے کوئی مشکل نہیں ایسے آدمی کا تمام تر بھروسہ اپنے وسائل اور اپنی قوتوں پر ہوتا ہے پھر اسی سے اس کے ذہن میں یہ تصور بھی پختہ ہو جاتا ہے کہ میں چونکہ اپنی صلاحیتوں اور اپنے وسائل سے تمام کام انجام دیتاہوں تو مجھے اپنے کاموں کے سلسلے میں کسی کے سامنے جواب نہیں دینا میں کام اچھا کروں گا تو اس کی جزا مجھے ملے گی اور اگر کام برا کروں گا تو یہیں اس کے نتائج خود دیکھ لوں گا اور ممکن ہے کہ میں ان کاموں کو نتیجہ خیز ہونے سے پہلے بدل دوں یا اس کے اثرات زائل کر دوں اسی طرح وہ یہ بھی سمجھتا ہے کہ میرا رشتہ کسی ایسی ذات سے نہیں جو ہر وقت میری نگرانی کرتی ہو، میری تنہائیاں جس کے سامنے واضح ہوں، جو میری نیتوں تک سے واقف ہو، جس نے میرے لیے زندگی کے کچھ اصول یا کوئی تہذیب عطا کی ہو اور کبھی ایسا دن آئے گا جب وہ ذات میرے ان کاموں سے متعلق مجھ سے سوال کرے گی وہ ایسی ہر سوچ اور ہر تصور سے بالا ہو کر اپنی ذات کے گنبد میں بند رہ کر اپنے مفادات کے حوالے سے ہر کام کو سرانجام دیتا ہے اگر وہ امیر ہے تو اس کی امارت اس کی خواہشات کی تکمیل میں صرف ہوتی ہے اگر وہ حاکم ہے تو اس کی حکومت دوسروں کے لیے ظلم بن جاتی ہے اگر وہ پڑھالکھا آدمی ہے تو اس کا علم برائی کا خادم بن جاتا ہے اور اگر وہ غریب آدمی ہے تو اس کی غربت صاحب امارت لوگوں کی دشمن بن جاتی ہے اس کے اندر کا جوار بھاٹا بعض دفعہ نئے نئے جرائم کو جنم دیتا ہے اور اس کی محرومیاں اس کے اندر انتقام کی آگ بھڑکاتی ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسی سوچ کے لوگ کسی بھی حیثیت کے مالک ہوں وہ اپنے ان بگڑے ہوئے تصورات کے باعث انسانیت کے لیے مہلک ثابت ہوتے ہیں ایسے تمام خطرات سے بچانے کے لیے نہایت حکیمانہ طریقے سے یہ مختصر سا حکم دے کر ایک ایسی تہذیب کی پہلی اینٹ رکھ دی گئی ہے جس کے نتیجے میں ایک ایسی عمارت وجود میں آتی ہے جس کے سائے میں انسانیت میٹھی نیند سوتی اور اقدار انسانیت پھلتے پھولتے ہیں جب ایک شخص بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ پڑھ کر ہر کام کا آغاز کرتا ہے تو فوراً اس کے ذہن میں یہ تصورات تازہ ہوتے ہیں کہ تم جن قوتوں اور صلاحیتوں سے کام لے کر یہ کام کرنے لگے ہو وہ تمہاری ذاتی نہیں اس ذات نے تمہیں عطا کی ہیں جس نے تمہیں پیدا کیا وہ تمہیں ہر کام کرتے ہوئے دیکھتا ہے تم ہر وقت اس کی نگرانی میں

ہو تمہارے ہر کام اور ہر عمل کا ایک نوشتہ تیار ہو رہا ہے ایک دن ایسا آئے گا جب تمہیں اپنے ہر عمل کا جواب دینا پڑے گا تم سے پوچھا جائے گا کہ ہم نے تمہیں بے مقصد تو پیدا نہیں کیا تھا تمہیں ہر کام اپنے مقصد زندگی کے مطابق کرنا چاہیے تھا آج اسی مقصد کے حوالے سے تمہارے ہر کام کا حساب لیا جائے گا یہ تصورات جیسے جیسے اس کے دل و دماغ میں پختہ ہوتے جاتے ہیں ویسے ویسے اس کی نیت، اس کے اعمال اور اس کے اعمال کے نتائج صالح ہوتے جاتے ہیں وہ اپنی ذات میں ایک خیر کا سرچشمہ بن جاتا ہے جس سے ہر وقت لوگوں کے لیے بھلائی ابلتی ہے اور نیکی کی قوتوں کو فروغ ملتا ہے یہ ان تہذیبی تصورات کا اجمالی خاکہ ہے جو اس مختصر سی ہدایت سے وجود میں آتے اور آہستہ آہستہ پروان چڑھتے چلے جاتے ہیں۔

ان تصورات کے ساتھ ساتھ کچھ حقائق بھی ہیں بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ پڑھنے سے جن کا اظہار ہوتا ہے۔ آپ کو یاد ہے کہ پہلی وحی میں اللہ تعالیٰ نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو حکم دیا تھا اِقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّكَ الَّذِىۡ خَلَقَۚ (۱:۹۶) ہم جب قرآن پاک کی تلاوت بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ سے شروع کرتے ہیں تو ہم اللہ کے اس حکم پر عمل کرتے ہیں اسی طرح یہ آیہ مبارکہ ہمیں اللہ کے ایک عظیم احسان کی یاد دلاتی ہے۔ اللہ کا وہ عظیم احسان یہ ہے کہ اس نے انسان کو نطق اور گویائی کی نعمت عطا فرمائی اگر ہمیں یہ نعمت میسر نہ آتی تو قرآن جیسی دولت بھی ہمیں نہ ملتی کیونکہ قرآن کریم کا تعلق زیادہ تر اسی صلاحیت سے ہے اور یہ اتنی بڑی نعمت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خود سورۃ الرحمن کے آغاز میں اس کا ذکر فرمایا۔ ارشاد ہوتا ہے اَلرَّحۡمٰنُ لا عَلَّمَ الۡقُرۡاٰنَ خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ لا عَلَّمَهُ الۡبَيَانَ (۵۵:۱۔۴) "خدائے رحمان نے قرآن سکھایا اور اس نے انسان کو پیدا کیا اور اس کو گویائی کی تعلیم دی"۔ مزید بر آں یہ کہ اس مبارک کلمہ کی تلاوت سے موسیٰ (علیہ السلام) کی ایک خاص پیش گوئی کی تصدیق بھی ہوتی ہے جس کی سند گزشتہ آسمانی صحیفوں میں موجود ہے وہ یہ ہے کہ آپ خلق خدا کو جو تعلیم دیں گے وہ اللہ کا نام لے کر دیں گے۔ حضرت موسیٰ کی پانچویں کتاب باب اٹھارہ (۱۸۔۱۹) میں یہ الفاظ وارد ہیں۔ "میں ان کے لیے انھیں کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے حکم دوں گا

وہی وہ ان سے کہے گا اور جو کوئی میری ان باتوں کو جن کو وہ میرا نام لے کر کہے گا نہ سنے گا تو میں اس کا حساب ان سے لوں گا۔"

صرف شریعت کے مطابق کام سے پہلے بِسۡمِ اللّٰہِ پڑھنی چاہیے

ایک اور پہلو سے بھی ہر کام کو اس مبارک کلمہ کے ساتھ کرنے کی اس طرح آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے تاکید فرمائی ہے جس سے اس کی افادیت میں بہت اضافہ ہو جاتا ہے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کل امر ذی بال لم یبدا بباسم اللہ فھو اقطع او ابتر "ہر جائز کام جسے بسم اللہ سے شروع نہ کیا جائے وہ بے برکت اور بے نتیجہ ہوتا ہے۔ "اس حدیث سے پہلی بات تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ ہر جائز کام کرنے سے پہلے بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ پڑھنا چاہیے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی کام ناجائز ہو یعنی جسے اسلامی شریعت نے کرنے کی اجازت نہ دی ہو اس کا ارتکاب کسی مسلمان کے لیے ویسے ہی شرم کی بات ہے لیکن اس سے بڑھ کر بدنصیبی کی انتہاء یہ ہے کہ آدمی کسی ناجائز کام کو اللہ کے نام سے شروع کرے یعنی اللہ کا حکم اللہ ہی کے نام سے توڑا جائے یہ نہ صرف کہ گناہ ہے بلکہ ایک طرح سے اللہ کے حکم کے خلاف بغاوت ہے گناہ تو اللہ کی رحمت سے معاف ہو جاتا ہے بغاوت کا معاملہ تو بہت شدید ہے لیکن ہماری جسارتوں کی کیا انتہاء ہے کہ ہمارے امراء اللہ کی شریعت کا مذاق اڑاتے ہوئے سینما ہاؤس تک بنائیں گے اور پھر اپنے ضمیر کو یا لوگوں کو دھوکہ دینے کے لیے اس کا آغاز تلاوت قرآن کریم سے کیا جائے گا۔ اسی طرح کی اور بہت سی مثالیں آپ کو دیکھنے کو ملیں گی اس لیے اس حدیث میں یہ قید لگائی گئی ہے کہ ہر جائز کام کو کرو اور اللہ کے نام سے کرو۔

برکت کا اصل مفہوم

دوسری بات یہ ارشاد فرمائی گئی ہے کہ کوئی بھی جائز کام اللہ کے نام سے کیا جائے تو اللہ اس میں برکت دیتا ہے اور اگر اللہ کا نام نہ لیا جائے تو بے برکتی ہوتی ہے ضروری ہے کہ برکت کا مفہوم سمجھ لیا جائے ورنہ اس سے غلط فہمی کا اندیشہ ہے۔ برکت کا لفظی معنی تو بڑھنا اور ترقی کرنا ہوتا ہے لیکن ہر بڑھنے کو برکت نہیں کہتے ایک آدمی کا جسم موٹا ہو جائے

یا پھول جائے لیکن ہمت نہ ہو تو ڈاکٹر بتاتے ہیں کہ اس کا جسم متورم ہو گیا ہے یا اس کے جسم میں پانی پڑ گیا ہے دونوں باتیں خطرناک بیماریوں کی خبر دیتی ہیں کوئی بھی شخص اسے صحت قرار دینے کی حماقت نہیں کرے گا حالانکہ بظاہر اس کے جسم میں برکت معلوم ہوتی ہے اس لیے میں نے عرض کیا کہ ہر اضافہ اور ہر ترقی برکت نہیں ہوتی بلکہ وہ اضافہ اور ترقی برکت ہے جو صحت کے اصولوں کے مطابق ہے اسی طرح یہاں جس بات کو برکت کہا گیا ہے وہ بھی وہ برکت ہے جو شریعت کے اصولوں اور مقاصد کے مطابق ہو اس کو میں ایک مثال سے واضح کرنے کی کوشش کرتا ہوں آدمی جب غذا لیتا ہے تو اس کے کچھ تو طبی اصول ہیں اور کچھ اس کے مقاصد ہیں طبی اصول میں سب سے بڑی بات یہ ہے کہ غذا مضر صحت نہ ہو بلکہ حفظان صحت کے اصولوں کے مطابق ہو اور مقاصد میں سے پہلی بات یہ ہے کہ غذا جزو بدن بنے اور دوسری بات یہ کہ اس سے خون تیار ہو اور تیسری یہ بات کہ خون جسم میں قوت کا باعث بنے یہ تین چیزیں وجود میں آجاتی ہیں تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ صحیح غذا نے اپنے مقاصد پورے کر دیئے ہیں لیکن اسلامی نقطہ نگاہ سے ایک مقصد ابھی باقی ہے وہ اگر پورا نہیں ہوتا تو اسے بے برکتی کہا جاتا ہے اور اگر پورا ہو جاتا ہے تو اسے برکت سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ مقصد یہ ہے کہ غذا نے جسم کو جو قوت، طاقت اور ہمت عطا کی ہے اگر وہ اللہ کے دین کی سربلندی اور اللہ کے بندوں کی خدمت میں صرف ہوتی ہے تو سمجھ لینا چاہیے کہ اللہ نے اس میں برکت دی ہے لیکن اگر وہ لادینیت کی خدمت اور شیطانی مقصد کے فروغ میں استعمال ہوتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ غذا اپنے سارے مقاصد پورا کرنے کے باوجود بے برکتی کا باعث بنی ہے۔ مختصر یہ کہ جسم کی قوت کا حقیقی مقصد یہ ہے کہ اس کے ذریعے سے اللہ کا کلمہ بلند ہو، شرافتیں توانا ہوں، نیکیوں کو فروغ ملے، مظلوموں کی حمایت اور دستگیری کے کام آئے، غریبوں کے دکھوں کا بوجھ اٹھائے اور انسانیت کی تقویت کا باعث بنے لیکن اگر یہی قوت ظلم کا باعث بنتی، نیکی کا راستہ روکتی، شرافتوں کو رسوا کرتی اور اذیتوں کا باعث بنتی ہے تو یہ قوت نہ صرف یہ کہ حقیقی مقصد سے محروم ہو گئی ہے بلکہ یہ وہ بے برکتی ہے جس سے اس حدیث میں متنبہ کیا گیا ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ کا مفہوم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ کی عظمت، اہمیت اور افادیت سمجھنے کے بعد یہ بھی جاننا چاہیے کہ اس کے الفاظ کا مفہوم کیا ہے جس سے ہمیں اندازہ ہو جائے گا کہ جب ہم کسی کام کے آغاز میں یہ مبارک کلمہ بولتے ہیں تو اس وقت ہمارے ذہن میں اس کا مفہوم کیا ہونا چاہیے۔

بِسۡمِ اللّٰہ تین لفظوں سے مرکب ہے ایک حرف با، دوسرے اسم، تیسرے اللہ، حرف با عربی زبان میں بہت سے معنی کے لیے استعمال ہوتا ہے جن میں سے وہ معنی جو اس مقام کے مناسب ہیں وہ تین ہیں۔ ان میں سے ہر ایک معنی بسم اللہ پڑھتے ہوئے لیا جا سکتا ہے۔

1 مصاحبت: یعنی کسی چیز کا کسی چیز سے متصل ہونا۔

2 استعانت: یعنی کسی چیز سے مدد چاہنا۔

3 تبرک: یعنی کسی چیز سے برکت حاصل کرنا۔

ان تینوں معنوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے بسم اللہ پڑھتے ہوئے جب ہم کسی کام کا آغاز کرتے ہیں تو گویا ہم یہ کہتے ہیں کہ میں یہ کام کرنے لگا ہوں اللہ کے نام کے ساتھ، اللہ کے نام کی مدد سے، اللہ کے نام کی برکت سے۔ لیکن اس میں آپ نے محسوس کیا ہو گا کہ صرف اتنا کہہ دینے سے بات مکمل تو نہیں ہوتی جب تک اس کام کا ذکر نہ کیا جائے جو اللہ کے نام کے ساتھ یا اس کی مدد یا اس کی برکت سے کرنا مقصود ہے اس لیے نحوی قاعدے کے مطابق یہاں کوئی فعل مقام کے مناسب محذوف ہوتا ہے۔ مثلاً کوئی آدمی کھانا کھانے لگتا ہے اور وہ بسم اللہ پڑھتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ میں اللہ کے نام سے کھانا کھانے لگا ہوں اور اگر وہ پڑھنا چاہتا ہے تو وہ یہ کہنا چاہے گا کہ میں اللہ کے نام سے پڑھنا چاہتا ہوں لیکن یہ یاد رہے کہ جو فعل بھی یہاں محذوف سمجھا جائے اسے بسم اللہ کے بعد محذوف سمجھنا چاہیے تاکہ حقیقتاً اس کام کا آغاز اللہ ہی کے نام سے ہو۔ اسم اللہ کو پہلے لانے میں صحابہ نے اس حد تک احتیاط کی ہے اور یقیناً انھوں نے یہ بات آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے سیکھی ہو گی کہ جب قرآن کریم لکھا گیا تو حرف با کا اسم اللہ سے پہلے آنا تو عربی زبان کے لحاظ سے لازمی ہے لیکن اس میں بھی مصحف عثمانی میں صحابہ کے اجماع

سے یہ رعایت رکھی گئی کہ حرف بار سم الخط کے قاعدہ سے ہمزہ کے ساتھ ملا کر لکھنا چاہیے تھا اور لفظ اسم الگ، جس کی صورت ہوتی باسم اللہ لیکن مصحف عثمانی کے رسم الخط میں حرف ہمزہ کو حذف کر کے حرف با کو سین کے ساتھ ملا کر صورۃً اسم کا جز بنادیا تاکہ شروع اسم اللہ سے ہو جائے۔

یہی وجہ ہے کہ دوسرے مواقع میں یہ حرف ہمزہ حذف نہیں کیا جاتا، جیسے اقرا باسم ربک میں "ب "کو "الف " کے ساتھ لکھا جاتا ہے، یہ صرف بِسۡمِ اللّٰہِ کی خصوصیت ہے کہ حرف "با "کو "سین "کے ساتھ ملادیا گیا ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ میں اللہ اسم ذات ہے اور الرحمن الرحیم اللہ تعالٰی کے دو صفاتی نام ہیں اس کی وضاحت ہم سورۃ الفاتحہ کی تفسیر میں کریں گے کیونکہ سورۃ الفاتحہ میں بھی ان تینوں کا ذکر فرمایا گیا ہے۔

قرآن میں بِسۡمِ اللّٰہِ کی اصل جگہ اور اہل علم کی رائے

اہل علم میں یہ بھی ایک اہم سوال رہا ہے کہ قرآن کریم میں بسم اللہ کی اصل جگہ کہاں ہے؟ یہ سوال اس وجہ سے پیدا ہوا ہے کہ سورۃ توبہ کے علاوہ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ہر سورۃ کے آغاز میں لکھی گئی ہے لیکن ہر جگہ اس کو کسی سورت کا جز بنانے کی بجائے مستقل آیت کی حیثیت سے لکھا گیا ہے۔ سوائے سورۃ النمل کے کسی سورۃ میں بھی سورت کے جز کے طور پر اس کا ذکر نہیں فرمایا گیا۔ مدینہ، بصرہ اور شام کے قراء اور فقہاء کی رائے یہ ہے کہ یہ قرآن کی سورتوں میں سے کسی سورۃ کی بھی حتیٰ کہ سورۃ الفاتحہ کی بھی آیت نہیں بلکہ ہر سورۃ کے شروع میں اس کو محض تبرک اور دو سورتوں کے درمیان علامت فصل کے طور پر لکھا گیا ہے اس سے ایک سورت دوسری سورۃ سے ممتاز بھی ہوتی ہے اور قاری جب اس سے تلاوت کا آغاز کرتا ہے تو اس سے برکت بھی حاصل کرتا ہے یہی مذہب امام ابو حنیفہ (رح) کا ہے اس کے برعکس مکہ اور کوفہ کے فقہاء کا مذہب یہ ہے کہ یہ سورۃ الفاتحہ کی بھی ایک آیت ہے اور دوسری سورتوں کی بھی ایک آیت ہے اور یہ مذہب امام شافعی اور ان کے اصحاب کا ہے۔ حقیقت تو اللہ جانتا ہے لیکن بظاہر قراء مدینہ کا مذہب قوی معلوم ہوتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مصحف کی موجودہ ترتیب تمام تر وحی الٰہی کی راہنمائی اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ہدایات کے تحت عمل میں آئی اور بسم اللہ کی کتابت بھی اسی ترتیب کا ایک حصہ ہے اس ترتیب میں جہاں تک بسم اللہ کے لکھے جانے کی نوعیت کا تعلق ہے سورۃ الفاتحہ اور غیر سورۃ الفاتحہ میں

کسی قسم کا فرق نہیں کیا گیا بلکہ ہر سورۃ کے آغاز میں اس کو ایک ہی طرح درج کیا گیا ہے۔ جس سے اس کی حیثیت سورۃ سے الگ ایک مستقل آیت کی نظر آتی ہے۔

خواب میں قرآن کی سورتوں کو پڑھنے کی تعبیر

جس نے سورۃ فاتحہ کو پورا یا کچھ خواب میں پڑھا تو اس کی تعبیر یہ ہے کہ وہ ایسی دعائیں کرے گا جو قبول ہوں گی اور ایسا فائدہ حاصل کرے گا جس سے اس کو مسرت ہو گی اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس کی تعبیر یہ ہے کہ اس کے پڑھنے والے کی عمر دراز ہو گی اور اس کا خاتمہ ایمان پر ہو گا اور وہ مستجاب الدعوات ہو گا اور جس کی دلیل رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی دعا ہے کہ آپ ہر دعا کے بعد پہلے اور بعد الحمد للہ رب العلمین پڑھا کرتے تھے۔ (تعبیر الرویا علامہ ابن سیرین)

اسرار مجموعہ سورت

اس صورت میں دس چیزیں مذکور ہیں۔ پانچ چیزیں خدا تعالیٰ کے متعلق ہیں اور پانچ بندوں کے متعلق ہیں۔ خدا کے متعلق جو چیزیں ہیں وہ یہ ہیں۔ الوہیت، ربوبیت، رحمانیت، رحیمیت، مالک یت بندہ کے متعلق جو چیزیں ہیں وہ یہ ہیں۔ عبادت، استعانت، طلب ہدایت۔ طلب استقامت، طلب نعمت۔
بندہ کی یہ پانچ صفتیں اسی ترتیب سے خدا تعالیٰ کی پانچ صفتوں سے متعلق ہیں اور معنی کلام یہ ہیں کہ اے خدا تعالیٰ ہم خاص تیری عبادت اس لیے کرتے ہیں کہ تو ہمارا اللہ یعنی معبود ہے اور خاص تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں اس لیے کہ تو ہی تمام جہانوں کا مربی اور پرورش کرنے والا ہے اور تجھ ہی سے ہدایت کی درخواست کرتے ہیں۔ اس لیے کہ تو رحمن ہے تیری رحمت اور مہربانی عام ہے اور تجھ ہی سے استقامت کی التجا کرتے ہیں اس لیے کہ تو رحیم ہے۔ تیری خاص رحمت خاص اہل ایمان اور اہل ہدایت پر ہی مبذول ہے اور تجھ ہی سے انعام کے امیدوار ہیں۔ اس لیے کہ تو ہی جزاء اور سزا کا مالک ہے ایسی کامل نعمت ہم کو عطا فرما کو جو غضب اور ضلال کے شائبہ سے بالکل پاک ہو
(تفسیر کبیر ص:151 جلد1)

2۔ نیز بندہ جب مقام مناجات میں کھڑا ہوا اور خدا کی صفات کمال بیان کرتا ہوا مالک یوم الدین تک پہنچا تو بے اختیار سیر الی اللہ کا شوق دامن گیر ہوا۔ ارادہ سفر کا مصمم کیا تو سفر کے لیے عبادت کا توشہ لیا۔ اور استعانت اور امداد خداوندی کی سواری پر سوار ہوا۔ زاد راہ ر راحلہ کے مکمل ہو جانے کے بعد راستہ معلوم کیا۔ جب سیدھا راستہ معلوم ہو گیا تو رفقاء طریق کی فکر ہوئی کہ جن کی رفاقت اور معیت سے راستہ سہولت سے قطع ہو اور راہزنوں یعنی اہل غضب اور اہل ضلال کا کوئی خدشہ اور دغدغہ باقی نہ رہے۔ (تفسیر عزیزی ص 48)

3۔ جن علوم کی حضرات انبیاء (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے دعوت دی وہ تین علم ہیں۔ علم شریعت، علم طریقت، علم حقیقت اور پھر علم شریعت کی دو قسمیں ہیں۔ اول علم عقائد، دوم علم احکام۔ سو **الحمد للہ رب العلمین الرحمن الرحیم مالك یوم الدین**۔ میں انسبیلت یعنی خدا تعالیٰ کی ذات وصفات کا بیان ہے اور **اھدنا الصراط المستقیم** الخ میں ہدایت اور ضلالت سعادت اور شقاوت کا بیان ہے اور چونکہ **الذین انعمت علیھم** سے انبیاء صدیقین، شہداء اور صالحین مراد ہیں۔ اس لیے اس آیت میں مباحث نبوت وامامت کی طرف اشارہ ہے اور **ایاك نعبد** میں علم احکام کی طرف اشارہ ہے

علم طریقت جس میں نفس اور قلب کے امراض اور معالجات سے بحث کی جاتی ہے۔ اس کے تین مرتبے ہیں۔

1۔ پہلا مرتبہ توحید فی العبادۃ ہے کہ سوائے خدا تعالیٰ کے کسی کی عبادت نہ کرے۔

2۔ دوسرا مرتبہ توحید فی الاستعانت ہے یعنی سوائے خدا کے کسی سے مدد نہ مانگے۔

3۔ تیسرا مرتبہ استقامت ہے یہ سلوک کا اعلیٰ مرتب ہے کہ طریق عبودیت اور جادہ اخلاص ومحبت پر قدم ایسا ٹھیک جم جائے کہ ذرہ برابر ادھر ادھر ہٹنے نہ پائے، ان مراحل اور مقامات کے طے ہو جانے کے بعد درجہ ہے مکاشفات اور تجلیات کا کہ قلب پر سحائب الہام کی بارش ہونے لگے اور علوم اور معارف اسرار اور لطائف منکشف ہونے لگیں۔ یہ علم حقیقت ہے اللہ تعالیٰ اس پر۔۔ انعام فرمائے۔ **صراط الذین انعمت علیھم** میں اسی علم کی طرف اشارہ ہے۔

"بسم اللہ الرحمن الرحیم" کے فوائد اور حکمتیں

(۱) علامہ ابن جریر طبری نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اسماء حسنیٰ کو مقدم کر کے ہمیں یہ ادب سکھایا ہے کہ ہمیں چاہیے کہ اپنے تمام اقوال 'افعال اور مہمات کو اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ سے شروع کیا کریں۔

(جامع البیان ج ۱ ص ۳۸ 'مطبوعہ مطبعہ امیریہ کبری 'بولاق 'مصر '۱۳۲۳ھ)

(۲) علامہ قرطبی نے لکھا ہے کہ کھانے 'پینے 'ذبح کرنے، جماع کرنے 'وضو کرنے 'کشتی میں سوار ہونے 'غرض ہر (صحیح) کام سے پہلے بسم اللہ پڑھنا مستحب ہے 'اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

(آیت) "**فکلوا مما ذکر اسم اللہ علیہ**"۔ (الانعام: ۱۱۸) تو اس (ذبیحہ) سے کھاؤ 'جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو۔ **وقال ارکبوا فیھا بسم اللہ مجریھا ومرسھا**"۔ (ھود: ۴۱) اور نوح نے کہا: اس کشتی میں سوار ہو جاؤ 'اس کا چلنا اور رکنا اللہ کے نام سے ہے۔

اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: دروازہ بند کرتے ہوئے بسم اللہ پڑھو 'چراغ گل کرتے ہوئے بسم اللہ پڑھو 'برتن ڈھانکتے ہوئے بسم اللہ پڑھو 'اور مشک کا منہ بند کرتے ہوئے بسم اللہ پڑھو اور فرمایا: اگر تم میں سے کوئی شخص عمل تزویج کے وقت کہے: بسم اللہ 'اے اللہ! ہم کو شیطان سے محفوظ رکھ اور جو (اولاد) ہم کو عطا کرے اس کو بھی شیطان سے محفوظ رکھ 'تو اگر اس عمل میں ان کے لیے اولاد مقدر کی جائے گی تو اس کو شیطان کبھی ضرر نہیں پہنچا سکے گا 'اور آپ نے عمر بن ابی سلمہ سے فرمایا: اے بیٹے! بسم اللہ پڑھو 'اور اپنے دائیں ہاتھ سے کھاؤ اور اپنے سامنے سے کھاؤ اور اپنے سامنے سے کھاؤ 'اور آپ نے فرمایا: شیطان ہر کھانے کو حلال کر لیتا ہے۔ ماسوا اس کھانے کے جس پر بسم اللہ پڑھی گئی ہو 'حضرت عثمان بن ابی العاص (رض) نے آپ سے شکایت کی کہ جب سے وہ اسلام لائے ہیں ان کے جسم میں درد رہتا ہے 'آپ نے فرمایا: تین بار بسم اللہ پڑھو 'اور سات بار یہ پڑھو "**اعوذ بعزۃ اللہ وقدرتہ من شر ما اجد واحاذر**" یہ تمام احادیث صحیح ہیں 'اور امام ابن ماجہ اور امام ترمذی (رح) نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جب بنو آدم بیت الخلاء میں داخل ہوں تو ان کی شرم گاہوں اور شیاطین کے درمیان بسم اللہ حجاب ہے 'اور امام دار قطنی نے حضرت عائشہ (رض) سے روایت کیا ہے کہ جب رسول

اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) وضو کرتے تو پہلے بسم اللہ پڑھتے ' پھر اپنے ہاتھوں پر پانی ڈالتے۔ (الجامع الاحکام القرآن ج ا ص ۹۸۔۹۷ ' مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو ایران)

(۳) ہر نیک اور صحیح کام سے پہلے بسم اللہ پڑھنے کی انسان کو عادت پڑ جائے تو پھر اس کا برے کاموں سے باز رہنا زیادہ متوقع ہو گا ' کیونکہ اگر وہ کسی وقت خواہش نفس سے مغلوب ہو کر برائی میں ہاتھ ڈالے گا تو عادۃ اس کے منہ سے بسم اللہ نکلے گی ' اور پھر اس کا ضمیر اس کو سرزنش کرے گا۔

(۴) انسان اسی کا نام بار بار لیتا ہے جس سے اس کو محبت ہوتی ہے ' اس لیے جو انسان ہر صحیح کام کے وقت بسم اللہ پڑھتا ہے یہ اس کی اللہ تعالیٰ سے محبت کی دلیل ہے۔

(۵) علامہ قرطبی (رح) لکھتے ہیں: سعید بن ابی سکینہ نے بیان کیا ہے کہ حضرت علی (رض) نے ایک شخص کو "بسم اللہ الرحمن الرحیم "لکھتے دیکھا تو فرمایا: اس کو خوبصورت لکھو ' کیونکہ ایک شخص نے بسم اللہ کو خوبصورت لکھا تو اس کو بخش دیا گیا۔

(۶) سعید بن ابی سکینہ نے بیان فرمایا کہ ایک شخص نے کاغذ کو دیکھا اس میں "بسم اللہ الرحمن الرحیم "لکھی ہوئی تھی ' اس نے اس کو اٹھا کر بوسہ دیا اور اس کو اپنی آنکھوں پر رکھا تو اس کو بخش دیا گیا۔

(۷) بشر حافی پہلے ایک ڈاکو تھے ' انھوں نے راستہ میں ایک کاغذ دیکھا جو لوگوں کے پیروں تلے آرہا تھا ' انھوں نے اس کاغذ کو اٹھایا تو اس میں اللہ تعالیٰ کا نام لکھا ہوا تھا ' انھوں نے بہت قیمتی خوشبو خریدی اور اس کاغذ پر وہ خوشبو لگائی اور اس کو حفاظت کے ساتھ رکھ دیا ' رات کو خواب میں انھوں نے سنا کوئی کہہ رہا تھا اے بشر! تم نے میرے نام کو خوشبو میں رکھا ہے ' میں تم کو دنیا اور آخرت میں خوشبودار رکھوں گا۔ اس کے بعد انھوں نے توبہ کی اور ولی کامل بن گئے۔

(۸) حضرت عبد اللہ بن مسعود (رض) نے فرمایا: جو شخص چاہتا ہو کہ اللہ تعالیٰ اس کو جہنم کے انیس فرشتوں سے نجات دے وہ "بسم اللہ الرحمن الرحیم "پڑھے تا کہ اللہ تعالیٰ بسم اللہ کے ہر حرف کے بدلہ اس کو جہنم کے ایک فرشتہ سے محفوظ رکھے کیونکہ بسم اللہ کے انیس حرف ہیں

.(الجامع الاحکام القرآن ج ا ص ۹۲۔۹۱ ' مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو ایران)

(۹) امام رازی (رح) لکھتے ہیں: روایت ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت ابو بکر صدیق (رض) کو اپنی انگوٹھی دی ' اور فرمایا: اس میں "لا الہ الا اللہ " لکھواؤ حضرت ابو بکر (رض) نے نقاش سے کہا: اس میں "لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ " لکھ دو ' جب نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو وہ انگوٹھی پیش کی تو اس میں لکھا ہوا تھا : "لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ابوبکر صدیق"۔ آپ نے پوچھا: اے ابو بکر! یہ زائد (کیسے لکھا ہوا ہے ؟) حضرت ابو بکر (رض) نے کہا: یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں نے آپ کے نام کو اللہ تعالیٰ کے نام سے جدا کرنا پسند نہیں کیا اور باقی میں نہیں لکھوایا ' اور حضرت ابو بکر (رض) اس پر شرمندہ تھے ' تب جبرائیل (علیہ السلام) آئے اور کہا: یا رسول اللہ ! ابو بکر کا نام میں نے لکھا ہے کیونکہ جب ابو بکر محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے نام کو اللہ عزوجل کے نام سے جدا کرنے پر راضی نہ تھے تو اللہ تعالیٰ ' ابو بکر کے نام کو آپ کے نام سے جدا کرنے پر راضی نہ تھا اور اس میں سے نکتہ یہ ہے کہ جو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے محبت کی وجہ سے آپ کے فراق کو گوارا نہ کرے وہ اللہ تعالیٰ کی عنایات کا مرکز بن جاتا ہے تو جو اللہ تعالیٰ سے محبت کی وجہ سے اس کے نام سے فراق نہ گوارا کرے اور ہر کام کے ساتھ اللہ کا نام لے وہ کب اللہ تعالیٰ کی عنایات سے محروم ہو گا!

(۱۰) حضرت نوح (علیہ السلام) نے "بسم اللہ مجرھا ومرسھا " کہا تو طوفان سے نجات پالی ' حالانکہ بسم اللہ " "بسم اللہ الرحمن الرحیم " کا نصف ہے تو جب ایک بار نصف بسم اللہ کے پڑھنے سے طوفان سے نجات مل گئی تو جو شخص ساری عمر بسم اللہ پڑھتا رہے ' وہ نجات سے کیسے محروم ہو گا!

(۱۱) قیصر روم نے حضرت عمر (رض) کی طرف لکھا کہ اس کے سر میں درد رہتا ہے جس سے افاقہ نہیں ہوتا ' میرے لیے کوئی دوا بھیج دیجیے حضرت عمر (رض) نے اس کے پاس ایک ٹوپی بھیجی ' وہ اس ٹوپی کو پہن لیتا تو آرام آجاتا اور اس ٹوپی کو اتار دیتا تو پھر سر میں درد شروع ہو جاتا۔ وہ حیران ہوا ' اور ایک دن اس نے ٹوپی کو کھول کر دیکھا تو اس میں ایک کاغذ تھا جس میں لکھا ہوا تھا "بسم اللہ الرحمن الرحیم "۔

(۱۲) بعض کفار نے حضرت خالد بن ولید سے کہا: آپ ہمیں اسلام کی دعوت دیتے ہیں ، آپ ہمیں اسلام کی صداقت پر کوئی نشان دکھایئے تاکہ ہم بھی اسلام لے آئیں ، حضرت خالد نے زہر منگایا اور "بسم اللہ الرحمن الرحیم" پڑھ کر کھالیا اور اللہ تعالیٰ کے اذن سے صحیح سالم کھڑے رہے ، مجوس نے کہا: واقعی یہ دین حق ہے۔

(۱۳) حضرت عیسیٰ بن مریم (علیہ السلام) ایک قبر کے پاس سے گزرے تو دیکھا کہ عذاب کے فرشتے ایک مردہ کو عذاب دے رہے ہیں ، جب اپنے کام سے واپس لوٹے تو اس قبر میں رحمت کے فرشتوں کو دیکھا جن کے پاس نور کے طباق تھے ، حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو اس سے تعجب ہوا ، انھوں نے نماز پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے دعا کی ، اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی کی کہ اے عیسیٰ! یہ شخص گناہ گار تھا اور جب یہ مرا تو عذاب میں مبتلا ہو گیا ، مرتے وقت اس کی بیوی حاملہ تھی ، اس کے بچہ ہوا ، اس نے اس کو پالا حتیٰ کہ وہ بڑا ہو گیا ، اس کو مکتب میں داخل کیا ، وہاں اس کو معلم نے "بسم اللہ الرحمن الرحیم" (ان کی زبان میں) پڑھائی تو مجھے حیا آئی کہ جو بچہ زمین کے اوپر میرا نام لے رہا ہے ، اس کے باپ کو میں زمین کے نیچے عذاب میں مبتلا رکھوں!

(۱۴) سورۃ توبہ میں قتال ذکر ہے ، لہٰذا اس سے پہلے بسم اللہ نہیں لکھی گئی ، اور ذبح سے پہلے "بسم اللہ اللہ اکبر" کہا جاتا ہے "بسم اللہ الرحمن الرحیم" نہیں کہا جاتا کیونکہ ذبح کے وقت رحمت کا ذکر مناسب نہیں ہے ، تو جو شخص ہر روز سترہ مرتبہ فرض نمازوں میں "بسم اللہ الرحمن الرحیم" پڑھے گا وہ کب عذاب میں مبتلا ہو گا۔

(تفسیر کبیر ج ۱ ص ۸۹۔۸۷ ، مطبوعہ دارالفکر بیروت ، ۱۳۹۸ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تمام تعریفیں اللہ ہی کے لائق ہیں جو تمام جہانوں کا رب ہے۔ (الفاتحہ: ۱) (تبیان)

حمد کے لغوی اور اصلاحی معانی

حمد ایک عربی لفظ ہے، جس کے معنی "تعریف" کے ہیں۔ اللہ کی تعریف میں کہی جانے والی نظم کو حمد کہتے ہیں۔ حمد باری تعالیٰ، کئی زبانوں میں لکھی جاتی آرہی ہے۔ عربی، فارسی، کھوار اور اردو زبان میں اکثر دیکھی جاسکتی ہے۔ حمد کو انگریزی میں Hymn کہتے ہیں۔ ویسے رب کی تعریف ہر زبان میں اور ہر مذہب میں پائی جاتی ہے۔

علامہ فیروزآبادی (رح) لکھتے ہیں:

حمد کا معنی ہے: شکر 'رضا 'جزاء اور حق کو ادا کرنا 'تحمید کے معنی ہیں: اللہ کی بار بار حمد کرنا 'اور محمد کے معنی ہیں: 'جس کی بار بار حمد کی گئی ہو۔ (قاموس ج ا ص ۵۶۳۔ ۵۶۲ 'داراحیاء التراث العربی 'بیروت '۱۴۱۲ھ)

علامہ جوہری لکھتے ہیں:

حمد 'ذم کی نقیض ہے 'تحمید 'حمد سے زیادہ بلیغ ہے اور حمد شکر سے زیادہ عام ہے 'جس شخص میں بہ کثرت خصال محمودہ ہوں اس کو محمد کہتے ہیں۔ (الصحاح ج ۲ ص ۴۶۶ 'مطبوعہ دارالعلم 'بیروت '۱۴۰۴ھ)

علامہ ابن منظور افریقی لکھتے ہیں:

حمد مذمت کی نقیض ہے 'ثعلب نے کہا: حمد کا تعلق نعمت اور غیر نعمت دونوں سے ہے اور شکر کا تعلق صرف نعمت سے ہے۔ لحیانی نے کہا: حمد شکر ہے اور ان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اخفش نے کہا: "الحمدللہ" کا معنی ہے: "الشکرللہ" اور کہا: "الحمدللہ" اللہ کی ثناء اور اس کی تعریف ہے 'ازہری نے کہا: شکر صرف اس ثناء کو کہتے ہیں جو نعمت پر کی جاتی ہے 'اور حمد بعض اوقات کسی کام کے شکر کو کہتے ہیں اور کبھی ابتداء نعمت کے بغیر کسی شخص کی ثناء کو حمد کہتے ہیں 'سو اللہ کی حمد اس کی ثناء ہے اور اس کی ان نعمتوں کا شکر ہے جو سب کی محیط ہیں 'اور حمد شکر سے عام ہے۔ (لسان العرب ج ۳ ص ۱۵۵ 'مطبوعہ نشر ادب الحوزۃ 'قم 'ایران '۱۴۰۵ھ)

علامہ ابن اثیر جزری لکھتے ہیں:

حمد اور شکر متقارب ہیں اور ان میں حمد زیادہ عام ہے 'کیونکہ تم انسان کی صفات ذاتیہ اور اس کی عطاء پر اس کی حمد (تعریف) کرتے ہو اور اس کی صفات ذاتیہ پر اس کا شکر نہیں ادا کرتے (مثلاً کسی کی سخاوت کی تعریف کرنا شکر ہے اور اس کے حسن کی تعریف کرنا شکر نہیں حمد ہے) حدیث میں ہے: حمد رئیس شکر ہے 'جس شخص نے اللہ کی حمد نہیں کی اس نے اللہ کا شکر ادا نہیں کیا 'حمد شکر کی رائیس اس لیے ہے کہ اس میں نعمت کا اظہار اور اس کی مشہور کرنا ہے اور حمد شکر سے عام ہے۔ (نہایہ ج ا ص ۴۳۷۔ ۴۳۶ 'مطبوعہ موسسۃ مطبوعاتی 'ایران '۱۳۶۴ھ)

علامہ میر سید شریف (رح) حمد پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

حمد: کسی خوبی کی بطور تعظیم ثنا کرنا خواہ کسی نعمت کی وجہ سے ہو یا اس کے بغیر۔

حمد قولی: زبان سے اللہ تعالیٰ کی وہ تعریف کرنا جو اللہ تعالیٰ نے انبیاء (علیہم السلام) کی زبانوں کے ذریعہ خود اپنی تعریف فرمائی ہے۔

حمد فعلی: اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی کے لیے بدن سے نیک اعمال کرنا۔

حمد حالی: روح اور قلب کے اعتبار سے ثناء کرنا 'مثلاً علمی اور عملی کمالات سے متصف ہونا 'اور اللہ تعالیٰ کے اخلاق سے متخلق ہونا۔

حمد عرفی: منعم کے انعام کی وجہ سے کوئی ایسا فعل کرنا جس سے اس کی تعظیم ظاہر ہو 'عام ازیں کہ زبان سے ہو یا دیگر اعضاء سے۔ (کتاب التعریفات ص ۴۲۔ ۴۱ 'مطبوعہ المطبعۃ الخیریہ 'مصر ۶، ۱۳ھ)

(ح م د) الحمد للہ

(تعالیٰ) کے معنی اللہ تعالیٰ کی فضیلت کے ساتھ اس کی ثنا بیان کرنے کے ہیں۔ یہ مدح سے خاص اور شکر سے عام ہے کیونکہ مدح ان افعال پر بھی ہوتی ہے جو انسان سے اختیاری طور پر سرزد ہوتے ہیں اور ان اوصاف پر بھی جو پیدائیشی طور پر اس میں پائے جاتے ہیں چنانچہ جس طرح خرچ کرنے اور علم و سخا پر انسان کی مدح ہوتی ہے اس طرح اس کی درازی قد و قامت اور چہرہ کی خوبصورتی پر بھی تعریف کی جاتی ہے۔ لیکن حمد صرف افعال اختیار یہ پر ہوتی ہے۔ نہ کہ اوصاف اضطرار یہ پر اور شکر تو صرف کسی کے احسان کی وجہ سے اس کی تعریف کو کہتے ہیں۔ لہٰذا ہر شکر حمد ہے۔ مگر ہر حمد شکر نہیں ہے اور ہر حمد مدح ہے مگر ہر مدح حمد نہیں ہے۔ (مفردات)

ہر خوبی و کمال جس کا ظہور اختیار اور ارادہ سے ہو۔ اس کی ستائش و ثنا کو عربی میں حمد کہتے ہیں۔ تو اس لفظ حمد نے اس حقیقت کو بے حجاب کر دیا کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کمال سے متصف ہونا اضطراری اور غیر اختیاری نہیں بلکہ اس کی اپنی مرضی اور ارادہ کی جلوہ نمائی ہے۔ کمال کہیں بھی ہو جمال کسی روپ میں ہو اسی کی کرشمہ سازی ہے۔ اسی کی بااختیار تدبیر کا اعجاز ہے تو ستائش و تعریف کسی کی بھی کی جائے حقیقت میں اسی ذات بے ہمتا کی ہے جس کی قدرت و اختیار سے اس عالم رنگ و بو کی ساری رنگینیاں اور رعنائیاں رو پذیر ہیں۔ اسی لیے فرمایا الحمد للہ۔

سورۃ فاتحہ کا آغاز الحمد سے کیا۔ اس سے اس امر کی طرف بھی اشارہ ہے کہ سالک جب راہ طلب میں قدم رکھے تو پہلے اپنے رب کی حمد کرے جس نے اس راہ پر گامزن ہونے کی اسے توفیق بخشی، جس نے نے منزل مقصود کی لگن اس کے دل میں پیدا کی کیونکہ ۔

میری طلب بھی انھیں کے کرم کا صدقہ ہے قدم یہ اٹھتے نہیں ہیں اٹھائے جاتے ہیں

نیز اس سورۃ میں دعا بھی ہے اور دعا کے آداب سے یہ بھی ہے کہ مولائے کریم جس کے سامنے وہ دامن طلب پھیلا رہاہے اس کی بخشش بے انداز اور عنایت جہاں پرور کا اعتراف کرے۔ (ضیاء)

ہر خوبی و جمال کا خالق اللہ تعالیٰ ہے، لہٰذا تعریف قرآن کی ہو یا کسی نبی کی، کعبہ کی ہو یا کسی ولی کی، چاند کی ہو یا کسی پھول کی، حقیقت میں اسی ذات بے مثال کی تعریف ہے جو ہر حسن و جمال کا خالق ہے۔ اسی لیے فرمایا: الحمدللہ یعنی ہر قسم کی کامل تعریفوں کا حقیقی مستحق صرف اللہ تعالیٰ ہے، لیکن اس کا مطلب یہ ہر گز نہیں کہ کسی صاحب کمال کی تعریف نہ کی جائے۔ سراپا صدق وصفا حضرت ابو بکر (رض) کا حق ہے کہ انھیں صدیق اکبر کے لقب سے نوازا جائے۔ عدل وانصاف کے پیکر حضرت عمر (رض) اس بات کے مستحق ہیں کہ انھیں فاروق اعظم کا اعزاز دیا جائے۔ اسی طرح ہر صاحب کمال کی قدر دانی ضروری ہے لیکن سب سے پہلے اس خالق حقیقی کی حمد لازم ہے جس نے اس میں اس کمال کو پیدا فرمایا۔

سورۃ فاتحہ میں دعا بھی ہے اور آداب دعا کی تعلیم بھی یعنی جس کریم آقا کے سامنے دست سوال دراز کرنے جارہے ہیں پہلے اس کے ان گنت احسانات اور بے پایاں عنایات کا اعتراف کریں اور شکرانے کے طور پر حمد وثناء کے گلدستے پیش کریں جس کے لیے الحمدللہ کے الفاظ سب سے افضل ہیں۔ اس کے بعد اپنی مغفرت کے لیے دعا کریں اور خدا کے فضل و کرم کا سوال کریں۔

حمد باری تعالیٰ مومن کی زندگی کا اہم ترین حصہ ہے یعنی نعمت ملے تو شکر کے ساتھ حمد، مصیبت آئے تو صبر کے ساتھ حمد، چھینک یا پسندیدہ خواب آئے تو حمد، کھانے اور پینے کے بعد حمد، نماز کے بعد حمد، الغرض مومن ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کرتا ہے۔ (تفسیر امداد الکرم۔ پیرزادہ سید امداد حسین شاہ)

خلاصہ یہ ہے کہ کسی چیز کی غیر اختیاری خوبی پر اس کی تعریف کرنا مدح ہے ' مثلاً یاقوت اور موتی کی خوبصورتی پر تعریف کرنا ' اور کسی شخص کے انعام اور احسان پر اس کی تعظیماً ثنا کرنا شکر ہے اور کسی کی اختیاری خوبی پر اس کی تعظیماً تعریف کرنا خواہ اس نے کوئی نعمت دی ہو یا نہ دی ہو ' یہ حمد ہے۔ کائنات کی کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے کہ جس کو اللہ نے کوئی نہ کوئی نعمت نہ دی ہو اس لیے اللہ تعالیٰ کی ہر ثناء اور ہر تعریف اس کا شکر ہے اور اس کی ہر حمد شکر کے ضمن میں ہے۔ (تفسیر امداد الکرم۔ پیرزادہ سید امداد حسین شاہ)

اللہ کائنات کے رب نے اپنی مخلوق کی پرورش کا بندوبست ایسے مضبوط نظام کے ساتھ فرمایا ہے کہ ہر چیز کو زندگی اور اس کی بقا کے لیے جو کچھ اور جس قدر چاہیے اسے اسی حالت اور مقام پر پہنچایا جا رہا ہے۔ پتھر کا کیڑا چاروں طرف بند چٹان کے اندر اپنی خوراک لے رہا ہے، مرغی کا بچہ انڈے میں پل رہا ہے، مچھلیاں دریا میں، پرندے فضا میں اور درندے صحرا میں اپنی اپنی خوراک لے رہے ہیں اور اپنے ماحول میں مطمئن اور خوش و خرم دکھائی دیتے ہیں۔ ہر دانہ اپنی آغوش میں زندگی اور ہر بیج اپنے سینے میں نشوونما کا سامان لیے ہوئے ہے۔ یہاں تک کہ پھول کی کلی کو جس ہوا اور فضا کی ضرورت ہے اسے مہیا کی جا رہی ہے۔ زندگی کے لیے ہوا اور پانی اس قدر لازمی جز ہیں کہ ان کے بغیر زندگی لمحوں کی مہمان ہوتی ہے۔ یہ اتنے ارزاں اور وافر ہیں کہ اس کا اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے قرآن نے اللہ کی ہستی کا تعارف رب اور اس کے نظام ربوبیت سے بات کا آغاز کیا ہے تا کہ انسان کا وجدان پکار اٹھے کہ مجھے اس ہستی کا شکر ادا کرنا اور تابع فرمان رہنا ہے جس نے مجھے پیدا کیا ہے۔ اور یہ نظام اس بات کی دلیل ہے کہ یہ کسی منتظم کے بغیر جاری اور قائم نہیں رہ سکتا ایک زندہ ضمیر شخص جب اپنے چاروں طرف رب کی ربوبیت کے اثرات و نشانات دیکھتا ہے تو اس کے دل کا ایک ایک گوشہ پکار اٹھتا ہے۔

(فَتَبَارَكَ اللّٰهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ۔)[المؤمنون:۱۴]

"اللہ تعالیٰ برکت والا اور بہترین پیدا کرنے والا ہے۔"

مانگنے کا صحیح طریقہ اور اسلامی تہذیب کا جزو لازم ہے کہ انسان ہر حال میں اپنے رب کا حمد خواں اور شکر گزار رہے۔ حمد گوئی سے یہ بات خود بخود ثابت ہوتی ہے کہ یہ سب کچھ اللہ ہی کی عطا اور ملکیت ہے۔ اور انسان انتہائی ناتواں اور

بے بس ہے۔ اس سے انسان کے دل میں یہ عقیدہ بھی جڑ پکڑ تاہے کہ جمال و کمال کسی کا اپنا نہیں بلکہ اللہ ہی کا عطا کردہ ہے۔ اس لیے حقیقی اور ہمہ وقتی حمد وستائش اسی مالک کو زیبا ہے۔ پھر مالک بھی ایسا جو صرف انسانوں اور جنّات کا ہی نہیں وہ تو حیوانات، جمادات، نباتات حتی کہ ارض و سمٰوٰت کا رب ہے۔ جو ابتدا سے انتہا تک ہر چیز کی ضرورت کو کمال رحمت اور ربوبیت سے پورا کر رہا ہے۔ حمد میں دوسرے کی ذات کی بڑائی اور اس کے احسانات کا احساس و اعتراف پایا جاتا ہے۔ قرآن مجید ابتدا ہی میں انسان کو یہ باور کرواتا ہے کہ کائنات کا ذرّہ ذرّہ اپنے رب کی تعریف و توصیف اور حمد و شکر بیان کرنے میں لگا ہوا ہے۔

(سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ) [الحشر:۱]

”زمین و آسمان میں موجود ہر چیز اللہ کی تسبیح بیان کرتی ہے اور وہ غالب حکمت والا ہے۔“

اے انسان! اشرف المخلوقات ہونے کی حیثیت سے تجھے مانگنے سے پہلے اپنے رب کی حمد و شکر اور اس کی عنایت و عطا کا اعتراف کرتے ہوئے پہلے اپنے رب کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ کیونکہ شکر گزار ہی تابع فرمان ہوا کرتے ہیں۔

رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا یوں بیان کیا کرتے تھے:

(أَللّٰهُمَّ أَعُوْذُ بِرِضَاكَ مِنْ سَخَطِكَ وَبِمُعَافَاتِكَ مِنْ عُقُوْبَتِكَ وَأَعُوْذُ بِكَ مِنْكَ لَآ أُحْصِيْ ثَنَاءً عَلَيْكَ أَنْتَ كَمَآ أَثْنَيْتَ عَلٰى نَفْسِكَ) [رواہ مسلم: کتاب الصلاۃ، باب مایقال في الرکوع والسجود]

”اے اللہ! میں تیری رضامندی کے ذریعے تیری ناراضی سے اور تیری معافی کے ذریعے تیری سزا سے پناہ مانگتا ہوں اور میں تجھ سے تیری پناہ مانگتا ہوں میں اس طرح تیری تعریف نہیں کر سکتا جس طرح تیری شایان شان ہے۔
“

(سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ عَدَدَ خَلْقِهٖ وَرِضَا نَفْسِهٖ وَزِنَةَ عَرْشِهٖ وَمِدَادَ كَلِمَاتِهٖ)

[رواہ مسلم: کتاب الذکر والدعاء والتوبۃ والاستغفار، باب التسبیح أول النھار وعند النوم]

”اللہ کی پاکی اس کی تعریف کے ساتھ اس کی مخلوق کی تعداد، اس کے نفس کی رضا، اس کے عرش کے وزن اور اس کے کلمات کی مقدار کے برابر۔“ (تفسیر فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل)

''اَلْحَمْدُ ''حمد پر الف لام استغراق کا ہے یا جنس کا 'اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام تعریفیں اور ہر طرح کی تعریفیں، یعنی تعریف کے جتنے انداز ہو سکتے ہیں اور تعریف جتنے پہلوؤں سے ممکن ہے اور تعریف کی جتنی اقسام تصور کی جا سکتی ہیں اور تعریف کے لیے جتنے خوبصورت الفاظ اہل لغت نے وضع کیے ہیں اور تعریف کی جتنی کیفیتیں آج تک اہل دل نے محسوس کی ہیں۔ اہل لغت اہل درد اور اہل دل کا یہ سارا سرمایہ صرف اللہ کی بارگاہ کے لیے ہے۔ اس وسعت کے ساتھ کوئی اس میں شریک نہیں ہے۔

حمد و شکر اور فہم انسانی

'' حمد ''کا معنی جس طرح تعریف کیا جاتا ہے۔ اسی طرح شکر بھی کیا جاتا ہے۔ لیکن شکر حمد کے مقابلے میں معنویت کے اعتبار سے محدود ہے۔ شکر کا لفظ کسی کی صرف انہی خوبیوں اور انہی کمالات کے اعتراف کے موقع پر بولا جاتا ہے، جن کا فیض آدمی کو خود پہنچ رہا ہو۔ لیکن حمد ہر قسم کی خوبیوں اور ہر قسم کے کمالات کے اعتراف کے لیے عام ہے، خواہ ان کا کوئی فیض خود حمد کرنے والے کی ذات کو پہنچ رہا ہو یا نہ پہنچ رہا ہو۔ مزید بر آں حمد اپنی معنوی وسعتوں کے اعتبار سے ایسے کمال سے متصف ہے جس کا شکر کے لفظ میں تصور کرنا بھی مشکل ہے۔ اس لیے شکر اگرچہ حمد کا ایک جزو ہے، لیکن پروردگار کے ذاتی اور صفاتی کمالات کی وسعتوں کو دیکھتے ہوئے حمد کا استعمال ہی ایسے وسیع معنوں میں کیا جا سکتا ہے۔ صرف شکر کا استعمال حمد کو محدود کر دینے کے ہم معنی ہو گا۔

ایک آدمی اگر فہم و شعور سے بالکل محروم نہ ہو تو یہ ممکن نہیں کہ وہ اپنی ذات، اپنے ماحول، اپنے گردوپیش، اپنے اوپر طاری ہونے والی کیفیتوں اپنے استعمال میں آنے والی نعمتوں پر غور کرنے کی کبھی زحمت نہ کرے۔ ایک مزدور اور محنت کش، جب چلچلاتی دھوپ میں سخت محنت کے بعد درخت کے ٹھنڈے سائے کے نیچے بیٹھ کر ٹھنڈا پانی پیتا ہے تو بے اختیار اس کی زبان پر حمد کے الفاظ جاری ہو جاتے ہیں۔ ایک بیمار، جب بیماری سے نجات پاتا ہے اور اپنے قدموں چل کر گھر کے صحن میں چڑیوں کے چہچہوں کی آواز سنتا ہے تو بے اختیار اس کی زبان پر اللہ کی تعریف کا نغمہ پھوٹنے لگتا ہے۔ ایک آدمی مسلسل سنجیدہ کام کے باعث جب اپنے ماحول سے اچاٹ ہونے لگتا ہے تو وہ کچھ وقت پہاڑوں کے ٹھنڈے موسم سے محظوظ ہونے کے لیے پہاڑوں کا رخ کرتا ہے۔ جیسے ہی اسے پہاڑوں میں ابلتے ہوئے چشمے، گرتی

ہوئی آبشاریں، برف کے پگھلتے ہوئے تودے، چاندی کے ابلتے ہوئے فوارے، سیماب اگلتے ہوئے جھرنے 'چیڑوں کے گڑے ہوئے جھنڈے اور پربت پر چھائی ہوئی چھاؤنی اور بادلوں کے تنے ہوئے ڈیرے اور کہرے کی لگی ہوئی قناتیں دکھائی دیتی ہیں تو بے ساختہ اس کی زبان پر اللہ کی حمد کے زمزمے جاری ہو جاتے ہیں۔ میدانی علاقوں میں بہتی ہوئی پانی کی جدولیں 'زمین پر سبزے کا مخملی فرش 'کھیتوں میں پھولی ہوئی سرسوں اور پھولوں سے لدے ہوئے تختے جب نگاہ کو دعوت نظارہ دیتے ہیں تو بے ساختہ زبان پر اللہ کی صنعت وقدرت کی تعریف جاری ہو جاتی ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ انسان جب بھی اپنے گردوپیش میں پھیلی ہوئی قدرت کی رعنائیاں دیکھتا ہے تو اگر اس کے سر میں معمولی سادماغ بھی ہے تو وہ ان خوبصورتیوں کے خالق کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہی تعریف کا جذبہ ہے، جو اسے اللہ کی بارگاہ تک جانے پر مجبور کرتا ہے۔ کیونکہ یہ اس کے اندر سے اٹھنے والی فطرت کی پکار ہے، جو الفاظ کا قالب اختیار کرلیتی ہے۔ اس لیے اہل علم نے حمد کو انسان کا جذبہ بے اختیار قرار دیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ بعض لوگوں نے اس فطری جذبے کو ارتقاء کا نتیجہ قرار دے کر گہنانے کی کوشش کی ہے۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ انسان کے اندر سب سے قدیم اور ابتدائی جذبہ خوف کا جذبہ ہے۔ اور یہ جذبہ ان ہولناک اور خوفناک حوادث کے مشاہدہ سے پیدا ہوا، جو اس دنیا میں طوفانوں 'زلزلوں اور وباؤں کی صورت میں آئے دن پیش آتے رہتے تھے۔ اس خوف کے جذبہ نے انسان کو ان دیکھی طاقتوں کی پرستش پر مجبور کیا، جن کو اس نے ان حوادث کا پیدا کرنے والا خیال کیا اور اس طرح انسان نے خوف کے جذبے سے اپنی زندگی کا آغاز کیا۔ حالانکہ اگر تدبّر سے کام لیا جائے تو یہ بات سمجھنا بھی مشکل نہیں کہ ہر خوف سے پہلے کسی نعمت کا شعور لازمی چیز ہے۔ جس کے چھن جانے کے احساس کو خوف کہا جاتا ہے۔ اور جب نعمت کا شعور پایا گیا تو ایک منعم کا شعور بھی لازمی ٹھہرا اور پھر اس کی شکر گزاری کا جذبہ پیدا ہونا بھی ناگزیر ہوا۔ اور مزید یہ کہ منعم کے اس تصور کو مزید اجاگر اور گہرا کرنے کے لیے انسان کا وہ شب وروز کا مشاہدہ ہے، جس سے وہ صرف نظر نہیں کر سکتا۔ وہ دیکھتا ہے کہ اس دنیا کے عام واقعات، زلزلے، طوفان اور سیلاب ہی نہیں، بلکہ اس میں بہاریں بھی آتی، چاندنی بھی پھیلتی، بارشیں بھی ہوتی، تارے بھی چھٹکتے، پھول بھی کھلتے اور فصلیں بھی پکتی ہیں۔ ان میں سے ایک ایک چیز اور ایک ایک مشاہدہ نہ صرف انسان کو اللہ کے آستانے پر جھکانے کے لیے کافی ہے، بلکہ اس کے جذبہ حمد کو مہمیز کرنے کا کام بھی دیتا ہے۔ اہل دل تو عجیب بات کہتے ہیں کہ اللہ کی بے حد وبیشمار

نعمتوں کو دیکھ کر اور خود اپنی ذات کو اس کی نعمتوں سے گرانبار پا کر تو شکر اور حمد کا جذبہ ابھرتا ہی ہے۔ لیکن خود یہ بات کہ آدمی اللہ کی تعریف کرنے لگے اور اس میں اسے ایک سکون اور اطمینان محسوس ہو، یہ نعمت تو ہر ایک کو میسر نہیں ہوتی۔ جس کسی کو یہ دولت نصیب ہو جائے، اسے اس دولت کے مل جانے پر بیش از بیش اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ کتنے ایسے لوگ ہیں، جنھیں بیشمار نعمتیں میسر ہیں۔ لیکن وہ منعم حقیقی کو پہچاننے کے لیے تیار نہیں۔ اس کے برعکس وہ خوش نصیب بھی ہیں، جو نان شبینہ پر گزارا کرتے اور جھونپڑے میں رہتے ہیں، لیکن اس پر بھی ہمیشہ اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں۔ انھیں اگرچہ دنیا کی دولت نہیں ملی لیکن اس دولت کا مل جانا ان کے لیے دنیا و عقبیٰ کی کامیابی کی ضمانت ہے۔ تو جس کو اتنی بڑی دولت مل جائے، اس پر اتنا ہی بڑا شکر ادا کرنا لازمی ہو جاتا ہے۔ کیا خوب کہا کسی شاعر نے۔

میری طلب بھی انہی کے کرم کا صدقہ ہے
قدم یہ اٹھتے نہیں ہیں اٹھائے جاتے ہیں

ایسے جذبہ بے پناہ سے جو تعریف کی جائے گی، وہی حقیقت میں ثنائے جمیل کہلانے کی مستحق ہے۔ اور یہی وہ ثنائے جمیل ہے، جو حمد کا حقیقی معنی ہے۔ اور یہ بات کہنے کی ضرورت نہیں کہ جس ذات کی ثنائے جمیل کی جائے وہ خود جمیل نہیں ہوگی تو اور کیا ہوگی۔ جمیل ذات سے محبت کی جاتی ہے، ڈرا نہیں جاتا۔ جن مذاہب نے اللہ کا تعارف اس طرح کرایا کہ وہ ایک ایسی وحشت ناک اور ہیبت ناک ذات ہے، جس کے غضب سے ہمیشہ ڈرنا چاہیے۔ انھوں نے نہ اپنے ساتھ انصاف کیا اور نہ اللہ کے ساتھ۔ نہ اپنے آپ پر ہونے والے احسانات کو پہچانا، نہ اللہ کو محسن حقیقی سمجھا۔ انھوں نے اللہ کو ایک بادشاہ پر قیاس کیا۔ جو کبھی دعا سے ناراض ہو جاتا ہے اور کبھی دشنام پر خلعت بخشتا ہے۔ وہ یہ بات نہ سمجھ سکے کہ جہاں بھی اللہ سے ڈرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ کوئی ڈراؤنی ذات ہے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے اعمال کی نگہداشت کرو۔ ایسا کوئی عمل نہ کرنا، جو اللہ کے احکام کے خلاف انسانیت کا دشمن اور اس کی ناراضگی کو دعوت دینے والا ہو۔ تمہیں اپنے اعمال کی پاداش سے ڈرنا چاہیے۔ اللہ کی ناراضگی یا خوشنودی اس کا نتیجہ ہے، اس کی علت نہیں۔ وہ ذات تو ایسی پیاری ذات ہے جس سے پیار کرنے والے سرفراز ہوتے ہیں۔ اور دنیا و عقبیٰ کی نعمتوں سے مالا مال ہوتے ہیں۔ (تفسیر روح القرآن)

حمد کی تفسیر اقوال سلف سے

حضرت عمر نے ایک مرتبہ فرمایا کہ سبحان اللہ اور لا الہ الا اللہ اور بعض روایتوں میں ہے کہ اللہ اکبر کو تو ہم جانتے ہیں لیکن یہ الحمدللہ کا کیا مطلب؟ حضرت علی نے جواب دیا کہ اس کلمہ کو اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے پسند فرمالیا ہے اور بعض روایتوں میں ہے کہ اس کا کہنا اللہ کو بھلا لگتا ہے۔ ابن عباس فرماتے ہیں یہ کلمہ شکر ہے اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میرا شکر کیا۔ اس کلمہ میں شکر کے علاوہ اس کی نعمتوں، ہدایتوں اور احسان وغیرہ کا اقرار بھی ہے۔ کعب احبار کا قول ہے کہ یہ کلمہ اللہ تعالیٰ کی ثنا ہے۔ ضحاک کہتے ہیں یہ اللہ کی چادر ہے۔ ایک حدیث میں بھی ایسا ہی رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فرماتے ہیں جب تم الحمدللہ رب العالمین کہہ لوگے تو تم اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کرلوگے اب اللہ تعالیٰ تمہیں برکت دے گا اسود بن سریع ایک مرتبہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں عرض کرتے ہیں کہ میں نے ذات باری تعالیٰ کی حمد میں چند اشعار کہے ہیں اگر اجازت ہو تو سناؤں فرمایا اللہ تعالیٰ کو اپنی حمد بہت پسند ہے۔ (مسند احمد ونسائی) ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ میں حضرت جابر بن عبداللہ (رض) سے روایت ہے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ افضل ذکر لا الہ الا اللہ ہے اور افضل دعا الحمدللہ ہے۔ امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن غریب کہتے ہیں۔ ابن ماجہ کی ایک حدیث ہے کہ جس بندے کو اللہ تعالیٰ نے کوئی نعمت دی اور وہ اس پر الحمدللہ کہے تو دی ہوئی نعمت لے لی ہوئی سے افضل ہوگی۔ فرماتے ہیں اگر میری امت میں سے کسی کو اللہ تعالیٰ تمام دنیا دے دے اور وہ الحمدللہ کہے تو یہ کلمہ ساری دنیا سے افضل ہوگا۔ قرطبی فرماتے ہیں مطلب یہ ہے کہ ساری دنیا دے دینا اتنی بڑی نعمت نہیں جتنی الحمدللہ کہنے کی توفیق دینا ہے اس لیے کہ دنیا تو فانی ہے اور اس کلمہ کا ثواب باقی ہی باقی ہے۔ جیسے کہ قرآن پاک میں ہے المال والبنون الخ یعنی مال اور اولاد دنیا کی زینت ہے اور نیک اعمال ہمیشہ باقی رہنے والے، ثواب والے اور نیک امید والے ہیں۔ ابن ماجہ میں ابن عمر (رض) سے روایت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ایک شخص نے ایک مرتبہ کہا یارب لك الحمد كما ينبغي لجلال وجهك وعظيم سلطانك تو فرشتے گھبرا گئے کہ ہم اس کا کتنا اجر لکھیں۔ آخر اللہ تعالیٰ سے انھوں نے عرض کی کہ تیرے ایک بندے نے ایک ایسا کلمہ کہا ہے کہ ہم نہیں جانتے اسے کس طرح لکھیں، پروردگار نے

باوجود جاننے کے ان سے پوچھا کہ اس نے کیا کہا ہے؟ انھوں نے بیان کیا کہ اس نے یہ کلمہ کہا ہے، فرمایا تم یونہی اسے لکھ لو میں آپ اسے اپنی ملاقات کے وقت اس کا اجر دے دوں گا۔ قرطبی ایک جماعت علماء سے نقل کرتے ہیں کہ لا الہ الا اللہ سے بھی الحمد للہ رب العالمین افضل ہے کیونکہ اس میں توحید اور حمد دونوں ہیں۔ اور علماء کا خیال ہے کہ لا الہ الا اللہ افضل ہے اس لیے کہ ایمان و کفر میں یہی فرق کرتا ہے، اس کے کہلوانے کے لیے کفار سے لڑائیاں کی جاتی ہیں۔ جیسے کہ صحیح بخاری مسلم حدیث میں ہے ایک اور مرفوع حدیث میں ہے کہ جو کچھ میں نے اور مجھ سے پہلے کے تمام انبیاء کرام نے کہا ہے ان میں سب سے افضل لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ہے۔ حضرت جابر کی ایک مرفوع حدیث پہلے گزر چکی ہے کہ افضل ذکر لا الہ الا اللہ ہے اور افضل دعا الحمد للہ ہے۔ ترمذی نے اس حدیث کو حسن کہا ہے، الحمد میں الف لام استغراق کا ہے یعنی حمد کی تمام تر قسمیں سب کی سب صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ثابت ہیں۔ جیسے کہ حدیث میں ہے کہ باری تعالیٰ تیرے ہی لیے تمام تعریفیں ہیں اور تمام ملک ہے۔ تیرے ہی ہاتھ تمام بھلائیاں ہیں اور تمام کام تیری ہی طرف لوٹتے ہیں۔ رب کہتے ہیں مالک اور متصرف کو لغت میں اس کا اطلاق سردار اور اصلاح کے لیے تبدیلیاں کرنے والے پر بھی ہوتا ہے اور ان سب معانی کے اعتبار سے ذات باری تعالیٰ کے لیے یہ خوب جچتا ہے۔ رب کا لفظ بھی سوائے اللہ تعالیٰ کے دوسرے پر نہیں کہا جا سکتا ہاں اضافت کے ساتھ ہو تو اور بات ہے جیسے رب الدار یعنی گھر والا وغیرہ۔ بعض کا تو قول ہے کہ اسم اعظم یہی ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نعت بھی حقیقت میں حمد خدا ہے

یہاں یہ بات ملحوظ رکھنا چاہیے کہ کارخانہ قدرت میں کارساز حقیقی نے اپنے پیارے محبوب، حضور پرنور، شافع یوم النشور، سے بڑھ کر کسی کو صاحب کمال نہیں بنایا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ پر ہر خوبی و کمال کی انتہاء فرمادی، کوئی خوبی خواہ صورت کی ہو یا سیرت کی، جسمانی ہو یا روحانی، دینی ہو یا دنیوی، وہبی ہو، یا کسبی، اخلاقی ہو یا علمی اللہ تعالیٰ نے اسے پورے کمال کے ساتھ اپنے محبوب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں جمع فرمادیا ہے، آپ اللہ تعالیٰ کی صفت تخلیق کا سب سے بڑا شاہکار ہیں۔

اس لیے جملہ مسلمانان عالم بڑھ چڑھ کر آپ کی خوبیاں، عظمتیں، کمالات، معجزات اور اخلاق کریمانہ بیان کرتے ہیں آپ کی شان میں کروڑوں نعتیں لکھی جاچکی ہیں اور لکھی جارہی ہیں یہ سب اس لیے ہے کہ ان کی تعریف کر کے لوگ دراصل اس رب کی حمد کرتے ہیں جس نے آپ کو سب خوبیوں کا جامع بنایا ہے ی۔یعنی آپ کی شان میں لکھی جانے والی کروڑوں نعتیں بالواسطہ، الحمد للہ رب العالمین ہی میں داخل ہیں۔

بعض لوگ ہم اہل سنت پہ چیں بہ جبیں ہوتے ہیں کہ تم لوگ ہر وقت نعتیں ہی کیوں پڑھتے ہو؟ ہم عرض کرتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے کارخانہ قدرت میں اپنے حبیب کریم سے بڑھ کو کوئی صاحب کمال پیدا ہی نہیں فرمایا، تو آپ کی جس قدر نعتیں پڑھی جائیں گی وہ حقیقت میں اللہ ہی کی حمد ہے۔ اور یہ مسلم اصول ہے کہ کسی معمار کو خوش کرنا ہو تو اس کی بنائی ہوئی تعمیر کی تعریف کرو، شاعر کو خوش کرنا ہے تو اس کے اشعار کی خوبی بیان کرو، مصنف کو خوش کرنا ہے تو اس کی تصنیف کو سراہو، اللہ کو راضی کرنا ہے تو اس کے محبوب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خوبیاں بیان کرو اور ان کی نعتیں پڑھو، کہ وہ بالواسطہ حمد خدا ہی ہے اسی لیے امام احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

وہی رب ہے جس نے تجھ کو ہمہ تن کرم بنایا

ہمیں بھیک مانگنے کو تیرا آستاں بتایا تجھے حمد ہے خدایا

یہاں ہمیں یہ سبق ملا کہ ہمیں جس بھی انسان سے کوئی نعمت ملے تو اس کا شکریہ ادا کرنے سے قبل اس اللہ تعالیٰ کا شکریہ بجالانا چاہیے جس نے اسے ہمیں وہ نعمت دینے کی توفیق بخشی۔ ومابکم من نعمۃ فمن اللہ۔ (سورۃ نحل آیت نمبر 54)۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ ہر نعمت پر الحمد للہ کہنا چاہیے کہ ہر نعمت اللہ ہی کی طرف سے آتی ہے۔ حدیث میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ بندے پر کوئی نعمت کرے اور وہ اس پر الحمد للہ کہے تو یہ حمد اس نعمت سے بڑھ جاتی ہے خواہ نعمت کتنی بڑی ہو اور ایک روایت میں ہے کہ جب بندہ دنیا میں نعمت ملنے پر الحمد للہ کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے آخرت میں اس سے بڑی نعمت تیار فرمادیتا ہے۔ (تفسیر برہان القرآن۔ علامہ قاری محمد طیب)

جس کی تعریف کی جائے اسے محمود کہا جاتا ہے۔ مگر محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) صرف اسی کو کہہ سکتے ہیں جو کثرت قابل ستائش خصلتیں رکھتا ہو نیز جب کوئی شخص محمود ثابت ہو تو اسے بھی محمود کہہ دیتے ہیں۔ اور آیت کریمہ: إِنَّهُ

حَمِيدٌ مَّجِيدٌ[ھود/73]وہ سزاوار تعریف اور بزرگوار ہے۔میں حمید بمعنی محمود بھی ہو سکتا ہے اور حامد بھی حماد کا ان تفعل کذا یعنی ایسا کرنے میں تمہارا انجام بخیر ہے۔اور آیت کریمہ:

وَمُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِي مِن بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ [الصف/6]

اور ایک پیغمبر جو میرے بعد آئیں گے جن کا نام احمد ہو گا ان کی بشارت سناتا ہوں۔میں لفظ احمد سے آنحضرت(صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)کی ذات کی طرف اشارہ ہے اور اس میں تنبیہ ہے کہ جس طرح آنحضرت(صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)کا نام احمد ہو گا اسی طرح آپ اپنے اخلاق واطوار کے اعتبار سے بھی محمود ہوں گے اور عیٰسی(علیہ السلام)کا اپنی بشارت میں لفظ احمد(صیغہ تفضیل)بولنے سے اس بات پر تنبیہ ہے کہ آپ(صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)حضرت مسیح(علیہ السلام)اور ان کے بیشتر وجملہ انبیاء سے افضل ہیں اور آیت کریمہ:مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ[الفتح/29]محمد(صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)خدا کے پیغمبر ہیں۔میں لفظ محمد(صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)گو من وجہ آنحضرت(صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)کا نام ہے لیکن اس میں آنجناب(صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)کے اوصاف حمیدہ کی طرف بھی اشارہ پایا جاتا ہے جیسا کہ آیت کریمہ:إِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلَامٍ اسْمُهُ يَحْيَى[مریم/7]میں بیان ہو چکا ہے کہ ان کا یہ نام معنی حیات پر دلالت کرتا ہے جیسا کہ اس کے مقام پر مذکور ہے۔(مفردات)

حمد ومدح وشکر میں فرق

کسی اختیاری خوبی پر زبان سے تعریف کرنا خواہ مقابلہ میں نعمت ہو یا نہ حمد کہلاتا ہے۔حمد ومدح دونوں ہم معنی ہیں۔مثلاتم کہو گے:حمدت الرجل علی انعامہ،حمدتہ علی شجاعتہ وحسبہ۔پہلی مثال میں مقابلے میں نعمت ہے اور دوسری مثال میں نعمت وغیرہ کچھ نہیں،شکر خاص طور پر نعمت کیا جاتا ہے،البتہ شکر دل،زبان اعضا تمام سے ہی کیا جاتا ہے۔جیسا شاعر کا یہ قول:افادتکم النعماء منی ثلاثۃ۔یدی ولسانی والضمیر المحجبا۔

نعمتوں کا فائدہ تمہیں میری طرف سے تین طرح پہنچا،میرے،ہاتھ،زبان اور مخفی ضمیر سے۔(یہاں شکر کے بالمقابل زبا،ہاتھ اور ضمیر تینوں کا ذکر کیا)

حمد: صرف زبان سے ہوتی ہے وہ شکر کا ایک شعبہ ہے اور اس حدیث میں یہی معنی ہے۔ الحمد راس الشکر ما شکر اللہ عبد لم یحمدہ (حمد شکر کی چوٹی ہے اور اس بندے نے شکر ادا نہیں کیا جس نے اللہ کی تعریف نہیں کی) اس ارشاد میں حمد کو شکر کی چوٹی قرار دیا گیا، کیونکہ زبان سے نعمت کا تذکرہ کرنے سے زیادہ پھیلتا ہے، بہ نسبت اعتقاد اور اعمال جوارح کے۔ کیونکہ دل کا عمل مخفی ہے اور اعضا کے عمل میں احتمال ہے، حمد کی نقیض ذم ہے اور شکر کی نقیض کفران ہے۔

شکر و مدح کا فرق

یہ بھی کہا گیا ہے کہ مدح اوصاف کمال پر کسی کی تعریف کرنا مثلاً باقی رہنا، قادر، عالم، ابدی، ازلی ہونا۔
شکر: جس کی طرف سے قسما قسم کی مہربانیاں ہوں ان پر اس کی تعریف کرنا اور حمد کا لفظ شکر و مدح دونوں کو شامل ہے۔ الحمد کا الف لام ہمارے نزدیک استغراق کے لیے ہے بخلاف معتزلہ کے، اسی لیے اس کو اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ ملایا جو اسم ذات ہے اور تمام صفات کمال کو جامع ہے، اور یہی بنیاد ہے مسئلہ خلق افعال کی جس کی تحقیق کئی مقام پر میں نے کر دی ہے۔ (مدارک)

شان نزول

سورۃ فاتحہ یہ ہے جو حضرت مولانا یعقوب چرخی (رح) حضرت امیر المومنین اسد اللہ کرم اللہ وجہہ اور حضرت عبد اللہ بن عباس (رض) سے راوی ہیں کہ
یہ سورۃ مبارکہ مکہ میں نازل ہوئی۔
اور کیفیت واقعہ یوں ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جب میں بسوئے صحرا جاتا ہوں ایک آواز سنتا ہوں کہ جو کوئی پکارتا ہے یا محمد اور ایک شخص نورانی دیکھتا ہوں کہ ایک تخت طلائی پر آسمان و زمین کے مابین معلق کھڑا ہوا ہے میں اس سے خوفزدہ ہو کر واپس آجاتا ہوں۔
جب یہ حادثہ مکرر سہ مکرر ہوا تو ورقہ بن نوفل (رح) سے جو ام المومنین خدیجۃ الکبریٰ (رض) کے چچازاد بھائی تھے۔ توراۃ و انجیل کے عالم تھے اور احبار نصاریٰ میں ممتاز تھے میں نے ان سے ذکر کیا۔

ورقہ نے سن کر عرض کیا۔ آئندہ جب آپ یہ آواز سنیں بجائے خوف زدہ ہونے کے ٹھہریں اور سنیں کہ وہ کیا کہتا ہے۔ چنانچہ آپ نے ایسا ہی کیا جب وہ آواز آئی اور کوئی پکارا یا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)۔
میں نے کہا لبیک میں حاضر ہوں تو وہ بولا انا جبرائیل وانت نبی ھذہ الامۃ۔ میں جبرائیل ہوں اور آپ اس امت کے نبی ہیں۔ پھر کہا فرمائیں اشھد ان لا الہ الا اللہ واشھد ان محمداعبدہ ورسولہ پھر کہا۔ فرمائیں الحمد للہ رب العلمین۔ الی اخرہ۔
یعنی تمام تعریف وثنا صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے جو تمام عالموں کا پرورش فرمانے والا ہے۔
یہ سورۃ پاک بندگان الٰہی کی زبان پر نازل ہوئی۔ یعنی بندہ کو چاہیے کہ بحالت مناجات اور بوقت دعا اس طرح اپنے رب کی حمد کرے۔ (تفسیر الحسنات۔ علامہ سید ابوالحسنات محمد احمد قادریؒ)

لفظ اللہ کا معنیٰ اور اس کے وصف یا علم ہونے کی تحقیق

علامہ مکی بن ابی طالب لکھتے ہیں:
لفظ اللہ اصل میں "الاہ" ہے پھر اس پر الف الام داخل کیا گیا تو "الالاہ" ہو گیا پھر تخفیفا الف کو حذف کیا اور اس کی حرکت پہلے لام پر داخل کر دی اور پہلے لام کا دوسرے لام میں ادغام کر دیا تو یہ لفظ "اللہ" ہو گیا ایک قول یہ ہے کہ یہ اصل میں "لاہ" ہے اس پر الف لام داخ کیا اور لام کا لام میں ادغام کیا تو یہ لفظ "اللہ ہو گیا اور خلیل سے منقول ہے کہ اس کی اصل "ولاہ" ہے (مشکل اعراب القرآن 'مطبوعہ انتشارات نور 'ایران '۱۳۶۲ھ)
علامہ ابن منظور افریقی لکھتے ہیں:
"الہ" کا معنی ہے حیرت زدہ ہونا 'کیونکہ بندہ جب اللہ تعالیٰ کی عظمت اور جلال میں غور کرتا ہے تو حیرت زدہ ہو جاتا ہے 'اور "لاہ" سریانی زبان کا لفظ ہے 'جو چیز بلند اور مجوب ہو اس کو "لاہ" کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انسانی آنکھوں سے مجوب ہے اور جو چیز اس کے لائق نہ ہو اس سے بلند ہے 'اور "ولاہ" کا معنی ہے بچہ کا خوف زدہ ہو کر ماں کی طرف لپکنا 'اور تمام مخلوق اپنے مصائب اور پریشانیوں میں گھبرا کر اللہ کی طرف لپکتی ہے 'ان وجوہ سے کہا جاتا ہے کہ لفظ

اللہ "الہ" سے "لاہ" سے یا "ولاہ" سے بنا ہے۔ ابن اثیر نے کہا: یہ "الہ" سے بنا ہے اور منذری نے کہا: یہ "الالہ" سے بنا ہے۔ (لسان العرب ج۱۳ ص۴۶۹۔۴۶۷ مطبوعہ نشر ادب الحوزۃ، قم، ایران)

اور علامہ فیروز آبادی لکھتے ہیں:

سیبویہ نے کہا کہ لفظ اللہ کا "لاہ" سے بننا جائز ہے، اس کا معنی بلندی اور ارتفاع ہے۔

(قاموس ج۴ ص۴۱۶، مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۱۲ھ)

علامہ زبیدی حنفی لکھتے ہیں:

زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ لفظ اللہ ذات واجب الوجود کے لیے علم (شخصی نام) ہے جو کہ تمام صفات کمال کی جامع ہے اور یہ لفظ مشتق نہیں ہے، ابن العربی نے کہا: یہ علم ہے اور الہ حق پر دلالت کرتا ہے اور یہ تمام اسماء حسنیٰ الٰہیہ احدیہ کا جامع ہے۔ (تاج العروس ج۱ ص۳۷۴، مطبوعہ المطبعۃ الخیریہ، مصر، ۱۳۰۶ھ)

لفظ اللہ کسی لفظ سے نہیں بنا

ہمارے نزدیک تحقیق یہی ہے کہ لفظ اللہ کسی لفظ سے نہیں بنا، اور یہ اصل میں علم ہے وصف نہیں ہے کیونکہ لفظ اللہ موصوف ہوتا ہے اور کسی موصوف کی صفت نہیں بنتا، نیز اللہ تعالیٰ کی متعدد صفات ہیں اور ان صفات کے عمل کے لیے کسی موصوف کی ضرورت ہے اور لفظ اللہ کے علاوہ اور کوئی لفظ اس کی صلاحیت نہیں رکھتا، اور اگر لفظ اللہ مشتق اور صفت ہو تو پھر "لا الہ الا اللہ" سے توحید ثابت نہیں ہو گی کیونکہ صفت کلی ہوتی ہے اور شرکت کثیرین سے مانع نہیں ہوتی اور علامہ بیضاوی کا یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ یہ لفظ اصل میں وصف تھا اور غلبہ استعمال کی وجہ سے بہ منزلہ علم ہو گیا کیونکہ پھر مرتبہ وضع میں توحید ثابت نہیں ہو گی، اور "الہ" اور "لاہ" کے ساتھ لفظی مناسبت سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ لفظ ان میں کسی ایک لفظ سے بنا ہو اور حق یہ ہے کہ جس طرح اللہ کی ذات کسی سے نہیں بنی اسی کی ذات پر دلالت کرنے والا بھی کسی لفظ سے نہیں بنا۔

علامہ شامی لکھتے ہیں:

علامہ سعد الدین تفتازانی اور علامہ عصام الدین نے کہا ہے کہ لفظ اللہ اس ذات کے لیے علم (شخصی نام) ہے جو واجب الوجود ہے، اور تمام صفات محمودہ کی جامع ہے، اور علامہ میر سید شریف نے کہا: جس طرح اللہ تعالیٰ کی ذات کا ادراک کرنے سے انسان کی عقل حیران اور عاجز و درماندہ ہے اسی طرح اس کی ذات پر دلالت کرنے والے اسم کی حقیقت کو پانے سے بھی عقلیں حیران اور پریشان ہیں۔ کسی نے کہا: یہ لفظ سریانی ہے، کسی نے کہا: یہ عربی ہے، کسی نے کہا: یہ وصف اور مشتق ہے، کسی نے کہا: علم ہے اور جمہور کا موقف یہ ہے کہ لفظ اللہ عربی ہے اور علم مرتجل ہے (کوئی اور لفظ اس کی اصل نہیں ہے) امام ابوحنفیہ، (رح) امام محمد بن الحسن، (رح) امام شافعی (رح) اور خلیل (رح) کا یہی نظریہ ہے، امام اعظم ابوحنیفہ (رح) سے منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم یہی اسم ہے، امام طحاوی اور دیگر کثیر علماء اور عارفین کا یہی قول ہے۔ (ردالمختار ج ا ص ۵، مبطوعہ مطبعہ عثمانیہ، استنبول، ۱۳۲۷ھ) (تبیان)

اللّٰہ جَلَّ جلاَلُہٗ

" اللہ " پروردگار کے لیے اسم ذات ہے۔ کسی اور ہستی پر اس کا اطلاق ہو ہی نہیں سکتا۔ فارسی کے خدا یا انگریزی کے God کی طرح اسم نکرہ نہیں کہ معبود واحد کے علاوہ دوسروں کے لیے بھی بولا جاسکے۔ اس کی نہ جمع آتی ہے نہ یہ کسی لفظ سے مشتق ہے اور نہ اس کا ترجمہ کسی دوسری زبان میں ممکن ہے۔

جیسا کہ شعراء جاہلیت کے کلام سے ظاہر ہے کہ نزول قرآن سے پہلے بھی عربی میں اللہ کا لفظ خدا کے لیے اسم ذات کے طور پر ہی مستعمل تھا۔ بلکہ نوع انسانی کے دینی تصورات کی جو تاریخ ہم تک پہنچی ہے، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ انسانوں کے تصور توحید میں جب بگاڑ پیدا ہوا اور شرک کی مختلف صورتیں پیدا ہوئیں تو ان میں اہم تر مظاہر فطرت کی پرستش تھی۔ اسی پرستش نے بتدریج اصنام پرستی کی صورت اختیار کی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ مختلف زبانوں میں مختلف الفاظ دیوتاؤں کے لیے پیدا ہو گئے اور جوں جوں پرستش کی نوعیت میں وسعت ہوتی گئی، الفاظ کا تنوع بھی بڑھتا گیا۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اصنام پرستی کی اس وسعت کے باوجود ایک ایسی ہستی کے تصوّر سے انسان کا ذہن کبھی خالی نہیں رہا، جو سب سے اعلیٰ اور سب کو پیدا کرنے والی ہستی ہے۔ اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ تمام قوموں میں کوئی نہ کوئی لفظ ایسا ضرور مستعمل رہا، جس کے ذریعے سے اس ان دیکھی اور اعلیٰ ترین ہستی کو پکارا جاتا تھا۔

بلکہ یہ دلچسپ حقیقت ہے کہ سامی زبانوں میں حروف واصوات کی ایک خاص ترکیب موجود رہی ہے، جو اس معبود اعلیٰ کی طرف اشارہ کرتی ہے اور تمام زبانوں میں اس کا مادہ مشترک رہا ہے۔ چنانچہ کلدانی اور سریانی کا الاہیا، عبرانی کا الوہ اور عربی کا اِلٰہ اسی سے ہے اور بعض علما کے نزدیک یہی الٰہ ہے جو حرف تعریف کے اضافہ کے بعد اللہ ہو گیا ہے۔ اور تعریف نے اسے صرف خالق کائنات کے لیے مخصوص کر دیا ہے۔ مگر بیشتر علما الف لام کو تعریف کے لیے نہیں مانتے، بلکہ اسے اس نام کا جزو قرار دیئے ہیں۔ اس لیے وہ لفظ اللہ کو کسی سے مشتق نہیں مانتے اور نہ اس سے کسی کو مشتق مانتے ہیں۔ چنانچہ یہی لفظ اللہ ہے جسے قرآن کریم نے بطور اسم ذات کے اختیار کیا اور تمام صفتوں کو اس کی طرف نسبت دی۔ ارشاد ہوا:

"وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا " اللہ کے لیے حسن وخوبی کے نام ہیں۔ (یعنی صفتیں ہیں) پس چاہیے کہ اسے ان صفتوں کے ساتھ پکارو۔

لفظ اللہ کے لفظی خواص

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو کوہ طور پر جن کلمات الٰہی کے ذریعے ذات حق سبحانہٗ کا عرفان بخشا گیا وہ یہ ہیں۔ (اِنَّنِیْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا) اس میں بھی پروردگار نے لفظ اللہ کو بطور اسم ذات کے اختیار فرمایا۔ اس لفظ کی معنوی بحث تو آگے آئے گی۔ یہاں ہم اس کے خواص لفظی کے سلسلہ میں چند باتیں عرض کرتے ہیں:

1 یہ لفظ عجیب شان رکھتا ہے کہ جس کلمہ توحید کے ذریعے اللہ نے اپنا تعارف کرایا یعنی (لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اللّٰهُ) اور اسے مسلمانوں کا شعار بنایا۔ اس میں غور کریں تو آپ دیکھیں گے کہ اس کلمہ توحید میں کوئی بھی زائد حرف موجود نہیں۔ وہی حروف ہیں، جو اسم ذات کے اندر موجود ہیں۔ انہی کی ترکیب سے کلمہ توحید کو متشکل کیا گیا۔

2 اللہ کا اگر حرف "ھمزہ" نہ لکھا جائے تو للہ پڑھا جائے گا۔ جس کے معنی ہیں ہر شے اللہ ہی کی ملک ہے۔ "وَلِلّٰهِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ " اور آسمان وزمین کے خزانے اللہ ہی کے لیے ہیں (المنافقون: ٦٣۔٧)

3 للّٰہ سے ایک لام کم کر دیا جائے تو "لہ" اور مزید ایک لام کم کرنے سے صرف "ہ" رہ جائے گا۔ جس کا تلفّظ "ھو" ہے۔ یہ حرف واحد بھی اسی ذات واحد اور اسی ذات احد پر دلالت کرتا ہے۔ جیسے "قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ"

4 یہ اسی لفظ اللہ ہی کا خاصہ ہے کہ اس پر تائے قسم وارد ہوتی ہے۔ ورنہ حرف "تا" بمعنی قسم اور کسی اسم پر وارد نہیں ہوتا۔

5 اس اسم پاک کا ایک خاصہ یہ ہے کہ الحمد کا استعمال اسی اسم ذات کے لیے خاص ہے اور کسی اسم کے ساتھ الحمد کو استعمال نہیں کیا جاتا۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کہیں گے۔ الحمد للرحمٰن یا الحمد للرحیم وغیرہ نہیں بولا جاتا۔ وجہ یہ ہے کہ جس طرح یہ اسم پاک مسمّٰی کی ذات وصفات سب پر حاوی ہے، اسی طرح لفظ "حمد" بھی تمام صفات کمال وجمال کا جامع ہے۔ لہٰذا کامل تر اسم کے لیے کامل تر نعت کی ضرورت تھی۔

6 یہ بھی اسم اللہ ہی کا خاصہ ہے کہ اس کے آخر میں حرف "م" شامل کیا جاتا ہے اور وہ حرف ندا کا کام دیتا ہے اور اس کے ساتھ حرف ندا شامل نہیں ہوتا۔ یعنی یا اللّٰھم نہیں کہتے بلکہ اللّٰھم کا معنی ہے اے اللہ۔ قرآن کریم نے کئی جگہ اسے استعمال کیا ہے۔ مثلاً

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ز وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ط بِيَدِكَ الْخَيْرُ ط اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (آل عمران ۳:۲۵-۲۶)

اسم "اللہ" کی معنوی بحث

یہ تو تھے اس اسم پاک کے خواص لفظی اب دیکھئے اس کی معنوی بحث۔ پیچھے گزر گیا کہ بعض علماء کے نزدیک لفظ "اللہ" وہ عربی کا اِلٰہ ہے، جو حرف تعریف کے اضافہ کے بعد اللہ ہو گیا۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر اللہ اِلٰہ سے ہے تو اِلٰہ کے معنی کیا ہیں؟ علماء لغت واشتقاق نے مختلف اقوال بیان کیے ہیں جنھیں ہم تفسیر کبیر کے حوالہ سے یہاں نقل کرتے ہیں۔

1 الھتُ اِلٰی فلاں۔ سے مشتق ہے۔ جس کے معنی ہیں سَكَنْتُ اِلٰی فلاں۔ یعنی اللہ وہ ہے، جس کے نام سے دلوں کو تسکین ملتی ہے اور قلب مضطر کو سکون۔ جیسے قرآن کریم کہتا ہے "اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ"

(الرعد:۱۳۔۲۸)

2 اَلِہَ اِذَا تَحَیَّرَ۔ سے مشتق ہے۔ جس کے معنی وارفتگی، تحیّر اور درماندگی کے ہیں۔

3 الہ لاہ۔ سے مشتق ہے۔ جس کے معنی بلند شان کے ہیں۔ یعنی اللہ وہ ہے جو لوازمات مادہ سے زمان و مکان کے احاطہ سے اور عقلمندوں کے فہم و ادراک سے ارفع اور بلند ہے۔

4 لاہ یلوہ لیاھا۔ سے مشتق ہے۔ جس کے معنی پوشیدہ اور مستور ہونا ہے۔ یعنی اللہ وہ ہے، جس کی ذات عقول سے محجوب ہے۔

5 اَلِہَ الفَصِیل سے بنا ہے۔ یعنی اونٹنی کا بچہ جب بچھڑنے کے بعد ماں کو ملتا ہے تو وہ ماں سے چمٹ جاتا ہے۔ اسی طرح اللہ وہ ہے کہ آفات و مصائب میں انسان اسی کی جانب لپکتا ہے اور وہیں اسے تسکین ملتی ہے۔

6 اَلِہَ الہ (سمع) سے بنا ہے۔ محاورہ ہے۔ "الہ علی فلاں " اس سے ڈر تا رہا۔ اَلَہ اِلَیۃ اس کی پناہ ڈھونڈی۔ یعنی اللہ وہ ہے جو خوف و ہراس کے وقت بندوں کی پناہ ہے۔ تمام عالم اور تمام مخلوقات اس کی حفاظت میں ہر ایک خطرہ سے محفوظ ہیں۔

7 اَلَہَ یَألَہُ۔ عَبَدَ

8 الہ اصلہ ولاہٌ فأُبدِل من الواد ھمزہ وتسمیتہ بذلك لکون کل مخلوق والھًا نحوہ

ان تمام لفظوں کے معانی پر اگر تدبّر سے کام لیا جائے تو چند باتیں صاف معلوم ہوتی ہیں۔ کہ وہ ذات عظیم جسے الہ سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ مندرجہ بالا خصوصیات کی حامل ہے۔ یعنی وہ ہر بے کس و بے بس کی حاجت روا ہے۔ جس کا کوئی ٹھکانا نہ ہو اس کی پناہ دہندہ ہے۔ وہ تمام ضرورت مندوں اور حاجت مندوں کے لیے قاضی الحاجات ہے۔ وہ تمام قوتوں سے بالاتر قوت اور تمام عظمتوں اور بڑائیوں سے سب سے بڑھ کر عظیم اور کبریائی کی مالک ہے۔ ہر پریشان حال اور اجڑے دل کو سکون بخشنے والی ہے۔ ہر مخلوق تکوینی اور جبلّی طور پر اس کی مشتاق ہے۔ پوری کائنات کا ایک ایک ذرہ اس کی قدرت کے سامنے بے بس اور لاچار ہے۔ ان تمام صفات کا خلاصہ اور حاصل اگر کوئی چیز ہو سکتی ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ الہ وہ ذات ہے جو کائنات میں اقتدار اعلیٰ کی مالک اور ہمہ مقتدر ہے۔ اس کے اقتدار میں کسی کو شریک نہیں کیا جا سکتا۔ نظام کائنات پر اس کی فرماں روائی ایک ایسی اٹل حقیقت ہے جس سے کسی طرح انکار نہیں۔

اقتدار کا یہ وہ تصور ہے جس کی بنیاد پر قرآن اپنا سارا زور غیر اللہ کی الٰہیت کے انکار اور صرف اللہ کی الٰہیت کے اثبات پر صرف کرتا ہے۔ اس کا استدلال یہ ہے کہ زمین اور آسمان میں ایک ہی ہستی تمام اختیارات و اقتدارات کی مالک ہے۔ خلق اسی کی ہے ،نعمت اسی کی ہے ،امر اسی کا ہے ،قوت اور زور بالکل اسی کے ہاتھ میں ہے۔ ہر چیز چار و ناچار اسی کی اطاعت کر رہی ہے ،اس کے سوا نہ کسی کے پاس کوئی اقتدار ہے ،نہ کسی کا حکم چلتا ہے ،نہ کوئی خلق اور تدبیر اور انتظام کے رازوں سے واقف ہے اور نہ کوئی اختیارات حکومت میں ذرہ برابر شریک و سہیم ہے۔ لہٰذا اس کے سوا حقیقت میں کوئی الٰہ نہیں ہے ،اور جب حقیقت میں کوئی دوسرا الٰہ نہیں ہے تو تمہارا ہر وہ فعل جو تم دوسروں کو الٰہ سمجھتے ہوئے کرتے ہو ،اصلاً غلط ہے ،خواہ وہ دعا مانگنے یا پناہ ڈھونڈنے کا فعل ہو ،یا سفارشی بنانے کا فعل ہو ،یا حکم ماننے اور اطاعت کرنے کا فعل ہو۔ یہ تمام تعلقات جو تم نے دوسروں سے قائم کر رکھے ہیں صرف اللہ کے لیے مخصوص ہونے چاہئیں ،کیونکہ وہی اکیلا صاحب اقتدار ہے۔

اس باب میں قرآن جس طریقہ سے استدلال کرتا ہے وہ اسی کی زبان سے سُنئے:

وَهُوَ الَّذِيْ فِي السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِي الْاَرْضِ اِلٰهٌ ط وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْعَلِيْمُ ۔

(وہی ہے جو آسمان میں بھی اِلٰہ ہے اور زمین میں بھی الٰہ ہے ،اور وہی حکیم اور علیم ہے)۔ "یعنی آسمان و زمین میں حکومت کرنے کے لیے جس علم اور حکمت کی ضرورت ہے وہ اسی کے پاس ہے۔"

(الزخرف۔۸۴)

اَفَمَنْ يَّخْلُقُ كَمَنْ لَّا يَخْلُقُ ط اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۔ ۔ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَخْلُقُوْنَ شَيْئًا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ ط ۔ ۔ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۔ (النحل۔۱۷۔۲۲)

" تو کیا وہ جو پیدا کرتا ہے اور جو پیدا نہیں کرتا دونوں یکساں ہو سکتے ہیں؟ کیا تمہاری سمجھ میں اتنی بات نہیں آتی؟۔۔ خدا کو چھوڑ کر یہ جن دوسروں کو پکارتے ہیں وہ تو کسی چیز کو بھی پیدا نہیں کرتے ،بلکہ خود پیدا کیے جاتے ہیں۔ تمہارا اِلٰہ تو ایک ہی اِلٰہ ہے۔

وَهُوَ اللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ط لَهُ الْحَمْدُ فِي الْاُوْلٰى وَالْاٰخِرَةِ ز وَلَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۔ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ الَّيْلَ سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِضِيَآءٍ ط اَفَلَا

تَسۡمَعُوۡنَ ۔ قُلۡ اَرَءَیۡتُمۡ اِنۡ جَعَلَ اللّٰہُ عَلَیۡکُمُ النَّہَارَ سَرۡمَدًا اِلٰی یَوۡمِ الۡقِیٰمَۃِ مَنۡ اِلٰہٌ غَیۡرُ اللّٰہِ یَاۡتِیۡکُمۡ بِلَیۡلٍ تَسۡکُنُوۡنَ فِیۡہِ ؕ اَفَلَا تُبۡصِرُوۡنَ ۔ (قصص۔۷۰۔۷۲)

(اور وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی دوسرا الٰہ نہیں ہے۔ اسی کے لیے تعریف ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ اور وہی اکیلا صاحب حکم و اقتدار ہے اور اسی کی طرف تم پلٹائے جانے والے ہو۔ کہو تم نے کبھی غور کیا کہ اگر اللہ تم پر ہمیشہ کے لیے روز قیامت تک رات طاری کر دے تو اس کے سوا کونسا دوسرا الٰہ ہے جو تمہیں روشنی لا دے گا؟ کیا تم سنتے نہیں ہو؟ کہو تم نے کبھی اس پر غور کیا کہ اگر تمہارے اوپر ہمیشہ کے لیے دن طاری کر دے تو اس کے سوا اور کونسا الٰہ ہے جو تمہیں رات لا دے گا کہ اس میں تم سکون حاصل کرو؟ کیا تمہیں نظر نہیں آتا؟)

دوسری بات جو معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ ہی کی ذات ہے، جہاں پریشانی اور مصیبت میں قرار اور پناہ ملتی ہے۔ وہی آغوش ہے جہاں انسان سکون پاتا ہے۔ دل اس کی طرف لپکتے ہیں۔ محبتیں اسی کے لیے بے تاب ہوتی ہیں اور تیسری یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اگر اس ذات کی حقیقت کو جاننے کے لیے فہم وادراک سے کام لیا جائے اور انسان کے پاس جتنے علوم دستیاب ہیں، ان سب کو اس راستے میں استعمال کر کے دیکھ لیا جائے، اور ظن و تخمین کے تمام ہتھیار بھی استعمال کر لیے جائیں تو حقیقت یہ ہے کہ بجز اس کے کہ انسان تحیّر اور درماندگی کا شکار ہو جائے اور اس کے ہاتھ کچھ نہیں آتا۔ وہ جس قدر بھی اس ذات مطلق کی ہستی میں غور وخوض کرے گا، اس کی عقل کی حیرانی اور درماندگی بڑھتی ہی جائے گی۔ اس لیے کہ ایک مخلوق اپنی فہم وادراک کی وسعتوں کے باوجود، مخلوق ہی ہے۔ وہ اپنے دستیاب وسائل میں ایک خالق کی وسعتوں کو نہیں سمیٹ سکتا۔ انسانی ذہن مخلوقات میں قدرت کا شاہکار ہے لیکن وہ بہر حال مخلوق اور محدود ہے۔ محدود میں غیر محدود کبھی نہیں سما سکتا۔ اکبرؔ مرحوم نے خوب کہا:

جو ذہن میں گھر گیا لاانتہا کیونکر ہوا

جو سمجھ میں آگیا پھر وہ خدا کیونکر ہوا

البتہ انسان کو اگر اپنی ذات میں فہم وادراک کی نارسائی اور اپنی عجز و درماندگی کا اعتراف نصیب ہو جائے تو یہ وہ دولت ہے جو عبدیت کی معراج ہے۔ اس وجہ سے جو لوگ عرفان و بصیرت کی راہ کے سالک ہیں ان کے ادراک کا منتہا ہمیشہ

یہی رہا ”رَبِّ زِدْنِيْ فِيْكَ تَحَيُّرًا “ کہ اے اللہ ہمیں اپنے بارے میں ایسا کر کہ تیرے بارے میں ہمارا تحیّر ہمیشہ بڑھتا رہے۔ اس لیے اگر اس لفظ کا کوئی مفہوم ہو سکتا ہے تو وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ اللہ جل جلالہٗ وہ ذات ہے، جس کو جاننے اور سمجھنے کے لیے تمام فہم و ادراک کی قوتیں عاجز و درماندہ ہیں۔ البتہ انسان کے پریشان دل کو اس وقت تک قرار نصیب نہیں ہو گا اور اس کے الجھے ہوئے مسائل کی گرہ اس وقت تک نہ کھلے گی جب تک اللہ کے ذکر سے زبانیں زمزمہ سنج نہیں ہوں گی اور اس کی دی ہوئی تعلیمات سے انسان کی فکر روشن نہیں ہو گی۔

معرفتِ رب کا اصل ذریعہ

بلاشبہ اللہ کی ذات انسان کے حواس اور عقل کی گرفت میں نہیں آسکتی۔ اس کا کماحقہٗ جاننا اور سمجھنا انسانی طاقت سے ماوراہے۔ لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ ایک انسان اس کی محبت میں ڈوب کر جب اس کی بارگاہ تک پہنچ جاتا ہے تو اس کا جذبۂ خاموش بار بار اسے انگیخت کرتا ہے کہ جس اللہ کو تم خالق، مالک معبود اور اپنا حاکم حقیقی سمجھتے ہو اسے جاننے کی بھی تو کوئی راہ نکالو۔ اللہ کا کرم ہے کہ اس نے ہمیں اس سے محروم نہیں رکھا۔ قرآن و سنت نے ہم پر یہ بات واضح کی کہ تم جس عقل کے ذریعے اللہ کی ذات کو جاننا چاہتے ہو وہ عقل اللہ کی بیش بہا نعمت ہے۔ اسی کی وجہ سے انسان کو بہت سی مخلوقات پر فضیلت حاصل ہے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ عقل کا کام محسوسات اور معقولات تک محدود ہے اور پھر محسوسات اور معقولات میں بھی بہت سی باتیں ایسی ہیں جس کی توجیہ کرنے میں آج تک عقل کامیاب نہیں ہو سکی۔ اللہ کی ذات کو جاننا یہ درحقیقت اس کی حدود سے ماوراچیز ہے۔ اس کا میدان چونکہ معقولات تک محدود ہے، جب ہم اسے ایسے میدان میں کھینچ لاتے ہیں جو اصلاً اس کا میدان نہیں تو اس میں عقل کا کام نہ دینا عقل کی کوتاہی یا اس کا نقص نہیں بلکہ یہ قصور عقل کو اس میدان میں استعمال کرنے والے کا ہے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی آدمی کسی صراف کے پاس جا کر یہ کہے کہ تمہارے ترازو کا تول اگر صحیح ہے تو مجھے اس میں یہ پہاڑ تول کر دکھاؤ یا یہ دیوار تول کر دکھاؤ اور جب وہ ایسا نہ کر سکے اور یقیناً ایسا نہیں کر سکے گا تو پھر یہ شور مچانا شروع کر دے کہ تم کیسے یہ دعویٰ کرتے ہو کہ تمہارا یہ ترازو بالکل صحیح ہے۔ وہ صراف جواب میں یقیناً یہ کہے گا کہ بھائی ترازو بالکل صحیح ہے لیکن تم اس میں وہ چیز تلوانا چاہتے ہو جو اس کی حدود سے ماوراہے۔ تو اس میں غلطی تمہاری ہے میرے ترازو کی

نہیں۔ یہی غلطی ہم اس وقت کرتے ہیں جب ہم عقل کے دائرے میں پروردگار عالم اور اس کی صفات کی معرفت کو لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ ہماری عقل کا دائرہ ذات خداوندی اور اس کی صفات سے یکسر مختلف اور اس کی وسعت اوبساط اللہ تعالیٰ کی لامحدود ذات کے سامنے انتہائی محدود اور کوتاہ، نتیجہ معلوم کہ عقل ہزار کوشش کے باوجود بھی اللہ تعالیٰ کی حقیقی معرفت سے عاجز رہتی ہے۔ بلکہ اگر غور کیا جائے تو یہی عقل کا غلط استعمال ہے، جس نے ہمیشہ توحیدِ الٰہ میں شرک کے لیے آسانیاں پیدا کی ہیں۔ کیونکہ انسان نے جب پروردگار کو عقل کے ترازو میں تولنے کی کوشش کی اور چونکہ اس عقل کا دائرہ محسوسات میں سمٹا ہوا ہے تو اس نے ہمیشہ یہ سمجھا کہ پروردگار کا بھی کوئی پیکر محسوس ہوگا یا ہونا چاہیے، جسے دیکھ سکیں ،محسوس کر سکیں ،سمجھ سکیں۔ یہیں سے شرک کی تمام آلودگیوں کے لیے راستہ کھلا۔ نتیجتاً نوع انسانی کبھی اصنام پرستی کا شکار ہوئی ،کبھی اوہام پرستی کا۔ کبھی اس نے مظاہر فطرت کی پوجا کی اور کبھی طاقت وقدرت کی۔ قرآن کریم نے ان گمراہیوں کی اصلاح فرماتے ہوئے قوموں کے سامنے یہ نکتہ فاش کیا کہ پروردگار کی معرفت تو ایک مشکل بات سہی مگر جن لوگوں کو تم علم ومعرفت کے حوالے سے ،اخلاقی بلندی کے حوالے سے ،انکشاف اور اکتشاف کے حوالے سے عظمت کا مینار سمجھتے ہو غور کرو ان کو دیکھنے کا طریقہ کیا ہے ؟ کیا کسی بڑے آدمی کو دیکھنے سے اس کی حقیقی عظمت نظر آجاتی ہے ؟ کیا کسی موجد کو دیکھنے سے اس کی قوت ایجاد دکھائی دے دیتی ہے ؟ کیا کسی معمار کو دیکھنے سے اس کا وہ جوہر جو پتھر کو آئینے کی شکل دیتا ہے نظر آجاتا ہے ؟ کیا اگر تمہارے سامنے بقراط یا سقراط یا افلاطون کو لاکر کھڑا کر دیا جائے یا ارسطو مجسم صورت میں تمہارے سامنے آجائے یا لقمان کو تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لو تو کیا وہ جواہر جن کی وجہ سے دنیا میں ان کا نام ہے تمہاری آنکھوں کے راستے سے تمہارے دل کا حصہ بن جائیں گے ؟ ظاہر ہے یہ سارے انسانوں جیسے انسان ہی تھے۔ ان کو اگر دیکھو گے تو صرف ایک انسان کے سراپا کو دیکھو گے۔ ان کی حقیقی شخصیت اور حقیقی معرفت کو کبھی نہ پاسکو گے۔ ان کو جاننے کا صحیح راستہ ان کو دیکھنا نہیں بلکہ ان کی صفات کو جاننا ہے۔ معمار اپنی تعمیر میں، شاعر اپنے شعر میں ،ناظم اپنے نظم میں ،ادیب اپنے ادب میں ،خطیب اپنے خطاب میں ،فلسفی اپنے فلسفے میں اور مفکر اپنی فکر میں نظر آتا ہے۔ یہ معرفت کا وہ صحیح طریقہ ہے جو حقیقی معرفت کا سراغ دیتا ہے۔ بالکل اسی طریقے سے تم اپنے خالق ومالک کو جان سکتے ہو ،وہ خالق ہے تو اس کو صفت خلق میں دیکھو ،وہ مالک ہے تو اس کی ملک میں اسے جانو ،وہ رازق ہے تو اس کو رزق رسانی میں تلاش کرو

'وہ رحیم ہے تو رحم و کرم کے آئینے میں اسے ڈھونڈو 'اس طرح ہوا کا ایک ایک جھونکا 'پانی کی ایک ایک بوند 'روشنی کی ایک ایک کرن 'درخت کا ایک ایک پتہ 'پھول کی ایک ایک پنکھڑی حتیٰ کہ خود انسان کی اپنی ذات اس کی خبر دیتی ہوئی معلوم ہو گی۔ وہ بے ساختہ پکار اٹھے گا کہ:

ہر کہ بینم در جہاں غیرے تو نیست

یا توئی یا خوئے تو یا بوئے تو

اس سورۃ مبارکہ میں بھی اللہ تعالیٰ نے اسی طریقے سے اپنے کمزور بندوں کے لیے اپنی معرفت کا راستہ کھولا ہے۔ پہلے اپنے اسم ذات کو ذکر فرمایا اس کے بعد اس کی معرفت کے لیے تین صفات بیان فرمائیں۔ جن میں پہلی صفت " ربوبیت " ہے۔ لیکن اسے ایک اسم کے طور پر بیان فرمایا جارہا ہے۔ اس لیے فرمایا اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔

(تفسیر روح القرآن۔)

رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

پروردگار کے اسمائے مبارکہ میں سے ایک اسم مبارک "رب " بھی ہے۔ رب الٰہ کی طرح سامی زبانوں کا ایک کثیر الاستعمال مادہ ہے۔ عبرانی 'سریانی اور عربی تینوں زبانوں میں اس کے معنی پالنے کے ہیں اور چونکہ پرورش کی ضرورت کا احساس انسانی زندگی کے بنیادی احساسات میں سے ہے اس لیے اسے بھی قدیم ترین سامی تعبیر میں سے سمجھنا چاہیے۔ پھر چونکہ معلّم 'استاد اور آقا کسی نہ کسی اعتبار سے پرورش کرنے والے ہی ہوتے ہیں اس لیے اس کا اطلاق ان معنوں میں بھی ہونے لگا۔ چنانچہ عبرانی اور آرامی کا (ربی) اور (رباہ) پرورش کنندہ معلّم اور آقا تینوں معنی رکھتا تھا اور قدیم مصری اور خالدی زبان کا ایک لفظ (رابو) بھی انھیں معنوں میں مستعمل ہوا ہے اور ان ملکوں کی قدیم ترین سامی وحدت کی خبر دیتا ہے۔

ربّ دراصل مصدر ہے جو فاعل کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ جس کی وجہ سے اس کے معنی میں انتہا درجے کا مبالغہ پیدا ہو گیا ہے۔ چنانچہ جب ہم اس کی معنوی وسعت پر غور کرتے ہیں تو عقل حیران رہ جاتی ہے۔ اس کی وسعت

کمیت کے اعتبار سے بھی ہے اور کیفیت کے اعتبار سے بھی۔ جہاں تک کمیت کا تعلق ہے تو وہ ذات جو رب ہے، وہ حقیقت میں رب العالمین ہے اور عالمین کا شمار کسی انسانی عقل کے بس میں نہیں۔ اس کی مخلوقات میں سے جو مخلوقات ہمارے سامنے ہیں اور جن میں سے ہر مخلوق کو ربوبیت کا فیضان پہنچ رہا ہے۔ ان میں سے صرف خشکی کی مخلوقات کو شمار کیا جائے تو یہ بھی ممکن نہیں۔ چہ جائیکہ سمندر کی مخلوقات 'آسمانوں کی مخلوقات 'پہاڑوں کی مخلوقات اور ان جہانوں کی مخلوقات جن کے ناموں سے تو ہم کسی حد تک واقف ہیں۔ لیکن ان کی حقیقت سے واقف نہیں۔ ان کا شمار کون کر سکتا ہے اور پھر اگر ایک ایک چیز کو غور سے دیکھا جائے مثلاً ایک درخت کے اندر جڑ 'تنا 'چھلکا 'گودا 'پھول 'پھل 'شاخ 'پتوں کے اندر رنگ وروغن پھر تاثیر اور مزا اور پھر ان کی شکل وصورت۔ ان تمام کے اندر ایک جہان معنی موجود ہے جو ربوبیت کے فیضان کا اظہار کر رہا ہے۔ مگر اس کی حقیقت تک پہنچنا آسان نہیں۔ اسی طرح خود انسان کو اپنے جسم 'جسم کے مختلف اعضاء، اعضاء کے اندر مختلف اعصاب اور پھر ہر ایک کی الگ الگ غذا۔ ان پر ہی غور کیا جائے تو حیرت واستعجاب کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ اسی طرح جہاں تک اس ربوبیت کی کیفیت کا تعلق ہے وہ صرف ایسا نہیں کہ محض پرورش کا جاری وساری عمل ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ بعض ائمہِ لغت نے اس کی تعریف میں یہ جو بات کہی ہے وہ حرف بحرف صحیح ہے کہ ربوبیت کی تعریف یہ ہے "ھو انشاء الشئ حالاً فحالاً الی حد التمام "یعنی کسی چیز کو یکے بعد دیگرے اس کی مختلف حالتوں اور ضرورتوں کے مطابق اس طرح نشوو نما دیتے رہنا کہ وہ اپنی حد کمال تک پہنچ جائے۔ اگر ایک شخص بھوکے کو کھانا کھلا دے یا کسی محتاج کو روپیہ دے دے تو یہ اس کا کرم ہے، جود ہے، احسان ہے، لیکن وہ بات نہیں جسے ربوبیت کہتے ہیں، ربوبیت کے لیے ضروری ہے کہ پرورش اور نگہداشت کا ایک جاری اور مسلسل اہتمام ہو اور ایک وجود کو اس کی تکمیل و بلوغ کے لیے وقتاً فوقتاً جیسی کچھ ضرورتیں پیش آتی رہیں، ان سب کا سروسامان ہوتا رہے۔ نیز ضروری ہے کہ یہ سب کچھ محبّت و شفقت کے ساتھ ہو۔ کیونکہ جو عمل محبت و شفقت کے جذبہ سے خالی ہو گا ربوبیت نہیں ہو سکتا۔ ربوبیت کی ایک ادنیٰ مثال ہم اس پرورش میں دیکھ سکتے ہیں جس کا جوش ماں کی فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے۔ مثلاً جب بچے کا معدہ دودھ کے سوا کسی غذا کا متحمل نہیں ہوتا تو اسے دودھ ہی پلایا جاتا ہے۔ اور جب دودھ سے زیادہ قومی غذا کی ضرورت ہوئی تو ویسی ہی غذا دی جانے لگی۔ جب اس کے پاؤں میں کھڑے ہونے کی سکت نہ تھی تو ماں اسے گود میں اٹھائے پھرتی تھی۔ جب

کھڑا ہونے کے قابل ہوا تو انگلی پکڑ لی اور ایک ایک قدم چلانے لگی۔ پس یہ بات کہ ہر حالت اور ضرورت کے مطابق ضروریات مہیّا ہوتی رہیں اور نگرانی و حفاظت کا ایک مسلسل اہتمام جاری رہے۔ یہ وہ صورت حال ہے جس سے ربوبیت کے مفہوم کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ مجازی ربوبیت کا یہ ناقص اور محدود عملی نمونہ سامنے رکھیے اور پھر ربوبیت الٰہی کی غیر محدود حقیقت کا تصور کیجیے تو اس کا رب العالمین ہونے کا معنی یہ ہوا کہ جس طرح اس کی خالقیت نے کائنات ہستی اور اس کی ہر چیز پیدا کی ہے اسی طرح اس کی ربوبیت نے ہر مخلوق کی پرورش کا سروسامان بھی کر دیا ہے اور یہ پرورش کا سامان ایک ایسے عجیب و غریب نظام کے ساتھ ہوا ہے کہ ہر وجود کو زندگی اور زندگی کی بقاء کے لیے جو کچھ مطلوب تھا وہ سب کچھ مل رہا ہے اور اس طرح مل رہا ہے کہ ہر حالت کی رعایت ہے ' ہر ضرورت کا لحاظ ہے۔ ہر تبدیلی کی نگرانی ہے اور ہر کمی بیشی ضبط میں آچکی ہے۔

پھر اسی ظاہری نظام ربوبیت پر بس نہیں بلکہ اس کی ربوبیت کا تقاضا یہ ہے کہ اس نے انسان کے لیے صرف اسباب معیشت ہی پیدا نہیں کیے بلکہ ان سے فائدہ اٹھانے اور انھیں بروئے کار لانے کے لیے جس صلاحیت کی ضرورت تھی، وہ بھی عطا کی گئی کیونکہ خارج میں زندگی اور پرورش کا کتنا ہی سروسامان کیا جاتا وہ کچھ مفید نہ ہوتا، اگر ہر وجود کے اندر اس سے کام لینے کی ٹھیک ٹھیک استعداد نہ ہوتی، اور اس کے ظاہری اور باطنی قویٰ اس کا ساتھ نہ دیتے۔ ربوبیت کے اس پہلو پر جتنا بھی غور کیا جائے نئی نئی حقیقتیں منکشف ہوتی جاتی ہیں۔ لیکن قرآن پاک کے نزول اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بعثت کے وقت جن لوگوں سے آپ کو واسطہ پڑا وہ اللہ تعالیٰ کے خالق ومالک ہونے ' رازق اور پروردگار ہونے کے منکر ہرگز نہیں تھے۔ انھیں اللہ کی صفت ربوبیت میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ وہ جانتے تھے کہ ہماری زندگی کی تمام ضروریات حتیٰ کے اس کے امکانات بھی اسی ذات کے ہاتھ میں ہیں، جسے رب العلمین کہا جاتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی دعوت سے انھیں شدید انکار تھا۔ انھوں نے آپ کا راستہ روکنے کے لیے کسی بھی ممکن تصادم سے گریز نہیں کیا۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ دعوت پیغمبری کے ساتھ ان کی مخالفت کی وجہ کچھ اور تھی۔ جب ہم قرآن حکیم میں غور کرتے ہیں تو ہمیں ان کے عقائد و اعمال میں دو بنیادی گمراہیوں کا سراغ ملتا ہے اور یہ گمراہیاں نئی نہیں بلکہ زمانہء قدیم سے تمام گمراہ قوموں میں پائی جاتی رہیں۔ ایک طرف فوق الطبیعی ربوبیت والٰہیت میں وہ اللہ کے ساتھ دوسرے الٰہوں اور ارباب کو شریک ٹھہراتے تھے اور یہ

سمجھتے تھے کہ سلسلہ اسباب پر جو حکومت کار فرما ہے، اس کے اختیارات و اقتدارات میں کسی نہ کسی طور پر ملائکہ اور بزرگ انسان اور اجرام فلکی وغیرہ بھی دخل رکھتے ہیں۔ اسی بناء پر دعا اور استعانت اور مراسم عبودیت میں وہ صرف اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع نہیں کرتے تھے، بلکہ ان بناوٹی خداؤں کی طرف بھی رجوع کیا کرتے تھے۔

دوسری طرف تمدنی و سیاسی ربوبیت کے باب میں ان کا ذہن اس تصور سے بالکل خالی تھا کہ اللہ تعالیٰ اس معنی میں بھی رب ہے۔ اس معنی میں وہ اپنے مذہبی پیشواؤں اپنے سرداروں اور اپنے خاندان کے بزرگوں کو رب بنائے ہوئے تھے اور انہی سے اپنی زندگی کے قوانین لیتے تھے۔

اسی گمراہی کو دور کرنے کے لیے ابتداء سے انبیاء آتے رہے ہیں اور اسی کے لیے آخرکار محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بعثت ہوئی۔ ان سب کی دعوت یہ تھی کہ رب کے ہر مفہوم کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کی ذات حقیقی رب ہے اور اس کی یہ ربوبیت ناقابل تقسیم ہے۔ اس کا کوئی جز کسی معنی میں بھی کسی دوسرے کو حاصل نہیں ہے۔ کائنات کا نظام ایک کامل مرکزی نظام ہے جس کو ایک ہی خدا نے پیدا کیا، جس پر ایک ہی خدا فرماں روائی کر رہا ہے۔ جس کے سارے اختیارات و اقتدارات کا مالک ایک ہی خدا ہے۔ نہ اس نظام کے پیدا کرنے میں کسی دوسرے کا کچھ دخل ہے نہ اس کی تدبیر و انتظام میں کوئی شریک ہے اور نہ اس کی فرماں روائی میں کوئی حصہ دار ہے۔ مرکزی اقتدار کا مالک ہونے کی حیثیت سے وہی اکیلا خدا تمہارا فوق الفطری رب بھی ہے اور اخلاقی و تمدنی اور سیاسی رب بھی۔ وہی تمہارا معبود ہے، وہی تمہارے سجدوں اور رکوعوں کا مرجع ہے۔ وہی تمہاری دعاؤں کا ملجا و ماویٰ، وہی تمہارے توکل و اعتماد کا سہارا، وہی تمہاری ضرورتوں کا کفیل اور اسی طرح وہی بادشاہ ہے۔ وہی مالک الملک، وہی شارع و قانون ساز اور امر و نہی کا مختار کل بھی ہے۔ ربوبیت کی یہ دونوں حیثیتیں جن کو جاہلیت کی وجہ سے تم نے ایک دوسرے سے الگ ٹھیرا لیا ہے حقیقت میں خدائی کا لازمہ اور خدا کے خدا ہونے کا خاصہ ہیں۔ انھیں نہ ایک دوسرے سے منفک کیا جا سکتا ہے اور نہ ان میں سے کسی حیثیت میں بھی مخلوقات کو خدا کا شریک ٹھیرانا درست ہے۔

اس دعوت کو قرآن جس طریقہ سے پیش کرتا ہے وہ خود اسی کی زبان سے سُنئے۔

قرآن میں رب کا تصور

اِنَّ رَبَّکُمُ اللّٰہُ الَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ فِیۡ سِتَّۃِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسۡتَوٰی عَلَی الۡعَرۡشِ قف یُغۡشِی الَّیۡلَ النَّہَارَ یَطۡلُبُہٗ حَثِیۡثًا لا وَّالشَّمۡسَ وَالۡقَمَرَ وَالنُّجُوۡمَ مُسَخَّرٰتٍ م بِاَمۡرِہٖ ط اَلَا لَہُ الۡخَلۡقُ وَالۡاَمۡرُ ط تَبٰرَکَ اللّٰہُ رَبُّ الۡعٰلَمِیۡنَ۔

(الاعراف:۷۔۵۴)

(حقیقت میں تمہارا رب اللہ ہے جس نے آسمان وزمین کو چھ دن میں پیدا کیا اور پھر اپنے تخت سلطنت پر جلوہ افروز ہو گیا جو دن کو رات کا لباس اڑھاتا ہے اور پھر رات کے تعاقب میں دن تیزی کے ساتھ دوڑ آتا ہے' سورج اور چاند اور تارے سب کے سب جس کے تابع فرمان ہیں سنو! خلق اسی کی ہے اور فرماں روائی بھی اسی کی۔ بڑا بابرکت ہے وہ کائنات کا رب)۔

قُلۡ مَنۡ یَّرۡزُقُکُمۡ مِّنَ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ اَمَّنۡ یَّمۡلِکُ السَّمۡعَ وَالۡاَبۡصَارَ وَمَنۡ یُّخۡرِجُ الۡحَیَّ مِنَ الۡمَیِّتِ وَیُخۡرِجُ الۡمَیِّتَ مِنَ الۡحَیِّ وَمَنۡ یُّدَبِّرُ الۡاَمۡرَ ط فَسَیَقُوۡلُوۡنَ اللّٰہُ ج فَقُلۡ اَفَلَا تَتَّقُوۡنَ۔ فَذٰلِکُمُ اللّٰہُ رَبُّکُمُ الۡحَقُّ ج فَمَاذَا بَعۡدَ الۡحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ ج فَاَنّٰی تُصۡرَفُوۡنَ۔ (یونس:۳۲۔۳۱)

(ان سے پوچھو! کون تم کو آسمان وزمین سے رزق دیتا ہے؟ کانوں کی شنوائی اور آنکھوں کی بینائی کس کے قبضہ واختیار میں ہے؟ کون ہے جو بے جان کو جاندار میں سے اور جاندار کو بے جان میں سے نکالتا ہے؟ اور کون اس کارگاہ عالم کا انتظام چلا رہا ہے؟ وہ ضرور کہیں گے اللہ۔ کہو! پھر تم ڈرتے نہیں ہو؟ جب یہ سارے کام اسی کے ہیں تو تمہارا حقیقی رب اللہ ہی ہے۔ حقیقت کے بعد گمراہی کے سوا اور کیا رہ جاتا ہے؟ آخر کہاں سے تمہیں یہ ٹھوکر لگتی ہے کہ حقیقت سے پھرے جاتے ہو؟)

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ بِالۡحَقِّ ج یُکَوِّرُ الَّیۡلَ عَلَی النَّہَارِ وَیُکَوِّرُ النَّہَارَ عَلَی الَّیۡلِ وَسَخَّرَ الشَّمۡسَ وَالۡقَمَرَ ط کُلٌّ یَّجۡرِیۡ لِاَجَلٍ مُّسَمًّی ۔۔ ذٰلِکُمُ اللّٰہُ رَبُّکُمۡ لَہُ الۡمُلۡکُ ط لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ج فَاَنّٰی تُصۡرَفُوۡنَ

(الزمر:۵۔۶)

(اس نے زمین و آسمانوں کو برحق پیدا کیا ہے۔ رات کو دن پر اور دن کو رات پر وہی لپیٹتا ہے۔ چاند اور سورج کو اسی نے ایسے ضابطے کا پابند بنایا ہے کہ ہر ایک اپنے مقررہ وقت تک چلے جا رہا ہے۔۔ یہی اللہ تمہارا رب ہے بادشاہی اسی کی ہے اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔ آخر یہ تم کہاں سے ٹھوکر کھا کر پھرے جاتے ہو؟)

اَللّٰهُ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ط ۔۔ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ م لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ز ج فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ۔۔ اَللّٰهُ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ط ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ج فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۔ هُوَ الْحَيُّ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ (المومن: ۶۱۔۶۵)

(اللہ وہ ہے جس نے تمہارے لیے رات بنائی کہ اس میں تم سکون حاصل کرو۔ اور دن کو روشن کیا۔۔ وہی تمہارا اللہ، تمہارا رب ہے، ہر چیز کا خالق کوئی اور معبود اس کے سوا نہیں، پھر یہ کہاں سے دھوکا کھا کر تم بھٹک جاتے ہو؟۔۔ اللہ جس نے تمہارے لیے زمین کو جائے قرار بنایا، آسمان کی چھت تم پر چھائی، تمہاری صورتیں بنائیں اور خوب ہی صورتیں بنائیں اور تمہاری غذا کے لیے پاکیزہ چیزیں مہیا کیں، وہی اللہ تمہارا رب ہے۔ بڑا بابرکت ہے وہ کائنات کا رب۔ وہی زندہ ہے کوئی اور معبود اس کے سوا نہیں اسی کو تم پکارو اپنے دین کو اس کے لیے خالص کر کے)۔

یہود و نصاریٰ کا تصور رب

ان تمام آیات پر غور کیجئے صاف معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کا سارا زور اس بات پر ہے کہ تم نے پروردگار کو صرف اپنا پالنے والا اور ضروریات مہیا کرنے والا سمجھ رکھا ہے۔ لیکن اس کے اختیارات اور اس کی صفات میں تم اسے یکتا ماننے کے لیے تیار نہیں ہو اور مزید تم یہ سمجھتے ہو کہ اللہ کو کسی بھی حیثیت سے زبان سے یاد کر لینا یا اس سے دعائیں مانگ لینا یا اس سے مناجاتیں کر لینا اور کبھی کبھی اس کے سامنے سرِ نیاز جھکا دینا، اس کے ماننے کے لیے کافی ہے اور رہی یہ بات کہ رب کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ وہی امر و نہی کا مختار اقتدارِ اعلیٰ کا مالک ہدایت و رہنمائی کا منبع قانون کا ماخذ اور مملکت کا رئیس ہوتا ہے۔ یہ بات تمہیں قبول نہیں اور یہی تمہاری گمراہیوں کی بنیاد ہے۔ چونکہ یہود و نصاریٰ باوجود اس کے کہ اپنے آپ کو اہل کتاب کہتے تھے اسی گمراہی کا شکار تھے۔ انھوں نے اپنے اہل علم اور دینی رہنماؤں کو

زندگی کی مکمل راہنمائی کا حق دیدیا تھا اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ انھیں حلت و حرمت کا اختیار حاصل ہے۔ قرآن کریم نے ان پر تنقید فرماتے ہوئے فرمایا کہ تم نے اپنے دینی راہنماؤں کو یہ اختیار دے کر انھیں اپنا رب تسلیم کر لیا ہے۔ کیونکہ یہ اختیارات رب کو ہی زیب دیتے ہیں اور جس کو بھی یہ اختیارات تفویض کر دیئے جائیں وہ ربوبیت کے منصب پر فائز ہو جاتا ہے۔ اس لیے تم اگر اللہ کو رب مانتے ہو تو اس کی ربوبیت کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ جس کی تربیت کے فیض سے تم زندگی کا سر و سامان پا رہے ہو اسی کو اپنا حاکم و مالک اور الٰہ سمجھو۔ اور زندگی میں رہنمائی کے اختیار کا مالک اور حسن و قبح کا معیار اسی کو جانو۔ اسی کے دیئے ہوئے قانون (شریعت) کو حرف آخر سمجھو، اسی کو حاکم حقیقی سمجھ کر اپنی حکومت اور حکمرانی کو اس کی اطاعت میں دے دو۔ اپنی ہر پالیسی اسی کی روشنی میں طے کرو۔ اسی کے رسول کو شخصیت سازی کے لیے آئیڈیل بناؤ 'اسی کی زندگی کے اطوار اور اسی کے ذوق و مزاج سے تہذیب و ثقافت اخذ کرو۔ یہ بھی ذہن نشین کر لو کہ وہ صرف رب نہیں بلکہ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ہے۔ اسی کی ربوبیت کا فیض سب کو برابر پہنچ رہا ہے۔ اسی کا سورج سب کو روشنی دے رہا ہے، اسی کا چاند سب کے لیے حلاوٹ بانٹ رہا ہے۔ اسی کی زمین سب کے لیے بچھونا بنائی گئی ہے، اسی کی روئیدگی کے خزانے سب کے لیے وقف ہیں۔ اس کی ہوا اور پانی صرف امیروں کے لیے نہیں، غریبوں کے لیے بھی ہیں۔ اسی کے مون سون کا فیض جس طرح جاگیرداروں کو پہنچتا ہے، اسی طرح غریب کسان اور ایک شودر کے آنگن اور کھیت کو بھی فیضیاب کر رہا ہے۔ تم نے جو انسانوں میں طبقات پیدا کر دیئے ہیں اور انسانوں کو مختلف درجات میں تقسیم کر دیا ہے۔ یہ اللہ کی صفت ربوبیت کے یکسر خلاف ہے۔ اگر تم واقعی اپنے پروردگار کو رب العالمین سمجھتے ہو تو اپنی اصلاح کرو اور ایک رب سے وہ تعلق پیدا کرو، جو بندہ اور آقا کے درمیان ہوتا ہے۔

ہر غور و فکر کرنے والے کی نظر جب تمام مخلوقات پر عموماً اور نوع انسانی پر خصوصاً پروردگار عالم کے فیضان ربوبیت کے حوالے سے پڑتی ہے تو وہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ تربیت کا یہ ہمہ گیر اور ہمہ جہت فیضان جس کی وسعت اور گہرائی کا اندازہ کرنا بھی کسی کے لیے ممکن نہیں کا آخر سبب کیا ہے؟ ہمارے جسموں کو پروان چڑھایا جا رہا ہے، ہمارے دل و دماغ کی صلاحیتوں کو جلا بخشی جا رہی ہے، ہمارے احساسات میں گہرائی اور ہمارے انفعالات میں شائستگی اور پاکیزگی ودیعت کی جا رہی ہے، ہمارے ماحول کو ہمارے لیے ساز گار اور ضرورتوں اور نعمتوں سے گراں بار کیا جا رہا

ہے۔ کیا پروردگار کی اپنے بندوں سے کوئی ضرورت متعلق ہے، جس کے لیے انھیں پروان چڑھایا جارہا ہے، جس طرح ریوڑ کا مالک اپنی بھیڑوں ' بکریوں کی حفاظت کرتا ہے اور انھیں غذا فراہم کرتا ہے تاکہ ان کے دودھ اور گوشت پوست سے فائدہ اٹھائے۔ باربرداری کے جانور اس لیے پالے جاتے ہیں تاکہ ان کا مالک ان سے باربرداری کا کام لے سکے۔ گھوڑوں کی پرورش میں جان کھپائی جاتی ہے تاکہ وہ سواری اور جنگی ضرورتوں میں کام آئیں۔ کسان اپنی کھیتی کی دیکھ بھال میں شب وروز محنت کرتا ہے تاکہ غذائی ضرورتوں کو پورا کرسکے۔ کیا ہمارے پروردگار کی بھی ہم سے کوئی ایسی ضرورت وابستہ ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا خیال، تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ جس ذات کے اشارے سے ہر چیز کو وجود ملتا اور ہر وجود کی ضرورتیں مہیا ہو رہی ہیں اسے ہم جیسے ناچیز ذروں سے کیا حاجت ہوسکتی ہے۔
یا پھر دوسری صورت یہ ہے کہ ہمارا کوئی حق اللہ کے ذمہ ہو جس کی ادائیگی کے لیے کائنات کا ایک ایک ذرہ شب وروز مصروف عمل ہے۔ ظاہر ہے ایسی کوئی بات بھی ممکن نہیں۔ کیونکہ ہمارا تو وجود ہی پروردگار کا مرہون منت ہے کسی طرح کا کوئی حق کس طرح اس کے ذمے ہوسکتا ہے۔ جب تک ہم پر عدم طاری تھا تو کسی استحقاق کا سوال خلاف عقل اور خلاف فطرت تھا اور جب عدم سے نکل کر وجود میں آئے تو وجود دینے والے کے حقوق ہمارے ذمے عائد ہوگئے کیونکہ وہ خالق ٹھہرا۔ اس کے بعد فیضان ربوبیت کی بارش شروع ہوئی تو ہم اس کے حقوق سے گراں بار ہوتے گئے۔ مختصر یہ کہ ان دونوں باتوں میں سے کوئی بات بھی نہیں ہے تو پھر سوال یہ ہے کہ اس بے پناہ پروردگاری کی وجہ آخر کیا ہے قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے کہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ رحمان اور رحیم ہے اس کی رحمانیت کا جوش ہے کہ اس نے ہمیں وجود بخشا اور یہ اس کی رحیمیت کا فیض ہے کہ وہ برابر ہماری دیکھ بھال کر رہا ہے۔ اس لیے یہاں ربوبیت کے بعد صفت رحمت کا ذکر فرمایا جارہا ہے۔ (تفسیر روح القرآن)

رب اور عالمین کا معنی

رب العالمین: الرب، مالک حضرت ابوسفیان کو صفوان نے جو بات کہی: لان یربنی رجل من قریش احب الی من ان یربنی رجل من ھوازن، اگر میرا مالک قریش کا کوئی آدمی ہو وہ بہتر ہے اس بات سے کہ ہوازن کا کوئی آدمی میرا مالک ہو۔ اس طرح بولتے ہیں رب یرب یربہ فھو رب۔ یہ اسم فاعل کے معنی میں ہے۔

دوسرا قول: یہ بھی درست ہے کہ یہ مصدر ہو جو مبالغہ کے لیے لایا گیا ہو، جیسا کہ کسی عادل کو عدل کہتے ہیں۔

طریق استعمال:

مطلقالفظ رب اللہ وحدہ کے لیے بولا جاتا ہے۔ اور بندوں کے لیے اس کا استعمال قید و سنبت کے ساتھ ہوتا ہے جیسا ان آیات میں (انہ ربی احسن مثوای) یوسف:23۔ (ارجع الی ربك) یوسف:50۔

واسطی نے کہا وہ ابتدا کرنے والا ہونے کے لحاظ سے خالق ہے اور غذا دینے کے لحاظ سے مربی اور انتہا کے لحاظ سے غافر ہے۔ یہ اللہ کا اسم اعظم ہے۔

العالم 1: جس چیز سے خالق کا علم ہو خواہ جواہر کی قسم سے ہو یا اعراض یا اجسام میں سے ہو۔ 2 ہر موجود ماسوی اللہ کو کہتے ہیں، اس کا یہ نام اس لیے رکھا گیا کیونکہ یہ اس کے وجود کی علامت ہے۔

سوال: اس کی جمع واؤنون کے ساتھ لائی گئی ہے، حالانکہ واؤنون والی جمع تو عقلاء کے ساتھ خاص ہے یا ان اعلام میں آتی ہے جو جمع عاقل کے حکم میں ہیں۔

جواب: اس میں وصفیت کے معنی ہیں جو کہ علم کے معنی کے لیے دلالت ہے۔ (پس جمع لانا درست ثابت ہو گیا) (مدارک)

رب کا معنی سردار بھی ہوتا ہے۔ اسی مفہوم میں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں استعمال ہوا ہے: اذ کرنی عند ربك (یوسف:42) (یعنی اپنے مالک کے پاس میں ذکر کرنا) اور حدیث میں ہے ان تلد الامۃ رب تھا۔ (3)۔ یعنی لونڈی اپنے سردار کو جنم دے گی۔ اور ہم نے اپنی کتاب "التذکرہ" میں اس کا ذکر کیا ہے۔ اور الرب سے مراد مصلح، مدبر، جابر اور قائم (نگران) بھی ہوتا ہے۔ الہروی وغیرہ نے کہا: جو شخص کسی شے کی اصلاح کرتا ہے اور اسے مکمل کرتا ہے

اس کے لیے بولا جاتا ہے: ربہ یربہ فھو رب لہ وراب۔ اسی وجہ سے علماء کو ربانیون کہا جاتا ہے جو کتب کے مطالعہ میں رہتے ہیں۔ اور حدیث میں ہے ھل لک من نعمۃ تربھا علیہ (1)۔ یعنی کیا تیرے پاس کوئی نعمت ہے جس کی تو دیکھ بھال کرتا ہے اور اس کی اصلاح کرتا ہے اور الرب بمعنی معبود بھی استعمال ہوتا ہے۔ شاعر کا قول ہے:

ارب يبول الثعلبان براسه لقد ذل من بالت عليه الثعالب(2)

اور یہ لفظ زیادتی اور کثرت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ رباہ وربیہ وربتہ (یعنی اس سے اسے زیادہ کر دیا) یہ معنی نحاس نے بیان کیا ہے۔ "الصحاح" میں ہے: رب فلان ولدہ یربہ ربا، وربیہ وتربیہ کا معنی ہے رباہ اور المویوب کا مطلب ہے الیربی۔ جس میں کثرت کی گئی ہو۔

مسئلہ نمبر 9: بعض علماء نے فرمایا: یہ اسم (رب) اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم ہے کیونکہ اسے پکارنے والے کثرت سے پکارتے ہیں اور قرآن حکیم میں غور کرنے سے بھی یہی پتہ چلتا ہے جیسا کہ سورۃ آل عمران، سورۃ ابراہیم وغیرہ میں ہے۔ یہ وصف رب اور مربوب کے درمیان تعلق کا شعور دیتا ہے ساتھ ساتھ اپنے ضمن میں ہر حال میں مہربانی، رحمت اور مخلوق کے اس کی طرف محتاج ہونے کا بھی رکھتا ہے۔

اس کے اشتقاق کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض نے کہا: یہ التربیۃ سے مشتق ہے۔ اللہ تعالیٰ مخلوق کا مدبر اور مربی ہے۔ اسی مفہوم میں ہے: ربائبکم التی فی حجورکم (النساء:23) (تمہاری بیویوں کی بیٹیاں جو تمہاری گودوں میں (پرورش پا رہی) ہیں) بیوی کی بیٹی کو ربیبۃ کہا جاتا ہے کیونکہ اس کا خاوند اس کی تربیت کرتا ہے۔ پس اس بنا پر کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کا مدبر اور مربی ہے تو یہ فعل کی صفت ہوگی اور اس بنا پر کہ الرب بمعنی مالک اور سردار ہے تو یہ ذات کی صفت ہوگی۔

مسئلہ نمبر 10: جب رب پر الف لام داخل ہو تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ یہ خاص ہوتا ہے کیونکہ الف لام عہد کے لیے ہوگا۔ اور اگر ہم الف لام حذف کر دیں تو اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان مشترک ہوگا۔ کہا جاتا ہے: اللہ رب العباد، (اللہ بندوں کا رب ہے) زید رب الدار (زید گھر کا مالک ہے) اللہ تعالیٰ رب الارباب ہے، وہ مالک و مملوک کا مالک ہے وہ ہر ایک کا خالق ورازق ہے۔ اس کے علاوہ ہر رب، غیر خالق اور غیر رازق ہے ہر مملوک، مالک بنایا گیا ہے اس کے بعد کہ وہ مالک نہ تھا اور اس سے ملکیت چھینی بھی جائے گی، مخلوق میں سے مالک کسی چیز کا مالک ہوتا ہے اور کسی

چیز کا مالک نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ کی صفت ان معانی کے مخالف ہے اور خالق و مخلوق کی صفت کے درمیان یہی فرق ہے۔

مسئلہ نمبر 11: العلمین، اہل تاویل کا العلمین کے بارے میں بہت اختلاف ہے۔ قتادہ نے کہا: العالمون، جمع ہے عالم کی اور عالم سے مراد اللہ کے سوا ہر موجود ہے اور لفظاً اس کا واحد نہیں ہے جیسے رھط اور قوم کا لفظاً واحد نہیں ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: ہر زمانہ کے لوگ عالم ہیں۔ یہ حسین بن فضل کا قول ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اتاتون الذکران من العلمین (الشعراء) اس آیت میں العلمین سے مراد لوگ ہیں۔ حجاج نے کہا:

فخندف ھامۃ ھذا العالم

جریر بن خطفی نے کہا:

تنصفه البرية وهو سام ويضحى العالمون له عيالا

اس شعر میں العالمون لوگوں کے لیے استعمال ہوا ہے۔

حضرت ابن عباس نے فرمایا: عالمون سے مراد جن وانس ہیں اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: لیکون للعلمین نذیرا (الفرقان) (اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جن وانس کو ڈرانے والے تھے نہ کہ چوپاؤں کو)۔

فراء اور ابو عبیدہ نے کہا: العالم سے مراد ہر ذی عقل ہے اور یہ چار امم ہیں: انسان، جن، ملائکہ اور شیاطین۔ بہائم، چوپاؤں کو عالم میں نہیں کہا جاتا کیونکہ یہ جمع ذی عقل کی جمع ہوتی ہے۔

اعشی نے کہا:

ما ان سمعت بمثلھم فی العالمینا میں نے ذی عقل لوگوں میں ان کی مثل نہیں سنا۔

زید بن اسلم نے کہا: اس سے مراد وہ ہیں جن کو رزق دیا جاتا ہے۔ اسی قسم کا قول ابو عمرو بن علاء کا ہے کہ وہ روحانیون ہیں۔ حضرت ابن عباس کے قول کا معنی بھی یہی ہے، ہر ذی روح جو زمین کی سطح پر چلا۔ وہب بن منبہ نے کہا: اللہ تعالیٰ کے اٹھارہ ہزار عالم ہیں دنیا ان عالموں میں سے ایک عالم ہے۔ حضرت ابو سعید خدری نے کہا: اللہ تعالیٰ کے چالیس ہزار عالم ہیں۔ دنیا، مشرق سے مغرب تک ایک عالم ہے۔ مقاتل نے کہا: عالمون، اسی ہزار عالم ہے، چالیس ہزار عالم خشکی میں ہیں اور چالیس ہزار عالم سمندر میں ہیں۔ ربیع بن انس نے ابو العالیہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: جن ایک عالم

ہے، انسان ایک عالم ہے، اس کے علاوہ زمین کے چار کونے ہیں، ہر کونے میں پندرہ ہزار عالم ہیں اللہ تعالیٰ نے سب کو اپنی عبادت کے لیے تخلیق فرمایا ہے۔ میں کہتا ہوں: ان اقوال میں سے صحیح ترین قول یہ ہے کہ عالم ہر مخلوق و موجود کو شامل ہے اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: **قال فرعون وما رب العلمين قال رب السموت والارض وما بينهما** (الشعراء)

اور یہ علم اور علامۃ سے ماخوذ ہے کیونکہ یہ اپنے موجد پر دلالت کرتا ہے اسی طرح زجاج نے کہا: عالم سے مراد ہر وہ چیز ہے جسے اللہ تعالیٰ نے دنیا و آخرت میں پیدا فرمایا۔ خلیل نے کہا: العلم، العلامۃ اور المعلم ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو کسی چیز پر دلالت کرے۔ عالم چونکہ دال ہے اپنے خالق و مدبر پر اور یہ واضح ہے۔

ذکر کیا جاتا ہے کہ ایک شخص نے حضرت جنید کے سامنے کہا: الحمد للہ تو حضرت جنید نے اسے کہا: اسے مکمل کرو جس طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ تم کہو: رب العلمین اس شخص نے پوچھا: العالمین کون ہیں حتیٰ کہ تم اللہ کے ساتھ اس کا ذکر کرتے ہو؟ حضرت جنید نے فرمایا: اے بھائی! تم کہو کیونکہ حادث کا جب قدیم کے ساتھ ملا کر ذکر کیا جاتا ہے تو حادث کا کوئی اثر باقی نہیں رہتا

مسئلہ نمبر 12: رب میں رفع اور نصب جائز ہے۔ نصب، مدح کی بنا پر اور رفع قطع (1) کی بنا پر۔ یعنی عبارت یوں ہوگی: **ھو رب العالمين**۔ (قرطبی)

رب کے معنیٰ مالک کے ہیں

رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (جو صاحب سارے جہان کا ہے) رب کے معنیٰ مالک کے ہیں۔ جیسا کہ رب الدار (گھر کا مالک) اور لفظ رب تربیت (مصدر) کے معنی میں بھی ہو سکتا ہے۔ آہستہ آہستہ درجہ کمال تک پہنچا دینے کو تربیت کہتے ہیں اس وقت مصدر کا اطلاق بطور مبالغہ ہو گا جیسا کہ خالدٌ صَوْمٌ اور زَيْدٌ عَدْلٌ میں رب کا اطلاق بلا قید اضافت وغیرہ غیر اللہ پر نہیں ہو سکتا۔ اس آیت میں اشارہ ہے کہ عالم (ا) [یعنی قرآن اور حدیث میں لفظ عالم بصیغہ مفرد استعمال نہیں کیا گیا] ابتداء کی طرح بقا میں بھی رب کا محتاج ہے اور عالَمِیْنَ عالَم کی جمع ہے اور استعمال میں اس کے لفظ سے اس کا

واحد نہیں پایا جاتا۔ عالم اس چیز کو کہتے ہیں جس سے صانع معلوم ہو جیسا کہ خاتم (وہ چیز ہے جس سے مہر کی جائے) اور عالم تمام ممکنات ہیں کیونکہ تمام ممکنات پر عالم صادق آتا ہے۔ فرعون نے جب کہا **وما رب العالمین** (رب العالمین کیا چیز ہے) حضرت موسیٰ نے جواب دیا: **رب السمٰوت والارض وما بینھما** (یعنی رب العالمین وہ ہے جو آسمان و زمین اور ان کے مابین کا مالک ہے) چونکہ عالم کے تحت میں اجناس مختلف موجود ہیں اس لیے عالمین بصیغہ جمع لایا گیا ہے اور جمع ذوی العقول باعتبار تغلیب ہے۔ وہب کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اٹھارہ ہزار عالم پیدا کئے ہیں ان میں سے ساری دنیا ایک عالم ہے تمام مکانات اور جنگلوں کو ایسا سمجھنا چاہیے گویا کسی صحرا میں ایک طشت رکھا ہوا ہے کعب احبار کہتے ہیں عالموں کی تعداد اور خدا کے لشکروں کی گنتی اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔ بعض کا قول ہے کہ اہل علم یعنی فرشتوں اور انسان اور جنات کا نام عالم ہے۔ دیگر اشیاء تبعًا ان کے ماتحت ہیں۔ (تفسیر مظہری)

رب کا ایک معنی مربی ہے یعنی کسی چیز کو اس کی ازلی استعداد اور فطری صلاحیت کے مطابق آہستہ آہستہ مرتبہ کمال تک پہنچانے والا۔ (تفسیر روح المعانی) اس سے معلوم ہوا کہ جو انسان اپنے مرتبہ کمال کو حاصل کرنا چاہتا ہے اسے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا چاہیے کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی اس کا حقیقی رب ہے۔

عالمین، عالم کی جمع ہے جس کا معنی جہان ہے۔ اس میں ایک لطیف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی خاص قوم، نسل یا علاقے کا رب نہیں بلکہ ساری کائنات کا رب ہے اور جو ساری کائنات کا رب ہو وہی ساری تعریفوں کا حقیقی مستحق ہے۔ (امداد الکرم)

رب۔ پرورش کرنے والا

رب العالمین جو رب ہے تمام جہانوں کا۔ رب کے معنی ہوتے ہیں پرورش کرنے والا پالنے والا۔ نشوونما دینے والا sustainer-cherisher- nourishes پرورش کرنے والا۔ پالنے والا۔ نشوونما دینے والا۔ درجہ بہ درجہ آگے بڑھاتے ہوئے حد کمال کو لے جانے والا۔ عروج پر لے جانے والا کسی چیز کو۔ ایک چھوٹے سے بیج کا تصور لے آیئے۔ اتنا چھوٹا سا بیج کیسے اتنا بڑا سا درخت بن جاتا ہے۔ وہ کسی نے کہا ہے نہ کہ پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون۔ کون پالتا ہے اس کو اندھیروں کے اندر۔۔۔ رب پالتا ہے اپنے آپ کو ہم دیکھیں۔ ہم بھی اسی طرح ایک seed تھے۔ ایک

چھوٹا سا بیج ہی تو تھے۔ جو ماں کے رحم میں جا کر implant ہو گیا۔ رب نے ہم کو پالا ماں کے پیٹ میں۔ ابھی ہم ماں کے پیٹ ہی میں تھے کہ ساری ضروریات ہماری دنیا میں فراہم کر دی گئیں۔ بن مانگے اللہ تعالیٰ نے ہم کو زندگی کا سامان دیا۔ ہم نے تو آکسیجن نہیں مانگی تھی۔ ڈیمانڈ کی تھی کسی نے ہم میں سے ماں کے پیٹ سے کہ آکسیجن ہونی چاہیے پانی ہونا چاہیے۔ دودھ ہونا چاہیے، ہم نے نہیں مانگا۔ بن مانگے اللہ نے سب انتظام کر دیا پہلے ہی۔ اللہ تعالیٰ سوال پوچھتا ہے ہم سے سورۃ انبیاء میں۔ الم نجعل الارض مھدا۔ کیا ہم نے تمہارے لیے زمین کو نہیں بچھایا۔ کیا ہم نے cradle نہیں بنایا اس کو تمہارے لئے۔ جیسے ماں بچے کے پیدا ہونے سے پہلے اس کے لیے تیاری کر کے رکھتی ہے۔ اسی طرح اللہ نے ساری تیاریاں کر کے رکھیں پھر اس نے ہم کو بھیجا۔ ضرورت کی حد تک نہیں خواہشات بھی پوری کرتا ہے۔ جیسے پھولوں کا لہلانا آپ دیکھیں۔ تتلیوں کا اڑنا دیکھیں۔ کوئی ضرورت تو پوری نہیں ہو رہی ہماری۔ کوئی بھوک یا پیاس تو نہیں مٹ رہی تتلیوں کو دیکھ کر یا پھولوں کو دیکھ کر۔ لیکن ایک تسکین ضرور ملتی ہے انسان کو۔ ٹھنڈک ملتی ہے آنکھوں کو۔ اس لیے کہ اللہ نے ہمارے اندر ایک جمالیاتی ذوق بھی رکھا ہے۔ ان چیزوں کو جب ہم دیکھتے ہیں اور ٹھنڈی ہوا کو جب ہم feel کرتے ہیں اپنے اوپر۔ ہم کو ایک bliss کا احساس ہوتا ہے۔ تاروں کو دیکھ کر ایک خوشی کا احساس ہوتا ہے۔ تو وہ رب ہے۔ تمام ضروریات کا خواہشات کا پورا کرنے والا۔

عالمین۔ عالم کی جمع ہے۔ ع ل م۔ جھنڈے کو کہتے ہیں۔ تو جھنڈا تو بے جان ہوتا ہے۔ علم کا مطلب ہوتا ہے کسی چیز پر نشان لگا دینا۔ recognition کا ذریعہ پہچان کا ذریعہ۔ اس سے لفظ عالم بنا ہے۔ تو عالم کیا ہے اپنے رب کی پہچان کا ذریعہ ہے۔ عالم کو دیکھو۔ رب کو دیکھو۔ عالمین کا رب ہے۔ ایک عالم نہیں۔ اس نے تو نہ جانے کتنے عالم بنائے ہیں۔ ایک عالم دنیا ہے ایک عالم آخرت۔ ایک عالم برزخ۔ ایک پرندوں کا عالم ہے ایک کیڑوں کا عالم ہے۔ ایک ستاروں کا عالم ہے الگ الگ worlds ہیں۔ تو اللہ صرف انسانوں کا رب نہیں ہے۔ رب العالمین ہے۔ نہ صرف انسانوں کا رب ہے بلکہ تمام مخلوقات کا پالنے والا ہے۔ گھاس کے تنکے سے لے کر بڑی بڑی گیلیکسیز کو پالنے والا provide کرنے والا nourish کرنے والا، پیدا کرنے والا۔ ہر چیز کی دیکھ بھال کر رہا ہے۔ پتے کو اور چیونٹی کو بھی پالتا ہے۔ اور ہاتھی کو بھی پالتا ہے اور رب کے معنی مالک کے بھی ہوتے ہیں۔ سب انسانوں کو پیدا کر کے اس نے کسی اور کے حوالے نہیں کر دیا۔ بلکہ وہ ان کا مالک بھی ہے اور owner بھی ہے۔

new: الحمد للہ رب العالمین۔ کل شکر کل تعریف اللہ رب العالمین ہی کے لیے ہے۔ جو تمام کائنات کا رب ہے۔
الرحمن الرحیم۔ رحمان اور رحیم ہے۔ رحمان۔ رحیم ان دونوں الفاظ کا روٹ ورڈ ایک ہی ہے۔ رح م۔ رحم womb کا کہا جاتا ہے ماں کے وجود کا وہ حصہ جس میں بچہ پرورش پائے۔ اگر ہم ماں اور بچے کے تعلق سے اس لفظ کو سمجھنے کی کوشش کریں تو ذرا بتائیں کہ ماں کا تعلق اپنے بچے سے کیسا ہوتا ہے۔ اور بچے سے مراد new born baby ہے۔
بعض دفعہ بچے جب بڑے ہو جاتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ان میں بغاوت آجائے۔ ہو سکتا ہے کہ ان کی فطرت میں کوئی ٹیڑھ و خرابی پیدا ہو جائے۔ اور ماں اور بچے کا تعلق بگڑ جائے۔ new born بچے کے ساتھ تعلق کیسا ہوتا ہے؟ بہت closeness کا احساس ہوتا ہے۔ بچہ مانگنے کے قابل نہیں ہوتا اور ماں اس کی ضرورت پوری کرتی ہے۔ بہت قربت کا تعلق ہوتا ہے ماں کا بچے سے۔ اس لفظ میں اسی تعلق کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ محبت کا تعلق ہوتا ہے۔ پھر توجہ کا۔ ماں اپنی توجہ ہٹائے بچے پر سے۔ تو بچہ کی ہو سکتا ہے کہ زندگی خطرے میں پڑ جائے۔ پرورش۔ پالنا کتنی بڑی ذمہ داری ہے ماں کی ماں پرورش کرتی ہے۔ ماں پالتی ہے بچے کو brought up کرتی ہے اس کی حفاظت کرتی ہے۔ protect کرتی ہے۔ اپنے بچے کی پھر تربیت بھی کرتی ہے۔ trained کرتی ہے۔
الحمد للہ رب العالمین کل شکر کل تعریف اللہ کی ہے جو رب العالمین ہے کیا ہے ہمارا رب۔ الرحمن۔ بے انتہا مہربان، الرحیم بے انتہا رحم فرمانے والا۔ بار بار رحم فرمانے والا مالک یوم الدین، جزا اور سزا کے دن کا مالک، قیامت آئے گی حساب کتاب ہوگا۔ جوں ہی یہ خیال آیا انسان نے فوراً یہ دعا کی، ایاک نعبد اللہ ہم صرف تیری اور صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں، وایاک نستعین۔ اور اللہ تیری عبادت آسان نہیں۔ ہم صرف اور صرف تیری مدد چاہتے ہیں اللہ ہمیں اپنا بندہ بنا۔ دنیا میں کوئی انسان آزاد ہے نہیں۔ سب کسی نہ کسی کے غلام ہیں کوئی انسانوں کا غلام ہے کوئی اپنی خواہش کا غلام ہے۔ اور آپ دیکھیں کہ خواہش سے زیادہ demanding مالک اسی سے زیادہ demanding آقا اور ہے نہیں۔ خواہش نے کہا اڑو۔ خواہش نے کہا پانی کے اندر تیرو اور اپنی خواہش کو راضی کرنے کے لیے انسان نے یہ کام کر لیے۔ نہ ممکن کو ممکن کر دکھایا، اللہ تعالیٰ ہم سے اتنے بڑے بڑے تقاضے نہیں کرتا، نہ ہم سے پرندوں کی طرح اڑنے کا تقاضہ کرتا ہے نہ مچھلیوں کی طرح تیرنے کا تقاضہ کرتا ہے۔ شریعت اللہ تعالیٰ نے بہت ہلکی پھلکی بنائی ہے۔ لیکن ہم جب اپنے آپ کو دوسروں کی غلامی میں دے دیتے ہیں تو پھر ہم اللہ کے بندے نہیں رہتے۔ اور

اللہ کی غلامی بہت بھاری لگنے لگتی ہے تو غلام تو سب ہی ہیں عبد سب ہیں، لیکن عبد دیگر عبدہ دیگر۔ اللہ کے بندے تو اور ہی ہوتے ہیں تو اللہ کا بندہ بننے کی درخواست ہے کہ اللہ تو ہمیں اپنی غلامی میں قبول فرمالے۔ اللہ تو اپنی نوکری میں ہمیں لے لے

(تفسیر تنویر)

مخلوق کے لیے اللہ تعالیٰ کی تربیت (پرورش کرنے) کی دو قسمیں ہیں

(۱) تربیت عامہ (۲) تربیت خاصہ تربیت عامہ سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوق کو پیدا کیا، ان کو رزق بہم پہنچایا اور ان مفادات و مصالح کی طرف ان کی راہ نمائی کی جن میں ان کی دنیاوی زندگی کی بقا ہے۔ تربیت خاصہ وہ تربیت ہے جو اس کے اولیا کے لیے مخصوص ہے پس وہ ایمان کے ذریعے سے ان کی تربیت کرتا ہے، انھیں ایمان کی توفیق سے نوازتا اور ان کی تکمیل کرتا ہے وہ ان سے ان تمام امور کو دور کرتا ہے جو راہ حق پر چلنے سے انھیں باز رکھتیں ہیں اور ان تمام رکاوٹوں کو ہٹاتا ہے جو ان کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان حائل ہوتی ہیں۔
تربیت خاصہ کی حقیقت یہ ہے کہ اس سے ہر بھلائی کی توفیق ملتی اور ہر برائی سے حفاظت نصیب ہوتی ہے۔ شاید یہی معنی انبیائے کرام (علیہ السلام) کی دعاؤں کا سر نہاں ہے کہ ان میں اکثر ”رب “ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے کیونکہ انبیائے کرام کی فریادیں تمام کی تمام اللہ تعالیٰ کی ربوبیت خاصہ کے تحت آتی ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ کا ارشاد (رب العلمین) اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے جس نے تمام مخلوق کو تخلیق کیا ارشاد (رب العلمین) اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے جس نے تمام مخلوق کو تخلیق کیا ہے۔ وہ اکیلا ہی ان کی تدبیر کرتا ہے اور اسے کمال بے نیازی حاصل ہے اور تمام عالم ہر پہلو اور ہر اعتبار سے اس کا محتاج ہے۔ (تفسیر السعدی)

بحث اول:

رب کے معنی پروردگار، مالک، صاحب کے ہیں، یہ اصل میں رَبَّ یَرُبُّ کا مصدر ہے جس کے معنی تربیت کے ہیں، پھر مبالغہ کیلئے عدل کی طرح بطور وصف استعمال کیا جانے لگا اور بعض کا قول ہے کہ بر کی طرح صفت مشبہ کا صیغہ ہے، امام راغب نے تربیت کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے: ”ھو انشاء الشیئ حالا فحالاً الی حد التمام “ (الکمال)

یعنی کسی چیز کو یکے بعد دیگرے ایک حالت سے دوسری حالت میں اس طرح نشوونما دیتے رہنا کہ حد کمال تک پہنچ جائے، امام حلیمی (رح) نے رب کے معنی میں فرمایا ہے کہ رب وہ ہے جو ہر اس چیز کو جسے اس نے پیدا کیا ہے کمال کی اس حد تک پہنچا دیتا ہے کہ جو حد اس چیز کیلئے اس نے مقدر فرمادی ہے (اس کی تفصیل بحث دوم میں آنے والی ہے) پس وہ نطفہ کو پشت سے نکالتا ہے، پھر اسے پھٹ کی (علقہ) بناتا ہے، پھر علقہ کو بوٹی، پھر بوٹی سے ہڈیاں پیدا کرتا ہے، پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھاتا ہے، پھر بدن میں جان ڈالتا ہے، اور اس کو ایک نئی صورت میں جبکہ وہ ناتوان بچہ ہوتا ہے نکال کھڑا کرتا ہے اور برابر اس کو نشوونما کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اس کو پورا برابر انسان بناتا ہے اور ابتداء حال میں وہ جوان ہوتا ہے، پھر ادھیڑ عمر پھر بوڑھا بنادیتا ہے اور جو بھی چیز اس نے پیدا کی (مثلاً دیگر مخلوقات) ان سب کا یہی طور طریقہ ہے پس رب وہ ہے جو اس کا نگران اور اس حد پر اس کو پہنچانے والا ہو جو حد اس کے لیے اس نے مقرر کی ہے اور اس کی مقدار و نہایت قرار دی ہے یہاں تک اختصار کے ساتھ رب کا معنی صرف ایک معنی کے اعتبار سے متعین و معلوم ہوا (لغات القرآن)

العالمین عالم کا جمع ہے اور عالم خود بھی جمع ہے مگر اسکا واحد اس کے لفظ پر بھی نہیں آتا کیونکہ علم الغۃ کا قول ہے کہ علم کا واحد نہیں نہ اس کے لفظوں پر اور نہ بغیر لفظوں پر کیونکہ وہ اشیاء مختلفہ کی جمع ہے (اعراب القرآن)

امام راغب مفردات القرآن میں کہتے ہیں کہ عالم آسمان اور آسمان کے تلے (نیچے) جو جواہر و اعراض ہے ان کا نام ہے یہ اصل میں اسم ہے اس چیز کا کے جس کے ذریعے علم حاصل کیا جائے جس طرح طابع (ٹھپہ) اور خاتم (مہر) ان اشیاء کے اسم ہیں کہ جن سے ٹھپا لگایا جاتا اور مہر لگائی جاتی ہے اور اس صیغہ پر اسکی بنا اس لئے رکھی گئی ہے کہ وہ بھی بمنزلہ آلہ کے ہے کیونکہ عالم اپنے بنانے والے کی طرف رہنمائی کا آلہ ہے یہی وجہ ہے کہ رب العزت سبحانہ نے اپنی وحدانیت کی معرفت کے سلسلے میں ہم کو عالم ہی کا حوالہ دیا ہے ارشاد فرمایا ہے **اولم ینظروا فی ملکوت السموات والارض وما خلق اللہ من شیئ** (الایۃ) عالم اور اس کی جمع العالمین کی جمع کا صیغہ بھی اسی لحاظ سے ہے کہ ان مخلوقات کی ہر نوع عالم کہلاتی ہے جیسے کہا جاتا ہے عالم انسان عالم جنات عالم حیوانات عالم نباتات وغیرہ اور جمع سلامت العلمین کی وجہ تغلیباً ہے کہ تمام اقسام و انواع عالم میں انسان ہی اشرف المخلوقات ہے جس کا لحاظ صیغہ جمع میں رکھا گیا ہے۔

امام نسفی تفسیر مدارک میں یہی فرماتے ہیں "اجسام جواہر اور اعراض (ذوات وصفات) جن سے خالق کا علم حاصل ہوتا ہے یہ سب عالم ہیں اور اللہ تعالیٰ کے سوا جو کچھ موجود ہے اس کا نام عالم ہے اور یہ نام اس لئے رکھا گیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے وجود کی علامت ہے تو عالم نام ہوا ما سوا اللہ کا (تفسیر مدارک)

بحث دوم:

بحث دوم در حقیقت بحث اول کا خلاصہ اور ترجمہ مع تفسیر ہے۔ الرب والتربیۃ وھی تبلیغ الشیئ الی کمالہ شیئا فشیئا (بیضاوی) الرب، المصلح والمدبر والجابر والقائم یقال لمن قام باصلاح شیئ واتمامہ (قرطبی) ولا یقال الرب مطلقا الا للہ تعالیٰ (مفردات) ولا یستعمل الرب لغیر اللہ بل بالاضافۃ ای الا بالاضافۃ (ابن کثیر) العلمین جمع ہے عالم کا اور عالم بھی جمع ہے جس کا واحد کوئی نہیں، العالم الخلق کلہ (لسان العرب) العالمون اصناف الخلق کلھم (لسان العرب۔)

رب العالمین کا مطلب یہ ہوا کہ ہر صفت موجودات کا ایک نظام تربیت ہے اور ہر صنف کا نظام دوسرے سے الگ ہے اور سب کا آخری سرا اسی قادر مطلق احکم الحاکمین واحد ویکتا لاشریک سبحانہ کے ہاتھ میں ہے فقط کوئی صنف موجود اس کے ہمہ گیر نظام ربوبیت و تربیت سے آزاد مستثنیٰ نہیں اور اس کی تربیت عام ہے۔

رب العالمین کے جملہ سے یہ واضح ہوا کہ اسلامک عرب کسی مخصوص نسل مخصوص مذہب مخصوص قوم مخصوص سرزمین اور مخصوص قوم مخلوق وقبیلہ کا رب نہیں۔ یہ حقیقت تاریخ مذاہب واقوام میں نہایت اہمیت کا حامل ہے اسلام سے قبل مذاہب واقوام جس صورت میں موجود رہے ہیں وہ اس وسیع تخیل سے آشنا نہیں تھے ہر مذہب والے اور ہر قوم رب کو صرف اپنا خدا تسلیم کرتے اور مانتے تھے گویا رب کا تصور اور حیثیت محض قومی خدا کی رہ گئی تھی مصر بابل یونان چین ہند روم عرب وغیرہ کی مشرق قوموں کا ذکر نہیں، بنی اسرائیل جیسے اہل کتاب بھی خدا کے خدائے کائنات ہونے کے پوری طرح قائل نہیں تھے اور عیسائیت آج تک مسلسل باپ باپ کہہ کر خداوند تعالیٰ کی شان میں گستاخیاں کر رہی ہے۔ (نعوذ باللہ) قرآن حکیم نے ایک لفظ رب العالمین لاکر ان سارے مشرکانہ گمراہانہ عقائد کو مسترد کیا اور ان کے غلط عقائد پر کاری ضرب لگا کر ان کے مذموم خیالات کی بلند وبالا عمارت کو زمین بوس کر دیا

مشرک قوموں کو سب سے زیادہ ٹھوکر اور خبط صفت ربوبیت ہی کے سمجھنے میں لگا ہے اور یہی ان کے مشرکانہ ملحدانہ عقائد کی بنیاد ہے اسی لیے قرآن حکیم نے اس نظام تربیت کے اختصاص اور ہمہ گیری کو سب سے مقدم رکھا بس علماء کرام نے کہا ہے کہ کلمہ الحمد للہ رب العالمین تمام کموں سے افضل واشرف ہے یہاں تک کہ لا الہ اللہ سے بھی اس لیے کہ لا الہ اللہ میں صرف توحید ہے اور اس میں توحید کے ساتھ حمد وثنا بھی ہے۔ (تفسیر قرطبی)

الحمدللہ رب العالمین کے ساتھ یہ سارے شکوک واوہام ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئے اور حقیقت نکھر کر سامنے آگئی اور واقعی نفس الامری مسلمہ امور جو کہ ازل سے ابد تک ہمہ گیر اور عام ہیں خوب واضح ہو گئے جن سے اہل کتاب کے عقائد باطلہ اور من مانیاں باطل ہو گئیں جو کہتے چلے آئے ہیں کہ **لن یدخل الجنۃ الا من کان ھودا او نصاری یا نحن ابناء اللہ واحباءہ** (البقرہ) اور سارے جہاں کے علم دانست میں آگیا کہ رب العزت کی ربوبیت تمام کائنات کے لیے ہے کسی ایک طبقہ اور قوم کے لئے نہیں الحمد للہ رب العالمین کے یہی حقیقی اور عمومی معنی ہیں کہ وہ صرف رب بنی اسرائیل یا رب المسلمین نہیں بلکہ رب العالمین ہے عالمین کے معنی یہی بیان کئے گئے کہ ماسوا اللہ جواہر واعراض اور جمیع موجودات حضرت ابو سعید خدری (رض) سے روایت ہے کہ چالیس ہزار مخلوقات موجودات کی تعداد ہے جبکہ امام مقاتل کے نزدیک مخلوقات موجودات عالمین کی تعداد 80 ہزار ہے (قرطبی)

رب العزت سے بہانہ کی تربیت ان تمام انواع واقسام موجودات کے لئے علی حسب المراتب یکساں برابر ہے خشکی ہو کہ دریا ذوی الارواح جان دار مخلوقات ہو کے بے جان ذوی العقول ہوں کہ غیر ذوی العقول علویات سفلیات جواہر اعراض جمادات نباتات وغیرہ تمام مخلوقات رب العالمین کی نگرانی ترتیبت، تخلیق وابقاء کے نظام میں بلا تخصیص و استثناء منسلک ہیں، وہی ذات عالی صفات تکوینی امر وحکم کے ساتھ سب کا خالق، مربی، نگہبان اور روزی روسان ہے بلاشرکت غیرے **فتبارك اللہ احسن الخلقين فتبارك اللہ رب العالمين**۔ اس کے امر وحکم کے ساتھ یہ سارا نظام عالم قائم ومتحرک ہے، اس کے حکم کے بغیر ایک ادنی درخت کا پتہ نہ حرکت کر سکتا ہے اور نہ کوئی تغیر قبول کر سکتا ہے نہ اپنے مستقر وجگہ سے ہٹ سکتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

الحمد للہ رب العلمین نے ان تمام سربستہ مخفی رازوں سے پردہ اٹھا کر ربوبیت عامہ کو روز روشن کی طرح ظاہر فرمایا کہ کائنات کا ہر ذرہ اسی تربیت ایزدی سے نشو ونما پا رہا ہے دیکھیں شہروں میں ہزاروں کی تعداد میں ہسپتال لاکھوں کی

تعداد میں معالج ڈاکٹر عربوں کی مشینری کھربوں کی ادویات کا حیران کن نظام شب وروز بلاوقفہ جاری رہتاہے زچہ و بچہ کی بیشمار ڈسپنسریاں اور ہسپتال جہاں مریضوں کی قطاریں لگتی ہیں آپریشن کا دھوم دھام اور ہجوم ہے اربوں روپیہ کے بے دریغ اخراجات ہیں ایک ایک ٹیسٹ پر پچاس پچاس ہزار روپیہ کی لاگت ہے ایک ایک پیچیدہ مریض پر ملک اور بیرون ملک لاکھوں کے بلکہ بسا اوقات کروڑوں تک کے اخراجات ہیں اب آپ سمندروں کے حیوانات اور خشکی کے جاندار اور حیوانات کارخ کریں جن کے لیے نہ معالج ہے نہ ڈاکٹر نہ میڈیکل نہ اسپتال آپ ان مخلوقات پر نظر ڈال کر دیکھیں گے انکی نسلیں ہیں بچے ہیں گجراتی کتیا16 سے 18 بچوں تک کو جنم دیتی ہے ان حیوانات میں بنسبت انسانوں کے دیو ہیکل جسامت میں کئی گنا بڑے شمار اور گنتی میں ہزار گنازیادہ ان کے لیے نہ ڈاکٹر نہ دیگر سرائے مگر وہ انسانوں کی طرح پھلتے پھولتے بڑھ رہے ہیں خوشحال ہیں زچگی و بچگی کے ناز نخرے اور تمام تکلفات سے آزاد ہیں پھر ان کی خوراک دیکھیے ان میں سے کچھ کی غذا مٹی ہے کچھ کی غذا صرف پانی کچھ کی گھاس کچھ کی جڑی بوٹیاں اور کچھ کی ہوا اور باد نسیم سوبتایئے یہ مضبوط و مربوط محکم نظام کس کا ہے اور کس کے ہاتھ میں ہے ایک ایک بنگلے اور پارکوں کے پھولوں اور درختوں کی خدمت پر کتنے مالی خدمت گار متعین و مقرر ہیں روزروز کھاد اور پانی کا تازہ سلسلہ جاری رہتا ہے معمولی غفلت سے پورا نظام درہم برہم ہوتا ہے یہ ہے انسانی ربوبیت کا انجام۔ اب ذرا جنگل کی چٹانوں سنگلاخوں پتھروں کارخ کر کے دیکھیں تو وہاں کے درختوں جڑی بوٹیوں کیڑے مکوڑوں جنگلی جانوروں کا کون مربی ہے سالوں مہینوں تک کچھ بھی انسانی تدبیر اور انسانی ہاتھ وہاں کار فرما نہیں ان کا نظام چلانے والا نگہبانی حفاظت کرنے والا اور انہیں سجاسجا کر ترقی دینے والا اور انہیں ہر قسم کے نشوونما مہیا کرنے والا کون ہے فتبارک اللہ رب العالمین۔ انسان ہو یا جانور بچوں کی پیدائش کے ساتھ ساتھ بلا تاخیر ماں کے سینے کے ساتھ دودھ کی نہر اور چشموں کا چھاتی کے ذریعے نظام دیکھئے ایک ایک جانور کے اس کے بچوں کی تعداد کے برابر پستانوں کا انتظام کس کی قدرت اور حکم سے ہے گرم گرم خالص دودھ کا جو مولود کی طبیعت کے مطابق ٹیسٹ شدہ ہو خوشبو بازاری ناقص اور ناموافق دودھ کیسے ناموافق ہونے کی وجہ سے بذریعہ ڈاکٹر روزانہ بار بار تبدیل کرنے کی نوبت پیش آتی ہے اور طرہ یہ کہ مہنگی قیمت دے کر خریدا جاتاہے ہم غریبوں کی دسترس سے باہر ہے اس ماں والی دودھ جو کہ مفت بھی ہے اور موافق بھی وغیرہ یہ ہے شان ربوبیت ایزدی درخت توت کا پتا جانور نے کھایا تو گوبر بنگی شہد کی مکھی نے چوسا شہد بن گیا کیڑے نے کھایا ریشم پیدا

ہوا یہ کس کی تربیت اور دستکاری ہے جانور ھوں یا انسان سروں اور منوں کے حساب سے خوراک کھاتے ہیں پیٹ میں ہضم ہونا کیلوس بننا، خون پیدا ہونا، بلغم پیدا ہونا یہ کیا ہے اور کس کے حکم سے ہے؟
اس کے بعد ذرا غور کرو تو 3 کلو خوراک کھا کر آٹھ گھنٹے بعد جو بول و براز نکلتا ہے اس کی مقدار دس تولہ ہے کھائی ہوئی خوراک کا باقی بڑا حصہ کہاں گیا اسی طرح بچہ ماں کے پیٹ میں کھاتا پیتا سانس لیتا ہے یہ کھایا ہوا فضلہ کہاں جاتا ہے اور سانس کس طرح لیتا ہے غور فرمایئے یہ ہے شان ربوبیت ایزدی انسانی اعضاء اور بدن کے اندر قیمتی اجزاء کو دیکھئے صرف بقول سائنسدانوں کے آنکھ میں 12 کروڑ بلاک اور دونوں آنکھوں میں 24 کروڑ بلب کی برقی طاقت موجود ہے پہلا آسمان زمین سے تین کروڑ دس لاکھ میل دور ہے آنکھوں کی نظر نصف سیکنڈ میں آسمان تک پہنچ جاتی ہے یہ کس کی صناعی و کاریگری ہے سارے جہان والے ملکر پورے وسائل کے ساتھ ایک آنکھ نہیں بنا سکتے اور بنانے والی ذات کے لئے اتنا آسان اور اس کے خزانوں میں اتنی بے قیمت ہے کہ یہی آنکھ اور اسی طرح دل و دماغ اور سارے اعضا رئیسہ سے جہاں اشرف المخلوقات کو نوازا گیا ہے وہاں یہ سارے قیمتی اعضاء اور آنکھوں سے پست ترین اور کمزور ترین مخلوق کیڑے مکوڑوں کو بھی نوازا گیا ہے آپ کبھی چوہے یا سانپ کی آنکھوں کی خوبصورتی دیکھیں تو بلا ساختہ زبان سے نکلے گا فتبارك الله احسن الخالقین ایک ادنیٰ مخلوق مچھر کو دیکھیں تحقیق سے پتہ چلا ہے کہ اس کی تخلیق انسانی تخلیق کے برابر ہے مچھر کا دماغ ہے دل جگر پھیپھڑا گردہ معدہ خون دانتوں کی جگہ سونڈ شعور سوچ وغیرہ جس طرح پورے عالم میں ایک شکل و صورت کے دو انسان اپنے نہیں دیکھے اسی طرح ایک شکل و صورت کے دو مچھر ملنا مشکل ہے دیکھئے رات کی تاریکی میں ہماری آنکھیں کام نہیں کرتی ہیں مچھر کی آنکھوں کی روشنی اور تاریکی میں فرق نہیں آتا بلکہ تاریکی میں اس کی بینائی اور تیز ہو جاتی ہے علامہ زمخشری کا قول ہے:

یا من یری مد البعوض جناحھا
فی ظلمۃ اللیل البھیم الالیل
ویری نیاط عروقھا فی نحرھا
والمخ فی تلک العظائم النحل

اے وہ پاک رب العالمین جو دیکھتا ہے سخت تاریکی میں مچھروں کے پروں کے پھیلاؤ کو اور دیکھتا ہے اس کے بدن کی رگوں کو اور اس کی ہڈیوں کے مغز و چربی اور اس کے دل کے والوں کو، یہ ہے شان ربوبیت باری تعالیٰ فللہ الحمد رب العالمین۔

جانوروں کا دودھ دیکھو یہ دودھ گوبر پیشاب خون گوشت کے درمیان سے خالص رنگ سفید ذائقہ دار نکلتا ہے اس میں ملاوٹ گوبر پیشاب و خون کا کبھی نہیں ہوتا یہ کس کی کاریگری اور صناعی ہے؟ یہی جانور صبح شام ایک من دودھ دیتا ہے اب اسے ذبح کرو تو اس کے گوشت میں ایک قطرہ دودھ نظر نہیں آئے گا یہ کہاں سے آیا اور کہاں گیا؟ یہ سب تربیت یزدی کے کرشمے ہیں فتبارك الله رب العلمين۔

بحث سوم "رب العلمین":

تربیت کرنے والا اور سارے جہانوں کا پالنے والا تربیت کرنے کے معنی ہیں ہر چیز کو آہستہ آہستہ رحمت و شفقت کے ساتھ کمال تک پہنچانا جس درجہ تک اس کی حد ہو مثلا رب العزت سبحانہ و تعالی و عز مجدہ مچھر چیونٹی گائے ہاتھی کے بچوں کو رفتہ رفتہ کمال تک پہنچا دیتا ہے لیکن مچھر مکھی چیونٹی کے بچوں کا کمال یہ ہے کہ ان کی لمبائی چوڑائی وغیرہ مچھر مکھی چیونٹی کے مطابق ہو اور گائے ہاتھی کے بچہ کو گائے اور ہاتھی کے برابر اسی طرح دیگر حیوانات کے بچوں کو ان کے بڑوں کی حد تک یہی قانون تمام حیوانات اور جاندار ذوی الارواح کیڑے مکوڑوں تک سب کے لئے ہے اسی طرح نباتات سبزی پھل درخت جڑی بوٹیوں تک کھجور عام سیب کیلا بادام دیگر ہر قسم کے درخت اور ان کے پھلوں کا حجم و لمبائی برابر نہیں اور رنگوں ذائقہ بھی ہر ایک کی حد و اندازہ اسی کے مطابق اور دوسروں سے مختلف ہوتا ہے یہی قانون تمام بوٹیوں کے لیے بھی ہے سبحان اللہ و بحمدہ انسانوں کو دیکھیں اور تمام حیوانات کو بھی ہر مل کو ہر علاقہ کے لوگوں کی قد و قامت اسی طرح ہر ملک و علاقہ کے حیوانات بھی باعتبار قد و قامت پتھروں سے مختلف ہیں ہر جنس و ہر نوع اسی طرح افراد کی تربیت الگ الگ زاویوں پر موجود ہے اور کبھی کسی جنس نوع یا افراد کی تربیت میں کوئی نقص معلوم نہیں ہوتا ہاں قدرت اگر اپنی تربیت کی نیرنگیوں کے خاطر اگر اس طرح کا فرق ظاہر فرمائے گا تو یہ آئین کمال قدرت و تربیت کا حصہ ہوگا جیسے شاعر نے کہا

نهد لال و فیروزه در صلب سنگ
گل لاله در شاخ فیروزه رنگ (سعدی)

بعض درخت اور بوٹی ایسے دیکھے گئے ہیں کہ ایک ہی درخت میں سات سے دس رنگ تک کے پھول موجود ہیں یہ قدرت باری تعالیٰ کا ایک ادنیٰ کرشمہ ورنگ سازی ہے یاد رہے کہ یہ کمی بیشی اور اختلاف موسم پانی اور زمین کے لحاظ سے نہیں فتاوی دیکھو بلکہ یہ سب کچھ ربوبیت باری تعالیٰ کے لحاظ سے ہے جیسا کہ مشاہدہ اس پر دلیل ہے یہ ربوبیت صرف زمین اور جنگلوں کے ہزاروں کیڑے مکوڑوں میں نہیں بلکہ سمندروں دریاؤں میں بنسبت زمین کے اور زیادہ مستحکم مضبوط پائیدار اور مختلف انداز میں پائی جاتی ہیں، حال ہی میں دنیا کے سائنسدانوں نے دریائی و سمندری مچھلیوں کی تعداد و اقسام 22 ہزار مختلف شکل و صورت اور مختلف قد و قامت مختلف جسم و جسامت کی دریافت کی ہیں ان تمام مخلوقات کی تخلیق پرورش اور تربیت دست قدرت ہی سے ہو رہی ہے عورت کے رحم میں کتنے بچے پرورش پاتے ہیں بسا اوقات دو اور تین سے لے کر چھ بچوں تک ایک ہی حمل میں بچے پرورش پاتے ہیں وہاں تو کسی کا ہاتھ نہیں جاتا وہاں کسی کی دسترس نہیں ہوتی اور کوئی انسانی تصرف و کاریگری نہیں ہوتی مگر رب العزت کی تخلیق و تصویر سازی اور پرورش اور خوراک کا نظام وہاں بھی موجود ہے کس کی مجال ہے کہ بچے کی ذکورت وہ خوبصورتی میں معاون ہو یا کسی بد صورتی اور انوثت میں رکاوٹ پیدا کرے قرآن حکیم نے واضح طور پر خبر دی "**هو الذی یصورکم فی الارحام کیف یشاء** "(الآیۃ)**لله ملك السموات وارض یخلق مایشاء یهب لمن یشاء اناثا ویهب لمن یشاء الذکور او یزوجهم ذکرانا و اناثا ویجعل من یشاء عقیما انه علیم قدیر** "(الشوری)۔یعنی سختی ہو یا نرمی سب احوال اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے ہیں آسمان و زمین میں ہر جگہ اسی کی سلطنت اور اسی کا حکم چلتا ہے جو چیز چاہے پیدا کرے اور جو چیز جس کو چاہے دے جس کو چاہے نہ دے دنیا کے رنگا رنگ حالات کو دیکھ لو کسی کو سرے سے اولاد نہیں ملتی کسی کو ملتی ہے تو صرف بیٹیاں کسی کو صرف بیٹے کسی کو دونوں جڑواں یا الگ الگ اس میں کسی کا کچھ دعوی نہیں وہ مالک حقیقی ہی جانتا ہے کہ کس شخص کو کس حالت میں رکھنا مناسب ہے اور وہی اپنے علم و حکمت کے موافق تدبیر کرتا ہے کسی کی مجال نہیں کہ اس کے ارادہ کو روک دے یا اس کی تخلیق و تقسیم پر حرف گیری کر سکے عقلمندی صرف تسلیم و رضا میں ہے فقط دیکھو جتنے عرصے تک بچہ رب العزت سبحانہ کی گود میں ہے ہمیں پتہ نہیں چلتا کہ کیسے رہتا ہے

کیسے کھاتا ہے کیسے پیتا ہے نہ روتا ہے نہ فضلہ وپیشاب پھینکتا ہے کچھ بھی نہیں مگر جو نہی رب العزت کی گود سے نکل کر باہر دنیا میں آتا ہے اور ماں کی گود میں پہنچتا ہے تو رونا بھی شروع کرتا ہے اور طرح طرح کی بیماریوں میں گھرتا ہے اور فضلات پھینکنا الٹیاں شروع کرنا روزمرہ کا مشاہدہ ہے۔

تو رب العزت سبحانہ کی تربیت بر و بحر، رحم و شکم مادر، عالم بالا و الم زیرین، اور ارحام میں کیسے منظم و مربوط طریقے پر جاری ہے، دیکھئے لاکھوں ٹن کروڑوں من وزنی ستارے 7 ارب یا اس سے زائد تعداد میں ہمارے سروں پر ہیں اور سات آسمان چاند سورج بغیر ستون اور کسی سہارے کے ہمارے سروں پر کھڑے یا چکر لگاتے نظر آتے ہیں نظام شمسی کو دیکھیں چوتھے آسمان پر سورج محو سفر ہے جو کہ تقریباً 13 لاکھ گنا زمین سے بڑا ہے اپنے وظیفہ روشنی اور حرارت کے ساتھ چل رہا ہے اور چاند جو کہ قریب ترین ستارہ ہے کس شان و شوکت کے ساتھ رواں دواں ہے کبھی باریک کبھی نہاقص کبھی مکمل اور کبھی درمیانی اندازے کے ساتھ زمینی نباتات درخت پھل فروٹ میوہ اور سارے ماکولات اس کی تپش اور معتدل روشنی سے پرورش پاتے ہیں اسی طرح ہمارے پاؤں کے نیچے سات زمینیں بغیر ستون کے فرش بنی ہوئی موجود ہیں یہ ساری اپنی اپنی جگہ نظام تربیت کے ساتھ کام کر رہے ہیں اور خدمت میں مصروف ہیں ہواؤں کو دیکھیں ان کی رفتار اور موسموں کی تبدیلی بادلوں کا نظام اور ان کے مختلف شکل رنگ گہرائی باریکی اور بارشوں برفوں اور اولوں کا نظام ترتیب یہ سارے رب العزت سبحانہ کے امر و حکم کے تحت خدمت میں مصروف ہیں۔

ابر و باد مہ خورشید و فلک در کار اند

تا تو نانے بکف آری و بغفلت نخوری

ہمہ از بھر تو سرگشتہ و فرمان بردار

شرط انصاف نباشد کہ تو فرمان نہ بری

سارا جہاں اوپر سے نیچے تک اور اس کا ذرہ ذرہ اور ہر مخلوق حضرت انسان کے لئے ہیں اور یہ سارے خادم بن کر انسان مخدوم کی خدمت بجا آوری میں محو سفر و مصروف ہیں اور یہ تمام مخلوقات اس کی خدمت پر مامور ہیں ان میں سے آج

تک کسی نے سستی انحراف نہیں کیا اور اپنے فرض منصبی کی بجا آوری سے انکار نہیں کیا دیکھیں گھوڑے گائے بھینس جیسے عظیم الجثۃ طاقتور اور پہلوان جانور کیسے مسخر ہیں انسان کا آٹھ سالہ بچے نے انہیں اپنے ہر حکم ماننے پر مجبور و محبوس کیا ہوا ہے اور شب و روز تخلیق و تسخیر ایزدی کے ساتھ ان سے خدمت لے رہا ہے بعض اوقات ان سے ایسی مالا یطاق خدمات وصول کر رہا ہے جو کہ حیران کن ہے مجال نہیں کہ کوئی جانور وظیفہ منصبی سے منحرف نظر آئے اور مقابلہ پر اتر آئے حالانکہ ایک اونٹ اگر ضد پر اتر آئے تو بیسیوں آدمی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے، دریاؤں کی تسخیر الگ باقی جانوروں اور حیوانات کی تسخیر الگ یہ سب کچھ رب العزت کی تسخیر اور نظام ربوبیت کے شواہد و دلائل ہیں کاش یہ خود مختار انسان صاحب عقل و ہوش جسے خلافت کا تاج پہنایا گیا ہے جسے دیگر مخلوقات پر حاکم بنایا گیا ہے جسے علم و عمل اور مختلف قسم کے ہنر و کمالات سے نوازا گیا ہے جسے قوت گویائی جیسی عظیم شرف منقبت کے ساتھ ساری مخلوقات پر برتری عطا ہوئی ہے جس کی رہنمائی اور سمجھانے کی خاطر انبیاء اور رسول تشریف لائے ہیں اور بابرکات آسمانی کتب اتاری گئی ہیں جسے زمین کا واحد حکمران اور سرپرست بنایا گیا ہے اور ساری امانتوں کا بوجھ اس کے سر پر رکھ کر سرداری کا شرف عطا کیا گیا ہے تو چاہیے کہ یہ خود کو پہچانے اور جانوروں سے بدتر نہ بنے، اسفل السافلین کے تہ میں پہنچنے سے پرہیز کرے۔ (دروس القرآن)

اجرام فلکی اور حکم ربی

اگر صرف یہ قریب ترین ستارہ چاند ذرا اپنے مرکز اور مستقل سے نیچے سرک جائے تو کیا کوئی طاقت ہے کہاں سے تھامے رکھے کوئی نہیں ہاں یہ طاقت ہے رب العالمین سبحانہ کی جس نے اسے تھام رکھا ہے اور چلا رہا ہے۔ اسی طرح باقی آسمانوں کے ساتھ عرب ستاروں کو اس پر قیاس کریں بیچارہ انسان نے زلزلہ کا پیمانہ و آلہ تو ایجاد کیا جس سے زمینی حرکت کا پتہ چلتا ہے مگر آج تک وہ آلہ روئے زمین پر آنے والے زلزلوں کی خبر دینے سے قاصر بھی ہے اور کیا اس کے پاس زلزلوں کو روکنے کی طاقت ہے؟ حضرت علی (رض) سے روایت ہے کہ لاکھوں ستارے اوپر کھڑے ہیں جب حکم ربی آجائے گا تو سب ایک کان میں آنکھ کی پلک جھپکنے ختم ہو جائیں گے **وما امرنا الا واحدۃ کلمح**

بالبصر۔(الآیۃ) قرآن حکیم کی سینکڑوں آیتوں میں آسمانوں زمینوں سمندروں ستاروں سورج چاند اور پہاڑوں کے عین وقت قیامت میں تہہ وبالا نیست ونابود ختم ہونے کا واضح بیان موجود ہے۔ فتدبر۔

دنیا کے سائنسدانوں نے اب تک صرف سات ارب ستارے معلوم کئے ہیں اور مزید معلومات کا سلسلہ جاری ہے اور کہتے ہیں کہ باقی ان سے زیادہ ہیں (**وما یعلم جنود ربك الا هو**)(الآیۃ) اللہ رب العزت سبحانہ کے لشکروں کو سوائے اس کے اور کوئی نہیں جانتا یہ ناکس وبیچارہ انسان صرف معلومات کی حد تک ہاتھ پاؤں مار مار کر فخر ومباہات کا شکار ہے اور اپنے اس کمال پر نازان وخوش ہے (اس کی تفصیل ان شاء اللہ آنے والی ہے) اور پھولے نہیں سماتا کہ یہ میرا کمال ہے اصل کمال ان محیر العقول حیران کن موجودات کی تخلیق وتصویر اور تربیت وپرورش ہے جو کہ رب العالمین سبحانہ کی ذات عالی صفات کے ساتھ مخصوص ہے "**فارجع البصر هل ترى من فطور** "(الایۃ) **فليخلقوا ذرة وليخلقوا حبة وليخلقوا نملة**(الحدیث) "**لا يخلقون شيئا وهم يخلقون** "(الایۃ) اگر اگلے پچھلے زندہ مردہ انس وجن مرد وعورت عقلاء حکما امراءوزراء سلاطین بادشاہ ورعیا ساری خلقت ایک جگہ جمع ہو جائیں مل کر اتفاق کریں دنیوی تمام اسباب وسائل استعمال کریں ساری دنیا کی تمام اسباب واموال خرچ کریں، باہمی تعاون کے ساتھ ایڑی چوٹی کا زور لگائیں تو یقینا عاجز آئیں گے، بے بس ہو کر تھک جائیں گے، خوار وذلیل ہو جائیں گے، ایک لنگڑی لولی مکھی یا بے دست وپاء چیونٹی پیدا نہیں کر سکیں گے یا ایک مردہ مچھر کو دوبارہ زندہ نہیں کر سکیں گے، چہ جائے کہ کسی مینڈک یا چوہے کا بنا سکیں۔**فتبارك الله احسن الخالقين**۔

حضرت علی (رض) کی روایت ہے الکواکب معلقۃ بسلاسل النور ستارے نورانی تاروں سے لٹکے ہوئے ہیں دراصل یہ نظام روحانی ہے مادی نہیں اگر یہ نظام مادی ہوتا تو مادے کی طرح تغیر پذیر ہوتا، مادی نظام میں ہر وقت تغیر وتبدیلی ہوتی رہتی ہے تو کسی وقت ضرور کوئی نہ کوئی تغیر پیدا ہو جاتا، لیکن یہ روحانی نظام ہے کہ ہر ستارہ ہزاروں سالوں سے اپنی جگہ پر کھڑا اور قائم ہے دیکھیں سائنس کے معلومات اور ایجادات حتمی یقینی نہیں ہوتے، سائنس دانوں کی تبدیلی سے معلومات اور یجادات میں ہر زمانہ تبدیلی ہوتی رہتی ہے اور ان میں ہر قسم کی غلطی نشیب وفراز یقینی اور واقع بھی ہے، مگر رب العزت سبحانہ کی فرمائی ہوئی باتوں میں کسی طرح کمی بیشی کا امکان تک نہیں، اس کا علم تمام

مخلوقات کے ذرات پر محیط ہے اور وہی اپنی علم وحکمت کے تحت ہر چیز کو اس کے مناسب حال پر پیدا فرمایا ہے، موجودہ وقت میں اقوام متحدہ کی رپورٹ کے مطابق روئے زمین پر ایک دن میں آٹھ سو کروڑ من خوراک خرچ ہوتی ہے، یہ بڑا لنگر اور خوراک کا نظام ربوبیت الہٰی کا واضح ثبوت نہیں تو اور کیا ہے؟ یہ بڑا اسامان، خوراک کس نے پیدا کیا؟ مخلوقات تو صرف کھانے والی، نوش جان کرنے والی ہیں، پیدا کرنے والا اور پکانے والا، رنگ وذائقہ ڈالنے والا، مہیا و تیار کرنے والا، زمین پر اگانے والا تو صرف رب العلمین ہی ہے۔

(افرأیتم ما تحرثون ءانتم تزرعونه ام نحن الزارعون "(سورۃ الواقعہ)

ماکولات ومشروبات کس کے حکم سے تیار ہوتے ہیں اور اگانے والا پانی برسانے والا زمین میں قوت واستعداد پیدا کرنے والا دریاوں کا نظام بغیر کمی وبیشی چلانے والا سبزی و پھل گندم جوار مکئی اگانے والا ان میں مختلف رنگ وذائقہ اور خواص ولطافت ڈالنے والا کون ہے یہ ربوبیت کس کی ہے یہ نظام کس کا ہے ایک ماکولات کو آفتوں آہتوں سے بچانے والا پانی میں یہ خاصیت اور شیرینی پیدا کرنے والا کون ہے عالم کا ہر ذرہ یہی جواب دے گا کہ یہ سب کچھ کرنے والا رب العالمین کی ذات گرامی ہی ہے اندازہ لگائیں یہ کثیر خوراک صرف انسانوں کی ہے، زمین پر کروڑوں بیشمار حیوانات، جنگلی جانور، طیور وپرندے، کیڑے مکوڑے، فضاؤں میں بسنے والی مخلوقات، دریاؤں، سمندروں میں بیشمار حیوانات اور دیگر بیشمار مخلوقات، کھانے والی اور غذا وروزی حاصل کرنے والی کیا عقل انسانی اس کا صحیح اندازہ لگاسکتی ہے جبکہ سمندروں میں جو مخلوقات ہیں ان کی تعداد خشکی مخلوقات سے کئی گنا زیادہ ہے اور ان کے اجسام وجسامت، حجم وخوراک بہ نسبت زمین اور خشکی کی مخلوقات کے زیادہ ہے ایک دریائی مچھلی کی خوراک زمین کے حیوانات کی بہ نسبت اتنی زیادہ ہے جیسے ایک کی نسبت ہزاروں لاکھوں کے ساتھ برابر ہو۔

حدیث شریف میں آیا ہے کہ روئے زمین کا واحد حکمران وبادشاہ پیغمبر حضرت سلیمان (علیہ السلام) جن کے قبضہ و اختیار میں ہوا، چرند، پرند، جن، انس، جنگلی جانور، طیور وپرندے، کیڑے مکوڑے، فضاؤں میں بسنے والی مخلوقات، کھانے والی اور غذا وروزی حاصل کرنے والی کیا عقل انسانی اس کا صحیح اندازہ لگاسکتی ہے جبکہ سمندروں میں جو مخلوقات ہیں ان کی تعداد خشکی کی مخلوقات سے کئی گنا زیادہ ہے اور ان کے اجسام وجسامت، حجم وخوراک بہ نسبت

زمین اور خشکی کی مخلوقات کے زیادہ ہے اور ایک دریائی مچھلی کی خوراک زمین کے حیوانات کی بہ نسبت اتنی زیادہ ہے جیسے ایک کی نسبت ہزاروں لاکھوں کے ساتھ برابر ہو۔

روئے زمین کا واحد حکمران وبادشاہ

حدیث شریف میں آیا ہے کہ روئے زمین کا واحد حکمران وبادشاہ، پیغمبر حضرت سلیمان (علیہ السلام) جن کے قبضہ و اختیار میں ہوا، چرند، پرند، جن، انس، جنگلی جانور وغیرہ رب العزت سبحانہ کے حکم سے محکوم اور منتظر فرمان ہیں، ایک شاہی تخت پر بیٹھ کر دو دن کے عرصے میں سارے جہان کی سیر وسیاحت کرتا ہے، تخت بھی تو تخت ہے، تاریخی و بے مثال تخت ہے، انجن ندارد، شیشہ کا بنا ہوا ہے، پہیا نہیں، کچھ بھی نہیں، تیل نہیں مانگتا، ہیرے جواہرات کی چھ لاکھ کرسیاں نصب ہیں، ہوا کے ذریعہ پرواز کرتا ہے، ہوا کے ذریعہ کسی ائیر پورٹ کے بغیر نیچے اترتا ہے، فضاء میں بلند ہونے کے بعد جس شہر و بستی اور جس علاقے سے گزرتا ہے وہاں کی آبادی اور انسان سارے نظر آتے ہیں اور ہوا کے ذریعہ ان کی باتیں حضرت سلیمان (علیہ السلام) کے کانوں تک سماعت کی خاطر پہنچ جاتی ہیں۔ وغیرہ۔ (بحر المحیط و تاریخ و قصص الانبیاء بروایت حضرت عبد اللہ بن عباس (رض))

اس عظیم پیغمبر و نبی نے ایک شاہانہ دعوت کا اہتمام کیا، ساری مخلوقات کیلئے ایک ٹائم کھانے کا انتظام فرمایا اور بیشمار ماکولات و مشروبات کا انتظام فرمایا، اس دعوت کی تیاری اور ترتیب دہی میں چھ ماہ صرف ہوئے، لاکھوں انسان اور لاکھوں دیو ہیکل بڑے بڑے پہلوان، جنات، مصروف عمل و خدمات پر مقرر اور متعین تھے، خوراک پہاڑوں جتنی تیار ہوئی، ایک دریائی سمندری مچھلی بے صبری کے عالم میں دریا سے نمودار ہوئی، سر نکالا، کھانے کی درخواست کی، جواب ملا کہ پہلے لوگ کھائیں گے تمہاری باری آخر میں آئے گی، عرض کی میں صبر نہیں کر سکتی سخت بھوک لگی ہے، جواب ملا اچھا کھاؤ، بس اتنا کہنا تھا کہ اس نے منہ کھولا اور چھ ماہ کی تیار شدہ پہاڑوں جتنی خوراک کو ایک لقمہ کر کے ہڑپ کیا اور مطالبہ کیا کہ دو حصہ میرا روزینہ یومیہ کا باقی ہے، براہ کرم انتظام کرو، رب العزت سبحانہ مجھے روزانہ تین دفعہ اتنی خوراک مہیا فرماتے رہے ہیں، بس اتنا ہی کہنا تھا کہ روئے زمین کے عظیم پیغمبر وبادشاہ سجدے میں گر گئے اور معافی مانگنے لگے، رب العزت تو ہی رازق ہے اور تو ہی رزق روزی مہیا کرنے پر قادر ہے، مجھے معاف فرمائیں اور میرا

مواخذہ نہ فرمائیں (قصص الانبیاء) رب العزت سبحانہ وتعالیٰ کا یہ بے مثال محیر العقول رزق وروزی کا نظام کسی اسباب و عوامل پر موقوف نہیں، بلکہ یہ نظام تکوینی ہے جو کہ "کن فیکون" کے آرڈر پر چل رہا ہے۔ بدقسمتی سے نادان و بے خبر انسان مصنوعات کو تو ہر لحہ دیکھتا ہے مگر غور و فکر نہیں کرتا، اس نظام ربوبیت سے کبھی متاثر نہیں ہوتا بلکہ غافل ہی رہتا ہے اور اس کی ہمہ گیری اور گہرائیوں پر توجہ صرف نہیں کرتا (**افلا یتدبرون فی خلق السموات والارض**) چاہیے کہ تخلیق عالم اور نظام کائنات میں تدبر و تفکر کر کے معبود برحق کی قدرت و نظم پر اور اس کے کمالات پر توجہ مبذول کر کے اسی سے معرفت کا دروازہ کھل کر بندگی کا حق پورا ادا کرنے کا جذبہ موجزن کر دے، صرف ظاہری اسباب و عوامل پر رسائی حاصل کرنے سے مسائل حل نہیں ہوتے، ان تک رسائی تب ممکن ہوگی جب گہرائیوں پر غور و فکر مبذول ہو، اگر مراقبہ کر کے گریبان میں منہ ڈال کر صحیح تصور کا حق ادا کیا جائے تو ان بیشمار مخلوقات کی پیدائش اور نظام حیات ورزق وروزی پر توجہ مرکوز کرنے سے تو معلوم ہوگا کہ **رب العلمین الحی القیوم بدیع السموات والارض سبحانہ وتعالیٰ** نے کیسا خوبصورت محکم و مضبوط اور پختہ نظام تشکیل فرمایا ہے، ذرا دیکھیں موسم کی تبدیلی، شردی، گرمی، روشنی، تاریکی، بادلوں کا نظام کیسا محیر العقول ہے اور جو لوگ قدرتی کمالات کے مشاہدے سے اندھے اور قرآن وحدیث کی پند و نصیحتوں سے سے بہرے ہیں اور ہر معاملہ میں مغرب کی تحقیق کو حرف صحیح اور قول آخر سمجھتے ہیں ہر بات پر مغرب کی پیروی کرتے ہیں اور اسی پر فخر کر کے خود کو ملک و ملکوت کا وارثو مدبر اور دانشور تصور کرتے ہیں اور مغرب کی واہیات و جھوٹ کو سچ اور یقینی جانتے ہیں، تو انہیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ ماہرین یورپ کہتے ہیں کہ زمین کے اندر تیرہ سو درجہ کی حرارت موجود ہے اور پانی ابالنے اور گرم کرنے کیلئے ایک سو درجہ گرمی کی ضرورت ہوتی ہے، تو یورپ کے سائنسدانوں نے واضح اقرار کیا ہے کہ زمین کے نیچے جہنم ہے، یہ اسلامی فرمودات کا اقرار و تسلیم نہیں تو اور کیا ہے؟ اور کہتے ہیں کہ اکیس جون کا دن انتہائی گرم ہوتا ہے اگر اس دن کو دو سال لمبا کیا جائے تو پوری دنیا جل کر راکھ کا ڈھیر بن جائے گی اور اکیس دسمبر کی رات انتہائی درجہ سرد ہوتی ہے اگر اسے چھ سال تک بڑھا دیا جائے تو پوری دنیا برف کی طرح منجمد ہو کر تباہ ہو جائے گی اور سارا نظام درھم برھم ہو کر کائنات کا بسترہ گول ہو جائے گا، اگر پانی کو گیس کی شکل میں تبدیل کیا جائے تو چھ سو چھتیس

درجہ گرمی کی ضرورت ہو گی، اب اندازہ لگایا جائے کہ ایک سو مربع زمین کی کھیتی کو سیراب کرنے کیلئے کس قدر پانی کی ضرورت ہے اور اگر پانی گیس کی صورت میں بنایا جائے تو اس کیلئے چھ لاکھ ٹن کوئلے کی ضرورت ہو گی، پورے برصغیر ہندوپاک پر صرف دس منٹ مصنوعی بارش برسانے کے لیے نوے کھرب ٹن کوئلے کی ضرورت ہو گی، اگر ہم صرف دس منٹ مصنوعی بارش برسانے کا انتظام کریں، تو آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس پر کتنے اخراجات ہوں گے، دیکھیں ہندوپاک کی آمدنی سالانہ کے حساب سے پانچ سو کھرب روپیہ ہے اور دس منٹ مصنوعی بارش کا خرچہ اس آمدنی سے تقریباً معمولی فرق کے ساتھ تیس ہزار گنا زیادہ ہے مطلب یہ ہوا کہ ہندوپاک کے تقریباً تیس ہزار سال کی آمدنی جمع کریں تو صرف دس منٹ بارش بنے گی، دیکھیں رب العلمین سبحانہ کی شان ربوبیت کس طرح عام اور بے مثال ہے اور یہ سارا محض بخششوں اور رحمتوں پر مبنی اور بغیر قیمت و معاوضہ پورے عالم کیلئے مفت ہے اور دوست و دشمن، مسلم و کافر سب کے لیے یکساں برابر ہے جس میں کسی قیمت یا خاص امتیاز کا شائبہ بھی نہیں بلکہ سب کے لیے بلا امتیاز جاری ہے۔(دروس القرآن)

اے کریمے کہ از خزانہ غیب
گبر و ترسا وظیفہ خور داری
دوستان رکجا کنی محروم
تو کہ بادشمنان کرم داری

نظام قدرت اور عالم ربوبیت

اسی طرح روشنی کے نظام قدرت کو دیکھیں تو وہ اس مذکورہ دقیقہ سے بھی کئی درجہ باریک اور حیران کن ہے اور بے انتہا اہم اور ہمہ گیر ہے، ملاحظہ کیا جائے دنیا میں شرقاً، غرباً، جنوباً و شمالاً سارے عالم میں جو تمام بجلی ہے جس سے دنیا کے تمام کارخانے، فیکٹریوں، مشینوں، پنکھوں اور اے سی، تھیٹروں، ہسپتالوں، مارکیٹوں، دفتروں، بازاروں، سڑکوں، گھروں وغیرہ میں جو بجلی روشن کارآمد اور زیر استعمال ہے ان سب کا اندازہ (¼) چھٹانک یعنی تقریباً سوا تولہ

ہے، اس کے ساتھ رب العلمین عزوجل کی بجلی اور نظام شمسی روشنی پر نظر جماؤ اور دیکھو تو یہ معلوم ہو جائے گا کہ جو سورج سے زمین پر روشنی پھیلتی ہے اور رب العزت سبحانہ نے اپنی قدرت کاملہ اور کرم وعنایت سے جو روشنی اور قوت برقیہ سورج میں رکھی ہے، اگر اس کے دو سو کروڑ حصے کیے جائیں تو اس کے ہر حصے کا نصف زمین پر پہنچتا ہے یعنی دو سو کروڑواں حصہ کا نصف زمین پر پہنچتا ہے اور پوری زمین اور تمام کائنات کیلئے کافی ہے، بالفاظ دیگر سورج کی روشنی کو چار سو کروڑ یعنی چار ارب حصہ کرو جس کا صرف ایک حصہ زمین پر پہنچتا اور کافی ہو جاتا ہے اور اس کا ثقل ووزن چار ہزار چار سو اسی من ہے اور تمام دنیا کی بجلی کا وزن سوا تولہ کے قریب ہے، تو رب العلمین سبحانہ کی بجلی کا وزن چار ہزار چار سو اسی من وزن رکھتی ہے، اگر یہ قیمت کے ساتھ بکنے لگے جس طرح دنیا کی بجلی مصنوعی بکتی ہے، تو تمام زمین کے ایک ارب سال کی پوری آمدنی اس کی قیمت کے لیے کافی نہیں اور لطف یہ کہ دنیا کی مصنوعی بجلی بار بار فیل ہوتی ہے، دوم یہ ہے کہ صرف چند خاص مقاصد تک محدود ہے، سوم یہ کہ کمی کی وجہ سے لوڈ شیڈنگ کا المیہ اس کے ساتھ وابستہ ہے، چہارم یہ کہ تمام خشکیوں اور دریاؤں، صحراؤں، جنگلوں تک کیلئے نہیں، پنجم یہ کہ اس کی روشنی نہ ہونے کے برابر ہے، ششم یہ کہ اس کا حصول صرف قیمت کے ساتھ ہے، ہفتم یہ کہ صرف انسانوں کیلئے ہے، ہشتم یہ ہے کہ اس کی تحصیل اور بنانے پر بیشمار سرمایہ صرف ہوتا ہے، نہم یہ کہ اس کے لیے میٹر، بلب، تار اور دیگر چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے، دہم یہ کہ اس میں بہت سارے خطرات ہیں، جان ومال اور سرمایہ ہر وقت اس کی زد میں ہیں، کئی گھر، بازار، مارکیٹیں، کارخانے اور انسانی جانوں کا تباہ وبرباد ہونا روزمرہ کا معمول بن چکا ہے، علاوہ ازیں دیگر بیشمار نقصانا کا پیش خیمہ ثابت ہوا ہے، جبکہ قدرتی بجلی میں یہ خطرات اور دیگر اقسام کے مذکورہ نقائص نہیں ہوتے جس کے فیض و برکات کائنات کے چپہ چپہ پر بلا قیمت اور یکساں جاری رہتے ہیں (دروس القرآن)

آبادی ہو یا صحراء، خشکی ہو یا دریا، جہاں جہاں ربوبیت کے مظاہر اور مناظر ہوں گے، وہاں تک بلا کمی وبیشی مساوات و برابری کے ساتھ جلوہ افروز رہیں گے اور یہی رب العلمین سبحانہ وتعالیٰ کی شان کریمی کا تقاضا ہے اور تمام جہانوں پر اس کی ربوبیت ومالکیت کا سایہ رحمت ہے، اس کی پوری تفصیلات کیلئے ہزاروں دفاتر درکار ہے، اسی طرح روشنی کی ضد جو راتوں کی خاموشی اور تاریکی ہے، وہ کتنی عظیم نعمت ہے جو قریب قریب روشنی کی نعمت کا ہم پلہ ہے اور اس

سے بالکل کم نہیں، تمام جہانوں کی زندگی اور خوشحالی انہی دو نعمتوں کی مرہون منت ہے اور سب کچھ انہی کے گرد گھوم رہا ہے۔قال اللہ تعالیٰ "وان تعدوا نعمة الله لا تحصوها "(ابراہیم)

اسی طرح اس کے ساتھ ہوا کی نعمت عامہ اور پانی کے فیوض و برکات جس کے ساتھ ہر چیز کی حیات وبقا وابستہ ہے قال اللہ تعالیٰ "وجعلنا من الماء كل شيء حي "(الانبیاء)

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ مینگریم

کرشمہ دامن دل مے کشد کہ حق این جاست

سمندروں، نہروں، چشموں، دریا، کاریزات، ٹیوب ویل، کنووں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ پورے کرہ ارض پر رواں دواں ہے، اگر سارے ملائکہ، تمام انسان وجنات لکھنے والے بن جائیں اور تمام درخت و جڑی بوٹیاں و اشجار قلم بن جائیں، اور سارے دریا، ساتوں سمندر ملا کر سیاہی ہوں، پوری زمین، کوہ و جبال اور چٹان کاغذ و گتہ اور اس کے ساتھ تمام کارخانے کاغذ بنا بنا کر روئے زمین کو بھر دیں، رب العلمین کی عظمت، کمالات، فضیلتوں، عنایتوں، نعمتوں کو لکھنا چاہیں، عمریں تمام ہو جائیں گی، ہاتھ شل ہو جائیں گے، قلم گھس گھس کر ٹوٹ جائیں گے، سیاہی ختم ہو جائے گی، لکھنے والے عاجز ہو کر تھک جائیں گے، مگر اللہ تعالیٰ کی تعریفیں اور خوبیاں ختم نہ ہوں گی اور ان کا احاطہ و شمار نہیں ہو سکے گا، یہ سارے محدود ہیں مگر اس کے کمالات و انعامات غیر محدود ہیں، کیونکر شمار (حساب) ہوں گے۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "لا احصى ثناء عليك انت كما اثنيت على نفسك " (الحدیث)

ہر کجا بینی نعیم و نعمت ست

نعمت حق از وجود رحمت ست

نعمت حق از حساب افزون ترست

از گمان بندگان بیرون ترست

نعمت ایمان زجملہ برترست
ہر کہ کوشد در عمل داترست
خوشتر آن باشد کہ ہر دم شاکرست
مال وجان قربان کند نیکوترست

رب العلمین کی ربوبیت کا ایک اور اہم پہلو

رب العلمین کی ربوبیت اور پرورش جو کہ سارے جہانوں کیلئے ہے، مخلوقات خواہ کتنی بھی ہوں چالیس ہزار ہوں یا اسی ہزار، ذی روح ہوں یا غیر ذی روح، جمادات ہوں یا نباتات، ذوی الاجسام جواہر ہوں یا اعراض، رب العزت کی تربیت وپرورش سب کو شامل ہے، آپ جانوروں کو دیکھیں اور ان کی اقسام دیکھیں ہر ایک کی جسامت، قدو قامت، شکل وصورت، طول وعرض ایک دوسرے سے مختلف ہیں، اور پھر ان کے خواص ومنافع دیکھیں، ان کے خواص و اغراض، رنگ وصورت، نسل وعمر اور زندگی وغیرہ کا حساب لگائیں، خوب غور وفکر کریں تو آپ کو بیشمار اور حیران کن عجائبات نظر آئیں گے اور عقل وشعور سے زندگی وغیرہ کا حساب لگائیں، خوب غور وفکر کریں تو آپ کو بیشمار اور حیران کن عجائبات نظر آئیں گے اور عقل وشعور سے بالاتر حقائق معلوم ہو جائیں گے کہ کوئی بڑے سے لے کر چھوٹے تک، پیٹ پر رینگنے والے، یا دو تین، چار، چھ اور آٹھ پاؤں والے سے لے کر پندرہ بیس پاؤں پر چلنے والے تک، کچھ مختلف سائز کے پروں والے، کچھ بغیر پروں کے، اسی طرح لمبائی، چوڑائی، پھر سیدھے اور کچھ ٹیڑھے، کچھ مربع، مثلث، مخمس، طویل وعریض، کچھ سروں والے اور کچھ بغیر سروں کے، کچھ دو تین سروں، اور دو تین چہروں اور کئی آنکھوں والے غرض یہ سارے عجیب وغریب بیشمار حکمتوں کے تحت پیدا کیے گئے ہیں۔

ان میں سے کسی کی تخلیق بغیر حکمت ومنفعت کے نہیں۔ قال اللہ تعالیٰ۔ "ربنا ما خلقت ھذا باطلاً "(ال عمران) ماہرین حیوانات نے سمندروں کی تہہ میں بیشمار عجیب الخلقت جانوروں کو دریافت کیا ہے کہ عقل انسانی ان کے تصور اور حقائق جاننے سے عاجز ہے، یمن کے ساحل عدن کے قریب سمندر میں بحری جہاز کے کپتان جناب عبد

الحمید خان نے بتایا کہ ایک انسان نما جانور ہے جس کے ہاتھ نہیں، چہرہ ہو بہو انسان کا ہے، اس کی ایک ٹانگ ہے جو انسان کی ٹانگ کی طرح کی ہے بڑی تیزی سے پانچ چھ فٹ پانی سے اوپر چھلانگ لگاتا ہے اور ہر وقت ہنستا ہوا نظر آتا ہے اور جہاز کی آمد پر خوشی محسوس کرتا ہے اور ساتھ ساتھ چلتا ہے، بار بار چھلانگ لگا کر ہنستا ہے پھر غائب ہو جاتا ہے۔ اسی طرح افریقہ کے گھنے جنگلات میں بکثرت عظیم الجثہ اور عجیب وغریب جانوروں کی دریافت ہو چکی ہے جو اس سے پہلے انسانی معلومات میں نہیں تھے، (حیاۃ الحیوان جیسی کتابوں میں ان کا تذکرہ نہیں) اور ماہرین حیوانات نے ایسے ایسے جانور دریافت کیے ہیں کہ جن کے چار سے لے کر آٹھ منہ اور متعدد چہرے اور پچاس کے قریب دانت ہوتے ہیں، یہ بات قابل فہم ہے کہ اس کائنات کی کوئی مخلوق چھوٹی یا بڑی بغیر فائدہ ومنفعت اور مہمل نہیں ہے بلکہ ان سب کے حقائق ہیں، خواص ہیں، فوائد ہیں، ایک ایک جانور میں کئی فوائد ہیں، دیکھیں بھیڑ بکریاں آپ کو پشم مہیا کرتی ہیں، بچے جنم لیتی ہیں، دودھ دیتی ہیں، گوشت مہیا کرتی ہیں، اونٹ، گھوڑے، بیل، گائے، خچر، گدھے وغیرہ باربرداری کیلئے استعمال ہوتے ہیں، ان کے چمڑے، ہڈیاں، عروق، رگیں سب کچھ کارآمد ہیں، پھر اسی بھیڑ بکریوں کی دودھ سے دہی، لسی، پنیر، خشک پنیر، اصلی کارآمد گھی، چربی، مکھن وغیرہ تیار ہوتے ہیں، ان تمام حیوانات کے منافع وفوائد انسانوں کیلئے رب العلمین سبحانہ کے کرم اور تربیت سے ہر موسم وہر زمانہ میں وافر وکثیر مقدار میں مہیا ہوتے ہیں، جیسے کہ روزمرہ کا مشاہدہ ہے۔

شہد کی مکھی کو دیکھیں، اس کی جسامت دیکھیں، کتنی سنجیدگی اور احتیاط سے شہد پیدا کرتی ہے، مجال نہیں کہ کسی زہریلی جڑی بوٹی کا رس چوس کر بجائے فائدہ کے نقصان پہنچائے، مچھر اور مکھی میں بھی کثیر فوائد ہیں، گھر میں، صحن میں، برآمدہ اور کچن میں زہریلے جراثیموں کی بہتات ہو تو یہ انہیں ختم کرتی ہے، زمین اور فرش پر موجود مہلک جراثیموں کو چیونٹیاں کھا جاتی ہیں، رب العلمین سبحانہ نے زمین اور اس کی فضاء میں چھوٹے چھوٹے کیڑے مکوڑے ایسے پیدا کیے ہیں کہ خوردبین سے بمشکل نظر آتے ہیں، لیکن ماہرین حیوانات نے بیان کیا ہے کہ وہ اتنے باریک اور چھوٹے ہیں کہ اگر ان میں سے چھ کروڑ اکٹھے کیے جائیں تو گندم کے دانہ کے برابر ہوں گے، ان کے سپرد یہ کام ہے کہ اگر فضاء زہر آلود بن جائے تو رب العزت سبحانہ نے ان کو حکم دے رکھا ہے کہ تم زہر آلود فضاء کو کھاؤ ختم کرو تاکہ زہریلی فضاء مخلوقات کو نقصان نہ پہنچائے اور مختلف قسم کے امراض پیدا نہ ہوں "**فسبحان من خلق الخلق**

بقدرته ودبر الاشياء بحكمته "(دروس القرآن)اور یہی رب العلمین سبحانہ کی حکمت اور حفاظت کا عمومی تقاضہ ہے جو بقاء عالم کیلئے ضروری ہے۔

نظام قدرت

اسی طرح نباتات، سبزہ اور درختوں کا نظام دیکھو، دوفٹ سے لے کر دو سوفٹ تک کے درخت موجود ہیں اور ایسے درخت بھی ہیں جن کے سایہ میں ہزار آدمی بیٹھ سکتے ہیں، ایسے قیمتی درخت جس کی لکڑی کا ایک فٹ بازار میں ہزاروں روپیہ پر بکتا ہے، درختوں کا نظام بہت ہی محیر العقول ہے، ان کے خواص الگ، جسامت، شاخیں، پتے، پھل و میوے، پھول، پھلیاں، چھلکے، سایے، کونپلیں یہ سب کار آمد ہیں، امریکہ میں سنا ہے سینکڑوں سال سے بڑی عمر کے درخت ہیں۔(سنوبر درخت کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ اس کی عمر پچاس ہزار سال ہوتی ہے اور اسی طویل العمری کی وجہ سے اس کی کونپلیں نکلنے کے ایک سال بعد اس کے پھول لگتے ہیں، پھر اسی ترتیب سے ایک ایک سال کے فاصلے پر پھلیاں، پتے اور پھل نموار ہوتے ہیں اور اس کی جڑیں سینکڑوں میٹر تک پھیلی ہوئی ہوتی ہیں) ان کے پتے الگ، چھال، پھل اور مختلف اجزاء کے الگ سینکڑوں فوائد ہیں، ان کی نسلیں بھی ہیں، ان میں نر و مادہ اور جفتی کا سلسلہ بھی ہے، موسم، زمین، ملک، خشکی، تری، نمائش، تربیت وغیرہ دیگر ہر قسم کے بہت سے منافع و خواص، امراض، ادویہ حتی کہ آج کل تہذیب یافتہ اور ترقی یافتہ اور ترقی پذیر دور میں ان کے محکمے بنے ہیں، محکمہ جنگلات، محکمہ زراعت، میوہ جات وغیرہ ناز و نخرے سب کچھ لاکھوں کی تعداد میں درخت صحرائی، بستانی، گھریلو پھول، جڑی بوٹیاں جن سے لاکھوں روپیہ کی ادویہ اور دیگر فوائد و منافع ہیں، ادویات ماہرین کے مشوروں سے مہیا اور تیار ہوتی ہیں، اس وقت پوری دنیا میں اوسطاً مختلف بیماریوں پر جو اخراجات ہوتے ہیں وہ تمام ملکوں کے سالانہ بجٹ کا چالیسواں حصہ ہیں اور یہ ساری ادویات انہی بوٹیوں سے بنائی جاتی اور تیار ہوتی ہیں، ان درختوں، جنگلات، جڑی بوٹیوں، پھل، پتے، شاخوں، پھولوں و دیگر اجزاء میں طرح طرح کے خواص و فوائد ہیں اور یہ سارا نظام جو کہ لامحدود بھی ہے اور حیران کن بھی۔

کہتے ہیں کہ اسپین میں سات ہزار قسم کے مختلف پھول پیدا ہوتے ہیں جن کے دیکھنے سے روح تازہ ہوتی ہے، اکثر سیاح انہیں دیکھنے کیلئے وہاں جاتے ہیں، یہ سب کچھ خالق کائنات کی بندہ پروری اور ربوبیت کے مظاہر ہیں اور اس کی بے پناہ نیرنگیوں کا ثمرہ و نتیجہ ہے، مگر افسوس یہ ہے کہ قدرتی مصنوعات و عجائبات دیکھنے پر انسان ہش ہش کر کے حیرانیوں کی دنیا میں گم ہو جاتا ہے، رنگ برنگ تخلیقات کو دیکھ کر لذت محسوس کرتا ہے لیکن قدرت کی کاری گری اور ہمہ گیر عظمت و کمالات سے بے بہرہ اور نابینا رہتا ہے اور اس کی وحدت تک رسائی کا غور و فکر اور کوشش نہیں کرتا، قال اللہ تعالیٰ ۔ ومن کان فی ھذہ اعمی فھو فی الاخرۃ اعمی (الاسراء) جو شخص یہاں نابینا ہوگا وہ آخرت میں بھی نابینا اٹھے گا، یہ نابینا سب کچھ دیکھ رہا ہوتا ہے مگر چشم بصیرت سے بے بہرہ محروم ہے، عرش الٰہی سے لے کر تحت الثری (زمین) ساتوں زمینوں کے نیچے تک بیشمار مخلوقات ہیں، علویات، سفلیات، نیز فضائی مخلوقات کا سلسلہ غیر متناہی ولا محدود ہے، ان میں ہر عالم کی حقیقت وصفات منافع و فوائد اور خواص ایک دوسرے سے مختلف ہیں، سبحان اللہ تمام عالم میں دو انسان ایک جیسی شکل وصورت، طبیعت و مزاج کے نظر نہیں آتے، اسی طرح باقی مخلوقات کا حال ہے حتیٰ کہ دو مچھر بھی ایک صورت و شکل کے نہیں ہوتے، فسبحان المصور للمخلوقات کیف یشاء فی ای صورۃ۔ قال اللہ تعالیٰ ۔ "ھو الذی یصورکم فی الارحام کیف یشاء لا الہ الا ھو العزیز الحکیم "(آل عمران) "ومن آیاتہ اختلاف السنتکم والوانکم "(الروم)

رب العزت سبحانہ کی اس تخلیقی و تربیتی پرورش میں جو رموز و اسرار اور حکمت پوشیدہ ہیں، انسان بیچارہ ہرگز اس کی گہرائی کا اندازہ اور سراغ نہیں لگا سکتا، کہیں دیکھو تربیت تکوینی ہے، کہیں تشریعی، کسی جگہ تدریجی اور کہیں ہنگامی ہے، بکری کا بچہ اور دوسرے حیوانات کے بچے پیدائش کے ساتھ فوراً چلنا شروع کر دیتے ہیں، انسان کا بچہ چھ ماہ تک مسلسل 24 گھنٹہ سویا رہتا ہے، مرغی اور دیگر پرندوں کے انڈے دینے کے کئی ہفتے بعد چوزے پیدا ہوتے ہیں، در اصل ہر نوع حیوانات میں قدرت نے تربیت کا الگ نظام رکھا ہے۔

حکایت

ایک منکر خدا، دہری کا گزر تربوز کے فصل پر ہوا، نرم ونازک زمین پر پھیلے ہوئے پودے دیکھ کر اس پر بڑے بڑے دس پندرہ سیر کے تربوز دیکھ کر کہنے لگا کہ کوئی مناسبت نہیں، قدرت الٰہی پر اعتراض کرنے لگا کہ پودا نرم وناز اور پھل بڑا، وہاں سے روانہ ہو کر انار کے باغ میں پہنچا اور درختوں پر انار کا پھل دیکھ کر پھر اعتراض کیا کہ درخت بڑا اور پھل چھوٹا، کوئی مناسبت نہیں، اس درخت کے لیے وہ بڑے پھل (تربوز) مناسب تھے اور اس کمزور درخت کیلئے یہ چھوٹا پھل (انار) مناسب معلوم ہوتا ہے، درخت کے سایہ میں آرام کرنے لگا، ہوا کا جھونک آیا، دو تین انار درخت سے گر کر اس کی پیشانی پر زور سے لگے تو کہنے لگا نہیں نہیں اب قدرت کی حکمت سمجھ میں آئی اگر درخت یہ ہوتا اور پھل وہ تربوز والا تو شاید میرا خانہ خراب ہوتا اور سر ٹوٹ کر میری زندگی کا خاتمہ ہو جاتا، انسان اشرف المخلوقات خلیفۃ اللہ فی الارض ہے کائنات کی تخلیق اسی کے لیے ہے۔

ع۔ جہاں ہے ترے لیے تو نہیں جہاں کیلئے (اقبال)

انسان محض دنیا میں نہیں بلکہ اس کی پیش قدمی برزخ اور آخرت تک کیلئے ہے، تب تو اس کی تربیت و تخلیق کو تدریجی بنیاد پر اور مختلف مراتب و درجات پر رکھا گیا ہے، اس کو بہت سے مدارج و مراتب سے گزرنا ہے، علم ہو یا جہالت، دولت ہو کہ فقر، خوشی ہو کہ غم، اسلام ہو کہ کفر، تندرستی اور بیماری، عبادت وریاضت، تقوی یا لادینیت والحاد، غرض یہ کہ سارے محاسن وکمالات اور سارے فسق وفجور یہ انسانی صفات ہیں ان کے ساتھ باقی مخلوقات کا کوئی تعلق نہیں، حضرت انسان کو تدریجاً یہ سارے مراحل پر سے گزرنا ہوگا، یہ جہاں محاسن واخلاق اور گمراہی وضلالتوں کی آماجگاہ ومستقر بنا ہوا ہے: "ان ربك لبا المرصاد "(الفجر) رب العزت عزت قدرتہ وتعالیٰ شانہ نظارہ کر رہا ہے اور بالکل نزدیک سے ملاحظہ فرما رہے ہیں: "لننظر كيف تعملون "فسبحانه وهو اللطيف الخبير۔ انسان کو کس خوبصورتی اور کیسی نزاکتوں سے نوازا ہے اور اس کیلئے کیا کیا مدارج طے فرمائے ہیں، پھر ان مدارج کو جس ترتیب کے ساتھ جوڑا ہوا ہے وہ نہایت پختگی اور استحکام کے ساتھ قابل غور وفکر ہے، ہر درجہ بہ نسبت اوپر والے کے

کمزور اور اوپر والا درجہ بہ نسبت اپنے ماتحت کے مضبوط و محکم ہے، ہر نیچے والا درجہ ختم ہو گا تب اوپر والا شروع ہو گا، نیچے والے کی موجودگی میں اوپر والا شروع نہیں ہو گا۔

تفصیل یہ ہے مثلاً انسان میں غذاء خوراک کی خاصیت و طلب موجزن ہے، پہلا درجہ یہ ہے کہ اس نے غذا کھائی یہ ہضم ہوئی اور فضلہ بن کر ختم ہو گئی، درسرا درجہ شروع ہوا، خون پیدا ہوا اور یہ ختم ہوا، اس سے نطفہ بنا، اب نطفہ رحم مادر میں داخل ہو کر ختم ہوا، تو علقہ پیدا ہوا یہ ختم ہوا، مضغہ پیدا ہوا اور یہ ختم ہوا، تو گوشت، عروق، ہڈیاں پیدا ہوئیں اور روح ڈالی گئی، انسانی شکل وصورت کے ساتھ ایک مکلف انسان موجود ہوا، پیٹ میں رہنے کا مرحلہ ختم ہوا تو اس جہان ناسوت میں قدم رکھا، محض رضاعت پر گزر اوقات ہونے لگا اور یہ درجہ ختم ہوا، تو فطام کا درجہ شروع ہوا، اس کے بعد آہستہ آہستہ دوسرے درجات شروع ہو گئے، دانت نکلے، چلنے، پھرنے، بولنے، کھیلنے کودنے، پھر شعور و احساس، پھر تعلیم و تدریب، پھر بلوغ، کمائی اور اعمال، پھر جوانی اور عقل و ہنر، پھر زمانہ زد، پھر تکمیل ہوش وحواس، پھر پختگی عقل چالیس سالہ دور، پھر ضعف و کمزوری کے مراحل، پھر ہرم و پیرانہ سالی، پھر (**لکیلا یعلم بعد علم شیئا**) پھر سارے اعضاء کا ناکارہ ہونا، پھر موت اور دنیا سے کوچ وروانگی بجانب برزخ و آخرت، اس کے ساتھ بصورت ایمان و عمل صالح دخول جنت اس پر تکمیل اور اختتام، یہ انتہائی عظیم ترقی اور اعلیٰ درجے کا عروج و کمال جس کو حصول رضاء الٰہی اور نعیم مقیم جنتی مربہ کہا گیا ز ہے سعادت و نصیب، اگر یہ انسان اپنے اصلی حالت پر رہتا اور موت سے ہمکنار و مشرف نہ ہوتا تو یہ رضائے الٰہی، ابدی زندگی، خوشحالی و جنت تک پہنچ کہاں سے حاصل ہوتی، موت ہی ترقی کا راستہ اور سبب و ذریعہ بن کر یہاں تک لے آئی، رب العزت سبحانہ و تعالیٰ کی ربوبیت و تربیت دیکھیے، ایک ادنیٰ نعمت زندگی و حیات بذریعہ موت ختم کر کے اس سے بہتر اور اعلیٰ چیز ابدی حیات و جنت عنایت فرمائی تو سچ فرمایا کہ "**تحفة المومن الموت**" "**راحة المومن و شرفه**" "**الموت جسر یوصل الحبیب الی الحبیب او کما قال**" تو کون کہتا ہے کہ موت ایک مصیبت ہے یہ صرف کافر کہہ سکتا ہے کیونکہ موت کے بعد اس پر عذاب الٰہی کا ورود ہوتا ہے مومن تو موت کو ایک نعمت وراحت سمجھتا ہے جس کے ساتھ اس پر جنتوں اور نعمتوں کا دروازہ کھل جاتا ہے۔

نذر کردم کہ گر آید بسرم آن روزے
تا در میکدہ شادان و غزل خوان بروم

لوگ رورو کر ماتم کناں ہیں اور مرنے والا ہنستا ہوا خوشی کا مظاہرہ کرتا ہے۔

رب العلمین، الخالق، المبدی، الموجد الواجد، بغیر آلہ، بغیر مادہ، بغیر محنت و جفاء کشی، بغیر مثال سابق و نمونہ، پورے عالم اور تمام علویات و سفلیات، متضاد مخلوقات، جواہر و اعراض کی پیدائش و ایجاد کا مرحلہ اور نظام تربیت و استحکام اور بدون کسی نقص و کمی کے صرف چھ دن میں تعلیماً للعباد اگر چاہتا تو صرف ایک اشارہ عین کے ساتھ (کن فیکون) کے ساتھ امر واحد کے ساتھ یہ سب کچھ کرنے پر عالم و قادر تھا اور جب اس پختہ و سنجیدہ محکم و مضبوط نظام کو ختم کرے گا تو وہاں چھ دنوں کا نہیں صرف ایک آدھ اشارہ نظام عالم کی شکست وریخت کے لیے کافی ہوگا: "وما امرنا الا واحدۃ کلمح بالبصر "(القمر) یہ ہے رب العلمین احسن الخالقین عز شانہ۔ یہ نظام عالم یا بعض چیزوں کی تخلیق محض ارادہ علم کلی محیط اور قدرت کاملہ رب العلمین کا نتیجہ و شاہکار ہے جو کہ اسی کے ساتھ مخصوص ہے، یہ بات نا قابل تردید ہے کہ انسان ہزاروں لاکھوں مصنوعات کا موجد ہے، آج انسان کی مصنوعات بہت بکثرت اور محیر العقول حیران کن دنیا میں موجود ہیں سائنسی ترقی کو وہ عروج حاصل ہوا جو کبھی چشم فلک نے نہیں دیکھا تھا وہ محیر العقول اشیأ ایجادات بنائے گئے جو کبھی انسان بے چارہ کیا بلکہ فرشتوں کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا اور نہ کوئی اس کا تصور کر سکتا تھا، شاید آئندہ یہ مصنوعات متروک ہو ان کی جگہ ان سے بھی زیادہ حیران کن سائنسی ایجادات اور مصنوعات کا ظہور ہو و ھلم جرا۔ مگر یاد رکھیے یہ مصنوعات وہ ایجادات ہی کہ لائیں گے انہیں تخلیق نہیں کہا جا سکتا اور نہ ہی ان کے ایجاد کنندگان پر خالق اور مصنوعات پر مخلوق کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ واضح رہے کہ یہ سارے عارضی ناتمام نامکمل معیوب ہزاروں نقائص سے پر اور فانی عارضی ہیں ان تمام مصنوعات کا مادہ رب العزت کا پیدا کرتا ہے پھر ان میں بہت سے تجربے اور تجزیہ کار فرما ہیں محنت اور اقتداء بالغیر مثال سابق اور تدری و تدریبی مشق و خواری اور مکمل شامل ہے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ انسان نے جس عقل و دانائی اور تدبر اور

تفکر فی المخلوقات کے بعد جس درجہ ایجاد پر پہنچا ہے یہ سب حضرت حق رب العزت سبحانہ کا عطیہ بخشش اور الہام ہیں یہ وہ الہام ہے جسے شہد کی مکھی کو شہد بنانے اور مکڑی کو عجیب وغریب جالا بنانے پر الہام سے نوازا گیا ہے مکھی مچھر اور مکڑی چیونٹی کی خالقیت کا دنیا میں کوئی ذی شعور مدعی ودعویدار نہیں ہاں اگر کوئی سائنسدان رب العالمین کے پیدا کردہ مواد اور جواہر اعراض اور اسکی عطیہ عقل شعور کے بغیر کوئی چیز ایجاد کرے تو قابل نظر ہے سارا جہاں جب ایک مچھر مکھی پیدا کرنے پر قادر نہیں تو بڑی چیزیں بطریق اولیٰ، لہٰذا تخلیق وایجاد کا فرق ضرور لازمی ہوگا، صرف یہ ایک بات تمام باتوں کے لیے فیصلہ کن ہے، کہ تمام ایجادات کا موجود جب اپنی جان اور موت وحیات کا مالک نہیں تو یہی عجز ناتوانی خالقیت کے ساتھ منافی ہے کیونکہ خالق صرف اور صرف قادر مطلق ہیں کا نام ہو سکتا ہے۔

دنیا جب سے وجود میں آئی اور انسان پیدا ہوا تو اسے عقل وعلم اور محدود قدرت عطا کی گئی پھر اسے ایک حد تک اختیار وارادہ سے نوازا گیا یہی اس کے مختلف ہونے کے اسباب ہیں اور بہت سی چیزیں اس کی ضرورت اور فائدے کے لئے اسے بتائی گئیں۔ پس اس نے مسلسل محنت وتجربہ سے اپنے لیے چیزیں بنانا شروع کیا اور مسلسل تجربہ محنت سے بہت سی چیزیں بنانے اور تیار کرنے میں کامیابی حاصل کی وہ اپنے ان تیار کردہ مصنوعات کا موجد بن گیا یہ سلسلہ حضرت آدم علی نبیناو(علیہ السلام) سے شروع ہوا اکثر وبیشتر چیزوں کے بنانے میں فرشتوں نے ان کی رہنمائی کی اور جس طرح نص قرآن حکیم سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نوح(علیہ السلام) کو کشتی تیار کرنے میں فرشتوں نے رہنمائی فرمائی۔ ان اصنع الفلک باعیننا ووحینا۔(ھود) قرآن حکیم نے **وعلم آدم الاسماء کلھا** الایۃ۔سے اسی سمت اشارہ فرمایا۔ چیزوں سے مخلوقات کے نام اور قیامت تک کی بولیاں زبانیں سب کی تعلیم مراد ہے۔

موجد الاشیاء والمصنوعات والحکمۃ

یادرہے اس وقت ساری دنیا میں جتنی زبانیں رائج ہیں ان کی صحیح تعداد 12874 زبانیں ہیں صرف ہندوستان میں 845 زبانیں رائج اور بولی جاتی ہیں پاکستان میں جزوی طور پر تیس کے قریب زبانیں بولی جاتی ہیں ہو سکتا ہے کسی کو تردد ہو مگر تحقیق کرنے کے بعد شک وشبہ دور ہو جائے گا حضرت آدم(علیہ السلام) کی ایک حیثیت نبوت کی ہے دوسری حیثیت سے آپ ابوالبشر ہیں تیسری حیثیت معلم الاسماء کی ہے چوتھی حیثیت میں آپ تمام نسل انسانیت کے

لیے صنعت و حرفت اور موجد الاشیاء والمصنوعات والحکمۃ کے ہیں اور یہ سلسلہ ایجاد حتم مصنوعات کا وہاں سے چلا اور آہستہ آہستہ ترقی و اضافے کے ساتھ برابر جاری رہا تاکہ حضرت ادریس (اخنوخ) (علیہ السلام) نے ان ایجادات میں اچھا خاصا نمایاں اضافہ فرمایا آپ پہلے پیغمبر ہیں کہ آپ پارچہ سازی کی صنعت اور زراعت و باغبانی و لکھ پڑھ تعلیم اور دیگر کئی چیزوں کے موجد ہیں یہ زمانہ دنیا کے بچپن کا زمانہ کہلاتا ہے زمانہ ابھی تک اپنے بلوغ کو نہیں پہنچا اور کان الناس امۃ واحدۃ الایۃ کا دور دورہ رہا جو نہی زمانہ اپنے بلوغ کو پہنچا تو انسانوں کی طرح زمانہ بھی بالغ کا مکلف ہوا اور بے دینی الحاد شرک و بت پرستی نے سر اٹھایا جب حضرت نوح (علیہ السلام) تشریف لائے مگر ایجادات و مصنوعات کے اعتبار سے دنیا اب بھی نابالغ شمار ہوتا رہا، تب ہی تو نوح (علیہ السلام) کشتی بنانے سے عاجز رہے اور فرشتوں نے ان کو اس پر آمادہ کیا اور سکھایا، یہاں تک کہ طوفان سے سارا جہاں غرقاب ہو کر فنا ہو گیا۔ قصہ ختم۔

رب العالمین سبحانہ کی ربوبیت کا ایک اہم نکتہ

طوفان کے بعد جب دنیا کی نشاۃ ثانیہ شروع ہوئی اور حضرت نوح (علیہ السلام) کے تینوں بیٹے حام سام یافث کی اولاد کرہ ارض پر تیزی سے پھیل گئیں اور دنیا کے مختلف ملکوں علاقوں میں لوگ آباد ہو گئے رب العزت کی مشیت نے بھی اسی سمت اپنی نیرنگیوں کو عام کیا کہ انسانیت اور اس کی آبادی معمورہ کے مختلف گوشوں کو لپیٹ میں لے لیے چین اور اس کے اطراف آباد ہو گئے ہندوستان میں آبادی بڑھ گئی ادھر مصر و افریقہ بشمول عمن و حجاز و عراق آباد ہو گئے۔ موجودہ تہران سے کاشغر۔ چین تک ادھر سے یورپ رومہ اٹلی یونان یہ تمام ممالک آباد ہو گئے دنیا کی ترقی کا عروج دیکھنے میں آیا فارس خراسان میں ایرانیوں کی مصر و افریقہ میں فراعنہ کی یمن و حجاز سے شام تک تبابعہ کی یونان اطراف میں رومیوں کی چین و نواحی میں خاقانیوں کی ہندوستان اطراف میں ہنود اقوام کی حکومتیں قائم ہو گئیں اور صابیت کا دور شروع ہوا شرک انسان پرستی دوبارہ زندہ ہو کر تمام اقوام کو اپنی لپیٹ میں لے لیا رفتہ رفتہ مختلف اقوام میں ارسالسال رسول اور نبوتوں کا دور شروع ہوا (اس کی تفصیل انشاء اللہ آئندہ آئے گی) مختصر یہ کہ حسابیۃ نے ترقی کر کے ہندو مت بدھ مت مجوسیت پرستی کے مختلف ادوار جنم لے لیے یونان میں حکماء فلاسفہ کا دور شروع ہوا خراسان نے مجوسیت اور زرتشت نظریات عام ہو گئے اہرام مصر، بابل، کابل، دیوار چین اسی زمانے میں تعمیر ہوئے قابل اعتماد

مورخ مسعودی نے مروج الذہب اور یاقوت حموی نے معجم البلدان میں بسط و تفصیل سے بیان کیے ہیں اور دیگر مؤرخین (خاص کر امام طبری) نے بھی قابل قدر تاریخی حالات قوموں کی آبادی عروج وزوال جنگی معرکے اور فتوحات بیان کئے ہیں میں نے اشارۃً ایک اجمالی خاکہ لکھ کر اسی پر بطور تمہید اکتفا کیا تاکہ بعد والے واقعات کو اسی پر تفریع کر سکوں۔

اس ترقی یافتہ دور سے جناب سیدنا ابراہیم (علیہ السلام) تک رنگ برنگی مختلف مذاہب وادیان، عقائد اعمال دنیا میں ظاہر ہوئے اگرچہ حضرت ذوالقرنین جیسے عظیم مومن و مصلح بادشاہ بھی آئے مگر دارا، اسکندر رومی جیسے مجوس مشرکین کی بھی کمی نہیں رہی اسی سکندر مقدونی بانی اسکندریہ مصر نے پنجاب (پاکستان) تک مسلسل فتوحات کیے وہ آگے بھی جانا چاہتے تھے مگر اسے معلوم ہوا کہ آگے کے لوگوں نے ہاتھی پال رکھے ہیں اور انہیں ہاتھیوں پر سوار ہو کر لڑتے ہیں وہ ہاتھیوں کے لشکر سے مرعوب ہو کر واپس آیا اس نے اس سے پہلے دارا جیسے ایرانی بادشاہ کو شکست دے کر پورے خراسان کو فتح کیا۔ یہ بڑا بت پرست ظالم خونخوار سفاک بادشاہ تھا 36 سال کی عمر میں مر گیا اگر یہ مزید زندہ رہتا تو پتہ نہیں کیا کرتا۔

اعطیت مفاتیح خزائن الارض

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ سرور کائنات (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بار بار ارشاد فرمایا کہ 'اعطیت مفاتیح خزائن الارض "(رواہ البخاری) اللہ رب العزت نے دنیا کے سارے خزانوں کی کنجیاں چابیاں مجھے عطا کی ہیں جو کہ پہلے کسی پیغمبر کو یہ خزانے اور اس کی چابیاں نہیں دی گئیں اب میری امت جو کہ آخری امت اور خیر الامۃ ہے اور گزشتہ تمام امتوں کی جانشین اور وارث ہے اس لئے یہ گزشتہ لوگوں کی ترقیوں اور عروج کا وارث ہو گی، امت اجابت اور امت دعوت کی آپ نے کوئی تخصیص نہیں فرمائی تو آپ کی امت کا زمانہ دنیا کے عروج و ترقی کا زمانہ قرار پایا اور دنیا کے وہ حیران کن خزانوں کا اور مخفی و پوشیدہ نعمتوں کا ظہور ہوا اور مسلسل ہو رہا ہے جسے چشم فلک نے کبھی نہیں دیکھا تھا اب انسانی مصنوعات اور ایجادات کا جو اس وقت اکناف واطراف عالم میں ایک دو نہیں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں ہر ملک و علاقہ ہر شہروں بستی خشکی اور سمندر آبادی اور صحراؤں میں ایک جال بچھا ہوا ہے جن کا گزشتہ

امتوں نے تصور تک نہیں کیا تھا۔ کسی وقت سادہ ہتھیار تلوار خنجر چاقو بندوق زرہ بنانے کے لیے خام لوہا بھی دستیاب نہ تھا ابھی موجودہ زمانے میں لوہے اور فولاد کی کثرت اور بہتات پہاڑوں سے زیادہ معلوم ہوتی ہے تیل اور سینکڑوں قسم کے پٹرولیم مصنوعات بجلی گیس اور کوئلہ ودیگر قیمتی اشیاء انہیں قدرتی خزانوں کا حصہ ہے اور آئے دن یہ ترقی و عروج مسلسل بڑھ رہا ہے اور اس کا سلسلہ پورے عالم میں ہمہ وقت جاری ہے گزشتہ زمانوں میں بادشاہوں نے وہ چیز نہیں دیکھی تھی جو آج ہم غریبوں کے زیر استعمال ہے یہ کشادہ سڑکیں ایئرپورٹ یہ کروڑوں کی گاڑیاں یہ دوربینیں ہسپتالوں کے اندر بیش قیمت مشینریاں یہ ریڈیو ٹائپ ٹیلی ویژن ٹیلی فون موبائل ہوائی جہاز راکٹ توپ ٹینک ریوالور چینی گھتہ دال چاول کی اور دیگر ہزاروں چیزوں کے کارخانے اور فیکٹریاں بجلی گھر بجلی اور اس کی مصنوعات جنگی اسلحہ و ہتھیار ایٹم بم اور دیگر بیشمار ہتھیاروں بارود ایٹمی ساز و سامان ریلوے کا نظام بغیر پائلٹ کے جہاز کلاشنکوف اور دیگر طرح طرح کے جنگی اور غیر جنگی لاکھوں کی تعداد میں ہر قسم کی مشینری اور ہر قسم کے آلات و مصنوعات۔

امریکہ نے بیشمار بحری بیڑے بنائے ہیں ایک تباہ کن بحری بیڑہ ایسا بنایا ہے جو کہ پورے عالم میں اس کی مثال نہیں، ایٹمی ایندھن سے چلتا ہے جس کے عرشے (چھت) پر 700 سے زائد بمبار جنگی جہاز موجود ہیں، یہ ایک جہاز نہیں پورا ایک شہر ہے تمام جنگی ہتھیاروں سے ہر وقت لیس ہے ہزاروں میلوں تک کام کرنے والے راڈاروں سے لیس ہے اتنا مضبوط محفوظ ہے کہ اس پر دشمن کا کوئی ہتھیار اثر نہیں کرتا اس کے علاوہ عورتوں نے بھی مصنوعات اور ایجادات ہر قسم کے جن کا پورے عالم میں جال بچھا ہوا ہے اللہ رب العزت کی نیرنگیاں اور قدرتی تخلیقی تربیتی الہامی کمالات کا کون اندازہ لگا سکتا ہے یہ ہوشیاری و دماغ سب اسی کی بخشش و الہامات اور کرم عنایت کے کرشمے ہیں جو حضرت آدم (علیہ السلام) سے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) تک پورے جہاں کی مخلوقات اور دنیا کے بڑے بڑے بادشاہوں نے نہ دیکھا نہ سنا اور نہ کبھی یہ فلسفہ ان کے وہم و گمان میں آیا، بدبخت فرعون نے تو بجلی بھی نہیں دیکھی اور نہ کبھی ٹیلیویژن دیکھا اور نہ کسی گاڑی یا جہاز یا موبائل فون سے استفادہ کیا اور نہ موجودہ مصنوعات کا تصور کیا یہ سب سید کائنات (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی کرامت و معجزہ ہیں جو فرمایا تھا "اوتیت مفاتیح خزائن الارض"۔ (الحدیث)

الدنیا سجن المومن وجنۃ الکافر

آگے آگے دیکھیئے ہوتا ہے کیا آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا تھا "**الدنیا سجن المومن وجنۃ الکافر** "(الحدیث) انسان کے لئے ایک قید ضرور مقرر ہے خواہ یہاں دنیا میں کاٹ لے یا آخرت میں، یہاں ایمان واعمال، اتباع شریعت اور بندگی کی قید پابندی جو چند روزہ عارضی ہے اور موت کے ساتھ اس عارضی قید سے رہائی ہو گی اور عالم آخرت میں اچھا خاصا استقبال ہو گا جس طرح حکومت کی قید سے رہائی پانے والوں کا اس کے عزیز رشتے دار جیل خانہ کے گیٹ پر استقبال کرتے ہیں جبکہ آئندہ اور اگلے جہان میں بے کسی وبے بسی اور جہنم کی قید ہے وہ تباہ کن اور دائمی ہے جس سے خلاصی اور رہائی ممکن ہی نہیں خاص کر کفار کے لیے، رہا فاسق وفاجر مومن جس میں ایمان کی دولت اگر موجود ہو تو وہ کسی وقت رہائی پائے گا مگر بہت دیر کے بعد، مومن کے لیے حدیث پاک نے دنیوی زندگی کو قید سے اور دنیا کو قید خانہ سے تعبیر فرمایا جب وہ یہاں سے چھوٹے گا تو جنت کے طویل وعریض اور نہایت خوشگوار فضا میں داخل ہو گا اور دنیاوی زندگی کے تمام جان لیوا رنج وپریشانیوں کو وہاں کی لذتوں کو دیکھ کر بھول جائے گا اس کے برعکس دنیوی زندگی کی راحتوں اور آزادیوں میں لت پت کافر جب اس کھلی ووسیع دنیا سے وہاں پہنچے گا تو ایک تنگ وتاریک فضا میں وارد ہو گا، وہاں کی قید وعقوبت کے مشاہدے کے بعد وہ دنیوی عیش وراحتوں کو سراسر بھول جائے گا (متفق علیہ)

مادر پدر آزاد زندگی جنگلی جانوروں

واضح ہو کہ مادر پدر آزاد زندگی جنگلی جانوروں کا حق ہے اشرف المخلوقات انسان کی فطری زندگی ایک متمدن زندگی وحیات کا نام ہے، انسانی زندگی اور اس کی تخلیق کا اصل مقصد یہ ہے کہ وہ صحیح، شرعی اعمال اور دینی اقدار وتہذیب اخلاق کا پابند ہو، اسے اخلاق حسنہ اور شرعی پابندیوں سے لاتعلق رہنا زیب نہیں دیتا۔ اسلام دین الٰھی اور دین فطرت ہے رب العزت سبحانہ کی غیرت کا یہی تقاضہ ہے کہ اس کی مخلوق ہر قسم کی بے حیائی آزادی اور خود سری سے پاک ہو اور اپنے خالق ومالک کے حکم پر عمل پیرا ہو کر شریعت کی زنجیروں میں قید وپابند ہو، ان شرعی پابندیوں کی بدولت وہ

خود بھی قیمتی ہیرا بن جائے گا اور اس کے اعمال صالحہ کے نتیجے میں معاشرہ ہر قسم کی برائیوں سے پاک ہو کر جنت کا منظر پیش کرے گا اور انسانی معاشرہ امن و سلامتی عدل و انصاف کا گہوارہ بن جائے گا، حقوق اللہ و حقوق العباد کی قدم قدم پر پاسداری اور حفاظت ہو جائے گی، جہالت و گمراہی کی تاریکیاں، ظلم و ستم اور ہر قسم کے جرائم پر قابو پالیا جائے گا، شرعی پابندیوں پر غیر شرعی ہزاروں آزادیاں قربان ہو جائیں گی، اسلام کا اولین دور اسی حکمت الٰہی اور شرعی پابندیوں کی بدولت نہایت عمدہ اور قابل تقلید زرین دور کے نام سے یاد کیا جاتا ہے جہاں انصاف کا دور دورہ رہا اور تمام ظلم وزیادتیوں کا نام ونشان نہیں رہا، اس مبارک عرصہ میں مسلمان تو کیا غیر مسلم اور جرائم پیشہ لوگ بھی برملا متاثر ہو کر اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے اور اسلامی خیمے میں داخل ہو گئے، اس حدیث پاک نے دنیا کو **سجن المؤمن** سے تعبیر کر کے انہیں شرعی پابندیوں کو سراہا اور کفر شرک کی غیر فطری آزادی کی مذمت فرمائی۔

جب امت مسلمہ ان شرعی پابندیوں پر شوق ورغبت سے عمل پیرا ہو تو حیوانیت اور غیر فطری آزادی سلب ہو کر پورا معاشرہ ایک جیل خانہ کی کیفیت پیش کرے گا جہاں اپنی نفسانی خواہشات ساری دب جائیں گی اور سارے احکام الٰہی پر عمل ہوتا رہے گا جیسے کہ جیل میں بند کر دی کے اختیارات سلب ہو کر جیل کے حکام ہی کا حکم و قانون قیدیوں پر نافذ رہتا ہے اس کے برعکس کافرانہ زندگی حیوانات کی زندگی ہے جس طرح کوئی جنگلی جانور کسی قانون وضابطہ کا پابند نہیں بعینہ کافرانہ زندگی اسکی نظیر ومانند ہے، جب کافر اپنے خالق ومعبود حقیقی کا باغی ہو گا تو اس کی زندگی باغیانہ زندگی ہو گی جس میں شرافت، عدل وانصاف، اخلاق حسنہ کا نام ونشان نہیں ہو گا، اس کے برعکس حیوانیت، ظلم وبے رحمی، خونریزی، تباہی وغیرہ کا رواج قائم ہو گا، وہ اپنے پالتو کتے کے عوض لاکھوں انسانوں کی خوں ریزی اور تباہی سے نہیں فرمائے گا، شرم وحیاء، ندامت، رحمدلی یہ ایمان باللہ کا خاصا اور حصہ ہے جہاں ایمان نہیں تو کچھ بھی نہیں، آپ نے دیکھا کہ روس وامریکہ اور مغربی بلاک (جو تہذیب کے مدعی ہیں) نے افغانستان اور عراق فلسطین اور دیگر بلاد اسلامیہ کے بے گناہ اور نہتے انسانوں کو خاک وخون میں تڑپایا اور ان کے شہروں کو کھنڈرات میں تبدیل کیا، اس کے باوجود وہ خود کو برحق سمجھتے اور مدعی تہذیب وانصاف کہلاتے ہیں۔ **لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔**

ان ظلم وزیادتیوں کے باوجود وہ ملامت بھی نہیں ہوئے اور ان سے بازپرس کرنے والا اور کوئی پوچھنے والا بھی نہیں تو

جنت الکافر کہہ کر حدیث پاک نے وعدہ فرمایا کہ جس طرح جنتی جنت میں خود مختار ہو گا یہی حال دنیا میں کافروں کا ہو گا۔ (تفسیر منازل العرفان)

{الرَّحْمٰنِ: بہت مہربان} رحمن اور رحیم اللہ تعالٰی کے دو صفاتی نام ہیں، رحمن کا معنٰی ہے: نعمتیں عطا کرنے والی وہ ذات جو بہت زیادہ رحمت فرمائے اور رحیم کا معنی ہے: بہت رحمت فرمانے والا۔
یاد رہے کہ حقیقی طور پر نعمت عطا فرمانے والی ذات اللہ تعالٰی کی ہے کہ وہی تنہا ذات ہے جو اپنی رحمت کا بدلہ طلب نہیں فرماتی، ہر چھوٹی، بڑی، ظاہری، باطنی، جسمانی، روحانی، دنیوی اور اخروی نعمت اللہ تعالٰی ہی عطا فرماتا ہے اور دنیا میں جس شخص تک جو نعمت پہنچتی ہے وہ اللہ تعالٰی کی رحمت ہی سے ہے کیونکہ کسی کے دل میں رحم کا جذبہ پیدا کرنا، رحم کرنے پر قدرت دینا، نعمت کو وجود میں لانا، دوسرے کا اس نعمت سے فائدہ اٹھانا اور فائدہ اٹھانے کے لیے اعضاء کی سلامتی عطا کرنا، یہ سب اللہ تعالٰی کی طرف سے ہی ہے۔

اللہ تعالٰی کی وسیع رحمت دیکھ کر گناہوں پر بے باک نہیں ہونا چاہیے

ابو عبد اللہ محمد بن احمد قرطبی (رح) فرماتے ہیں: اللہ تعالٰی نے ''رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ'' کے بعد اپنے دو اوصاف رحمن اور رحیم بیان فرمائے، اس کی وجہ یہ ہے کہ جب اللہ تعالٰی نے فرمایا کہ وہ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ہے، تو اس سے (سننے اور پڑھنے والے کے دل میں اللہ تعالٰی کی عظمت کی وجہ سے اس کا) خوف پیدا ہوا، تو اس کے ساتھ ہی اللہ تعالٰی کے دو اوصاف رحمن اور رحیم ذکر کر دیئے گئے جن کے ضمن میں (اللہ تعالٰی کی اطاعت کرنے کی) ترغیب ہے یوں ترہیب اور ترغیب دونوں کا بیان ہو گیا تا کہ بندہ اللہ تعالٰی کی اطاعت کرنے کی طرف اچھی طرح راغب ہو اور اس کی نافرمانی کرنے سے رکنے کی خوب کوشش کرے۔

(قرطبی، الفاتحۃ، تحت الآیۃ: ۲، ۱/ ۱۲۹، الجزء الاول)

قرآن مجید میں اور مقامات پر اللہ تعالٰی کی رحمت اور اس کے عذاب دونوں کو واضح طور پر ایک ساتھ ذکر کیا گیا ہے، چنانچہ اللہ تعالٰی ارشاد فرماتا ہے:

”نَبِّئۡ عِبَادِیۡۤ اَنِّیۡۤ اَنَا الۡغَفُوۡرُ الرَّحِیۡمُ ﴿۴۹﴾ وَ اَنَّ عَذَابِیۡ هُوَ الۡعَذَابُ الۡاَلِیۡمُ ﴿۵۰﴾ “(حجر:۴۹،۵۰)

ترجمہ: میرے بندوں کو خبر دو کہ بیشک میں ہی بخشنے والا مہربان ہوں۔ اور بیشک میرا ہی عذاب دردناک عذاب ہے۔

اور ارشاد فرمایا:

”غَافِرِ الذَّنۡۢبِ وَ قَابِلِ التَّوۡبِ شَدِیۡدِ الۡعِقَابِ ذِی الطَّوۡلِ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ اِلَیۡهِ الۡمَصِیۡرُ ﴿۳﴾ “(مومن:۳)

ترجمہ کنزالعرفان: گناہ بخشنے والا اور توبہ قبول کرنے والا، سخت عذاب دینے والا، بڑے انعام (عطا فرمانے) والا ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اسی کی طرف پھرنا ہے۔

نیز حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت ہے، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: ”اگر مومن جان لیتا کہ اللہ تعالیٰ کے پاس کتنا عذاب ہے تو کوئی بھی اس کی جنت کی امید نہ رکھتا اور اگر کافر جان لیتا کہ اللہ تعالیٰ کے پاس کتنی رحمت ہے تو اس کی جنت سے کوئی ناامید نہ ہوتا۔

(مسلم، کتاب التوبۃ، باب فی سعۃ رحمۃ اللہ۔۔۔ الخ، ص ۱۴۷۳، الحدیث: ۲۳(۲۷۵۵))

لہٰذا ہر مسلمان کو چاہیے کہ وہ امید اور خوف کے درمیان رہے اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کی وسعت دیکھ کر گناہوں پر بے باک نہ ہو اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کے عذاب کی شدت دیکھ کر اس کی رحمت سے مایوس ہو۔

کسی کو رحمن اور رحیم کہنے کے بارے میں شرعی حکم

اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور کو رحمن کہنا جائز نہیں جبکہ رحیم کہا جا سکتا ہے جیسے قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو بھی رحیم فرمایا ہے، چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

”لَقَدۡ جَآءَكُمۡ رَسُوۡلٌ مِّنۡ اَنۡفُسِكُمۡ عَزِیۡزٌ عَلَیۡهِ مَا عَنِتُّمۡ حَرِیۡصٌ عَلَیۡكُمۡ بِالۡمُؤۡمِنِیۡنَ رَءُوۡفٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۱۲۸﴾ “(توبہ:۱۲۸)

ترجمہ: بیشک تمہارے پاس تم میں سے وہ عظیم رسول تشریف لے آئے جن پر تمہارا مشقت میں پڑنا بہت بھاری گزرتا ہے، وہ تمہاری بھلائی کے نہایت چاہنے والے، مسلمانوں پر بہت مہربان، رحمت فرمانے والے ہیں۔

(صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم القادری)

جب کہا گیا رب العالمین، کہ اللہ سب جہانوں کا پالنہار ہے تو عقل نے سوال کیا کہ دنیا میں کروڑوں لوگ اللہ کو گالیاں دینے والے ہیں پھر وہ اپنے منکروں اور گالیاں دینے والوں کو کی سے رزق بہم پہنچاتا ہے تو اس کا جواب دیا گیا (**الرحمن الرحیم**) کہ چونکہ اس کے دریائے رحمت کا کوئی ٹھکانہ نہیں اس لیے سب دوست دشمن اس کے دریائے رحمت سے یکساں پی کر سیراب ہو رہے ہیں:۔

اے کریمے کہ از خزانہ غیب گبر و وترسا وظیفہ خور داری

دوستاں را کجا کنی محروم تو کہ با دشمناں نظر داری

رب العالمین، کے ساتھ، الرحمن الرحیم، کہہ کر یہ بھی بتادیا کہ اس کا تمام جہانوں کو پالنا کسی مجبوری کے تحت نہیں ہے محض رحمت کے ساتھ ہے دیکھو ایک بادشاہ بھی اپنی رعایا کی خوراک وضروریات کا اہتمام کرتا ہے مگر اس کا یہ عمل بامر مجبوری ہے اگر نہ کرے تو بادشاہت جاتی ہے مگر اللہ رب العالمین کو کوئی مجبوری یا ڈر نہیں، ہاں وہ رحمن ورحیم ہے اور سب پر اپنے رحم وکرم کی بارش فرمارہا ہے۔

الرحمن اور الرحیم میں فرق

یادرہے کہ الرحمن اور الرحیم دونوں مبالغہ کے صیغے ہیں اور دونوں کا لفظی معنی بہت رحم کرنے والا ہے مگر قرآن وحدیث کی روشن میں الرحمن اور الرحیم کے معنی میں فرق ہے۔ الرحیم کا معنی ہے آخرت میں رحم فرمانے والا، اور الرحمن کا معنی ہے دنیا و آخرت میں ہر جگہ رحم فرمانے والا۔ یا الرحیم کا معنی ہے صرف مومنوں پر رحم فرمانے والا اور الرحمن کا معنی ہے مومنوں کافروں سب پر رحم فرمانے والا۔ گویا الرحمن میں معنی کے لحاظ سے الرحیم کی نسبت زیادہ وسعت ہے اور ہمہ گیری ہے۔

پھر ان دونوں میں یہ فرق بھی ہے کہ الرحیم مخلوق پر بولا جاتا ہے جیسے رسول اللہ کی شان میں بیان فرمائی گئی ہے:

بالمومنین رؤف الرحیم۔ کہ آپ مومنوں کے لیے مہربان اور رحم فرمانے والے ہیں (سورۃ توبہ) اور صحابہ

کرام کے لیے فرمایا گیا، رحماء بینھم، مگر الرحمن کا لفظ صرف اللہ کے ساتھ خاص ہے کسی اور کو رحمان نہیں کہا جا سکتا۔

(برہان القرآن۔علامہ قاری محمد طیب)

رحمن فعلان کے وزن پر مبالغہ یعنی سپر ڈگری (Super Degree) اور رحیم فعیل کے وزن پر اسم صفت مشبہ (۔۔لکھنا ہے) کے صیغے ہیں۔ اہل علم کے نزدیک رحمن کی صفت سب کے لیے ہے اور اللہ تعالیٰ کا رحیم ہونا صرف مومنوں کے لیے خاص ہے۔

الرحمن: لامتناہی اور رحمت مجسم کا ترجمان ہے اور لفظ "الرحیم "کائنات پر نازل ہونے والی مسلسل اور دائمی رحمت کی ترجمانی کرتا ہے۔

اس لحاظ سے معنٰی یہ ہوا کہ وہ "اللہ "بے انتہا مہربان 'ہمہ وقت اور ہر حال میں رحم فرمانے والا ہے۔ فرق یہ ہے کہ رحیم کسی مشفق شخصیت کو کہا جا سکتا ہے مگر کسی کو اللہ تعالیٰ کے علاوہ "الرحمن "کہنا بہت بڑا گناہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور رحیمیت کسی اضطرار اور مجبوری کی وجہ سے نہیں بلکہ یہ اس کی رحمانیت کا عین تقاضا ہے۔ اس صفت کا تذکرہ قرآن مجید میں مختلف الفاظ اور انداز میں پایا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان جس قدر سرکشی اور بغاوت پر اتر آئے لیکن جب اللہ کے حضور یہ کہتے ہوئے آب دیدہ ہوتا ہے کہ الٰہی! میرے جرائم اور خطاؤں کی آندھیوں نے میرے گلشن حیات کو برباد کر دیا ہے۔ جس طرح تو ویران وادیوں، تپتے ہوئے صحراؤں اور اجڑے ہوئے باغوں کو اپنے کرم کی بارش سے سرسبز و شاداب بنا دیتا ہے اسی طرح مجھے بھی حیات نو سے ہمکنار کر دے۔ بندہ مومن کی عاجزی اور سرافگندگی پر رحمن و رحیم کی رحمت کے سمندر میں ایک تلاطم برپا ہو جاتا ہے۔ جس کی وسعتوں کا تذکرہ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یوں فرمایا کرتے تھے کہ اللہ کی رحمت اس قدر وسیع و عریض ہے جیسے بحر بیکراں میں سوئی ڈبو کر نکال لی جائے تو اس سے سمندر کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ایسے ہی کائنات کے تمام جن وانس کی حاجات اور تمناؤں کو پورا کر دیا جائے تو اللہ تعالیٰ کی رحمت کے سمندر میں سوئی ڈبو کر باہر نکال لینے کے برابر بھی کمی واقع نہیں ہوتی۔ [رواہ مسلم: کتاب البر والصلۃ والآداب، باب تحریم الظلم]

اللہ تعالیٰ معافی اور درگزر سے کام لیتا ہے کیونکہ اس نے ابتدائے آفرینش سے لکھ رکھا ہے کہ میری رحمت میرے غضب پر غالب رہے گی۔ [رواہ البخاری: کتاب التوحید، باب قول اللہ تعالیٰ ویحذرکم اللہ نفسہ]

مومنوں کے لیے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ میری رحمت و شفقت ہر آن ان کے قریب رہتی ہے۔

(رَحۡمَتِيۡ وَسِعَتۡ كُلَّ شَيۡءٍ)[الأعراف:۱۵۶]

”میری رحمت تمام اشیاء پر محیط ہے۔“

(كَتَبَ رَبُّكُمۡ عَلٰى نَفۡسِهِ الرَّحۡمَةَ)[الأنعام:۵۴]

”تمہارے رب نے اپنے اوپر رحمت کو لازم کر لیا ہے۔“

(عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ(رض) قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ(صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) يَقُوْلُ لَنْ يُّدْخِلَ أَحَدًا عَمَلُهُ الْجَنَّةَ قَالُوْا وَلَآ أَنْتَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ لَا وَلَآ أَنَا إِلَّا أَنْ يَّتَغَمَّدَنِيَ اللّٰهُ بِفَضْلٍ وَّرَحْمَةٍ فَسَدِّدُوْا وَقَارِبُوْا وَلَا يَتَمَنَّيَنَّ أَحَدُكُمُ الْمَوْتَ إِمَّا مُحْسِنًا فَلَعَلَّهُ أَنْ يَّزْدَادَ خَيْرًا وَإِمَّا مُسِيْءًا فَلَعَلَّهُ أَنْ يَّسْتَعْتِبَ) [رواہ البخاری:کتاب المرضٰی،باب تمني المريض الموت]

”حضرت ابوہریرہ(رض) بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے سنا آپ فرماتے تھے کہ کسی کو اس کے عمل جنت میں داخل نہیں کریں گے۔ صحابہ کرام (رض) نے عرض کیا اے اللہ کے پاک نبی! آپ بھی نہیں؟ آپ نے فرمایاہاں! میں بھی نہیں سوائے اس کے کہ اللہ اپنے فضل ورحمت سے مجھے نواز دے۔ اس لیے میانہ روی اختیار کرو اور قریب قریب چلو۔ تم میں کوئی شخص موت کی تمنا نہ کرے کیونکہ وہ نیک ہو گا تو اس کے اعمال میں اضافہ ہو جائے گا۔ اگر وہ برا ہے تو ممکن ہے وہ توبہ کر لے۔ “

رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی دعا

(اَللّٰهُمَّ رَحْمَتَكَ أَرْجُو فَلَا تَكِلْنِيْ إِلٰى نَفْسِيْ طَرْفَةَ عَيْنٍ وَّأَصْلِحْ لِيْ شَأْنِيْ كُلَّهُ لَآ إِلٰهَ إِلَّآ أَنْتَ)

[رواہ ابوداؤد:کتاب الأدب،باب مايقول إذا أصبح]

”اے اللہ! میں تیری رحمت کا طلب گار ہوں مجھے آنکھ جھپکنے کے برابر بھی میرے نفس کے سپرد نہ کرنا اور میرے سب کاموں کی اصلاح فرما تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔“ (تفسیر فہم القرآن۔میاں محمد جمیل)

تمام تعریفوں کے لیے اللہ تعالیٰ کے استحقاق پر دلیل

''الحمدللہ ''میں الف لام یا استغراق کے لیے ہے یا جنس کے لیے ہے 'اگر یہ لام استغراق ہو تو اس کا معنی یہ ہے کہ ہر حامد کی ہر زمانہ میں ہر حمد اللہ کا حق ہے اور اس کے ساتھ خاص ہے 'اور اگر لام جنس کا ہو تو معنی یہ ہے کہ حمد کی ماہیت اور حقیقت اللہ کا حق اور اس کی ملک ہے 'اور یہ اس کی منافی ہے کہ حمد کا کوئی فرد اللہ کے غیر کے لیے ثابت ہو 'تو ہر دو طریقوں سے یہ معلوم ہوا کہ حمد صرف اللہ کا حق ہے کسی اور کا حق نہیں ہے 'کیونکہ تعریف کسی حسن اور کمال کی ہوتی ہے اور تمام محاسن اور کمالات کا مبدا اللہ تعالیٰ ہے تو ثابت ہوا کہ تمام تعریفات کا مستحق بھی اللہ تعالیٰ ہے۔ ''للہ ''میں لام 'یا اختصاص لائق کیلیے ہے یا ملک کے لیے ہے 'پہلی صورت میں معنی یہ ہے کہ تمام تعریفیں اللہ ہی کے لائق ہیں 'کیونکہ ہر چیز کو اس نے پیدا کیا ہے اور ہر چیز اس کے فضل اور احسان سے معمور ہے 'دوسری صورت میں معنی یہ ہے کہ تمام تعریفوں کا اللہ ہی مالک ہے کیونکہ ہر چیز ہر حال میں اللہ کی مملوک ہے تو جس حال میں وہ حمد کرتے ہیں اس حال میں بھی وہ اللہ کی مملوک ہیں 'لہٰذا وہ حمد بھی اللہ کی مملوک ہے۔اس کا معنی یہ ہے کہ اگر کوئی شخص بظاہر کسی پھول کی خوشبو کی تعریف کر رہا ہے 'یا کسی عالم کے علم کی تعریف کر رہا ہے تو وہ در حقیقت اللہ ہی کی تعریف ہے اور اسی ایک جملہ سے مخلوق پرستی کی جڑ کٹ جاتی ہے کیونکہ جو شخص سورج کی 'کسی نبی کی یا کسی دیوی اور دیوتا کی پرستش کرتا ہے وہ ان میں کسی خوبی اور کمال کو دیکھ کر ان کی پرستش کرتا ہے حالانکہ وہ کمال اور حسن ان کا اپنا ذاتی نہیں ہے اللہ تعالیٰ کا پیدا کیا ہوا اور اس کا عطا کردہ ہے اس لیے پرستش کا حق دار صاحب کمال نہیں ہے خالق کمال ہے۔

مخلوق کا شکر ادا کرنے پہلے خالق کا شکر ادا کیا جائے

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ کیا محسن شکریہ ادا کئے جانے کا مستحق نہیں ہے 'امام ابو داؤد روایت کرتے ہیں:
حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جو شخص لوگوں کو شکر ادا نہیں کرتا وہ اللہ کا شکر ادا نہیں کرتا۔ (سنن ابو داؤد ج ٢ ص ٣٠٦ 'مطبوعہ مطبع مجتبائی 'پاکستان لاہور '١٤٠٥ ھ)

اس کا جواب یہ ہے کہ ہر محسن اور ہر منعم کا شکر ادا کرنا چاہیے اور ہم اس سے منع نہیں کرتے ٬بلکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ ہر نعمت در حقیقت اللہ تعالیٰ سے ملتی ہے ٬اس لیے کسی منعم کے انعام اور کسی محسن کے احسان پر اس کی تعریف کرنے اور اس کا شکر ادا کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد کی جائے اور اس کا شکر ادا کیا جائے۔ کیونکہ ہر نعمت اور ہر احسان در حقیقت اللہ کی دی ہوئی نعمت اور اس کا احسان ہے ٬مثلاً کسی بھوکے شخص کو بھوک سے بلبلاتے دیکھ کر کوئی شخص اس کو کھانا کھلا دیتا ہے ٬بظاہر اس شخص کا احسان ہے ٬لیکن غور کیجئے اگر اللہ تعالیٰ کھانا ہی پیدا نہ کرتا تو وہ شخص بھوکے کو کیسے کھلاتا ٬یا کھانا تو پیدا کیا تھا لیکن اس شخص کے پاس کھانا خریدنے کے لیے پیسے نہ ہوتے تو کہاں سے کھلاتا ٬کھانا بھی ہوتا ٬اس کے حصول کے لیے پیسے بھی ہوتے لیکن اس کے دل میں بھوکے کو دیکھ کر رحم نہ پیدا ہوتا تو بھوکے کو کب کھلا سکتا تھا ٬یہ سب کچھ ہوتا لیکن بھوکے آدمی میں کھانے کی صلاحیت نہ ہوتی مثلاً اس کے منہ میں ناسور ہوتا ٬یا اوپر کا جبڑا نچلے جبڑے پر بیٹھ جانے کی وجہ سے اس کا منہ بند ہو گیا ہوتا تو وہ بھوکے کو کب کھلا سکتا تھا؟ تو نعمت بھی اس نے پیدا کی ٬نعمت کے حصول پر منعم کو قدرت بھی اس نے دی، نعمت دینے کے لیے منعم میں رحم کا جذبہ بھی اس نے پیدا کیا اور نعمت سے فائدہ اٹھانے کی منعم علیہ میں صلاحیت بھی اس نے پیدا کی ٬تو پھر حمد اور شکر کا کون مستحق ہو گا؟ اس لیے اولاً اسی کی حمد کی جائے اور اسی کا شکر ادا کیا جائے ٬اب یہ اس کا کرم ہے کہ اس نے ظاہری وسائل اور اسباب کو بھی نظر انداز نہیں کیا اور اس ظاہری منعم اور محسن کا بھی شکر ادا کرنا کا حکم دیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی کماحقہ حمد و ثنا سے مخلوق کا عاجز ہونا

اللہ تعالیٰ کی نعمتیں لامحدود ہیں ٬اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(آیت) "وان تعدوا نعمۃ اللہ لا تحصوھا"۔ (النحل:۱۸) اور اگر تم اللہ کی نعمتیں گنو تو انھیں گن نہ سکو گے۔

تو جب ہم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو گن نہیں سکتے تو ان کا شکر کیسے ادا کر سکتے ہیں؟ نیز اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی توفیق اور قدرت کے بغیر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا نہیں ہو سکتا ٬اس لیے جب انسان کسی نعمت پر شکر ادا کرے تو اس شکر ادا کرنے کی توفیق اور قدرت پر بھی شکر ادا کرے، پھر اس دوسرے شکر کی توفیق پر شکر ادا کرے اور یوں ساری عمر ختم ہونے کے باوجود اس کی کسی ایک نعمت کا شکر ادا نہیں ہو سکتا "" تفسیر کبیر "" میں منقول ہے کہ حضرت داؤد (علیہ السلام) نے اللہ

تعالیٰ سے یہی عرض کیا کہ خدایا! میں تو تیری ایک نعمت کا بھی شکر ادا نہیں کر سکتا کجا غیر متناہی نعمتوں کا شکر ادا کیا جائے ' اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے داؤد! جب تم نے یہ جان لیا کہ تم ہماری نعمتوں کا شکر ادا کرنے سے عاجز ہو تو ہمارا شکر ادا ہو گیا ' بس تم اپنی قدرت اور طاقت کے مطابق ہمارا شکر ادا کرتے رہو!

ایک قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ازل میں علم تھا کہ بندے اس کی حمد کرنے سے عاجز ہیں اور اس کی استاعت نہیں رکھتے ' اس لیے اللہ تعالیٰ نے خود اپنی حمد کی اور فرمایا (آیت) " الحمد للہ رب العلمین " رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے بڑھ کر اللہ کی ذات وصفات اور اس کی نعمتوں کا عارف ' اور اس کی حمد وثناء میں رطب اللسان رہنے والا کون ہو سکتا ہے! اس کے باوجود آپ بارگاہ الہیہ میں عرض کرتے ہیں: " لا احصی ثناء علیک انت کما اثنیت علی نفسک ' میں تیری ایسی ثنا نہیں کر سکا جیسی ثنا تو خود اپنی کرتا ہے " (صحیح مسلم ج ۱ ص ۱۹۲ ' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع ' کراچی ' ۱۳۷۵ ھ)

اللہ کی حمد کرنے کے احوال اور اوقات

امام ابو داؤد (رح) روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جس کلام کی ابتداء " الحمد للہ " سے نہیں کی جائے گی وہ ناتمام رہے گا۔ (سنن ابو داؤد ج ۲ ص ۳۰۹ ' مطبوعہ مطبع مجتبائی ' پاکستان ' لاہور ۱۴۰۵ ھ)

امام ابن ماجہ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جس مہتم بالشان کام کی ابتداء " الحمد للہ " سے نہیں کی گئی وہ ناتمام رہے گا۔ (سنن ابن ماجہ ص ۱۳۵، مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب، کراچی)

امام احمد (رح) روایت کرتے ہیں:

حضرت سعد بن ابی وقاص (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: مجھے تعجب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مومن کا کیسا نصیب رکھا ہے! اس کو اگر بھلائی پہنچتی ہے تو اپنے رب کی حمد کرتا ہے اور اس کا شکر ادا کرتا ہے اور اگر اس کو مصیبت پہنچتی ہے تو اپنے رب کی حمد کرتا ہے اور صبر کرتا ہے۔

(مسند احمد ج ۲ ص ۱۸۲۔۱۷۷۔۱۷۳ 'مطبوعہ مکتب اسلامی 'بیروت '۱۳۹۸ھ)

امام ترمذی (رح) روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوموسی اشعری (رض) روایت کرتے ہیں کہ رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جب ایک بندہ کا بچہ فوت ہوتا ہے تو ہے تو اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرماتا ہے: تم نے میرے بندہ کا بچہ اٹھالیا؟ وہ کہتے ہیں: ہاں! اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: تم نے اس کے دل کا ٹکڑا اٹھالیا 'وہ کہتے ہیں: ہاں! اللہ فرماتا ہے: میرے بندہ نے کیا کیا؟ وہ کہتے ہیں تیری حمد کی اور " اناللہ وانا الیہ راجعون " پڑھا 'اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: میرے بندہ کے لیے جنت میں ایک گھر بنادو اور اس کا نام بیت الحمد رکھ دو۔ (جامع ترمذی ص ۱۶۶ 'مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب 'کراچی)

اس حدیث کو امام احمد (رح) نے بھی روایت کیا ہے۔ (مسند احمد ج ۴ ص ۴۱۵ 'مطبوعہ مکتب اسلامی 'بیروت '۱۳۹۸ھ)

امام ترمذی (رح) روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوسعید (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جب کھاتے یا پیتے تو دعا کرتے: تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے ہم کو کھلایا اور پلایا اور مسلمان بنایا۔ (جامع ترمذی ص ۴۹۹ 'مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب 'کراچی)

حضرت معاذ بن انس (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جس شخص نے کھانا کھا کر کہا: تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں 'جس نے مجھے یہ کھانا کھلایا اور مجھ کو بغیر کوشش اور طاقت کے یہ رزق دیا 'تو اس کے تمام پچھلے گناہ معاف کردیئے جائیں گے۔

(جامع ترمذی ص ۴۹۹ 'مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب 'کراچی)

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت ابو سعید خدری (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فرماتے تھے: جب تم میں سے کوئی شخص اپنا پسندیدہ خواب دیکھے تو وہ اللہ کی طرف سے ہے اور اس پر "الحمد للہ" کہے۔

(صحیح بخاری ج ۲ ص ۱۰۳۴ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع 'کراچی '۱۳۸۱ھ)

حضرت ابو ہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جب تم میں سے کسی شخص کو چھینک آئے تو وہ "الحمد للہ" کہے۔

(صحیح بخاری ج ۲ ص ۹۱۹ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع 'کراچی '۱۳۸۱ھ)

امام ترمذی روایت کرتے ہیں:

حضرت حذیفہ بن یمان (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جب سونے کا ارادہ کرتے تو دعا کرتے: اے اللہ! میں تیرے نام سے مرتا ہوں اور زندہ ہوتا ہوں اور جب بیدار ہوتے تو دعا کرتے: تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے میرے نفس پر موت وارد کرنے کے بعد اس کو زندہ کیا 'اور اس کی طرف اٹھنا ہے۔

(جامع ترمذی ص ۴۹۲ 'مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب 'کراچی)

امام احمد روایت کرتے ہیں:

حضرت انس (رض) کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جب کسی ٹیلے یا کسی بلندی پر چڑھتے تو فرماتے: اے اللہ! ہر بلندی سے زیادہ بلندی تیری لیے ہے 'اور ہر حمد سے بالا حمد تیرے لیے ہے۔

(مسند احمد ج ۲ ص ۱۲۷ 'مطبوعہ مکتب اسلامی 'بیروت '۱۳۹۸ھ)

اللہ کی حمد کی فضیلت اور اجر و ثواب

امام مسلم روایت کرتے ہیں:

حضرت ابو مالک اشعری (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: پاکیزگی نصف ایمان ہے " 'الحمد للہ "میزان کو بھر دیتا ہے اور "سبحان اللہ "اور "الحمد للہ "آسمان اور زمین کے درمیان کو بھر دیتے ہیں۔ (صحیح مسلم ج ۱ ص ۱۱۸ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع 'کراچی '۱۳۷۵ھ)

یعنی "الحمدللہ "یا اس کے اجر کو اگر مجسم کیا جائے تو اس سے میزان بھر جائے گی ""سبحان اللہ "سے مراد اللہ کی تنزیہہ ہے اور "الحمدللہ "سے مراد اس کی ثناء ہے گویا آسمان اور زمین کے درمیان ہر چیز اللہ تعالیٰ کے نقص سے بری ہونے اور اس کی تعریف اور ثناء پر دلالت کرتی ہے۔

امام احمد روایت کرتے ہیں:

حضرت سمرہ (رض) روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: قرآن کے بعد چار کلام افضل ہیں اور وہ بھی قرآن سے ہیں ' تم ان میں جس سے بھی ابتداء کرو کوئی مضائقہ نہیں ہے "سبحان اللہ ' الحمدللہ ' لا الہ الا اللہ "اور "اللہ اکبر"۔

(مسند احمد ج ۵ ص ۲۰ ج ۴ ص ۳۶ ' مطبوعہ مکتب اسلامی ' بیروت ' ۱۳۹۸ھ)

امام ترمذی روایت کرتے ہیں:

عمرو بن شعیب اپنے باپ سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جس نے سو مرتبہ صبح اور سو مرتبہ شام کو "سبحان اللہ "کہا اس نے گویا سو حج کئے اور جس نے سو مرتبہ صبح اور سو مرتبہ شام کو "الحمدللہ "کہا اس نے گویا جہاد فی سبیل اللہ کے لیے سو گھوڑے مہیا کئے۔

(جامع ترمذی ص ۵۰۰ ' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب ' کراچی)

امام ابن جریر اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس (رض) نے کہا: "الحمدللہ "شکر ہے ' اللہ کی فرمان برداری کرنا ہے اور اس کی نعمت اور ہدایت کا اقرار کرنا ہے۔ (جامع البیان ' مطبوعہ دارالمعرفتۃ بیروت ' ۱۴۰۹ھ)

نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جب تم کہتے ہو: (آیت) "الحمدللہ رب العلمین "تو تم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہو اور وہ تم کو زیادہ نعمت دے گا۔ (جامع البیان ج ا ص ۴۶ ' مطبوعہ دارالمعرفتۃ بیروت ' ۱۴۰۹ھ)

علامہ قرطبی (رح) بیان کرتے ہیں:

امام مسلم (رح) حضرت انس بن مالک (رض) سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اللہ تعالیٰ بندہ کی اس بات سے خوش ہوتا ہے کہ وہ کچھ کھائے تو اللہ کی حمد کرے اور کچھ پیے تو اللہ کی حمد کرے۔

حسن بصری (رح) نے کہا: ہر نعمت کی بہ نسبت "الحمدللہ" کہنا افضل ہے۔

امام ابن ماجہ (رح) نے حضرت انس بن مالک (رض) سے روایت کیا ہے کہ جب کوئی بندہ اللہ کی دی ہوئی کسی نعمت پر "الحمدللہ" کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو اس سے افضل نعمت عطا فرماتا ہے۔

"نوادر الاصول" میں حضرت انس بن مالک (رض) کی نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے ایک روایت ہے جس کا خلاصہ یہ ہے: اگر کسی کو تمام دنیا دے دی جائے 'پھر اس کو ""الحمدللہ" کہنے کی توفیق دی جائے تو "الحمدللہ" کہنے کی نعمت تمام دنیا سے افضل ہے۔ (الجامع الاحکام القرآن ج ١ ص ١٣١ مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو ایران)

خود اپنی حمد وثنا کرنے کی شرعی نوعیت

جس طرح کبریائی صرف اللہ تعالیٰ کو زیبا ہے اور انسان کے لیے تکبر کرنا حرام ہے 'اسی طرح انسان کا عیوب سے اپنی تنزیہہ اور محاسن سے خود اپنی حمد وثناء کرنا مکروہ اور ناپسندیدہ ہے 'کیونکہ تسبیح اور تنزیہہ اور حمد وثنا اللہ تعالیٰ ہی کی شان ہے 'اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے خودستائی سے منع فرمایا ہے اور اس کو ناپسندیدہ قرار دیا ہے۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(آیت) "فلا تزکوا انفسکم ھو اعلم بمن اتقی"۔ (النجم: ٣٢) خودستائی نہ کرو 'پرہیزگاروں کو وہی زیادہ جانتا ہے۔

تزکیہ کا معنی ہے: عیوب اور قبائح سے منزہ کرنا یعنی نہ عیوب سے اپنی برأت بیان کرو نہ اپنے محاسن بیان کرو۔

علامہ آلوسی اس آیت کے شان نزول میں لکھتے ہیں:

یہ آیت ان مسلمانوں کے حق میں نازل ہوئی ہے جو نیک اعمال کرتے 'پھر اپنی نمازوں 'اور حج کا ذکر کرتے تھے۔

(روح المعانی ج ٢٧ ص ٦٤ 'مطبوعہ داراحیاء التراث العربی 'بیروت)

علامہ قرطبی (رح) نے لکھا ہے کہ جب یہود و نصاری نے اپنی تعریف کی اور یہ کہا: "نحن ابناء اللہ واحباءہ "ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں اور بعض روایات میں ہے کہ یہودیوں نے کہا: ہم بچوں کی طرح گناہوں سے پاک ہیں تو یہ آیت نازل ہوئی:

(آیت) "الم تر الی الذین یزکون انفسھم بل اللہ یزکی من یشآء' (النساء:۴۹) کیا آپ نے ان کو نہیں دیکھا جو اپنی پاکیزگی کا دعوی کرتے ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے پاکیزہ بنا دیتا ہے۔

(الجامع الاحکام القرآن ج ۵ ص ۲۴۶ 'مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو ایران' ۱۳۸۷ ھ)

امام مسلم روایت کرتے ہیں:

ابن عطا کہتے ہیں: میں نے اپنی بیٹی کا نام برہ (نیکوکارہ) رکھا 'مجھ سے حضرت زینب بنت ابی سلمہ نے کہا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس نام منع فرمایا ہے 'میرا نام پہلے برہ تھا (یعنی نیکی کرنے والی) تو میرا نام زینب رکھا گیا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تم خود ستائی نہ کرو 'اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ تم میں سے نیکی کرنے والا کون ہے 'صحابہ (رض) نے پوچھا: پھر ہم اس کا کیا نام رکھیں ؟ آپ نے فرمایا: اس کا نام زینب رکھو۔

(صحیح مسلم ج ۲ ص ۸۰۲ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع 'کراچی' ۱۳۷۵ ھ)

قرآن مجید کی ان آیات اور اس حدیث سے یہ واضح ہوگیا کہ انسان کا خود اپنی تعریف اور حمد و ثنا کرنا اور اپنے آپ کو عیوب اور قبائح سے بری اور پاک دامن کہنا 'اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے نزدیک ناپسندیدہ ہے 'تسبیح اور تنزیہہ اور حمد و ثنا صرف اللہ تعالیٰ ہی کو زیبا ہے 'وہی ہر عیب اور نقص سے پاک ہے اور وہی تمام خوبیوں اور کمالات کا جامع ہے اور وہی تمام تعریفوں اور حمد و ثنا کا مستحق ہے۔

تاہم اگر کسی غرض صحیح کی وجہ سے انسان اپنی تعریف کرے تو یہ جائز ہے جیسے حضرت عثمان (رض) نے باغیوں کے سامنے اپنی تعریف و توصیف کی تاکہ وہ باغی بغاوت سے باز آجائیں اور ان پر اللہ کی حجت تمام ہوجائے۔

امام ترمذی (رح) روایت کرتے ہیں:

ابوعبدالرحمن سلمی بیان کرتے ہیں کہ جب حضرت عثمان (رض) کا محاصرہ کرلیا گیا تو انھوں نے اپنے گھر کی چھت سے ان کی طرف متوجہ ہو کر کہا: میں تمہیں اللہ کی قسم دے کر یاد دلاتا ہوں کہ جب جبل حراء ہلنے لگا تو رسول اللہ

(صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اے حراء! پر سکون ہو جا! کیونکہ تجھ پر صرف نبی ہے یا صدیق ہے یا شہید ہے ' باغیوں نے کہا: ہاں! آپ نے کہا: میں تمہیں اللہ کی قسم دے کر یاد دلاتا ہوں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) غزوہ تبوک لیے یہ فرمایا تھا 'اس کے لیے کون مقبول خرچ مہیا کرتا ہے؟ اس وقت مسلمان سخت مشکل اور تنگ دستی میں تھے تو میں نے اس لشکر کے لیے زاد راہ مہیا کیا 'باغیوں نے کہا: ہاں! پھر آپ نے کہا: میں تمہیں اللہ کی قسم دے کر یاد دلاتا ہو کیا تمہیں علم ہے کہ چاہ رومہ (ایک کنواں) سے صرف قیمت دے کر پینے کے لیے پانی حاصل کیا جاتا تھا 'میں نے اس کنویں کو خرید کر امیروں 'غریبوں اور مسافروں کے لیے وقف کر دیا 'باغیوں نے کہا: ہاں! اس کے علاوہ اور بہت سی نیکیاں حضرت عثمان (رض) نے گنوائیں۔ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

(جامع ترمذی ص ۵۳۱۔ ۵۳۰ 'مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب 'کراچی)

نیز امام ترمذی (رح) روایت کرتے ہیں:

ثمامہ بن حزن قشیری بیان کرتے ہیں کہ حضرت عثمان (رض) نے باغیوں کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا: میں تم کو اللہ کی اور اسلام کی قسم دیتا ہوں کیا تم کو علم ہے کہ جب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مدینہ میں آئے تو چاہ رومہ کے سوا اور کوئی میٹھے پانی کا کنواں نہیں تھا 'تو رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: کوئی ہے جو چاہ رومہ کو خرید کر مسلمانوں کے لیے وقف کر دے؟ اور اس نیکی کے عوض میں جنت لے لے! میں نے اس کنویں کو خالص اپنے مال سے خریدا اور آج تم مجھ کو اس کنویں کا پانی پینے نہیں دیتے! حتی کہ میں سمندر کا کھارا پانی پی رہا ہوں! باغیوں نے کہا: ہاں! آپ نے فرمایا: میں تم کو اللہ کی اور اسلام کی قسم دیتا ہوں کیا تم کو علم ہے کہ مسجد نبوی میں جگہ کم تھی تو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: کوئی ہے جو فلاں شخص سے زمین خرید کر اس مسجد کو وسیع کرے؟ اور اس نیکی کے عوض جنت لے لے! پھر اس جگہ کو میں نے اپنے خالص مال سے خریدا تھا اور آج تم مجھے اس میں دو رکعت نماز پڑھنے نہیں دیتے! باغیوں نے کہا: ہاں! آپ نے فرمایا: میں تم کو اللہ کی اور اسلام کی قسم دیتا ہوں کیا تم کو علم ہے کہ غزوہ تبوک کے لیے میں نے اپنے مال سے خرچ مہیا کیا تھا 'انھوں نے کہا: ہاں! آپ نے پھر فرمایا میں تم کو اللہ کی اور اسلام کی قسم دیتا ہوں کیا تم کو علم ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مکہ میں جبل ثبیر پر کھڑے ہوئے اور آپ کے ساتھ حضرت ابو بکر (رض)، حضرت عمر (رض)، تھے اور میں تھا 'اس وقت پہاڑ ہلنے لگا 'حتی کہ اس کے

پتھر نیچے گرنے لگے 'تو آپ نے اس پر اپنا پیر مارا اور فرمایا: اے ثبیر! ساکن ہو جا! تجھ پر نبی ہے 'صدیق ہے اور دو شہید ہیں 'باغیوں نے کہا: ہاں! آپ نے تین بار فرمایا: اللہ اکبر! خدا کی قسم ان باغیوں نے میرے حق میں گواہی دے دی اور میں شہید ہوں۔ (جامع ترمذی ص ۵۳۱ 'مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب 'کراچی)

حضرت عثمان (رض) نے باغیوں کے سامنے اپنی حمد و ثناء اس لیے کی تھی کہ یہ باغی اسلام کے لیے حضرت عثمان (رض) کی خدمات اور بارگاہ رسالت میں ان کے مقام کو پہچان کر بغاوت سے باز آجائیں 'تو ایسی کوئی غرض صحیح ہو مثلا غاصبوں کے سامنے اپنا استحقاق ثابت کرنے کے لیے یا محض اللہ تعالیٰ کے انعامات بیان کرنے کے لیے اپنی تعریف کی جائے اور اس سے اپنی بڑائی کا اظہار کرنا مقصود نہ ہو تو پھر اپنی تعریف کرنا جائز ہے اور اگر حمد و ثنا سے اپنی بڑائی کا اظہار کرنا مقصود ہو تو اس کے حرام ہونے میں کوئی شک نہیں 'حمد و ثناء اور کبریائی صرف اللہ تعالیٰ کا حق ہے اور اسی کو زیبا ہے۔

کسی دوسرے شخص کے سامنے اس کی حمد و ثنا کرنے کی شرعی نوعیت

جس طرح بغیر کسی غرض صحیح کے خود اپنی تعریف کرنا مکروہ اور ناپسندیدہ ہے اسی طرح کسی غرض صحیح کے بغیر کسی دوسرے شخص کے سامنے اس کی تعریف کرنا بھی مکروہ اور ناپسندیدہ ہے۔

امام مسلم (رح) روایت کرتے ہیں:

حضرت ابو بکر (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سامنے ایک شخص نے کسی کی تعریف کی 'آپ نے فرمایا: تم پر افسوس ہے تم نے تو اپنے صاحب کی گردن کاٹ دی 'یہ جملہ آپ نے کئی بار فرمایا: جب تم میں سے کسی شخص نے اپنے صاحب کی لامحالہ تعریف کرنی ہو 'تو یوں کہو کہ میرا فلاں کے متعلق یہ گمان ہے اور اس کو حقیقت میں اللہ ہی جاننے والا ہے 'اور میں کسی کو اللہ کے نزدیک سراہا ہوا نہیں کہتا 'خواہ وہ اس کے متعلق اسی طرح جانتا ہو۔

حضرت ابو بکر (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سامنے ایک شخص کا ذکر کیا گیا 'ایک شخص نے کہا: یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بعد کوئی شخص فلاں

فلاں چیز میں اس سے افضل نہیں ہے۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: تم پر افسوس ہے! تم نے اپنے صاحب کی گردن کاٹ دی۔ یہ جملہ آپ نے کئی بار فرمایا ' پھر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اگر تم میں سے کسی شخص نے خواہ مخواہ اپنے بھائی کی تعریف کرنی ہو ' تو یہ کہے: میرا فلاں کے متعلق یہ گمان ہے خواہ وہ اس کو اسی طرح سمجھتا ہو اور وہ یہ نہ کہے کہ وہ اللہ کے نزدیک ایسا ہی ہے۔

(صحیح مسلم ج ۲ ص ۴۱۴ ' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع ' کراچی ' ۱۳۷۵ھ)

ان احادیث میں کسی شخص کے سامنے اس کی تعریف سے منع کیا گیا ہے اور بعض احادیث سے اس کا جواز بھی ثابت ہے ' امام بخاری (رح) روایت کرتے ہیں:

حضرت ابو سعید خدری (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے خطبہ میں فرمایا کہ اللہ سبحانہ نے ایک بندے کو دنیا اور اس کے پاس ہے ' اس کے درمیان اختیار دیا تو اس نے اس چیز کو اختیار کرلیا تو اللہ کے پاس ہے ' حضرت ابوبکر (رض) یہ سن کر رونے لگے ' حضرت ابو سعید (رض) کہتے ہیں: میں نے دل میں سوچا: اگر اللہ نے ایک بندے کو دنیا اور جو اس کے پاس ہے اس کے درمیان اختیار دے دیا ہے اور اس نے جو اللہ کے پاس ہے اس کو پسند کرلیا تو اس بوڑھے کو کیا چیز رلاتی ہے؟ لیکن آپ کے اس ارشاد میں بندے سے مراد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تھے اور حضرت ابوبکر (رض) ہم سب سے زیادہ عالم تھے، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اے ابوبکر! بیشک اپنی صحبت اور مال سے مجھ پر سب سے زیادہ احسان کرنے والے ابوبکر ہیں ' اور اگر میں اپنی امت میں سے کسی کو خلیل بناتا تو ابوبکر (رض) کو بناتا لیکن اسلام کی اخوت اور محبت قائم رہے گی ' اور ابوبکر کے دروازے کے سوا مسجد میں (کھلنے والا) ہر دروازہ بند کردیا جائے ' باقی نہ رکھا جائے۔

(صحیح بخاری ج ۱ ص ' ۵۱۶۔ ۶۷ مطبوعہ نور محمد اصح المطابع ' کراچی ' ۱۳۸۱ھ)

اس حدیث کو امام ترمذی نے بھی روایت کیا ہے۔

(جامع ترمذی ص ۵۲۶۔ ۵۲۵ ' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب ' کراچی)

نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت ابوبکر (رض) ' حضرت عمر (رض) اور حضرت عثمان (رض) کے سامنے بھی ان کی تعریف کی ہے۔

امام ترمذی (رح) روایت کرتے ہیں:۔

حضرت انس بن مالک (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ' حضرت ابو بکر (رض)، حضرت عمر (رض) اور حضرت عثمان (رض) احد (پہاڑ) پر چڑھے ' وہ ہلنے لگا ' آپ نے فرمایا: اے احد ساکن ہو جا ' تجھ پر صرف نبی " صدیق اور دو شہید ہیں۔

(جامع ترمذی ص ۵۳۰ ' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب ' کراچی)

اور آپ نے حضرت علی (رض) کے سامنے بھی ان کی تعریف کی ہے، امام ترمذی (رح) روایت کرتے ہیں:

حضرت جابر بن عبداللہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت علی (رض) سے فرمایا: تم میرے لیے ایسے ہو جیسے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے لیے ہارون (علیہ السلام) تھے مگر میرے بعد کوئی نبی نہیں ہو گا۔ (جامع ترمذی ص ۵۳۵ ' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب ' کراچی)

منہ پر تعریف کرنے کے جواز اور عدم جواز کا محمل

امام مسلم نے ایسی احادیث ذکر کی ہیں جن میں کسی کے سامنے اس کی تعریف کرنے سے منع کیا گیا ہے ' جبکہ " معجم طبرانی " میں ایسی روایات ہیں جن میں کسی کے سامنے تعریف کرنے کی اجازت ہے اور صحاح ستہ میں بکثرت ایسی روایات ہیں جن میں خود رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بعض صحابہ کے سامنے ان کی تعریف کی ہے ' اس لیے علماء کرام نے ان احادیث میں یہ تطبیق دی ہے کہ اگر کسی کے سامنے اس کی تعریف کرنے سے اس کے فتنہ میں مبتلا ہونے کا خدشہ ہو تو پھر اس کے سامنے اس کی تعریف نہ کی جائے اور اگر یہ خدشہ نہ ہو تو پھر اس کے سامنے اس کی تعریف جائز ہے۔

علامہ یحییٰ بن شرف نووی (رح) لکھتے ہیں:

امام مسلم (رح) نے وہ احادیث ذکر کی ہیں جن میں کسی کے منہ پر تعریف کرنے سے منع کیا گیا ہے ' صحیح بخاری ' صحیح مسلم اور بکثرت کتب حدیث میں ایسی روایات بھی ہیں جن میں منہ پر تعریف کی گئی ہے ' ان احادیث میں تطبیق اس طرح ہے کہ کسی کی بے جا تعریف کرنا یا تعریف میں مبالغہ کرنا ' یا دنیاوی طمع کی وجہ سے تعریف کرنا یا جس کے

متعلق یہ اندیشہ ہے کہ وہ تعریف سن کر اکڑ جائے گا یا تکبر میں مبتلا ہو جائے گا 'اس کے منہ پر تعریف کرنا منع نہیں ہے 'اور جس شخص کے کمال تقوی اور عقل میں پختگی کی وجہ سے یہ خدشہ نہ ہو اس کے منہ پر تعریف کرنا منع نہیں ہے 'بشرطیکہ وہ بے جا تعریف نہ ہو اور دنیاوی طمع کی وجہ سے نہ ہو 'بلکہ اگر کسی دینی مصلحت کی وجہ سے تعریف کی جائے یا کسی شخص میں کسی نیک خصلت کے حصول یا اس کی زیادتی کے لیے یا اس کو اس نیک خصلت پر برقرار رکھنے کے لیے یا اس نیک خصلت کی اقتداء کے لیے اس کے منہ پر تعریف کی جائے تو یہ تعریف کرنا مستحب ہے۔(شرح مسلم ج ۲ ص ۴۱۴ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع 'کراچی '۱۳۷۵ھ)

علامہ ابن حجر عسقلانی (رح) لکھتے ہیں:

علامہ ابن بطال نے کہا ہے کہ ممانعت کا خلاصہ یہ ہے کہ جو شخص کسی کی ان اوصاف کے ساتھ تعریف کرے گا جو اس میں نہ ہوں تو ہو سکتا ہے کہ وہ شخص اپنے متعلق ان اوصاف کا یقین کر لے اور ان اوصاف پر اعتماد کر کے وہ شخص اپنے اعمال ضائع کر دے اور نیکی کی جدوجہد کرنا چھوڑ دے (مثلا ایک شخص کسی سے کہے: میں نے تم کو خواب میں بارگاہ رسالت میں دیکھا ہے۔ اور تمہارے جنتی ہونے کی بشارت سنی ہے یا کہے کہ میں نے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے یہ سنا ہے کہ جو تمہارے ہاتھ پر بیعت کرے گا وہ جنتی ہو گا 'یا جو تمہارے وعظ میں شریک ہو گا وہ جنتی ہو گا۔ (العیاذ باللہ) اس لیے جس حدیث میں یہ ہے کہ تعریف کرنے والوں کے منہ میں مٹی ڈال دو 'اس کا مطلب یہ ہے کہ جھوٹی تعریف کرنے والوں کے منہ میں مٹی ڈال دو اور جس شخص نے ان اوصاف کے ساتھ تعریف کی جو موصوف میں موجود ہوں تو وہ اس حکم میں داخل نہیں ہے، کیونکہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سامنے بعض صحابہ (رض) نے اپنے اشعار اور خطاب میں آپ کی تعریف کی اور آپ نے ان کے منہ میں مٹی نہیں ڈالی۔

علامہ ابن بطال کا کلام ختم ہوا

امام مسلم (رح) نے روایت کیا ہے کہ کسی شخص نے حضرت عثمان (رض) کے سامنے ان کی تعریف کی تو حضرت مقداد (رض) نے اس کے منہ پر کنکریاں پھینکیں اور مذکور الصدر حدیث سے استدلال کیا 'اس حدیث کا دوسرا محمل یہ ہے کہ منہ پر مٹی ڈالنے کا مطلب ہے اس کو ناکام اور نامراد کرنا یعنی جھوٹی تعریف کرنے والے کی غرض اور مقصد کو پورا نہ کرو 'تیسری توجیہ یہ ہے کہ اس سے کہو: تمہارے منہ میں مٹی 'چوتھی توجیہ یہ ہے کہ ممدوح اور موصوف

اس جھوٹی تعریف سے دھوکا نہ کھائے اور تعریف کرنے والے سے کہے: تم غلط کہہ رہے ہو میں ایسا نہیں ہوں ' اور یہ اس کے منہ میں مٹی ڈالنا ہے ' پانچویں توجیہ یہ ہے کہ وہ شخص جس مقصد اور غرض سے تعریف کررہا ہے اس کا وہ مقصد پورا کر کے اس کا منہ بند کر دیا جائے اور اس کو روانہ کر دیا جائے ' مثلا کوئی شخص کسی سے کچھ رقم مانگنے کے لیے اس کی بے جا تعریف کررہا ہے تو وہ اس کو وہ رقم دے کر کہے: یہ رقم لو اور جاؤ ' اور یہ اس کے منہ کو بند کرنا ہے جو اس کے منہ میں مٹی ڈالنے کے مترادف ہے ' علامہ بیضاوی (رح) اور علامہ طیبی (رح) نے اسی توجیہ کو اختیار کیا ہے۔

امام غزالی نے "احیاء العلوم " میں لکھا ہے کہ مدح کی آفت یہ ہے کہ مدح کرنے والا کبھی جھوٹ بولتا ہے اور کبھی اپنی مدح سے ممدوح کو مزید برائی میں مبتلا کرتا ہے ' خصوصا جب وہ فاسق یا ظلم کی مدح کرے ' امام ابویعلی (رح) نے حضرت انس (رض) سے روایت کیا ہے کہ جب فاسق کی مدح کی جائے تو اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہے ' اور کبھی وہ ایسی تعریف کرتا ہے جو اس کے نزدیک متحقق نہیں ہوتی، اور جس شخص کی مدح کی جائے وہ اس خطرہ سے خالی نہیں ہے کہ وہ اترانے لگے یا تکبر کرے یا تعریف کی شہرت پر اعتماد کر کے عمل میں کمی کر دے ' اگر تعریف ان قباحتوں سے خالی ہو تو پھر اس میں حرج نہیں ہے، بلکہ بعض اوقات تعریف مستحب ہوتی ہے ' ابن عیینہ نے کہا: جو شخص اپنے نفس کو پہچانتا ہو اس کو کسی کی تعریف سے ضرر نہیں ہوتا اور بعض سلف نے کہا: جب کسی کے منہ پر تعریف کی جائے تو وہ دعا کرے: اے اللہ! میرے ان کاموں کو بخش دے جن کو یہ لوگ نہیں جانتے اور ان کی تعریف کی وجہ سے میری پکڑ نہ کر اور مجھے ان کے گمان سے بہتر بنا دے۔ (فتح الباری ج ١٠، ص ٤٧٨۔ ٤٧٧ ' مطبوعہ دارالکتب الاسلامیہ ' لاہور)

رب کا لغوی اور شرعی معنی

علامہ زبیدی لکھتے ہیں:

الرب اللہ عزوجل ہے ' اور وہ ہر چیز کا رب ہے ' یعنی ہر چیز کا مالک ہے ' اور تمام مخلوق اس کی ملک میں ہے ' اس کا کوئی شریک نہیں ہے اور وہ "رب الارباب " اور "مالك الملوك " ہے ' ابو منصور نے کہا: لغت میں مالک ' سید ' مدبر اور مہتمم پر رب کا اطلاق ہوتا ہے اور جب اس پر الف لام ہو (الرب) تو پھر اس کا اللہ عزوجل کے غیر پر اطلاق

نہیں ہوتا 'اور جب اللہ تعالیٰ کے غیر پر رب کا اطلاق کیا جائے تو پھر اس کی کسی چیز کی طرف اضافت کی جاتی ہے جیسے "رب الدار "(مکان کا مالک) 'حدیث میں علامات قیامت کے ذکر میں ہے: "ان تلد الامۃ ربھا "باندی اپنی مالکہ کو جنم دے گی "یعنی بہت زیادہ باندیاں ہوں گی، اور اذان کی دعا میں "اللھم رب ھذہ الدعوۃ 'اے اس نداء کے صاحب "اور حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت ہے کہ کوئی مملوک اپنے مالک کو میرا رب نہ کہے ' آپ نے اس کو ناپسند کیا کہ مالک کو رب قرار دے کر اس کو ربوبیت میں اللہ کے ساتھ شریک کیا جائے قرآن مجید میں ہے؛ "اذکرنی عند ربک "حضرت یوسف (علیہ السلام) نے قیدی سے کہا: تم اپنے رب کے سامنے میرا ذکر کرنا ' اور یہاں عزیز مصر پر رب کا اطلاق کیا ہے 'اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت یوسف (علیہ السلام) کا یہ کلام اس زمانہ اور ان لوگوں کے عرف کے مطابق تھا 'اس طرح نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے گم شدہ اونٹ کے متعلق فرمایا: " حتی یلقاھا ربھا "۔ اونٹ چرتا پھرے گا حتی کے اپنے رب (مالک) سے مل جائے گا "کیونکہ جانور عبادت کرتے ہیں نہ احکام کے مخاطب ہوتے ہیں 'بلکہ جانور مال ومتاع کے حکم میں ہیں اور جس طرح رب الدار وغیرہ کی اضافت جائز ہے اسی طرح ان کی طرف اضافت بھی جائز ہے 'اور حضرت یوسف (علیہ السلام) نے جو فرمایا تھا: (آیت) " انہ ربی احسن مثوای "۔ بیشک وہ عزیز مصر میرا صاحب ہے 'اس نے مجھے اچھی رہائش دی ہے۔ "یہاں بھی صاحب پر رب کا اطلاق ان کے عرف کے مطابق ہے 'یا اس سے مراد اللہ تعالیٰ ہے 'یعنی اللہ تعالیٰ نے مجھے اچھی رہائش دی ہے رب کی جمع ارباب اور ربوب ہے 'اور راسخ عالم 'یا عالم باعمل 'یا بہت بڑے عالم کو ربانی کہتے ہیں 'جب حضرت ابن عباس (رض) فوت ہوئے تو محمد بن حنفیہ (رح) نے کہا: آج اس امت کے ربانی فوت ہو گئے

(تاج العروس ج ۱ ص ۲۶۰ 'مطبوعہ المطبعۃ الخیریۃ 'مصر '۱۳۰۶ ھ)

العلمین کا لغوی اور عرفی معنی

علامہ زبیدی (رح) لکھتے ہیں:

عالم ' خاتم ' طابق اور دانق کے وزن پر ہے ' اس کا معنی ہے: کل مخلوق ' اس طرح صحاح میں ہے ' یا آسمان اور اس کے نیچے جو جواہر اور اعراض ہیں وہ عالم ہیں ' جس طرح خاتم مہر لگانے کا آلہ ہے اسی طرح عالم اسم آلہ ہے ' اس کا معنی ہے موجد کو جاننے کا آلہ ' حضرت جعفر صادق (رح) نے کہا: عالم کی دو قسمیں ہیں ' عالم کبیر اور عالم صغیر۔ آسمان اور جو کچھ اس کے اندر ہے وہ عالم کبیر ہے اور انسان عالم صغیرے اور انسان میں وہ سب کچھ ہے جو عالم کبیر میں ہے، ہمارے شیخ نے کہا ہے کہ مخلوق کو عالم اس لیے کہتے ہیں کہ وہ صانع پر علامت ہے ' بعض مفسرین نے کہا: عالم اس کو کہتے ہیں جس سے خالق کا علم حاصل ہو ' پھر بہ طور تغلیب جن اور انس میں سے عقلاء پر اس کا اطلاق کیا گیا ' یا جن اور انس پر انسان اور فرشتوں پر اور سید شریف کا مختار یہ ہے کہ اس کا اطلاق ہر جنس پر کیا جاتا ہے ' اور تمام اجناس کے مجموعہ پر بھی کیا جاتا ہے۔

زجاج نے کہا: عالم کا اس لفظ سے کوئی واحد نہیں ہے اور اس کے علاوہ اور کسی لفظ کی جمع واؤ اور نون (**عالمون یا عالمین**) کے ساتھ نہیں آتی "" بصائر " میں مذکور ہے کہ اس کی جمع اس لیے آتی ہے کہ موجودات کی ہر نوع ایک عالم ہے مثلا عالم انسان ' عالم نار ' وغیرہ اور روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دس ہزار سے زیادہ عالم پیدا کیے ہیں اور اس کی جمع سالم اس لیے آتی ہے کہ انسان بھی عالم کا ایک فرد ہے (ورنہ غیر ذوی العقول کی جمع ' جمع مکسر ہوتی ہے) ایک قول یہ ہے کہ اس کی جمع سالم اس لیے آتی ہے کہ اس سے مراد مخلوق کی اصناف میں سے صرف ملائکہ ' جن اور انس ہیں اور دوسرے غیر ذوی العقول یا غیر ذوی العلوم اس سے مراد نہیں ہیں ' یہ حضرت ابن عباس (رض) کا قول ہے ' جعفر صادق نے کہا: اس سے صرف انسان مراد ہے اور ہر انسان ایک عالم ہے ' میں کہتا ہوں کہ حضرت ابن عباس (رض) نے " **رب العلمین** " کی تفسیر میں کہا: " **رب الجن والانس** " اور قتادہ (رض) نے اس کی تفسیر میں کہا: تمام مخلوق کے رب ' ازہری نے کہا: حضرت عباس (رض) کے قول کی دلیل یہ آیت ہے: "**لیکون للعلمین نذیرا**" ۔ (الفرقان: ۱)

تاکہ آپ عالمین کے لیے نذیر ہو جائیں۔

اور سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جانوروں اور فرشتوں کے لیے نذیر نہیں ہیں حالانکہ وہ بھی اللہ کی مخلوق ہیں ' آپ صرف جن اور انس کے لیے مبعوث ہوئے ہیں ' اور وھب بن منبہ سے مروی ہے کہ کل اٹھارہ ہزار عالم ہیں اور یہ دنیا ان میں سے ایک عالم ہے۔ (تاج العروس ج ۸ ص ۴۰۷ ' مطبوعہ المطبعۃ الخیریۃ ' مصر ' ۱۳۰۶ھ)

علامہ قرطبی (رح) لکھتے ہیں:

حضرت ابوسعید خدری (رض) نے کہا: اللہ تعالیٰ نے چالیس ہزار عالم پیدا کئے اور یہ دنیا شرق سے غرب تک ایک عالم ہے ' مقاتل نے کہا: اسی ہزار عالم ہیں ' چالیس ہزار خشکی میں ہیں اور چالیس ہزار سمندر میں ' ابو العالیہ سے مروی ہے کہ جن ایک عالم ہے ' انس ایک عالم ہے ' ان کے سوا زمین کے چار زاویے ہیں اور ہر زاویہ میں پندرہ سو عالم ہیں۔ (الجامع الاحکام القرآن ج ۱ ص ۱۳۸ مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو ایران ' ۱۳۸۷ھ)

العلمین کے متعلق اقوال میں مصنف کا مختار

میں کہتا ہوں کہ ان تمام اقوال میں صحیح قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا ہر موجود عالم ہے اور مخلوق عالم میں شامل ہے، اور اس کی دلیل یہ ہے کہ قرآن مجید میں ہے:

(آیت) " قال فرعون وما رب العلمین قال رب السموت والارض وما بینھما ان کنتم موقنین۔ (الشعراء: ۲۴۔ ۲۳) فرعون نے کہا: رب العلمین کیا ہے؟ (موسیٰ (علیہ السلام) نے) کہا: وہ آسمانوں ' زمین اور ان کے درمیان ہر چیز کا رب ہے ' اگر تم یقین کرنے والے ہو۔

اس آیت میں یہ تصریح ہے کہ تمام آسمان ' زمینیں اور ان کے درمیان ہر چیز عالم ہیں ' اور اس کی جمع عالم کی انواع اور اصناف کے اعتبار سے لائی گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی تربیت میں غور و فکر

ایک بیج زمین میں گرا دیا جاتا ہے پھر زمین میں وہ پھول جاتا ہے 'پھولنے کے بعد وہ ہر طرف سے پھٹ سکتا تھا لیکن اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ کی وجہ سے وہ صرف اوپر اور نیچے سے پھٹتا ہے 'اوپر سے پھٹ کر اس میں سے ایک جز زمین کو پھاڑ کر نکلتا ہے اور درخت بن جاتا ہے 'اس میں شاخیں پھوٹتی ہیں 'پھر ان شاخوں میں پھول کھلتے ہیں اور پھل بنتے ہیں اور پھلوں میں چھلکا بنتا ہے 'مغز بنتا ہے اور مغز میں روغن ہوتا ہے 'اور بیج کے نیچے سے جو جز زمین کو پھاڑ کر نکلتا ہے وہ جڑ بنتی ہے اور زمین کی گہرائی میں راستہ بناتی ہوئی وہ جڑیں نکل جاتی ہیں اور مٹی اور پانی سے اپنی طبعی غذا حاصل کر کے پورے درخت کو پہنچاتی ہیں اور اس کو سرسبز اور شاداب رکھتی ہیں۔

باپ کی پشت سے ایک قطرہ نکل کر ماں کی رحم میں پہنچتا ہے 'پھر وہ قطرہ پہلے جما ہوا خون بن جاتا ہے 'پھر گوشت کا ٹکڑا 'پھر اس میں ہڈیاں 'رگیں اور مختلف اعضاء بنتے ہیں 'پھر ان میں الگ الگ اثرات کی قوتیں رکھی جاتی ہیں 'آنکھ میں دیکھنے کی کان میں سننے کی اور زبان میں گویائی کی قوت رکھی جاتی ہے تو سبحان ہے وہ جس نے ہڈی میں سماعت ' چربی میں بصارت اور گوشت کے ایک ٹکڑے میں گویائی رکھی!

ماں باپ کے دل میں ایسا جذبہ رکھا کہ انھوں نے اپنے سکھ اور آرام کو چھوڑ کر اس کی پرورش کی 'ماں کے سینے میں اس کے لیے دودھ اتارا اور باپ کے دل میں شفقت رکھی اور یوں تدریجا اس کو پالتا رہا 'تربیت کرتا رہا 'بڑھاتا رہا اور جب وہ اپنی نشو و نما کے کمال طبعی کو پہنچ کر بالغ ہو گیا 'اس کا شعور پختہ اور عقل کامل ہو گئی تب کہا: اب ہماری ان نعمتوں کا شکر ادا کرو 'ہمارے ان کمالات کی حمد و ثناء کرو جن کے نتیجہ میں تم اس کمال طبعی تک پہنچے ہو 'دیکھو! اس نے تمہارے چلنے کے لیے زمین بنائی ہے 'تمہارے سانس لینے کے لیے ہواؤں کے سمندر رواں دواں کئے ہوئے ہیں 'تمہارے پینے کیلیے آسمان سے پانی اتارا اور زمین کی تہوں میں چشمے جاری کیے 'تمہیں روشنی پہنچانے کے لیے دن بنایا 'تمہارے آرام کے لیے رات بنائی 'سورج کی حرارت سے تمہاری کھیتیاں پکتی ہیں اور چاند کی کرنوں سے ان میں ذائقہ پیدا ہوتا ہے 'کیا اللہ تعالیٰ کے ان تمام احسانوں اور نعمتوں کو دیکھنے اور غور کرنے کے بعد تمہارے دلوں میں اس کی حمد و ثنا کرنے اور اس کا شکر بجالانے کا کوئی جذبہ پیدا نہیں ہوتا!

کمال ذات ،گزشتہ احسان ،رجا اور خوف سے حمد و ثناء کا تقاضا"

دنیا میں انسان کسی شخص کی چار وجوہ سے تعریف کرتا ہے: یا اس لیے کہ وہ شخص اپنی ذات وصفات میں کامل ہے اور عیوب اور نقائص سے بری ہے ،خواہ اس نے اس انسان پر کوئی احسان کیا ہے یا نہیں ،وہ محض کمال ذات کی وجہ سے اس تعریف کرتا ہے ،دوسری وجہ یہ ہے کہ اس نے اس پر ماضی میں احسانات کیے ہیں اور انعامات دیے ہیں تو وہ ان گزشتہ احسانوں کی وجہ سے اس کی تعریف کرتا ہے ،تیری وجہ یہ ہے کہ وہ مستقبل میں اس سے انعامات کی توقع رکھتا ہے ،چوتھی وجہ یہ ہے کہ وہ اس کے غیظ و غضب اور اس کے قہر اور قدرت سے ڈر کر اس کی تعریف کرتا ہے ،تو گویا اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اگر تم کمال ذات کی وجہ سے کسی کی حمد و ثناء کرتے ہو تو میری ذات کامل ہے ،سو میری حمد کرو اور اس کی طرف "الحمد للہ" سے اشارہ ہے اور اگر گزشتہ نعمتوں کی وجہ سے حمد و ثناء کرتے ہو تو ساری نعمتیں میں نے دی ہیں ،میری تعریف کرو ،میں ہی (آیت) "رب العلمین "ہوں ،اور اگر مستقبل میں نعمتیں حاصل کرنے کے لیے تعریف کرتے ہو تو میں (آیت) "الرحمن الرحیم "ہوں ،سو میری حمد کرو اور اگر ڈر اور خوف کی وجہ سے حمد و ثنا کرتے ہو تب بھی میری حمد و ثنا کرو میں ہی "مالک یوم الدین "ہوں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: نہایت رحم فرمانے والا بہت مہربان ہے۔ (الفاتحہ: ۲)

بعض مفسرین کی فرو گزاشت

"بسم اللہ الرحمن الرحیم "کی تفسیر میں ہم "الرحمن الرحیم "کی تفسیر کو بیان کر چکے ہیں ،یہاں پر ہم بعض مفسرین کی ایک فرو گزاشت پر متنبہ کرنا چاہتے ہیں۔

سید ابو الاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں:

انسان کا خاصہ ہے کہ جب کوئی چیز اس کی نگاہ میں بہت زیادہ ہوتی ہے تو وہ مبالغہ کے صیغوں میں اس کو بیان کرتا ہے ،اور اگر ایک مبالغہ بول کر وہ محسوس کرتا ہے کہ اس شے کی فراوانی کا حق ادا نہیں ہوا ،تو پھر وہ اس معنی کا ایک اور لفظ بولتا ہے تاکہ وہ کمی پوری ہو جائے جو اس کے نزدیک مبالغہ میں رہ گئی ہے۔ اللہ کی تعریف میں رحمن کا لفظ استعمال کرنے کے بعد پھر رحیم کا اضافہ کرنے میں بھی یہی نکتہ پوشیدہ ہے۔ رحمان عربی زبان میں بڑے مبالغہ کا صیغہ

ہے لیکن خدا کی رحمت اور مہربانی اپنی مخلوق پر اتنی زیادہ ہے ' اس قدر وسیع ہے ' ایسی بے حد و حساب ہے کہ اس کے بیان میں بڑے سے بڑا مبالغہ لفظ بول کر بھی جی نہیں بھرتا ' اس لیے اس کی فراوانی کا حق ادا کرنے کے لیے پھر رحیم کا لفظ مزید استعمال کیا گیا۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ہم کسی شخص کی فیاضی کے بیان میں "سخی" کا لفظ بول کر جب تشنگی محسوس کرتے ہیں تو اس پر "داتا" کا اضافہ کرتے ہیں۔ رنگ کی تعریف میں جب "گورے" کو کافی نہیں پاتے تو اس پر "چٹے" کا لفظ اور بڑھا دیتے ہیں۔ درازی قد کے ذکر میں جب "لمبا" کہنے سے تسلی نہیں ہوتی تو اس کے بعد "تڑنگا" بھی کہتے ہیں۔ (تفہیم القرآن ج ۱ ص ۴۴ 'مطبوعہ ادارہ ترجمان القرآن ' لاہور '۱۹۸۳ء)

ہمارے شیخ علامہ سید احمد سعید کاظمی قدس سرہ العزیز نے اس پر دو اعتراض کئے ہیں ' اول یہ کہ اگر کسی اہم چیز کا بیان مبالغہ کے صیغوں سے کرنا انسان کا خاصہ ہے تو اس کو اللہ کے کلام پر منطبق کرنا درست نہیں ہے کیونکہ خاصہ کی تعریف یہ ہے کہ وہ جس چیز کا خاصہ ہو اسی میں پایا جاتا ہے ' دوسرے میں نہیں پایا جاتا ' دوسرا اعتراض یہ ہے کہ " الرحمن الرحیم " کی مثال گورے چٹے اور لمبے تڑنگے سے دینا صحیح نہیں ہے کیونکہ "الرحمن الرحیم "دونوں مبالغہ کے صیغہ ہیں اور گورے چٹے اور لمبے ' تڑنگے میں سے کوئی لفظ بھی مبالغہ کا صیغہ نہیں ہے۔

(التبیان ص ۳۰۔۲۹ کاظمی پبلیکیشنز 'ملتان '۱۹۹۳ء) ، (تفسیر تبیان القرآن۔ علامہ غلام رسول سعیدی)

الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

رحمن اور رحیم اللہ تعالیٰ کے صفاتی ناموں میں سے دو نام ہیں۔ ان دونوں کا مادہ رحمت ہے۔ لیکن یہ رحمت کے دو مختلف پہلوؤں کو نمایاں کرتے ہیں۔

رحمن عربی زبان میں فعلان کے وزن پر مبالغہ کا صیغہ ہے اور رحیم فعیل کے وزن پر صفت مشبہ ہے۔

فعلان میں تین باتیں نمایاں ہیں۔

1 فعلان کا وزن صفات عارضہ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

جیسے پیاسے کے لیے عطشان 'غضبناک کے لیے غضبان ' سراسیمہ کے لیے حیران 'مست کے لیے سکران کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔

2 فعلان کا وزن جوش و خروش اور ہیجان پر دلیل ہوتا ہے اس طرح رحمن کا لفظ جو رحمت سے اسم مبالغہ ہے کے معنی ہوں گے کہ رحمن وہ ذات ہے جس میں صفت رحمت پائی جاتی ہے اور اس کی رحمت میں ایک جوش اور ایک ہیجان ہے۔ یہ مخلوقات کے لیے اس طرح ابلتی ہے جیسے چشمہ ابلتا ہے۔

3 فعلان کا وزن اپنے اندر وسعت اور ہمہ گیری رکھتا ہے اس لحاظ سے رحمن کے معنی ہوں گے وہ ذات جس کی رحمت سارے عالم، ساری کائنات اور جو کچھ اب تک پیدا ہوا ہے اور جو کچھ آئندہ ہو گا، سب پر حاوی اور شامل ہے۔ اسی وجہ سے اس اسم کو لفظ اللہ کے تقریباً برابر قرار دیا گیا ہے۔

ارشاد ہے: قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ط اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى

(بنی اسرائیل:۱۷۔۱۱۰)

(اے پیغمبر فرما دیجئے کہ اللہ کہہ کر پکارو یا رحمن کے نام سے پکارو کسی طرح بھی پکارو اس کے سب نام بہتر ہیں)۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی طرح لفظ رحمن بھی پروردگار کی ذات کے ساتھ مخصوص ہے۔ کسی مخلوق کو رحمن کہنا جائز نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی بھی ایسا نہیں ہو سکتا جس کی رحمت سے عالم کی کوئی چیز خالی نہ رہے۔ اس لیے جس طرح لفظ اللہ کی جمع اور تثنیہ نہیں آتا رحمان کا بھی جمع و تثنیہ نہیں آتا کیونکہ وہ ایک ہی ذات پاک کے ساتھ مخصوص ہے دوسرے اور تیسرے کا وہاں احتمال ہی نہیں۔

یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ کفار قریش اسم اللہ سے تو واقف تھے، مگر اسم رحمان سے انھیں بالکل آگاہی نہیں تھی۔ اس لیے قرآن کریم نے متعدد مواقع پر اس کا ذکر فرمایا کہ کفار مکہ سے جب پوچھا جاتا کہ زمین و آسمان کا خالق کون ہے؟ سورج اور چاند کو کس نے مسخر کیا ہے؟ آسمان سے پانی کون اتارتا ہے؟ زمین کو از سر نو کون زندگی دیتا ہے؟ یہاں تک کہ جب ان سے پوچھا جاتا کہ تمہیں کس نے پیدا کیا ہے؟ تمہیں رزق کون دیتا ہے؟ دعائیں کون سنتا ہے؟ تو وہ اس کے جواب میں کہتے تھے کہ "اللہ" مگر جب ان سے کہا جاتا کہ رحمن کو سجدہ کرو تو کہتے کہ رحمان کیا ہوتا ہے؟ اسی لیے قرآن کریم نے کہا:

وَهُمْ بِذِكْرِ الرَّحْمٰنِ هُمْ كٰفِرُوْنَ (الانبیا:۳۶)"

کہ یہی تو وہ ہیں کہ جو رحمان کے ذکر سے انکاری ہیں"۔

اس لیے علماء نے لکھا کہ اگر کسی کا نام عبد الرحمن ہو تو اسے صرف رحمان کہہ کر بلانا جائز نہیں کیونکہ یہ نام ذات الٰہی کے ساتھ مخصوص ہے۔ اس کے مقابلے میں لفظ رحیم جو اللہ تعالیٰ کے پیارے ناموں میں سے ہے، وہ فعیل کے وزن پر صفت مشبہ ہے اور فعیل کا وزن دوام و استمرار، پائیداری و استواری پر دلالت کرتا ہے اور یہ وزن ایسی صفات کے لیے بولا جاتا ہے جو صفات عارضہ نہیں بلکہ صفات قائمہ ہیں۔ مثلاً کریم، کرم کرنے والا۔ عظیم، بڑائی رکھنے والا۔ علیم، علم رکھنے والا۔ حکیم، حکمت رکھنے والا۔ دوسری یہ بات کہ اس میں رحمت کے کامل اور مکمل ہونے کا معنی پایا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ رحیم وہ ہو گا جس کی رحمت میں دوام اور تسلسل پایا جائے اور جس کی رحمت صفت کمال کے ساتھ متصف ہو۔ رحمان کے بعد رحیم کا ذکر کرنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ پروردگار کی اپنی خلق کے لیے رحمت میں صرف جوش ہی نہیں بلکہ پائیداری اور استقلال بھی ہے۔ اس نے یہ نہیں کیا ہے کہ رحمانیت کے جوش میں دنیا پیدا تو کر ڈالی لیکن پیدا کر کے پھر اس کی خبر گیری اور نگہداشت سے غافل ہو گیا ہو۔ بلکہ اس کو پیدا کرنے کے بعد وہ اپنی پوری شان رحیمیت کے ساتھ اس کی پرورش اور نگہداشت بھی فرما رہا ہے۔ بندہ جب بھی اسے پکارتا ہے۔ وہ اس کی پکار سنتا ہے اور اس کی دعاؤں اور التجاؤں کو شرف قبولیت بخشتا ہے۔ پھر اس کی رحمتیں اسی چند روزہ زندگی تک ہی محدود نہیں ہیں بلکہ جو لوگ اس کے بتائے ہوئے راستے پر چلتے رہیں گے ان پر اس کی رحمت ایک ایسی ابدی اور لازوال شان میں ہو گی جو کبھی ختم ہونے والی نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ رحیم میں دوام اور تسلسل صفت کمال کے ساتھ پایا جاتا ہے تو جس طرح اس کائنات کا ارتقاء بالآخر اسے آخرت میں داخل کر دے گا اور اس کی تمام نعمتیں جنت کی آغوش میں پہنچ کر ارتقاء کی انتہائی منزل کو پالیں گی اسی طرح پروردگار کے رحیم ہونے کی صفت دنیا سے آخرت کی طرف اس کی رحمت کے ارتقاء کا ایک عمل ہے، جو اپنی صفت کمال کے ساتھ آخرت اور جنت میں رونما ہو گا۔ اس لیے جن علماء نے الرحیم کو آخرت کے ساتھ مخصوص کیا ہے ان کا شاید یہی مفہوم ہے کہ رحمت اپنی تکمیلی شان میں وہاں جلوہ گر ہو گی۔

رحمت کا مفہوم

یہ تو تھا الرحمن اور الرحیم کا مفہوم اور دونوں کے معنی میں فرق۔ اب سوال یہ ہے کہ دونوں معنوں میں ہم نے جس صفت رحمت کا ذکر کیا ہے، وہ رحمت ہے کیا؟ اگر اس رحمت کا مفہوم یہ ہے کہ اس نے کائنات کو عدم سے وجود بخشا تو یہ بات اس کی صفت خلق کا مظہر ہے اور اگر اس کا یہ معنی ہے کہ وہ پیدا کرنے کے بعد تربیت کا سامان کر رہا ہے اور ہر مخلوق کو اس کی ضرورت کے مطابق سامان تربیت میسر آرہا ہے اور ہر ایک کی ضرورت کو پورا کیا جارہا ہے اور ہر ایک کی نگرانی کی جارہی ہے اور ہر ایک کو عہد بعہد آگے بڑھایا جارہا ہے تو یہ وہ چیز ہے جس کو پروردگار کی صفت ربوبیت انجام دے رہی ہے۔ مگر یہاں تو رحمت کا ذکر ہو رہا ہے۔ سوال یہ ہے کہ وہ رحمت کیا ہے؟ اس کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اس کائنات پر تدبر کی نگاہ ڈالیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ یہاں کائنات کے لیے صرف پرورش اور تربیت کا سامان ہی مہیا نہیں ہو رہا بلکہ پرورش سے بھی زیادہ بنانے سنوارنے اور فائدہ پہنچانے کی حقیقت کام کر رہی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس کی فطرت میں بناؤ ہے، اس کے بناؤ میں خوبی، اس کے مزاج میں اعتدال، اس کے افعال میں خواص، اس کی صورت میں حسن' اس کی صداؤں میں نغمہ اور اس کی بو میں عطر بیزی ہے اور اس کی کوئی بات ایسی نہیں جو اس کارخانہ کی تعمیر اور درستگی کے لیے مفید نہ ہو۔ پھر اسی پر بس نہیں بلکہ اس دنیا میں مخلوقات کی اپنی زندگی اور بقاء کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہے صرف ایسا نہیں کہ انھیں مہیا کر دیا گیا ہے، بلکہ اس کے ساتھ ہم دیکھتے ہیں کہ اس کارگاہ عالم میں عناصر حیات میں سے ہر عنصر' اس کے موئثرات میں سے ہر موئثر، اس کے خواص میں ہر خاصہ' ایک بے پناہ فیضان کا جوش رکھتا ہے اور ہر کسی کے اندر یہ خواہش تڑپتی دکھائی دیتی ہے کہ وہ آگے بڑھ کر اپنے فیضان سے اور اپنی خدمت سے مخلوقات کو نوازے۔ سورج' چاند' تارے' ہوا' بارش' دریا' سمندر' پہاڑ ان میں سے کون ہے جو مخلوقات کے لیے راحت رسانی اور آسائش دینے میں دوسرے سے پیچھے ہو۔

تصور کیجئے ہم رات بھر خواب غفلت کے مزے لوٹتے ہیں، سہانے خواب دیکھتے رات گزر جاتی ہے۔ صبح نیند کا خمار اترتے ہی اپنے آپ کو باد سحر کی طرح تر و تازہ اور شاداب محسوس کرتے ہیں۔ مگر ہم نے کبھی یہ غور کرنے کی زحمت نہیں کی کہ ہم نے تھکاوٹ سے چور ہو کر جیسے ہی اپنے آپ کو بستر پر گرایا تو نیند لوریاں دیتی ہوئی خود بخود آموجود

ہوئی۔ ہم آرام کرتے رہے، وہ شب بھر ہمیں تھپکتی رہی۔ ہم نے اگر گرانی محسوس کی تو نہ جانے وہ کون فرشتہ آپہنچا جس نے وقفے وقفے سے ہمیں دنیا بھر کی سیر کرائی ' ہمیں اس طرح مسرور و مخمور رکھا کہ ہمیں رات گزرنے کا احساس ہی نہیں ہونے دیا۔ یہ جو عناصر رحمت مسلسل اپنا فرض انجام دینے میں مصروف رہے ہیں، ہمیں تو انھیں بلانے کی زحمت بھی نہیں کرنی پڑتی۔ یہ ان کا آپ سے آپ بے تابانہ ہمارے سکون اور آرام مہیا کرنے میں لگے رہنا ' یہ اللہ کی رحمت کے سوا اور کیا ہے۔

صبح اٹھتے ہی زندگی کی سرگرمیاں شروع ہو جاتی ہیں لیکن اس میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ زندگی کی سرگرمیاں بروئے کار لانے اور انجام دینے کے لیے جس جس موثر اور عنصر کی ضرورت ہے، وہ خود بخود اس کے لیے بے تاب دکھائی دیتا ہے۔ ہم بیدار ہونے میں تاخیر کر سکتے ہیں مگر سورج طلوع ہونے اور روشنی پھیلانے میں کبھی تاخیر نہیں کرتا۔ اس کی کرنوں کو ہمیں بلانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ وہ ہمیں روشنی بھی دے رہا ہے ' ہماری کھیتیوں کو پکا بھی رہا ہے، زندگی کی گاڑی کو ایک انجن کی طرح کھینچ رہا ہے۔ اگر زمین کو آبیاری کی ضرورت ہے تو سمندر سے کرنوں کے ڈول بھر بھر کر کھینچ رہا ہے ' ابر کی چادریں بچھا رہا ہے ' پہاڑوں سے برف کو پگھلا رہا ہے اور ندی نالوں کے ذریعے زمین کی ضرورت پورا کرنے میں لگا ہوا ہے۔

فرائض کونیہ

رات آتی ہے تو چاند اپنا فرض انجام دینے اور اہل زمین کی خدمت کرنے کے لیے آموجود ہوتا ہے۔ وہ رات کے مسافروں کو راستہ دکھاتا ' دلوں کو مسرتوں سے معمور کرتا ' پھلوں میں مٹھاس اور گداز پیدا کرتا ہے۔ ستارے جھلملانے میں کبھی کوتاہی نہیں کرتے ' کلیاں کبھی چٹکنے سے نہیں رکتیں ' پھول خود بخود مشام جاں کو معطر کرنے کا فرض انجام دے رہے ہیں۔ قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے کہ تمہیں اس حقیقت کو سمجھنے کے لیے دور جانے کی ضرورت نہیں فَلۡيَنۡظُرِ ٱلۡاِنۡسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖۤ (عبس: ۸۰۔ ۲۴) انسان کو چاہیے کہ اپنے کھانے ہی کو دیکھے کہ جو غذا اس کے سامنے پڑی ہے وہ کہاں سے آئی ہے۔ یقیناً یہ گیہوں سے تیار ہوئی ہے۔ گیہوں کا ایک ایک دانہ ہتھیلی پر رکھ کر سوچو کہ یہ کیسے تیار ہوا ہے۔ کسان نے گیہوں زمین میں کاشت کیا ' سہاگہ سے اسے دفن کر کے گھر چلا آیا لیکن اس کی غیر

حاضری میں زمین کی قوت روئید گی نے اپنا کام کیا ٗہوا نے اپنا فرض انجام دیا ٗسورج نے سمندر کا شوراب کھینچ کر ابر کی چادریں بچھائیں ٗموسم کے تغیرات اور ہوا کی گردش نے آبیاری کا کام کیا ٗسورج نے اس دانہ گندم کو پکایا ٗچاند نے اس میں گداز پیدا کیا، غرضیکہ تمام کارخانہ ہستی ایک خاص نظم وترتیب کے ساتھ اس کی بناوٹ میں خودبخود بے تابانہ مصروف ہے۔ کسان یہ سمجھتا ہے کہ گندم کا یہ کھلیان میری محنت کا نتیجہ ہے۔ لیکن وہ نہیں جانتا کہ کس طرح عناصر قدرت اور زمین کی گیسوں نے اس سے کہیں زیادہ اپنا فرض انجام دے کر اسے روٹی کے قابل بنایا ہے۔ اسی پیرائے میں پروردگار مختلف نعمتوں کا ذکر فرماتے ہیں، جس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہم بے خبری میں جن نعمتوں سے استفادہ کرتے ہیں وہ سراسر اللہ کی رحمت کا ظہور ہے۔ چند آیات ملاحظہ فرمایئے جس میں اسی حقیقت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے:

وَاِنَّ لَكُمْ فِی الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ؕ نُسْقِیْكُمْ مِّمَّا فِیْ بُطُوْنِهٖ مِنْۢ بَیْنِ فَرْثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِیْنَ ۔ وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِیْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّرِزْقًا حَسَنًا ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ۔ وَاَوْحٰی رَبُّكَ اِلَی النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِیْ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا یَعْرِشُوْنَ ۔ لا ثُمَّ كُلِیْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِیْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا ؕ یَخْرُجُ مِنْۢ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِیْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ ۔

(اور دیکھو یہ) چارپائے (جنھیں تم پالتے ہو) ان میں تمہارے لیے غور کرنے اور نتیجہ نکالنے کی کتنی عبرت ہے؟ ان کے جسم سے ہم خون اور کثافت کے درمیان دودھ پیدا کر دیتے ہیں جو پینے والوں کے لیے بے غل وغش مشروب ہوتا ہے۔ (اسی طرح) کھجور اور انگور کے پھل ہیں، جن سے نشہ کا عرق اور اچھی غذا دونوں طرح کی چیزیں حاصل کرتے ہو۔ بلاشبہ اس بات میں ارباب عقل کے لیے (ربوبیت الٰہی کی) بڑی ہی نشانی ہے اور (پھر دیکھو) تمہارے پروردگار نے شہد کی مکھی کی طبیعت میں یہ بات ڈال دی کہ پہاڑوں میں اور درختوں میں اور ان ٹہنیوں میں جو اس غرض سے بلند کی جاتی ہیں، اپنے لیے گھر بنائے پھر ہر طرح کے پھولوں سے رس چوسے، پھر اپنے پروردگار کے ٹھہرائے ہوئے طریقوں پر کامل فرمان برداری کے ساتھ گامزن ہو۔ (چنانچہ تم دیکھتے ہو کہ) اس کے جسم سے مختلف

رنگوں کا رس نکلتا ہے، جس میں انسان کے لیے شفا ہے، بلاشبہ اس بات میں ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں (ربوبیت الٰہی کی عجائب آفرینیوں کی) بڑی ہی نشانی ہے۔ (النحل ۱۶:۶۵۔۶۶)

غرضیکہ عناصر قدرت میں ایک ایک عنصر اور ایک ایک خاصہ مخلوقات کو راحت رسانی اور سہولت مہیا کرنے کے لیے بے تاب ہے اور کبھی اس نے تساہل سے کام نہیں لیا۔ یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ پروردگار میں صفت ربوبیت کے ساتھ ساتھ رحمت بھی اپنا وجود رکھتی ہے۔ یہ سب اسی کا مظہر اور اسی کی نمود ہے۔

کائنات کا حسن اللہ کی صفت رحمت کا ظہور ہے

حقیقت تو یہ ہے کہ اگر تدبر کا ایک قدم مزید آگے بڑھائیں تو بیشمار ایسے مناظر ہیں، جو غور و فکر کرنے والے کو حیرت و استعجاب کی نذر کر دیتے ہیں۔ دور نہ جایئے اگر ہم زمین کو دیکھتے ہیں تو دیکھتے ہی رہ جاتے ہیں کہ اس کی سطح پھلوں اور پھولوں سے لدی ہوئی ہے۔ اس کی تہہ میں آب شیریں کی سوتیں بہہ رہی ہیں گہرائی سے سونا چاندی نکل رہا ہے۔ سائے کے لیے درخت سر اٹھائے کھڑے ہیں۔ چلنے پھرنے کے لیے سبزے کا ایک مخملیں فرش بچھا دیا گیا ہے۔ آنکھوں کی ٹھنڈک کے لیے سبزے کی چادریں بچھا دی گئی ہیں۔ پھولوں میں رنگ و حسن پیدا کر دیا گیا ہے۔ میدانوں کے اکتائے ہوئے لوگوں کے لیے سر بفلک پہاڑ اٹھا دیئے ہیں۔ ان میں آبشاریں ہیں جو سینوں کو مسرت سے بھرے دے رہی ہیں۔ اس میں قسم قسم کے درخت ہیں، جن کی حسن افروزی اپنی ایک شان رکھتی ہے۔ پھر باغ و انہار' سبزیاں' پھل ہیں' قسم قسم کی بیلیں ہیں۔ پھر زمین کے چار پائے' فضا کے پرند' پانی کی مچھلیاں' یہ سب کیا ہے؟ ظاہر ہے یہ ساری چیزیں انسان کی ضرورت کے لیے ضروری نہیں تھیں۔ انسان کے لیے لکڑی کی ضرورت تھی؟ لیکن کیا ضروری تھا کہ درختوں کو چھتریاں بنا دیا جاتا۔ انسان کو غلے کی ضرورت تھی لیکن لہلہاتی فصل کو نقرئی لباس پہنانے کی کیا ضرورت تھی پرندے گوشت کے لیے ضروری سہی لیکن ان کی خوبصورت آوازیں' کوئل کی کوک' مور کا ناچ' پپیہئے کی پی' چڑیوں کے چہچہے' اور عام پرندوں کے ترانے یہ تو انسان کی ضرورت نہ تھے اور اگر آسمان کی طرف دیکھا جائے تو ہم سمجھتے ہیں کہ یہ ہم پر ایک چھت تانی گئی ہے۔ لیکن ستاروں کا نظام اور ان کی سیر و گردش' سورج کی روشنی اور اس کی بوقلمونی' چاند کی گردش اور اس کا اتار چڑھاؤ' فضائے آسمانی کی وسعت اور اس کی نیرنگیاں' بارش کا سماں اور

اس کے تغیرات۔۔ یہ سب کیا ہے ؟ یہ چیزیں یقیناً انسان کی ضرورتوں میں شامل نہیں۔ ان چیزوں پر جب آپ غور کریں گے تو آپ محسوس فرمائیں گے کہ یہاں ربوبیت سے زیادہ ایک اور چیز کارفرما ہے یہ وہی چیز ہے، جس کو قرآن صفت رحمت سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ خالق کائنات میں رحمت ہے اور اس کی رحمت اپنا ظہور بھی رکھتی ہے اور جس میں رحمت ہو اور جس کی رحمت ظہور بھی رکھتی ہو تو جو کچھ اس سے صادر ہو گا اس میں خوبی اور بہتری ، حسن و جمال، اعتدال و تناسب ہی ہو گا۔ اس کے سوا کچھ ہو ہی نہیں سکتا اور پھر یہ اس کی صفت رحمت کا ظہور صرف یہاں تک محدود نہیں کہ خارج میں آپ ہر طرف حسن و رعنائی دیکھ رہے ہیں۔ بلکہ اس کی رحمت کا اصل ظہور اس بات میں ہے کہ اس نے صرف ہمیں حسن و رعنائی ہی سے نہیں نوازا بلکہ اس سے محظوظ ہونے کے لیے احساس بھی بخشا۔ اس نے روئے خوش بخشا تو نظر کو احساس حسن بھی بخشا۔ اس نے پھول میں خوشبو رکھی تو ہمیں قوت شامہ سے بھی نوازا۔ اس نے پانی کو ٹھنڈک عطا کی تو ہمیں ٹھنڈک کی قدر کا جذبہ بھی دیا۔ اس نے پھول میں رنگ رکھا تو ہمیں رنگوں کی شناخت بھی بخشی۔ یعنی ہر چیز سے اور اس کی حقیقی قدر و قیمت سے حظ اٹھانے کے لیے جس احساس کی ضرورت تھی اس احساس سے اس نے تمام مخلوقات کو بہرہ ور فرمایا۔ وہ اپنی مخلوقات کو اولاد دیتا ہے تو اولاد کی محبت بھی دیتا ہے۔ سعی و کاوش کی سرگرمیوں کے لیے جوش و جذبہ بھی عطا کرتا ہے۔ گھر دیتا ہے تو اس کے لیے حفاظت کا جوش بھی عطا فرماتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض صورتوں میں ایک آدمی کو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ سخت گرمی میں محنت اور مزدوری کر رہا ہے۔ چہرے سے پسینہ ٹپک رہا ہے ، چلچلاتی دھوپ میں بوجھ اٹھانے پر مجبور ہے ، دیکھنے والی نگاہ سمجھتی ہے کہ یہ شخص اپنی زندگی سے انتہائی ناخوش ہو گا مگر شام کو دن بھر کی مزدوری کا معاوضہ پا کر جب اپنے جھونپڑے میں بیوی اور بچوں کے جھرمٹ میں بیٹھ کر وہ مسکرا مسکرا کے باتیں کرتا ہے تو تب اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا مزدوری کرنا تو ایک ضرورت تھی۔ لیکن اس خوشی کو پیدا کر دینا یہ اس پروردگار کا کمال ہے جو رحمان اور رحیم ہے۔ اسی طرح آپ دیکھتے ہیں کہ بچے کی پیدائش ماں کے لیے کیسی جانکاہی اور مصیبت ہوتی ہے۔ اس کی پرورش اور نگرانی کس طرح خود فروشانہ مشقتوں کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ تاہم یہ سارا معاملہ کچھ ایسی خواہش اور جذبے کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا ہے کہ ہر عورت میں ماں بننے کی قدرتی طلب ہے اور ہر ماں پرورش اولاد کے لیے مجنونانہ خود فراموشی رکھتی ہے۔ وہ زندگی کی سب سے بڑی تکلیف سہے گی اور پھر اس تکلیف میں زندگی کی سب سے

بڑی مسرت محسوس کرے گی اور جب وہ اپنی ساری راحتیں قربان کر دیتی ہے 'اپنی رگوں کے خون کا ایک ایک قطرہ دودھ بنا کر پلا دیتی ہے تو اس کے دل کا ایک ایک ریشہ سب سے بڑے احساس مسرت سے معمور ہو جاتا ہے۔ یہ کیا ہے؟ یہ اس خالق کائنات کی صفت رحمت کا ظہور ہے اور پھر اگر دقیق نظر سے کام لیا جائے تو اس رحمن ورحیم کے افادہ اور فیضان اور اس کی رحمت کے ظہور کی صورت کچھ انہی مظاہر پر موقوف نہیں ہے بلکہ کارخانہ ہستی کے تمام اعمال و قوانین کا یہی حال ہے۔ مثلاً دیکھئے کہ انسان ٹھوکریں کھاتا ہے 'غلطیاں کرتا ہے تو ہونا یہ چاہیے کہ اپنی غلطیوں کا خمیازہ فوراً بھگتے اور بد عملی اس کو فوراً تباہی کی طرف لے جائے۔ لیکن ہم یہاں دیکھتے ہیں کہ اس کی صفت رحمت کا ظہور اس طرح ہو رہا ہے کہ یہاں بڑے سے بڑے گناہ گار کو سنبھلنے کے لیے مہلت دی جا رہی ہے۔ اپنی روش کو تبدیل کرنے کا موقع دیا جا رہا ہے اور اس کی جزا و سزا کا قانون فوراً حرکت میں آنے کی بجائے آہستہ آہستہ اس کے ساتھ چلتا رہتا ہے اور اس کے عفو و درگزر کا دروازہ آخر تک کھلا رہتا ہے۔ اس لیے قرآن کریم نے کہا کہ اگر پروردگار لوگوں کو ان کی زیادتیوں پر فوراً پکڑنے لگتا تو زمین پر چلنے والا کوئی زندہ نہ رہتا۔ یہ اس کی رحمت ہے جو اچھائی کرنے والے کو بھی مہلت دیتی ہے تاکہ اس کی اچھائی نشو و نما پائے اور برائی کرنے والے کو بھی مہلت دیتی ہے تاکہ وہ متنبہ اور خبردار ہو کر اصلاح و تلافی کی کوشش کرے۔

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوْا مَا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ج فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِعِبَادِهٖ بَصِيْرًا ۔ ع

(فاطر:۳۵۔۴۵)

اس خدائے رحمن ورحیم کی رحمت کے مظاہر بیشمار ہیں مگر انسان کی کوتاہ فکری ہے کہ چونکہ شب و روز اس کی بے پایاں رحمتوں سے فائدہ اٹھا رہا ہے، اس لیے اسے نہ اس کی پہچان ہوتی ہے، نہ اس کی قدر و قیمت کا احساس ہوتا ہے۔ ایک لمحہ کے لیے تصور کریں کہ دنیا موجود ہے مگر حسن و رعنائی کے تمام جلووں اور احساسات سے خالی ہے۔ آسمان ہے مگر فضا کی یہ نگاہ پرور نیلگونی نہیں ہے۔ ستارے ہیں مگر ان میں درخشندگی اور جہاں تابی کی جلوہ آرائی نہیں ہے۔ غور کیجئے ایسی دنیا کے ساتھ زندگی کا تصور کتنا بھیانک اور ہولناک ہوگا۔ اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھیئے۔ رات روز جلوہ گر ہوتی ہے مگر آنکھوں میں نیند نہیں آتی۔ صبح مسکراتی ہوئی طلوع ہوتی ہے لیکن نقاہت یا کوئی بیماری

بستر سے اٹھنے نہیں دیتی۔ باہر پرندے چہچہا رہے ہیں۔ سورج اپنی کرنوں سے کائنات کو منور کر رہا ہے، لیکن آشوب چشم یا پاؤں کی تکلیف باہر نکل کر محو نظارہ ہونے کی اجازت نہیں دیتی۔ رنگا رنگ خوان نعمت سجا ہوا ہے لیکن طبیعت کی بے کیفی ادھر متوجہ نہیں ہونے دیتی یا آدمی ان نعمتوں سے فائدہ اٹھاتا ہے ،لیکن بھوک کا احساس مر جانے سے یہ نعمتیں مزا نہیں دے رہیں۔ گرمیوں میں ٹھنڈے پانی کی نعمت میسر ہے لیکن دانتوں کی تکلیف یا معدے کی سوزش پانی پینے کی متحمل نہیں ہو رہی، باہر آزادی سے گھومنا پھرنا ایک معمول کی نعمت ہے مگر پاؤں کی تکلیف باہر نکلنے کی اجازت نہیں دے رہی۔ یہ بظاہر معمولی نعمتیں ہیں لیکن اگر یہ چھن جائیں تب آدمی کو اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی زندگی کیسی بدمزہ ہو گئی۔ یہی اس پروردگار کی رحمت ہے جس کی قدر دانی سے ہماری عقول نارسا قاصر ہیں۔

مزید دیکھئے کبھی آپ نے غور کیا کہ اگر آپ ایک ہی طرح کے معمولات اور مصروفیات میں ایک عرصہ گزارتے ہیں تو حالات کی یہ یکسانی طبیعت کو اکتا دیتی ہے اور آپ کہیں سیر کا پروگرام بنانے لگتے ہیں۔ لیکن آپ نے کبھی اس بات پر غور نہیں کیا کہ اگر عام میدانی علاقوں والوں کے لیے پہاڑی سلسلے نہ ہوتے اور پہاڑی سلسلے والوں کے لیے ہموار میدان نہ ہوتے۔ ریگستان والوں کے لیے دریاؤں کی روانی نہ ہوتی اور دریا کے کنارے رہنے والوں کے لیے ریگستان کے ٹیلے نہ ہوتے تو آپ اس اکتاہٹ کا کیا علاج کرتے۔ اگر اس سے بھی ایک قدم اور آگے بڑھیں تو آپ کو تعجب ہو گا کہ گھر بیٹھے قدرت نے ہمیں اس یکسانی سے بچنے کے لیے کیسی کیسی نعمتیں عطا کیں۔ مثلاً اختلافِ لیل ونہار ، موسموں کے تغیرات ،خزاں اور بہار کا ایک دوسرے کی جگہ لینا ،ٹنڈ منڈ درختوں کا سبزے کا لباس پہن لینا ،بے آباد اور بے رنگ زمین پر رنگ رنگ کے پھولوں کا کھل جانا ایسے ہی بیشمار اختلافات ہیں جو پروردگار عالم کی صفت رحمت کا ظہور دنیا کی زیب وزینت اور ہماری تسکین وراحت کا سامان ہیں۔

گلہائے رنگ رنگ سے ہے زینت چمن
اے ذوقؔ اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

اسی کی طرف پروردگار توجہ دلاتے ہوئے فرماتا ہے:

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ۔

" بلاشبہ آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں، رات دن کے ایک کے بعد ایک آتے رہنے میں عقلمندوں کے لیے نشانیاں ہیں۔ (آل عمران ۱:۳۔۱۹۰)

مزید فرمایا:

وَمِنۡ رَّحۡمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّيۡلَ وَالنَّهَارَ لِتَسۡكُنُوۡا فِيۡهِ وَلِتَبۡتَغُوۡا مِنۡ فَضۡلِهٖ وَلَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُوۡنَ ۔

" کہ یہ اس کی رحمت کی کارسازی ہے کہ تمہارے لیے رات اور دن ٹھہرائے گئے ہیں تا کہ رات کو راحت پاؤ اور دن میں اس کا فضل تلاش کرو اور تا کہ تم شکر ادا کرو۔ "(قصص:۲۸۔۷۳)

اس بحث کا ایک اور گوشہ بھی ہے جس پر توجہ دینا بے حد ضروری ہے، کہ پروردگار کی رحمتوں کے مختلف مظاہر کا ہم نے تذکرہ کیا ہے۔ تصور کیجئے اگر یہ جابجا اس کے ظہور کی صورتیں اور اس کے صدور کی شکلیں اپنی جگہ قائم ہوتیں اور ہر انسان اس سے بقدر ہمت استفادہ کے لیے کوشاں ہوتا اور ہر ایک اپنے آپ کو ان کا حقیقی وارث اور مالک سمجھتا اور کسی کو اس بات کا علم نہ ہوتا کہ انسانوں کا انسانوں سے کیا رشتہ ہے؟ ان نعمتوں پر اگرچہ سب کا مساوی حق ہے مگر انسانی معیشت میں جو لوگ کسی وجہ سے پیچھے رہ گئے ہیں ان کا آگے بڑھ جانے والوں پر بھی کیا کوئی حق ہے؟ پھر ان میں باہمی انس اور محبت کا کوئی جذبہ نہ ہوتا ' ایثار و خیر خواہی سے انسان ناواقف ہوتا۔ حقوق و فرائض سے بے خبر ' باہمی نظم و تربیت سے عاری 'حکومت اور ریاست کے تصور سے نابلد 'معاشرت کے اصولوں سے تہی دامن 'مکارم اخلاق سے ناآشنا ہوتا 'تو آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان ساری نعمتوں کی موجودگی کے باوجود انسانی زندگی کس قدر ہولناک ہوتی۔ اس کو مثال سے یوں سمجھئے کہ ہم ایک گھر بناتے ہیں جس میں میاں بیوی اور ان کے بچے ہیں۔ جب تک میاں بیوی میں ایک دوسرے کے حقوق کی پاسداری رہتی ہے اور دونوں ایک دوسرے سے غایت درجہ محبت رکھتے ہیں۔ شوہر باہر محنت کرتا ہے اور بیوی گھر کی ذمہ داریاں ادا کرتی ہے۔ اس طرح دونوں یکجان اور دو قالب ہو کر اپنے بچوں کے لیے ٹھنڈا سایہ مہیا کرتے ہیں اور بچوں کی نگاہ میں ان دونوں کا وجود اللہ کی رحمت کی علامت ہوتا ہے اور بچے اگر بڑے ہو جائیں تو وہ اپنے ماں باپ کی بالکل اسی طرح عزت کرتے اور دیکھ بھال کرتے ہیں، جس طرح ماں باپ نے انھیں شفقت سے پالا اور محنت سے پروان چڑھایا تو یہ گھر فی الواقع جنت کا نمونہ ہوتا ہے۔ لیکن اگر اسی گھر کی چھت کے نیچے رہنے والے میاں بیوی ایک دوسرے سے خیانت کا ارتکاب کریں بیوی شوہر کی غیر حاضری میں

شوہر کی غیرت و حمیت کو تماشہ بنادے اور شوہر باہر بیوی کی محبت اور اعتماد کو رسوا کرتا پھرے آہستہ آہستہ دونوں ایک دوسرے سے اس قدر دور ہو جائیں کہ بجائے بچوں کے لیے نمونہ بننے کے بچوں کے لیے ڈراؤنا خواب بن جائیں گے۔ بچے انھیں اپنے کردار کے لیے نمونہ سمجھنے کی بجائے اجنبی خیال کرنے لگیں اور جب یہ بڑے ہوں تو ان کا رد عمل ان کی اجنبیت کو یاد کر کے گستاخی یا لاتعلقی کا حامل ہو جائے تو اندازہ فرمایئے کہ یہ گھر اپنی چھت اور دیواروں سمیت اور اپنی ساری آرائش کے باوصف گھر نہیں رہے گا، بلکہ جہنم کا نمونہ بن جائے گا۔ اس گھر میں رہنے والا ہر فرد ایک دوسرے سے شاکی ہو گا۔ نتیجتاً یہ دو نسلیں تباہی کے راستے پر چل نکلیں گی۔ اسی مثال سے باقی پوری انسانی زندگی کو سمجھا جا سکتا ہے۔ انسانی زندگی کے بیشمار ادارے ہیں جن میں سے ہر ادارہ حقوق و فرائض کی ادائیگی ہی سے باقی رہتا اور ترقی کرتا ہے۔ حقوق و فرائض کا شعور کسی بھی ادارے میں کام کرنے والوں سے اگر سلب کر لیا جائے یا وہاں کام کرنے والے سرے سے اس شعور سے محروم ہوں تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ ادارہ کتنے دنوں چلے گا۔ گھر سے لے کر ایوان ہائے حکومت تک کے ناگفتہ بہ حالات اس زندہ حقیقت کے آئینہ دار ہیں کہ ہر جگہ بہتری اور استواری کا دارومدار بنیادی حقائق اور اصولوں کی پاسداری سے وابستہ ہے اور ان کی تباہی و بربادی انہی اصولوں سے ناواقفیت یا ان سے انحراف کا نتیجہ ہے۔ اس لیے وہ ذات بابرکات جو صرف خالق و مالک ہی نہیں رحمن و رحیم بھی ہے، اس کی صفت رحمت کا یہ تقاضا ٹھہرا کہ جہاں انسانوں کو ظاہری اور باطنی نعمتوں سے نوازا گیا ہے، وہاں اس کے استعمال اور اس کی حدود کا علم بھی دینا چاہیے ورنہ یہ اس صفت رحمت کی ناتمامی ہو گی۔ چنانچہ اس نے انسان کو علم سے بہرہ ور کرنے کے لیے کتابیں اتاریں اور راہنمائی کے لیے رسول بھیجے۔ اور اس راہنمائی کو اور کتابوں کے نزول کو اس نے ہدایت و رحمت سے تعبیر کیا۔

فرمایا: **وَاِنَّهٗ لَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ** ۔ ''یہ قرآن ہدایت اور رحمت ہے مومنوں کے لیے''۔
(نمل 77)

پھر اس کی تعلیم کو دنیا بھر کے خزانوں سے بہتر و برتر فرمایا' ارشاد فرمایا: **وَرَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ** "تیرے رب کی رحمت یعنی (قرآن) بہتر ہے، ان تمام خزانوں سے جن کو یہ لوگ جمع کرتے ہیں"۔ (زخرف 32)

پھر قیامت تک جو ذات مکمل راہنما' آئیڈیل اور منارہ نور بن کر آئی ہے اس کے بارے میں فرمایا:

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (انبیا:۲۱۔۱۰۷)

ہم نے یہاں تک اللہ کی صفت ربوبیت اور اس کی صفت رحمت کو کسی حد تک جاننے کی کوشش کی ہے۔ ان دونوں کے مطالعہ سے علم و معرفت کا ایک اور دروازہ ہمارے سامنے واشگاف ہوتا ہے "وہ یہ کہ ہم جب اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کے فیضان کو دیکھتے ہیں کہ اس نے ہمارے لیے زمین کا فرش بچھایا 'آسمان کی چھت تانی 'پھر زمین سے ہمارے لیے مختلف قسم کی غذائیں پیدا فرمائیں 'زندگی کے امکانات ایک سے ایک بڑھ کر ہمیں عطا کیے۔ دل و دماغ کی رعنائیاں عطا فرمائیں، ہماری ظاہری اور باطنی روحانی اور مادی ہر طرح کی ضروریات کو مہیا فرمایا۔ ایسی ایسی نعمتیں عطا فرمائیں اور اس وسعت سے دستر خوان نعمت بچھایا کہ آدمی انھیں دیکھ کر یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا:

دنیا تو ایک بہشت ہے اللہ رے کرم
کن نعمتوں کو حکم دیا ہے جواز کا

اللہ کی رحمت خود روز جزاء پر دلیل ہے

ربوبیت کے اس اہتمام کو دیکھتے ہوئے یقیناً ذہن میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ وہ پروردگار عالم جس کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں، کیا اس نے اس کائنات میں انسان کو بغیر کسی مقصد کے پیدا کر دیا ہے اور اس کائنات کی ایک ایک چیز اس کی خدمت میں دے کر یہ کہہ دیا ہے کہ جاؤ تم ان چیزوں سے کام لو تمہاری حیثیت ایک شتر بے مہار سے زیادہ نہیں۔ تم جدھر جی چاہے منہ اٹھائے چلتے پھرو۔ اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے جو چاہو کرو 'تمہارا پیدا کرنے والا تم سے کسی بات کی باز پرس نہیں کرے گا؟ اندازہ فرمایئے کہ کیا یہ تصور کسی حکیم ذات کے بارے میں قرین عقل بھی ہے؟ دنیا میں کوئی بھی شخص کوئی ایسا کام کرے جس کا کوئی مقصد نہ ہو تو ہر شخص اس کا مذاق اڑاتا ہے کہ اس نے اپنی محنتوں 'اپنی کاوشوں اور اپنی ذہانت کا یہ کیا مصرف سمجھا ہے کہ ایک بے فائدہ کام میں اپنا سب کچھ ضائع کر دیا۔ بچے گھروندے بنا کر ڈھا دیتے ہیں 'تو ان کے بچپنے کی وجہ سے انھیں یہ سمجھ کر کچھ نہیں کہا جاتا کہ یہ بچے ابھی عقل اور شعور کی عمر کو نہیں پہنچے اس لیے یہ زندگی کو ایک کھیل سمجھتے ہیں۔ لیکن اگر بچوں کا باپ یہ حرکت کرے تو ہر دیکھنے

والا اس کی دماغی صحت کے بارے میں شبہ میں پڑ جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کے بارے میں ظاہر ہے ایسی کسی بات کا تصور کرنا بھی خلاف ادب ہے۔ اس لیے کہ اس کی ربوبیت کا یہ اہتمام خود پکار پکار کر یہ شہادت دے رہا ہے کہ یہ اہتمام کسی اہم غایت و مقصد کے لیے ہے اور یہ ان لوگوں پر نہایت بھاری ذمہ داریاں عائد کرتا ہے جو بغیر کسی استحقاق کے اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ ایک دن ان ذمہ داریوں کے بارے میں ایک ایک شخص سے پرسش ہوگی کہ تمہیں ہم نے زندگی کی اور زندگی کی ساری نعمتیں عطا فرمائیں اور عناصر قدرت کو تمہارے ہم رکاب کیا۔ تم نے ایک حیوان کی طرح زندگی گزارنے کی آخر کوشش کیوں کی؟ تم نے یہ بات کیوں نہ سمجھی کہ جس نے ہمیں جوہر عقل سے نوازا ہے یقینا اس نے ہمیں کچھ ذمہ داریاں بھی سونپی ہوں گی اور وہ ضرور ایک دن ایسا لائے گا جب وہ ہم سے اس کا حساب لے گا۔ اسی کی طرف توجہ دلاتے ہوئے قرآن کریم میں ایک جگہ ارشاد فرمایا گیا ہے اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ۔ (مومنون:۲۳۔۱۱۵)

"کیا تم نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ ہم نے تمہیں عبث اور بے کار پیدا کیا ہے اور تم ہماری طرف لوٹائے نہیں جاؤ گے؟
"

اور ایک دوسری جگہ اپنی نعمتوں ہی سے استدلال کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ تم آج جن نعمتوں سے متمتع ہو رہے ہو تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ایک دن ان کا حساب بھی دینا ہوگا۔

اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا۔ۙ وَّالْجِبَالَ اَوْتَادًا۔ۙ وَّخَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًا۔ۙ وَّجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا۔ۙ وَّجَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا۔ۙ وَّجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا۔ۙ وَّبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا۔ۙ وَّجَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا۔ۙ وَّاَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا۔ۙ لِّنُخْرِجَ بِهٖ حَبًّا وَّنَبَاتًا۔ۙ وَّجَنّٰتٍ اَلْفَافًا۔ ط اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيْقَاتًا۔ۙ (نبا۷۸:۶۔۱۷)

(کیا ہم نے زمین کو تمہارے لیے گہوارہ نہیں بنایا اور اس میں پہاڑوں کی میخیں نہیں ٹھونکیں؟ اور ہم نے تم کو جوڑا جوڑا پیدا کیا اور تمہاری نیند کو دافع کلفت بنایا۔ رات کو تمہارے لیے پردہ پوش بنایا اور دن کو حصول معاش کا وقت ٹھہرایا اور ہم نے تمہارے اوپر سات مضبوط آسمان بلند کیے اور روشن چراغ بنایا اور ہم نے بدلیوں سے دھڑا دھڑ پانی برسایا تاکہ اس سے ہم غلے اور نباتات اگائیں اور گھنے باغ پیدا کریں۔ بیشک فیصلہ کا دن مقرر ہے)۔

یعنی اوپر جن چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے یہ اس بات کی گواہی دے رہی ہیں کہ جس نے یہ سب کچھ اہتمام انسان کے لیے کیا ہے وہ انسانوں کو یونہی شتر بے مہار کی طرح نہیں چھوڑے رکھے گا بلکہ اس کی نیکی یا بدی کے فیصلے کے لیے فیصلہ کا ایک دن بھی لائے گا۔

اسی طرح جب ہم اس کی صفت رحمت کے مناظر کو دیکھتے اور اس کی صفت رحمت کے ظہور کی صورتوں کو جاننے کی کوشش کرتے ہیں تو اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح اس کی رحمت کا ظہور کائنات کی ایک ایک چیز میں ہوا ہے۔ اسی طرح اس کی رحمت کا تعلق انسانی اعمال اور اس کے نتائج سے بھی ہے۔ دنیا میں دو طرح کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ ایک وہ جو دنیا میں نیکی کے پیکر بن کر نیکی کو فروغ دیتے ہیں۔ نیکی کی کیسی بھی قیمت ادا کرنی پڑے وہ اس سے دریغ نہیں کرتے۔ اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے قربانیاں دیتے اور لوگوں کی طرف سے مصائب کو برداشت کرتے ہیں اور دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو خواہشات نفس کے بندے اور درہم و دینار کے پرستار ہیں۔ ان کی زندگی کا مقصد عیش و عشرت کے سوا کچھ نہیں۔ انھیں اگر اقتدار ملتا ہے تو کمزوروں پر ظلم کرتے ہیں اور اگر اقتدار نہیں ملتا تو اپنی محرومیوں کا انتقام جرائم کی صورت میں معاشرے سے لیتے ہیں۔ اس کے لیے انھیں انسانی زندگیوں سے بھی کھیلنا پڑے تو دریغ نہیں کرتے۔

ان دونوں طرح کے لوگوں کی حالت پر غور کیجئے۔ اگر پہلی طرح کے لوگ ایک اچھی ، پاکیزہ لیکن کٹھن زندگی گزار کر دنیا سے چلے جاتے ہیں اور انھیں دنیا میں سوائے محرومیوں کے اور کچھ نہیں ملا اور آخرت کا بھی ان کے یہاں کوئی تصور نہ ہو تو اندازہ فرمایئے کہ انھوں نے جن مقاصد کی خاطر اپنی زندگی کی راحتیں قربان کیں اور بعض دفعہ زندگی بھی نچھاور کر ڈالی انھیں اس کا کیا صلہ ملا اور دوسری طرف وہ لوگ جنھوں نے زندگی بھر ظلم توڑے اور عیش و عشرت کو مقصد زندگی بنائے رکھا انھیں کھلی چھٹی دے دی گئی اور ان سے کوئی بازپرس کا دن مقرر نہ کیا تو کیا یہ اللہ کی صفت رحمت کے خلاف نہیں ہو گا؟ اس کی رحمت کا تقاضہ تو یہ ہے کہ اس کی خاطر جان دینے والوں کو ایک نہ ایک دن صلہ ملے اور اس سے انحراف کرنے والوں کو ایک نہ ایک دن انحراف کی سزا ملے اور اگر دونوں کو بغیر کسی بازپرس کے کھلی چھٹی دے دی جائے اور اسی طرح زندگی کا یہ کارخانہ ختم کر دیا جائے اور جزا اور سزا اور انعام و انتقام کا کوئی دن کبھی نہ آئے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ معاذ اللہ اس دنیا کے پیدا کرنے والے کی نگاہوں میں متقی اور مجرم دونوں برابر

ہیں بلکہ مجرم نسبتاً اچھے ہیں جن کو جرم کرنے اور فساد کرنے کے لیے اس نے بالکل آزاد چھوڑ رکھا ہے اور یہ چیز ظاہر ہے کہ اللہ کی صفت رحمت کے یکسر خلاف ہے اس لیے پروردگار نے فرمایا:

اَفَنَجۡعَلُ الۡمُسۡلِمِیۡنَ کَالۡمُجۡرِمِیۡنَ ۔ مَا لَکُمۡ وقفة کَیۡفَ تَحۡکُمُوۡنَ ۔

" کیا ہم اطاعت کرنے والوں کو مجرموں کی طرح کر دیں گے۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے 'تم کیسا فیصلہ کرتے ہو؟ " (قلم ۳۶)

کَتَبَ عَلٰی نَفۡسِہِ الرَّحۡمَۃَ ط لَیَجۡمَعَنَّکُمۡ اِلٰی یَوۡمِ الۡقِیٰمَۃِ لَا رَیۡبَ فِیۡہِ

" اس نے اپنے اوپر رحمت واجب کرلی ہے 'وہ قیامت تک جس کے آنے میں کوئی شبہ نہیں ہے 'تم کو ضرور جمع کر کے رہے گا۔ " (انعام:۱۲)

حاصل کلام یہ کہ اللہ کی صفت ربوبیت اور اس کی صفت رحمت کا یہ تقاضا ہے کہ ایک دن ایسا ضرور آئے جس میں ہر شخص سے اس کی گزری ہوئی زندگی کا حساب لیا جائے۔ حسن عمل کے سرمایہ داروں کو بیش از بیش صلہ ملے اور اللہ کے منکروں اور انسانیت کے دشمنوں کو ان کے کرتوتوں کی سزا ملے۔ کیونکہ جس طرح نیکی کرنے والوں کو ان کی نیکی کا صلہ ملنا رحمت کا تقاضہ ہے اسی طرح انسانیت کے دشمنوں کو ان کے کیے کی سزا ملنا بھی رحمت کا تقاضہ ہے۔ تا کہ وہ سزا کے خوف سے اپنی بد اطواری سے باز آجائیں اور اپنا انجام بہتر کرلیں اور باقی نوع انسانی ان کے شرور سے محفوظ رہ سکے۔ اسی لیے اب اس کے بعد اللہ کی صفت عدالت کو ذکر کیا جا رہا ہے۔

(تفسیر روح القرآن۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی)

رحمان ور حیم کی مزید وضاحت

یہ سب چیزیں دراصل رحم ہی کا حصہ ہیں۔ رحمت کا یہ تعلق ہے جو اللہ کا اپنی مخلوق کے ساتھ ہے۔ رحمان لفظ بھی کافی تھا۔ پھر رحیم کیوں آیا۔ کیا دونوں کا ایک ہی مطلب ہے۔ اگر دونوں الفاظ کے ایک ہی مطلب ایک ہی معنی ہوتے تو اللہ تعالیٰ کو بات کو دہرانے کی ضرورت نہیں تھی۔ رحمان دراصل فعلان کے وزن پر ہے اس میں کچھ meaning پائے جاتے ہیں خاص قسم کے۔ فعلان۔ جیسے ہم کہتے ہیں طوفان۔ ہیجان۔ اس میں کیا ہے۔ جوش ہے جذبہ ہے۔ تو

بالکل اسی طرح رحمن میں اللہ کی رحمت کا جوش محسوس ہوتا ہے۔ اللہ کی رحمت جوش میں آئی۔ اللہ تعالیٰ نے کائنات بنائی۔ انسان کو پیدا کیا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے اندر بھی جو رحم کا جذبہ ہے یہ جوش میں آتا ہے۔ مثال کے طور پر جیسے کہ زلزلہ آیا۔ جب ہمیں پتہ چلا کہ زلزلے نے بڑی تباہی مچائی ہے۔ کیا حال ہوا ہے وہاں پر۔ کتنے مر گئے۔ لوگوں کے رحم کے جذبے کو جوش آیا اور بہت کچھ لوگوں نے کیا۔ فنڈز جمع کئے donations دیئے۔ لوگوں نے وقت لگایا۔ لوگ اس علاقے میں آگئے۔ اور انھوں نے ان لوگوں کی خدمت کی جو وہاں پر زخمی یا ضرورت مند تھے۔ اب کتنے لوگ وہاں پر ہیں کچھ مہینوں میں ہی جوش ٹھنڈا پڑ گیا لوگوں کا۔ بھولی بسری بات ہو گئی۔ ہمارے رحم کے جذبے میں وہ ہیجان نہیں پایا جاتا۔ وہ passion نہیں ہے ہمارے اندر۔ اب وہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ یہ انسانوں کی کمزوری ہے۔ کہ وقتی طور پر ان کو جوش تو آتا ہے مگر اس کے بعد وہ جذبہ مدہم پڑ جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نہ صرف رحمان ہے۔ یہ نہیں ہوا کہ اس نے جوش میں آکر کائنات تو بنا دی۔ انسان کو پیدا تو کر دیا۔ اب اس کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ اب اس کی رحمت کا جذبہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ ہو سکتا ہے کہ زلزلے سے جو لوگ متاثر ہوئے ہوں اس میں کچھ بچے ہوں۔ جوش ہی جوش میں کسی نے کہا کہ تیرے اپنے تین بچے ہیں۔ میں اپنے گھر میں ایک اور بچہ رکھ لیتا ہوں۔ جوش ہی جوش میں رکھ تو لیا۔ مگر ہو سکتا ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کو وہ بچہ بھاری لگنے لگ جائے۔ جب جوش ٹھنڈا پڑے کہ پہلے ہی میری اپنی پریشانیاں کچھ کم تھیں۔ میری اپنی ذمہ داریاں کچھ کم تھیں کہ میں نے اور ایک اتنی بڑی ذمہ داری اپنے سر لے لی۔ تو بےزار ہونے لگے۔ پریشان ہونے لگے۔ اس ذمہ داری سے۔ عین ممکن ہے۔

لیکن اللہ تعالیٰ انسان کو بنا کر نہ بیزار ہوا۔ نہ پریشان ہوا۔ نہ انسان اللہ تعالیٰ کو بوجھ لگے۔ اس لیے کہ اللہ رحمان کے ساتھ ساتھ رحیم بھی ہے۔ رحیم فعیل کے وزن پر ہے یہ ایک خاص وزن ہے اس پر کچھ الفاظ آئے ہیں۔ جو اپنے اندر ایک خاص مفہوم خاص meaning رکھتے ہیں۔

رحمان میں ہیجان ہے۔ جوش ہے۔ رحیم میں دوام ہے۔ تسلسل ہے consistently maintain کرنے والی کیفیت پائی جاتی ہے۔ مسلسل رحم فرمانے والا ہے۔ اس کے جذبہ رحم میں کوئی کمی نہیں آتی۔ وہ مسلسل رحم فرمائے چلا جا رہا ہے۔ انسانوں کو پیدا کر کے وہ upset نہیں ہو رہا۔ کہ اوہو! ان کو میں نے کیوں پیدا کر دیا۔ بلکہ مسلسل وہ ان کی

ضروریات کو پورا بھی فرما رہا ہے۔ اور مسلسل ان پر اپنا رحم بھی فرما رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کے 100 حصے کئے۔ ایک حصہ تمام مخلوق میں بانٹ دیا۔ جس کی بنا پر جانور اپنے بچوں پر رحم کرتے ہیں۔ اور انسان ایک دوسرے پر رحم کرتے ہیں۔ یہ جو ہم دنیا میں رحم و کرم دیکھتے ہیں۔ یہ صرف اللہ کی رحمت کا 1٪ ہے۔ اور 99٪ اللہ نے اپنے پاس رکھے ہیں اور آخرت میں پھر وہ اپنی مخلوق پر رحم فرمائے گا۔ تو ہم دراصل اللہ کی رحمت کا مستحق بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ کہ اللہ ہم پر رحم فرمائے قیامت کے دن۔ اور پھر اس لفظ رحم کو ذہن میں لے کر آئیں۔ انسان کسی کو مصیبت میں مشکل میں دیکھتا ہے تو اس کو رحم آتا ہے۔ ترس آتا ہے۔ اور آپ اس پر ترس کھا کر اس کی کوئی مشکل دور کر دیتے ہیں کیوں۔ کس کا فائدہ ہے اس میں۔ اس شخص کا فائدہ ہے جس پر کہ رحم کیا جائے۔ رحم کرنے والے کا اپنا تو کوئی ذاتی فائدہ نہیں ہوتا۔ نہ کوئی اس کی اپنی غرض ہوتی ہے۔ بے غرض اور بے لوث کیفیت پائی جاتی ہے۔ رحم کے اندر بالکل ایسے ہی اللہ کی رحمت ہے اپنے بندوں کے اوپر۔ بندوں کو کھلا کر بندوں کو ملا کر ان کی ضروریات پوری کر کے اللہ کو نہ کوئی فائدہ ہے نہ اللہ کو کوئی غرض ہے۔ بالکل ایسی ہی محبت ماں کو اپنے new born بچے سے ہوتی ہے۔ نئے پیدا ہوئے بچے سے ہوتی ہے۔ اور یہ محبت کی بات ہم دیکھیں۔ پہلے ہم محبت کی بات کرتے ہیں پھر ہم رحم کی بات کرتے ہیں۔ پھر ہم تربیت کی بات کرتے ہیں۔ ان الفاظ کو compare ہم کریں۔ پھر ہم پرورش کی بات کرتے ہیں، پھر ہم sustain کرنے کی nourish کرنے کی بات کرتے ہیں۔ provide کرنا۔ رب کا مطلب provider۔ ضروریات کا پورا کرنے والا۔ اب سارے shades ہیں ان الفاظ کے۔ دنیا میں جو دو رشتے ہم دیکھتے ہیں ایک ماں کا رشتہ ایک باپ کا رشتہ۔ محبت ماں بھی کرتی ہے۔ محبت باپ بھی کرتا ہے۔ لیکن ماں کی محبت میں باپ کی محبت میں فرق ہوتا ہے۔ محبت دونوں کرتے ہیں لیکن کیا ہے۔ باپ ایک طرح سے trouble shooters ہوتے ہیں کوئی مشکل آجائے۔ کوئی پریشانی آجائے کوئی مسئلہ پیدا ہو جائے تو اس کو وہ حل کر دیتے ہیں۔ کہ کوئی مشکل ہے چلو اس کو یوں حل کر دیتے ہیں۔ اس لیے کہ باپ provider ہے فراہم کرتا ہے ضروریات زندگی۔ اب ماں کی ذمہ داری جو ہے وہ تھوڑی سی مختلف ہے محبت ماں بھی کرتی ہے۔ لیکن محبت کے ساتھ ساتھ جو ذمہ داری ماں کے اوپر ہے وہ تربیت کی ذمہ داری ہے۔ ماں تربیت کرتی ہے بچے کی۔ تربیت میں یہ چیز شامل ہوتی ہے کہ ہر ماں اس چیز کا انتظار نہیں کرتی کہ پہلے بچہ مشکل میں مبتلا ہو جائے پھر میں اس کا حل بتائے۔ ماں یوں نہیں کرتی۔ بلکہ وہ چاہتی ہے کہ پہلے

سے ہی اس کو کچھ سکھادوں۔ پہلے سے ہی اس سے کچھ کروادوں تاکہ وقت پڑنے پر یہ مشکل میں پڑے ہی نہ۔ اس پر مشکل آنے ہی نہ پائے۔ یہ ماں چاہتی ہے یہ نقصان سے بچ جائے۔ اس لیے کہ رحمی رشتہ ہے۔ ماں کا رحمی رشتہ ہے۔ womb کا تعلق ہے۔ بعض دفعہ ماں اپنے بچے کو چھوٹی تکلیف دے کر بڑی تکلیف سے بچالیتی ہے۔ چھوٹے بچے ہوتے ہیں ماں ان کی vaccination کراتی ہے۔ بچہ روتا ہے۔ بخار چڑھتا ہے۔ وہ تو ہوتا ہے نہ۔ کیا یہ ہم کہیں گے کہ کتنی ظالم ہے جان بوجھ کر۔ پلان کر کے ڈاکٹر سے اپوائنٹمنٹ لے کر گئی بچے کو تاکہ بچے کو بخار چڑھے۔ کیا یہ آپ کا مقصد تھا۔ ہرگز نہیں۔ آپ کو پتہ تھا کہ بچے کو بخار چڑھے گا۔ جی ہاں تو کیا آپ ظالم ہیں۔ کیا آپ کو بچہ برا لگتا ہے۔ کیا آپ sadist ہیں۔ نہیں۔ آپ نے اس کو اس لیے اس میں ڈالا کہ کل کو اس کے smallpox نہ ہوں۔ کل کو خدا ناخواستہ اس کو کوئی اور بیماری نہ ہو جائے۔ یہ تھوڑا سا بخار۔ یہ سوئی کی چبھن یہ بہتر ہے اس بڑی بیماری سے جو ہو سکتا ہے کہ vaccination نہ کرنے کی وجہ سے آجائے بچے کے اوپر۔ اس رحم کی وجہ سے بعض دفعہ بچوں کے ساتھ ماں سختی بھی کرتی ہے۔ یعنی زبردستی کچھ کاموں سے روکتی ہے۔ بہت دل چاہ رہا ہوتا ہے بچے کا کہ میں lunch نہ کھاؤں۔ گھر آکے میں مثال کے طور پر جوس پی لوں۔ کوک پی لوں۔ اب دو مائیں ہیں۔ دونوں کے بچے گھر آتے ہیں۔ ایک بچہ آکر ماں سے کہتا ہے کہ ہے کہ مجھے کھانا نہیں کھانا۔ مجھے کوک چاہیے۔ اب ماں خود گلاس بھر کر اس کو کوک دے دیتی ہے۔ بچہ خوش۔ ایک اور بچہ اپنی ماں سے کہتا ہے۔ ماں کہتی ہے بالکل نہیں۔ یہ کوئی کوک کا ٹائم نہیں ہے۔ ابھی تمہیں کھانا کھانا ہے۔ تو کون سی ماں اچھی ہے۔ وہ جو کھانا دے رہی ہے۔ لیکن بچہ تو خوش نہیں ہے اس لیے پھر کیسے اچھی ہو گئی۔ رحم میں یہ چیز ہے کہ ماں اپنی تعریف نہیں کرانا چاہتی۔ بے غرض ہے نا۔ اس کو یہ غرض نہیں ہے کہ بچہ میری تعریف کرے۔ کہتی ہے جو بچے کے لیے اچھا ہو جس سے بچہ صحتمند رہے۔ اس کے لیے فائدہ مند ہو۔ تو وہ اس کو نہیں sweet کھانے دیتی۔ روتا بھی ہے بچہ۔ چھوٹے بچے لوٹ بھی جاتے ہیں زمین کے اوپر۔ کہتی ہے کوئی بات نہیں۔ لیکن کوک کا ٹائم نہیں ہے یہ۔ تو بہت سی چیزیں جو بچے کو چاہیے ہوتی ہیں ماں نہیں دیتی۔ اور بچے کو کیا پتا کیا بچے نے پڑھا ہے سارا نیوٹریشن کہ میری باڈی میں شکر بہت زیادہ ہو جائے گی۔ پھر میں hyper ہو جاؤں گا۔ یہ اس کے بعد میرے دانت بھی خراب ہو جائیں گے۔ اور پھر اس کے بعد میں کمزور ہو جاؤں گا۔ یہ سب باتیں پتہ ہیں بچے کو۔ اسے کچھ نہیں پتہ۔ تو جو بچہ ناراض ہو رہا ہے وہ لاعلمی کم علمی کی وجہ سے۔ اور ماں جو اس کو نہیں دے رہی۔ وہ

بے رحمی کی وجہ سے نہیں۔ علم کی وجہ سے۔ماں کے پاس علم ہے۔وہ جانتی ہے۔ بعض دفعہ بچے کی مرضی کے خلاف کچھ کام اس سے کرواتی ہے۔ ایک تہ یہ ہے نہ کہ بہت سے کاموں سے روک دیتی ہے۔اور بعض دفعہ اس کو force کرتی ہے کہ تمہارادل نہیں بھی چاہ رہاتب بھی فلاں کام تم کرو۔ کھانا کھایا بچے نے اور بغیر برش کئے سو گیا۔ماں اٹھاتی ہے۔ کہتی ہے کہ نہیں برش کر کے سونا ہے۔ ہوم ورک کر کے سونا ہے۔ اگر یہ کام بچہ نہیں کرے گا تو ماں کے دانت نہیں خراب ہوں گے۔ لیکن بچہ نقصان اٹھائے گا۔ تو بچے کو کتنا بھی ناگوار لگے مگر ماں force کرتی ہے بچے کو کہ نہیں کرنا ہے یہ تم کو کام۔ یہ دراصل رحمی رشتے کی وجہ سے ہے۔ اس لیے کہ رحم کا رشتہ ہے۔ رحم دراصل محبت سے آنے کا بھی ایک stage ہے۔ یہ اعلیٰ تر درجہ ہے۔ محبت کے مقابلے میں۔ بے غرض محبت ہے اگلے کے فائدہ کے لئے۔ محبت کی بھی قسمیں ہیں انشاء اللہ وقتاً فوقتاً ہم ان کو ڈسکس کریں گے۔

لیکن یہ رحم یہ جس طرح کی محبت ہے یہ اعلیٰ ترین درجہ ہے محبت کا صرف لاڈ صرف محبت کرنا ہو سکتا ہے کہ یہ چیز کسی کو spoil کر دے۔ خراب کر دے۔ لیکن رحم کا جذبہ ایسا نہیں کرنے دیتا۔ spoil نہیں ہونے دیتا کسی کو۔ جو بھی باتیں ہم نے ڈسکس کیں رحم کے تعلق پر ماں اور بچے کے تعلق سے۔ یہ سمجھئے کہ یہ ایک ہلکی سی پرچھائیں ہے۔ ایک pale reflection ہے جو تعلق اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں کے ساتھ ہے۔ رحمان ہے۔ رحیم ہے۔ ہر طرح کے نقصان سے۔ ہر طرح کے غموں سے اپنے بندوں کو بچانا چاہتا ہے۔ بعض کاموں کا حکم دیتا ہے جو ہمیں اچھے نہیں لگتے۔ زبردستی کرنا پڑیں تو زبردستی کرو۔ لیکن کرو۔ اقیموا الصلوٰۃ۔ نماز قائم کرو۔ دل نہیں بھی چاہتا۔ تب بھی کرو۔ اور بعض دفعہ کوئی کام جو ہمیں بہت اچھے لگ رہے ہوتے ہیں۔ ان سے روک دیتا ہے۔ کہ تمہارا بہت دل چاہ رہا ہے یوں اور یوں کرنے کو لیکن بس میں نے تو منع کر دیا ہے۔ اس لیے کہ اللہ ہمیں نقصان سے بچانا چاہتا ہے۔ اللہ جس طرح کی محبت اپنے بندوں سے کرتا ہے بدتمیز اور disobedient بنانے والی محبت نہیں ہے۔ سرکش بنانے والی محبت اللہ اپنے بندوں سے نہیں کرتا۔ اس لیے کہ سرکش بلآخر انسان کو خود نقصان دیتی ہے۔

70 ماؤں سے بڑھ کر محبت کرنے والا ہے۔ لیکن کوئی یہ نہ سمجھے کہ بالکل ماں کی طرح ہے۔ یہ تو ایک سمجھانے کا سا انداز ہے جو اختیار کیا گیا ہے کہ اللہ 70 ماؤں سے بڑھ کر محبت کرتا ہے لیکن کوئی اس غلط فہمی کا شکار ہو جائے کہ بالکل ماں کی طرح ہے۔ یہ بات درست نہیں۔ وہ ماؤں کی طرح مجبور نہیں ہے۔ کوئی اس بات سے دھوکا نہ کھائے۔ بچے

ایک بار بڑے ہو جاتے ہیں اس کے بعد جو ان کا دل چاہتا ہے وہ کرتے ہیں۔ماں بوڑھی ہو چکی ہوتی ہے بچوں کا وہ کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتی۔ اللہ رحم فرمانے والا محبت فرمانے والا تو ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اس کی ایک شان مالک اور بادشاہ والی بھی ہے۔ دنیا میں تو محسوس نہیں ہوتا کہ اللہ کا انسانوں پر کچھ کنٹرول ہے۔directly نظر نہیں آتا۔ ہے تو! 100 فیصد ہے۔ لیکن انسان اس وقت محسوس نہیں کر سکتا۔ اپنے حواس خمسہ کے ذریعے سے۔ اس کو پتہ نہیں چلتا۔ وہ بھول جاتا ہے کہ اللہ میرا مالک ہے۔ اللہ بڑا بادشاہ ہے۔ لیکن ایک دن آئے گا جب وہ فرمان برداروں کو جزا دے گا۔ اور احسان فراموش انسانوں کو۔ اللہ کی محبت کے جواب میں اللہ سے ضد باندھنے والوں سے وہ حساب لے گا۔
بوڑھی ماں کا حال تو یہ ہوتا ہے کہ بچے اگر کہنا مانتے ہیں تو بہت اچھی بات ہے۔ اور اگر کہنا نہیں مانتے تو ماں مجبور ہوتی ہے۔ ماں کچھ بھی نہیں کر سکتی۔ ہم تصور نہیں کر سکتے کہ کوئی ماں اتنی ناراض ہو جائے کہ سزا دینے لگ جائے اپنے اتنے بڑے بڑے جوان بیٹوں کو۔ ہم کہتے ہیں کہ جیسے ماں نہیں کر سکتی تو اللہ بھی نہیں کرے گا۔ ہم اس چیز کی طرف سے بالکل بے فکر ہو جاتے ہیں کہ اللہ پکڑ بھی سکتا ہے۔ اللہ کی صفت رحم پر اتنا زیادہ فوکس کر لیتے ہیں کہ اس کے مالک ہونے کی شان، آقا ہونے والی شان، حبیب ہونے والی شان کہ وہ حساب لے گا۔accountability ہے یہ نظروں سے اوجھل ہونے لگتی ہے۔ تو چونکہ اللہ رحم فرمانے والا ہے نہ تو فوراً یہ چیزیں یاد دلا دیں۔ اس کو بھی یاد رکھنا۔ رحمان اور رحیم ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ مالک یوم الدین بھی ہے۔ روز جزا کا مالک ہے اللہ کے رحم کا تقاضہ ہے کہ وہ انصاف کرے۔ (تفسیر تنویر۔ زاہدہ تنویر)

مالک کہتے ہیں؟

مالک کہتے ہیں المتصرف فی الاعیان المملوکۃ کیف شاء (بیضاوی) وہ ہستی جو اپنے ملک میں جو چاہے کر سکے۔ اس لفظ سے ان عقائد باطلہ کی تردید ہو گئی جن میں ہندوستان کے مشرک اور کسی دوسری قومیں مبتلا تھیں یعنی خدا ہر مجرم کو سزا دینے پر مجبور ہے اسے معاف کرنے کا ہرگز اختیار نہیں۔ قرآن نے فرمایا وہ مالک و مختار ہے اور ہر چیز جن و انس سب اس کی ملکیت ہیں۔ جیسے چاہے ان سے سلوک فرمائے۔ اگر مجرم کو سزا دینا چاہے تو اسے کوئی روک نہیں سکتا۔ اور اگر بخشنا چاہے تو اسے کوئی ٹوک نہیں سکتا۔

دین کا معنی ہے حساب اور جزاء۔ لبید کہتا ہے حصادک یوماما زرعت وانما۔ یدان الفتی یوما کماھو دائن ثواب وعذاب کی تعبیر لفظ "دین" سے کی تا کہ پتہ چلے کہ یہ ثواب وعذاب بلاوجہ نہیں بلکہ ان کے اپنے اعمال کا طبعی ثمر ہے جس سے مضر نہیں۔ مقصد یہ ہے کہ انسان گناہوں کی لذت میں کھو کر ان برے نتائج سے بے خبر نہ ہو جائے جو رونما ہو کر رہیں گے۔ اپنی عمر ناپائیدار اور اس کی فناپذیر راحتوں اور عزتوں پر مغرور ہو کر اس دن کو نہ بھول بیٹھے جب کہ انصاف کے ترازو میں اس کا ہر چھوٹا بڑا نیک وبد عمل تولا جائے گا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ رب ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ اس کی رحمت بے پایاں ہے۔ لیکن اس کی یہ صفت کمال بھی ہر وقت پیش نظر رہے کہ وہ عادل ہے۔ حق تو یہ ہے کہ عدل کے بغیر اس کی صفات ربوبیت ورحمت کا کامل ظہور ہو ہی نہیں سکتا۔ کان کھول کر سن لو وہ دن آنے والا ہے جب سطوت وجبروت کے سب موہوم پیکر مٹ جائیں گے۔ اکڑی ہوئی سب گردنیں جھک جائیں گی۔ ظاہر وباطن میں اسی کی فرماں روائی ہو گی جو حقیقی فرماں روا ہے۔

کتنی افسوسناک حقیقت ہے کہ وہ امت جس کے دین کے بنیادی عقائد میں روز جزاء پر ایمان لانا ہے۔ میدان عمل میں اس کی غالب اکثریت میں اس ایمان کا کوئی اثر محسوس نہیں کیا جاتا۔ وہ روز حساب اور مکافات عمل کے قانون سے یوں غافل ہیں گویا کسی نے انھیں یہ بات بتائی ہی نہیں۔

(تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر محمد کرم شاہ الازہری)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: روز جزاء کا مالک ہے (الفاتحہ: ۳)

مالک اور ملک کی دو قراءتیں

مالک اور ملک اس آیت میں دونوں متواتر قراءتیں ہیں، امام عاصم، امام کسائی اور امام یعقوب کی قراءت میں مالک ہے۔ باقی پانچ ائمہ کی قرات میں ملک ہے۔

مالک اس شخص کو کہتے ہیں جو اپنی مملوکہ چیزوں میں جس طرح چاہے تصرف کرنے پر قادر ہو اور ملک اس شخص کو کہتے ہیں اپنی رعایا میں احکام (امر ونہی) نافذ کرتا ہو۔

قرآن مجید کی بعض آیات مالک کی موافقت میں ہیں اور بعض ملک کی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(آیت) "قل اللہ ملك الملك تؤتی الملك من تشآء وتنزع الملك ممن تشآء وتعز من تشآء وتذل من تشآء، بيدك الخير۔

(آل عمران:۲۶)

کہیے: اے اللہ! ملک کے مالک! تو جس کو چاہتا ہے ملک دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے ملک چھین لیتا ہے اور تو جس کو چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ذلت میں مبتلا کرتا ہے 'اور تمام بھلائی تیری ہاتھ میں ہے۔

(آیت) "یوم لا تملك نفس لنفس شيئا، والامر يومئذ للہ (الانفطار:۱۹)

یہ وہ دن ہے جس میں کوئی شخص کسی شخص کے لیے کسی چیز کا مالک نہیں ہوگا 'اور اس دن اللہ ہی کا ہوگا۔

ان دونوں آیتوں سے مالک کی تائید ہوتی ہے۔

(آیت) "قل اعوذ برب الناس ملك الناس"۔ (الناس:۲۔۱)

آپ کہیے: میں تمام لوگوں کے رب 'تمام لوگوں کے بادشاہ کی پناہ میں آتا ہوں۔

(آیت) "لمن الملك اليوم، للہ الواحد القھار"۔ (المومن:۱٦)

آج کس کی بادشاہی ہے؟ اللہ کی جو واحد ہے اور سب پر غالب ہے۔

(آیت) "الملك يومئذ للہ يحكم بينهم"۔ (الحج:۵٦)۔

اس دن صرف اللہ ہی کی بادشاہی ہوگی 'وہی ان کے درمیان فیصلہ فرمائے گا۔

اور ان دو آیتوں سے ملک کی تائید ہوتی ہے۔

یوم کا عرفی اور شرعی معنی

علامہ آلوسی لکھتے ہیں:

عرف میں طلوع شمس سے لے کر غروب شمس تک کے زمانہ کو یوم کہتے ہیں' اور اعمش کے سوا اہل سنت کے نزدیک شریعت میں طلوع فجر ثانی سے لے کر غروب شمس تک کے وقت کو یوم کہتے ہیں اور یوم قیامت اپنے معروف معنی میں حقیقت شرعیہ ہے۔(روح المعانی ج ا ص ۸۴ 'مطبوعہ دار احیاء التراث العربی 'بیروت)

یوم قیامت کی مقدار

قیامت کے دن کے متعلق قرآن مجید میں ہے:

(آیت) ”تخرج الملئکۃ والروح الیہ فی یوم کان مقدارہ خمسین الف سنۃ (المعارج:۴)

جبرائیل اور فرشتے اس کی طرف عروج کرتے ہیں (جس دن عذاب ہو گا) اس دن کی مقدار پچاس ہزار سال ہے۔

امام ابو یعلی روایت کرتے ہیں:

حضرت ابو سعید خدری (رض) روایت کرتے ہیں 'عرض کیا گیا: یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قرآن مجید میں اس دن کے متعلق ہے کہ وہ پچاس ہزار برس کا ہو گا 'یہ کتنا لمبا دن دن ہو گا؟ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: قسم اس ذات کی جس کے قبضہ وقدرت میں (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی جان ہے! مومن پر اس دن میں تخفیف کی جائے گی 'حتی کہ وہ جتنی دیر میں دنیا میں فرض نماز پڑھتا تھا اس پر وہ دن اس سے بھی کم وقت میں گزرے گا۔ (مسند ابو یعلی ج ۲ ص ۱۳۴ 'مطبوعہ دارالمامون ترات 'بیروت '۱۴۰۴ھ)

اس حدیث کو حافظ ابن جریر (جامع البیان ج ۲۹ ص ۴۵) اور حافظ ابن کثیر (تفسیر ابن کثیر ج ۷ ص ۱۱۳) نے بھی اپنی اپنی سندوں کے ساتھ روایت کیا ہے اور امام ابن حبان نے بھی اس کو روایت کیا ہے۔

(موارد الظمان الی زاوائد ابن حبان 'ص ۶۳۸ 'مطبوعہ دار الکتب العلمیہ 'بیروت)

امام بیہقی (رح) نے بھی اس کو روایت کیا ہے۔

علامہ سیوطی (رح) نے بھی اس کو امام احمد (رح) ' امام ابو یعلی (رح) ' امام ابن جریر (رح) ' امام ابن حبان (رح) ' اور امام بیہقی (رح) ' کے حوالوں سے ذکر کیا ہے۔ (الدرالمنثور ج ٦ ص ٢٦٥۔ ٢٦٤ ' مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ العظمی ' ایران)

علامہ آلوسی (رح) نے بھی اس کو مذکور الصدر حوالہ جات کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

(روح المعانی ج ٢٩ ص ٥٧ ' مطبوعہ داراحیاء التراث العربی ' بیروت)

حضرت ابو سعید خدری (رض) کی حدیث مذکور کے متعلق حافظ الہیثمی (رح) لکھتے ہیں:

اس حدیث کو امام احمد اور امام ابو یعلی (رح) نے روایت کیا ہے ' اس کا ایک راوی ضعیف ہے اور اس کی سند حسن ہے۔

(مجمع الزوائد ج ١٠ ص ٣٣٧ ' مطبوعہ دارالکتاب العربی ' ١٤٠٢ ھ)

نیز حافظ الہیثمی (رح) لکھتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: لوگ رب العلمین ' کے سامنے آدھے دن تک کھڑے رہیں گے جو پچاس ہزار برس کا ہوگا اور مومن پر آسانی کردی جائے گی ' جیسے سورج کے مائل بہ غروب ہونے سے اس کے غروب ہونے تک ' اس حدیث کو امام ابو یعلی نے روایت کیا ہے اور یہ حدیث صحیح ہے۔ (مجمع الزوائد ج ١٠ ص ٣٣٧ ' مطبوعہ دارالکتاب العربی ' ١٤٠٢ ھ)

امام احمد روایت کرتے ہیں:

حضرت ابو سعید خدری (رض) رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے روایت کرتے ہیں کہ کافر کے لیے قیامت کا دین پچاس ہزار برس کا مقرر کیا جائے گا کیونکہ اس نے دنیا میں نیک عمل نہیں کئے۔

(مسند احمد ج ٣ ص ٧٥ ' مطبوعہ مکتب اسلامی ' بیروت ' ١٣٩٨ ھ)

عدل وانصاف کا یہ تقاضا ہے کہ جو لوگ دنیا میں اس طرح نماز پڑھتے ہیں کہ گویا وہ نماز میں اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہے ہیں ' پھر وہ اس میں اس طرح محو ہوجاتے ہیں کہ انھیں گردوپیش کا ہوش نہیں رہتا ' امام ابوحنیفہ (رح) نماز پڑھ رہے تھے کہ مسجد کی چھت سے سانپ گر پڑا ' افراتفری مچ گئی مگر وہ اسی محویت سے نماز پڑھتے رہے ' ایک انصاری صحابی کو نماز کے دوران تیر لگا ' خون بہتا رہا اور وہ اسی انہماک سے نماز پڑھتے رہے ' امام بخاری کو نماز میں تتیہ نے سترہ ڈنک

مارے اور انھیں احساس تک نہ ہوا ،سو ایسے ہی کاملین کی یہ جزاء ہو گی کہ قیامت کے دن ان کو فی الواقع دیدار الہٰی عطا کیا جائے اور جب ان کو دیدار الہٰی عطا کیا جائے گا تو وہ اس کی دید میں ایسے مستغرق ہوں گے کہ قیامت کے ہنگامہ خیز پچاس ہزار برس گزر جائیں گے اور ان کو یوں معلوم ہو گا جیسے ایک فرض نماز پڑھنے کا وقت گزرا ہو ،لیکن اللہ تعالیٰ ہم پر عدل نہیں کرم فرماتا ہے ،عدل کے لحاظ سے تو ہم دنیا میں بھی کسی نعمت کے مستحق نہیں ہیں ،اللہ تعالیٰ دنیا میں بھی ہم کو دنیکوں کے صدقہ میں نعمتیں دیتا ہے ،سو آخرت میں بھی ان نیکوں کے طفیل ہم پر قیامت کا دن بہ قدر فرض نماز گزرے گا اور اپنے دیدار سے معمور فرمائے گا۔

وقوع قیامت پر عقلی دلیل

ہم اس دنیا میں دیکھتے رہتے ہیں کہ بعض لوگ ظلم کرتے کرتے مر جاتے ہیں اور ان کو ان کے ظلم پر کوئی سزا نہیں ملتی اور بعض لوگ ظلم سہتے سہتے مر جاتے ہیں اور ان کی مظلومیت پر کوئی جزا نہیں ملتی ،اگر اس جہان کے بعد کوئی اور جہان نہ ہو تو ظالم سزا کے بغیر اور مظلوم جزا کے بغیر رہ جائے گا اور یہ چیز اللہ تعالیٰ کی حکمت کے خلاف ہے ،اس لیے یہ ضروری ہے کہ اس عالم کے بعد کوئی اور عالم ہو جس میں ظالم کو سزا دی جائے اور مظلوم کو جزا۔

اور جزاء اور سزاء کے نظام کے برپا کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس عالم کو بالکلیہ ختم کر دیا جائے ،کیونکہ جزاء اور سزا اس وقت جاری ہو سکتی ہے جب بندوں کے اعمال ختم ہو جائیں ،اور جب تک تمام انسان اور یہ کائنات ختم نہیں ہو جاتی لوگوں کے اعمال کا سلسلہ ختم نہیں ہو گا ،مثلاً قابیل نے قتل کرنے کا طریقہ ایجاد کیا ،اب اس کے بعد جتنے قتل ہوں گے ان کے قتل کے جرم سے قابیل کے نامہ اعمال میں گناہ لکھا جاتا رہے گا ،اس لیے جب تک قتل کا سلسلہ ختم نہیں ہو جاتا قابیل کا نامہ اعمال مکمل نہیں ہو گا ،اسی طرح ہابیل نے ظالم سے بدلہ نہ لینے کی رسم ایجاد کی ،اب اس کے بعد جو شخص بھی یہ نیکی کرے گا اس کی نیکی میں سے ہابیل کے نامہ اعمال میں نیکی لکھی جاتی رہے گی ،اس لیے جب تک اس نیکی کا سلسلہ ختم نہیں ہو جاتا ہابیل کا نامہ اعمال مکمل نہیں ہو گا ،اسی طرح ایک شخص مسجد یا کنواں بنا کر مر جاتا ہے تو جب تک اس مسجد میں نماز پڑھی جاتی رہے گی ،جب تک اس کنوئیں سے پانی پیا جاتا رہے گا ،اس شخص

کے نامہ اعمال میں نیکیاں لکھی جاتی رہیں گی اور کوئی شخص بت خانہ یا شراب خانہ بنا کر مر گیا تو جب تک وہاں بت پرستی یا شراب نوشی ہوتی رہے گی اس کے نامہ اعمال میں برائیاں لکھی جاتی رہیں گی۔

اس لیے جب تک یہ دنیا اور اس دنیا میں انسان موجود ہیں اس وقت تک لوگوں کا نامہ اعمال مکمل نہیں ہو سکتا اور لوگوں کے نامہ اعمال کو مکمل کرنے کے لیے دنیا اور دنیا والوں کو مکمل ختم کرنا ضروری ہے اور اسی کا نام قیامت ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حکمت اس کی متقاضی ہے کہ جزا اور سزا کا نظام قائم کیا جائے اور جزا اور سزا کو نافذ کرنے سے پہلے قیامت کا قائم کرنا ضروری ہے۔

وقوع قیامت پر شرعی دلائل

یہ دنیا دارالامتحان ہے اور اس میں انسان کی آزمائش کی جاتی ہے اور اس امتحان کا نتیجہ اس دنیا میں ظاہر نہیں ہوتا لیکن نیک اور بد 'اطاعت گزار اور نافرمان 'موافق اور مخالف اور مومن اور کافر میں فرق کرنا ضروری ہے اور یہ فرق صرف قیامت کے دن ظاہر ہو گا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

(آیت) "لیجزی الذین اسآءوا بما عملوا ویجزی الذین احسنوا بالحسنی (النجم:۳۱)

تاکہ برے کام کرنے والوں کو ان کی سزا دے اور نیکی کرنے والوں کو اچھی جزا دے۔

(آیت) "ام نجعل الذین امنوا وعملوا الصلحت کالمفسدین فی الارض ام نجعل المتقین کالفجار (ص:۲۸)

کیا ہم ایمان والوں اور نیکی کرنے والوں کو زمین میں فساد کرنے والوں کی طرح کر دیں گے ؟ یا ہم پرہیز گاروں کو بدکاروں جیسا کر دیں گے ؟۔

(آیت) "ام حسب الذین اجترحوا السیات ان نجعلھم کالذین امنوا وعملوا الصلحت' سوآء محیاھم ومماتھم سآء ما یحکمون۔ (الجاثیہ:۲۱)

کیا برے کام کرنے والوں نے یہ گمان کر لیا ہے کہ ہم ان کو ان لوگوں کی طرف کر دیں گے جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کئے کہ (ان سب کی) زندگی اور موت برابر ہو جائے؟ وہ کیسا برا فیصلہ کرتے ہیں۔

(آیت) "افنجعل المسلمین کالمجرمین مالکم کیف تحکمون (القلم:٣٦۔٣٥)

کیا ہم فرمان برداروں کو مجرموں جیسا کر دیں گے تمہیں کیا ہوا 'تم کیسا فیصلہ کرتے ہو؟

دنیا میں راحت اور مصیبت کا آنا مکمل جزاء اور سزا نہیں ہے

ہر چند کہ بعض لوگوں کو دنیا میں ہی ان کی بداعمالیوں کی سزا مل جاتی ہے۔ مثلاً ان کا مالی نقصان ہو جاتا ہے 'یا وہ ہولناک بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں یا ان پر دشمنوں کا خوف طاری ہو جاتا ہے 'لیکن یہ ان کی بداعمالیوں کی پوری پوری سزا نہیں ہوتی 'اور ہم کتنے ہی لوگوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ ساری عمر عیش پرستی 'ہوس ناکیوں اور ظلم وستم کرنے میں گزار دیتے ہیں 'پھر اچانک ان پر کوئی مصیبت ٹوٹ پڑتی ہے اور ان کی دولت اور طاقت کا نشہ کافور ہو جاتا ہے۔ لیکن ان کے جرائم کے مقابلہ میں یہ بہت کم سزا ہوتی ہے 'اس لیے ان کی مکمل سزا کے لیے ایک اور جہاں کی ضرورت ہے جہاں قیامت کے بعد ان کو پوری پوری سزا ملے گی۔

(آیت) "ولنذیقنھم من العذاب الادنی دون العذاب الاکبر لعلھم یرجعون۔

(السجدہ:٢١)

اور ہم ان کو بڑے عذاب سے پہلے (دنیا میں) ہلکا عذاب ضرور چکھائیں گے تاکہ وہ باز آجائیں۔

اس طرح بہت سے نیک بندے ساری عمر ظلم وستم سہتے رہتے ہیں اور مصائب برداشت کرتے رہتے ہیں اور انھیں اپنی زندگی میں آرام اور راحت کا بہت کم موقعہ ملتا ہے 'اس لیے اللہ تعالیٰ قیامت کو قائم کرے گا اور ہر شخص کو اس کی نیکی اور بدی کی پوری پوری جزا اور سزا دے گا۔

(آیت) "فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ ومن یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ

(الزلزال:٨۔٧)

سو جو ذرہ برابر نیکی کرے گا وہ اس کی (جزا) پائے گا اور جو ذرہ برابر برائی کرے گا وہ اس کی (سزا) پائے گا۔

دین کا لغوی معنی

علامہ زبیدی لکھتے ہیں:

دین کا معنی ہے جزا اور مکافات 'قرآن مجید میں (آیت) "مالک یوم الدین "کا معنی ہے: یوم جزاء کا مالک 'دین کا معنی عادت بھی ہے 'کہا جاتا ہے: "ماز ال ذالك ديني "میری ہمیشہ سے یہ عادت ہے 'اور دین کا معنی اللہ تعالیٰ کی عبادت ہے 'اور دین کا معنی طاعت ہے 'حدیث میں ہے:

یمرقون من الدین مروق السھم من الرمیة:

وہ امام کی اطاعت سے اس طرح نکل جائیں گے جس طرح تیر شکار سے نکل جاتا ہے۔

(علامہ سید محمد مرتضی حسینی زبیدی حنفی متوفی ۱۲۰۵ 'تاج العروس ج۹ ص۲۰۸۔۲۰۷ 'مطبوعہ المطبعۃ الخیریہ 'مصر ۱۳۰۶ھ)

دین 'شریعت اور مذہب وغیرہ کی تعریفات

میر سید شریف لکھتے ہیں:

دین ایک الٰہی دستور ہے جو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس ہوتا ہے جو عقل والوں کو قبول کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ دین اور ملت متحد بالذات ہیں اور مختلف بالاعتبار ہیں کیونکہ شریعت بہ حیثیت اطاعت دین ہے اور بہ حیثیت ضبط اور تحریر ملت ہے 'اور جس حیثیت سے اس کی طرف رجوع کیا جائے مذہب ہے 'ایک قول یہ ہے کہ دین اللہ کی طرف منسوب ہے اور ملت رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف منسوب ہے اور مذہب مجتہد کی طرف منسوب ہے۔ (کتاب التعریفات ص۴۷ 'مطبوعہ المطبعۃ الخیریہ 'مصر ۱۳۰۶ھ)

عبودیت کا التزام کر کے حکم ماننا شریعت ہے 'ایک قوم یہ ہے کہ شریعت دین کا ایک راستہ ہے۔

(کتاب التعریفات ص ۵۵ ،مطبوعہ المطبعۃ الخیریہ ،مصر ۱۳۰٦ھ)

علامہ بدرالدین (رح) عینی لکھتے ہیں:

"شرعة ومنهاجا" کی تفسیر میں قتادہ (رض) نے کہا: دین ایک ہے اور شریعت مختلف ہے۔

(عمدۃ القاری ج ۱ ص ۱۱۷ ،مطبوعہ ادارۃ الطباعۃ المنیریہ ،مصر ۱۳۴۸ھ)

علامہ قرطبی مالکی (رح) لکھتے ہیں:

اللہ تعالیٰ نے اہل توراۃ کے لیے توراۃ مقرر کی اور اہل انجیل کے لیے انجیل اور اہل قرآن کیلیے قرآن مقرر کیا اور یہ تقرر شریعتوں اور عبادتوں میں ہے اور اصل توحید ہے جس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

(الجامع الاحکام القرآن ج ۲ ص ۲۱۱ مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو ایران ۱۳۸۷ھ)

امام بخاری (رح) مجاہد (رح) سے روایت کرتے ہیں:

اے محمد! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہم نے آپ کو اور حضرت نوح (علیہ السلام) کو ایک ہی دین کی وصیت کی ہے۔

(صحیح بخاری ج ۱ ص ٦ ،مطبوعہ نور محمد اصح المطابع ،کراچی ،۱۳۸۱ھ)

قرآن مجید میں ہے:

اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے اسی دین کا راستہ مقرر کیا ہے جس کا حکم اس نے نوح کو دیا تھا اور جس دین کی ہم نے آپ کی طرف وحی فرمائی ہے اور جس کا حکم ہم نے ابراہیم (علیہ السلام)، موسیٰ (علیہ السلام) اور عیسیٰ (علیہ السلام) کو دیا تھا کہ اسی دین کو قائم رکھو اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ تمام انبیاء (علیہم السلام) کا دین واحد ہے اور وہ اسلام ہے۔

(آیت) "لكل جعلنا منكم شرعة ومنهاجاء"۔ (المائدہ:۴۸) ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے الگ الگ شریعت اور واضح راہ عمل بنائی ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ

ہر نبی کی شریعت الگ ہے

قرآن مجید کی ان آیات اور احادیث اور عبارات علماء کا حاصل یہ ہے کہ جو عقائد اور اصول تمام انبیاء میں مشترک ہیں مثلاً توحید ' رسالت قیامت جزاء ' سزا ' اللہ کی تعظیم اور اس کے شکر کا واجب ہونا ' قتل اور زنا کا حرام ہونا ' ان کا نام دین ہے اور ہر نبی نے اپنے زمانہ کے مخصوص حالات کے اعتبار سے عبادات اور نظام حیات کے جو مخصوص احکام بتائے وہ شریعت ہے ' ان کو مدون اور منضبط کرنا ملت ہے اور امام اور مجتہد نے کتاب اور سنت سے جو احکام مستنبط کیے ان کا نام مذہب ہے ' اور مشائخ طریقت نے جو اوراد اور وظائف کے مخصوص طریقے بتائے ان کا نام مسلک اور مشرب ہے اور کسی مخصوص درسگاہ کے نظریات کا نام مکتب فکر ہے ' مثلاً یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہم دین کے اعتبار سے مسلمان ہیں ' شریعت کے اعتبار سے محمدی ہیں ' مذہب کے اعتبار سے ماتریدی اور حنفی ہیں اور مسلک اور مشرب کے اعتبار سے قادری ہیں اور مکتب فکر کے لحاظ سے بریلوی ہیں۔

اللہ ' رب ' رحمن ' رحیم اور مالک یوم الدین میں وجہ ارتباط

سورۃ فاتحہ کے شروع میں اللہ تعالیٰ نے اپنے پانچ اسماء ذکر کئے ہیں: اللہ ' رب ' رحمن ' رحیم اور مالک یوم الدین اور ان میں ارتباط اس طرح ہے کہ "اللہ" کے تقاضے سے اس نے انسان کو پیدا کیا " 'رب" کے تقاضے سے اس نے غیر متناہی نعمتوں سے انسان کی پرورش کی " 'رحمن" کے تقاضے سے انسان کے گناہوں پر پردہ رکھا "'رحیم" کے تقاضے سے انسان کی توبہ قبول کرکے اس کو معاف فرمایا اور (آیت) "مالك يوم الدين" کے تقاضے سے انسان کو اس کے اعمال صالحہ کی جزاء عطا فرمائی۔

اگر یہ سوال ہو کہ "بسم الله الرحمن الرحيم" میں بھی اللہ تعالیٰ کی صفت رحمن ور حیم کا ذکر ہے اور سورۃ فاتحہ کی ابتداء میں پھر ان صفات کا ذکر ہے ' اس کی کیا وجہ ہے کہ رحمن اور رحیم کو دو مرتبہ ذکر کیا ہے اور باقی اسماء کا دو مرتبہ ذکر نہیں ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ہو سکتا ہے کہ اس میں یہ اشارہ ہو کہ اللہ تعالیٰ پر رحمت کا غلبہ ہے اس لیے بندہ کو اس سے مایوس نہیں ہونا چاہیے اور ہر وقت اس کی رحمت پر نظر رکھنی چاہیے ' اس کے بعد (آیت) "

مالک یوم الدین "فرمایا کہ کہیں اس کی رحمت سے دھوکا کھا کر انسان گناہوں پر دلیر نہ ہو جائے کیونکہ وہ "مالک یوم الدین "بھی ہے۔

جس طرح اس آیت میں فرمایا ہے:

غافر الذنب و قابل التوب شدید العقاب ذی الطول۔ (المومن:۴۰)

وہ گناہ بخشنے والا اور توبہ قبول کرنے والا ' بہت سخت عذاب دینے والا قدرت والا ہے۔

"الحمد لله "میں مسند الیہ مقدم ہے اور خبر معرفہ ہے اور عربی قواعد کے مطابق ایسی ترکیب مفید حصر ہوتی ہے ' نیز اللہ تعالیٰ کی صفات رب ' رحیم 'اور (آیت) "مالك یوم الدین "بہ منزلہ علت ہیں 'اس اعتبار سے معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی حمد کا مستحق نہیں ہے کیونکہ وہی رب ہے 'وہی رحمن، رحیم اور مالک روز جزاء ہے ' اور اس میں یہ رمز ہے کہ جس میں یہ صفات نہ ہوں وہ توستائش کے لائق بھی نہیں ہے چہ جائیکہ وہ پرستش کا مستحق ہو اور جب یہ معلوم ہو گیا کہ اللہ ہی حمد و ثناء کے لائق ہے اور وہی عبادت کا مستحق ہے تو ہم سے یہ کہلوایا: اے پروردگار !ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ سے ہی مدد چاہتے ہیں۔

(تفسیر تبیان القرآن۔ علامہ غلام رسول سعیدی)

جب الرحمن الرحیم، کہا گیا تو اس سے انسان کا دل بخشش و مغفرت کی امیدوں سے بھر گیا، اب حکمت الٰہیہ کا تقاضا ہوا کہ ساتھ جلال خداوندی کا ذکر بھی ہو تو فرمایا گیا، ملك یوم الدین، کہ اللہ یوم انصاف کا مالک بھی ہے، یعنی وہ روز قیامت دربار انصاف لگائے گا جہاں مجرموں کو سزا اور محسنوں کو جزا دی جائے گی لہذا محض الرحمن الرحیم پڑھ کو کوئی ناسمجھ انسان بازار فسق و فجور گرم نہ کرے۔ گویا الرحمن الرحیم، کہہ کر بندوں کو امید رحمت دی گئی اور مالک یوم الدین کہہ کر خوف عذاب دلایا گیا اور یہی (امید رحمت اور خوف عذاب) ایمان کی دو سرحدیں ہیں۔ حدیث میں ہے: الایمان بین الخوف والرجا: ایمان خوف و امید کی درمیان ہے۔ اس لیے اہل ایمان کی شان کی گئی، یدعون ربھم خوفا وطمعا، وہ اپنے رب کو خوف و امید کے ساتھ پکارتے ہیں (سورۃ سجدہ)

دوسرے لفظوں میں الرحمن الرحیم، کہہ کر بندوں کو نیکی کا شوق اور مالک یوم الدین کہہ کر انھیں گناہوں سے خوف دلایا گیا ہے۔ اگر کہا جائے کہ اللہ تو ہر چیز کا مالک ہے پھر صرف روز انصاف کے مالک ہونے کا ذکر کیوں کیا گیا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ آج دنیا میں لوگ بھی مختلف اشیاء پر دعوی ملکیت رکھتے ہیں مگر روز قیامت صرف اللہ ہی کی ملکیت ہو گی ہر انسان خالی ہاتھ اٹھے گا، اس لیے اللہ کی ملکیت کو یوم انصاف کے حوالے سے خصوصا یاد کیا گیا۔

قیامت کا آنا تقاضائے عقل بھی ہے

یاد رہے! قرآن مجید تو قیامت کا آنا بتا ہی رہا ہے، عقل بھی اس امر کا تقاضا کرتی ہے کہ قیامت کا دن ضرور آنا چاہیے اس لیے کہ دنیا میں کچھ لوگ مظلومی کی زندگی گزار کر چلے جاتے ہیں۔ کوئی ان کی فریاد نہیں سنتا اور کچھ لوگ ساری زندگی ظلم و ستم کا بازار گرم رکھتے ہیں کوئی ان کا ہاتھ نہیں روکتا۔ اب ضروری ہے کہ ایک ایسا دن آئے جب ظالموں کو ان کے ظلم کی سزا اور مظلوموں کو ان کے صبر کی جزا دی جائے۔ چنانچہ روز قیامت اللہ تعالیٰ مظلوموں کو ظلم کا بدلہ اور ظالموں کو ان کی سزا دے گا۔ یہی فلسفہ قیامت اور مالك یوم الدین، کا معنی ہے۔ اگر قیامت پر ایمان نہ ہو تو معنی یہ ہے کہ ظالم اور مظلوم دونوں کا انجام ایک جیسا ہو جائے اور یہ خلاف عقل ہے۔

اسی طرح دنیا میں لوگوں کے مابین ہزار ہا اختلافات ہیں۔ کوئی اللہ کو مانتا ہے کوئی نہیں کوئی اللہ کو ایک مانتا ہے کوئی اس کے ساتھ جھوٹے خداؤں کو ملاتا ہے یہود کثیر انبیاء پر جھوٹی تہمتیں رکھتے ہیں مومنین ان کا رد کرتے ہیں عیسائی حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو خدا کا بیٹا مانتے ہیں مومنین انھیں بطور نبی پیش کرتے ہیں اب ضروری ہے کہ ایک آئے جب ان اختلافات کا فیصلہ ہو۔ ہر کسی کو خبر ہو جائے کہ سچ کیا ہے جھوٹ کیا ہے اور قیامت فیصلے ہی کا دن ہے اسی لیے اسے یوم الفصل بھی کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ان ربھو یفصل بینھم یوم القیامۃ فیما کانوا فیہ یختلفون۔ (سورۃ سجدہ)

(تفسیر برہان القرآن۔ علامہ قاری محمد طیب)

علامہ پیر زادہ امداد حسین شاہ صاحب فرماتے ہیں

اس دن کا مالک جس میں ہر انسان کو اس کے اچھے کاموں کا حسین ثواب اور برائیوں کا دردناک عذاب دیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کی صفات رحمت پڑھنے والا بے عملی کا شکار ہو سکتا تھا مگر مالک روز جزا نے اسے متنبہ کر دیا۔ یہ سب درست ہے کہ اس کی رحمتوں کی کوئی حد نہیں، جس کو چاہے بخش دے لیکن وہ بااختیار منصف بھی ہے، کوئی مجرم اس کی گرفت سے بچ نہیں سکتا۔

لہٰذا اے انسان! اس فانی زندگی اور چند روزہ عیش وراحت پر مغرور ہو کر اس دن کو فراموش نہ کر جو ابدی زندگی اور حقیقی جزاو سزا کا پہلا دن ہو گا۔ اچھے کام کر اور قبولیت کے لیے اس کی رحمتوں پر امید رکھ۔ ناجائز کاموں کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈر کیونکہ اللہ تعالیٰ کی غضب سے بے خوفی انسان کو بے عمل اور اس کی رحمت سے مایوسی انسان کو ظالم بنا دیتی ہے، لہٰذا ایک طرف اس کی رحمت پر امید رکھ اور دوسری طرف اس کے غضب سے ڈر، یہی ایمان کی نشانی ہے۔ اس کے مزید تشریح کے لیے حضرت عمر فاروق (رض) کا ارشاد غور طلب ہے: "اگر آسمان سے آواز آئے: اے لوگو! سوائے ایک انسان کے آپ سب لوگ جنت میں داخل ہونے والے ہیں تو مجھے اللہ تعالیٰ کے غضب سے اتنا ڈر ہے کہ وہ میں ہوں گا، اور اگر اعلان یہ ہو: اے لوگو! سوائے ایک انسان کے تم سب جہنم میں داخل ہونے والے ہو تو مجھے اللہ تعالیٰ کی رحمت سے اتنی امید ہے کہ وہ میں ہوں گا"۔ (کنز العمال: 35916: جلد 12: ص 620)

حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "اگر مومن کو اللہ تعالیٰ کی سزا کا علم ہو جائے تو کوئی بھی جنت کا لالچ نہ کرے اور اگر کافر کو اللہ تعالیٰ کی رحمت کا علم ہو جائے تو کوئی بھی جنت سے مایوس نہ ہو"۔

(صحیح مسلم: 2755: کتاب التوبۃ: باب 4)

اللہ تعالیٰ آج بھی ساری کائنات کا مالک ہے، لیکن اس آیت میں روز جزا کی تخصیص شاید اس لیے ہے کہ آج جو لوگ اللہ تعالیٰ کا مالک نہیں مانتے قیامت کے دن اس کی بادشاہی کا مشاہدہ کر کے وہ بھی اس کے مالک ہونے کا اقرار کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

(تفسیر امداد الکرم۔ محمد امداد حسین پیر زادہ)

ملک یوم الدین۔ مالک روز جزاء کا

ایک قرات میں ملک یوم الدین بھی آیا ہے جس کے معنی ہوتے ہیں "بادشاہ روز جزا کا"۔ یہاں یہ سمجھنا ضروری ہے کہ مالک جمیع اشیاء ہر آن و ہر ساعت حق تعالیٰ عزوجل کی ذات پاک کے سوا حقیقتاً کوئی نہیں۔ اس لیے کہ خالق کل اشیاء وہی ہے تو مالک بھی وہی ہے ایسے ہی ملک یعنی بادشاہ بھی حقیقتاً ہونا اسی کا خاصا ہے وہی ہر آن و ساعت ہر شے پر حکمران اور ہر شے کا حاکم ہے۔ لیکن روز جزا کا مالک ہونا اور ملک اس کا نظر خاص و عام میں حقیقت و مجاز ظہور فرما رہا ہے اور حکمت الٰہی متقاضی ہے کہ مخلوق کو بھی ملک و ملک کا کچھ حصہ عطا ہوتا ہو۔ تاکہ کارخانہ عمل صحیح ہو۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ انسان مستعد تکلیف و قبول احکام الٰہی پر بموجب اپنی جبلت کے ہے اس لیے اسے اس کام لیے پکڑا گیا ہے۔ لہٰذا بعض اشیاء اگر اس کی ملک میں نہ ہوتے اور بعض کا بعض پر بنی نوع سے اس کا حکم جاری نہ ہو تو اس کے اعمال طالح و صالح پر اس سے کس طرح بازپرس صحیح ہوتی۔ علی الخصوص وہ عمل جن کا تعلق مال اور ذبح حیوانات اور عطائے صدقات اور ادائے نفقات سے ہے اور اس قسم کے بہت سے اعمال ہیں جن کا تعلق رعیت و راعی سے ہے یہ بغیر حکمرانی ناممکن ہے۔

بنابریں بمقتضاء حکمت اس دنیا میں بندے کو بھی حکومت و ملوکیت عطا کی گئی تاکہ روز جزا میں بندہ اپنی معذوری اور بے حکمی کا عذر نہ لا سکے اور اس کی ایسی حجتیں کلیتہً زائل ہو جائیں۔ اور روز جزا جسے یوم الدین فرمایا گیا اس دن پاداش عمل درست ہو۔ اور اس دن کسی کی ملکیت اور کسی کا تصرف نہ رہے۔ اس لیے ملک یوم الدین فرما کر مطلع کر دیا کہ اس دن جزا و سزا صرف اور صرف ہم ہی دینے والے ہیں۔

ویسے اس دن کو **یوم القیامہ، یوم البعث و النشور** وغیرہ بھی فرما کر اس طرف اشارہ فرما دیا کہ اس دن صرف اور صرف ہماری ہی ذات ہو گی اور **لمن الملك اليوم لله الواحد القهار**۔ (آج کس کی بادشاہی ہے اللہ اکیلے زبردست کی) بھی فرما دیا۔

یہاں یہ سمجھ لینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حمد کو اول اسم ذات کے ساتھ متعلق فرمایا اس کے بعد تین صفتیں بیان فرمائیں۔

اول رب العلمین میں صفت ربوبیت۔
دوسرے الرحمن الرحیم میں صفت رحمت۔
تیسرے ملک یوم الدین میں صفت جزا۔

اس طریق بیان میں عجیب و دقیق نکتہ ہے وہ یہ کہ

جو بھی عالم میں کسی کی ثناو ستائش کرتا ہے، وہ تین حال سے خالی نہیں ہوتا۔ اول یہ کہ جس کی ثناء کر رہا ہے اس کا پرانا نمک خوار تھا اگرچہ اب نہ ہو اور آئندہ بھی اس سے امید نفع نہ ہو لیکن پرانے احسان کی وجہ میں یہ اس کی ثناو ستائش کرتا ہے۔
یا یہ کہ پہلے منتفع نہیں تھا لیکن اب منتفع ہو رہا ہے اگرچہ مستقبل میں بھی امید نفع نہ ہو تاہم احسان مند ہو گا۔ تیسرے یہ کہ امید نفع ہو اگرچہ زمانہ سابق و حال میں اس سے منتفع نہ ہوا ہو۔ یہ تینوں صورتیں دنیا میں ہر ایک کو کسی نہ کسی کے ساتھ رہتی ہیں۔ تو رب العلمین۔ الرحمن الرحیم۔ ملك یوم الدین فرما کر اس طرف اشارہ فرمایا گیا کہ اگر بندہ غور کرے تو ہماری نعمتیں اس پر پہلے سے رہیں کہ اسے قطرہ سے علقہ اور علقہ سے مضغہ اور مضغہ سے جنین اور جنین سے طفل اور طفل سے بڑھا کر کیا کیا بنا دیا۔ اس حال میں اس پر حمد و ثناء واجب ہے کہ اس نے ہماری ربوبیت کی نعمتوں سے تمتع حاصل کیا۔ اور اگر وہ اپنے اوپر عاجل نعمتیں دیکھے تو ہم نے رحمن ورحیم کی صفات کا مظاہرہ فرما رکھا ہے۔ اور اگر انجام و آخر پر نظر کرے جسے کارخانہ جزا کہتے ہیں جسے یوم الدین کہا جاتا ہے تو بھی ہم ہی ثناء و ستائش کے حقدار ہیں اس لیے کہ اس دن نقیر سے قطمیر تک سب ہمارے حضور حاضر ہوں گے۔

(تفسیر الحسنات۔ علامہ سید ابو الحسنات محمد احمد قادری)

حقیقی وارث مالک کون ہے؟

بعض قاریوں نے ملک پڑھا ہے اور باقی سب نے مالک اور دونوں قرأتیں صحیح اور متواتر ہیں اور سات قرأتوں میں سے ہیں اور مالک نے لام کے زیر اور اس کے سکون کے ساتھ۔ اور ملیک اور ملکی بھی پڑھا گیا ہے پہلے کی دونوں قرأتیں معانی کی رو ترجیح ہیں اور دونوں صحیح ہیں اور اچھی بھی۔ زمخشری نے ملک کو ترجیح دی ہے اس لیے کہ حرمین والوں کی یہ قرأت ہے۔ اور قرآن میں بھی آیت (لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ)40۔ غافر:16) اور (قَوْلُهُ الْحَقُّ وَلَهُ الْمُلْكُ)6۔ الانعام:73) ہے۔ امام ابو حنیفہ سے بھی حکایت بیان کی گئی ہے کہ انھوں نے ملک پڑھا اس بنا پر کہ فعل اور فاعل اور مفعول آتا ہے لیکن یہ شاذ اور بیحد غریب ہے۔ ابو بکر بن داؤد نے اس بارے میں ایک غریب روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور آپ کے تینوں خلفاء اور حضرت معاویہ اور ان کے لڑکے مالک پڑھتے تھے۔ ابن شہاب کہتے ہیں کہ سب سے پہلے مروان نے ملک پڑھا۔ میں کہتا ہوں مروان کو اپنی اس قرأت کی صحت کا علم تھا۔ راوی حدیث ابن شہاب کو علم نہ تھا واللہ اعلم۔ ابن مردویہ نے کئی سندوں سے بیان کیا ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مالک پڑھتے تھے۔ مالک کا لفظ ملک سے ماخوذ ہے جیسے کہ قرآن میں ہے آیت (اِنَّا نَحْنُ نَرِثُ الْاَرْضَ وَمَنْ عَلَيْهَا وَاِلَيْنَا يُرْجَعُوْنَ)19۔ مریم:40) یعنی زمین اور اس کے اوپر کی تمام مخلوق کے مالک ہم ہی ہیں اور ہماری ہی طرف سب لوٹا کر لائے جائیں گے۔ اور فرمایا آیت (قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۝ مَلِكِ النَّاسِ ۝)114۔ الناس:2-1) یعنی کہہ کہ میں پناہ پکڑتا ہوں لوگوں کے رب اور لوگوں کے مالک کی۔ اور ملک کا لفظ ملک سے ماخوذ ہے جیسے فرمایا آیت (لمن الملك اليوم) الخ یعنی آج ملک کس کا ہے صرف اللہ واحد غلبہ والے کا۔ اور فرمایا آیت (قَوْلُهُ الْحَقُّ وَلَهُ الْمُلْكُ يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ)6۔ الانعام:73) اسی کا فرمان ہے اور اسی کا سب ملک ہے۔ اور فرمایا آج ملک رحمن ہی کا ہے اور آج کا دن کافروں پر بہت سخت ہے۔ اس فرمان میں قیامت کے دن ساتھ ملکیت کی تخصیص کرنے سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے، اس لیے کہ پہلے اپنا وصف رب العالمین ہونا بیان کر چکا ہے دنیا اور آخرت دونوں شامل ہیں۔ قیامت کے دن کے ساتھ اس کی تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ اس دن تو کوئی ملکیت کا دعویدار بھی نہ ہو گا۔

بلکہ بغیر اس حقیقی مالک کی اجازت کے زبان تک نہ ہلا سکے گا۔ جیسے فرمایا جس دن روح القدس اور فرشتے صف بستہ کھڑے ہوں گے اور کوئی کلام نہ کر سکے گا۔ یہاں تک کہ رحمن اسے اجازت دے اور وہ ٹھیک بات کہے گا۔ دوسری جگہ ارشاد ہے سب آوازیں رحمن کے سامنے پست ہوں گی اور گنگناہٹ کے سوا کچھ نہ سنائی دے گا اور فرمایا جب قیامت آئے گی اس دن بغیر اللہ تبارک و تعالیٰ کی اجازت کے کوئی شخص نہ بول سکے گا۔ بعض ان میں سے بد بخت ہوں گے اور بعض سعادت مند۔ ابن عباس فرماتے ہیں اس دن اس کی بادشاہت میں اس کے سوا کوئی بادشاہ نہ ہو گا جیسے کہ دنیا میں مجازاً تھے۔ آیت (یوم الدین سے مراد مخلوق کے حساب کا یعنی قیامت کا دن ہے جس دن تمام بھلے برے اعمال کا بدلہ دیا جائے گا ہاں اگر رب کسی برائی سے درگزر کرلے یہ اس کا اختیاری امر ہے۔ صحابہ تابعین اور سلف صالحین سے بھی یہی مروی ہے۔ بعض سعادت مند۔ ابن عباس فرماتے ہیں اس دن اس کی بادشاہت میں اس کے سوا کوئی بادشاہ نہ ہو گا جیسے کہ دنیا میں مجازاً تھے۔ آیت (یوم الدین) سے مراد مخلوق کے حساب کا یعنی قیامت کا ہے جس دن تمام بھلے برے اعمال کا بدلہ دیا جائے گا ہاں اگر رب کسی برائی سے درگزر کرلے یہ اس کا اختیاری امر ہے۔ صحابہ، تابعین اور سلف صالحین سے بھی یہی مروی ہے۔ بعض سے یہ بھی منقول ہے کہ مراد اس سے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت قائم کرنے پر قادر ہے۔ ابن جریر نے اس قول کو ضعیف قرار دیا ہے لیکن بظاہر ان دونوں اقوال میں کوئی تضاد نہیں، ہر ایک قول کا قائل دوسرے کے قول کی تصدیق کرتا ہے ہاں پہلا قول مطلب پر زیادہ دلالت کرتا ہے۔ جیسے کہ فرمان ہے آیت (الملک یومئذ الخ اور دوسرا قول اس آیت کے مشابہ ہے جیسا کہ فرمایا آیت (ویوم یقول کن فیکون) یعنی جس دن کہے گا "ہو جا" بس اسی وقت "ہو جائے گا" واللہ اعلم۔ حقیقی بادشاہ اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ جیسے فرمایا آیت (ھو اللہ الذی لا الہ الا ھو الملك الخ

بدترین نام

صحیحین میں حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے کہ "رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا بدترین نام اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس شخص کا ہے جو شہنشاہ کہلائے حقیقی بادشاہ اللہ کے سوا کوئی نہیں۔" ایک اور حدیث میں ہے کہ "اللہ

تعالیٰ زمین کو قبضہ میں لے لے گا اور آسمان اس کے داہنے ہاتھ میں لپٹے ہوئے ہوں گے پھر فرمائے گا میں بادشاہ ہوں کہاں گئے زمین کے بادشاہ کہاں ہیں تکبر والے۔" قرآن عظیم میں ہے کس کی ہے آج بادشاہی؟ فقط اللہ اکیلے غلبہ والے کی اور کسی کو ملک کہہ دینا یہ صرف مجازاً ہے جیسے کہ قرآن میں طالتون کو ملک کہا گیا اور آیت (**وکان وراءھم ملك**) کا لفظ آیا۔ اور بخاری مسلم میں ملوک کا لفظ آیا ہے اور قرآن کی آیت میں آیت (**اذجعل فیکم انبیاء وجعلکم ملوکا**) یعنی تم میں انبیاء کئے اور تمہیں بادشاہ بنایا، آیا ہے۔ دین کے معنی بدلے جزا اور حساب کے ہیں۔ جیسے قرآن پاک میں ہے اس دن اللہ تعالیٰ انھیں پورا پورا بدلہ دے گا اور وہ جان لیں گے اور جگہ ہے آیت (**ائنا لمدینون**) کیا ہم کو بدلہ دیا جائے گا؟ حدیث میں ہے " دانا وہ ہے جو اپنے نفس سے خود حساب لے اور موت کے بعد کام آنے والے اعمال کرے۔" جیسے کہ حضرت عمر فاروق اعظم کا قول ہے کہ تم خود اپنی جانوں سے حساب لو اس سے پہلے کہ تمہارا حساب لیا جائے اور اپنے اعمال کو خود وزن کر لو اس سے پہلے کہ وہ ترازو میں رکھے جائیں اور اس بڑی پیشی کے لیے تیار ہو جاؤ جب تم اس اللہ کے سامنے پیش کئے جاؤ گے جس سے تمہارا کوئی عمل پوشیدہ نہیں جیسے خود رب عالم نے فرما دیا جس دن تم پیش کئے جاؤ گے کوئی چھپی ڈھکی بات چھپے گی نہیں۔

(تفسیر ابن کثیر۔ حافظ عماد الدین ابو الفداء ابن کثیر)

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ

جزا اور سزا کے دن کا مالک

امام بیضاوی نے "مالک" کا معنی بیان کرتے ہوئے فرمایا **المتصرف فی اعیان المملوکة کیف شاء** "وہ ذات جو اپنی مملوکہ چیزوں میں جس طرح چاہے تصرف کرنے کی قدرت رکھتی ہو "یعنی اسے ایسا قبضہ حاصل ہو کہ اس کے تصرف کو نہ کوئی روک سکے اور نہ اسے ناجائز کہہ سکے اس آیت کریمہ میں پروردگار نے اپنے آپ کو جزا اور سزا کے دن کا مالک قرار دیا ہے۔ حالانکہ اس دنیا اور دنیا کی ہر چیز اور پھر آنے والی دنیا اور اس کی ہر چیز کا بھی اللہ ہی مالک ہے تو

پھر بطور خاص اپنے آپ کو روز جزا کا مالک کہنے سے کیا مراد ہے؟ بات یہ ہے کہ یوں تو پروردگار کائنات کے ذرے ذرے کا مالک ہے ہر چیز کو اسی کے حکم سے وجود ملا ہے 'اسی کی عنایت سے اس کی زندگی وابستہ ہے اور ہر چیز کی بقاء اللہ ہی کے رحم و کرم پر ہے۔ لیکن یہ اس کی حکمت ہے کہ اس نے مخلوقات کو کسی نہ کسی حد تک ملکیت کا حق دے رکھا ہے۔ جنگل کے جانور طاقت کے بل بوتے پر جس بھٹ 'بل یا آشیانے پر قبضہ کر لیں وہ اس کو اپنی ملک سمجھتے ہیں۔ اسی طرح انسان بھی بعض حوالوں سے بہت ساری چیزوں کو اپنی ملکیت خیال کرتا ہے اور شریعت نے بھی ہر جائز ملکیت کے حقوق تسلیم کیے ہیں۔ لیکن ایک تو یہ ملکیت چند روزہ ہے، زندگی کے خاتمے کے ساتھ ختم ہو جائے گی اور دوسری یہ بات کہ یہ ایک ناقص ملکیت ہے اگر کامل ملکیت ہوتی تو قیامت کے دن اس کے بارے میں جواب دہی نہ کرنا پڑتی۔ پروردگار نے اس ناقص ملکیت کا بھی لحاظ فرمایا اس لیے انسانی زندگی اور اس کے زیر تصرف چیزوں پر کامل ملکیت رکھنے کے باوجود بھی ملکیت کا ذکر نہیں فرمایا۔ بلکہ اپنے آپ کو یوم الدین کا مالک کہا جس سے اشارہ اس جانب ہے کہ وہ دن ایسا ہو گا جس دن اللہ کی صفت عدالت پوری طرح ظہور میں آچکی ہو گی اور وہ ہر شخص کو عدالت کے کٹھرے میں بلا کر جواب طلبی کرے گا۔ اس دن ناقص ملکیت رکھنے والے جو اپنی محدود ملکیتوں پر ناز کرتے تھے وہ اس کے سامنے دست بستہ کھڑے ہوں گے اور وہ بڑے بڑے حکمران جنھیں ان کے اقتدار نے فریب میں مبتلا کر رکھا تھا، اس کے سامنے سر جھکائے سہمے ہوئے ایستادہ ہوں گے۔ پھر وہ اس دن اعلان فرمائے گا کہ باوجود اس کے کہ دنیا میں بھی اصل ملکیت اور حکومت میری تھی اور میں فی الحقیقت مالک ہوتے ہوئے ہر چیز کا حکمران تھا۔ لیکن تم نے اپنی ناقص حکمرانی سے دھوکہ کھا کر میری حکمرانی کو نظر انداز کیا۔ آج بتاؤ وہ تمہاری حکمرانیاں کہاں گئیں اور آنکھیں کھول کے دیکھو کہ آج کس کی حکومت ہے کہ اس کے مقرب بندے بھی سر جھکائے کھڑے ہیں اور اس کے انبیاء و رسل بھی زبان کھولنے کی ہمت نہیں کر پار ہے۔ اسی کے بارے میں قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا:

يَوْمَ هُمْ بَارِزُوْنَ ۚ لَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْهُمْ شَيْءٌ ؕ لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ؕ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ۔ اَلْيَوْمَ تُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ ۢ بِمَا كَسَبَتْ ؕ لَا ظُلْمَ الْيَوْمَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۔

" جس دن سب لوگ (خدا کے) سامنے آموجود ہوں گے (کہ) ان کی کوئی بات خدا سے (صورۃً) بھی مخفی نہ رہے گی 'آج کے روز کس کی حکومت ہو گی؟ بس اللہ ہی کی ہو گی 'جو یکتا اور غالب ہے۔ آج ہر شخص کو اس کے کیے کا بدلہ دیا جائے گا 'آج کسی پر ظلم نہ ہو گا 'اللہ تعالیٰ بہت جلد حساب لینے والے ہیں۔"

(المومن آیت ۴۰:۱۶۔۱۷)

اس آیت کریمہ کا دوسرا لفظ ہے یوم الدین "جزاوسزا کا دن"۔ اس لفظ پر غور کرتے ہوئے سب سے پہلی بات جو ذہن میں آتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ جزا اور سزا کا دن وہ ہو گا۔ جب اس دنیا کی بساط لپیٹ دی جائے گی اور ہم سب اللہ کی بارگاہ میں جوابدہی کے لیے کھڑے ہوں گے اور جہاں تک اس دنیا کا تعلق ہے، جس میں اب ہم رہ رہے ہیں، یہ جزاوسزا کا دن نہیں، یہ دارالعمل ہے۔ یہاں ہمیں مہلت عمل میسر ہے تاکہ ہم آنے والے دن کی تیاری کر سکیں۔ یہاں جو کچھ ہم کریں گے اس کا صلہ آنے والے دن میں پائیں گے نیکی کریں گے۔ تو اس کا صلہ اچھا ملے گا اور برائی کریں گے تو اس کے نتیجے میں برائی ملے گی۔ اس لیے اس دنیا میں ہر زندہ شخص کو یہ سوچ کر زندگی گزارنی ہے کہ یہاں میں صرف اعمال کا مکلف ہوں اللہ نے مجھ پر جو ذمہ داریاں عائد کی ہیں مجھے اپنی زندگی میں انھیں ادا کرنا ہے۔ وہ چاہے انفرادی ذمہ داریاں ہوں چاہے اجتماعی ذمہ داریاں۔ ان کی ادائیگی مجھ پر واجب ہے اور اسی حوالے سے کل کو مجھے جزا اور سزا ملے گی۔ آج کسی عمل کے بارے میں بھی مجھے یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ اسی دنیا میں مجھے اس کی جزا بھی ملے گی۔ اس بات کو سمجھ لینے سے آدمی ایک بڑی غلط فہمی سے بچ جاتا ہے۔ عموماً دیکھا گیا ہے کہ اگر کوئی نیکی کرنے والا شخص کسی مصیبت میں گرفتار ہوتا ہے تو وہ خود بھی اور اسے جاننے والے بھی اس غلط فہمی میں مبتلا ہونے لگتے ہیں کہ نیکی کا صلہ تو اللہ بہتر اجر کی صورت میں دیتا ہے، یہ نیک شخص آخر اس مصیبت میں مبتلا کیوں ہے۔ اس سوچ کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یا تو اس نیک شخص کے بارے میں بدگمانی پیدا ہونے لگتی ہے اور یا اللہ کے بارے میں آدمی بدگمان ہو جاتا ہے کہ مذہب غلط کہتا ہے کہ نیکی کا صلہ اجر و ثواب کی صورت میں ملتا ہے اور دنیا میں ایک اچھی زندگی عطا ہوتی ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو نیک لوگ مصیبتوں میں مبتلا کیوں ہوتے۔

اسی طرح اگر کوئی برا آدمی دولت میں کھیلتا ہے اور آئے دن اس کے کاروبار میں ترقی ہوتی ہے یا اس کا عہدہ و منصب بڑھتا ہے تو تب بھی لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہونے لگتے ہیں کہ اگر برائی کا نتیجہ برا ہوتا تو اس شخص کو یہ آسانیاں اور

سہولتیں تو میسر نہیں آنی چاہئیں تھیں۔ اس لیے یہاں فرمایا گیاہے کہ تم جس دنیامیں زندگی گزار رہے ہو یہ دار الجزاء نہیں، دار العمل ہے۔ تمہارا کام یہاں اچھے سے اچھا عمل کرنا ہے۔ اس کی جزا تمہیں قیامت میں ملے گی۔ اس لیے اگر آج نیکی کی جزا نہیں مل رہی تو مایوسی کی کوئی وجہ نہیں اور اگر کسی کو گناہ یا ظلم کی سزا نہیں مل رہی تو اس میں بھی ظالم کی خوشی کا کوئی موقع نہیں۔ البتہ ایک بات اور سمجھ لینی چاہیے کہ بعض دفعہ یہاں کبھی نہ کبھی نیکی کا صلہ مل بھی جاتا ہے اور کبھی کسی مجرم کو دنیاہی میں سزا سے بھی دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اس کے بارے میں قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے کہ دنیا میں کسی نیکی کا صلہ درحقیقت جزا نہیں۔ بلکہ نیکی کرنے والے کی حوصلہ افزائی ہے۔ اس کا تعلق قانون جزا سے نہیں بلکہ اللہ کے فضل ورحمت سے ہے۔ اسی طرح کسی بدعملی کی سزا کا ملنا وہ بھی حقیقت میں جزا اور سزا کے قانون کا ظہور نہیں، بلکہ محض متنبہ کرنے کے لیے ہوتا ہے جو اصل سزا اور عذاب ہو گا۔ وہ تو قیامت کے دن ہی ہو گا قرآن کریم نے اس کے بارے میں ہمیں بتایا ہے:

وَلَنُذِيقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ۔ "یعنی ہم لوگوں کو (آخرت کے) بڑے عذاب سے پہلے (بعض اوقات) دنیا میں ایک عذاب چھوٹے عذاب قریب کا مزہ چکھادیتے ہیں تاکہ وہ باز آجائیں"۔ (سجدہ ۳۲:۲۱)

كَذٰلِكَ الْعَذَابُ ط وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ م لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ۔ ع

"ایسا ہوتا ہے عذاب اور آخرت کا عذاب بہت بڑا ہے کاش وہ سمجھیں"۔ (قلم ۲۸:۳۳)

الغرض دنیا کی راحت و مصیبت بعض اوقات تو امتحان اور آزمائش ہوتی ہے اور کبھی عذاب بھی ہوتی ہے۔ مگر وہ عمل کا پورا بدلہ نہیں ہوتا، بلکہ ایک نمونہ ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ سب کچھ چند روزہ اور محض عارضی ہے۔ اصل بدلہ وہ راحت و کلفت ہے جو ہمیشہ قائم رہنے والی ہے اور جو اس عالم سے گزرنے کے بعد عالم آخرت میں آنے والی ہے۔ اسی کا نام روز جزاء ہے اور جب یہ معلوم ہو گیا کہ نیک و بد عمل کا بدلہ یا پورا بدلہ اس دنیا میں نہیں ملتا اور عدل و انصاف اور عقل کا تقاضا ہے کہ نیک و بد اچھا اور برابر برابر نہ رہے بلکہ ہر عمل کی مکمل جزا یا سزا ملنی چاہیے۔

اس لیے ضروری ہے کہ اس عالم کے بعد کوئی دوسرا عالم، ہو جس میں ہر چھوٹے بڑے اور اچھے برے عمل کا حساب اور اس کی جزا یا سزا، انصاف کے مطابق ملے۔ اسی کو قرآن کی اصطلاح میں روز جزا یا قیامت یا آخرت کہا جاتا ہے۔

قرآن نے خود اس مضمون کو سورۃ مومن میں وضاحت سے بیان فرمایا ہے۔

وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ ۙ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَلَا الْمُسِيءُ ۚ قَلِيلًا مَّا تَتَذَكَّرُونَ ۔ إِنَّ السَّاعَةَ لَآتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيهَا وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُونَ۔ ”یعنی بینا اور نابینا اور (ایک) وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے اچھے کام کیے اور (دوسرے) بد کردار باہم برابر نہیں ہو سکتے ،تم لوگ بہت ہی کم سمجھتے ہو ،قیامت تو ضرور ہی آکر رہے گی (تاکہ ہر ایک عمل کا پورا بدلہ ہر عمل کرنے والے کو مل جائے) ،اس کے آنے میں کسی طرح کا شک ہے ہی نہیں ،مگر اکثر لوگ نہیں جانتے“۔(المؤمن ۴۰:۵۸۔۵۹)

سورۃ فاتحہ میں آخرت یا قیامت کو یوم الدین کے نام سے ذکر فرمایا گیا ہے۔ اس میں نزول قرآن کے وقت لوگوں کی ایک عام غلط فہمی کا ازالہ کرنا مقصود تھا۔ جس کا ذکر میں آگے چل کر کروں گا۔ سب سے پہلے آخرت کا تعارف کرانا چاہتا ہوں۔

آخرت کا تعارف

اسلامی عقائد کی آخری کڑی آخرت پر ایمان لانا ہے۔ قرآن پاک میں ایمان باللہ کے بعد اس کی اہمیت پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے۔ کیونکہ موجودہ دنیا کے تمام اعمال اور ان کے نتائج کی اصلی اور دائمی بنیاد اسی آئندہ دنیا کے گھر کی بنیاد پر قائم ہے۔ اگر یہ بنیاد متزلزل ہو جائے تو اعمال انسانی کے نتائج کا ریشہ ریشہ بیخ و بن سے اکھڑ جائے۔ قرآن کریم نے اسے الیوم الآخر یا آخرت کے نام سے تعبیر کیا ہے۔ مراد اس سے آخرت کا گھر یا آخرت کی زندگی ہے۔

عربی میں طریقہ یہ ہے کہ اوصاف کو موصوف کا قائم مقام کر کے اکثر موصوف کو حذف کر دیتے ہیں۔ اس طریقے کے مطابق قرآن کریم نے ”الآخرت “کا لفظ استعمال کیا ہے جو ”الحیاۃ “یا ”الدار “کی صفت ہے۔ مراد اس سے آخرت کا گھر یا آخرت کی زندگی ہے۔ قرآن پاک میں تقریباً 113 مقامات پر یہ لفظ انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

الآخر یا آخرت کا معنی ہے پچھلی زندگی یا پچھلا گھر یا پچھلی دنیا۔ اس پچھلی دنیا سے مراد موت کے بعد کی دنیا ہے، جسے

قرآن کریم نے دو دوروں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے دور سے مراد موت سے لے کر قیامت تک کا دور ہے اور دوسرے دور سے مراد قیامت سے لے کر ابد تک کا دور۔ جس میں پھر موت اور فنا نہیں۔ پہلے دور کا نام برزخ ہے اور دوسرے دور کا نام بعث بعد الموت یا حشر و نشر اور قیامت ہے اور ان کے معنی جی اٹھنے 'اکٹھے کیے جانے اور کھڑے ہونے کے ہیں۔ ان سب سے مقصود ایک ہی حقیقت کی طرف اشارہ ہے اور وہ موجودہ دنیا کے خاتمے کے بعد دوسری دنیا کی زندگی ہے۔ جسے قرآن کریم میں الدار الآخرہ اور عقبی الدار وغیرہ کے ناموں سے یاد کیا گیا ہے۔

قرآن و سنت میں آخرت کی جو تفصیلات آئی ہیں، ان پر اگر ہم غور کریں تو چند چیزیں ہمارے سامنے واضح ہوتی ہیں جن میں سب سے پہلی چیز موت کا تصور اور حقیقت ہے۔

موت

اس احساس کو دلوں میں مستحضر کرنا مقصود معلوم ہوتا ہے کہ جو زندگی انسان گزار رہا ہے، یہ زندگی ہمیشہ قائم نہیں رہے گی۔ اگرچہ علم کی حد تک ہر آدمی جانتا ہے کہ موت سے بہر حال ہمکنار ہونا ہے۔ کیونکہ ہر آدمی کے سامنے جنازے اٹھتے ہیں، موت و حیات کا سلسلہ جاری و ساری رہتا ہے۔

بایں ہمہ انسان کو اپنی موت کا خیال اور یقین بہت کم پیدا ہوتا ہے۔ آدمی زندگی کی ہماہمی میں اس طرح مستغرق رہتا ہے کہ اسے بھول کر بھی یہ خیال نہیں آتا کہ ایک دن زندگی کے ان ہنگاموں کا خاتمہ بھی ہونے والا ہے۔ اس لیے آخرت کے تصور سے اسلام اپنے ماننے والوں میں یہ تصور راسخ کرنا چاہتا ہے کہ تم زندگی اور موت کے فاصلے کو زیادہ نہ جانو۔ زندگی کی حیثیت ایک حباب کی سی ہے جو ہوا کے ایک جھونکے سے کسی وقت بھی ٹوٹ سکتا ہے۔ اس لیے زندگی سے فائدہ ضرور اٹھاؤ، مگر آنے والے وقت کو ہر وقت یاد رکھو۔ حضرت عبد اللہ ابن مسعود فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) رفع حاجت کے لیے نکلے۔ میں پانی کا برتن لے کر ہمراہ ہو گیا۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آبادی سے نکل کر کھجوروں کے جھنڈ میں داخل ہوئے۔ رفع حاجت سے فارغ ہو کر باہر نکلتے ہی زمین پر بیٹھ کر آپ نے تیمم فرمایا پھر مجھ سے پانی طلب کیا اور پانی استعمال فرمایا۔ میں نے بصد ادب عرض کی حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں آپ سے بہت قریب تھا اور پانی میرے پاس آپ کے استعمال کے لیے حاضر تھا۔ پھر آپ نے

تیمم کیوں فرمایا؟ آپ نے ارشاد فرمایا: "عبد اللہ! کیا مجھے اس بات کا یقین ہو سکتا تھا کہ میں پانی تک پہنچنے سے پہلے یا پانی مجھ تک پہنچنے سے پہلے اللہ کو پیارا نہ ہو جاؤں گا"۔ اس سے تصور یہ دینا مقصود تھا کہ موت کو ہر وقت اپنے قریب جانو۔ اس لیے آخرت کے تصور میں پہلا تو یہ تصور ہے جو دلوں میں اتارنا مقصود ہے اور ساتھ ہی یہ بات بھی کہ موت اصلاً زندگی کی فنا کا نام نہیں بلکہ تمہیں جن ذمہ داریوں کی ادائیگی کے لیے دنیا میں بھیجا گیا تھا اور تمہیں اس زندگی کی صورت میں ایک مہلت عمل دی گئی تھی۔ موت اصلاً اس کے خاتمے کا نام ہے۔

یعنی یہ اس طرح کی فنا نہیں ہے۔ جیسی فنا دوسری غیر مکلف مخلوقات پر طاری ہوتی ہے۔ جس طرح ایک حباب ٹوٹتا ہے 'پھول مرجھا کے ٹہنی سے گر جاتا ہے 'پتے خزاں میں جھڑنے لگتے ہیں یا کوئی حیوان اپنی طبعی عمر کو پہنچ کر سفر حیات ختم کر دیتا ہے۔ کیونکہ ایک پھول کو چند روزہ بہار کے لیے پیدا کیا گیا تھا، سو وہ پوری ہو گئی۔ پتوں کو چند دنوں تک سایہ دینا تھا، وہ دے چکے۔ ہر حیوان کو اپنی جبلی ذمہ داریاں پورا کرنا تھیں، وہ کر چکا۔ اب اس کے لیے فنا کے سوا اور کچھ نہیں۔ مگر انسانی موت فنا نہیں بلکہ اپنی ذمہ داریوں سے واپسی سے عبارت ہے کہ اسے ایک خاص مقصد حیات اور ذمہ داریاں دے کر دنیا میں بھیجا گیا تھا۔ اب اسے اس سے واپس بلایا جا رہا ہے۔ اس لیے قرآن کریم نے اس واپسی کو اللہ کی طرف روح کی بازگشت قرار دیا ہے۔ سورۃ جمعہ میں ارشاد فرمایا: قُلۡ اِنَّ الۡمَوۡتَ الَّذِیۡ تَفِرُّوۡنَ مِنۡهُ فَاِنَّهٗ مُلٰقِیۡكُمۡ ثُمَّ تُرَدُّوۡنَ اِلٰی عٰلِمِ الۡغَیۡبِ وَالشَّهَادَةِ فَیُنَبِّئُكُمۡ بِمَا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ۔

(جمعہ ۶۲۔۸)"

کہہ دیجئے بیشک وہ موت جس سے تم بھاگتے ہو، اس سے ملنا ہی ہے۔ پھر تم اس خدا کے پاس لوٹائے جاؤ گے جو حاضر و غائب کو جاننے والا ہے اور وہ تم کو تمہارے کرتوت بتائے گا۔ "ہم سورۃ البقرہ کی اس آیت کو اکثر اپنی زبانوں سے دہراتے رہتے ہیں اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّاۤ اِلَیۡهِ رٰجِعُوۡنَ "ہم سب خدا کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جائیں گے"۔ اس میں بھی اسی حقیقت کا اعادہ کیا گیا ہے۔ سورۃ مائدہ میں ارشاد فرمایا: اِلَی اللّٰهِ مَرۡجِعُكُمۡ جَمِیۡعاً (المائدہ ۵۔۴۸)"

تم سب کو خدا ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے "اور پھر یہ اللہ کی طرف لوٹنا ہر صورت میں ہو گا چاہے آدمی اس کی خواہش رکھتا ہو یا اس سے نفرت کرتا ہو۔ یہ ایک اٹل سنت اللہ ہے جس سے کبھی مفر نہیں۔ سورۃ القیامہ کی ایک

آیت میں اس کے بارے میں خوب نقشہ کھینچا گیا ہے۔ ارشاد فرمایا: كَلَّآ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ ۔ لا وَقِيْلَ مَنْ سكة رَاقٍ ۔ لا وَظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ ۔ لا وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ ۔ لا اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِنِ الْمَسَاقُ ۔ ع (۷۵:۲۹۔۳۰)" ہر گز نہیں جب روح ہنسلی تک آ پہنچے اور لوگ کہیں اب کون ہے جھاڑ پھونک کر بچانے والا اور سمجھو کہ اب جدائی کا وقت آ گیا اور پنڈلی پنڈلی سے لپٹ گئی 'اس دن تمہیں پروردگار کی طرف ہانکا جانا ہے"۔

البتہ فرق یہ ہے کہ وہ بد نصیب جنھوں نے کفر اور شرک کی زندگی گزاری اور ان کو کبھی اس بات کا خیال نہیں آیا کہ اللہ کی طرف لوٹ کر بھی جانا ہے ان کی واپسی تو اسی طرح ہو گی جیسے کسی جانور کو ہانک کر لے جایا جاتا ہے جس طرح سورۃ انعام میں ارشاد فرمایا: وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَاسِطُوْٓا اَيْدِيْهِمْ ج اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ط اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ وَكُنْتُمْ عَنْ اٰيٰتِهٖ تَسْتَكْبِرُوْنَ ۔ وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّتَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ ج (۶:۹۳۔۹۴) "اور اگر تم دیکھو جس وقت گناہ گار موت کی بے ہوشی میں ہوں گے اور فرشتے ہاتھ کھولے کہہ رہے ہوں گے کہ نکالو اپنے جسموں کے اندر سے اپنی روحوں کو آج تم کو اس پر ذلت کی سزا ملے گی کہ تم خدا کی شان میں جھوٹی باتیں کہتے تھے اور اس کے حکموں کو ماننے سے غرور کرتے تھے اور تم ایک ایک کر کے تنہا جیسے ہم نے پہلی بار تم کو پیدا کیا تھا، ہمارے پاس آئے ہو اور جو سامان واسباب تم کو دیا تھا، جس نے تم کو مغرور بنایا تھا اس کو پیچھے چھوڑ آئے ہو "(الانعام۔۹۳، ۹۴) لیکن جو سعید اور نیکو کار روحیں اپنے آنے والے انجام کو یاد رکھتی ہیں، بلکہ اللہ سے ملاقات کی متمنی رہتی ہیں انھیں آخری وقت یہ صدا سنائی دیتی ہے۔

يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۔ ق ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۔ ج

" اے مطمئن روح تو اپنے مالک سے خوش اور تیرا مالک تجھ سے خوش تو اپنے مالک کے پاس واپس چلی جا"

(الفجر ۸۹:۲۷۔۲۸)

برزخ

اسی طرح مومن اور کافر دونوں اپنی مہلت عمل کے خاتمے پر اپنے اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہو جاتے ہیں اور پھر انھیں ایک ایسی جگہ رکھا جاتا ہے، جسے ہم برزخ کہتے ہیں اور اسی کو احادیث مبارکہ میں اور تمام سامی قوموں کے محاورے میں قبر کا نام دیا گیا ہے۔ لیکن اس قبر سے مقصود وہ خاک کا تودہ نہیں جس کے نیچے کسی مردہ کی ہڈیاں پڑی رہتی ہیں، بلکہ وہ دنیا ہے جس میں مرنے والوں کی روحوں کو قیامت تک رکھا جائے گا۔ کوئی مرنے والا چاہے خاک میں دفن ہو یا قعر دریا میں ڈوب جائے یا کسی درندیا پرند کے پیٹ میں اس کے جسم کو جگہ ملے، یہی اس کی قبر ہے اور یہی وہ دنیا ہے جسے برزخ کے نام سے یاد کیا گیا ہے اور اسی برزخ یعنی قبر سے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن تمام مرنے والوں کو اٹھائے گا۔ ارشاد خداوندی ہے: وَاَنَّ اللّٰہَ یَبْعَثُ مَنْ فِی الْقُبُوْرِ۔ (۲۲:۷) "بیشک اللہ ان کو جو قبروں میں ہیں اٹھائے گا "(الحج۔۷)۔ ظاہر ہے کہ یہ اٹھایا جانا صرف انہی مردوں کے لیے مخصوص نہیں جو تودہ خاک کے اندر دفن ہیں، بلکہ ہر میت کے لیے ہے۔ خواہ وہ کیسی حالت اور کیسے عالم میں ہو۔ اب سوال یہ ہے کہ اس برزخ کا مفہوم کیا ہے؟ برزخ کا لفظ قرآن کریم میں تین جگہ استعمال ہوا ہے۔ (1) سورۃ الرحمن (2) سورۃ الفرقان (3) سورۃ المومنون میں۔ ہر جگہ اس سے دو چیزوں کے درمیان پردہ حاجب اور حائل مراد ہے مثلاً سورۃ الفرقان آیت ۵۳ میں فرمایا: وَهُوَ الَّذِیْ مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ وَجَعَلَ بَیْنَهُمَا بَرْزَخًا وَّحِجْرًا مَّحْجُوْرًا (الفرقان:۲۵۔۵۳)

اور اسی نے دو دریاؤں کو ملا کر چلایا یہ میٹھا اور پیاس بجھاتا ہے اور وہ کھاری کڑوا ہے اور ان کے بیچ میں ایک پردہ اور روکی ہوئی اوٹ بھی بنائی ہے۔"

تو اس برزخ سے مراد موجود زندگی اور آئندہ زندگی کے درمیان جو حائل اور رکاوٹ ہے، اسی کو برزخ کہا گیا ہے۔ یعنی جب آدمی مر جاتا ہے تو اس کی زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ اب دوبارہ وہ زندہ اس وقت ہو گا جب قیامت برپا ہو گی۔ ان دونوں زندگیوں کے درمیان ایک مدت حائل ہے، جو انسان پر ایک خاص قسم کی موت کا دور ہے۔ اس کا نام برزخ ہے۔ یہاں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ قیامت کے آنے تک یہ برزخی دور باقی رہے گا۔ لیکن یہ

زندگی کا دور نہیں بلکہ یہ موت کا زمانہ ہے۔ کیونکہ قرآن کریم نے دو مدتوں اور دو زندگیوں کا ہمیں تصور دیا ہے۔ سورۃ بقرہ میں ارشاد فرمایا كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ۔ (البقرہ:۲۔۲۸) "کیسے تم اللہ کا انکار کرتے ہو؟ حالانکہ تم پہلے مردہ تھے تو پھر اس نے تم کو زندہ کیا۔ (یعنی انسان بنا کر پیدا کیا) ' پھر تم کو مار دے گا ' پھر تم کو زندہ کرے گا ' پھر اس کی طرف لوٹائے جاؤ گے " (البقرہ۔۲۸)۔ پہلی موت تو ہر انسان کی پیدائش سے پہلے کا وقت ہے۔ جب وہ مادہ یا عنصر کی شکل میں تھا۔ پھر زندہ ہو کر اس دنیا میں پیدا ہوا۔ یہ اس کی پہلی زندگی ہے۔ پھر موت آئی روح نے مفارقت کی اور جسم اپنی اگلی مادی صورت میں منتقل ہو گیا۔ یہ اس کی دوسری موت ہے اور اسی کو برزخی زندگی کہا گیا ہے۔ پھر اللہ خود اس کی روح کو جسم سے ملا کر زندہ کرے گا۔ یہ اس کی دوسری زندگی ہے، جس کے بعد پھر کبھی اسے موت نہیں آئے گی۔ اب رہی یہ بات کہ یہ دور قیامت تک چلے گا اس کا ثبوت بھی ہمیں قرآن کریم سے ملتا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ۔ (المومنون:۲۲۔۱۰۰)

اور ان کے پیچھے برزخ ہے، اس دن تک جب وہ اٹھائے جائیں گے۔ "یعنی قیامت تک۔ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ انسان کی تین منزلیں ہیں۔ دنیا ' برزخ اور قیامت۔ ان تینوں میں جو فرق ہے اسے یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ موجودہ دنیا میں جسم یعنی مادہ نمایاں اور روح پوشیدہ ہے اور روح کو جو کچھ مسرت و تکلیف یہاں پہنچتی ہے، وہ صرف اس مادی جسم کے وجود سے پہنچتی ہے، ورنہ در حقیقت اس کی براہ راست لذت و راحت کا اس مادی دنیا میں کوئی امکان نہیں۔ دوسرے عالم میں جس کو برزخ کہا گیا ہے۔ روح نمایاں ہو گی اور جسم چھپ جائے گا۔ وہاں جو راحت و تکلیف پہنچے گی وہ دراصل روح کو پہنچے گی اور جسم اس کی تبعیت میں ضمناً اس سے متاثر ہو گا۔ لیکن تیسرے عالم یعنی قیامت میں جہاں سے حقیقی اور غیر فانی زندگی شروع ہوتی ہے روح اور جسم دونوں نمایاں ہوں گے اور دونوں کی لذت و راحت کے مظاہر بالکل الگ ہوں گے۔

عالمِ برزخ میں سوال وجواب کی کیفیت

یہ بات تو واضح ہوگئی کہ برزخی دنیا زندگی کا دور نہیں، بلکہ موت کا دور ہے۔ لیکن ہمیں اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اس میں مرنے والے کو سوال وجواب کے ایک مختصر مرحلے سے بھی گزرنا ہوگا اور اسے کسی نہ کسی حد تک عذاب وثواب سے واسطہ بھی پڑے گا (جسکی تفصیل ہم آگے ذکر کریں گے)۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر یہ دور زندگی کا نہیں بلکہ موت کا دور ہے تو پھر اس میں سوال وجواب اور عذاب وثواب کا تحقق کیسے ہوگا؟ اسے سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ موت کی حقیقت کو سمجھ لیا جائے۔ اسی موت کے واسطے سے مرنے والا برزخ کی وادی میں داخل ہوتا ہے۔ اس لیے برزخی زندگی کی وہی حقیقت ہوگی، جو اس موت کی حقیقت ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن پاک میں موت کو نیند سے تشبیہ دی گئی ہے۔ سورۃ زمر میں ارشاد فرمایا گیا۔

اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الۡاَنۡفُسَ حِیۡنَ مَوۡتِہَا وَالَّتِیۡ لَمۡ تَمُتۡ فِیۡ مَنَامِہَا فَیُمۡسِکُ الَّتِیۡ قَضٰی عَلَیۡہَا الۡمَوۡتَ وَیُرۡسِلُ الۡاُخۡرٰۤی اِلٰۤی اَجَلٍ مُّسَمًّی ط اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّتَفَکَّرُوۡنَ ۔ (۳۹۔۴۲)

"وہ اللہ ہی ہے جو روحوں کو ان کی موت کے وقت وفات دیتا ہے اور جو نہیں مری ہیں ان کو نیند میں ہی وفات دے دیتا ہے۔ تو جس پر موت کا حکم اس نے جاری کیا اس کو روک لیتا ہے اور دوسری روح کو جس پر موت کا حکم نہیں یعنی نیند والی کو ایک مدت معینہ کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔ بیشک اس میں سوچنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں، اس آیت کریمہ میں موت کو نیند سے تشبیہ دی گئی ہے۔ بلکہ دونوں کو ایک ہی سطح پر رکھ کر ذکر فرمایا گیا ہے۔ اسی طرح برزخی زندگی کو قرآن کریم نے نیند سے تعبیر فرمایا۔ یعنی قیامت میں جب لوگ دوسری زندگی پاکر قبروں سے اٹھیں گے تو گنہگاروں کی زبانوں پر یہ فقرہ ہوگا یٰوَیۡلَنَا مَنۡۢ بَعَثَنَا مِنۡ مَّرۡقَدِنَا (یٰسٓ۔۵۲)

اے ہماری خرابی کس نے ہم کو ہماری نیند کی جگہ سے اٹھا دیا"۔ (یٰسٓ۔۵۲)

مرقد ہم قبر کے لیے بولتے ہیں حالانکہ اس کا معنی سونے کی جگہ ہے۔ اب اس کو دیکھئے قبر کو بستر سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس طرح قرآن کریم میں دوسری زندگی یعنی قیامت کے لیے اکثر بعث کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنی جگانے اور بیدار کرنے کے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ موت اپنی حقیقت میں نیند کے قریب واقع ہوئی ہے۔ اب

ہمیں اس پر غور کرنا چاہیے کہ ایک سونے والے کی کیفیت کیا ہوتی ہے؟ اور نیند سے اس میں کس طرح کی تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ انسان جب سوتا ہے تو اس کے ادراک و احساس کے آلات اپنی مادی دنیا سے عارضی طور پر بے خبر ہو جاتے ہیں۔ مگر اس کے ادراک و احساس کی تخیلی، تمثالی یا ذہنی دنیا اس کے سامنے بالکل اسی مادی دنیا کی طرح متشکل ہوتی ہے۔ اس میں وہ خود اپنے جسم سے الگ مگر ہو بہو وہی جسم دیکھتا ہے جو آتا جاتا ہے۔ اس کے سامنے کھانے پینے اور لطف انگیزی کے سب سامان ہوتے ہیں نیز اس میں درد و رنج اور تکلیف کی تمام وہی صورتیں ہوتی ہیں جو مادی دنیا میں ہیں۔ اس کے خیالی جسم کو اگر اس عالم میں تکلیف ہوتی ہے تو وہ چیخ اٹھتا ہے۔ اور اگر اس میں لذت ملتی ہے تو لطف اندوز ہوتا ہے اور ان دونوں کے اثرات اس کو اپنے مادی جسم میں جاگنے کے بعد بھی نظر آتے ہیں۔ غرض عالم خواب کی خیالی دنیا اور اس کی خوشی اور رنج اور لذت و الم اور اس مادی دنیا کی جسمانی و مادی خوشی اور رنج اور لذت و الم میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ اگر کچھ فرق ہے تو یہ ہے کہ عالم خواب کی لذت و تکلیف بیداری کے بعد ختم ہو جاتی ہے اور مادی دنیا کی تکلیف و لذت احساس و ادراک کے وجود تک قائم رہتی ہے اور جس طرح مادی بیداری والی لذت و تکلیف خواب میں معدوم ہو جاتی ہے اس طرح خواب والی لذت و تکلیف بیداری میں رخصت ہو جاتی ہے۔

برزخی زندگی کو بھی انہی احوال و کیفیات کے آئینہ میں دیکھنا چاہیے۔ یہ ایک طویل اور گہری نیند ہے جو موت کی صورت میں انسان پر طاری کر دی جاتی ہے۔ اس میں جو کچھ واردات گزرتی ہیں ان کا تعلق براہ راست روح سے ہوتا ہے۔ البتہ اس میں یہ لمبی نیند سونے والا ایک جسم کو بھی دیکھتا ہے اس کے اعمال کی رعایت سے مناسب صورت میں اسے ملتا ہے۔ اس میں اگر اسے سوال و جواب سے گزارا جاتا ہے تو وہ خواب کی طرح اس سوال و جواب کے ماحول سے گزرتا ہے اور اگر اسے لذت و راحت سے واسطہ پڑتا ہے تو وہ خواب ہی کی طرح اسے محسوس کرتا ہے اور محظوظ ہوتا ہے اور اگر اسے تکلیف و عذاب سے گزرنا پڑتا ہے تو وہ خواب ہی کی طرح اس کی شدت کو محسوس کرتا ہے۔

اصل سوال یہ نہیں کہ ثواب و عذاب کو محسوس کرنے کا ذریعہ کیا ہے بلکہ اصل سوال یہ ہے کہ کیا اسے ثواب و عذاب کا احساس ہوتا ہے یا نہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں طرح کے احساسات وہ عالم بیداری میں بھی رکھتا ہے اور نیند میں بھی۔ جس طرح اپنی مرغوب چیز پا کر عالم بیداری میں مسرت و شادمانی محسوس کرتا ہے اور تکلیف دہ صورتحال

سے دوچار ہو کر پریشانی اور کرب کا شکار ہوتا ہے بالکل یہی کیفیت اس کی نیند کی حالت میں بھی ہوتی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ نیند کی حالت کے تغیرات نیند کھل جانے سے ختم ہو جاتے ہیں تو آدمی انھیں جلدی بھول جاتا ہے، اور بیداری کے تغیرات دیرپا ہوتے ہیں اس لیے انھیں دیر تک یاد رکھتا ہے۔ یہ برزخی زندگی چونکہ قیامت تک طویل ہو گی اس لیے اس میں پیش آمدہ تغیرات چاہے وہ خوشی کی شکل میں ہوں یا تکلیف کی شکل میں، دیرپا ہوں گے اور گہرے تاثرات چھوڑیں گے کیونکہ اب قیامت سے پہلے یہ صورتحال بدلنے والی نہیں اور یہ نیند کھلنے والی نہیں۔

قرآن و سنت میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مرنے کے بعد ہر مرنے والا ایک مختصر امتحان سے گزرے گا یعنی اس سے کچھ سوال و جواب کیے جائیں گے۔ احادیث میں آیا ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ مرنے کے بعد قبر میں دو فرشتے آتے ہیں اور وہ مردوں سے توحید و رسالت کی نسبت سوال و جواب کرتے ہیں۔ یعنی وہ اس سے اس کے دین اور رب کے بارے میں بھی پوچھتے ہیں اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بارے میں بھی۔ اگر اس نے زندگی ایمان و عمل کے ساتھ گزاری ہو گی تو اسے صحیح جواب دینے کی توفیق ملے گی، ورنہ ہمیشہ کی نامرادی اس کا مقدر بن جائے گی اور قرآن کریم سے ہمیں ان باتوں کی تصدیق بھی ہوتی ہے اور کچھ مزید باتوں کا بھی پتہ چلتا ہے تصدیق تو اس بات کی ہوتی ہے کہ ایمان و اعمل کی زندگی گزارنے والے مرنے کے بعد فرشتوں کی دعاؤں اور ان کے تہنیتی کلمات سے مستفید اور شادکام ہوں گے۔ اور وہ آنے والے وقت کی بشارت بھی دیں گے اور مزید جس بات کی قرآن پاک ہمیں خبر دیتا ہے ان میں سے ایک بات تو یہ ہے کہ مرنے والوں میں وہ بدنصیب جنھوں نے ایمان لانے کی بجائے کفر کا راستہ اختیار کیا۔ فرشتے صرف ان کی جان ہی نہیں نکالیں گے بلکہ ساتھ ساتھ ماریں پیٹیں گے بھی اور جان نکالتے ہی انھیں عذاب سے دوچار کر دیا جائے گا۔ سورۃ انفال میں ہے:

وَلَوْ تَرَىٰٓ إِذْ يَتَوَفَّى ٱلَّذِينَ كَفَرُوا۟ ٱلْمَلَٰٓئِكَةُ يَضْرِبُونَ وُجُوهَهُمْ وَأَدْبَٰرَهُمْ وَذُوقُوا۟ عَذَابَ ٱلْحَرِيقِ۔

(الانفال:۸۔۵۰)

اور اگر تو دیکھے جب فرشتے کافروں کی روح قبض کرتے ہیں 'مارتے ہیں ان کے منہ اور پیٹھ پر اور کہتے ہیں کہ چکھ جلنے کا مزا۔" اس آیت سے جہاں یہ ثابت ہوتا ہے کہ کافروں پر موت کے بعد ہی سے عذاب شروع ہو جاتا ہے، وہاں یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ مار ان کے منہ اور پیٹھ پر پڑتی ہے۔ مگر یہ منہ اور پیٹھ وہ نہیں ہے جو بے جان لاشہ کی صورت

میں ہمارے سامنے ہے، بلکہ اس آیت میں کافر کی روح کو جانور سے تشبیہ دی گئی ہے کہ جس طرح جانور کو تیز ہنکاتے وقت کبھی آگے منہ پر اور پیچھے پیٹھ پر مارتے ہیں اسی طرح کافر روح کو زبردستی فرشتے مارتے ہوئے اور ہنکاتے ہوئے لے چلیں گے اور کہیں گے کہ چل عذاب کا مزا چکھ۔ اسی طرح سورۃ اعراف میں ہے:

حَتّٰۤى اِذَا جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا يَتَوَفَّوْنَهُمْ قَالُوْۤا اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا وَشَهِدُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ ۔ قَالَ ادْخُلُوْا فِيْۤ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ فِى النَّارِ ؕ (الاعراف ۷:۳۷۔۳۸)

"یہاں تک کہ جب جھٹلانے والوں کے پاس ہمارے فرشتے ان کی روحوں کو قبض کرنے کے لیے آئیں گے اور کہیں گے کہ کہاں ہیں، وہ جن کو تم خدا کے علاوہ پکارتے تھے۔ تو اس وقت وہ مشرک کہیں گے کہ ہمارے وہ دیوتا ہم سے کنارہ کش ہو گئے ہیں اور انھوں نے اپنے اوپر خود گواہی دی کہ وہ کافر تھے تب خدا فرمائے گا کہ تم بھی ان لوگوں میں جاملو جو جن وانس میں سے تم سے پہلے آگ میں جا چکے ہیں۔ اور جو لوگ ناموافق حالات کا بہانہ بنا کر اللہ کے دین پر چلنے سے کتراتے ہیں ان کے بارے میں سورۃ النساء میں فرمایا۔ بیشک فرشتوں نے جن کی روحوں کو اس حالت میں قبض کیا کہ وہ جانوں پر ظلم کر رہے تھے۔ فرشتے ان سے کہیں گے کہ تم کس حالت میں تھے۔ وہ جواب دیں گے کہ ہم ملک میں بے یار و مددگار تھے۔ فرشتے کہیں گے کہ کیا اللہ کی زمین کشادہ نہ تھی کہ تم اپنا وطن چھوڑ کر باہر چلے جاتے۔ یہی لوگ ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہے۔

عالمِ برزخ میں ارواح کا مقام

برزخ کے حوالے سے اب ایک سوال یہ باقی رہ جاتا ہے کہ برزخ میں ارواح انسانی کا مسکن کہاں ہو گا؟ قرآن پاک میں اس کا جواب متعدد آیات میں ملتا ہے۔ کافروں کے بارے میں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی روحوں کو کائنات کی وسعتوں میں اس طرح آوارہ پھرنے کے لیے چھوڑ دیا جائے گا کہ جیسے بے خانماں اور محروم لوگ پھرا کرتے ہیں۔ لیکن وہ جہاں بھی ہوں گے وہاں سے ہر وقت دوزخ کے نظارے کریں گے اور ہر وقت اللہ کے عذاب کا نقشہ ان کی نگاہوں کے سامنے رہے گا اور ایک عجیب عذاب کی کیفیت ان پر طاری رہے گی۔ لیکن جہاں تک پاکباز مومنوں کا

تعلق ہے قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ اولاً تو ان کی موت ہی اس طرح واقع ہو گی کہ ایک طرف جان ان کے جسم سے نکالی جارہی ہو گی اور دوسری طرف رحمت الٰہی کا فرشتہ مژدہ جانفزا ان کے کانوں میں انڈیل رہا ہو گا۔ پھر ان میں بھی ایسی پاکباز اور سعید روحیں ہیں جنھیں شہداء کہا جاتا ہے۔ انھیں خدا کی طرف سے ایک تمثالی جسم غیر فانی زندگی اور روحانی عیش و عشرت کی لازوال دولت عنایت کی جائے گی۔ وہ اللہ کے یہاں خاص قسم کا رزق بھی پائیں گے اور خوشی و مسرت ہر دم ان کے ساتھ ہو گی اور اس مضمون کی متعدد آیات قرآن کریم میں موجود ہیں۔

احوالِ قیامت اور اس کے وقوع کے دلائل

افراد اور جماعتوں کو تو ہم ہر روز اپنی آنکھوں کے سامنے اخری سفر پر روانہ ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں اور ہمیں کسی حد تک یقین ہو جاتا ہے کہ موت ایک ایسی حقیقت ہے جس سے مفر کی کوئی صورت نہیں۔ لیکن اس سے بھی بڑی ایک حقیقت اور بھی ہے جسے ہم قیامت کہتے ہیں۔ اس کا مفہوم ہے تمام دنیا اور تمام کائنات کا چشم زدن میں ختم ہو جانا اور پھر ایک مدت معینہ کے بعد از سر نو زندہ ہونا اور پھر اللہ کے حضور حساب کتاب کے لیے پیش ہونا اور حسب اعمال جزا و سزا کے مراحل سے گزرنا۔ موت تو کبھی اچانک آتی ہے اور کبھی دھیرے دھیرے بیماری کی شکل میں اپنا احساس دلا کے آتی ہے۔ اس لیے مرنے والا بالعموم پہلے سے اس سے کسی حد تک آگاہ ہوتا ہے اور پسماندگان بھی ذہنی طور پر اس صدمے کے لیے تیار ہوتے ہیں لیکن جہاں تک قیامت کے وقوع کا تعلق ہے وہ تو اس طرح کا حادثہ ہو گا کہ جس کو قرآن کریم کہتا ہے:

وَمَآ اَمۡرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمۡحِ الۡبَصَرِ اَوۡ هُوَ اَقۡرَبُ ط (النحل:١٦۔٧٧)

"اور وہ قیامت کا معاملہ آنکھ جھپکنے کی طرح ہو گا یا اس سے بھی جلدی۔" قیامت کا آغاز صور اسرافیل سے ہو گا اور یہ اس قدر اچانک ہو گا کہ خود حضرت اسرافیل کو علم نہیں کہ کب مجھے اس کے پھونکنے کا حکم دیا جائے گا۔ وہ تعمیل حکم کے لیے ہر دم مستعد کھڑے ہیں۔ ایک حدیث میں حضرت ابو سعید خدری (رض) روایت کرتے ہیں کہ "رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا کہ میں مزے کی زندگی کیسے گزاروں؟ حالانکہ صور والے فرشتے نے صور منہ میں لے رکھا ہے اور اللہ کے حکم کی طرف کان لگا رکھا ہے اور پیشانی جھکا رکھی ہے اور اس انتظار میں ہے کہ کب

صور پھونکنے کا حکم ہو جائے اور میں فوراً صور پھونک دوں"۔ حضرت ابی ابن کعب (رض) فرماتے ہیں کہ جب تہائی رات باقی رہ جاتی تھی تو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فرماتے "اے لوگو! اللہ کو یاد کرو ' اللہ کو یاد کرو۔ پہلا صور پھونکا جانے والا ہے اور اس کے بعد دوسرا پھونکا جائے گا۔ موت اپنی سختیاں لے کر آ پہنچی ہے"۔

قرآن کریم میں دو دفعہ صور پھونکے جانے کا ذکر ہے۔ سورۃ زمر آیت ۶۸ تا ۶۹ میں ارشاد خداوندی ہے

وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ط ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ ۔ وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا وَوُضِعَ الْكِتٰبُ وَجِآئَ بِالنَّبِيّٖنَ وَالشُّهَدَآءِ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۔ (۳۹: ۶۸۔ ۶۹)

"صور دو دفعہ پھونکا جائے گا۔ پہلی بار ارض و سما کی تمام مخلوق بے ہوش ہو جائے گی سوائے ان کے جنھیں خدا خود بچائے۔ دوسری مرتبہ تمام لوگ اٹھ کر ادھر ادھر دیکھنے لگیں گے۔ اس وقت اللہ کے نور سے زمین جگمگا اٹھے گی ' نامہ اعمال کھل جائے گا ' انبیاء اور شہداء کو حاضر کیا جائے گا ' انھیں ان کی خدمات کا پورا پورا اجر ملے گا اور کسی سے ظلم نہیں کیا جائے گا"۔

ان آیات سے صور اسرافیل کی کیفیات اور اس کا دو دفعہ پھونکا جانا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن سیّد قطب شہید (رح) نے سورۃ یٰسٓ کی آیت نمبر ۴۸ تا ۵۳ سے تین دفعہ صور اسرافیل کی تفصیل بیان کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ دین حق کی تکذیب کرنے والے پوچھتے ہیں کہ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (یٰسٓ: ۳۶۔۴۸)

"اگر تم سچے ہو تو یہ وعدے کا دن کب آئے گا؟" ان کا جواب آنکھ جھپکنے میں تیزی سے گزر جانے والا یہ منظر ہے ' یہ لو۔ یہ صور پھونکنے کی ایک آواز ہی تو ہے کہ دفعتہ وہ انھیں اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ نہ تو اپنے اہل و عیال کو وصیت ہی کر پاتے ہیں اور نہ ان میں واپس لوٹ کر آ سکتے ہیں۔ بلکہ ان کے سامنے ان کے ہاتھوں میں موت کا پیالہ پی لیتے ہیں۔ صور کی پہلی آواز کے بعد قیامت کا پہلا منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ پھر دوسری بار صور کی آواز گونجتی ہے۔ دفعتہ وہ اپنی قبروں سے مٹی جھاڑتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ خوف و دہشت کے عالم میں تیزی سے قدم بڑھاتے ایک دوسرے سے پوچھتے چلے ہیں کہ ہمیں ہماری قبروں سے کس نے نکال باہر کیا۔ پھر آنکھیں ملتے ہوئے فضائے بسیط میں گونجنے والی اس حقیقت کا اعتراف اور اس کی توثیق کرتے ہیں

هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ "ہاں! یہ وہ دن ہے جس کا وعدہ رحمن نے کیا تھا اور جس کی تصدیق اس کے رسولوں نے کی تھی"۔ آج قبروں سے نکل کر کھڑے ہونے کا سبب یہی ہے۔ پھر تیسری بار صور کی آواز گونجتی ہے۔

فَاِذَا هُمْ جَمِيْعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ (یٰسٓ:۳۶۔۵۳)

"ابھی فوراً وہ سب ہمارے حضور میں حاضر ہونے والے ہیں"۔ لو دیکھو آنکھ جھپکنے میں پیشی کا بندوبست ہو گیا۔ لوگوں کی قطاریں لگ گئیں۔ سب کے سب مہر بلب شہنشاہ عالم کا اعلان عام کان لگا کر سن رہے ہیں کہ آج کسی کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی نہیں ہو گی۔ دنیا میں جو اعمال کرتے رہے تھے، آج اس کی جزا دی جائے گی۔ یہاں کسی ناانصافی کا کوئی سوال نہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ پہلے صور اسرافیل سے تمام کائنات کا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ ہر مخلوق موت کا شکار ہو جائے گی سوائے اس کے جس کو اللہ بچانا چاہے اور دوسری دفعہ صور اسرافیل کے بعد از سر نو زندگی وجود میں آئے گی۔ لوگ آنکھیں ملتے ہوئے اٹھیں گے اور حیرانی و پریشانی کے عالم میں ایک دوسرے کا منہ دیکھیں گے۔ پھر جب تیسرا صور پھونکا جائے گا تو تمام بارگاہ ایزدی میں حاضری کے لیے چل پڑیں گے اور اللہ کی عدالت قائم ہو جائے گی اور زندگی کے اعمال کا حساب کتاب شروع ہو جائے گا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں پیدا ہونے والے تغیرات اور مختلف مراحل میں پیش آنے والی کیفیات کا قرآن کریم میں متعدد جگہ ذکر فرمایا گیا۔

نفخہ اولٰی کے بعد کی کیفیت

سورۃ الحاقہ میں نفخہ اولی کے بعد کی کیفیت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا:

فَاِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ نَفْخَةٌ وَّاحِدَةٌ ۔لا وَّحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً ۔لا فَيَوْمَئِذٍ وَّقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ۔لا وَانْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَهِيَ يَوْمَئِذٍ وَّاهِيَةٌ ۔لا وَّالْمَلَكُ عَلٰٓى اَرْجَآئِهَا ط وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمٰنِيَةٌ يَوْمَئِذٍ تُعْرَضُوْنَ لَا تَخْفٰى مِنْكُمْ خَافِيَةٌ (الحاقہ ۶۹:۱۳۔۱۸)

جس وقت صور پھونکا جائے گا اور اللہ زمین کو پہاڑوں سمیت اٹھا کر یوں پٹخے گا کہ سب کچھ ریزہ ریزہ ہو جائے گا۔ اس روز آسمان پھٹ کر ڈھیلا ہو جائے گا۔ فرشتے اطراف آسمان پر جمع ہو جائیں گے۔ اور اللہ کے تخت کو آٹھ فرشتے اٹھا کر لائیں گے اس وقت تم اللہ کے سامنے پیش کیے جاؤ گے اور تم سے کوئی راز مخفی نہیں رہے گا۔

سورۃ القارعہ میں اس کی نقشہ کشی یوں کی گئی ہے کہ "وہ متنبہ کرنے والی چیز 'وہ کیا ہے متنبہ کرنے والی چیز؟ اور تم کو کس نے بتایا کہ کیا ہے متنبہ کرنے والی؟ یہ وہ چیز ہے جب لوگ پریشان پروانوں کی طرح اور پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح ہوں گے۔"

سورۃ ابراہیم میں فرمایا "جب یہ زمین دوسری زمین سے بدل دی جائے گی اور لوگ نکلیں گے اللہ کی طرف 'جو ایک ہے، قہار ہے۔ "(۴۸:۱۴)

سورۃ المعارج میں فرمایا "جب آسمان پگھلے ہوئے تانبے کی طرح اور جب پہاڑ روئی کے گالوں کی مانند ہو جائیں گے۔ " (۷۰:۸۔۹)

سورۃ قیامہ میں فرمایا گیا۔ "روز قیامت کی قسم اور گناہ پر ملامت کرنے والے نفس کی قسم (یوم الحساب آکر رہے گا) کیا انسان کا خیال یہ ہے کہ ہم اس کی بوسیدہ ہڈیوں کو دوبارہ ترتیب نہ دے سکیں گے؟ کیا وہ جانتا نہیں کہ اس کے پوروں کو ترتیب دینے والے ہم ہی ہیں۔ انسان کی تمنا یہ ہے کہ وہ کچھ کرے اور اپنا مستقبل تباہ کر دے۔ اس لیے (طنزاً) پوچھتا ہے کہ قیامت کب آئے گی؟ اسے کہو اس دن جب آنکھیں پتھرا جائیں گی۔ چاند سیاہ ہو جائے گا اور شمس و قمر اکٹھے کر دیئے جائیں گے۔ اس وقت انسان پوچھے گا ہے کوئی راہ فرار؟ ہر گز نہیں آج کوئی جائے پناہ نہیں۔ سب اللہ کے سامنے پیش کیے جائیں گے اور انھیں اگلے پچھلے اعمال کی خبر دی جائے گی۔ "(۷۵:۱۔۱۳)

سورۃ تکویر میں فرمایا "جب آفتاب بے نور ہو جائے گا۔ "جب ستارے تاریک ہو جائیں گے 'جب پہاڑ چلائے جائیں گے۔ "(۸۱:۱۔۳)

سورۃ انفطار میں فرمایا گیا "جب آسمان پھٹ جائیں گے اور جب ستارے بکھر جائیں گے اور جب سمندر چلائے جائیں گے اور جب قبر کے لوگ زندہ کیے جائیں گے 'اس وقت روح نے جو کچھ پہلے اور پیچھے بھیجا ہے اس کو جان لے گی۔"

(۸۲:۱۔۵)

سورۃ انشقاق میں فرمایا: "جب آسمان پھٹ جائیں گے اور وہ اپنے مالک کی فرمان برداری کریں گے اور وہ فرمان برداری کے ہی لائق ہے جب زمین پھیلائی جائے گی اور جو کچھ اس میں ہے اگل دے گی اور خالی ہو جائے گی۔" (۸۴:۱۔۴)

سورۃ زلزال میں فرمایا گیا جب زمین خوب ہلائی جائے گی اور وہ اپنا بوجھ نکال دے گی اور انسان کہے گا زمین کو کیا ہو گیا ہے؟ اس دن وہ اپنی حالت بیان کرے گی۔" (۹۹:۱۔۴)

مندرجہ بالا تفصیلات سے آپ کو اندازہ ہوا ہو گا کہ نفخ اولی کے بعد کس طرح کائنات کی ہر چیز شکست وریخت کا شکار ہو گی اور کس طرح ایک ہمہ گیر تباہی جملہ مخلوقات اور ہر ذی روح کو اپنی گرفت میں لے لے گی اور یہ سب کس قدر اچانک چشم زدن میں ہو گا۔ ہر دور کی طرح آج بھی عقل کے پرستار اس تمام صورتحال کو سمجھنے سے قاصر ہیں اور وہ اسے ناقابل وقوع اور خلاف عقل گردانتے ہیں۔ حالانکہ یہ صرف ان کی عقل کا پھیر اور عدم علم کا نتیجہ ہے۔ ہم یہاں نفخ اولیٰ کے بعد کی مکمل تباہی پر چند شواہد اور بعض پیش یا افتادہ دلائل ذکر کرتے ہیں۔

مثلاً قرآن کریم نے قیامت کے پہلے مرحلے کو ایک زمینی زلزلے سے تعبیر فرمایا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۚ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَیْءٌ عَظِیْمٌ۔

"اے لوگو! اللہ سے ڈرو کہ قیامت کا زلزلہ نہایت ہولناک شے ہے"۔

زلزلے

وہ زلزلہ جسے خود پروردگار ہولناک فرما رہا ہے اس کی تباہ کاری اور ہمہ گیری کا انسان کیا اندازہ کر سکتا ہے؟ ہم یہاں چھوٹے موٹے زلزلوں کو وقوع پذیر ہوتے دیکھتے ہیں اور ان کی تباہ کاریوں سے چیخ اٹھتے ہیں۔ 1924ء کے زلزلہ جاپان میں 16 لاکھ نفوس ہلاک ہو گئے تھے اور 1935ء کے زلزلہ کوئٹہ میں 51000 اور ہماری قریبی تاریخ میں ایسے ہی کئی ہولناک زلزلے آ چکے ہیں۔ ہر زلزلہ ایک قیامت ہوتی ہے اس سے بلندیاں پست اور پستیاں بلند ہو جاتی ہیں۔ دریاؤں کے رخ مڑ جاتے ہیں، کئی جزیرے ڈوب جاتے ہیں اور کئی نئے نکل آتے ہیں۔ بعض زلزلوں سے پہاڑ پھٹ جاتے ہیں اور ان سے ابلتے ہوئے لاوے کا ایک دریا بہہ نکلتا ہے اور انسان ان حادثات کے مقابلے میں اس قدر

بے بس ہے کہ وہ آج تک انھیں روکنے کی کوئی سبیل نہیں سوچ سکا اور اسے یقین ہے کہ زمین کا مالک زمین کو تباہ کرنے پر پوری طرح قادر ہے۔ علماء زمین شناس کا نظریہ، یہ ہے کہ آج سے لاکھوں سال پہلے جب زمین سورج سے الگ ہوئی تھی تو اس کا درجہ حرارت، حرارت سورج کے برابر تھا۔ یہ حرارت آج بھی بطن زمین میں موجود ہے اور لاوے کا درجہ حرارت وہی ہے جو آغاز میں زمین کا تھا۔ یعنی بارہ ہزار فارن ہائیٹ۔ اب اگر کسی زلزلے سے سارا لاوا باہر آجائے تو سطح زمین ایک کھولتے ہوئے جہنم میں بدل جائے۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ زمین کی تباہی کے لیے اس کو پیدا کرنے والے نے کس قدر امکانات پیدا کر رکھے ہیں اور جہاں تک فضا ' خلا اور آسمانوں کا تعلق ہے اس کی تباہی کوئی ایسی بات نہیں جو سمجھ میں نہ آنے والی ہو۔ خلاء میں کروڑوں بلین ستارے حیرت انگیز رفتار سے محو پرواز ہیں۔ ان میں سے بعض زمین سے دس گنا اور بعض ایک کروڑ گنا بڑے ہیں۔ ان کا نظام پرواز اتنا مکمل ہے کہ آج تک کوئی ستارہ دوسرے سے متصادم نہیں ہوا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا وہ طاقت جس نے ان ستاروں کو بنایا اور پھر ان کی راہیں متعین کیں اس بات پر قادر نہیں کہ انھیں باہم ٹکرادے اور سب کچھ تباہ کر دے؟ سائنس دان کہتے ہیں کہ نظام عالم کی پوری گاڑی جس انجن سے چل رہی ہے وہ گرم آفتاب ہے۔ جس کی گرمی روز بروز کم ہوتی جارہی ہے۔
اب سائنس دانوں نے اندازہ لگانا شروع کر دیا ہے کہ اس بات کا امکان ہے کہ ایک دن ایسا آئے گا جب یہ انجن بالکل ٹھنڈا ہو جائے گا اور ساری گاڑی ٹوٹ پھوٹ جائے گی اور یہ بات بھی سائنسدان کہتے ہیں کہ یہ پورا نظام کائنات کشش ثقل کے ستون پر قائم ہے اور یہ کشش ثقل بھی روز بروز مدہم پڑتی جارہی ہے۔ چنانچہ ایک دن آئے گا کہ تمام کرّے ایک دوسرے کے قریب ہو کر ٹکراجائیں گے اور یہ تصادم ان کو چور چور کر دے گا۔
یہ تو وہ حقائق ہیں جن کی بنیاد بہر حال مستقبل کے اندازوں پر ہے۔ لیکن یہ بات تو امر واقعہ ہے کہ خود انسان کیسے کیسے تباہ کن آلات پیدا کر چکا ہے کہ ان کی تباہی خود انسان کے ہاتھوں کوئی دور نظر نہیں آتی۔ انہی ایجادات میں جوہری بم کی ایجاد بھی شامل ہے۔ لارڈ برٹرینڈ رسل نے اسی کے اندر دنیا کی مکمل تباہی دیکھ لی تھی۔ انھوں نے 1848ء کے موسم سرما میں بی بی سی ریڈیو سے تقریر نشر کرتے ہوئے کہا تھا کہ اگر جوہری بم زیادہ تعداد میں پھینکے گئے (اور زمین پر جنگوں کا سلسلہ جاری رہا تو ظاہر ہے کہ پھینکے جائیں گے) تو بعض ماہرین طبیعات کا خیال یہ ہے (اور ان کی رائے واجب احترام ہے) کہ یہ بم تابکار پیدا کریں گے۔ جو ہوا سے گھل مل کر اڑتے اور ادھر سے ادھر گزرتے ہوئے زندگی کی ہر

صورت کو ختم کر دیں گے اور چند سال بعد ہماری زمین انسانوں ' جانوروں اور پودوں سے بالکل خالی ہو جائے گی۔ انہی برٹرینڈ رسل نے (مذہب اور سائنس) میں ایک قدم آگے بڑھایا اور لکھا کہ وہ قوانین جو ترقی کا باعث ہوتے ہیں تنزل کا سبب بھی بن جاتے ہیں۔ ایک دن سورج سرد پڑ جائے گا۔ زمین پر حیوانی اور نباتاتی زندگی کی پوری تاریخ کچھ بہت گرم اور بہت سرد زمانوں کے بیچ کا واقعہ ہے۔ مسلسل ارتقاء کوئی کلیہ نہیں بلکہ تنزل اور ترقی کا پنڈولم ادھر ادھر حرکت کر رہا ہے جس میں بلاشبہ کائناتی قوتوں کے انتشار کی وجہ سے نیچے کی طرف ایک خفیف سا رجحان پایا جاتا ہے۔

نفخۂ ثانیہ کے بعد کی کیفیت اور اس کے دلائل

دوسری مرتبہ صور اسرافیل پھونکے جانے کے بعد زندگی وجود میں آئے گی۔ لوگ اپنی اپنی قبروں سے اٹھیں گے اور اللہ کے اذن اور حکم سے میدان حشر کی طرف چل پڑیں گے۔ وہاں ان کے ہاتھوں میں ان کا نامہ اعمال دیا جائے گا۔
عقل کے پرستاروں کو جس طرح کائنات پر ایک ہمہ گیر موت کے طاری ہونے پر اعتراض ہے اسی طرح اس کے دوبارہ زندہ ہونے پر اور پھر نامہ اعمال میزان اور حساب کتاب پر بھی اعتراض ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کے ان اعتراضات کی وجہ یہ نہیں ہے کہ علمی طور پر ان کے غلط ہونے کی کوئی دلیل ان کے ہاتھ آگئی ہے۔ بلکہ اس انکار کی وجہ سراسر بے علمی اور جہالت ہے۔

قرآن کریم کہتا ہے: بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ (یونس:۱۰۔۳۹) "انھوں نے صرف اس لیے اس حقیقت کو جھٹلایا کہ ان کا علم اس کا احاطہ نہ کر سکا۔ اگر کسی چیز کا علم نہ ہونا اس چیز کے وجود پر انکار کی دلیل ہو سکتا ہے تو پھر اس انکار کی بھی کوئی علمی توجیہ ممکن ہے۔ لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو قرآن کریم کہتا ہے کہ اس وقت کا انتظار کرنا چاہیے، جب تمہاری آنکھوں سے حجابات اٹھا لیے جائیں گے اور ہر حقیقت تمہارے سامنے جلوہ گر ہو جائے گی اور کوئی راز 'راز نہ رہے گا۔ سورۃ الکہف میں فرمایا: وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ ط ذٰلِكَ يَوْمُ الْوَعِيْدِ ۔ وَجَآءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَآئِقٌ وَّ شَهِيْدٌ ۔ لَقَدْ كُنْتَ فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ ۔

(الکہف۱۸:۲۰۔۲۲)

وہ صور پھونک دیا گیا' وہ وعدے کا دن طلوع ہو گیا۔ ہر فرد محشر میں اس حال میں آئے گا کہ اس کے ہمراہ ہانکنے والا ہو گا اور ایک گواہ بھی۔ تم اس صورتحال سے بے خبر تھے سو آج ہم نے تمام حجابات اٹھا دیئے اور اب تمہاری نگاہ بہت تیز ہو گئی"۔ نگاہ کی اس تیزی کا انتظار کرنا چاہیے۔ تاہم اگر غیر جانبداری سے غور کیا جائے اور علمی حدود کو ملحوظ خاطر رکھا جائے تو آج بھی بیشمار شواہد ایسے ہیں جو قیامت کے ایک ایک مرحلہ کی دلیل ہیں۔ ہم نہایت اختصار سے چند دلائل ذکر کرتے ہیں۔

بیشمار شواہد ایسے ہیں جو قیامت کے ایک ایک مرحلہ کی دلیل

1 مثلاً جو لوگ اللہ کی ذات اور اس کی صفات کے قائل ہیں وہ اس بات کا انکار نہیں کر سکتے کہ اللہ کی ایک صفت ہر چیز پر قادر ہونا ہے۔ یعنی وہ قدرت کاملہ کا مالک ہے۔ اب جو آدمی اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا یقین رکھتا ہے اور یہ بھی مانتا ہے کہ اسی نے اس کائنات کو اور اس کی ایک ایک مخلوق کو پیدا فرمایا ہے تو اس کے لیے اس بات کو ماننے میں کوئی دقت نہیں ہونی چاہیے کہ جو اس کائنات کا خالق ہے آخر وہ اس کو ہلاک کرنے اور پھر زندہ کرنے پر قادر کیوں نہیں؟ سورۃ نازعات آیت ۲۷ تا ۳۳ میں فرمایا: "کیا تمہاری تخلیق مشکل ہے یا آسمان کی؟ اللہ نے آسمان کو پیدا کیا اور اس نے چھت کو بلند کرنے کے بعد اس کو استحکام بخشا۔ رات کو تاریک اور دن کو روشن بنایا۔ اس کے بعد زمین کو بچھایا' ان میں سے پانی نکالا' چارہ پیدا کیا اور پہاڑوں کو اس پر کھڑا کر دیا۔ یہ سب کچھ تمہارے اور تمہارے مویشیوں کے لیے متاع ہے۔ یعنی جو خالق و مالک ان تمام باتوں پر قدرت رکھتا ہے آخر وہ تمہاری ہمہ گیر موت اور دوبارہ زندگی پر قدرت کیوں نہیں رکھتا؟

سورۃ بنی اسرائیل میں فرمایا: وَقَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا۔

(بنی اسرائیل ۱۷:۴۹)

"اور وہ بولے کہ جب ہم ہڈی اور چورا ہو جائیں گے تو پھر کیسے از سر نو زندہ کیے جائیں گے۔ کیا یہ نہیں دیکھتے کہ وہ اللہ جس نے آسمانوں اور زمین کو بنایا وہ ان جیسے لوگوں کو دوبارہ بھی بنا سکتا ہے۔

سورۃ روم میں فرمایا کہ خدا وہی ہے جو خلق کو آغاز کرتا ہے، پھر اس کو دوبارہ خلق کرے گا اور یہ دوبارہ خلق کرنا اس کے لیے آسان ہے۔(روم ۳۰:۲۷)

سورۃ یٰسٓ میں فرمایا:قَالَ مَنۡ یُّحۡیِ الۡعِظَامَ وَهِیَ رَمِیۡمٌ ۔ قُلۡ یُحۡیِیۡهَا الَّذِیۡۤ اَنۡشَاَهَاۤ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۔ ط (یٰسٓ ۳۶:۷۸۔۷۹)

(وہ بولے کون ان کھوکھلی وسڑی ہڈیوں کو زندہ کرے گا، آپ کہہ دیجئے وہی جس نے پہلی دفعہ ان کو بنایا)

سورۃ قیامہ میں ارشاد فرمایا:ایحسب الانسان ان لن نجمع عظامه بلی قادرین علی ان نسوی بنانه (۷۵:۳۔۴)

"کیا انسان کا خیال یہ ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو پھر جمع نہ کر سکیں گے۔ ہم تو اس بات پر بھی قادر ہیں کہ چھوٹی ہڈیوں 'ریشوں اور رگوں سے اس کی انگلیوں کے پورے بنا ڈالیں"۔یعنی جس پروردگار نے چھوٹی ہڈیوں 'ریشوں اور رگوں سے ایسے پوروں کو ترتیب دیا ہے کہ جو آج بھی دستاویزی ثبوت کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ اربوں کھربوں انسانوں کی تخلیق کے باوجود کسی ایک انسان کے انگوٹھے کا نشان دوسرے انسان سے نہیں ملتا۔ جو خالق کائنات اس بات پر قادر ہے کیا وہ تمھیں دوبارہ زندہ کرنے پر قادر نہیں ہے؟

2 پروردگار کی صفات کو ماننے والے اس کی صفت عدل کو بھی تسلیم کرتے ہیں۔ عدل کا ایک معنی ہے تلافی مافات۔ یعنی نقصان کو پورا کرنا۔ اس عدل کے بیشمار مناظر ہمارے سامنے ہیں۔ جب ہم کسی درخت کی شاخوں کو کاٹ دیتے ہیں تو نئی شاخیں ان کی جگہ لے لیتی ہیں۔ جب ہم کسی جنگل کا کوئی قطعہ درختوں سے صاف کر دیتے ہیں تو وہاں نئے پودے اور بوٹیاں اگ آتی ہیں۔ جب تلوار وغیرہ سے کسی حصہ جسم کا گوشت کٹ جاتا ہے تو قدرت نیا گوشت دے دیتی ہے۔ ہم کنویں سے کتنا ہی پانی نکالیں زمین کی رگوں سے اتنا ہی پانی اس میں آجاتا ہے۔ یہ حقیقت عدل جو حیات کی ہر سطح میں پائی جاتی ہے اور جس پر ارض وسما کا نظام قائم ہے۔ اس عدل کا تقاضا ہے کہ جب ہم سے یہ دنیا چھن جائے تو ہمیں ایک اور ایسی دنیا ملنی چاہیے جہاں اس زندگی کی تمام ناانصافیوں کی تلافی ہو۔ اس لحاظ سے جب ہم دیکھتے ہیں کہ اس دنیا میں جو لوگ انسانیت کے سب سے بڑے محسن رہے ہیں ان میں انبیاء بھی ہیں اور مصلحین امت بھی۔ وہ سب سے زیادہ ستائے گئے۔ انھوں نے انسان کو راہ راست دکھانے اور پنجہ استبداد سے چھڑانے کے لیے بے اندازہ

مصائب اٹھائے۔ لیکن اس کے بدلے میں جن پر انھوں نے احسان کیا ان کی طرف سے انھیں کیا ملا؟ کوئی سپر د دار ہوا اور کوئی سپر د نار۔ کسی کو قتل کیا گیا تو کسی کو زندہ دیوار میں چن دیا گیا۔ انھیں اس زندگی میں سوائے مصیبتوں اور تکلیفوں کے کچھ نہیں ملا۔ بقول شاعر

زمانہ یونہی اپنے محسنوں کو تنگ کرتا ہے
وہ درس صلح دیتے ہیں یہ ان سے جنگ کرتا ہے

اور ان کے مقابلے میں وہ لوگ جنھوں نے انسانیت کو تباہ و برباد کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی وہ دنیا میں ظلم و استبداد کی علامت بن کر رہے اور جنھوں نے خالق کائنات کے مقابلے میں اپنی ربوبیت کا صور پھونکا۔ وہ ہمیشہ عیش و عشرت کی زندگی گزارتے اور زندگی کی نعمتوں سے فیضیاب ہوتے رہے۔ آپ نے پڑھا ہو گا کہ جب چنگیز کے پوتے ہلاکو خان نے 1258ء میں بغداد پر حملہ کیا تھا تو وہاں سات دن میں 19 لاکھ شہری موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے تھے۔ سوال یہ ہے کہ ہلاکو اور اسی نوع کے دیگر قذاقوں اور قاتلوں کو ان جرائم کی سزا کیا ملی؟ اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ایک بیوہ کا اکلوتا بیٹا جو اس کے بڑھاپے کا سہارا تھا کسی قاتل کی گولی کا شکار ہو جاتا ہے۔ وہ باقی زندگی پولیس کے چکر کاٹتی ' دربدر ٹھوکریں کھاتی اور شب و روز آنسو بہاتی گزار دیتی ہے۔ اولاً تو اس کے قاتل پکڑے نہیں جاتے اور پکڑے بھی جائیں تو انھیں سزا نہیں ملتی۔ وہ رات دن یہ کہہ کہہ کر تخت الٰہی کو ہلاتی رہتی ہے۔

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندہ مظلوم کے اوقات

اور پھر کتنے لوگ ایسے ہیں جو تخت اقتدار پر بیٹھ کر لاکھوں آدمیوں کی محرومیوں کا باعث بنتے ہیں یا ان کے قتل کا سبب ٹھہرتے ہیں اور کتنے ایسے تخریب کار ہیں جو گاڑی کی پٹڑی اکھاڑ کر یا بم پھینک کر سینکڑوں اور ہزاروں آدمیوں کو لقمہ اجل بنا دیتے ہیں۔ اولاً تو ان کو سزا نہیں ملتی اور اگر ملتی بھی ہے تو ان کی ایک جان سینکڑوں اور ہزاروں جانوں کا عوض تو نہیں بن سکتی۔ ایک جان تو ایک جان کا بدلہ ہو سکتی ہے، باقیوں کا بدلہ کون دے گا؟ اگر اللہ عادل ہے اور عدل اس کی صفت ہے تو اسی صفت عدل کا تقاضا ہے کہ ایسی دنیا ہونی چاہیے اور ایک ایسی عدالت قائم ہونی چاہیے

جہاں انسانیت کے محسنوں اور قاتلوں کو اپنے اپنے کیے کا بدلہ ملے۔ محسن لافانی مسرتوں سے ہمکنار ہوں اور مجرم قہر وعذاب کا شکار ہوں۔

3 امریکہ کے مشہور فلسفی ولیم جیمز آغاز میں آخرت کے منکر تھے۔ لیکن بڑھاپے میں معتقد ہو گئے۔ دلیل یہ دی کہ انسان بڑھاپے میں علم و دانش کی بلندیوں پر پہنچ جاتا ہے اور ایک نیا شعور حاصل کر لیتا ہے۔ اللہ ان باکمال لوگوں پر زندگی کا دروازہ بند نہیں کرے گا۔ ایسی اقالیم ہونی چاہئیں جہاں یہ اپنی صلاحیتوں کو کام میں لا کر نئی بلندیوں کو سر کر سکیں۔ یہ بلندیاں اس خفیہ براعظم میں ہیں جو ہمارے حاشیہ خیال سے پرے واقع ہے۔ انسان میں بقا کی آرزو فطری ہے۔ اس مقصد کے لیے کوئی کتابیں لکھتا ہے 'کوئی عمارات اور تصاویر بناتا ہے کوئی عبادت کرتا ہے اور کوئی گیت تراشتا ہے۔ کائنات میں بے اندازہ معقولیت ہے۔ اس لیے یہ سمجھنا کہ موت کی ایک پھونک سے شمع حیات گل ہو جائے گی یا انسان چند جملے بول کر ہمیشہ کے لیے خاموش ہو جائے گا۔ بہت نامعقول سی بات ہے۔

4 ہم ہر روز اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھتے ہیں کہ موسم گرما یا موسم سرما میں اگر بارش برسنے میں دیر ہو جائے تو ایسے لگتا ہے کہ ہر چیز اپنی موت آپ مر گئی۔ زمین سبزے سے محروم ہو جاتی ہے جو ہڑوں میں پلنے والی مخلوق یعنی مینڈک وغیرہ ختم ہو جاتے ہیں۔ زمین پر اٹھتی ہوئی دھول اس وقت موت کی غماز بن جاتی ہے۔ پھر اچانک ہم دیکھتے ہیں کہ گھٹا اٹھتی ہے برستی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے زمین سبز مخمل کی وردی پہن لیتی ہے۔ صاف نظر آتا ہے کہ زندگی از سر نو وجود میں آئی ہے اور مردہ زمین زندہ ہو گئی ہے۔ تو جو پروردگار مردہ زمین کو بارش کے چند چھینٹوں سے نئی زندگی عطا فرما سکتا ہے وہ انسانوں کو دوبارہ زندہ کیوں نہیں کر سکتا؟ یہی بات سورۃ فاطر آیت نمبر ۹ میں فرمائی گئی: وَاللّٰهُ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ الرِّیٰحَ فَتُثِیْرُ سَحَابًا فَسُقْنٰهُ اِلٰى بَلَدٍ مَّیِّتٍ فَاَحْیَیْنَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ط كَذٰلِكَ النُّشُوْرُ۔ (۲۵۔ ۹) "اللہ وہ ہے جو ہواؤں کو بھیج کر پہلے بادل بناتا ہے اور پھر ہانک کر کسی مردہ بستی کی طرف لے جاتا ہے پھر ہم مردہ زمین کو اس سے زندہ کرتے ہیں اور قیامت کے دن مردے بھی اسی طرح زندہ ہوں گے۔

5 کائنات کی سب سے بڑی حقیقت تغیر اور اختلاف حالات ہے۔ کوئی چیز یہاں ایک حالت پر قائم نہیں رہتی۔ مسلسل ارتقاء یا مسلسل تنزل یہاں کی حقیقت نہیں۔ عروج اور زوال دو ایسی حقیقتیں ہیں جن کی افراد اور قوموں میں ہمیشہ

رونمائی ہوتی رہتی ہے۔ موسم بدلتے ہیں، صبح و شام میں تبدیلی آتی ہے۔ یہ سب اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ یہاں قرار کسی چیز کو نہیں، بلکہ ثبات اور قرار اگر کسی کو ہے تو بقول شاعر:

ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

یہ تغیر اور عدم ثبات دراصل اس بات کی دلیل ہے کہ ثابت اور قائم رہنے والی ذات صرف ایک ہے، جس کی صفت الحیؔ اور القیوم ہے۔ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی، اسی کی ذات کو دوام اور ثبات ہے۔ باقی ہر چیز اس کی ذات اور اس کے قانون کی گرفت میں ہے اس کا قانون یہ ہے کہ وہ ہر دم چیزوں کو 'افراد کو اور قوموں کو تغیر کا شکار کرتا رہتا ہے۔

اگر یہ واقعی ایک حقیقت ہے تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ کائنات کی یہ زندگی ہمیشہ کے لیے رہے اور پھر جب اس زندگی پر موت کا پردہ چھا جائے تو یہ پردہ کبھی تار تار نہ ہو، یعنی یہاں نہ تو زندگی کو ثبات ہے اور نہ موت کو ثبات ہوگا۔ جس طرح یہاں ہر صبح شام میں ڈھل جاتی ہے اسی طرح کوئی شام بھی دوام کا مقدر لے کر نہیں آئی بلکہ اللہ کے قانون کے مطابق ضرور صبح طلوع ہوتی ہے۔ اس لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جب اس صبح حیات پر موت کی رات طاری کردی جائے گی تو پھر ایک ایسا وقت آئے گا جب پھر اس کی صبح طلوع ہوگی۔ کیونکہ اس زندہ اور قائم رہنے والی ذات کی اصل صفت زندگی ہے اور چونکہ روح اس کا امر ہے اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ اس روح کو ہمیشہ کی زندگی نصیب نہ ہو اور یہ زندگی چونکہ قیامت کے بعد ہوگی اس لیے اس کا لازمی تقاضا ہے کہ قیامت بھی ضرور برپا ہو۔ یہی بات اقبال کہتے ہیں۔

جوہرِ انساں عدم سے آشنا ہوتا نہیں
آنکھ سے غائب تو ہوتا ہے فنا ہوتا نہیں
یہ اگر آئینِ ہستی ہے کہ ہو ہر شام صبح
مرقدِ انساں کی شب کا کیوں نہ ہو انجام صبح

6 اگر مزید غور کیا جائے تو خود انسان کا جسم اس بات کی دلیل ہے کہ قیامت ایک حقیقت ہے۔ کیونکہ قیامت صغریٰ یعنی موت وحیات کی کشمکش اور حشر ونشر خود انسان کے جسم کے اندر برپا رہتا ہے۔ میڈیکل سائنس کہتی ہے کہ انسانی جسم کے ترکیبی اجزاء کو خلیہ (سیل) کہتے ہیں۔ ایک اوسط درجے کا جسم اندازاً 26 ارب ملین خلیوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ ورزش، محنت اور مطالعہ سے یہ خلیے ٹوٹتے اور ان کی جگہ نئے خلیے بنتے رہتے ہیں۔ ماہرین ابدان کا اندازہ یہ ہے کہ ہر سات سال کے بعد جسم کی مکمل تجدید ہو جاتی ہے۔ پرانے خلیے مر جاتے ہیں اور ان کی جگہ اور نئے خلیے لے لیتے ہیں۔ جو شخص یہاں عمر کے ستر سال گزارتا ہے وہ گویا دس مرتبہ مر چکا ہوتا ہے۔ لیکن موت کے ان مسلسل حملوں کے باوجود وہ زندہ رہتا ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ موت کے اخری حملے کے بعد بھی وہ زندہ رہے۔

موت تجدید مذاق زندگی کا نام ہے

خواب کے پردے میں بیداری کا ایک پیغام ہے

7 قرآن کریم نے بعض ایسی تاریخی شہادتیں بیان فرمائی ہیں جو "**بعث بعد الموت**" یعنی دوبارہ جی اٹھنے پر مضبوط دلائل فراہم کرتی ہیں اور پھر یہ واقعات ایسے ہیں کہ تمام آسمانی مذاہب اس کی تصدیق بھی کرتے ہیں۔ حضرت عزیر (علیہ السلام) جو بنی اسرائیل کے ایک جلیل القدر نبی گزرے ہیں بلکہ بنی اسرائیل کی تباہی اور توراۃ کے جلائے جانے کے بعد انھوں نے تجدید واحیائے دین کا زبردست کارنامہ انجام دیا۔ ان کے بارے میں قرآن کریم سورۃ البقرہ آیت نمبر ۲۵۸ میں بتاتا ہے کہ حضرت عزیر (علیہ السلام) کا گزر ایک ایسی بستی پر ہوا جو مکمل تباہ ہو چکی تھی۔ انھوں نے اسے دیکھ کر (شاید دل میں) کہا یہ آبادی جو ہلاک ہو چکی ہے، اسے اللہ تعالیٰ کس طرح دوبارہ زندگی بخشے گا؟ اس پر اللہ نے ان کی روح قبض کر لی اور وہ سو برس تک مردہ پڑے رہے پھر اللہ نے انھیں دوبارہ زندگی بخشی اور ان سے پوچھا کہ کتنی مدت یہاں پڑے رہے ہو؟ انھوں نے کہا کہ ایک دن یا چند گھنٹے رہا ہوں گا۔ پروردگار نے فرمایا تم پر سو برس اسی حالت میں گزر چکے ہیں۔ اب ذرا اپنے کھانے اور پانی کو دیکھو کہ اس میں ذرا تغیر نہیں آیا اور اپنے گدھے کو بھی دیکھو (جس پر وہ سوار ہو کر آئے تھے۔ کہ اس کا پنجر تک بوسیدہ ہو گیا ہے) اور یہ ہم نے اس لیے کیا ہے کہ ہم تمھیں لوگوں کے لیے ایک نشانی بنا دینا چاہتے ہیں۔ پھر دیکھو کہ ہڈیوں کے اس پنجر پر ہم کس طرح گوشت پوست

چڑھاتے ہیں۔ اس طرح جب حقیقت ان کے سامنے بالکل نمایاں ہو گئی تو انھوں نے کہا میں جانتا ہوں کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ یعنی اس طرح حضرت عزیر (علیہ السلام) کو زندگی اور موت کے مرحلے سے گزار کے آنے والی دنیا کے لیے ایک نشانی بنا دیا گیا اور یہ واضح کر دیا گیا کہ میری قدرت کے سامنے یہ بات کوئی مشکل نہیں کہ ایک جیتے جاگتے انسان کو اچانک موت دے دوں اور پھر سو برس کے بعد اسے زندہ کر دوں اور اس سو سال کے عرصہ میں اس کے کھانے پانی کو باسی تک نہ ہونے دوں اور اس کے گدھے کی ہڈی ہڈی الگ کر دوں اور پھر دوبارہ اس پر گوشت پوست چڑھا کر اس کو جیتا جاگتا اٹھا کھڑا کروں۔ یہ سب میری قدرت کے کرشمے ہیں۔ اس سے تم اندازہ کر سکتے ہیں کہ تمہیں مارنے اور پھر دوبارہ زندہ کرنے پر پروردگار ہر طرح قادر ہے۔

اسی طرح البقرۃ آیت نمبر ۲۶ میں حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کا واقعہ بیان کیا کہ جب ابراہیم (علیہ السلام) نے پوچھا کہ پروردگار مجھے دکھادے کہ تو مردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے؟ تو اس پر پروردگار نے حکم دیا کہ تم چار پرندے لے لو اور ان کو اپنے سے مانوس کر لو۔ پھر ان کے اجزاء کاٹ کر ان کا ایک ایک جزو ایک ایک پہاڑ پر رکھ دو۔ پھر ان کو پکارو وہ تمہارے پاس دوڑے چلے آئیں گے۔ اور جب ایسا ہو جائے تو خوب جان لو کہ اللہ نہایت غالب اور حکمت والا ہے۔ یعنی اس دنیا میں رہتے ہوئے ہمارے لیے ممکن تو نہیں ہے کہ زندگی اور موت کا راز پالیں۔ لیکن ان واقعات سے صرف یہ بتلانا مقصود ہے کہ اللہ ہر چیز پر غالب ہے اور وہ اپنی حکمت و دانش کے مطابق زندگی اور موت کے فیصلے کرتا ہے۔

اس طرح قرآن کریم میں سورۃ الکہف میں چند نوجوانوں کا ذکر کیا گیا ہے جو تاریخ میں اصحاب کہف کے نام سے مشہور ہیں جو کہ تقریباً تین صدیوں تک غار میں سوئے رہے۔ پھر انھیں نیند سے جگایا گیا لوگوں سے ملے پورے شہر کے لوگ اکٹھے ہو کر انھیں دیکھنے آئے۔ شہر کے حکمران نے ان سے ملاقات کی، پھر وہ اپنے غار میں جا کر سو گئے اور بعد والوں نے یادگار کے طور پر غار کے دھانے پر ایک مسجد تعمیر کر دی اور مورخین کی شہادت کے مطابق آج بھی ان کے آثار زندہ ہیں۔ نئی تحقیق کے مطابق اردن میں عمان شہر کے قریب ایک پہاڑ پر یہ غار دریافت ہو گیا ہے۔ یہ غار عمان شہر سے سات کلو میٹر جنوب میں واقع ہے اور اردن کی مرکزی شاہراہ جو عقبہ سے عمان تک گئی ہے اس سے اس کا فاصلہ تین کلو میٹر ہے۔

یہ حیرت انگیز واقعہ بجائے خود اس بات کی کتنی بڑی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ اسباب کی اس دنیا میں اگر چاہے تو بغیر کسی سبب کے چند نوجوانوں کو صدیوں تک سلائے رکھ سکتا ہے اور پھر انھیں زندہ اٹھا کر لوگوں پر حجت تمام کر سکتا ہے اور یہ پورا واقعہ اسی شہر میں پیش آیا تھا جس شہر کے رہنے والے دوبارہ اٹھنے یا نہ اٹھنے یعنی قیامت کے حق و باطل ہونے میں بری طرح جھگڑ رہے تھے اور اللہ تعالیٰ نے اس طریقے سے قیامت کے بر حق ہونے کی پر ان پر ایک حجت تمام کر دی اور قرآن کریم نے اسے بیان فرما کر قیامت تک آنے والوں کے لیے قیامت کے سمجھنے کو آسان کر دیا۔ قرآن کریم کہتا ہے: وَكَذٰلِكَ اَعۡثَرۡنَا عَلَيۡهِمۡ لِيَعۡلَمُوۡۤا اَنَّ وَعۡدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيۡبَ فِيۡهَا جق

(الکہف:۱۸۔۱۲)

”اس واقعہ اصحاب کہف سے ہم نے انھیں صرف اس لیے آگاہ کیا تاکہ وہ جان لیں کہ اللہ کا وعدہ حق ہے اور قیامت کے آنے میں کوئی شبہ نہیں۔

1 قیامت کے وقوع پر اگر ہم ایک اور حوالے سے غور کریں تو پھر قیامت کے وجود کو تسلیم کرنا نہ صرف مذہبی فریضہ ٹھہرتا ہے، بلکہ عقل اور اخلاق کا تقاضا بھی بن جاتا ہے۔ کیونکہ انسان کی اجتماعی زندگی میں حسن عمل کا سرمایہ یا اخلاقی زندگی کا بیش بہا خزانہ صرف اس وقت تک موجود ہے اور رہے گا جب تک انسان میں ایک بات کا تصور زندہ رہے گا۔ وہ یہ کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں یا جو کچھ کروں گا میرا ہر عمل اپنی مکافات بھی رکھتا ہے۔ جس طرح میں اس کائنات کا ایک حصہ ہوں، اسی طرح میرے اعمال بھی اس کائنات کے باقی حقائق کی طرح ان کا ایک حصہ ہیں۔ جس طرح اللہ کا قانون یہاں ہم کار فرما دیکھتے ہیں کہ ہر حالت کوئی نہ کوئی اثر رکھتی ہے اور ہر چیز کا کوئی نہ کوئی خاصہ ہے۔ ممکن نہیں جہاں کوئی شے اپنا وجود رکھتی ہے وہ اثرات و نتائج کے سلسلہ سے باہر ہو۔ پس جس طرح خدا نے اجسام و مواد میں خواص و نتائج رکھے ہیں۔ یعنی آگ جلاتی ہے 'پانی ٹھنڈک پیدا کرتا ہے 'سنکھیا کھانے سے موت اور دودھ پینے سے طاقت آتی ہے۔ کونین سے بخار رک جاتا ہے۔ اسی طرح اعمال میں بھی خواص و نتائج ہیں اور جس طرح جسم انسانی کے قدرتی انفعالات ہیں اسی طرح روح انسانی کے لیے بھی قدرتی انفعالات ہیں۔ جسمانی موثرات جسم پر مرتب ہوتے ہیں اور معنوی موثرات میں روح متاثر ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ ہم اجسام و مواد کے خواص و نتائج کو دیکھنے کے عادی ہو گئے ہیں تو ہمیں ان کے خواص و نتائج پر بھی شبہ نہیں ہوتا مثلاً ہم گیہوں بوتے ہیں تو ہمارے دل میں یہ خدشہ

کبھی نہیں گزرتا کہ گیہوں پیدا نہ ہو گا اور اگر ہم سے کوئی کہے کہ ممکن ہے گیہوں کی جگہ جوار پیدا ہو جائے تو ہم اسے پاگل سمجھیں گے۔ اس لیے کہ فطرت کے قانون مکافات کا یقین ہماری طبیعت میں راسخ ہو چکا ہے اور ہمیں یہ کبھی وہم و گمان بھی نہیں گزرتا کہ فطرت گیہوں لے کر اس کے بدلے میں جوار دے گی۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ہم یہ بھی ماننے کو تیار نہیں ہوتے کہ اچھی قسم کا گیہوں لے کر فطرت بری قسم کا گیہوں دے سکتی ہے۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ وہ بدلہ دینے میں قطعی اور شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ لیکن اعمال کے قدرتی خواص و نتائج جنھیں سزا و جزا سے تعبیر کیا گیا ہے یعنی اچھے اعمال کا نتیجہ اچھائی ہے، جس پر ثواب ملے گا اور برے اعمال کا نتیجہ برائی ہے، جس پر عذاب ملے گا اور پھر اچھے اعمال کے نتیجے میں اچھے اعمال برگ و بار لائیں گے تو انسانی معاشرت میں صحتمند توانائی بروئے کار آئے گی اور انسانی زندگی خوشحالی اور اعتدال سے ہم آہنگ ہو گی اور اگر برائی کریں گے تو اس کا نتیجہ برائی ہو گا اور اس کے رد عمل کے طور پر برائی پھیلے گی اور معاشرہ غیر صحت مند صورت حال کا شکار ہو کر تباہی اور بربادی کا راستہ اختیار کرے گا۔ یہ چیزیں چونکہ ہمیں آنکھ سے دکھائی نہیں دیتیں اور اس کے لیے گہرے غور و فکر کی ضرورت ہوتی ہے، اس لیے ہمیں ان باتوں کا یقین نہیں آتا۔ پروردگار ہمیں یہ بتاتا ہے کہ قیامت اصلاً "یوم الدین' ہے اور دین کا معنی ہے جزا اور سزا 'بدلہ اور مکافات۔ یوم الدین کا معنی ہو گا "جزا اور سزا اور بدلہ اور مکافات کا دن"۔ یعنی یہ دن ہم نے اس لیے رکھا ہے تاکہ تمہیں اس بات کا اندازہ ہو کہ تم دنیا میں اچھی زندگی گزارنے اچھائیوں کو سپورٹ کرنے ' اچھائیوں کو فروغ دینے 'اچھائیوں کو سربلند کرنے کے لیے بھیجے گئے ہو اور یہ تمہارے اعمال دنیا میں بھی اپنے اثرات و نتائج رکھتے ہیں۔ جس سے ایک صحت مند معاشرہ وجود میں آتا ہے اور آخرت میں انہی اعمال کے حوالے سے ہم تمہیں جزا و سزا دیں گے۔

نزول قرآن سے پہلے پیروان مذہب کا عالم گیر اعتقاد یہ تھا کہ جزا و سزا محض اللہ کی خوشنودی اور اس کے قہر و عذاب کا نتیجہ ہے۔ اعمال کے نتائج کا اس میں دخل نہیں۔ الوہیت اور شہنشاہیت کے تشابہ سے تمام مذاہب دیگر تصورات کی طرح اس معاملہ میں بھی گمراہی فکر کے مرتکب ہوئے تھے۔ لوگ دیکھتے تھے کہ ایک مطلق العنان بادشاہ کبھی خوش ہو کر انعام و اکرام دینے لگتا ہے، کبھی بگڑ کر سزائیں دینے لگتا ہے۔ اس لیے خیال کرتے تھے کہ خدا کا بھی ایسا ہی حال ہے۔ وہ کبھی ہم سے خوش ہو جاتا ہے کبھی غصہ و غضب میں آجاتا ہے۔ طرح طرح کی قربانیوں اور چڑھاؤوں کی رسم

اسی اعتقاد سے پڑی لوگ دیوتاؤں کا جوش وغضب ٹھنڈا کرنے کے لیے قربانیاں کرتے اور ان کی نظر التفات حاصل کرنے کے لیے نذریں چڑھاتے۔ لیکن قرآن کریم نے جزاء وسزا کا اعتقاد ایک دوسری ہی شکل ونوعیت کا پیش کیا ہے۔ وہ اسے خدا کا کوئی ایسا فعل قرار نہیں دیتا جو کائنات ہستی کے عام قانونی نظام سے الگ ہو۔ بلکہ اسی کا ایک قدرتی گوشہ قرار دیتا ہے۔ اب آپ اندازہ فرمایئے کہ اس حقیقت کو جو اوپر بیان کی گئی ہے اگر نظر انداز کر دیا جائے اور جس کا نتیجہ بہ ہر صورت قیامت کا وجود ہے تو کیا دنیا میں نیکی اور بدی کا تصور امتیاز باقی رہ سکتا ہے پھر تو اچھائی اور برائی یکساں ہو جائیں گی اور نیک اور بد برابر ٹھہریں گے۔ اس کو قرآن کریم کہتا ہے: اَمۡ حَسِبَ الَّذِیۡنَ اجۡتَرَحُوا السَّیِّاٰتِ اَنۡ نَّجۡعَلَهُمۡ کَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ سَوَآءً مَّحۡیَاهُمۡ وَ مَمَاتُهُمۡ ؕ سَآءَ مَا یَحۡکُمُوۡنَ۔ ع وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ بِالۡحَقِّ وَلِتُجۡزٰی کُلُّ نَفۡسٍۭ بِمَا کَسَبَتۡ وَهُمۡ لَا یُظۡلَمُوۡنَ۔

(الجاثیہ ۴۵:۲۱۔۲۲)

”جو لوگ برائیاں کرتے ہیں وہ سمجھتے ہیں ہم انھیں ایسے لوگوں جیسا کر دیں گے، جو ایمان رکھتے ہیں اور جن کے اعمال اچھے ہیں۔ دونوں برابر ہو جائیں گے۔ زندگی میں اور موت میں بھی؟ اگر ان لوگوں کی فہم ودانش کا یہی فیصلہ ہے تو افسوس ان کے اس فیصلے پر اور اللہ نے زمین اور آسمان کو بے کار اور عبث نہیں بنایا، بلکہ حکمت ومصلحت کے ساتھ بنایا ہے اور اس لیے بنایا ہے کہ ہر جان کو اس کی کمائی کے مطابق بدلہ ملے اور یہ بدلہ ٹھیک ٹھیک ملے گا 'کسی پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔“

یہ صحیح ہے کہ اسلامی زندگی کے برپا ہونے سے کسی حد تک دنیا میں بھی ایسا ہو گا۔ لیکن حقیقی جزاوسزا کی مکمل صورت صرف قیامت کی شکل میں وجود میں آئے گی۔ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے:

اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِیَةٌ اَکَادُ اُخۡفِیۡهَا لِتُجۡزٰی کُلُّ نَفۡسٍۭ بِمَا تَسۡعٰی۔ (طٰہٰ:۲۰۔۱۵)

قیامت یقیناً آنے والی ہے میں نے اسے مخفی رکھا ہے تا کہ ہر نفس کو اس کی سعی وکاوش کا بدلہ دیا جائے۔“

مختصر یہ کہ جس طرح دنیا میں ہر چیز کی ایک خاصیت ہے اور جب وہ یہاں پر وجود پذیر ہوتی ہے تو اس کے ساتھ اس کے خواص و آثار بھی پیدا ہوتے ہیں۔ اسی طرح انسان کی اندرونی کیفیات واعمال کے بھی کچھ آثار ولوازم ہیں، جو اس سے الگ نہیں ہو سکتے۔ غرور اور خاکساری 'بخل اور فیاضی 'انتقام اور عفو 'شجاعت اور بزدلی 'تقویٰ اور فسق 'ایمان

اور کفر، ہر ایک کا ایک نہ ایک اثر و نتیجہ ہے اور ہر ایک کے کچھ نہ کچھ خصائص ولوازم ہیں، جو اس سے کسی طرح الگ نہیں ہو سکتے۔ جس طرح سنکھیا سے سمیت ٗشکر سے مٹھاس اور آگ سے حرارت جدا نہیں ہو سکتی، اسی طرح ان معنوی روحانی اور نفسیاتی چیزوں میں بھی علت و معلول کا وہی لزوم ہے، جو جسمانی ٗمادی اور طبیعاتی اشیا میں ہے۔ اب کوئی وجہ نہیں کہ ہم جسمانی، مادی اور طبیعاتی اشیا کے علت و معلول کے رشتے کو جانیں اور اس پر یقین بھی کریں۔ لیکن قیامت جو اس کا منطقی نتیجہ اور عقلی تقاضا ہے اسکو سمجھنے سے انکار کر دیں اور اس پر اشتباہات وارد کریں۔ (تفسیر روح القرآن۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی)

دنیا کافروں کے لئے جنت

حضرت رسالتمآب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جو پیشن گوئی فرمائی وہ آج ہماری نظروں کے سامنے ہے اور موجودہ وقت اس پر شاہد عادل ہیں کہ یہ دنیا کافروں کے لئے جنت ہی ہے اور مسلمانوں کے لیے قید خانہ، جس طرح جنتی زندگی ایک شاہانہ زندگی ہوگی جس میں اہل جنت پر نہ ملامتی ہوگی نہ روک ٹوک وہ جو چاہیں گے وہ سب کچھ ہو جائے گا اور جنتی زندگی میں اہل جنت کو کن فیکون والا منصب رتبہ بھی حاصل ہوگا، آج کی ترقی اور تمام عالم میں حیران کن ایجادات مصنوعات حربی و جنگی اسلحہ ایٹم بم راڈار کا سسٹم بغیر پائلٹ کے ہوائی بمبار جہازوں کی جھرمٹ ہزاروں میلوں پر انسانی حرکتوں کی نگرانی، چاند و سورج پر کمند ڈالنا، بیس ہزار میل پورے عالم کے ذرہ ذرہ پر نگرانی کرنا، یہ ٹیلی ویژن، یہ کمپیوٹری نظام جس سے زمینی، سمندری، فضائی، کنٹرول اور نگرانی، بجلی کا نظام، تیل اور اس کی ہزاروں پیداوار، دس میل تک زیر زمین کھدائی کرنا، یہ موبائل، یہ کلاشنکوف، یہ راکٹ وغیرہ دیگر ہزاروں ایجادات وہ مصنوعات جن کا سلسلہ ابھی جاری ہے، یہ سب جنت الکافر کا حصہ ہے، یہ سب کچھ بنانے والے اور ایجادات کرنے والے سارے غیر مسلم ہیں اور رب العزت سبحانہ کے الہام سے ان پر رحمتوں اور آسائشوں سہولتوں کا دروازہ کھول دیا گیا۔ قال اللہ تعالیٰ سبحانہ: **كلا نمد هؤلاء وهؤلاء من عطاء ربك وما كان عطاء ربك محظورا**۔ (بنی اسرائیل) مطلب یہ ہے کہ یہ طالب دنیا (کافر) ہو یا طالب آخرت (مومن) دنیوی امداد سے دونوں کو حسب مصلحت حصہ پہنچتا ہے، محض کفر و عصیان کی وجہ سے دنیاوی بخشش کے دروازے بند نہیں کئے جاتے (کافروں پر

بخشش کا دروازہ کھلا رہے گا) اب وہ یہ سوچ رہے ہیں کہ زمین و آسمان، چاند سورج، بادلوں، بارشوں، دریاؤں، تمام عالم کے رزق و روزی پر کس طرح کنٹرول حاصل کیا جائے اور پورے نظام عالم کو اپنے ہاتھ میں لے کر سارے جہانوں کو اپنا دست نگر، تابع اور غلام بنایا جائے خاص کر اسلام، قرآن، مساجد، مدارس، دینی اقدار و اعمال پر کس طرح قابو پایا جائے۔حتی یکونوا مثلنا کا خواب دیکھ رہے ہیں اور مسلسل کوششوں میں لگے ہوئے ہیں مزید جنت الکافر کا دائرہ وسیع کر کے العیاذ باللہ خدائی منصب کو حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

ہر نوع مخلوق کی تربیت اسی نوع کے اعتبار سے ہے

رب العلمین سبحانہ و تعالیٰ کی تربیت و پرورش تمام مخلوقات کیلئے ایک جیسی نہیں، ہر نوع مخلوقات کی تربیت اسی نوع اور افراد نوعی کے مطابق ہے، تو ظاہر ہے کہ اونٹ اور ہاتھی کی تربیت مچھر و مکھی کی تربیت سے مختلف ہے، ہر ایک کی تربیت اسی کے مطابق ہے، اعلی کی تربیت اعلی اور ادنی کی ادنیٰ ہوتی ہے، جب انسان اشرف المخلوقات اور خلاصہ کائنات ہے تو اس کی تربیت سب سے اعلیٰ اور مقدم ہے، چونکہ کائنات صرف انسان کیلئے ہے اور باقی مخلوقات بھی انسان کیلئے ہیں تو وہ سب کا سردار ہے، انسان کو کسی مخصوص کارنامہ انجام دینے کی بنیاد پر یہ سرداری انہیں ملی ہے بلکہ ابتداء وبالذات اس کی تخلیق اسی مقصد کیلئے ہوئی ہے۔

اور اس کے سر پر خلافت کا تاج اسی خاطر ہے کہ وہ احکام الٰہی کی پاسداری کرے گا اور رب العزت کی ذات وصفات کو دنیا میں متعارف کرائے اور بحیثیت خلیفہ و نمائندہ اس کے قوانین وضوابط کا جہاں میں نفاذ کرے گا، اس کی فرامین پر عمل پیرا ہو کر دوسری مخلوقات کا تحفظ اور نگہداشت کا فریضہ بجالائے گا، اسی مقصد کی بنیاد پر اسے تعظیم و تکریم کی خلعت سے نوازا گیا اور اس پر ہر قسم کی ظاہری وباطنی نعمتوں کا دروازہ کھولا گیا۔ قرآن حکیم نے یوں ارشاد فرمایا:

وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون۔ (الذاریات)

ولقد کرمنا بنی آدم وحملناھم فی البر والبحر ورزقنھم من الطیبت وفضلناھم علی کثیر ممن خلقنا تفضیلا۔ (الاسراء)

(واسبغ علیکم نعمہ ظاھرۃ و باطنۃ) (لقمان)

خشکی و سمندری اور تمام مخلوقات پر انسان کی برتری ثابت ہو گئی اور تقریبا پورے عالم کو اس کی تسخیر میں دیدیا گیا اور بیشتر مخلوقات کو اس کا تابع بنایا گیا "ان الدنیا خلقت لکم و انتم خلقتم للاخرۃ "(الحدیث)

تینوں جہان، عالم دنیا، عالم برزخ، عالم آخرت صرف انسانوں کے لئے ہیں اور انسان ہی کو مکلف بنایا گیا ہے کہ تینوں جہانوں کو کامیابی کے ساتھ عبادت و تقویٰ اور احکام الہی کی پیروی کے ساتھ آباد رکھے ان میں پہلا جہاں صرف اعمال حسنہ واتبع شریعت واقتداء باعمال انبیاء کے ساتھ اور باقی دونوں جہاں صرف نتائج اعمال کے ساتھ مخصوص ہوئے انبیاء اور رسول اور کتب منزلہ اسی مقصد کے لئے ہیں کہ مکلف انسان کے لئے دین الہی کی طرف رہنمائی ہو فرشتے جو نظام عالم اور خدمت خلق پر مامور ہیں وہ بھی انسانوں کی فلاح و بہبود کی خاطر حفاظت کی رامن کا تبین بارشوں بادلوں ہواؤں ارزاق روزی روشنی موسموں کی تبدیلی پر مامور ملائکہ یہ ایک منظم و مربوط نظام ہے جس کو ہم عثمانی حکومت اور تکوینی نظام سے تعبیر کرتے ہیں یہ ساری فطری حکومت انسان ہی کیلئے قائم ہے۔

دراصل یہ مکلف انسان خلیفۃ اللہ الارض مبدا کائنات و سبب تخلیق عالم ہے اور وہی جہاں میں حکمرانی اور سرپرستی کا محور ہے وہ اپنی پیدائش، شکل و صورت، قیام و طیبات، ماکولات و مشروبات و دیگر امور میں تمام مخلوقات سے ممتاز و نرالا ہے اللہ رب العزت نے تمام جہاں کا نظام اسی کو سونپا ہے اور اسی نے اللہ رب العزت کے حضور جواب دینا ہے سیدنا ابو بکر صدیق (رض) مقام صدیقیت پر فائز تھے، جنت کی خوشخبری حاصل کیے ہوئے تھے، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے انہیں جنتوں کے کسی بھی دروازے سے داخل ہونے کی بشارت بھی سنائی تھی اور حضرت فاروق اعظم (رض) نے ان سے کہا تھا کہ میری زندگی کے تمام اعمال لے کر صرف غار ثور والے عمل کے ساتھ سودا کریں، لیکن یہی صدیق اکبر (رض) تھے جو رو رو کر کہتے تھے کہ کاش میں پیدا ہی نہ ہوتا یا صغر سنی میں مر جاتا یا کوئی گھاس ہوتا جسے جانور کھا کر ختم کر دیتے تو اپنے رب کے سامنے پیش ہونے سے بچ جاتا اور نجات پالیتا، خلاصہ الکلام انسان اشرف المخلوقات کی تربیت بہ نسبت دوسری مخلوقات کی تربیت بہ نسبت دوسری مخلوقات کے اعلیٰ و اشرف اور ممتاز ہے، انسانی تربیت کے اصول و مبادی تقریباً بیس چیزوں کے ساتھ منسلک وابستہ ہیں جن کو دو حصوں پر تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

اول ''قوی ظاہری '' یہ پانچ ہیں جن کو حواس ظاہرہ بھی کہتے ہیں جو کہ درج ذیل ہیں:

1۔ قوت باصرہ، دیکھنے کی طاقت۔2۔ قوت سامعہ، سننے کی طاقت۔3۔ قوت ذائقہ، چکھنے کی طاقت۔4۔ قوت لامسہ، محسوس کرنے کی طاقت۔5۔ قوت شامہ، سونگھنے کی طاقت۔

قسم دوم ''حواس باطنہ ''جو کہ تقریباً پندرہ ہیں:

اول وہم، دوم خیال، سوم حس مشترک، چہارم قوت متفکرہ، پنجم ذہانت و قوت عاقلہ، ششم قوت ناطقہ، ہفتم قوت شہویہ، ہشتم قوت غضبیہ، نہم قوت جاذبہ غذا کیلئے، دہم قوت ہاضمہ طعام کیلئے، یازدہم قوت غاذیہ طعام ودواء وغیرہ کو اپنے ٹھکانے پر پہنچانے کیلئے، دوازدہم قوت دافعہ فضلات کا جسم سے اخراج کے لیے، سیزدہم قوت نامیہ جسم کی نشو و نما کیلئے، چہاردہم قوت مولدہ تولید ونسل کیلے، پازدہم قوت حافظہ ہر چیز کی نگہداشت کیلئے۔

ان تمام حواس و قویٰ میں انسان و دیگر حیوانات معمولی فرق کے ساتھ برابر کے شریک ہیں، سوائے قوت ناطقہ اور عاقلہ کے کہ یہ دونوں انسان کے ساتھ مخصوص ہیں اور انہی دونوں قویٰ کی بدولت انسان کو تمام حیوانات پر برتری حاصل ہے اور اس کی عظمت و شرف اور سید المخلوقات ہونے کی دلیل ہیں، انسان میں رب العزت نے جو قوت عاقلہ رکھی وہ اتنی اہم واعلیٰ ہے کہ اس پر تمام کائنات کی تسخیر منحصر ہے مگر ناشکرے انسان نے اس نورانی عقل کا حق ضائع کیا اور رب العزت سبحانہ کی اس عظیم نعمت کی بے قدری کی، وہ اس طرح کہ عقل سے کائنات کی تسخیر کا کام روز اول سے لیتا رہا ہے اور اب تو عجائبات و بے مثال کارناموں کا نا ختم ہونے والا سلسلہ چل رہا ہے مگر یہ سارے وہاں عقول فاسدہ والے کارنامے ہیں جن کو وحی الٰہی کی رہنمائی حاصل نہیں عقل ایک عمدہ صحت ہیں مگر وہ وحی الٰہی کی رہنمائی کے بغیر سعادت و شقاوت کا راستہ معلوم کرنے سے عاجز ہے۔

فارس وروم، یمن، عرب، مصر وافریقہ، ہندوسندھ، چین وجاپان، اسلام سے پہلے حضرت نوح (علیہ السلام) کے زمانے سے لے کر اسلام تک کا عرصہ جو ہزاروں سالوں پر مشتمل ہے، ان علاقوں اور ملکوں میں سینکڑوں بادشاہ گزرے ہیں اور اسی طرح نبی اء کرام بھی یکے بعد دیگرے تشریف لاتے رہے ہیں، قرآن کہتا ہے: یحسرۃ علی العباد مایاتھم من رسول الا کانوا بہ یستھزءون۔ (یس) یہ مذکورۃ الصدر ممالک آباد اور متمدن رہے ہیں مگر عقل کے اندھوں نے نہ انبیاء ورسل کی بات مانی اور نہ آسمانی کتابوں کو تسلیم کیا اور نہ رب العزت سبحانہ کی خالقیت ومالک یت

کے سامنے سر تسلیم خم کیا حضرت آدم (علیہ السلام) سے لیکر حضرت ادریس (علیہ السلام) تک تقریبا ایک ہزار سال کا عرصہ ہے اس مختصر عرصہ میں توحید اور ایمان اور وحی الہی کا زمانہ رہا جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے: کان الناس امۃ واحدۃ فبعث اللہ النبیین مبشرین و منذرین و انزل معھم الکتب بالحق لیحکم بین الناس فیما اختلفوا فیہ (البقرۃ)

انبیائے کرام ہر زمانے میں آتے رہے کوئی زمانہ وحی الہی کے انوار و خلوص سے خالی نہیں رہا اور وحی و نبوت میں کوئی انقطاع نہیں ہوا مگر اہل دنیا کے ذوی العقول طبقہ میں اس کی پذیرائی نہیں ہوئی۔ حضرت آدم (علیہ السلام) سے حضرت نوح (علیہ السلام) کا عرصہ 1256 سال کا ہے طوفان نوح سے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کا عرصہ 1020 سال کا ہے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) سے موسیٰ (علیہ السلام) کا عرصہ پانچ سو تیس سال کا ہے پھر حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے حضرت سلیمان (علیہ السلام) تک کا عرصہ پانچ سو پچاس سال کا عرصہ ہے سلیمان (علیہ السلام) سے بخت نصر کا زمانہ 446 سال کا عرصہ ہے بخت نصر سے اسکندر رومی تک کا عرصہ 436 سال کا عرصہ ہے یہ سارا دور جو کہ ہزاروں سالوں پر مشتمل ہے ترقی یافتہ اور متمدن گزرا ہے مگر توحید اور رسالت اور وحی الہی پر کہیں بھی عمل نہیں ہوا نمونہ کے طور پر آپ صرف چند مثالیں گوش گزار فرمائیں، حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے وقت عراق بابل کا حکمران نمرود بن کنعان تھا جس نے ایک اعلیٰ شاندار محل تعمیر کیا تھا جس کی اونچائی 5000 ذراع اور عرض تین ہزار ذراع ہوتا تھا (قرطبی) بقول بعض مورخین اس کی بلندی اونچائی دو فرسخ تھی

(قرطبی سورۃ نحل اور سورۃ ابراہیم)

اسی طرح فراعنہ مصر نے جو تین اہرام بنائے ہیں یہ آج بھی موجود ہیں آج بھی امریکا بہادر اس کا کھوج لگانے سے قاصر نظر آتا ہے کہ یہ کیا معمہ نما تعمیر ہے تیسرے نمبر پر سد مآرب جسے ملوک یمن و تبابعہ اور حمیر قوم نے تعمیر کیا تھا جس کا ذکر اور تباہی کا بیان قرآن حکیم کی سورۃ سبا میں ہے چوتھے نمبر پر شداد بادشاہ کی جنت جو کہ صنعا یمن بندر گاہ عدن کے قریب بنائی گئی تھی اس کی روداد اور پوری تفصیل تفسیر عزیزی سورۃ فجر کے تحت مذکور ہے اور پانچویں نمبر پر دیوار چین ہے جس کا شمار دنیا کے عجوبات میں سے ہے۔

مختصراً یہ حال ہے عجائبات زمانہ کا جو کہ اس وقت کے سلاطین و پادشاہان عالم کا بیان ہوا، یہ سارے وہ لوگ ہیں جن کا دامن توحید الہٰی اور اعمال صالحہ سے خالی ہے یہ سب کے سب صابئیت اور بدھ مت مذہب کے رکھوالے تھے اور اسی کے پیروکار تھے، صرف ایک سد ایسا ہے جس کا تذکرہ قرآن حکیم نے کیا جو کہ آنکھوں سے غائب ہے اور پائیدار بھی ہے جس کا بانی یا پیغمبر ہے یا ملک صالح علی الاختلاف اور وہ ہے سد ذوالقرنین (علیہ السلام)۔

اسی کے ساتھ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس عرصہ میں ملوک فارس جو گزرے ہیں مورخ ابن جریر طبری اور مسعودی نے مروج الذھب میں نیز دوسروں نے بھی بیان کیا ہے، وہ یہ کہ فارس کا پہلا بادشاہ کیومرث اور آخری بادشاہ یزدجرد جسے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے تباہ کیا، کیومرث سے لے کر یزدجرد تک ایرانی بادشاہ تقریباً 55 بتائے گئے ہیں، ان کی حکمرانی کی مدت 4281 سال ہے۔ یہ سب زرتشت اور مجوسی المذہب گزرے ہیں ان میں سے کوئی ایک بھی دین الہٰی پر نہیں تھا یہ سارے ساسانی ملوک کہلاتے ہیں اسی طرح یمن و افریقہ اور موجودہ سعودی عرب، شام، یمن میں عرب بادشاہوں کی حکمرانی تھی جن کا پہلا بادشاہ سباء بن یشجب بن یعرب بن قحطان اور آخری بادشاہ سیف ذی یزن تھا، بقول مورخین اس نے اسلام قبول کیا تھا واللہ اعلم۔ یمن کے آخری چند ایک بادشاہ عیسائی مذہب کے تھے وہ بھی برائے نام، انہی میں سے ایک ابرہہ شرم بھی ہے جس کی تباہی کا ذکر قرآن حکیم سورۃ الفیل میں ہے اور اسی کے پیشرو بادشاہوں میں وہ ظالم بادشاہ یوسف ذونواس بھی گزرا ہے جس کا ذکر قرآن حکیم کی سورۃ البروج میں بنام اصحاب الاخدود مذکور ہے، یہ واقعہ نجران شہر کا ہے جو کہ اب سعودیہ میں ہے پہلے یمن کا حصہ تھا، کہ سارے بادشاہان یمن سوائے ایک شخص کے یعنی جسے تبع اکبر کہتے ہیں، موحد تھا اور کتب تاریخ میں اس کے کچھ اشعار اور ایمان یاد بھی مذکور ہیں جو کہ اکثر کتب سیرت نے بیان کیے ہیں واللہ اعلم۔

باقی ملکہ سبا بلقیس کے ایمان کا تذکرہ قرآن حکیم سورۃ النمل میں تفصیلاً مذکور ہے، رہا مغرب و یونان وہاں کا حال تاریخی نوادرات اور کتب سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ارسطو و دیگر حکماء یونان عقلمند، فلسفی، منطقی، ریاضی دان، طبیب و حکیم ضرور تھے جس سے کوئی عقلمند انکاری نہیں مگر ان پر بھی صائیت و ستارہ پرستی، ملائکہ پرستی کا غلبہ رہا، رہا ہند و سندھ، جاپان و چین وہ اب بھی بدھ مت مذہب کے پیروکار ہیں، ہزاروں سال پہلے بھی ان کا یہی مذہب رہا ہے کوئی حیرانی کی

بات نہیں اب بھی جاپان میں ایک ایسا فرقہ موجود ہے جو گدھے کی پوجا کرتے ہیں اس کی تفصیل انشاء اللہ آنے والی ہے۔

تربیت وپرورش بذریعہ عقل

رب العلمین تربیت وپرورش بذریعہ عقل یہ بحث ہفتم کا تتمہ ہے، انسان قوت عاقلہ کی بدولت حیوانات ودیگر مخلوقات سے ممتاز ہے اور یہی اس کی عظمت وبرتری کا اصلی سبب ہے۔ انسان میں رب العزت سبحانہ نے قوت عاقلہ جو رکھی ہے اس بارے میں حضرت امام اعظم (رح) فرماتے ہیں "کہ عقل کا محل دماغ ہے اگرچہ اس کا گہرا تعلق قلب کے ساتھ بھی ہے حضرت امام شافعی (رح) ودیگر حضرات کے نزدیک عقل کا محل کلب ہے اگرچہ اس کا تعلق دماغ کے ساتھ بھی ہے قاری محمد طیب (رح) نے اپنی کتاب سائنس اور اسلام میں اس پر سیر حاصل بحث کی ہے اور دل کو اصل قرار دے کر دماغ کو اس کا تابع قرار دیا ہے۔ حضرت علامہ کشمیری (رح) فرماتے ہیں کہ محمل دونوں قولوں کا ایک ہی ہے کیونکہ قلب ودماغ کا آپس میں تعلق ایسا ہے جیسا کہ بلب وبٹن کا تعلق ہو ہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اکثر دیکھا جاتا ہے کہ دماغ میں فتور پیدا ہونے سے عقل جاتی رہتی ہے تو محل دماغ ہی ہو گا اور قلب اس کا معاون ہے حیوانات کی کھوپڑی اور سروں میں دماغ موجود ہیں مگر ان میں عقل کی روشنی نہیں ہوتی حیوانات کا دماغ صرف بدنی ڈھانچہ اعصاب وحواس ساخت بدن کی نگرانی اور تحفظ تک محدود ہے اس میں قوت عاقلہ کا فقدان ہے عقل ایک غیر مرئی نورانی قوت وکیفیت کا نام ہے جسے خلاق جہان سبحانہ نے صرف انسان کے دماغ میں ودیعت فرمائی ہے اس کی مختصر تشریح اطبانے یوں بیان کی ہے۔

دماغ ایک عضو رئیس ہے جس کے ساتھ روح انسانی کا تعلق ہے یا یہ کہ جس کے ساتھ روح نفسانی منسلک ہے۔ دماغ ہی دیکھنے، سننے، سونگھنے، چکھنے، چونے کی ظاہری قوتوں اور سمجھنے اور خیال میں لانے، سوچنے، فرض کر لینے اور یاد رکھنے کی باطنی قوتوں اور طاقتوں کا منبع ہے اسی میں عقل کا خزانہ ہے جو انسان کو اشرف المخلوقات بناتی ہے جب تک انسان کا دماغ صحیح وسالم ہے اس کی عقل وتمیز اور ہوش وحواس بھی قائم رہتے ہیں جب ذرا دماغ میں خلل واقع ہو تو اس کی عقل میں فتور آجاتا ہے پھر اس کی حرکتیں بے محل اور اس کی باتیں بے معنی ہو جاتی ہیں اور وہ دیوانہ ومجنون ہو

کر وحشی جانوروں سے مشابہ ہو جاتا ہے انسان کا دماغ اپنے تمام ہم وزن ہم قد حیوانات سے بڑا ہے اسلئے عقل میں وہ سب پر فائق وغالب ہے مردوں کے دماغ کا اوسط وزن 124 تولہ اور عورتوں کا 110 تولہ ہوتا ہے چالیس برس کی عمر تک دماغ تکمیل کو پہنچتا ہے پھر ہر دس سال میں تقریباً نصف چھٹانگ اس کا وزن کم ہونے لگتا ہے بڑے سر اور وزنی دماغ والے اشخاص زیادہ عقیل وفہیم ہوتے ہیں اور چھوٹے سر اور ہلکے دماغ والے لوگ کم عقل ہوتے ہیں۔

(کلید مطب)

اللہ رب العزت سبحانہ کی تربیت تکوینی بھی ہوتی ہے اور تشریعی بھی، تکوینی کا تعلق تمام مخلوقات کے ساتھ ہے بشمول انس وجن تقریباً تقوینی تعلق وتربیت میں اگرچہ موجودات ومخلوقات میں فرق واختلاف کی وجہ سے ہر قسم کا اختلاف فی التربیت ہو گا مگر کوئی مخلوق تکوینی تربیت سے خالی نہیں، تکوینی تربیت جمادات، نباتات، حیوانات، جواہر واعراض سب پر محیط ہے۔

تشریعی تربیت انسان وجنات کے ساتھ مخصوص ہے کیونکہ یہی دونوں مکلف ہیں باقی سب غیر مکلف، شرعی تکلیف کا مدار عقل وقوت عاقلہ ہے، مگر یاد رہے کہ شرعی تربیت اور تکلیف دونوں برگزیدہ اور عمدہ ہیں البتہ جہاں فائدہ اجر وثواب کا وعدہ ہے وہاں نقصان اور عقاب وعذاب کی وعید بھی ہے۔ دراصل تخلیق کائنات کا اصل سبب وبنیاد بھی یہی ہے کیونکہ انسان کی تخلیق برائے خلافت ایزدی ہے نہ اور کچھ خلاف ایک بہت بڑا منصب شرعی اور اعلیٰ مرتبہ و درجہ تخلیقی پر مرتب ہے۔

من نکردم خلق تا سودے کنم

بلکہ تا بر بندگان جودے کنم

رب العزت سبحانہ کا لطف وکرم اپنے بندوں پر اتنا زیادہ اور عام ہے جس کا حد واندازہ نہیں، بے جان اور ناکارہ مٹی سے وجود وحیات، زندگی پیدا فرمانا کرم نہیں تو اور کیا ہے؟ رب العزت سبحانہ نے محض وجود نہیں بخشا بلکہ ایسا خوبصورت ڈھانچہ عطا فرمایا جو کہ ساری مخلوقات سے اعلیٰ وافضل ہے (لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم) (التین) پھر اس جسم انسانی میں وہ خوبصورت وپائیدار مختلف قیمتی اور کارآمد اعضاء ومفاصل جوڑ پیدا کیے کہ جن میں سے ہر

ایک کی قیمت لاکھوں کروڑوں میں ہے، قلب و دماغ قوت ناطقہ و قوت عاقلہ وہ بے مجال نعمتیں ہیں کی دنیا میں کوئی بشر قیمت ادا کرنے پر قادر نہیں۔ جب ان بیشمار نعمتوں سے نوازا تو ان فانی چند روزہ نعمتوں کو ایک ابدی اور دائمی نعمت کا ذریعہ حصول بنا کر انسان کو مکلف بنایا تا کہ ان نعمتوں کو راس المال قرار دے کر اس کی تجارت نفع بخش فائدہ مند ہو جس کے استعمال شرعی سے اسے جنت اور رضائے الٰہی حاسل ہو، قیامت کے روز اس کی تجارت کا نفع بیشمار راحتوں اور خوشحالیوں کا سبب بن کر ایک بادشاہ جہاں سے بھی زائد آسائشوں کو حاصل کرے گا(**یاایھا الذین آمنو ھل ادلکم علی تجارۃ تنجیکم من عذاب الیم**)غریب انسان دنیا کی تجارت اور فوائد سے اس لیے محروم رہتا ہے کہ اس کے پاس سرمایہ نہیں ہوتا اور اللہ رب العزت سبحانہ نے آخرت کی تجارت منافع کمانے کے لئے اپنے فضل و کرم سے ہر بندہ کو مفت بلا قیمت فرمایا مہیا فرمایا جو کہ بدن اور اعضائے بدن ہیں اور یہ اخروی تجارت ہر قسم کے نقصانات سے پاک ہے دنیوی تجارت کا فائدہ مشکوک ہے جبکہ اخروی تجارت کا نفع یقینی ہے اور وہ ہر قسم کے خسارہ و تباہی اور نقصانات سے پاک ہے۔ سید کائنات (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد گرامی ہے کہ کوئی شخص صدق دل سے کھجور کا ایک دانہ صدقہ کرے تو رحمان عزشانہ اسے اپنے ہاتھ میں لے کر اس کی پرورش فرمائے گا جیسے کوئی اپنے گھوڑے کے بچے کی پرورش کرتا ہے قیامت کے دن اسی ایک کھجور کا نفع مند ثواب پہاڑوں کے برابر اس کو دے دیا جائے گا یہ ہی رب العالمین کی ربوبیت و پرورش کہاں ایک خرما کہاں پہاڑوں کے برابر ثواب۔ (رواہ البخاری و مسلم) ایک مشت نمونہ خروار کی مثال ہے مزید اس پر قیاس فرمائیں۔

اس کے ساتھ آپ یہ اندازہ بھی لگا لیجیے کہ سہولتوں اور کرم نوازیوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر آپ کے پاس ہے پیدائش سے لیکر بلوغت تک سارے احکام کی پابندی معاف ہوئی ایک آزادی کی زندگی عطا ہوئی اس عرصہ میں بچے یہ نہیں کی نکمہ اور ناکارہ ہوتے ہیں بلکہ شعوری طور پر کماتے اور کاروبار بھی کرتے ہیں بڑے لائی لائک اور سنجیدہ ہوتے ہیں مگر کرم نوازی دیکھئے کہ اس کی طرف سے کوئی شرعی پابندی نہیں ہاں اتنا ضرور فرمایا کہ سات سال کی عمر میں اپنے بچوں کو نماز کا امر کرو اور دس سال کی عمر میں بطور تنبیہ معمولی مار اکرو یہ اس لئے کہ ابھی سے تین سیکھ جائیں مگر ان پر احکام شریعت کی پابندی فرض نہیں فرمایا۔ دیکھیں اگر یہ بچے اسی عمر میں مر جائیں گے تو میں اپنے کرم سے انہیں مفت بلا عمل جنت عطا کروں گا آپ پھر اس پر بھی بس نہیں ان کے صبر کنندہ والدین کو جنت بخش دوں گا اور یہ

بچے اپنے والدین کا احترام کریں گے انہیں دوزخ میں جانے سے روک دیں گے (الحدیث متفق علیہ) ان بچوں کو اس اعزاز کے ساتھ میں نے اس لئے نوازا ہے کہ ان کے والدین مسلمان اور میرے فرمانبردار رہے ہیں اور بچوں کو یہ اعزاز میں نے اس لیے عطا فرمایا کہ انہوں نے میرے احکام کی بے احترامی نہیں کی اور مکلف ہونے کا زمانہ نہیں پایا۔ ہاں ان کے پاس کوئی نیکیوں کا انبار اگر نہیں تو نہ سہی میری جنت کی قیمت اور بدلہ عمل نہیں بلکہ میرا فضل اور کرم ہے جیسے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد گرامی ہے۔لن یدخل الجنۃ احد کم بعملہ۔(الحدیث متفق علیہ) یہ ہے سلسلہ ربوبیت کے رحم و کرم کا اور یہ نہیں کہ صرف بچوں کے ساتھ مخصوص ہے بل کے ذی شعور صاحب عقل بالغ لوگوں کے لئے بھی یہ فیض عام ہے کہ رب العزت سبحانہ نے محض عقل پر انسان کو مکلف نہیں بنایا بلکہ اس کے ارادہ اور قدرت و اختیار کا بھی جوڑ لگا دیا جہاں قدرت و اختیار نہ ہو وہاں بہت سے احکام شرعیہ میں سہولتیں ہوں گی نابینا انسانوں پر حج و جہاد معاف فقراء پر حج و زکوٰۃ، صدقۃ الفطر، قربانی معاف، معذوروں پر بہت سارے احکام معاف۔ لطف یہ ہے کہ بندہ اپنے مفاد کی خاطر سفر کر رہا ہے مگر معافی اس کو حاصل ہے کہ نصف نماز معاف، سفر اپنا اور معافی رب العزت سبحانہ کی، یہ مسائل تفصیلاً کتب فقہ میں موجود ہیں۔ فلیراجع۔

عقل ایک روحانی نور ہے

عقل ایک روحانی نور ہے جس کی بدولت نفس علوم ضروریہ و نظریہ کا ادراک کیا کرتا ہے اور اس کے وجود کی ابتداء اسی وقت سے شروع ہونے لگ جاتی ہے جب سے بچہ ماں کے پیٹ میں جنم لیتا ہے اور پھر وہ برابر بڑھتا رہتا ہے تا آنکہ سن بلوغ میں جو کر تکمیل کو پہنچ جاتا ہے۔ صاحب قاموس نے اس کے بہت سے معانی بیان کیے ہیں جو سب کا مآل یہی ہے۔

انسان کی سعادت و شقاوت (خیر و شر، ابدی کامیابی و ناکامی) کے اصول بتلانے اور متعین کرنے کے لیے عقل انسانی کافی نہیں مگر نہ ارسطو اور دوسرے یونانی حکما اپنی عقول و سوچ کی بدولت دنیا کے عقلمندوں میں شمار ہوتے اور رب العزت سبحانہ کی ذات و صفات کی معرفت میں گمراہ و گم نہ ہوتے ان دونوں چیزوں کی شناخت و حقیقت میں تمام یونانی حکماء پاگلوں اور بچوں سے بدتر زیادہ غیر سنجیدہ اور بیوقوف مانے گئے ہیں۔ حضرت امام غزالی (رح) تھافۃ الفلاسفۃ

رسالہ میں اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ (رح) نے مجموعۃ الفتاوی اور نقض المنطق نامی رسائل میں یونانی حکماء کی غیر حکیمانہ قواعد و آراء کی قلعی کھول دی ہے جو قابل مطالعہ ہیں۔

اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم

واز ہر چہ گفتہ اند شنیدیم و خواندیم (سعدی)

اگر عقل انسانی حقائق کو خواص مخلوقات کی معرفت و شناخت کے لئے کافی ہوتی تو رب العزت سبحانہ خالق کائنات اس کی پیشوائی اور رہنمائی کے لئے انبیاء رسولی اور آسمانی وحی کا کیوں کر انتظام فرماتے اللہ رب العزت سبحانہ اپنی مخلوقات کی ہدایت اور صراط مستقیم پر انہیں چلانے کی خاطر ہی تو وحی آسمانی کا انتظام و تربیت مہیا فرمایا اور عقل انسانی کی باگ ڈور وحی آسمانی کے ہاتھ میں دے کر عقل کو وحی کا تابع فرمایا۔ اگر عقل کا صحیح استعمال وحی کی روشنی میں ہو گا تو بہتر نتائج اور فائدہ مند ادراکات کا ظہور ہو گا لیکن عقل محض عقل و ہوا سے وحی کی رہنمائی و رہبری حاصل نہ ہو تو وہ عقل محض کیا کچھ کر سکتی ہے وہ ذات باری تعالیٰ اور اس کی صفات کی معرفت و تعیین میں وہ ٹھوکریں کھائے کہ جس پر کتے اور گدھے کو بھی ہنسی آئے۔

نالہ ہے بلبل شوریدہ تیرا خام ابھی

اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی

پختہ ہوتی ہے اگر مصلحت اندیش ہو عقل

عشق ہو مصلحت اندیش تو ہے خام ابھی

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق

عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

عشق فرمودہ قاصد سے سبک گام عمل

عقل سمجھی ہی نہیں معنی پیغام ابھی

شیوہ عشق ہے آزادی و دہر آشوبی

تو ہے زناری بت خانۂ ایام ابھی
عذر پرہیز پہ کہتا ہے بگڑ کر ساقی
ہے ترے دل میں وہی کاوش انجام ابھی
سعی پیہم ہے ترازوئے کم و کیف حیات
تیری میزان ہے شمار سحر و شام ابھی
ابر نیساں یہ تنک بخشی شبنم کب تک
مرے کہسار کے لالے ہیں تہی جام ابھی
بادہ گردان عجم وہ عربی میری شراب
مرے ساغر سے جھجکتے ہیں مے آشام ابھی
خبر اقبال کی لائی ہے گلستان سے نسیم
نو گرفتار پھڑکتا ہے تہ دام ابھی

پس اسی مریض و آفت زدہ عقل کی رہنمائی اور اسے براہ راست پر ٹالنے کی خاطر حضرت حق لطیف خبیر نے برگزیدہ انبیاء اور رسول کی مقدس جماعت کا انتخاب فرمایا اور اس بیمار عقل کے علاج کی خاطر ان پر وحی نازل فرمائی۔ اپنے اندازہ لگایا ہو گا دنیا کے جس معاشرہ میں بھی وحی پہنچی ہے وہاں روشنائی اور شرافت کا دھوم دھام ہے جہاں وہیں پہنچی نہیں یا اس کی پذیرائی نہیں ہوئی وہاں برابر تاریکی ہے اور انسانیت شرافت کا نام و نشان تک نہیں بچے مسلسل پیدا ہو رہے ہیں مگر شفقت پدری سے محروم ہیں شناختی کارڈ ماں کے نام پر بنتا ہے باپ کا خدا حافظ۔

قدم قدم پہ برکتیں، نفس نفس پہ رحمتیں
جہاں جہاں گزر ہوئی وہاں وہاں سحر ہوئی
جہاں نہیں ہوئی گزر وہاں ہے رات آج تک

وحی کی برکت وفیض

یہ وحی کی برکت وفیض ہے کہ جس نے انسانیت وشرافت کا بول بالا کیا ہوا ہے اور انسانی تہذیب وشرافت کو غرق ہونے سے تحفظ دیا ہوا ہے، عقل ایک ترازو کی طرح ہے اس کے اکثر احکام پسندیدہ ہیں لیکن کسی کو یہ امید نہیں کرنی چاہیے کہ اسی ترازو سے توحید ورسالت اور امور آخرت اور انسانی سعادت وشقاوت بھی تول سکتا ہے، کیونکہ یہ محال ہے اور اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص سونا تولنے والا کانٹا دیکھے اور یہ امید وابستہ کرے کہ اسی سے پہاڑ یا بھرے ہوئے مال سے ٹرک تول سکتا ہوں۔ ٹھیک ہے کانٹا صحیح ہے خراب نہیں مگر اس میں بڑی چیزوں کا تولنا ممکن نہیں، اسی طرح امور آخرت واحکام شریعت کو انسانی عقل کے ترازو میں نہیں تولا جاسکتا، رہا یہ کہ اس میں ذات باری تعالیٰ اور صفات کا تولنا وادراک کرنا یہ عقل کیلئے محال ہے اور یہ صرف وحی الٰہی کے ساتھ مخصوص ہے، پس اگر وحی عقل کی معاون ہو تو پھر ایسا کرنا ممکن ہے ورنہ نہیں اور پھر یہ بات قابل غور ہے کہ جتنے عقلاء اور دانشور انسان ہیں ان کی عقول میں بھی اتنی تفاوت ہوگی اور جب عقول مختلف ہیں تو راستے بھی مختلف ہوں گے ہر عاقل کی عقل دوسرے کی نفی کرتی ہے، لیکن وحی الٰہی میں کوئی اختلاف نہیں۔ انبیاء (علیہم السلام) کی شرائع اگرچہ مختلف ہیں مگر اصول سب کے برابر اور ایک جیسے ہیں، یہی حال آسمانی کتابوں کا ہے کہ ایک دوسرے کی تصدیق کرتی ہیں اور اہل اسلام کا طرہ امتیاز بھی یہی ہے کہ ہر مسلمان سارے انبیاء کی تصدیق کرتا اور انہیں برگزیدہ وبرحق سمجھتا اور ان پر ایمان لاتا ہے۔ (لا نفرق بین احد من رسلہ)۔ (البقرہ)

رواداری وحی الٰہی نے سکھائی

لاکھوں مسلمانوں کے بچوں کا نام ابراہیم، اسماعیل، اسحٰق، یعقوب، ہارون، موسیٰ، عیسیٰ پیغمبروں کے نام پر رکھے ہوئے ہیں، کیا آپ ثابت کرسکتے ہیں کہ کسی یہودی یا عیسائی بچے کا نام محمد ہو یا کسی رافضی بچے کا نام عمر یا ابو بکر ہو، ہرگز نہیں یہ رواداری بھی ہمیں وحی الٰہی نے سکھائی ہے اور ان بدبختوں نے وحی اور اس کی تعلیمات پر پانی پھیر دیا اور تحریف کرکے ضائع کردیا، نام ونشان مٹادیا، ہندو، بدھ، صابی، سکھ یہ لوگ اہل کتاب نہیں تو ان سے گلہ کس چیز کا، گلہ نام نہاد

اہل کتاب سے ہے، نبی و رسول ان معصوم پاکیزہ بر گزیدہ ہستیوں کو کہتے ہیں جو رب العزت سبحانہ کے نمائندے ہوتے ہیں جو کچھ اوپر سے حاصل کرتے ہیں ذوی العقول انسانوں کی اصلاح و تربیت فرماتے ہیں ان کی اپنی تربیت براہ راست رب العزت کی طرف سے ہوتی ہے سارے جہاں سے نسباً، حسباً، خلقاً، خُلقاً، علماً، عملاً، عقلاً، اکمل و اشرف اور افضل ہوتے ہیں، نیز گفتار، سیرت و صورت کے لحاظ سے معیاری اور ساری خلقت کیلئے نمونہ ہوتے ہیں، جہاں خلقت کی عقول و علوم کی انتہاء ہوتی ہے وہاں سے نبوت کی ابتداء ہوتی ہے ان کے علوم و معارف کا سرچشمہ و منبع وحی الٰہی ہے جس کا مرکز عرش الٰہی عز شانہ و مجدہ ہوتا ہے۔

خصوصیات نبوت

اول:۔ انتخاب الٰہی یعنی عہدہ نبوت کسبی نہیں وہبی ہے۔ اس کا انتخاب رب العزت خود فرماتے ہیں اللہ اعلم حیث یجعل رسالتہ اللہ پاک خود جانتا ہے کہ عہد رسالت کس کو دینا ہے رب العزت اپنے علم محیط کے ساتھ یہ عالی مرتبہ منصب جس کو عطا فرماتا ہے وہ نبی اور رسول ہوتا ہے یہ ایسا محبت انتخاب ہے کہ جس میں کسی شبہ و شک اور غلطی کا امکان تک نہیں ہو سکتا۔

دوم: نبی کے علوم وہبی ہوتے ہیں کچھ بھی نہیں وہ کسی زمین کے استاد سے استفادہ کیا ہوا نہیں ہوتا بلکہ وہ آسمانی علوم کا آسمانی استاد سے استفادہ کرتا ہے زمینی سلسلہ تعلیم کے لحاظ سے وہ امی کہلاتے ہیں۔

سوم: وہ حسن صورت و سیرت یعنی ظاہری خوبصورتی اور باطنی خوبصورتی میں تمام جہاں سے ممتاز ہوتے ہیں۔ کان رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) احسن الناس خَلقاً وخُلقاً (متفق علیہ) اور یہی حال دیگر سارے انبیاء کرام (علیہم السلام) کا ہے کہ سیرت و صورت ہر اعتبار سے عمدہ صفات و کمالات کے حامل ہوتے ہیں۔

چہارم:۔ انبیاء کے علوم و اعمال کامل بلکہ افضل و اکمل ہوتے ہیں علم کا کمال یہ کہ اس میں قطعاً غلطی نہ ہو اور عمل کا کمال یہ کہ علم پر مکمل عمل ہو ذرہ بھر علم و عمل میں تفاوت نہ ہو اور ساری امت کے لئے نمونہ عمل ہو اور ان میں گناہ بے عملی کا نام نشان تک نہ ہو حتیٰ کہ مخالف دشمن کو بھی اس کی طہارت و تقویٰ کا اعتراف و اقرار ہو۔

پنجم: تکمیل علم و عمل یعنی جو حضرات نبی پر ایمان لا کر اس کے دائرہ تربیت میں داخل ہو جاتے ہیں وہ لوگ علم عمل کے اعتبار سے کامل بن جاتے ہیں نہ ان کے علم میں نقص ہوتا ہے اور نہ عمل میں۔

ششم: ان کی تعلیم اور عملی زندگی سے ہزاروں مصالح عامہ کی مقصدیت اور فوائد نمایاں ہوتے ہیں اور مصالح عامہ کو ہر میدان میں افراد اور اشخاص سے زیادہ اعتبار اور ترجیح ہوتی ہے۔

ہفتم: نبی کی معاشی زندگی عمارت اور فقر دونوں صورتوں میں یکساں ہوتی ہے نبی کی پوشاک، طعام، مسکن میں جو سادگی اور فقر کی حالت ہوتی ہے بادشاہت امارت حکومت حاصل ہونے پر بھی وہی حالت ہوتی ہے اور جو تواضع، انکساری، کسر نفسی بوقت فخر ہوتی ہے وہی سلطنت بادشاہت پر کردار و گفتار میں وہی عجز و انکساری، تواضع و نیاز مندی نمایاں ہوتی ہے۔ خواجہ عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور تمام انبیاء (علیہم السلام) کی تاریخ اس حقیقت کی گواہی دیتی ہے گویا انبیاء (علیہم السلام) کے اظہار کی یہ حالت ہوتی ہے کہ وہ مفاد عوام الناس پر ذاتی مفاد کو قربان کرتے ہیں اور غلبہ و سلطنت حاصل ہونے پر بھی ان کے عجز و نیاز اور شان عبدیت اور تواضع پر کسی قسم کا اثر نہیں پڑتا اور ان کے قلب و روح کی خداداد پاکیزگی کسی بھی ماحول سے متاثر نہیں ہوتی تاکہ یہ معلوم ہو کہ عام انسانوں سے ان کی فطرت مختلف ہے۔

ہشتم: نبوت کی آٹھویں خصوصیت یہ ہے کہ نبی کی زندگی میں بناوٹ، تکلیف، تصنع، علو ذات، نمائش نام و نمود اور شخصیت کا کوئی اثر اور وجود نہیں ہوتا اور اس نبی کا حب و بغض اپنی ذات کے لیے نہیں بلکہ ذات رب العالمین کے لیے ہوتا ہے وہ اپنا حق ہر ایک پر معاف کرتا ہے حق اللہ کو معاف نہیں کرتا (بخاری و مسلم)

نہم: نبی اطاعت الٰہی کا عملی نمونہ ہوتا ہے، خلوت، جلوت، گھر میں، گھر سے باہر، دوستوں اور دشمنوں میں، خوشی، غم، غصہ، الغرض کسی حالت میں بھی رضائے الٰہی کی راہ سے ذرہ برابر تجاوز نہیں کرتا مجلس احوال اور نفسانی کیفیات اس کی استقامت میں خلل انداز نہیں ہوتے، کیوں کہ رضاء الٰہی و اطاعت شرع اس کی فطرت کا جز ہوا کرتی ہے۔

دہم: دسویں خصوصیت یہ ہے کہ اس کے دعوی نبوت کی تائید میں خوارج اور معجزات کا ظہور ہوتا ہے۔

شرح مواقف میں معجزہ کے لیے ساتھ شرطیں لکھی گئی ہیں

1۔ اللہ تعالیٰ کا فعل ہو۔ 2۔ خارق عادت ہو۔ 3۔ اس کا معارضہ ناممکن ہو۔ 4۔ مدعی نبوت سے ظاہر ہو۔ 5۔ دعویٰ کے موافق ہو۔ 6۔ نبی کا مکذب نہ ہو۔ 7۔ دعویٰ پر مقدم نہ ہو۔ (علوم القرآن)

معجزہ:

معجزہ کی حقیقت اور اس کی مختصر تشریح کی خاطر سمجھنا چاہیے کہ دنیا میں جس قدر امور اشیار و نمایا موجود ہوتے ہیں ان کی کل تین قسمیں ہیں۔

1۔ عادیات۔ 2۔ عجائبات۔ 3۔ معجزات۔

عادیات:

عادیات سے مراد وہ امور ہیں جن کا تعلق ایسے اسباب مادیہ سے ہو دن کو عام و خاص سب لوگ جانتے ہیں اور روزمرہ زندگی میں ہر جگہ پیش آتے ہیں اور ادنیٰ یا زیادہ محنت سے موجود ہوتے ہیں جہاں علم و ہنر اور مہارت کی چنداں ضرورت نہیں ہوتی۔ مثلاً گندم کی کاشت ہوئی اور حفاظت کی گئی اور گندم وقت پر تیار ہو گئی۔ یا سبزی کاشت کی گئی تو وقت پر فصل تیار ہو گئی۔ آگ جلائی گئی اور روٹی سالن چائے تیار ہو گئے۔ کپڑے مشین میں ڈال دیئے تو صاف ہو گئے۔ قلم کی لکھائی، مکان کا رنگ کرنا، بکرا ذبح کر کے گوشت تیار کرنا وغیرہ ہزاروں اور جو عام و خاص لوگ جانتے اور تیار کرتے ہیں، ان میں کوئی عمل ایسا نہیں جو انسانی طاقت کے دائرہ سے باہر ہو وغیرہ۔

عجائبات:

وہ اشیاء جو مادی اسباب کے ذریعہ پیدا ہوں لیکن مخصوص ماہرین فن کے کدوکاوش اور محنت کا حصہ ہوں جنہیں ہر کس و ناکس تیار نہ کر سکتا ہو اور ان کی تیاری میں ایک خاص عملی و فنی مہارت درکار ہو۔ مثلاً مکان بنانا، موٹر سائیکل، ٹرین، گاریاں، مشینری، ہوائی جہاز، بحری جہاز، راکٹ، بندوق، کمپیوٹر، ٹیوی، ایٹم بم، میزائل یہ عادی اور عام اشیاء نہیں یہ مخصوص ایجادات اور عجائبات میں شمار ہیں لیکن شروع میں ان کا موجد ایک ہی شخص ہوتا ہے پھر آہستہ آہستہ اس کی نقل اتار کر دوسرے ملک اور علاقے والے بنانا شروع کرتے اور کامیاب ہو جاتے ہیں۔ غرض یہ کہ ہر ماہر فن کی

استطاعت اور قدرت پر موقوف ہے ان عادیات و عجائب میں قدر مشترک ایک چیز ہے کہ دونوں انسانی طاقت کے ماتحت ہیں ان میں ایسا اعجازی پہلو نہیں کہ کوئی دوسرا شخص اس کے تیار کرنے سے عاجز ہو اور بنانے پر قادر نہ ہو۔

معجزات:

وہ ہیں جن کا وجود مادی اسباب پر مبنی نہ ہو، خواہ عام اسباب ہوں جیسے امور عادیہ یا خاص اسباب ہوں جیسے امور عجائبات و مصنوعات، یہ معجزات ان دونوں سے بالاتر اور مختلف ہوں گے بلکہ ان کا وجود خالق کائنات کی مخفی قوت اور مشیت کا نتیجہ ہو، عام انسان ہزاروں علم و تجربہ اور ہر قسم کی مہارت و استعداد کے باوجود اس کی تخلیق و ایجاد سے سراسر عاجز و بے بس ہو، جس کو پیغمبر کے سوا کوئی شخص حاسل نہ کر سکتا ہو، مثلاً انسانی ایجاد ہوائی جہاز جو شب و روز اڑایا جا رہا ہے اور حضرت سلیمان (علیہ السلام) کا تخت بھی ہوا میں اڑتا تھا، کام ایک ہے لیکن یہ صناعت ہے اور وہ معجزہ تھا، کیونکہ ہوائی جہاز مشین، تیل، پرزے کے ساتھ اڑتا ہے، اسی طرح جہاز بنانا ہر انسان، ماہر فن، ہر ملک و دولت کیلئے بنانا، تیار کرنا اور اڑانا آسان اور روزمرہ کا معمول ہے مگر حضرت سلیمان علیہ السلا کا تخت مشین سے نہیں تیل اور دیگر اسباب سے نہیں بلکہ مشیت الٰہی کی تسخیر کردہ ہوا سے اڑتا تھا اور جتنے اسباب ظاہری ہیں ان سب سے مستغنی تھا جس کی نقل اتارنے پر نہ پہلے کوئی قادر تھا نہ اب، نہ آئندہ، کیونکہ مشیت الٰہی کی کارسازی دوسروں کیلئے ممکن نہیں ہے، تو یہ ہے فرق مصنوعات اور معجزات میں۔ اس سے نتیجتاً معلوم ہوا کہ دنیا میں دو قسم کی مصنوعات ہیں۔

1۔ مصنوعات الٰہی جیسے زمین، آسمان، پہاڑ، سمندر، چاند، سورج، ستارے وغیرہ۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ان خدائی مصنوعات کا نقل اتارنا اور بنانا انسانی قوت کے دائرے سے خارج ہے سارے انسان و جن مل کر اگر کسی خدائی مخلوق کو بنانا چاہیں تو ہرگز ایسا نہیں کر سکتے، ایک ادنی مکھی و مچھر بنانے پر پوری انسانیت کو قدرت حاصل نہیں۔

2۔ دوم انسانی مصنوعات، جیسے جہاز، کمپیوٹر، گاڑی، میزائل، وغیرہ ان کو ہر ماہر فن اور صاحب علم و ہنر بنا سکتا ہے اور روزمرہ مسلسل ایک دوسرے کی مصنوعات سے اپنے لیے بعینہ وہی چیز بنا رہے ہیں وغیرہ، مگر یہی لوگ خدائی مصنوعات کو نہ کسی کارخانے اور فیکٹری میں بنا سکتے ہیں نہ بازاروں میں فروخت کر سکتے ہیں اور یہی حال کتابی مصنوعات کا ہے، انسانی کتابوں کی نقل اور ان جیسی کتب کو ترتیب دینا تمام انسانوں کے دائرہ اختیار میں ہے، مگر

قرآن حکیم جو رب العزت کا کلام ہے اس کی نظیر و مثال پیش کرنا بلکہ قرآن کریم کی مختصر سورۃ الکوثر کی نظیر پیش کرنا پوری انسانیت کی طاقت و کارسازی سے باہر ہے:

(قل لئن اجتمعت الانس والجن علی ان یأتوا بمثل ھذا القرآن لایأتون بمثلہ ولو کان بعضھم لبعض ظھیرا)۔ (بنی اسرائیل)

اس آیت میں اقوام عالم کو خطاب کیا گیا (بلکہ پوری انسانیت اور جنات کو قیامت تک کیلئے چیلنج کیا گیا) جن کو اپنی ادبی، علمی قابلیت اور فصاحت و بلاغت پر ناز تھا اور جو قرآن کے شدید دشمن تھے، قرآن کے دعویٰ کو توڑنا ان کے لیے ہر چیز سے زیادہ اہم اور ضروری تھا اور یہ اعلان سرور کائنات (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی زبان مبارک سے کر دیا گیا کہ ساری عمر آپ نے نہ کوئی تعلیم پائی تھی اور نہ کوئی کتاب پڑھ سکتے تھے، نہ لکھ سکتے اور نہ جانتے تھے، خالص امی تھے، آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کبھی نہ شعر پڑھا اور نہ سیکھا اور نہ شعر و شاعری کی کوئی مشق کی نہ کسی شعر و ادب پر توجہ مبذول فرمائی، آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا نام مبارک کاغذ پر لکھا ہوا ہوتا تو اس کو شناخت کرنے پر بھی قدرت نہیں رکھتے تھے۔ دیکھیں اس چیلنج نے مخالفین اسلام و بدخواہاں رسالت کو قیامت تک ذلیل و شرمندہ اور عاجز و بے بس کر دیا، یہ ہے معجزہ بمعنی عاجز کرنے والا، طوق بشر سے خارج۔ اس کی مختصر تفصیل بیان کرنا ضروری معلوم ہوا۔

اگر نظر صحیح سے کام لیا جائے تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے معجزات بے حساب و شمار سے زیادہ ہیں کیونکہ آپ کا ہر قول، ہر فعل، ہر حال، باعتبار تضمن حکم مصالح اور اسرار، دعاء اور طلب یا اشارہ سارے خارق عادت ہیں، یہی تو نام ہے معجزہ کا۔ بلکہ یاد رکھنے بات یہ ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا سب سے بڑا معجزہ قرآن حکیم ہے، قرآن حکیم کلام اللہ ہے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا کلام نہیں اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ابتداءً امر میں طلب بھی نہیں تھی ابتدا انزول میں نہ طلب ہے نہ عمل بلکہ بعد میں فترۃ الوحی کے بعد طلب عمل کا حصہ بنی۔ فتدبر!

اور یہی حال آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے دوسرے بڑے معجزہ معراج کا ہے جس کو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اللہ سبحانہ سے نہیں مانگا اور نہ ہی آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے وہم خیال میں تھا بلکہ غیر ارادی طور پر اچانک بلاوا آگیا اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تشریف لے گئے، ہاں معجزہ شق القمر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ

وسلم) کی طلب کا حصہ ہے اگر سورج والی روایت صحیح ہو تو یہ بھی آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طلب تھی کھانے میں برکت وضو میں اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی انگلیوں سے پانی کا چشمہ جاری ہونا یہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا مطلوب تھا۔ وغیرہ۔ سورج کا غروب کے بعد دوبارہ طلوع ہونا اور حضرت علی (رض) کی نماز ادا کرنا اس پر بعض محدثین حضرات نے کلام کیا ہے مگر علامہ حافظ ابن حجر، قاضی عیاض، امام نووی، حضرت آلوسی، حافظ سیوطی، علامہ سبکی، علامہ قسطلانی، حضرت کشمیری، اور علامہ سخاوی رحمہم اللہ نے اس حدیث کی تصحیح کی ہے۔ دیکھو فتح الباری اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی بھی اجوبہ اربعین کتاب میں اسی طرح صحت حدیث کے قائل ہیں۔ تو علمائے کرام نے مختلف زاویوں سے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے معجزات کو شمار کیا ہے بقول قطب الشیخ عبد اللہ بہلوی (رح) آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے معجزات دس ہزار کے قریب ہیں یہ اس صورت میں کے تمام اسرار شریعت کا شمار معجزات میں ہو۔ حضرت الشیخ مولانا عاشق الٰہی سے ساڑھے 4 ہزار معجزات کا قول منقول ہے۔ رحمۃ للعلمین فی معجزات سید المرسلین کے مؤلف لبنانی عالم ہیں انہوں نے مختلف اقوال بیان کئے ہیں آخر میں 3000 کی تعداد کو صحیح بتایا ہے۔ حضرت حافظ سیوطی (رح) نے الخصائص الکبریٰ میں ایک ہزار معجزات بیان کئے ہیں۔ دراصل سیرت اور حدیث کی کتابوں سے اگر کوئی تمام معجزات کو نقل کر کے جمع کرے تو بآسانی 3000 کی تعداد پوری ہو سکتی ہے۔ بعض علماء کرام کے نزدیک معجزات کی تعداد 7700 ہے اس تعداد میں قرآن مجید کی آیات اور بلاغت و کا لحاظ مدنظر رکھا گیا ہے۔ اس سلسلے میں ایک وضاحت ضروری ہے وہ یہ ہے کہ تمام عالم دو قسم پر ہے:

تمام عالم دو قسم پر ہے

ا۔ عالم اعیان و جواہر۔ عالم معانی و اعراض

جواہر و اعراض کے معانی معلوم ہیں۔ پھر عالم اعیان یعنی جواہر دو قسم پر ہیں:

1۔ ذوی العقول۔ 2۔ غیر ذوی العقول۔

پھر ذوی العقول تین قسم پر ہیں، عالم ملائکہ، عام انسان، عالم جن۔ پھر عالم غیر ذوی العقول یا عالم علوی ہو گا، یا سفلی، پھر عالم سفلی دو قسم پر ہے۔ ایک بسائط دوم مرکبات، دراصل بسائط چار ہیں۔ آب، آتش، باد، خاک، عالم مرکبات تین ہیں: حیوانات، جمادات، نباتات، انہیں موالید ثلاثہ کہتے ہیں تو عالم کی تفصیلی اقسام نو ہوئیں جو کہ درج ذیل ہیں:

1۔ عالم معانی۔ 2۔ عالم ملائکہ۔ 3۔ عالم انسان۔ 4۔ عالم جنات۔ 5۔ عالم علوی افلاک کواکب۔ 6۔ بسائط اربعہ۔ 7۔ حیوانات۔ 8۔ جمادات۔ 9۔ نباتات۔

حضرت تھانوی صاحب فرماتے ہیں کہ مرکبات دو قسم پر ہیں:

1۔ وہ مرکبات کے جن میں ایسا مزاج ہو کہ مرکب کی ترکیب محفوظ ہو۔

2۔ مرکب کی ترکیب محفوظ نہ ہو یہ دوم کائنات "الجوّ" کے نام سے موسوم ہو گا جیسے بادل۔

ان تمام اقسام عشرہ میں حضور پر نور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے معجزات ظاہر ہوئے۔ پس آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے معجزات تمام عالم اور اقسام علم پر حاوی رہیں گے۔ یہی مطلب ہو گا۔ **وما ارسلناك الا رحمة للعلمين** (الانبیاء) آیت کریمہ کی وضاحت سے یہ سارے معجزات آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت صادقہ کی حقانیت و صداقت پر واضح و روشن دلائل ثابت ہوں گے۔ (**فصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبه المصطفی و رسوله المجتبی و علی آله و اصحابه و اتباعی الغر المحجلین الی یوم البعث والقضاء وسلم تسلیما کثیراً کثیرا مادامت الارض والسماء**)

1۔ عالم معانی معجزہ:

القرآن الحکیم والفرقان الحمید

2۔ عالم ملائکہ میں معجزہ:

میدان بدر میں نزول ملائکہ، اسی طرح احد و حنین کے معرکوں میں۔

3۔ عالم انسان میں معجزہ:

حضرت ابوہریرہ (رض) عنہٗ کی والدہ کا فوری اسلام قبول کرنا آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی دعا کے طفیل سے۔

حضرت قتادہ بن نعمان کی آنکھ غزوہ احد میں ضائع ہو گئی اس کو اپنے ہاتھ میں لے کر خدمت اقدس میں حاضر ہوئے

اپنے ان کے ہاتھ سے لے کر دوبارہ اسے اسکی جگہ پر رکھ دیا تو وہ صحیح ہو گئی اور آخر عمر تک اس کی روشنی میں کمی نہیں آئی۔

4۔ عالم جنات میں معجزہ:

جنات کا آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر سلام کرنا اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے حکموں پر اطاعت کا وعدہ کرنا۔

5۔ عالم آتش میں معجزہ:

حضرت جابر (رض) کی دعوت کے موقع پر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا حکم مان کر آگ نے ایجاد کی۔

6۔ عالم ہوا معجزہ:

غزوہ احزاب میں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا "نصرت بالصباء "ہوا نے دشمن کو بھگا دیا۔

7۔ عالم جوّ بادل میں معجزہ:

آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے استسقاء کے موقع پر فرمایا "اللھم حوالینا ولا علینا "ایسا ہی ہوا۔

8۔ عالم نباتات میں معجزہ:

میدان اور صحراء میں درختوں نے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس آکر سترہ بنایا وغیرہ، استن حنانہ نے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے فراق میں رونا شروع کیا اور خوب رویا۔

10۔ عالم حیوانات میں معجزہ:

اونٹ نے اور گوہ نے (ضب اعرابی نے) سلام کیا اور کلمہ پڑھا۔

11۔ عالم جمادات میں معجزہ مکرر ہے:

آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے پانی میں لعب مبارک ڈالا آج تک وہ چشمہ ٹھنڈا اور میٹھا موجود ہے۔

(نشر الطیب، الکلام المبین، سیرت حلبیہ)

اشارات سے یہ چند مختصر معجزات پر اکتفا کیا گیا اگر اللہ رب العزت میں توفیق عطا فرمائی تو ہزاروں معجزات کو تفصیل مع السند ایک مستقل رسالہ میں لکھنے اور جمع کرنے کی تمنا ہے۔ فللہ الحمد۔

داماں نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار
گل چین تو از تنگئی داماں گلہ دارد
نہ حسنش غایتے دارد نہ سعدی را سخن پایان
بمیرد تشنہ مستسقی و دریا ہمچنان باقی
روز و شب در وصف تو نازم مثل عاشقان
کے شوم سیر از بیان وصفت اے جان جہان

نبی کا معجزہ اور ولی کی کرامت دونوں بر حق ہیں اور دونوں غیر اختیاری ہیں کسب و اکتساب اور تعلیم و تعلم کو اس میں دخل نہیں دونوں کا سبب محض ارادہ الٰہی جل شانہٗ ہے۔ آئندہ ان شاء اللہ سورۃ البقرہ کی آیت **واتبعوا ما تتلوا الشیاطین علی ملك سلیمن** کے تحت معجزہ، کرامت، سحر وغیرہ کی تفصیل کے ساتھ بیان ہو گا۔

رب العلمین کی تشریعی ربوبیت جو کہ روحانی ربوبیت کا نام ہے

رب العلمین کی تشریعی ربوبیت جو کہ روحانی ربوبیت کا نام ہے یہ ربوبیت تمام ربوبیتوں کی سرخیل اور سردار ہے یہ اس لیے کہ تخلیق کائنات کے اغراض و مقاصد اسی ربوبیت پر موقوف ہیں۔ **خلیفۃ اللہ فی الارض** والی پاکیزہ جماعت انبیاء (علیہم السلام) ہے کی ہے۔ اگر سارا جہاں عناصر اربعہ کا مرکب ہے تو انبیاء (علیہم السلام) کی حیثیت ہیرے جواہرات کے ہیں ان ہی کے طفیل نابینا آنکھوں کو بینائی حاصل ہوتی ہے اگر مادی سورج نے فضاؤں کو روشنی مہیا کی ہوئی ہے تو اس پاکیزہ جماعت نے پورے جہاں اور اس کی ظلمتوں کو مٹا کر انسانی قلوب و اعضاء تک اپنا نور پھیلایا ہے۔ سورج کا غروب ہو کر ختم ہوتا ہے سادات انبیاء کے نور کے لیے کوئی غروب نہیں۔ ایک محقق محدث نے فرمایا کہ سید کائنات (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا سایہ نہیں ہوتا تھا مگر سارے جہان پر سایہ فگن رہے اور گم گشتہ انسانیت کو معراج و عروج عطا کیا جس کی مثال نہ ہو۔

الرسول۔ پیغمبر بھیجا ہوا:

رسول رسالۃ سے ہے شیخ علامہ شمس الدین قہستانی فرماتے ہیں۔ فعول کا وزن مبالغہ۔ مرسل، مفعل بالفتح کا اور فعول کا استعمال اس طرح پر نادر ہی ہوتا ہے۔ رسول اور نبی کے مابین کیا نسبت ہے اس بارے میں تین مختلف رائیں ہیں جو یہ ہیں:

1۔ یہ دونوں متساوی ہیں، یعنی ہر نبی رسو ہے اور ہر رسول نبی ہے، علامہ تفتازانی نے "شرح عقائد نسفی اور شرح مقاصد" میں اسی کو اختیار کیا ہے اور امام ابن ہمام نے "المسائرہ" میں اس کو محققین کی طرف منسوب کیا ہے۔ فرماتے ہیں "**وما علی ما زکرہ المحققون من ان النبی انسان بعثه الله تعالیٰ لتبلیغ ما اوحی الیه و کذا الرسول فلا فرق**" لیکن محققین نے ذکر کیا ہے کہ نبی وہ انسان ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اس لیے مبعوث فرمایا ہو کہ جو کچھ اس کی طرف وحی کی ہے اس کی تبلیغ کرے اور اسی طرح رسول بھی ہے اس بنا پر کوئی فرق نہیں لیکن آیت کریمہ وما ارسلنا من قبلک من رسول ولا نبی (الحج) اور نہیں بھیجا ہم نے تجھ سے پہلے کوئی رسول اور نہ نبی۔ اصول کی تردید کر رہے ہیں کیونکہ عطف مغایرت رکھپر دلالت کرتا ہے اور احد المتساوبین کی نفی متساوی آخر کی نفی کو مستلزم ہے۔ پس اگر ان کے مابین تساوی مانی جائے تو ولا نبی کہنے کی ضرورت نہیں رہتی کیونکہ نبی تو رسول ہی کے ذکر میں آگیا، اب الگ ذکر کرنے کی کیا حاجت۔

2۔ یہ دونوں متباینین ہیں، رسول وہ ہے جو جدید شرع لے کر آئے اور نبی وہ ہے جو جدید شرع لے کر نہ آئے پس کوئی رسول نبی نہیں اور کوئی نبی رسول نہیں۔ لیکن یہ محض غلط ہے کیونکہ حضرت اسماعیل (علیہ السلام) کے متعلق قرآن مجید میں صاف تصریح ہے (وکان رسولا نبیا) (المریم) یعنی وہ رسول اور نبی تھے اور اسی طرح حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے حق میں وارد ہوا ہے۔

3۔ ان دونوں کے مابین نسبت عموم وخصوص مطلق ہے، اکثر علماء کرام کی یہی رائے ہے، اب بعض تو اس طرف گئے ہیں کہ رسول اعم اور نبی اخص ہے کیونکہ رسول فرشتہ بھی ہوتا ہے اور انسان بھی، ارشاد ہے:

(**الله یصطفی من الملائکة رسلا ومن الناس**)۔ (الحج)

اللہ تعالیٰ چھانٹ لیتا ہے فرشتوں میں پیغام پہنچانے والے اور آدمیوں میں، اور نبی صرف انسان ہی ہوتا ہے فرشتہ نہیں، پس ہر رسول نبی ہے لیکن ہر نبی رسول نہیں مگر اس صورت میں نبی اور رسول میں فرق کیا ہو گا اور ان دونوں کی شرعی تعریف کیا ہو گی؟ اس سلسلے میں سخت اختلافی اقوال ہے جو درج ذیل ہیں۔

حضرت شاہ عبد القادر رحمۃُ اللہ علیہ نے جمہور کی ترجمانی ان الفاظ میں کی ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ سے وحی آئی وہ نبی ہے اور ان میں جو خاص ہیں اور امت رکھتے ہیں یا کتاب وہ رسول ہیں (موضح القرآن) علامہ بیضاوی (رح) لکھتے ہیں کہ رسول وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے شریعت جدیدہ دے کر مبعوث فرمایا ہو تاکہ وہ لوگوں کو اس کی طرف دعوت دے اور نبی اس کو بھی عام ہے اور اس کو بھی کہ جس کو شرع سابق کے برقرار رکھنے کیلئے بھیجا ہو جیسے وہ انبیاء بنی اسرائیل جو حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ (علیہم السلام) کے مابین ہوئے ہیں۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنی امت کے علماء کو اسی بناء پر ان انبیاء سے تشبیہ دی ہے، پس نبی رسول سے اعم ہے اور اس پر ی چیز بھی دلالت کرتی ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے انبیاء کے متعلق سوال ہوا تو آپ نے ارشاد فرمایا: کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار، عرض کیا گیا کہ ان میں رسول کتنے ہیں؟ فرمایا: تین سو تیرہ کا جم غفیر اور بعض کا قول ہے کہ رسول وہ ہے کہ معجزہ اور کتاب جو اس پر نازل کی گئی ہو دونوں کا جامع ہو اور جو نبی ہو رسول نہ ہو وہ ہے کہ جس کے پاس کتاب نہ ہو۔ اور بعض کہتے ہیں کہ رسول وہ ہے کہ جس کے پاس فرشتہ وحی لے کر آئے اور نبی اس کو بھی کہا جاتا ہے اور نیز اس کو بھی جس کی طرف خواب میں وحی کی جائے۔ محدث ملا علی قاری "**المھج الازھر شرح الفقہ الاکبر** "میں فرماتے ہیں کہ زیادہ تر مشہور فرق جو ان دونوں میں منقول ہے وہ یہ ہے کہ نبی رسول سے اعم ہے کیونکہ رسول وہ ہے جو تبلیغ پر مامور ہو اور نبی وہ ہے جس کی طرف وحی کی جائے خواہ وہ تبلیغ پر مامور ہو یا نہ ہو۔ شیخ ابن ہمام نے "المسائرہ" میں اس فرق کو بعض اہل ظواہر واصحاب حدیث کی طرف منسوب کیا ہے، شیخ اکبر محی الدین ابن عربی بھی "فتوحات مکیہ "میں اسی کے قائل ہیں۔ اور علامہ جلال الدین دوانی (مناطقہ سے ہے) نے اسی کو اختیار کیا ہے۔

شیخ ابن تیمیہ نے "کتاب النبوات "میں اس سلسلے میں ایک نفیس بحث سپرد قلم فرمائی ہے، فرماتے ہیں نبی وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ بتلاتا ہے اور جو کچھ اللہ تعالیٰ بتلاتا ہے وہ اس کو بتاتا ہے اب اگر اسی کے ساتھ وہ اس شخص کی طرف بھیجا گیا ہے کہ جو حکم الٰہی کا مخالف ہے تاکہ اس کو اللہ تعالیٰ کے پیغام کی تبلیغ کرے تو وہ رسول ہے لیکن جس صورت میں کہ

وہ پہلے ہی شریعت پر عامل ہے اور کسی کی طرف اس کو بھیجا نہیں گیا کہ جسے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیغام پہنچائے تو وہ نبی ہو گا رسول نہیں۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: **وما ارسلنا من قبلك من رسول ولا نبی الا اذا تمنی القی الشیطن فی امنیته** (النور) اور ہم نے جو رسول بھیجا تجھ سے پہلے یا نبی سو جب لگا خیال باندھنے شیطان نے ملا دیا اس کے خیال میں، ارسال کا ذکر فرما کر (جو ہر دو نوع کو عام ہے) ان میں سے ایک کو بایں طور خاص کیا ہے کہ وہ رسول ہے اور یہی وہ رسول مطلق ہے جو اللہ تعالیٰ کے مخالفوں کی طرف تبلیغ رسالت پر مامور ہے جیسے حضرت نوح (علیہ السلام)۔ صحیح حدیث میں ثابت ہے کہ وہ پہلے رسول ہیں جو اہل زمین کی طرف مبعوث ہوئے اور ان سے پہلے جو تھے وہ انبیاء تھے جیسے حضرت شیث اور حضرت ادریس (علیہم السلام) اور ان دونوں سے بھی پہلے حضرت آدم (علیہ السلام) جو نبی مکلم تھے یعنی ان سے حق تعالیٰ نے کلام فرمایا تھا۔

حضرت ابن عباس (رض) کا بیان ہے کہ حضرت آدم اور حضرت نوح (علیہم السلام) کے مابین دس قرن گزرے ہیں جو سب کے سب اسلام پر تھے، ان انبیاء پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی آتی تھی جس پر یہ خود بھی عمل پیرا ہوتے تھے اور ان مومنوں کو بھی حکم فرماتے تھے جو ان کے پاس تھے کیونکہ وہ سب ان پر ایمان رکھتے تھے۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح کہ ایک شریعت والے ان تمام باتوں کو مانتے ہیں کہ جن کے علماء رسول کی طرف سے تبلیغ کرتے ہیں اور یہی حال انبیاء بنی اسرائیل کا ہے کہ وہ شریعت تورات کے مطابق حکم کرتے تھے اگرچہ ان میں سے کسی کی طرف ایک معین واقعہ میں خاص وحی بھی کی جاتی تھی تاہم شریعت تورات میں ان کی مثال اسی عالم کی سی ہے جس کو اللہ تعالیٰ کسی قضیہ میں ایسے معنی سمجھا دے جو مطابق قرآن ہو جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان (علیہ السلام) کو اس قضیے کا حکم سمجھایا کہ جس میں انہوں نے اور حضرت داؤد (علیہ السلام) نے فیصلہ کیا تھا۔ پس انبیاء کو تو اللہ تعالیٰ بتلاتا اور اپنے امر و نہی اور خبر سے ان کو مطلع فرماتا ہے اور وہ ان لوگوں کو کہ جو ان پر ایمان لاتے ہیں۔ اللہ عزوجل نے جو کچھ خبر دی ہے اور امر و نہی سے مطلع فرمایا ہے وہ بتلاتے ہیں۔ پھر اگر کفار کی طرف بھی رسول ہوئے تو ان کو توحید الٰہی اور اس وحدہ لاشریک لہ کی عبادت کی دعوت دیتے ہیں۔ نیز یہ ضروری ہے کہ رسولوں کی ایک قوم تکذیب کرے۔

اللہ تعالیٰ عزوجل فرماتے ہیں ”کذلك ما اتی الذین من قبلھم من رسول الا قالوا ساحر او مجنون“ (الذاریات) اسی طرح ان سے پہلے لوگوں کے پاس جو رسول آیا تو یہی کہا گیا کہ جادوگر ہے یا دیوانہ اور ارشاد ہے: مایقال لك الا ما قد قیل للرسل من قبلك۔ (حم سجدہ) تجھ سے وہی کہیں گے جو کہہ دیا ہے سب رسولوں سے تجھ سے پہلے۔ وجہ یہ ہے کہ رسول مخالفوں ہی کی طرف بھیجے جاتے ہیں اس لیے مخالفوں کی ایک جماعت ان کو جھٹلاتی ہے۔ ارشاد ہے: وما ارسلنا من قبلك الا رجالا نوحی الیھم من اھل القری افلم یسیروا فی الارض فینظروا کیف کان عاقبۃ الذین من قبلھم ولدار الآخرۃ خیر للذین اتقوا افلا تعقلون حتی اذا استیأس الرسل وظنوا انھم قد کذبو جاءھم نصرنا فنجی من نشاء ولا یرد باسنا عن القوم المجرمین۔ (یوسف) اور فرمایا: (انا لننصر رسلنا والذین آمنو فی الحیوۃ الدنیا ویوم یقول الاشھاد (المومن) ارشاد ربانی ہے: وما ارسلنا من قبلك من رسول ولا نبی۔ اس امر کی دلیل ہے کہ نبی بھی مرسل ہی ہوتا ہے لیکن اطلاق کے وقت وہ رسول سے موسوم نہیں ہوگا۔ کیونکہ وہ کسی قوم کی طرف ایسی باتیں لے کر نہیں بھیجا گیا کہ جن سے وہ واقف نہ ہوں بلکہ اہل ایمان کو ان باتوں کا حکم دیتا کہ جن کے حق ہونے کو وہ جانتے ہیں (جو نوعیت کہ ایک عالم کی ہوتی ہے) آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اسی لیے ارشاد فرمایا ہے العلماء ورثۃ الانبیاء۔ (الحدیث) نیز رسول کی شرط یہ بھی نہیں ہے کہ وہ نئ شریعت ہی لے کر آئے کیونکہ حضرت یوسف (علیہ السلام) باوجود رسول ہونے کے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی ملت پر تھے، نیز حضرت داؤد، حضرت سلیمان (علیہم السلام) دونوں رسول اور شریعت تورات پر تھے۔ حق تعالیٰ مومن آل فرعون کی زبانی فرماتے ہیں۔ ولقد جاء کم یوسف من قبل بالبینات فما زلتم فی شك مما جاء کم بہ حتی اذا ھلك قلتم لن یبعث اللہ من بعدہ رسولا۔ (المومن) انا اوحینا الیك کما اوحینا الی نوح والنبیین من بعدہ۔ (النساء) اور ارسال اسم عام ہے ارسال ملائکہ، ارسال ریاح، ارسال شیاطین، ارسال نار، سب پر مشتمل ہے۔ ارشاد ربانی ہے: یرسل علکما شواظ من نار و نحاس (اور ارشاد ہے:

الحمد للہ فاطر السموات والارض جاعل الملئکۃ رسلاً اولی اجنحۃ (الفاطر)

یہاں سب فرشتوں کو رسول کہا گیا ہے اور ملک لغت میں اس کو کہتے ہیں جو الوکۃ یعنی رسالت کا حامل ہو۔ اللہ یصطفی من الملائکۃ رسلاً و من الناس۔ اسی طرح۔ وما کان لبشر ان یکلمہ اللہ الا وحیا او من وراء حجاب او یرسل رسولا فیوحی باذنہ (الشوری) اور فرمایا: ھو الذی یرسل الریاح بشرا بین یدی رحمتہ۔ (الروم) اور ارشاد فرمایا: انا ارسلنا الشیاطین علی الکفرین تؤزھم ازا۔ (المریم)

لیکن لفظ رسول جب کہ اللہ تعالیٰ کی طرف مضاف ہو اور رسول اللہ کہا جائے تو اس سے وہی سمجھا جائے گا جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیغام لے کر آئے خواہ فرشتہ ہو خواہ بشر ہو، چنانچہ ارشاد ہے: اللہ یصطفی من الملائکۃ رسلا و من الناس (الحج) اور فرشتے کہتے ہیں یالوط انا رسل ربك لن یصلوا الیك (ھود) اور عام ہواؤں، اور فرشتوں اور جنوں کا ارسال کسی فعل کی انجام دہی کیلئے ہوتا ہے تبلیغ رسالت کیلئے نہیں۔ اللہ پاک کا ارشاد ہے۔

اذکروا نعمۃ اللہ علیکم اذ جاء تکم جنود فارسلنا علیھم ریحا وجنودا لم تروھا۔ (الاحزاب)

پس اللہ تعالیٰ کے جو رسول اور پیغمبر جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے امر و نہی کی تبلیغ کرتے ہیں عند الاطلاق یہی اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ (کتاب النبوات)

غرض امام موصوف کے نزدیک جس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی آئے اور مومنین ہی کو وہ احکام الٰہی کی تعلیم دے وہ نبی ہے اور جو اس کی دعوت کافروں کے لیے بھی عام ہو تو وہ رسول ہے اسی کے ساتھ یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ نبی کو صرف تعلیم و تبلیغ کے فرائض سونپے جاتے ہیں انہیں جہاد بالسیف کا حکم حاصل نہیں بخلاف رسول کے کہ انہیں تعلیم و تبلیغ کے ساتھ منکرین کے ساتھ جہاد بالسیف کا فریضہ بھی انجام دینا ہوتا ہے۔

الانبیاء

یہ نبی کی جمع ہے جس کے معنی پیغامبر کے ہیں، قرآن حکیم میں جن انبیاء کرام کے اسماء گرامی بیان کیے گئے ہیں وہ کل پچیس ہیں اور جس ترتیب کے ساتھ وہ دنیا میں تشریف لائے ہیں یہاں اسی ترتیب کے ساتھ ان کے مقدس اسماء تحریر کیے جاتے ہیں تاکہ تقدیم و تاخیر کا اشتباہ نہ رہے وہ یہ ہیں۔

حضرت آدم، حضرت ادریس، حضرت نوح، حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت ابراہیم الخلیل، حضرت لوط، حضرت اسماعیل، حضرت اسحق، حضرت یعقوب، حضرت یوسف، حضرت شعیب، حضرت موسیٰ، حضرت ہارون، حضرت یونس، حضرت ذوالکفل، حضرت داؤد، حضرت سلیمان، حضرت ایوب، حضرت الیاس، حضرت الیسع، حضرت زکریا، حضرت یحییٰ، حضرت عیسیٰ علیہم الصلوۃ والتسلیمات اور حضرت امام الانبیاء خاتم المرسلین، سید الاولین والآخرین، رحمۃ للعلمین، محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وجمیع امتہ وسلم وشرف وکرم۔

البتہ !جن انبیاء کرام (علیہم السلام) کا قرآن مجید میں ذکر نہیں ان کے بارے میں اختلاف ہے کہ ان کی ان کی تعداد کتنی ہے، حضرت ابوذر (رض) کی طویل حدیث (مشکوۃ المصابیح ص 511) اس سلسلے میں مشہور ہے۔ چنانچہ امام ابن مردویہ اپنی تفسیر میں اور امام احمد بن حنبل (رح) اپنی مسند میں ان سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے سردار دوجہاں (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے عرض کیا: یارسول اللہ !انبیاء (علیہم السلام) کی تعداد کتنی ہے ؟ فرمایا ایک لاکھ چوبیس ہزار۔ میں نے سوال کیا یارسول اللہ ان میں سے رسول کتنے تھے ؟ فرمایا: تین سو تیرہ، کا جم غفیر، میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ان میں پہلے رسول کون ہے ؟ فرمایا آدم (علیہ السلام)، میں نے دریافت کیا کہ وہ نبی مرسل تھے ؟ فرمایا: ہاں !اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے ہاتھ سے پیدا فرمایا، پھر ان میں روح پھونکی اور اپنے سامنے ان کو درست کیا پھر فرمانے لگے اے ابوذر چار انبیاء سریانی ہیں، حضرت آدم، حضرت شیث، حضرت نوح اور اخنوخ یعنی حضرت ادریس (علیہم السلام) اور انہوں نے سب سے پہلے قلم سے لکھا ہے اور چار عرب سے ہیں حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت شعیب (علیہم السلام) اور تمہارے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)۔ اے ابوذر بنی اسرائیل کے پہلے نبی حضرت موسیٰ اور آخری نبی حضرت عیسیٰ (علیہم السلام) ہیں۔ اول نبی حضرت آدم (علیہم السلام) ہے اور آخری تمہارے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہے (مشکوۃ میں جو روایت ہے وہ مختصر ہے) اس پوری حدیث کو حافظ ابوحاتم بن حبان بستی نے بھی اپنی مشہور کتاب "التقاسیم والانواع "میں روایت کی ہے جس کو وہ صحیح کے نام سے موسوم کرتے ہیں، لیکن حافظ ابوالفرج ابن الجوزی نے ان کی مخالفت کی ہے اور اپنی کتاب "الموضوعات "میں اس کا ذکر کیا ہے اور وہ اسی سلسلے میں اس حدیث کے ایک راوی ہشام بن حسان کو متہم گردانتے ہیں۔

حافظ ابن کثیر (رح) ابن جوزی کی رائے نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں " **ولا شك انه قد تكلم فيه غير واحد من ائمة الجرح والتعديل من اجل هذا الحديث** " (ابن کثیر ج 3 ص 248) اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کے متعلق بہت سے ائمہ جرح و تعدیل نے اسی حدیث کی بنا پر کلام کیا ہے اور یہ بھی واضح رہے کہ اس روایت میں حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو بنی اسرائیل کا پہلا نبی بتایا گیا ہے حالانکہ یہ صفت حضرت یوسف (علیہ السلام) میں پائی جاتی ہے۔ اس چیز سے بھی حافظ ابن جوزی کے خیال کی تائید ہوتی ہے، ابن ابی حاتم نے حضرت ابی امامۃ سے بھی مرفوعاً یہی تعداد نقل کی ہے لیکن یہ روایت بھی سخت ضعیف ہے اور مسند احمد میں حضرت ابو امامۃ (رض) کے توسط سے خود ابی ذر (رض) کی بھی مذکورہ بالا روایت منقول ہے لیکن اس کی سند بعینہ وہی ہے جو ابن ابی حاتم کی ہے۔

حافظ ابو بکر اسماعیلی نے اپنی صحیح میں حضرت انس (رض) سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "میری بعثت آٹھ ہزار انبیاء کرام کے بعد عمل میں آئی ہے جن میں سے چار ہزار انبیاء بنی اسرائیل میں گزرے ہیں " (عمدۃ القاری ج 7 ص 307) لیکن اس روایت کے ایک راوی احمد بن طارق کے متعلق حافظ ابن کثیر کا بیان ہے کہ مجھے اس کی عدالت یا جرح کا علم نہیں۔ (ابن کثیر ج 3 ص 249)

امام احمد بن حنبل (رض) نے حضرت ابو سعید خدری (رض) سے اور حافظ ابو بکر بزار نے حضرت جابر (رض) سے روایت کی ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "میں ایک ہزار یا اس سے زیادہ انبیاء کرام کا خاتم ہوں"۔ (ابن کثیر حوالہ بالا) ان دونوں روایتوں کی سندیں صحیح ہیں اس لحاظ سے تعداد انبیاء کرام کے متعلق یہی قول زیادہ قوی معلوم ہوتا ہے۔ (لغات القرآن)

الرسالۃ

رسالت کی شرعی تعریف علامہ تفتازانی نے شرح عقائد نسفی میں بیان کی ہے "**هی سفارة العبد بين الله وبين ذوى الالباب من خليقته ليزيح بها عللهم فيما قصرت عنه عقولهم من مصالح الدنيا والآخرة**" اللہ رب العزت سبحانہ اور اسکی ہوشمند مخلوق کے مابین بندہ کی سفارت ہے تا کہ اس کے ذریعہ ان بیماریوں کو زائل کر دیا جائے جن میں ان کی عقول دنیا و آخرت کی مصلحتوں سے عاجز ہو چکی ہیں۔

سوال: وہی جو کہ انبیاء (علیہم السلام) کے ساتھ مخصوص ہے اس کی ضرورت کب اور کیوں پیش آئی؟

جواب: جب خالق کا مخلوق سے اور مخلوق کا آپس میں ایک دوسرے سے رابطہ منقطع ہوا اور ہر قسم کی مادی اور روحانی محرومیوں کا دور دورہ ہو، فضا ہر طرف سے زہر آلود اور مکدر ہو افق پر ہر قسم کا ظلم و طغیانی نمودار ہو اور آہستہ آہستہ پھیل کر پورے معاشرے کو برباد کر رہا ہو انسانی محبت شرافت اور دوسرے اقدار ناانصافیوں کے سیلاب میں بہہ کر غرقاب ہو رہے ہوں اور ہر طرف حقوق اللہ و حقوق العباد غارت ہوں انسانی آبادی گھٹاٹوپ اندھیرے اور تاریکیوں میں ڈوب کر موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہو پوری انسانیت مایوس کن حالات سے دوچار ہو پورا عالم نجات دہندہ حقیقی کی آمد کا بیتابی کے ساتھ منتظر ہو ایسے وقت میں اچانک ایک روشنی کی کرن دنیا میں ظاہر ہوتی ہے اور آسمان سے ایک نجات دہندہ عدل و انصاف کا پیغام الٰہی کسی عظیم ہستی کی معرفت چمکتے ہوئے سورج کی مانند ظاہر ہو گا جس سے غم کے اندوناک لمحات ختم ہوں گے اور محرومیوں کا خاتمہ ہو گا۔ پریشانیوں کے سیاہ بادل افق سے چھٹ جائیں گے انسانی اقدار کی بعد از موت دوبارہ زندگی ممکن ہو گی اسی روشن کرن کا نام پیغام الٰہی ہے جو کہ انبیاء و مرسلین (علیہم السلام) کے ساتھ مخصوص ہے یہی وحی انسانیت و شرافت کی نجات دہندہ ہے اور خوشحالیوں کا سرچشمہ و بنیاد ہے دینی اقدار کی محافظ اور نگہبان ہے پورے معاشرے کے لیے نعمت غیر مترقبہ اور رحمت الٰہی ہے مردہ دلوں اور تاریک قلوب کے لیے نور مجسم ہے سارے غموں اور بیماریوں کا علاج تریاق ہے جہاں تک اس کی رسائی اور پھیلاؤ ہو تو نور ہی نور ہدایت ہی ہدایت کا دور دورہ ہو گا مردہ معاشرہ دوبارہ زندہ ہو گا۔

وحی کا لغوی معنی

الاشارۃ السریعۃ یا الاعلام فی خفاء۔ یعنی کسی کو پوشیدہ طور پر جلدی میں کچھ بتانا وغیرہ۔

وحی کے اقسام

وحی لغوی کی تین قسمیں ہیں: 1۔ فطری۔ 2۔ ایجادی۔ 3۔ عرفانی۔ جس کو الہام بھی کہتے ہیں۔

وحی فطری:

جس کو سورۃ اعلیٰ میں چوتھے نمبر پر "فھدی" سے تعبیر کیا گیا ہے یہ انسانوں اور حیوانات سب میں موجود ہے بکری کا بچہ پیدا ہوتے ہیں ماں کے پستانوں سے دودھ پینا چوسنا شروع کرتا ہے اور شہد کی مکھی چھتہ بنا کر شہد پیدا کرتی ہے۔

وحی ایجادی:

انسان ہزاروں مصنوعات اور ایجادات کا مالک ہے عقل و تجربہ کی مدد سے ہزاروں چیزوں کی ایجاد کو عمل میں لایا اور یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہتا ہے یہ تمام مصنوعات وحی ایجادی کہلاتے ہیں۔

وہی عرفانی والہامی:

اصحاب باطن پرہیز گار مومنوں کو حاصل ہے۔ جیسے: **واوحینا الی ام موسیٰ**۔ (الایۃ)

وحی شرعی جو کہ اصل وحی ہے وہ انبیاء (علیہم السلام) کے ساتھ مخصوص ہے یعنی **کلام اللہ المنزل علی الانبیاء**۔ اس کی مختلف قسمیں ہیں جو کہ درج ذیل ہیں:

1۔ خواب میں وحی کا آنا جیسے: **یابنی انی اری فی المنام انی اذبحك** (الصافات) سرور عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نبوت سے پہلے مسلسل چھ ماہ تک رویاء صالحہ صادقہ سے نوازے گئے تھے۔

2۔ بیداری میں بغیر واسطہ فرشتہ جیسے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو شب معراج میں اور موسیٰ (علیہ السلام) کو کوہ طور پر بلاواسطہ نوازا گیا۔

3۔ **وحی بواسطہ ملك مثل صلصلۃ الجرس** (رواہ الشیخان) اس میں فرشتہ نظر نہیں آتا وہی کی آواز گھنٹی کی طرح سنائی دیتی ہے اور یہ سخت وحی ہوتی ہے وھوا شدہ علی۔

4۔ فرشتہ جبرائیل بشکل انسان آکر وحی لاتا ہے یہ صورت سب سے آسان ترین صورت ہے۔

5۔ خواب میں اور نصف بیداری میں۔ جیسے: "**اتانی ربی فقال فیم یختصم الملأ الاعلی**۔ (مشکوۃ) اس میں نزول رب العالمین بدون واسطہ ہے (یہ حدیث حضرت معاذ بن جبل سے مروی ہے بحوالہ ترمذی)۔

6۔ بواسطہ ملک ہو اور خواب کے اندر ہو۔ فرمایا: "**ان جبریل نفث فی روعی**" (الحدیث) یہ روعی ہے کے نام سے مشہور ہے۔ (مشکوۃ)

قرآن حکیم کے تیس پارے ایک سو چودہ سورتیں ہیں، جملہ آیات (6236) اور جمیع حروف قرآنیہ (346998) اور جمیع کلمات یعنی الفاظ قرآنی (77934) ہیں۔ قرآن حکیم کا نزول تدریجاً آہستہ آہستہ (23) برس میں مکمل ہوا۔ مکی سورتیں (86) اور مدنی سورتوں کی تعداد (28) ہے یہ مکمل مجموعہ طیبہ وحی جلی کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے علاوہ وحی خفی جو کہ احادیث کے نام سے مشہور ہے حدیث کا بہت بڑا ذخیرہ ہے اس وقت حدیثوں کا جو ذخیرہ امت کے پاس ہے یہ ان مجموعی حدیثوں کا ایک حصہ ہے بہت بڑا ذخیرہ جو جمع و تدوین میں نہیں آیا وہ اس کے علاوہ ہے۔ اکثر و بیشتر صحابہ کرام نے روایت حدیث سے اجتناب کرتے ہوئے اپنے مسندات مرویات کو بیان (روایت) نہیں کیا اس خوف سے کہ کہیں غلطی نہ ہو اور گناہ لازم نہ ہو۔ تو یہ دونوں سلسلے وحی جلی اور وحیٔ خفی برابر (23) سال تک جاری رہے۔ اس بناء پر علماء کرام نے کہا ہے کہ جبرئیل امین (علیہ السلام) بغرض وحی آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس مجموعی طور پر چوبیس ہزار مرتبہ تشریف لائے اور اسی مقدار میں وحی کا نزول ہوا جو کہ ایک اہم خصوصیت ہے۔ (قسطلانی)

رب العالمین سبحانہ وتعالیٰ نے اپنی ربوبیت کاملہ کے سایہ میں دین محمدی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی حفاظت کی ذمہ داری اور ضمانت اپنے ذمہ لے لیا

رب العالمین سبحانہ وتعالیٰ نے اپنی ربوبیت کاملہ کے سایہ میں دین محمدی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی حفاظت کی ذمہ داری اور ضمانت اپنے ذمہ لے لیا۔ انا نحن نزلنا الذکر و انا له لحافظون۔ (الحجر) قران حکیم کی حفاظت دین اسلام کی حفاظت کی بنیاد ہے کیونکہ بقا قرآن در حقیقت بقا اسلام ہی ہے اور دونوں لازم و ملزوم ہیں۔

اس وقت دنیا کی آبادی تقریباً ساڑھے چھ ارب انسانوں پر مشتمل ہے۔ مسلم آبادی ان میں تقریباً ڈیڑھ ارب سے ذرا کم ہے اس تناسب سے مسلمان آبادی غیر مسلم آبادی سے تقریباً 5 حصہ کم ہے یہ پانچ ارب غیر مسلم آبادی عیسائی یہودی بدھ مت ہندو مت کمیونسٹ دہریہ، سکھ مت اور دیگر مذاہب و اقوام پر مشتمل ہے اور یہ سارے ملت واحدہ کہلاتے ہیں اور مذہبی سطح پر آپس میں متحد اور ایک ہیں اور ایک دوسرے کے حلیف ہیں ان کے آپس میں مذہبی

یکجہتی اور رواداری ہر وقت موجود ہے گو سیاسی اور جغرافیائی فوجی اور معاشرتی و معاشی سطح پر کبھی کبھار ایک دوسرے کی بدخواہی اور تناؤ کھینچتے ہیں مگر مذہبی اختلاف ظاہراً ان میں نہیں ہوتا یا ہو گا مگر نہ ہونے کے برابر ہے۔ لیکن اسلام کے ساتھ ان کی کھینچا تانی روز اول سے آج تک برابر جاری ہے انہوں نے اسلام کے ساتھ ہمیشہ معاندانہ اور حریفانہ سلوک جاری رکھے ہوئے ہیں اور اسلام کے ساتھ ان کی سرد جنگ ہمیشہ سے جاری ہے اسلام اور اسلامی تعلیمات اور اسلامی معاشرہ انہیں کھٹکتا ہے نفاق بغض اور عداوت اور دوسرے ہر قسم کے ذرائع سے اسلام کو کمزور کرنے کی کوششوں میں مصروف رہتے ہیں گزشتہ ادوار میں صلیبی جنگوں اور معرکوں کے ذریعے انہوں نے مسلمانوں کی نسل کشی سے کبھی انحراف نہیں کیا۔ بار بار سقوط بغداد، سقوط کابل سمرقند و بخارا تاشقند و خوارزم فلسطین و کشمیر اور سقط اندلس ان کی اسلام دشمنی کے واضح ثبوت ہیں جب ان دشمنان اسلام نے ابھی جزائر بلقان کوسوو اور سربیا وغیرہ پر حملہ کیا تو چنگیز و ہلاکو کے تاریخی واقعات کو دہرایا۔ جب برطانیہ اور اس کے حواریوں نے دہلی پر قبضہ جمایا اور مغلیہ بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے اقتدار کو پاش پاش کر کے شہزادوں کے سروں کو کاٹ کر طشت میں رکھا اچھا اور بادشاہ کے سامنے پیش کیا لاکھوں مسلمانوں کو تہہ تیغ کیا اور دس ہزار علماء کرام کو تختہ دار پر لٹکایا ہندو سکھ آبادی کا کوئی نمایاں آدمی قتل نہیں ہوا اسی طرح اندلس کا حال ہوا جس پر مسلمانوں نے آٹھ سو سال حکومت کی جس میں ایک سنہری تاریخ ہے وہاں کے مسلمانوں کا ایک حصہ قتل ہوا ایک حصے کو جلاوطن اور تیسرے حصے کو زبردستی عیسائی بنایا گیا۔ قرطبہ کی تاریخی جامع مسجد جس کی وسعت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ مسجد جامعہ کے اندرونی حصہ 1417 عجیب و غریب خوبصورت ستونوں پر قائم ہے عجوہ چرچ اور گرجا بنی ہوئی ہے۔ سرزمین خراسان نیشاپور سے لے کر کاشغر تک مسلمانوں کے علوم و ادب، تفسیر و حدیث، اصول اور فقہ حنفی کا گہوارہ تھی اور بڑے بڑے ائمہ حدیث جیسے امام بخاری امام مسلم امام ترمذی عبداللہ بن مبارک اور علم فقہ کے سارے ائمہ و مجتہدین بیشمار و بے حساب المعاصی خوراسان کی پیداوار ہے آج وہاں کون ہے اور کیا ہو رہا ہے؟

جائیکہ بودند گل رخان با دوستان در بوستان
شد گرگ و روباہ را وطن شد زاغ و کرگس را مکان

یہ مذہبی تنزل اور ملکی تخریب کاری، اسلام دشمنی، مسلمان دشمنی، تہذیب و ثقافت پشمنی جسے آج کوئی اچھانام دے کر یاد کیا جارہاہے اور مغربی اتحادی اسے امن وانصاف کہنے سے نہیں شرماتے اور مسلمان سے جنھوں نے حق دفاع بھی چھین لیاہے اسے دہشت گرد اور دوسرے ناموں سے یاد کرتے ہیں۔ پورے خطے میں ایک صلاح الدین ایوبی نہیں جو انہیں للکارے اور خاموش کرائے یہ منحوس اتحادی آخر کیا چاہتے ہیں وہ یہ چاہتے ہیں کہ اسلام کو کمزور کیا جائے یا ختم کیاجائے مسلمان ہمارے تابع اور دست نگر بن جائیں اسلامی تہذیب و معاشرت ختم ہو کر قصہ پارینہ بن جائے۔ اسلام شہروں سے غائب ہو کر صرف تاریخی اوراق تک محدود ہو۔ قرآن وحدیث میں بھی وہی تحریف ہوں جو کہ انجیل وزبور اور تورات میں ہوئی۔ ہماری طرح مسلمان بھی مادر پدر آزاد ہوں۔ جہاد کی آیتوں کو اور یہودیت و نصرانیت کی نشاندہی والے مضامین آیتوں کو قرآن پاک سے نکال دیاجائے۔ مسلمان قوم کی سنہری تاریخ کو مسخ کرکے پیش کیا جائے بہادران اسلام خلفاء راشدین اور عالمگیر محی الدین جیسے عدل وانصاف والے سلاطین کو غاصب اور ظالم قرار دیاجائے اور پورے عالم میں اسلام قرآن حکیم کی تعلیمات کو بدنام کیا جائے اور طرح طرح کے ہتھکنڈوں سے مسلم امت کو تخریب کار اور دہشت گرد قرار دیاجائے وغیرہ وغیرہ۔ آج یہ منصوبے سارے چل رہے ہیں اور مسلمانوں کے اندر سے مختلف روشن خیال بناکر اپنے ہمنوااور ہاں میں ہاں ملانے والے افراد بنارہے ہیں بلکہ بنائے ہوئے ہیں خود بہتر فرقوں میں تقسیم در تقسیم ہو چکے ہیں اور مسلمانوں کو ہر محاذ پر تہتر فرقوں میں تقسیم در تقسیم کر چکے ہیں علمی میدان میں مستشرقین یورپ نے وہ کچھ کیاہے اور کر رہے ہیں جس کی حدوانتہانہ ہو۔ یہ ایک طرفہ حملہ زوروں پر ہے اور دوسری طرف سے جواب دہی نہیں اور کوئی مرد میدان نہیں ہم صرف اس مشاعرہ میں میں کھاپی کر عیش کر رہے ہیں اور محفلوں میں کہہ رہے ہیں کہ قرب قیامت ہے دجال کازمانہ آپہنچاہے اور یہ سب کچھ تکوینی طور پر ہورہاہے (اناللہ وانا الیہ راجعون)

مگر چونکہ اسلام دین الٰھی اور دین رحمت اور رواداری کانام ہے اور سارے عالم کے لیے باعث برکت اور سبب بقاہے اور اس پر رب العالمین کی رحمت وعنایت والی نظر شفقت ہے اتنی مخالفتوں اور قسم قسم کے ہتھکنڈوں کے باوجود اپنا تشخص اور شناخت بر قرار رکھے ہوئے ہے اور اپنے اصلی روپ وصورت کے ساتھ پورے عالم میں موجود ہے کیونکہ وہ مٹنے اور نیست ونابود ہونے کے تصور سے ماوراہے اور وہ جہاں میں باقی رہنے کے لئے آیاہے جانے کے لیے نہیں آیا

اس کی ایک سنہری روداد اور پس منظر ہے اگر وہ جانے کے لئے ہو تا تو پوری دنیا کی مخالفتوں کی تاب نہ لا کر کب کا ختم ہو چکا ہو تا مگر ایسا ہر گز نہیں۔ وان کان مکر ھم لتزول منہ الجبال (ابراہیم) یعنی سب اگلے پچھلے ظالم اپنے اپنے داؤ پیچ کھیل چکے ہیں انبیاء کرام کے مقابلے میں حق کو دبانے اور مٹانے کی کوئی تدبیر اور سازش انہوں نے اٹھا نہیں رکھی ان کی ساری تدوین نیست و نابود اور ناکارہ ہو جائیگی رب العالمین سبحانہ انہیں ناکام بنائیں گے۔

باطل سے دبنے والے اے آسمان نہیں ہم

سو بار کر چکا ہے تو امتحان ہمارا

(تفسیر منازل العرفان۔ عبد الستار شاہ)

نفخ ثانیہ کے بعد کی تفصیلات

گزشتہ معروضات میں آپ نے قیامت کے احوال کی تفصیل اور اس کے واقع ہونے کے دلائل ملاحظہ فرمائے۔ اب میں چاہتا ہوں کہ قیامت کے دوسرے مرحلے کے وقوع پذیر ہونے کے بعد جب از سر نو زندگی کی ہماہمی شروع ہو گی اس وقت کی کیفیت اور اس کی تفصیلات کا ذکر کروں۔ آپ نے یہ سنا ہو گا کہ انسان اپنی قبروں سے جسموں سمیت اٹھائے جائیں گے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا ان کے یہ جسم جن کے ساتھ وہ میدان حشر میں پہنچیں گے وہی ہوں گے، جو انھیں دنیا میں دیئے گئے تھے یا یہ اجسام اور ہوں گے؟ حقیقت یہ ہے کہ اجسام وہ نہیں ہوں گے، جو دنیا میں انھیں دیئے گئے تھے۔ بلکہ یہ اجسام ان کے اعمال کا ظل اور عکس ہوں گے۔ یعنی جیسے اعمال ہوں گے، ویسے ہی ان کو جسم عنایت ہوں گے۔ چنانچہ اس دنیا کے جسمانی رنگ کے لحاظ سے خواہ کوئی کالا ہو یا گورا مگر اس دنیا میں اس کا یہ کالا پن اور گورا پن اعمال کی سیاہی اور سفیدی کی صورت میں بدل جائے گا۔ قرآن کریم سورۃ عبس میں کہتا ہے: **وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ۙ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ۚ وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ۙ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ** ۔ ط

(عبس ۸۰:۳۸۔۴۱) "

کتنے چہرے اس دن روشن ، ہنستے اور شاد ہوں گے اور کتنے چہروں پر کدورت ہو گی اور ان پر سیاہی چھائی ہو گی۔"

سورۃ آل عمران آیت 11 میں فرمایا گیا:

يَّوۡمَ تَبۡيَضُّ وُجُوۡهٌ وَّتَسۡوَدُّ وُجُوۡهٌ‌ ۚ فَاَمَّا الَّذِيۡنَ اسۡوَدَّتۡ وُجُوۡهُهُمۡ اَكَفَرۡتُمۡ بَعۡدَ اِيۡمَانِكُمۡ فَذُوۡقُوا الۡعَذَابَ بِمَا كُنۡتُمۡ تَكۡفُرُوۡنَ ۔ وَاَمَّا الَّذِيۡنَ ابۡيَضَّتۡ وُجُوۡهُهُمۡ فَفِىۡ رَحۡمَةِ اللّٰهِ‌ؕ هُمۡ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ ۔

(۳:۱۰۶۔۱۰۷)

"اس دن کتنے چہرے سفید ہوں گے اور کتنے کالے۔ لیکن جن کے چہرے کالے ہوئے (ان سے پوچھا جائے گا کیا تم وہ ہو جو ایمان کے بعد کافر ہو گئے تھے تو اپنے کفر کے بدلے عذاب کا مزا چکھو۔) جن کے چہرے سفید ہوئے وہ اللہ کی رحمت میں ہوں گے وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔"

صحیح احادیث میں ہے کہ جنت میں سب لوگ جوان بن کر داخل ہوں گے ان کے جسم پر کبھی بڑھاپا نھیں آئے گا ان کا قد حضرت آدم (علیہ السلام) کے اولین بہشتی قد کے مطابق ہو گا۔ دوزخیوں میں سے کسی کا سر پہاڑ کے برابر ہو گا اور کسی کا ایک پہلو مفلوج ہو گا۔ کسی کے ہونٹ لٹکے ہوں گے ، دل کے اندھے ، آنکھوں کے اندھے بن کر اٹھیں گے۔ سزاؤں کے بعد جب ان کے جسم چور چور ہو جائیں گے تو پھر صحیح اور سالم نئے جسم نمودار ہوں گے اور پھر ان کی وہی کیفیت ہو گی یہ بھی حدیث میں آیا ہے کہ جو اپنے آپ کو بڑے سمجھتے ہیں وہ چیونٹی بن کر قیامت میں اٹھیں گے۔

ان تمام شواہد سے ظاہر ہوتا ے کہ اس دنیا کے جسمانی قالب ہمارے اس دنیاوی جسم کے مطابق نہیں بلکہ ہمارے دنیاوی اعمال کے مطابق ہوں گے۔ اب انسانوں کو اس میدان میں لے جایا جائے گا جہاں اللہ کی عدالت ہو گی اور ان کے سامنے وہ مرحلہ در پیش ہو گا جس کے لیے قیامت برپا کی گئی یعنی ان کا حساب کتاب شروع ہو گا۔ نیک لوگ اپنے اچھے اعمال کی جزا پائیں گے اور برے لوگوں کو اپنے برے اعمال کی سزا ملے گی۔ اس حساب و کتاب کے سلسلہ میں جو باتیں قرآن و سنت سے واضح ہوتی ہیں ان میں سے پہلی بات یہ ہے کہ ہر آدمی کو اس کا نامہ عمل دیا جائے گا اور وہ نامہ عمل ایسا ہو گا جس میں کوئی چھوٹی بڑی بات چھوٹنے نہیں پائے گی بلکہ وہ اس کی زندگی کا روزنامچہ ہو گا جس میں ایک ایک لمحے کی تفصیل موجود ہو گی۔

قرآن کریم سورۃ کہف آیت چھ میں کہتا ہے:

وَوُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ وَيَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰهَا وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ط وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا ۔ ع (۱۸۔۴۹) ”

اور نامہ اعمال رکھ دیا جائے گا پس تو گنہگاروں کو دیکھے گا کہ اس میں جو کچھ لکھا ہو گا اس سے وہ ڈر رہے ہوں گے اور کہیں گے کہ ہائے افسوس اس نامہ اعمال کو کیا ہے کہ چھوٹی بڑی بات تک نہیں چھوڑتا۔ بلکہ اس کو شمار کرتا ہے اور جو کچھ انھوں نے زندگی میں کیا اس کو وہ سامنے پائیں گے اور تیرا پروردگار کسی پر ظلم نہیں کرے گا۔“

نامہ اعمال کی نوعیت

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ نامہ عمل کیا ہے اور یہ کیسے ممکن ہے کہ زندگی میں گزرا ہوا ایک ایک لمحہ اپنی تفصیل سمیت زندہ رہے اور قیامت کے دن ہر آدمی کے حق میں یا اس کے خلاف پیش کیا جائے۔ اس کے بارے میں چند باتیں بالکل واضح ہیں۔

1 ہمیں قرآن کریم یہ بتاتا ہے کہ انسان کی زبان سے جب کوئی لفظ نکلتا ہے یا جب وہ کوئی عمل کرتا ہے خواہ یہ قول یا عمل کتنا ہی تنہائی میں وقوع پذیر کیوں نہ ہوا ہو اللہ کے مقرر کردہ فرشتے ہر وقت موجود ہوتے ہیں جو اسے سن کر یا دیکھ کر محفوظ کر لیتے ہیں۔ سورۃ ق میں ارشاد ہوتا ہے:

اِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيٰنِ عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيْدٌ ۔ مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ ۔

(۵۰:۱۷۔۱۸) ”اس وقت کو یاد کرو کہ جب دو لینے والے دائیں اور بائیں بیٹھے محفوظ کر رہے ہوتے ہیں“۔ اور بولنے والا کوئی بات نہیں بولتا مگر نگران اس کے پاس حاضر رہتا ہے۔ یعنی اس طرح دو عینی گواہ جو ہر وقت ہمارے ساتھ موجود رہتے ہیں وہ قیامت کے دن اپنا نوشتہ اللہ کے سامنے اور اللہ کے حکم سے ہر ایک کو پیش کریں گے۔ یہ بھی قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے کہ جن کو نامہ عمل دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا وہ ان کی سعادت کی علامت ہو گا۔ اس لیے وہ اسے پا کر خوش و خرم ہوں گے۔ لیکن جن لوگوں کو یہ نامہ عمل بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا وہ ان کی بدبختی اور شقاوت کی علامت ہو گا وہ اسے لے کر سر پیٹ لیں گے۔

سورۃ بنی اسرائیل میں کہا گیا:

وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰهُ مَنْشُوْرًا ۔ اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ط كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ۔(۱۷:۱۳۔۱۴)

"ہم نے ہر انسان کا نتیجہ یعنی (اس کا نامہ عمل) اس کی گردن میں چپکا دیا ہے اور قیامت کے دن ہم اس کا رجسٹر نکالیں گے جس کو وہ کھلا ہوا پائے گا۔ (اسے یہ کہا جائے گا) کہ اپنا یہ نامہ عمل پڑھ لے آج تو خود ہی اپنے حساب کے لیے کافی ہے۔"

قرآن کریم کے اس بیان سے یہ بات تو واضح ہو گئی کہ ہمیں محفوظ حالت میں اللہ کی قدرت سے ایک نوشتہ اور نامہ عمل دیا جائے گا اور ہم اسے خود پڑھ سکیں گے۔

لیکن ہم اگر آج کی جدید دنیا میں نئی ایجادات کے حوالے سے دیکھیں جن میں سب سے نمایاں ٹیلی ویژن کی ایجاد ہے تو کیا ہم اس میں گزرے ہوئے لوگوں کو اپنی آنکھوں سے چلتا پھرتا ، بولتا چالتا نہیں دیکھتے؟ جو لوگ عرصہ دراز سے دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں اور ان کی فلمیں محفوظ ہیں ہم جب چاہیں ٹیلی ویژن کی مدد سے ان کی آواز سن سکتے ہیں انھیں اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں۔ اگر انسانی ایجاد یہ کارنامہ انجام دے سکتی ہے تو قدرت کے لیے اس میں کیا مشکل ہے کہ وہ پوری فضا کو پردہ سکرین میں تبدیل کر دے اور ہماری کہی ہوئی باتیں اور کیے ہوئے اعمال کی اس محفوظ فلم کو جو اس کے پاس محفوظ ہے، پردہ سکرین پر جاری کر دے اور وہاں ہر دیکھنے والا اس پردہ سکرین پر اپنے اعمال کو دیکھے اور اپنے اقوال کو سنے۔ بلکہ اگر ہم مزید غور کریں تو سائنس ہمیں یہ بتاتی ہے کہ یہ فضا اس قدر حساس واقع ہوئی ہے کہ اس میں ہر کہا ہوا بول محفوظ ہے اور ہر کیا ہوا کام دیکھا جا سکتا ہے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ کوئی موجد اپنی نئی ایجاد سے یہ کارنامہ انجام دے دے۔ ممکن ہے یہ بات انسان کی بساط سے باہر ہو اور دنیا میں کبھی ایسا نہ ہو سکے لیکن میں محض تسہیل و توضیح مدعا کے لیے ایک مثال عرض کرتا ہوں۔

اگر ایک پر سکون جھیل میں آپ ایک کنکر پھینکیں تو آپ دیکھیں گے کہ سطح آب پر ایک دائرہ سا بن جائے گا جو جھیل کے کنارے تک پھیلتا چلا جائے گا۔ یہ کائنات اس جھیل سے بھی زیادہ حساس ہے جہاں ہمارے ہر عمل سے ہر جنبش سے بلکہ خیال تک سے لہریں اٹھتی اور پھیلتی چلی جاتی ہیں۔ چونکہ کائنات کا کوئی ساحل نہیں اس لیے یہ لہریں

سدا باقی رہیں گی اگر ہم کوئی ایسا ٹیلی ویژن ایجاد کر لیں جو ان لہروں کو صوت و حرکت میں بدل سکے تو ہر شخص کا پورا اعمال نامہ ایک فلم کی طرح ہمارے سامنے آجائے گا۔ اس آیت کریمہ میں غالباً اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے:

اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ(۳۶۔۶۵) "

قیامت کے دن ہم ان کے منہ بند کر دیں گے اور ان کے اعمال کی داستان ان کے ہاتھ اور پاؤں سنائیں گے۔ اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اعضاء بھی ہمارے حق میں یا ہمارے خلاف گواہی دیں گے بلکہ ہماری کھال تک ہمارے اعمال بد پر گواہی دے گی۔ قرآن کریم میں سورۃ حم السجدہ میں کہا گیا:

وَيَوْمَ يُحْشَرُ اَعْدَآءُ اللّٰهِ اِلَى النَّارِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ۔ حَتّٰٓى اِذَا مَا جَآءُوْهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَاَبْصَارُهُمْ وَجُلُوْدُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا قَالُوْٓا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ۔(۴۱:۱۹۔۲۱) "جس دن خدا کے دشمن دوزخ کی طرف ہانکے جائیں گے اور وہ درجہ بدرجہ تقسیم کر دیئے جائیں گے یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس پہنچیں گے تو ان کے کان، آنکھیں اور ان کی کھالیں ان پر ان کے کرتوتوں کی گواہی دیں گی تو وہ اپنی کھالوں سے کہیں گے کہ تم نے ہم پر گواہی کیوں دی؟ تو وہ بولیں گی کہ جس اللہ نے ہر چیز کو قوت گویائی بخشی ہے آج اسی نے ہمیں بھی بولنے کا حکم دیا ہے مزید ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہاں ہر عمل مخصوص شکل میں لایا جائے گا۔ جس کا ایک وزن ہو گا اب اس کی کمی بیشی کے لیے یا بوجھل اور ہلکے پن کو جاننے کے لیے میزان رکھا جائے گا۔ تو پھر جن کے وزن ہلکے ہوں گے وہ جہنم کا ایندھن بنیں گے اور جس کا وزن بھاری ہو گا وہ جنت کی نعمتوں سے سرفراز ہو گا۔

قرآن کریم سورۃ اعراف میں کہتا ہے:

وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِنِ الْحَقُّ ج فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۔ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ۔ (الاعراف ۷:۸۔۹)

اور اس دن وزن کرنا حق ہے پھر جس کی تولیں بھاری ہوئیں تو یہ وہ لوگ ہیں جو فلاح کو پہنچیں گے اور جن کی تولیں ہلکی ہوئیں یہ وہ ہیں جو اپنی جانوں کا نقصان کر بیٹھے ہیں۔

سورۃ القارعہ میں فرمایا:

فَاَمَّا مَنۡ ثَقُلَتۡ مَوَازِیۡنُهٗ فَهُوَ ۔ لا فِیۡ عِیۡشَةٍ رَّاضِیَةٍ ۔ ط وَاَمَّا مَنۡ خَفَّتۡ مَوَازِیۡنُهٗ ۔لا فَاُمُّهٗ هَاوِیَةٌ ۔ ط

(القاریہ ۱۰۱:۶۔۹)

"آج جس کا تول بھاری ہو تو وہ عیش کی زندگی میں ہوگا اور جس کا تول ہلکا ہوا اس کا ٹھکانا دوزخ ہے۔

تو حساب کتاب کے اس مرحلے سے گزرنے کے بعد لوگ اپنے اپنے اعمال کے مطابق جنت یا جہنم میں داخل کر دیئے جائیں گے۔ البتہ ان لوگوں میں سے جنھوں نے کفر اور شرک کا رویہ اختیار کیا ہوگا ان کو تفصیلی حساب کتاب کی ضرورت نہ ہوگی کیونکہ اس جرم کے بعد باقی کوئی نیکی اپنا اعتبار نہیں رکھتی اس لیے ان کو سیدھا جہنم میں بھیج دیا جائے گا اور وہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں رہیں گے اور کبھی ان کو معافی نہیں ملے گی۔ قرآن کریم کہتا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لا یَغۡفِرُ اَنۡ یُّشۡرَكَ بِهٖ وَیَغۡفِرُ مَا دُوۡنَ ذٰلِكَ لِمَنۡ یَّشَآءُ ۔ ج (النساء:۴۔۴۸) ''

بیشک اللہ تعالیٰ اس آدمی کو کبھی نہیں بخشے گا جس نے اس کے ساتھ شرک کیا اس کے علاوہ جسے چاہے گا بخش دے گا "۔

سزا و جزا کا ہندوانہ نظریہ

لیکن یہ حساب کتاب جس میں نیکی کی جزا اور بدی کی سزا ہے اس طرح کا غیر معقول ،غیر منطقی اور اللہ کی رحمت کے بالکل برعکس نہیں ہے جس طرح کا تصور بعض دیگر مذاہب میں پایا جاتا ہے۔ یہودیت اور عیسائیت نے بھی اس میں بہت کچھ ٹھوکریں کھائی ہیں اور قدم قدم پر غلطیاں کی ہیں لیکن ہندومت نے تو اس کو نامعقولیت اور غیر منطقی انجام کی انتہا تک پہنچا دیا ہے۔ اس کی ہم تفصیل سید سلیمان ندوی (رح) کی سیرۃ النبی سے نقل کرتے ہیں۔

" درحقیقت مذاہب کا حقیقی تعلق اس عقیدہ سے ہے کہ انسان اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے اور اچھا یا برا جیسا کام اس سے صادر ہوتا ہے اس کے مطابق اچھا یا برا بدلہ اس کو دوسری دنیا میں ضرور ملے گا۔ اس عقیدہ کا نشان مصر و بابل جیسی دنیا کی قدیم قوموں میں بھی ملتا ہے۔ ہندوستان کے مذاہب میں اس دوسری دنیا کو دوسرے جنم سے تعبیر کیا گیا ہے ' ان کا خیال یہ ہے کہ انسان جب مرتا ہے تو اس کے اچھے یا برے کاموں کے مطابق اس کی روح کسی جانور گھاس پھوس یا درخت کے قالب میں جا کر اپنے عمل کا نتیجہ بھگتتی ہے اور پھر انسانوں کے قالب میں لائی جاتی ہے اور کام

کرتی ہے اس کے بعد جس کے گناہ زیادہ ہوتے ہیں ان کو ہملوک میں جانا پڑتا ہے۔ جہاں نرک (دوزخ) ہیں وہاں وہ ہر قسم کی سزا بھگتتی ہے، بعد ازاں اپنے بعض اچھے کاموں کی بدولت چندر لوک (چاند کی دنیا) میں جاتی ہے، جس روح کے کچھ کام اب بھی باقی ہیں وہ اس دنیا میں ہوا، بادل اور بارش کے ذریعہ سے دوبارہ آتی ہے اور اپنے کام کے مطابق حیوانات یا نباتات کے روپ میں سزا پاتی ہے اور پھر چھوٹ کر انسان بنتی ہے، یہاں تک کہ اس کے کام اتنے اچھے ہو جائیں کہ وہ سزا کے قابل نہ رہ جائے۔ اس وقت وہ مادی قالبوں کی قید سے نجات پا کر سورج لوک اور چندر لوگ وغیرہ اجرام سماوی کی دنیاؤں میں جا کر آرام کرتی ہے اور پھر اپنے علم و عمل کی کسی کمی کے سبب سے بادل، ہوا، اناج یا کسی دوسری مخلوقات کے قالب میں ہو کر اس کو اس دنیا میں پھر آنا پڑتا ہے اور پھر وہی عمل شروع ہوتا ہے یعنی وہ نئے نئے جنموں میں سزا بھگتتی ہے اور اس وقت تک آمد و رفت اور آوا گون کے چکروں میں پھنسی رہتی ہے جب تک اس سے اچھے یا برے کاموں کا صدور ہوتا رہتا ہے۔ اس لیے کامل اور دائمی نجات کی صورت صرف یہ ہے کہ انسان سے اچھا یا برا کوئی کام صادر نہ ہو، یہی ترک عمل روح کو مادہ کی قید سے آزاد کر کے ہمیشہ کے لیے چھٹکارا (موکش) دلاتا ہے۔ یہاں تک کہ یہ موجودہ مادی دنیا پرلے (قیامت) کے بعد پھر جب نئے سرے سے بنے گی تو پھر وہی عمل اور سزا یعنی آوا گون کا چکر شروع ہو گا۔ اور پھر اس طرح چھٹکارا پائے گی اور پھر دوسری پرلے کے بعد نیا دور اسی طرح شروع ہو گا یہ چکر اسی طرح ہمیشہ رہے گا۔

یہ وہ چکر ہے جس سے انسان کو کبھی نکلنا نصیب نہ ہو گا۔ الا یہ کہ ہمالہ کی چوٹی یا غار میں بیٹھ کر ترک عمل کے ذریعہ سے خود اپنے وجود سے ہاتھ دھو لیا جائے لیکن اگر اس اصول نجات پر دنیا عمل کرے تو یہ بہارستان ایک دم میں خارستان بن جائے۔ ہر قسم کا کاروبار بند ہو کر دنیا آپ سے آپ فنا کے قریب آ جائے۔ بدی کے ساتھ نیکی کا وجود بھی صفحہ ہستی سے مٹ جائے اور با ایں ہمہ دائمی و ابدی نجات میسر نہ ہو کیونکہ ہر پرلے کے بعد وہی جنم اور کم اور آوا گون پھر شروع ہوتا ہے۔"

سزا و جزا کا اسلامی نظریہ

لیکن اسلام نے اس جزا و سزا کے دن کا جو تصور دیا وہ عقل اور منطق کے انتہائی قریب اور اللہ کی رحمت کا عکاس ہے۔ اسلام نے اس بنیادی تصور کے ساتھ کہ ہر نیک عمل کی جزا اور ہر برائی کی ایک سزا ہے ' رحمت کے ایسے مواقع سے بھی بہرہ ور فرمایا ہے کہ اگر آدمی واقعی ان مواقع سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کر لے اور اللہ کا خوف اس کو دامن گیر رہے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ اللہ کی جنت کا مستحق نہ ٹھہرے۔ مثلاً سب سے پہلے پروردگار نے یہ کرم فرمایا کہ ایک اصول طے کر دیا کہ تم جو برائی کرو گے تو ہم ہر برائی کے بدلے میں ایک ہی برائی کی سزا دیں گے البتہ اگر تم نیکی کرو گے تو ہم نے یہ اصول بنا دیا ہے کہ مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا۔ج (الانعام:٦۔١٦١) "جو آدمی نیکی کرے گا تو ہم اس کو دس گنا بدلہ دیں گے۔"

اب جہاں ایک اور دس کا تناسب ہو تو کیا وہ آدمی جو صراط مستقیم پر چلنا چاہتا ہو اور شریعت کے تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھتا ہو کوئی وجہ نہیں کہ وہ اس تناسب سے فائدہ نہ اٹھا سکے۔

2۔ دوسرا کرم یہ فرمایا کہ اگر تم نیکی کا ارادہ کرو لیکن اسے کسی وجہ سے کر نہ پاؤ تو ہم تمہیں ایک نیکی کا صلہ ضرور دیں گے لیکن اگر تم برائی کا ارادہ کرو اور اسے پھر کر نہ پاؤ تو ہم تم سے کوئی مواخذہ نہیں کریں گے۔

3۔ پھر ہمارے لیے بعض ایسے مواقع رکھے کہ اگر ہم ان مواقع پر اور ان زمانوں میں اللہ کی بندگی بجالائیں اور اس سے استغفار کریں تو بخشش خود آگے بڑھ کر قدم چومتی ہے۔ مثلاً رمضان کا مہینہ لیلۃ القدر ' عیدین کی دونوں راتیں 'یوم العرفہ ' 15 شعبان کی رات ' رات کا پچھلا پہر ' ان میں کوئی گناہ گار سے گناہ گار بھی استغفار کے لیے اللہ کے سامنے ہاتھ پھیلائے تو کبھی اسے خالی ہاتھ واپس نہیں لوٹایا جاتا۔

4۔ یہ صحیح ہے کہ آدمی بعض دفعہ بڑے سے بڑا گناہ بھی کر گزرتا ہے جس کی بخشش کے لیے دوسرے مذاہب نے کوئی امکان نہیں چھوڑا۔ لیکن اللہ کا بے حد کرم ہے کہ اس نے ہمارے لیے توبہ کا دروازہ کھلا رکھا ہے بلکہ قرآن کریم میں بار بار تسلیاں دی گئیں کہ اے ہمارے وہ بندوں جو اپنے نفسوں پر زیادتی کر چکے ہو: لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ

(۳۹:۵۳) "اللہ کی رحمت سے کبھی مایوس نہ ہوں وہ سب گناہوں کو بخش دے گا صرف ایک دفعہ توبہ کر کے دیکھو"۔

حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس توبہ پر اس حد تک زور دیا کہ آپ کے اسمائے مبارکہ میں سے ایک اسم مبارک "رسول التوبہ" بھی ہے۔ یہ ایک ایسا امکان ہے کہ جس کے بعد سو سال کا مجرم بھی توبہ کے ذریعہ اپنی زندگی کو پاکیزہ بنا سکتا ہے اور اللہ کی رحمت کا استحقاق پیدا کر سکتا ہے اس قدر بخشش اور استغفار کے مواقع ملنے کے بعد بھی کوئی آدمی اللہ کی رحمت کا استحقاق پیدا نہ کر سکے تو اسے بدنصیب کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے لیکن قربان جائیں اللہ کی رحمتوں کے کہ اس نے مرنے کے بعد بھی اور قیامت کے دن بھی اپنے بندوں کو اپنی رحمتوں سے محروم نہیں کیا۔

5۔ مرنے کے بعد بھی اس نے ہمیں یہ حق دیا کہ اگر تم اپنے پیچھے کوئی صدقہ جاریہ چھوڑ جاؤ یا اپنی نیک اولاد چھوڑ جاؤ جو تمہارے لیے دعا کرتی رہے تو مرنے کے بعد بھی اس سے تمہاری برائیوں میں کمی ہو گی اور تم بخشش کے قریب ہوتے جاؤ گے۔

6۔ اور اگر معاملہ اس سے بھی نہ بن سکے تو پھر اللہ کی رحمتوں نے ہمارے لیے ایک اور امکان بھی پیدا فرمایا وہ یہ کہ ہمیں بتایا گیا کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہمارے لیے شفاعت فرمائیں گے حضور کی ایک شفاعت تو شفاعت عامہ ہو گی جس کے نتیجے میں تمام امتوں کے لوگ جو حساب کتاب کے انتظار میں نہایت کرب اور اضطراب سے وقت گزار رہے ہوں گے ان کا حساب کتاب شروع ہو جائے گا۔ پھر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنی امت کے لیے بطور خاص سفارش فرمائیں گے حضرت انس ابن مالک (رض) فرماتے ہیں کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے قیامت کی حالت بیان کرتے ہوئے بتایا کہ پھر میں سجدہ میں گر پڑوں گا 'نہ جانے کب تک پڑا رہوں گا آخر آواز آئے گی اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سر اٹھا 'مانگ دیا جائے گا۔ تب میں سر اٹھاؤں گا اور اس حمد سے جو اس وقت خدا مجھے سکھائے گا اس کی حمد کروں گا اور سفارش کروں گا تو خدا ایک حد مقرر فرمائے گا تو میں ان کو دوزخ سے نکالوں گا اور جنت میں داخل کروں گا۔ پھر لوٹ آؤں گا اور سجدہ میں گر پڑوں گا پھر وہ کچھ لوگوں کو بخش دے گا اسی طرح تیسری بار پھر چوتھی بار کروں گا یہاں تک کہ دوزخ میں پھر وہی رہ جائے گا جس کو قرآن نے روک رکھا ہے۔

حضرت عمران ابن حصین سے روایت ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ میری شفاعت سے کچھ ایسے لوگ بھی دوزخ سے نکلیں گے اور جنت میں داخل ہوں گے جن کا نام جہنم والے ہو گا۔ البتہ یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ آنحضرت کی سفارش ہر ایک کے لیے نہیں ہو گی بلکہ اس سفارش سے وہ خوش نصیب بہرہ ور ہوں گے جو اخلاص قلب سے توحید پر ایمان رکھتے ہوں گے اور جن کے سر صرف اور صرف اللہ کے سامنے جھکتے ہوں گے۔

حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ ان کے سوال پر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ میری سفارش سے سر فراز ہونے کی خوش قسمتی اس کو حاصل ہو گی جس نے خلوص قلب سے اللہ کی توحید کا اقرار کیا ہو گا۔

حضرت ابو ہریرہ (رض) ہی سے روایت ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے فیصلے سے فراغت پائے گا اور چاہے گا کہ ان کو جنھوں نے اس کی توحید کی گواہی دی تھی دوزخ سے نکالے تو فرشتوں کو ان کے نکالنے کا حکم دے گا۔

فرشتے ان توحید والوں کو اس علامت سے نکالیں گے کہ ان کی پیشانیوں میں سجدے کے نشان ہوں گے۔ خدا نے آدم (علیہ السلام) کے بیٹے کی پیشانی کے نشان کو دوزخ کی آگ پر حرام کر دیا ہے وہ ان کو جلا کر خاکستر نہیں کر سکے گی۔

فرشتے جب ان کو نکالیں گے تو وہ جلے اور جھلسے ہوئے ہوں گے۔ پھر ان پر آب حیات چھڑکا جائے گا تو وہ اس طرح اگیں گے جس طرح سیلاب کے بہاؤ میں جنگلی دانہ اگتا ہے۔

ایسی متعدد روایات ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ جس کا خاتمہ ایمان پر ہوا اور جس نے توحید پر جان دی اور جس نے کبھی بھی کوئی نیک عمل کیا ہو گا جہنم کی سزا بھگتنے کے بعد بالآخر اللہ تعالیٰ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی شفاعت سے اس کو جہنم سے آزادی دے دیں گے اور جنت میں اسے داخل کر دیا جائے گا۔ البتہ وہ بدنصیب کبھی جہنم سے چھٹکارا نہیں پا سکے گا جس نے شرک کا ارتکاب کیا ہو گا۔

یہاں تک ہم نے اللہ تعالیٰ کی تین صفات کا مطالعہ کیا ہے جس سے ہمیں اندازہ ہوتا ہے کے ایک بندہ جب اپنے پروردگار کی حمد و ثناء کرنا چاہتا ہے تو اسے سب سے پہلے اپنے پروردگار کی صفت ربوبیت سے آگاہی ہوتی ہے وہ اپنے وجود کو دیکھتا ہے تو اس کا بچپن لڑکپن، جوانی اور ڈھلتی ہوئی عمر، غرضیکہ زندگی کا ایک ایک لمحہ اسے اپنے رب کی ربوبیت کے فیضان سے گراں بار معلوم ہوتا ہے اس کی پیدائش کا پورا عمل ماں کے پیٹ کی زندگی دنیا میں آنے کے بعد کی بے بسی اور اس بے بسی میں قدم قدم پر تربیت کا سامان اور ہر تبدیلی کے ساتھ تربیت کے عمل کی تبدیلی،

جسمانی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ اندرونی اور بیرونی صلاحیتوں کا فیضان اور وقت کے ساتھ ساتھ دماغی نشوونما میں ترقی پھر ایک وقت میں پہنچ کر شعلہ عقل کی روشنی فعلی اور انفعالی جذبوں کی افزائش گردوپیش کی موافقت اور اس کے مطابق ذوق اور مزاج کی تربیت ایک طویل داستان ہے جو ہر شخص کے گردوپیش پھیلی ہوئی دکھائی دیتی ہے پھر وہ ایک قدم آگے بڑھ کر دیکھتا ہے کے مجھے میرے پروردگار نے صرف جسمانی ضرورتوں سے ہی مالامال نہیں کیا بلکہ میرے اندر ایسے احساسات کو بھی فروغ بخشا ہے جو میرے دماغی نفسیاتی روحانی اور جمالیاتی ذوق کی تسکین کا باعث ہیں اور پھر اس مزاج اور ذوق کی ضرورت کی بجاآوری کے لیے جابجا ایسے مناظر اٹھا دیئے گئے ہیں جس سے اللہ کی صفت ربوبیت کے ساتھ ساتھ اس کی صفت رحمت کا بھی احساس توانا ہونے لگتا ہے پھر جب آدمی انسانی زندگی کا مطالعہ کرتا ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے کے انسانی زندگی میں مختلف کرداروں سے واسطہ پڑتا ہے جس کے نتیجہ میں مختلف رویے جنم لیتے ہیں کہیں رحم دلی نظر آتی ہے تو کہیں سنگدلی کہیں مروت کا اظہار ہوتا ہے تو کہیں شقاوت کا اس رویے کے نتیجہ میں خودبخود ایک احتسابی عمل کی ضرورت محسوس ہونے لگتی ہے کیونکہ اگر زندگی میں رویوں کو کھلی چھوٹ دے دی جائے تو انسانی زندگی جنگل کا منظر پیش کرنے لگے گی جس میں صرف طاقت کی حکومت ہو گی لیکن جب وہ دیکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ایک صفت عدالت بھی ہے جو یہاں عقیدے کی صورت میں کارفرما ہے اور قیامت میں نتیجے کی صورت میں کارفرما ہو گی تو اس کی روح جھوم اٹھتی ہے اور وہ بے ساختہ حریم قدس کی طرف عبادت کے تصورات لے کر بڑھتا ہے اور اس کی زبان پر بے ساختہ یہ نغمہ جاری ہو جاتا ہے۔ اِيَّاكَ نَعۡبُدُ وَاِيَّاكَ نَسۡتَعِيۡنُ ۔ ط

ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں

یہ نغمہ اس کے دل کا سرجوش ہے جو ازخود اس کے دل سے اچھل کر زبان پر آگیا ہے کیونکہ یہ بات انسان کے خمیر میں رکھی گئی ہے کہ وہ اپنے محسن کی احسان شناسی کے جذبے میں ڈوب کر اپنے محسن کے لیے کچھ کرنا چاہتا ہے پھر اگر وہ محسن اس کا ہم پایہ ہے اور اس کا احسان ایک عام سطح کا ہے تو یہ اس کی خدمت کر کے ایک تسکین محسوس کرتا ہے لیکن اگر وہ محسن ایک بڑی حیثیت کا مالک ہے تو یہ اس کی حیثیت کے مطابق اس کے آداب بجالاتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ جو میرے بس میں ہے میں اس کی خوشنودی کے لیے کر گزروں اور اگر وہ احسان کرنے والی ذات ایسی ہے جو محبت، عقیدت اور بندگی کا مرجع ہے تو یہ احسان میں ڈوبا ہوا شخص اپنی زندگی کا سارا سرمایہ اور بندگی کا سارا خزانہ اور

حمد و ثناء کی ساری پونجی اس کے قدموں میں ڈھیر کر کے خود بھی اس کے سامنے ڈھیر ہو جاتا ہے یہ طرز عمل فطرت کا وہ رویہ ہے جو انسان کے خمیر میں گوندھ دیا گیا ہے اسی جذبے سے سرشار انسان جب اپنے رب کے احسانات کو دیکھتا ہے کہ اس کا وجود اس کے دل و دماغ کی رعنائیاں، اس کے احساسات کی سرگرمیاں، اس کے جذبوں کی فراوانیاں، اس کی ذہانت کی جولانیاں، اس کے عزائم کی بلندیاں، اس کی محبت کی گہرائیاں، اس کے جذبہ ءایجاد کی ہمہ گیریاں، اس کے انفعالی جذبوں کی خوبصورتیاں اور اس کی شخصیت کی تہ در تہ کرم فرمائیاں سب پروردگار کی عطاء اور بخشش ہے تو وہ بے ساختہ اس کے سامنے سجدہ ریز ہو کر اپنی ذات کی نفی کر کے اسی کی عبادت کا اقرار و اعتراف کرنے لگتا ہے اور پھر جب عبادت کی وسعتوں اور اپنی ناتوانیوں کو دیکھتا ہے تو اسی سے مدد کا طلب گار ہوتا ہے لیکن یہ سب کچھ وہ اس عاجزی اور سرافگندگی کے ساتھ کرتا ہے جس سے ایک طرف دعا کا آہنگ جنم لیتا ہے اور دوسری طرف بندے اور اس کے رب کے درمیان ایک عہد و پیمان کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے کہ بندہ اپنی بندگی کا سرمایہ لے کر جب حضور حق میں حاضر ہوتا ہے تو ادھر سے اسے آواز سنائی دیتی ہے کہ تم نے اپنا سب کچھ ہمارے حوالے کر دیا تو ہم نے بھی تمہیں وہ سب کچھ دے دیا جو تم نے ہم سے مانگا اور جب تک تم اپنی بندگی کے اس عہد پر قائم رہو گے تو ہماری عنایات میں کبھی کمی نہیں دیکھو گے چنانچہ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ مسلمان وسائل کی کمی کے باوجو محض بندگی رب کے باعث اس سرزمین پر سرفراز رہے لیکن جب انھوں نے طاغوت کی بندگی شروع کر دی تو وہ ٹھوکروں کی نذر ہو کر رہ گئے یہی وہ عہد ہے جو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جنگ بدر شروع ہونے سے پہلے اپنے پروردگار سے کیا تھا آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) رات بھر اللہ کے حضور کھڑے دعائیں مانگتے رہے آخر آپ کی زبان پر یہ جملہ آیا کہ یااللہ یہ زمین انسانوں سے معمور ہے لیکن آج کی پوری نوع انسانی میں یہ چند گنتی کے لوگ ہیں جو آپ کی توحید کے پرستار ہیں اگر اس جنگ میں یہ لوگ مارے گئے تو پھر دنیا میں تیری پوجا کرنے والا کوئی نہیں رہے گا اگر آپ چاہتے ہیں کہ دنیا میں آپ کی عبادت کی جائے تو پھر ان چند گنتی کے لوگوں کو اپنی تائید و نصرت سے نواز دیں تاکہ یہ آپ کی زمین پر آپ کے نام اور آپ کے دین کو بلند کر سکیں پروردگار نے فرمایا کہ ہم تمہارے اس وعدے پر تمہاری مدد کے لیے فرشتے بھیج رہے ہیں اور آئندہ بھی یہی فیصلہ ہو گا کہ تم اللہ کی بندگی میں کمی نہیں آنے دو گے اور اللہ تعالیٰ کبھی تمہیں اپنی تائید و نصرت سے محروم نہیں کرے گا اسی وعدے اور عہد کا اعادہ روزانہ ایک بندہ اپنے رب

کے حضور کھڑا ہو کر کرتا ہے اب اس سے پہلے کہ ہم اس عبادت اور استعانت کی لفظی اور معنوی وضاحت کریں اس کی اہمیت اور افادیت کے حوالے سے چند بنیادی باتیں عرض کرتے ہیں:

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں جن وانس کا مقصد تخلیق عبادت ٹھہرایا ہے ارشاد خداوندی ہے:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ۔(الذاریات ۵۱:۵۶)

کہ میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔

انسانوں کی ہدایت کے لیے اللہ نے انبیاء اور رسول مبعوث فرمائے اور قرآن کریم کی صراحت کے مطابق تمام انبیاء اور رسولوں کی دعوت کا عنوان صرف عبادت رہا۔ پروردگار کا ارشاد ہے:

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ (النحل ۱۶:۳۶)

ہم نے ہر امت کی طرف رسول بھیجا (انھوں نے آکر انھیں اللہ کا پیغام پہنچایا) کہ لوگو اللہ کی عبادت کرو۔

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سب پیغمبروں کے آخر میں خاتم النبیین بن کر تشریف لائے اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بعد نبوت اور رسالت کا دروازہ بند ہو گیا اور آپ کے واسطے سے اللہ تعالیٰ قیامت تک کے آنے والے انسانوں کو جو ہدایت دینا چاہتا تھا اسے تکمیلی انداز میں انتہائی جامعیت کے ساتھ عطا فرما دیا گیا۔ چنانچہ قرآن کریم میں اس دعوت کا جب آغاز فرمایا گیا اس کا عنوان بھی یہی عبادت رکھا گیا۔ ارشاد ہوا:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ (البقرۃ ۲:۲۱)

اے لوگو! عبادت کرو اپنے اس رب کی جس نے تمھیں پیدا کیا اور تم سے پہلے لوگوں کو پیدا کیا۔

مندرجہ بالا تفصیلات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں عبادت کی کیا اہمیت ہے کیونکہ یہی جن وانس کا مقصد تخلیق ہے، یہی تمام انبیاء کی دعوت تھی اور یہی دعوت رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے انتہائی جامعیت کے ساتھ جن وانس تک پہنچائی۔ اب سوال یہ ہے کہ اس عبادت کا مفہوم کیا ہے؟ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جب مبعوث ہوئے تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تشریف آوری سے پہلے دنیا میں عبادت کے حوالے سے چار تصورات پائے جاتے تھے۔

حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بعثت سے قبل عبادت کے چار تصورات

1۔ مشرکین مکہ کی عبادت کا تصور: ان کے نزدیک خالق کائنات کی حیثیت ایسے تھی جیسے ایک سلطنت کا بادشاہ ان کا خیال یہ تھا کہ سلطنت کا قانون صرف بادشاہ کی زبان ہوتی ہے وہ جو کہہ دے اور جس بات کا حکم دے دے وہ قانون بن جاتا ہے اور اس سلطنت میں محفوظ زندگی کی ضمانت بادشاہ کی رضامندی ہے۔ وہ جب تک رعایا سے خوش ہے تو رعایا کو انعام و کرام سے نوازتا ہے اور جب وہ ان سے ناراض ہوتا ہے تو انھیں سزائیں دیتا ہے۔ اور اس کی رضامندی کا حصول اس کی تعریف وستائش اور اس کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونا، اس کی چاکری کرنا اور ہر ممکن طریقے سے اس کو خوش رکھنے میں ہے۔ ظاہر ہے یہ سارے اعمال صرف بادشاہ کے سامنے کے ہیں، جب رعایا کا کوئی فرد بادشاہ کے سامنے ہوتا ہے تو یہ سارے اعمال بجالاتا ہے اور جب بادشاہ کی نگاہوں سے اوجھل ہوتا ہے تو اب وہ اپنی مرضی کا مالک ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ بادشاہ اس کے حال سے واقف نہیں ہے۔ اب اس کے سامنے بادشاہ کی رضامندی کی صرف ایک صورت ہے کہ مقامی طور پر جن لوگوں کو اس نے اپنے نمائندے مقرر کر رکھا ہے انھیں خوش رکھا جائے اور انھیں کوئی شکایت کا موقع نہ دیا جائے چنانچہ انہی تصورات کے تحت وہ اللہ تعالیٰ کو بادشاہ سمجھ کر اس کے چند لگے بندھے رسم ورواج اور پوجا پاٹ کر طریقوں کو بجالاتے تھے۔ بیت اللہ کا طواف کرتے سال بہ سال حج کر لیتے، اس کے غصے کو بڑھکنے سے روکنے کے لیے قربانیاں کرتے اور ان بتوں کی پوجا کرتے تھے جن کو یہ سمجھتے تھے کہ اللہ کی مرضی میں انھیں بھی دخل ہے۔

2۔ عبادت کا دوسرا تصور ہمارے قریبی ہمسائے ہندوؤں اور انہی سے نکلنے والے بدھ مت کا تھا ان کے تصور کے دو پہلو ہیں۔ ایک پہلو تو وہ ہے جو مشرکین مکہ کے یہاں پایا جاتا ہے اور ان کے نزدیک بھی اللہ تعالیٰ ایک بادشاہ ہے جسے لگی بندھی رسموں کو ادا کرنے اور بعض قربانیاں پیش کرنے سے خوش کیا جاسکتا ہے۔ زندگی کے معاملات سے اس کا کوئی تعلق نہیں اور دوسری طرف وہ اللہ کی بندگی کو اس قدر بلند اور عظیم سمجھتے تھے کہ اس کا حق دنیا میں رہ کر، دنیا کے معاملات میں شریک ہو کر ادا ہی نہیں کیا جاسکتا اس لیے ترک دنیا یعنی دنیا کو چھوڑ دینا ضروری ہے دنیا ان کے نزدیک ایک آلودگی اور گندگی کا نام ہے۔ جس میں آلودہ ہو کر اللہ کو پکارا نہیں جاسکتا چنانچہ اس لیے ان کے یہاں

عبادات کا عظیم تر تصور جو گی ازم کی شکل میں ظاہر ہوا۔ چنانچہ ان کے مذہبی لوگ جب گیان حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے تو وہ تارک الدّنیا ہو کر پہاڑوں یا جنگلوں میں جا بیٹھتے، اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ جسمانی راحتوں سے دور رکھتے، شادی بیاہ کا تصور ان کے یہاں ممنوع ٹھہرتا اور کم سے کم کھانے پر اکتفا کر کے وہ اپنے نفس کی پاکیزگی کا سامان کرتے اور اس کو وہ عبادت سمجھتے تھے۔

3۔ عبادت کا تیسرا تصور ہم عیسائیوں میں دیکھتے ہیں عیسائیت پر بھی بعض محققین کے نزدیک ہندوازم کا اثر ہے، اس لیے انھوں نے اسی جوگیانہ تصور کو رہبانیت کے نام سے اختیار کیا اور ترک دنیا کو انتہائے بندگی کی علامت سمجھ کر اختیار کر لیا بلکہ ان کے نزدیک تو ہندوازم سے زیادہ ترک دنیا کا رجحان پایا جاتا ہے جس کو انھوں نے رہبانیت کا نام دیا ہے اس لیے ان کے یہاں جو خدا رسیدہ لوگ سمجھے جاتے تھے ان کا تارک الدنیا ہونا یعنی راہب ہونا ضروری تھا اور ایسے ہی لوگوں کی ان کے یہاں قدر و منزلت تھی اور دوسری بات ان کے یہاں ہندوؤں کی طرح ہی یہ بھی نظر آتی ہے کہ وہ اللہ کو دوسرے مشرکین کی طرح انسانی دسترس سے بہت بلند سمجھتے تھے اس لیے وہ یہ ناممکن جانتے تھے کہ انسانوں کی بندگی اور ان کی دعائیں براہ راست بھی اللہ تعالیٰ تک پہنچ سکتی ہیں اس لیے وہ خدا اور بندے کے درمیان واسطوں کے تصور کو ضروری خیال کرتے تھے مشرکین مکہ کے یہاں کاہنوں کا تصور، ہندوؤں کے یہاں برہمنوں کا تصور اور عیسائیوں اور یہودیوں کے یہاں مذہبی رہنماؤں کا تصور اسی تصور کا نتیجہ ہے؟ انھیں اس بات کا یقین تھا کہ جب تک درمیان کے واسطوں کو خوش نہیں رکھا جائے گا اور انہی کے حوالے سے جب تک اللہ تعالیٰ سے رابطہ نہ کیا جائے گا اس وقت تک اللہ تعالیٰ خوش ہو سکتا ہے اور نہ ہماری بندگی اس تک پہنچ سکتی ہے۔

4۔ چوتھا تصور یہود کا ہے وہ اگرچہ نسبتاً اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اس کی صفات کے فہم میں ان تمام اہل مذاہب سے بہتر تھے لیکن درمیانی رابطوں کا تصور ان کے یہاں بھی پایا جاتا ہے اور یہ بھی تابوت سکینہ اور اولاد ہارون (علیہ السلام) کو واسطہ بنائے بغیر اللہ تعالیٰ کے تشریعی اور تعبدی تعلق کو ناممکن سمجھتے تھے حتیٰ کہ حلت و حرمت کا اختیار بھی انھوں نے اپنے مذہبی راہنماؤں کو دے رکھا تھا۔ اس لیے قرآن کریم نے واضح طور پر یہ ارشاد فرمایا کہ انھوں نے اپنے احبار اور اپنے رہبان کو رب بنا رکھا ہے۔

یہ تھے عبادت کے وہ تصورات جو حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بعثت کے وقت دنیا میں موجود تھے جنھیں خلاصے کے طور پر یوں کہا جاسکتا ہے کہ عبادت ان کے یہاں مندرجہ ذیل نکات پر مشتمل تھی۔

1۔ اللہ تعالیٰ کو ایک بادشاہ تصور کر کے چند وقتی مراسم بجالانا۔

2۔ دنیوی معاملات میں اللہ تعالیٰ کو دخیل نہ سمجھنا۔

3۔ اللہ تعالیٰ اور بندے کے تعلق کو دونوں کے درمیان ایک پرائیویٹ معاملہ سمجھنا۔

4۔ انسان براہ راست اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا نہیں کر سکتا اس لیے درمیانی واسطوں کو ضروری سمجھنا۔

5۔ خدارسیدہ بننے کے لیے ترک دنیا یعنی رہبانیت اختیار کرنا کیونکہ دنیا ایک آلودگی ہے۔ اس آلودگی میں مبتلا شخص اللہ تعالیٰ سے قرب کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

(تفسیر روح القرآن۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی)

جزا۔ بدلے کا دن۔ لوگوں کو بدلہ ملے جن لوگوں پر دنیا میں ظلم ہوا تھا۔ جو دنیا میں مظلوم تھے ان کو بھرپور حق دلوائے۔ اور نماز ظالم کی پکڑ ہو۔ یہ بھی تو رحم ہی کا تقاضہ ہے۔ اگر بچے پر کوئی ظلم کرتا ہے۔ ماں حتی الامکان کوشش کرتی ہے کہ اس کا بدلہ لے لے۔ تو اگر اللہ کے بندوں پر کسی نے ظلم کیا اور پھر ان کی پکڑ ہی نہ ہو ظلم کرنے والوں کی۔ تو پھر یہ اللہ کا رحم کیسے ہوا۔ تو اللہ کے رحم کا تقاضہ ہے کہ ایک دن ایسا آئے جس میں ان لوگوں کو سزا ملے جنھوں نے اللہ کے بندوں کو ستایا تھا۔ ناحق ان کو تکالیف میں مبتلا کیا تھا۔ ظلم و ستم کے پہاڑ ان پر توڑے تھے۔ ظالم کی پکڑ ہو۔ اس سے پوچھ ہو۔ کہ اس نے ظلم کیوں کیا تھا۔ آخرت کا آنا آخر اتنا کیوں ضروری ہے۔ دیکھیں کہ دنیا میں کچھ طبعی قوانین ہیں جو کہ نافذ العمل ہیں۔ مثال کے طور پر کسی کو نیزہ چبھوئیں تو تکلیف محسوس ہوگی۔ یا کوئی سوئی چبھویں تو انسان تکلیف محسوس کرے گا۔ ہو سکتا ہے کہ بہت زور سے چبھویا جائے اور کوئی زخم بھی پڑ جائے۔ آنکھوں سے نظر آئے۔ یہ بھی تکلیف ہے۔ اور مثال کے طور پر کوئی طعنہ دے۔ تو تکلیف تو اس نے بھی پہنچائی۔ زخم تو اس نے بھی لگایا۔ لیکن دنیا میں نظر تو نہیں آتا۔ کسی نے طنز کیا۔ تکلیف تو اس نے بھی پہنچائی۔ بعض دفعہ ہو سکتا ہے کہ جو نیزے کا زخم ہے وہ بھر جائے۔ لیکن جو طعنے کا زخم لگتا ہے وہ نہیں بھرتا۔ کہاوت ہے کہ تلوار کا گھاؤ بھر جاتا ہے۔ زبان کا گھاؤ نہیں بھرتا۔ زبان اتنی اذیت پہنچا دیتی ہے کہ وہ جو طعنے کی تکلیف پہنچی اب اس کا ازالہ کون کرے گا۔ تو ہم دیکھتے ہیں

کہ یہ ازالہ نہیں ہوتا یہاں پر۔ جو مورل لاز ہیں اخلاقی قوانین ہیں نافذ العمل نہیں ہیں دنیا میں۔ دنیا میں ہم مالٹے کا بیج بوتے ہیں۔ تو اس سے مالٹے ہی نکلتے ہیں۔ کبھی کڑوے کریلے اس پر نہیں لگے۔ لیکن عمل کے لحاظ سے ہم دیکھیں کہ میٹھا پھل پر خلوص بات کے نتیجے میں ممکن ہے کہ نتیجہ میٹھا نہ نکلے۔ پر خلوص بات کے نتیجے میں مٹھاس انسان کو نہ ملے۔ return میں۔ ہم سب یہ بات جانتے ہیں کہ ایمانداری سے کام کرنا چاہیے۔ یہ سلوگن ہے۔ honesty بہت اچھی چیز ہے۔ ٹھیک ہے یہ ایمانداری ہونی چاہیے۔ لیکن ضروری نہیں ہے کہ ایمانداری سے تجارت کرنے والا تاجر امیر ہو جائے۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی بے ایمانی کرنے والا۔ ملاوٹ کرنے والا زیادہ دولتمند ہو۔ جھوٹ بولنے والے سے لوگ خوش رہیں۔ اور سچ بولنے والے سے ناراض ہو جائیں۔ تو پتہ چلا کہ یہاں ضروری نہیں کہ اچھائی کا بدلہ ضرور ہی اچھائی میں نکلے دنیا میں۔ اور برائی کا بدلہ ضروری نہیں کہ برا نکلے یہاں یہ سب باتیں انسان کو سوچنے پر مجبور کرتی ہیں کہ دنیا میں تو انصاف نہیں ہے۔ this is not fair۔

لیکن اللہ کی جب شان پر انسان غور کرتا ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ یہ اللہ کی شان کے خلاف ہے کہ اللہ بے انصافی سے کام لے۔ انصاف تو ہونا چاہیے۔ تو عقل ہماری intellect اس بات کا تقاضہ کرتی ہے کہ ایک وقت آئے جب انصاف کے ساتھ فیصلے ہوں۔ اچھائی کا نتیجہ اچھا نکلے۔ اور برائی کا نتیجہ برا نکلے۔ یہ یہاں پر بتا دیا۔ ملک یوم الدین۔ کہ ہاں ایک دن آئے گا جب فیصلے کئے جائیں گے۔ جب بدلے دیئے جائیں گے۔ تو ہمارا نقطہ نظر clear کر دیا گیا۔ کہ دنیا دار الجزاء نہیں ہے۔ یہ بدلہ ملنے کی جگہ نہیں ہے۔ یہ دراصل دارالامتحان ہے۔ یہاں تو سب کو ٹیسٹ کیا جا رہا ہے۔ بدلہ تو قیامت کے دن ملے گا۔ اللہ بدلہ دے گا۔ اللہ مالک ہے۔ اللہ اس دن جج ہو گا۔ ایک جج میں کیا خوبیاں ہیں جو کہ ہونی چاہئیں۔ انصاف کرنے والا۔ اس کے اندر کوئی تعصب نہ ہو۔ جج بعض دفعہ غلط فیصلہ اس لیے بھی کر جاتے ہیں کہ جو ثبوت ان تک پہنچا ہوتا ہے وہ صحیح نہیں ہوتا۔ غلط ہوتا ہے۔ جس نے جو علم ان تک پہنچا دیا اس کی روشنی میں وہ فیصلے کر لیتے ہیں۔ اس لیے کہ ان کا اپنا علم تو بہت محدود ہے۔ جو ان کو بتا دیا جاتا ہے۔ ان کا انحصار تو دوسرے کے علم پر ہوتا ہے کہ جو ہمیں بتائیں گے اسی حساب سے ہم فیصلے کریں گے۔

چلیں صحیح علم بھی اگر پہنچ گیا کسی جج کے پاس تو وہ اپنے فیصلے کو نافذ نہیں کر سکتا۔ پاور نہیں ہوتی۔ کوئی اور زیادہ اقتدار رکھنے والا۔ زیادہ پاور رکھنے والا آ کر اس فیصلے کو نافذ ہونے سے روک دیتا ہے۔ تو اگر ہم اپنے مقدمے کا فیصلہ کرانا

چاہیں۔ ہم چاہیں گے کہ وہ جج متعصب نہ ہو۔ اس کے پاس مکمل علم ہو۔ اور وہ ساتھ ہی ساتھ اپنے فیصلے کو نافذ کرنے کی طاقت بھی رکھتا ہو۔ یعنی علیم ہو اور قدیر ہو۔ تو اللہ العلیم القدیر۔ کوئی ان پر دباؤ نہیں ڈال سکتا۔ کوئی اللہ کو مجبور نہیں کر سکتا کہ اس سے کوئی زبردستی فیصلہ کروالے۔ اور قیامت کے دن مجرم چھوٹ جائیں۔ اور بے گناہ پکڑے جائیں۔ سورۃ حج 56 میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: الملک یومئذ للہ یحکم بینھم۔ اس دن سارا اختیار اللہ ہی کے لیے ہو گا۔ وہی ان کے درمیان فیصلہ کرے گا۔ انصاف کے ساتھ فیصلہ کرے گا۔ تو قیامت کا دن دراصل بدلے کا دن ہے۔ اگر یہی بات ہم سمجھ جائیں۔ بہت کچھ ہمارے عمل پر اس کا اچھا اثر پڑے۔ ہم سب قیامت کے دن کو مانتے ہیں۔ مسلمان ہونے کے ناطے۔ لیکن تصور ایسا آتا ہے کہ وہ قیامت کا دن جو ہے کوئی grand get together کا سا دن ہو گا۔ سب اکٹھے ہوں گے۔ بات چیت۔ سب سے ملاقات۔ chit chat۔ اور سب کے لیے اناؤنسمنٹ ہو جائے گی کہ اب آپ سب لوگ جنت میں تشریف لے چلیے۔ تو ہم کہتے ہیں کہ قیامت آئے گی۔ لیکن یہ سوچ کر ہمارا دل ہلتا نہیں۔

اس لیے کہ ہم نے سوچا نہیں کہ ہم اپنے اعمال کے جواب دیں گے۔ نفسا نفسی کا عالم ہو گا۔ سوائے اپنے آپ کے کوئی کسی کی فکر نہیں کرے گا۔ تو یہ ہے بدلے کا دن۔ ایک ایک چیز دکھادی جائے گی۔ فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ۔ جس نے ذرے کے برابر بھی نیکی کی ہوتی دیکھ لے گا۔ و من یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ۔ جس نے ذرے کے برابر بھی برائی کی ہوگی دیکھ لے گا۔ پل پل کا حساب کتاب چکا جائے گا۔ یہ احساس ہی انسان کو محتاط بنادے گا۔ ہو نہیں سکتا کہ وہ سوچے time to kill۔ میں بور ہو رہی ہوں۔ کیسے وقت گزاروں۔ کبھی یہ اٹھالیا۔ کبھی وہ اٹھالیا۔ یا زبان اب اللہ نے دے دی ہے جو مرضی بولتی رہوں۔ نہیں۔ حساب دینا ہو گا یا کان اللہ نے دے دیئے اب جو چاہے میں سنتی رہوں۔ حساب دینا ہو گا۔ accountability۔ جو نعمتیں ملی ہیں ان سب کا حساب ہو گا۔

احساس ذمہ داری انسان میں آجاتا ہے۔ کسی نے کہا کہ اگر قیامت ہے نہیں۔ مثال کے طور پر۔ نہیں آئے گی قیامت تب بھی انسان کو اس کی ضرورت ہے۔ اپنے لیے اس کو وہ ایجاد کرے۔ کہے کہ ہاں آئے گی قیامت۔ تاکہ وہ درست زندگی گزار سکے۔ تو انسان کی یہ اپنی ضرورت ہے۔ اس کو درست عمل پر رکھنے کے لئے۔ کہ قیامت آئے۔ صرف دنیا کے قوانین کی وجہ سے وہ نیک عمل نہ کرے۔ بلکہ اللہ کی پکڑ کے ڈر سے وہ نیکی کرے۔ اختیاری طور پر نیکیاں

کرے۔ کہ اگر نہیں کیں تو میری شامت آئے گی قیامت کے دن۔ ہو سکتا ہے کہ دنیا کا کوئی قانون مجھ کو نہ پکڑے۔ طعنہ دینے پر کیا سزا ہے۔ طنز کرنے پر کیا سزا ہے۔ غیبت کرنے پر کیا سزا ہے۔ کسی کو جیل ہوئی نہیں۔ تو پھر آخر کوئی کیوں غیبت سے رکے۔ کوئی طعنہ کیوں نہ دے کوئی طنز کیوں نہ کرے۔ یہ ڈر ہے پکڑ کا اللہ کی۔ اللہ پکڑے گا۔ قیامت کے دن شامت آجائے گی۔ اس لیے نہیں کرتا انسان۔

تو ایک مطلب دین کا ہم نے دیکھا بدلے کا دن۔ اور ایک اور اس کا پہلو دیکھتے ہیں۔ لفظ دین میں دال کے نیچے زیر ہے۔ اس سے ملتا جلتا ایک لفظ ہے دَین۔۔ اس میں دال پر زبر ہے۔ دَین عربی زبان میں قرض کو کہتے ہیں۔ کسی سے ادھار چیز جب ہم لیتے ہیں تو وہ چیز ہمیں لوٹانی بھی تو ہوتی ہے۔ واپس بھی تو کرنی ہوتی ہے۔ تو جو کچھ اللہ نے ہمیں دیا۔ امانت کی طرح ہے۔ اپنی ذاتی چیز نہیں ہے۔ یہ نہیں کر سکتے کہ کسی سے قرض لیا ہو یا امانت اس کی ہو۔ اور انسان اس کو ادھر ادھر اڑا کر ضائع کر دے۔

اب دنیا کے اینگل سے اس کو دیکھیں۔ مثال کے طور پر قیامت نہیں ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں۔ کہ کوئی قیامت نہیں آنی۔ کوئی accountibiglity نہیں ہے۔ ہم نہیں مانتے۔ چلو نہیں آئے گی۔ نکال دیں آخرت کے تصور کو۔ بس دنیا ہی دنیا ہے۔ اس دنیا کے علاوہ کوئی اور حیات ہے ہی نہیں۔ کوئی اور دنیا آنی ہی نہیں۔ اب دنیا کو دیکھتے ہیں۔ ایک شخص ہے محل میں رہ رہا ہے ہم کہتے ہیں نا کہ سونے کا چمچ لے کر پیدا ہوا۔ اس نے ہاتھ پاؤں بھی ہلائے۔ کوئی محنت نہیں کوئی مشقت نہیں لیکن دولت اتنی ہے کہ سات پشتیں بھی اس کی کھالیں تو ختم نہ ہو۔ محلوں میں رہتا ہے۔ بہت آرام سے رہتا ہے۔ اس کے برعکس ایک شخص ہے کمر توڑ محنت کرتا ہے۔ لیکن بمشکل شام کو وہ ایک وقت کی روٹی خود بھی کھا سکتا ہے اور اپنے گھر والوں کو بھی کھلا سکتا ہے۔ تو کیا یہ انصاف ہے۔ unfair ہے۔ تو اگر صرف دنیا ہی دنیا ہوتی تو یہ بہت unfair تقسیم ہے۔ لیکن اگر آخرت کے تصور کو ہم لے آئیں کہ یہ دنیا سب کچھ نہیں ہے۔ اصل زندگی آخرت کی زندگی ہے۔ ہر چیز بالکل صحیح خانے کے اندر جا کر فٹ ہو جاتی ہے۔ کہ اللہ سب کو آزما رہا ہے۔ اب یہ ہو گا کہ آخرت میں جس کو آنکھیں دی تھیں ان سے آنکھوں کا حساب ہو گا۔ اور جو دنیا میں اندھا تھا۔ اس سے تو آنکھوں کا حساب ہی نہیں ہونا۔ ہلکا چھٹ گیا۔ lightly اس کو تو چھوڑ دیا جائے گا۔ جس کو عقل دی تھی اس سے حساب ہو گا۔ جس کا I Q 70 تھا۔ اس سے I Q70 کا حساب لیا جائے گا۔ کہ تم نے کیا کیا۔ اور جس کا I Q170 تھا

اس سے I Q170 کا حساب لیا جائے گا۔ کہ ہم نے تمہیں اتنی عقل دی تھی۔ اتنا عقلمند بنایا تھا۔ بتاؤ تم نے اپنی عقل سے کیا کام کیا۔ اور جو بالکل ہی پاگل ہے۔ جس کا کوئی I Q نہیں۔ اس کا تو کوئی حساب نہیں۔ اس لیے کہ وہ سوچ ہی نہیں سکتا۔ عقل ہی نہیں اس کے اندر تو۔ جیسے دنیا میں آپ نے air travel کیا ہو۔ تو جو 6 سوٹ کیس یا دس سوٹ کیس لے کر آتا ہے اس کا کتنا لمبا چوڑا کسٹم ہوتا ہے۔ اور جس کے پاس صرف ایک ہینڈ بیگ ہے۔ وہ گرین چینل سے نکل کر جلدی جلدی پہنچ جاتا ہے۔ اپنی منزل اپنے گھر کو۔ روایات میں مضمون آتا ہے کہ غریب امیروں کے مقابلے میں 500 سال پہلے جنت میں پہنچ جائیں گے۔ 500 سال پہلے تو کتنا اچھا بدلہ ہے 70-80 سال کی غربت کا۔ کہ جن کو اللہ نے یہاں کروڑوں کروڑوں روپیہ دیا تھا۔ وہ ابھی اپنا حساب کتاب دے رہے ہوں گے۔ ابھی ان کا فیصلہ نہیں ہوا ہو گا۔ اور غریبوں کے پاس تھا ہی نہیں کروڑوں۔ وہ آرام سے پہلے ہی جنت میں چلے جائیں گے۔ تو لہٰذا نعمتوں والے اترانے کے بجائے شو آف کرنے کے بجائے تکبر میں pride میں مبتلا ہونے کے بجائے، ذمہ داری کے بوجھ تلے دبے رہیں۔ دنیا بدلہ ملنے کی جگہ نہیں ہے۔ بدلہ ملنے کی جگہ آخرت ہے۔ دنیا تو کام کرنے کی جگہ ہے۔ دارالعمل ہے۔ یہاں تو کام کرنا ہے خوب دل لگا کر انسان وہ کام کرے جو اللہ نے اس کے سپرد کر دیئے ہیں۔ جو ذمہ داریاں اللہ نے اسے دے دی ہیں ان ذمہ داریوں کے ادا کرنے کی کوشش کرے۔ دنیا میں بھی لوگ نوکریاں کر رہے ہوتے ہیں۔ اپنی job میں بے حد مصروف ہوتے ہیں۔ بے حد محنت کر رہے ہوتے ہیں۔ تو ان کو تو کوئی بے چارہ نہیں کہتا۔ پتہ ہے کہ مہینے کے آخر میں ان کو بدلہ مل جائے گا۔ تنخواہ مل جائے گی۔ جو نوکری نہیں کر رہے ہوتے ان کو بے چارا سمجھا جاتا ہے۔ unemployed۔ اور جو employed ہوتے ہیں وہ بھی خود کو مصیبت میں مبتلا نہیں سمجھتے نوکری کر کے۔ کہ مجھ کو تو انھوں نے ceo ہی بنا دیا۔ ڈائریکٹر ہی بنا دیا کیا مصیبت آگئی۔ یہ تو نہیں کہتے وہ۔ جس کے پاس نوکری نہیں ہوتی وہ اپنے آپ کو مصیبت میں مبتلا سمجھتا ہے تو یہ جو بدلے کا یقین ہے۔ اور جو اس بدلے کو نظر میں رکھ کر دنیا میں عمل کر رہے ہوتے ہیں۔ کبھی اپنے آپ کو مصیبت زدہ نہیں سمجھتے۔ کبھی اپنے آپ کو بے چارا نہیں سمجھتے۔ تو بدلے پر یقین نیک اعمال کرنے کو آسان بنا دیتا ہے۔ آج محنت کر رہے ہیں کل بدلہ ملے گا۔ یہ یاد دہانی کرنے کی ضرورت ہے۔ ایک ایک لمحہ۔ ایک ایک ذرہ۔ ایک ایک کلمہ۔ چھوٹی سے چھوٹی چیز کا بھی اللہ بدلہ دے دے گا۔ جو بھی اس کی راہ میں کوشش کی ہو گی۔ تو پھر انسان عمل پر جم جاتا ہے۔ مشکلات اس کو ہٹاتی نہیں۔ سوچتا ہے مشکلات تو اپنے لیے

اٹھا رہا ہوں۔ اللہ بدلہ دے گا۔ دنیا میں چاہے کچھ بھی بدلہ نہ ملے۔ کوئی return نہ ملے۔ کوئی تعریف نہ ہو لیکن انسان اللہ کی خاطر عمل کرتا رہتا ہے۔ اور یہ سب سے اچھا motivation ہے۔ سب سے اچھا جذبہ محرکہ ہے کہ انسان اپنے رب کو راضی کرنے کی خاطر نیکی کرے۔ کسی صلے کے لیے نہیں۔ تو بدلے کا یقین جہاں نیکیاں کرنے کو آسان کر دیتا ہے۔ وہاں گناہ کرنا بڑا بھاری اور بڑا مشکل ہو جاتا ہے۔ چاہے اس گناہ کے بدلے ساری دنیا مل جانے کی امید ہو۔ اور ساری دنیا کے لوگوں کی رضا مل جانے کی امید ہو۔ لیکن اگر وہ کام میرے رب کو ناراض کرنے والا ہے۔ وہ کام بھاری ہو جائے گا۔ مشکل ہو جائے گا۔ ہمارے قدم ایک ایک من کے ہو جائیں گے۔ وہ کام ہو نہیں سکے گا کہ اس کا بدلہ مجھے ملے گا۔ میں یہ کام کر نہیں سکتی۔ تو دین اور دین یہ بھی ملتے جلتے لفظ ہیں۔

دین یہاں سورۃ الفاتحہ میں تو بدلے کے معنوں میں آیا ہے۔ جزا کے دن کا مالک۔ لیکن اس کا صرف یہ ایک مطلب نہیں ہے دین کا۔ انشاء اللہ ہم جب آگے قرآن پڑھیں گے تو اس لفظ دین کے اور بھی مطلب پڑھیں گے۔ دین کے جو اور مطلب ہیں وہ ہیں اطاعت obedience۔ اور دین کا مطلب ہوتا ہے قانون law۔ وہ اگر ہم بدلے کو اور اطاعت کو اور قانون کو جمع کرنے کی کوشش کریں تو یہ تصویر ہمارے سامنے آتی ہے۔ کہ قانون اس لیے دیا جاتا ہے۔ کہ اس کی اطاعت کی جائے۔ جو اطاعت کرتے ہیں ان کو اچھا بدلہ دیا جاتا ہے۔ اور جو قانون کی نافرمانی کرتے ہیں ان کو سزا دی جاتی ہے۔ تو یہی دراصل قیامت کے دن ہونا ہے۔ ملک یوم الدین۔ اللہ تنہا روز جزا کا مالک ہے۔ جو عمل خالص اللہ کی رضا اور اس کے بتائے ہوئے طریقے پر کیے گئے ہوں گے وہی کام آئیں گے۔ اور جو عمل کسی اور کو راضی کرنے کے لیے کیے گئے ہوں گے تو ایسے لوگوں کو قیامت کے دن کہہ دیا جائے گا کہ جاؤ اور ان سے جا کر اپنا بدلہ لے لو۔ تو ظاہر ہے کہ کوئی کسی کو کیا بدلہ دے سکتا ہے۔ تو یہ ہمیں اپنی نیت کو خالص کرنا ہے کہ اللہ ہم صرف اور صرف تیری رضا کے لیے تیرا کلام پڑھ رہے ہیں۔ اور صرف تیری رضا حاصل کرنے کے لیے محنت کر رہے ہیں۔ ہمیں کسی اور سے کوئی اور اس وقت مطلب نہیں۔ تو فرمایا۔ مالک یوم الدین۔

(تفسیر تنویر۔ زاہدہ تنویر)

عبادت کیا ہے؟

آپ کو لغت و تفسیر کی ساری کتابوں میں اس کا یہ معنی ملے گا۔ اقصی غایۃ الخضوع والتذلل یعنی حد درجہ کی عاجزی اور انکسار۔ مفسرین اس کی مثال سجدہ سے دیتے ہیں۔ حالانکہ صرف سجدہ ہی عبادت نہیں بلکہ حالت نماز میں تمام حرکات وسکنات عبادت ہیں۔ ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونا، رکوع اور رکوع کے بعد ہاتھ چھوڑ کر کھڑے ہونا، سجدہ اور اس کے بعد حالت التحیات میں دوزانو بیٹھنا، سلام کے لیے دائیں بائیں منہ پھیرنا۔ یہ سب عبادت ہیں اگر عبادت صرف تذلل وانکسار کے آخری مرتبہ کا نام ہے اور یہ آخری مرتبہ سجدہ ہی ہے تو کیا یہ باقی چیزیں عبادت نہیں۔ اس کا تو تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اور اگر یہ ساری چیزیں مطلقاً عبادت ہیں تو اگر کوئی شاگرد اپنے استاد کے سامنے اور بیٹا اپنے باپ کے سامنے دوزانو ہو کر بیٹھتا ہے یا ان کی آمد پر کھڑا ہو جاتا ہے تو کیا یہ کہنا درست ہو گا کہ اس نے اپنے استاد یا باپ کی عبادت کی اور ان کو اپنا معبود بنالیا۔ حاشا وکلا۔ پھر وہ کونسی چیز ہے جو ان حرکات وسکنات کو اگر یہ نماز میں ہوں تو عبادت بنادیتی ہے اور یوں کھڑے ہونے کو (ہاتھ باندھے یا کھولے ہوئے) اور اس طرح بیٹھنے کو اور دائیں بائیں منہ پھیرنے کو تذلل وانکسار کے آخری مرتبہ پر پہنچا دیتی ہے۔ اور اگر یہی امور نماز سے خارج ہوں تو نہ ان میں غایتہ خضوع ہے اور نہ یہ عبادت متصور ہوتے ہیں۔ تو اس کا ممیز ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ جس ذات کے لیے اور جس کے سامنے آپ یہ افعال کر رہے ہیں اس کے متعلق آپ کا عقیدہ کیا ہے۔ اگر آپ اس کو اللہ اور معبود یقین کرتے ہیں تو یہ سب اعمال عبادت ہیں اور سب میں غایتہ تذلل وخضوع پایا جاتا ہے لیکن اگر آپ اس کو عبد اور بندہ سمجھتے ہیں نہ خدا، نہ خدا کا بیٹا، نہ اس کی بیوی، نہ اس کا اوتار تو یہ اعمال عبادت نہیں کہلائیں گے۔ ہاں آپ ان کو احترام، اجلال اور تعظیم کہہ سکتے ہیں۔ البتہ شریعت محمدیہ علی صاحبہا اجمل الصلاۃ واطیب السلام میں غیر خدا کے لیے سجدہ تعظیمی بھی ممنوع ہے۔ یہ سمجھ لینے کے بعد اب یہ بات خود بخود واضح ہو گئی کہ اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کے بغیر کوئی دوسری چیز ایسی نہیں جس کی عبادت شرعاً یا عقلاً درست ہو۔ سب سے بالاتر اور قوی تر وہ، سب کا خالق اور سب کو اپنی تربیت سے مرتبہ کمال تک پہنچانے والا وہ لطف وکرم پیہم مینہ برسانے والا وہ، بندہ ہزار خطائیں کرے لاکھوں جرم کرے اپنی رحمت سے معاف فرمانے والا وہ، اور قیامت کے دن ہر نیک وبد کی قسمت کا فیصلہ فرمانے والا وہ، تو اسے چھوڑ کر انسان

کسی غیر کی عبادت کرے تو آخر کیوں؟ بلکہ اس کے بغیر اور ہے ہی کون جو معبود اور اللہ ہو اور اس کی پرستش کی جائے ؟اسی لیے قرآن نے ہمیں صرف یہی تعلیم نہیں دی کہ نعبدک کہ ہم تیری عبادت کرتے ہیں کیونکہ اس میں یہ احتمال بھی ہے کہ ہم تیری عبادت کرتے ہیں اور تیرے ساتھ اوروں کی بھی۔ بلکہ یہ سبق سکھایا کہ ایاک نعبد۔ صرف تیری ہی ہم عبادت کرتے ہیں اور کسی کی نہیں کرتے مفسرین کرام نے ایاک کو مقدم کرنے میں حصرو تخصیص کے علاوہ دیگر لطائف کا بھی ذکر فرمایا ہے۔ فرماتے ہیں یہاں تین چیزیں ہیں۔ عابد، عبادت اور معبود۔ عارف کو چاہیے کہ اس مقام پر اپنے آپ کو بھی بھول جائے۔ عبادت کو بھی مقصود نہ بنائے بلکہ اس کی نگاہ ہو تو صرف اپنے معبود حقیقی پر تاکہ اس کے انوار جمال و جلال کے مشاہدہ میں استغراق کی نعمت سے سرفراز کیا جائے۔ اس لیے فرمایا ایاک نعبد۔ عابد واحد ہے لیکن صیغہ جمع کا استعمال کر رہا ہے۔ اس میں نکتہ یہ ہے کہ اپنی ناقص عبادت کو مقربین بارگاہ صمدیت کی اخلاص و نیاز میں ڈوبی ہوئی عبادت کے ساتھ پیش کرے تاکہ ان کی برکت سے اس کی عبادت کو بھی شرف پذیرائی نصیب ہو۔

1 • ف یعنی جیسے ہم عبادت صرف تیری ہی کرتے ہیں اسی طرح مدد بھی تجھی سے طلب کرتے ہیں توہی کارساز حقیقی ہے توہی مالک حقیقی ہے ہر کام میں ہر حاجت میں تیرے سامنے ہی دست سوال دراز کرتے ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس عالم اسباب میں اسباب سے قطع نظر کرلی جائے۔ بیمار ہوئے تو علاج سے کنارہ کش، تلاش رزق کے وقت وسائل معاش سے دست بردار، حصول علم کے لیے صحبت استاد سے بیزار۔ اس طریقہ کار سے اسلام اور توحید کو کوئی سروکار نہیں۔ کیونکہ وہ جو شافی، رزاق اور حکیم ہے اسی نے ان نتائج کو ان اسباب سے وابستہ کر دیا ہے۔ اسی نے ان اسباب میں تاثیر رکھی ہے۔ اب ان اسباب کی طرف رجوع استعانت بالغیر نہیں ہو گی۔ اسی طرح ان جملہ اسباب میں سب سے قوی تر اور اثر آفریں سبب دعا ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا عاء یرد القضاء کہ دعا تو تقدیر کو بھی بدل دیتی ہے۔ اور اس میں بھی کلام نہیں کہ محبوبان خدا کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ وہ ان کی عاجزانہ اور نیاز مندانہ التجاؤں کو ضرور شرف قبول بخشے گا۔ چنانچہ حدیث قدسی جسے امام بخاری (رح) اور دیگر محدثین نے روایت کیا ہے میں مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے مقبول بندوں کے متعلق ارشاد فرماتا ہے۔ لان سألنی لاعطینہ ولان استعاذنی لاعیذنہ۔ اگر میرا مقبول بندہ مجھ سے مانگے گا تو میں ضرور اس کا سوال پورا کروں گا۔ اور اگر وہ مجھ سے پناہ طلب

کرے گا تو میں ضرور اسے پناہ دوں گا۔ تو اب اگر کوئی شخص ان محبوبان الٰہی کی جناب میں خصوصا حبیب کبریا علیہ التحیۃ والثناء کے حضور میں کسی نعمت کے حصول یا کسی مشکل کی کشود کے لیے التماس دعا کرتا ہے تو یہ بھی استعانت بالغیر اور شرک نہیں بلکہ عین اسلام اور عین توحید ہے۔ہاں اگر کسی ولی، شہید یا نبی کے متعلق کسی کا یہ عقیدہ ہو کہ یہ مستقل بالذات ہے اور خدا نہ چاہے تب بھی یہ کر سکتا ہے تو یہ شرک ہے اور ایسا کرنے والا مشرک ہے۔ اس حقیقت کو حضرت شاہ عبد العزیز(رح) نے نہایت بسط کے ساتھ اپنی تفسیر میں رقم فرمایا ہے۔ اور اس کا ماحصل مولانا محمود الحسن صاحب نے اپنے حاشیہ قرآن میں ان جامع الفاظ میں بیان کیا ہے:۔

"اس آیت شریفہ سے معلوم ہوا کہ اس کی ذات پاک کے سوا کسی سے حقیقت میں مدد مانگنی بالکل ناجائز ہے۔ ہاں اگر کسی مقبول بندہ کو محض واسطہ رحمت الٰہی اور غیر مستعمل سمجھ کر استعانت ظاہری اس سے کرے تو یہ جائز ہے کہ یہ استعانت در حقیقت حق تعالیٰ سے ہی استعانت ہے۔"

اور اس طرح کی استعانت تو پاکان امت کا ہمیشہ سے معمول رہا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ (رح) جناب رسالت مآب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں عرض کرتے ہیں وانت مجیری من ھجوم ملمۃ اذا انشبت فی القلب شر المخالب۔

بانی دار العلوم دیوبند عرض کرتے ہیں مدد کر اے کرم احمدی کہ تیرے سوا نہیں ہے قاسم بے کس کا کوئی حامی کار

(تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر محمد کرم شاہ الازہری)

"اللہ" کے حضور نمازی غلامانہ انداز میں ہاتھ باندھ کر اور سراپا عجز و انکساری کے ساتھ اس بات کا اقرار اور اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہے کہ اے اللہ! تو ہی میرا معبود ہے اس لیے میں تیری ہی عبادت کرتا ہوں۔ اس میں نہ کسی کو سہیم سمجھتا ہوں اور نہ کسی کو آپ کے ساتھ شریک کرتا ہوں۔ نمازی یہ عہد و اقرار ابتداءً قیام کی حالت میں اور آخر میں تشہد میں بیٹھ کر کرتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ ابتدا میں اس نے جامع الفاظ میں اقرار کیا تھا اور تشہد میں فقیروں کی طرح دامن پھیلا کر عرض کرتا ہے کہ میری تمام مناجات و عبادات اور نذر و نیاز اللہ وحدہ لا شریک کے لیے ہیں۔

(اَلتَّحِيَّاتُ لِلّٰهِ وَالصَّلَوٰتُ وَالطَّيِّبٰتُ)[رواہ البخاری: باب التَّشَهُّدِ فِي الآخِرَةِ]

"ہمہ قسم کی لسانی 'بدنی اور مالی عبادات اللہ ہی کے لیے ہیں"۔

یہی وہ مطالبہ ہے جو رسالت مآب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی زبان اطہر سے کروایا گیا ہے۔ اس میں یہ تقاضا بھی کیا گیا ہے کہ اللہ کی عبادت نہایت اخلاص اور بلا شرکت غیرے ہونی چاہیے۔

(قُلۡ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحۡيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ ٱلۡعَٰلَمِينَ ۔ لَا شَرِيكَ لَهُۥۖ وَبِذَٰلِكَ أُمِرۡتُ وَأَنَا۠ أَوَّلُ ٱلۡمُسۡلِمِينَ ۔) (الانعام:۱۶۳۔۱۶۴)

”آپ اعلان کریں! یقیناً میری نماز، میری قربانی، میری زندگی اور میری موت اللہ رب العالمین کے لیے ہے اس کا کوئی شریک نہیں اسی بات کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور میں سب سے پہلے سر تسلیم خم کرنے والا ہوں۔“

اس کے بعد مومن دل کی اتھاہ گہرائیوں اور انتہائی عاجزی کے ساتھ عرض گزار ہوتا ہے کہ الٰہی! یہ حاضری اور عاجزی تیری توفیق اور عنایت کا نتیجہ ہے کیونکہ کتنے ہی انسان ہیں جو صحت، فرصت اور تونگری کے باوجود تیری بارگاہ میں حاضر ہونے کی سعادت نہیں پاتے۔ اے اللہ! تیری مدد ہمیشہ میرے شامل حال رہے۔ میرا ایمان ہے کہ تیرے بغیر کوئی میری مدد نہیں کر سکتا۔ لہٰذا میں ہر دم تجھ سے مدد کا طلبگار اور تیری دستگیری کا خواستگار ہوں۔ میرا تیرے حضور یہ عہد ہے کہ میں تجھے مشکل کشا اور حاجت روا سمجھتے ہوئے تجھ ہی سے نصرت و حمایت کا طلبگار رہوں گا کیونکہ تو داتا ہے میں محتاج، تو غنی ہے میں تیرے در کا فقیر، تو بے نیاز ہے میں نیاز مند، تو بادشاہ ہے میں فقیر بے نوا۔ اس لیے میری مدد فرما۔ میں تیری دستگیری اور مدد کے بغیر نہ اپنا ایمان سلامت رکھ سکتا ہوں اور نہ اپنی عزت و جان کی حفاظت کر سکتا ہوں۔

یہی عقیدہ رسول گرامی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے سکھلایا اور اسی عقیدہ کو نماز کے بعد دعا کی صورت میں دہراتے اور مانگتے تھے۔

(اَللّٰهُمَّ لَا مَانِعَ لِمَآ أَعۡطَيۡتَ وَلَا مُعۡطِيَ لِمَا مَنَعۡتَ ۔۔)(بخاری: کتاب الأذان، باب الذکر بعد الصلوۃ)

”اے اللہ! جو چیز تو دے اسے کوئی روکنے والا نہیں اور جو چیز تو نہ دے اسے کوئی دینے والا نہیں۔“

(عَنِ ابۡنِ عَبَّاسٍ (رض) قَالَ كُنۡتُ خَلۡفَ رَسُوۡلِ اللّٰهِ (صلى الله عليه وآله وسلم) يَوۡمًا فَقَالَ يَا غُلَامُ إِنِّيۡ أُعَلِّمُكَ كَلِمَاتٍ احۡفَظِ اللّٰهَ يَحۡفَظۡكَ احۡفَظِ اللّٰهَ تَجِدۡهُ تُجَاهَكَ إِذَا سَأَلۡتَ فَاسۡأَلِ اللّٰهَ وَإِذَا اسۡتَعَنۡتَ فَاسۡتَعِنۡ بِاللّٰهِ وَاعۡلَمۡ أَنَّ الۡأُمَّةَ لَوِ اجۡتَمَعَتۡ عَلَىٰۤ أَنۡ يَنۡفَعُوۡكَ بِشَيۡءٍ لَمۡ يَنۡفَعُوۡكَ إِلَّا

بِشَیۡءٍ قَدۡ کَتَبَہُ اللّٰہُ لَكَ وَلَوِ اجۡتَمَعُوا عَلٰی أَنۡ یَّضُرُّوكَ بِشَیۡءٍ لَمۡ یَضُرُّوكَ إِلَّا بِشَیۡءٍ قَدۡ کَتَبَہُ اللّٰہُ عَلَیۡكَ رُفِعَتِ الۡأَقۡلَامُ وَجَفَّتِ الصُّحُفُ.)

(رواہ الترمذی: کتاب صفۃ القیامۃ والرقائق والورع، باب منہ)

"حضرت عبداللہ بن عباس (رض) بیان کرتے ہیں ایک دن میں رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پیچھے سوار تھا آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: بچے! میں تجھے چند کلمات سکھاتا ہوں۔ اللہ کو یاد رکھنا وہ تجھے یاد رکھے گا، تو اللہ تعالیٰ کو یاد رکھے گا تو اسے اپنے سامنے پائے گا، جب تو سوال کرے تو اللہ ہی سے سوال کر، جب تو مدد طلب کرے تو اللہ تعالیٰ ہی سے مدد طلب کر اور یقین رکھ کہ اگر پوری مخلوق تجھے کچھ نفع دینے کے لیے جمع ہو جائے تو وہ اتنا ہی نفع دے سکتی ہے جتنا اللہ تعالیٰ نے تیرے لیے لکھ رکھا ہے اور اگر وہ تجھے نقصان پہنچانے پر تل جائے تو تجھے اتنا ہی نقصان پہنچے گا جتنا تیرے حق میں لکھا گیا ہے، قلمیں اٹھالی گئیں ہیں اور صحیفے خشک ہو گئے ہیں۔"

(تفسیر فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل)

ایاک نعبد وو ایاک نستعین

{اس آیت شریفہ سے معلوم ہوا کہ اس کی ذات پاک کے سوا کسی سے حقیقت میں مدد مانگنی بالکل ناجائز ہے۔

استعانت و توسل کی تحقیق

مدد ماتحت اسباب

☆ یہ دوسرا مسئلہ کسی سے مدد مانگنے مسئلہ کا ذرا تشریح طلب ہے، کیونکہ ایک مدد تو مادی اسباب کے ماتحت ہر انسان دوسرے انسان سے لیتا ہے، اس کے بغیر اس دنیا کا نظام چل ہی نہیں سکتا، صنعت کار اپنی صنعت کے ذریعہ ساری مخلوق کی خدمت کرتا ہے، مزدور، معمار، بڑھئی، لوہار سب مخلوق کی مدد میں لگے ہوئے ہیں، اور ہر شخص ان سے مدد

لینے پر مجبور ہے، ظاہر ہے کہ یہ کسی دین اور شریعت میں ممنوع نہیں، وہ اس استعانت میں داخل نہیں، جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے، اسی طرح غیر مادی اسباب کے ذریعہ کسی نبی یا ولی سے دعاء کرنے کی مدد مانگنا یا ان کا وسیلہ دے کر براہ راست اللہ تعالیٰ سے دعاء مانگنا روایات حدیث اور اشارات قرآن سے اس کا بھی جواز ثابت ہے، وہ بھی اس استعانت میں داخل نہیں جو صرف اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص اور غیر اللہ کے لیے حرام و شرک ہے۔

مخصوص مدد

اب وہ مخصوص استعانت و امداد جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے اور غیر اللہ کے لیے شرک ہے کونسی ہے اس کی دو قسمیں ہیں، ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی فرشتے یا پیغمبروں یا ولی یا کسی اور انسان کو خدا تعالیٰ کی طرح قادر مطلق اور مختار مطلق سمجھ کر اس سے اپنی حاجت مانگے، یہ تو ایسا کھلا ہوا کفر ہے کہ عام مشرکین بت پرست بھی اس کو کفر سمجھتے ہیں، اپنے بتوں، دیوتاؤں کو بالکل خدا تعالیٰ کی مثل قادر مطلق اور مختار مطلق ی کفار بھی نہیں کہتے۔

دوسری قسم وہ ہے جس کو کفار اختیار کرتے ہیں، اور قرآن اور اسلام اس کو باطل و شرک قرار دیتا ہے، ایاک نستعین میں یہی مراد ہے، کہ ایسی استعانت و امداد ہم اللہ کے سوا کسی سے نہیں چاہتے، وہ یہ ہے کہ اللہ کی کسی مخلوق فرشتے یا پیغمبر یا ولی یا کسی دیوتا کے متعلق یہ عقیدہ رکھنا کہ اگرچہ قادر مطلق اللہ تعالیٰ ہی ہے اور کامل اختیارات اسی کے ہیں، لیکن اس نے اپنی قدرت و اختیار کا کچھ فلاں شخص کو سونپ دیا ہے، اور اس دائرے میں وہ خود مختار ہے یہی وہ استعانت و استمداد ہے جو مومن و کافر میں فرق اور اسلام و کفر میں امتیاز کرتی ہے، قرآن اس کو شرک و حرام قرار دیتا ہے، بت پرست مشرکین اس کے قائم اور اس پر عامل ہیں، مختاط مقام: اس معاملے میں دھوکا یہاں سے لگتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بہت سے فرشتوں کے ہاتھوں دنیوی نظام کے بہت سے کام جاری کرتے ہیں، دیکھنے والا اس مغالطے میں پڑ سکتا ہے کہ اس فرشتے کو اللہ تعالیٰ نے یہ اختیار سپرد کر دیا ہے، یا بہت انبیاء (علیہم السلام) کے ذریعے بہت سے ایسے کام وجود میں آتے ہیں جو عام انسانوں کی قدرت سے خارج ہیں، جن کو معجزات کہا جاتا ہے، اسی طرح اولیاء اللہ کے ذریعے بھی ایسے یہ بہت سے کام وجود میں آتے ہیں، جن کو کرامات کہا جاتا ہے، یہاں سرسری نظر والوں کو یہ مغالطہ لگ جاتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ ان کاموں کی قدرت و اختیار ان کو سپرد نہ کرتا تو ان کے ہاتھ سے یہ کیسے وجود میں آتے؟

اس سے وہ ان انبیاء و اولیاء کو ایک درجے میں مختار کار ہونے کا عقیدہ بنالیتے ہیں حالانکہ حقیقت یوں نہیں، بلکہ معجزات اور کرامات براہ راست حق تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے، صرف اس کا ظہور پیغمبر یا ولی کے ہاتھوں پر ان کی عظمت ثابت کرنے کے لیے کیا جاتا ہے، پیغمبر اور ولی کا اس کے وجود میں آنے میں کوئی اختیار نہیں ہوتا، قرآن مجید کی بیشمار آیات اس پر شاہد ہیں۔

ارشادات اولیاء (وسیلہ کے متعلق)

قرآن پاک میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

یایھا الذین امنوا اتقوا اللہ وابتغوا الیہ الوسیلۃ وجاھدوا فی سبیلہ لعلکم تفلحون۔

(اے ایمان والو! ڈرتے رہو اللہ پاک سے اور ڈھونڈو اس تک وسیلہ اور جہاد کرو اس کی راہ میں تا کہ تمہارا بھلا ہو۔)

ای تقربوا الیہ بطاعۃ والعمل بما یرضیہ۔

یعنی اللہ کا قرب حاصل کرو اس کی فرمان برداری اور رضامندی کے ساتھ۔

آیت کریمہ میں مخاطب مومن ہے۔ پہلا حکم اس کو تقویٰ کا دیا جاتا ہے اس لیے کہ تقویٰ ملاک الحسنات یعنی ساری نیکیوں کی جڑ اور اصل ہے خوف خدا ہی انسان کو برے کاموں سے باز رکھتا ہے۔

دوسرا حکم وسیلہ کا ہے جس کی تفسیر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور تابعین عظام نے طاعت اور عمل صالح سے کی ہے تو جیسا کہ وسیلہ میں ایمان اور عمل صالح داخل ہیں اسی طرح انبیاء و صلحاء کی صحبت و اطاعت بھی داخل ہے فرمان خداوندی ہے۔

یایھا الذین امنوا اتقوا اللہ و کونوا مع الصدقین۔

(اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ رہو۔)

تو انبیاء (علیہم السلام) سچے، صلحاء سچے، تو ان کی معیت واجب اور ان کو وسیلہ بنانا درست اور اسی بنا پر حضرت عمر فاروق (رض) نے حضرت عباس (رض) کو ایک موقع پر بارش کے لیے وسیلہ بنایا تھا اور عرض کیا تھا کہ اے اللہ جب تک تیرے حبیب حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہم میں موجود تھے تو ہم ان کو وسیلہ بناتے تھے، اب ہم ان کے عم

محترم کو وسیلہ بناتے ہیں اس قحط کو دور کر دیجئے اور بارش برسا دیجئے۔ چنانچہ اللہ پاک نے دعا قبول فرمائی اور باران رحمت شروع ہو گیا۔

تیسرا حکم جہاد کا ہے جہاد دو قسم کا ہے ایک جہاد مع الکفار ہے اور دوسرا جہاد مع النفس ہے اور یہ آخری جہاد پہلے سے زیادہ ضروری ہے اور سخت بھی ہے چنانچہ جب ایک بار رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کفار کے خلاف جہاد سے واپس ہوئے تو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے ارشاد فرمایا۔

رجعنا من الجهاد الاصغر الى الجهاد الاكبر۔

"واپس ہوئے ہم چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کی طرف"

اى الجهاد مع النفس یعنی نفس کے ساتھ جہاد کو بڑا فرمایا اور کفار کے ساتھ جہاد کو چھوٹا جہاد فرمایا۔

کافر ایسا دشمن ہے جس کا مقابلہ تیر و تفنگ سے ہو سکتا ہے قلعہ و حصار سے ہو سکتا ہے اور اگر یہ دونوں طریقے کامیاب نہ ہو سکیں تو انسان حفاظت جان کے لیے راہ فرار اختیار کر سکتا ہے۔ لیکن اعدی عدوک نفسک التی بین جنبیک سخت سے سخت دشمن اے انسان تیرا نفس ہے جو تیرے بدن میں ہے اس سے نہ تجھے قلعہ و حصار بچا سکتا ہے نہ تیر و تفنگ، نہ راہ فرار بلکہ اس سے نجات کا ہتھیار اگر ہے تو استغفار ہے۔

حدیث شریف میں ہے کہ رسول اکرام (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے امت سے فرمایا ہے کہ میں نے تم میں دو عظیم الشان نشانیاں چھوڑی ہیں، ایک کتاب اللہ اور دوسری اپنی آل ان دونوں کو مضبوطی سے پکڑو، تم کبھی گمراہ نہ ہو گے کتاب اللہ پر عمل کرنے سے اعمال کی درستی نصیحت و عبرت اور خدا کی مرضی کے مطابق زندگی بسر کرنا نصیب ہو گا اور آل کی متابعت کرنے میں تزکیہ نفس اور تصفیہ باطن حاصل ہو گا اور آل صرف سادات پر منحصر نہیں بلکہ ایک دوسری حدیث شریف میں ہے:

كل تقى نقى فهو الى، یعنی ہر پرہیز گار اور نیکوکار میری آل ہے تو نیکوکار سید ہو یا غیر سید اس کا دامن پکڑنا اور اس کے طریقہ پر چلنا ایسا ہی ضروری ہے جیسے کتاب اللہ کو مضبوطی سے پکڑنا اور اس پر عمل کرنا۔

حضرت شیخ عبد القادر جیلانی (رح) غنیۃ الطالبین میں فرماتے ہیں کہ شروع سے اللہ تعالیٰ نے روحانی تربیت کا سلسلہ اس طرح قائم کیا ہے کہ ایک فیض دیتا ہے اور دوسرا فیض لیتا ہے انبیاء (علیہم السلام) اور ان کے جانشین صحابہ کرام

اور ان کے بعد ان کے تربیت یافتہ حضرات علی ہذاالقیاس یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا اور یہ امر نہایت شاذونادر ہے کہ خداوند قدوس کسی دوسرے کی تربیت کے بغیر مقامات عالیہ تک ترقی دے دے۔ مثال کے طور پر حضرت اویس قرنی (رح) کی ذات اقدس کو لیجئے کہ بیشک ان کو مقامات تو مل گئے لیکن چونکہ صحبت نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) حاصل نہ ہوئی اور رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سینہ اطہر سے بالمشافہ فیض حاصل نہیں کیا تو تابعین کی صف میں آگئے اور اس افضلیت سے محروم رہے جو صحبت کے اثر سے حاصل ہوتی۔

اسی طرح عام انسانوں کی حالت کو مدنظر رکھتے ہوئے شیخ کامل کی ضرورت ثابت ہوتی ہے کیونکہ اکثر یہی ہوا ہے کہ بلا تربیت شیخ کامل کوئی شخص منازل سلوک طے نہیں کر سکتا:

فلا ینبغی لہ ان ینقطع عن الشیخ حتی یتغنی عنہ بالوصول الی ربہ عزوجل۔

یعنی مرید کو شیخ کی خدمت سے اس وقت تک جدانہ ہونا چاہیے جب تک وصول الی اللہ نصیب نہ ہو کیونکہ قدیم سے رسم چلی آتی ہے اور تجربہ اس پر گواہ ہے کہ اندرونی نجاستوں اور غلاظتوں سے پاک صاف ہونا اور نماز کو خشوع وحضور قلب سے ادا کرنا جیسا کہ:

اعبداللہ کانك تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراك۔

(یعنی اللہ کی ایسی عباد کرو گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو اور اگر یہ مقام نصیب نہ ہو تو پھر عبادت میں یہ دھیان کرو کہ اللہ تم کو دیکھ رہا ہے) اور یہی مقام احسان ہے تو بھلا یہ مقام بغیر تربیت شیخ کیسے ہاتھ آئے گا۔ یہ مقام علم کے حاصل کر لینے اور انبار درانبار کتابوں کے مطالعہ کر لینے سے حاصل نہیں ہو سکتا۔

در کنز وہدایہ نہ شناسی تو خدارا

در مصحف دل بیں کہ کتابے بہ ازیں نیست

یعنی کنز وہدایہ کے پڑھنے سے معرفت حق حاصل نہیں ہوتی ہے بلکہ دل کی کتاب میں نظر کرو، معرفت رب کے لیے دل کی کتاب سے بہتر کوئی کتاب نہیں ہے۔

امام شعرانی (رح) نے انور قدسیہ میں شیخ کامل کی پیروی کو واجب لکھا ہے دلیل یہ بیان کی ہے کہ اندرونی نجاستوں کا دور کرنا واجب ہے اور وہ بغیر تربیت شیخ کامل ممکن نہیں پس شیخ کامل کا دامن پکڑنا بھی واجب ہے پھر کہتے ہیں:

ولو تكلف لا ينفع بغير شيخ ولو حفظ الف كتاب،

"اگر انسان خود بخود کوشش کرکے اس مقام کو بلاواسطہ شیخ حاصل کرنا چاہے تو اس کو نفع نہ ہوگا اگرچہ ہزاروں کتابیں حفظ کرلے۔"

مولانائے روم (رح) فرماتے ہیں:

مولوی ہرگز نہ شد مولائے روم
تا غلام شمس تبریزی نہ شد

"یعنی مولانائے روم (رح) کو ناموری اس وقت تک حاصل نہ ہوئی جب تک انھوں نے حضرت شمس تبریز (رح) کی مریدی نہ اختیار کی "اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ علم سینہ ہے علم سفینہ نہیں۔

لہٰذا اے برادران عزیز! کسی شیخ کامل کی تلاش کرلو، اس کے دامن کو پکڑلو تاکہ نفس کے شکار نہ ہو جاؤ، نفس کا ڈاکہ مومن کے ایمان پر ہوتا ہے اور ایمان کی حفاظت فرض ہے اور ایمان کی حفاظت کا وسیلہ شیخ کامل ہے وہ تم کو شریعت پر چلنے کی تلقین کرے گا کتاب وسنت پر لگائے گا اور جب کتاب وسنت دونوں کو مضبوطی سے پکڑے رہوگے تو کبھی گمراہ نہ ہوگے ایمان محفوظ رہے گا۔

امام احمد بن حنبل (رح) صاحب المذہب ابتداء میں اپنے بیٹے کو وصیت فرماتے تھے کہ دیکھو بیٹے صوفیاء کی صحبت میں کبھی نہ بیٹھنا کیونکہ یہ لوگ شریعت کے احکام سے بیخبر ہوتے ہیں حدیث کا علم حاصل کرو اور اس میں مشغول رہو لیکن جب ابو حمزہ بغدادی (رح) کی مجلس میں حاضر ہوئے اور ان کی زبان سے رموز شریعت سنے تو آنکھیں کھل گئیں اور بیٹے سے فرمانے لگے بیٹا صوفیوں سے بدظن نہ ہو جاؤ بلکہ ان کی صحبت لازمی طور پر اختیار کرو اس لیے کہ اسرار الٰہیہ اور معارف شریعت کے خزانوں سے مطلع ہونا انہی کا حق ہے ہم لوگ تو بے بہرہ ہیں یہی لوگ حقیقی زہد تقویٰ اور اخلاص کے مالک ہیں جنہیں فقہاء محدثین سینکڑوں دفتروں سے بھی حاصل نہیں کرسکتے ہیں۔

امام شافعی (رح) مجتہد اعظم فرماتے ہیں:

الفقيه محتاج الى معرفه اصلاح الصوفية ليفيد له من العلم مالم يكن عنده

یعنی فقہ کا عالم اپنی اصلاح نفس کے لیے صوفی کا محتاج ہے تاکہ علم کا فائدہ جو کہ اصلاح نفس ہے اسے حاصل ہو جس کا حصول بغیر صحبت شیخ کے ممکن نہیں۔

جلیل القدر محدث، حافظ ابن حجر (رح) شارح بخاری فرماتے ہیں "طالب خدا کو چاہیے کہ کسی شیخ عارف کو اپنا پیر بنالے جو احکام شریعت و طریقت سے خوب واقف ہو اور جب ایسا کامل رہبر کسی کو مل جائے تو اس پر حرام ہے کہ اس کی صحبت کو چھوڑ دے اور میرے اس دعوے پر چار گواہ موجود ہیں کتاب سنت اجماع امت اور قیاس۔

شمس الدین امام المسلمین امام ابو حنیفۃ النعمان علیہ رحمۃ المنان کا یہ جملہ مشہور ہے **لو لا السنتان لهلك النعمان** اگر یہ دو سال (تصوف کے) نہ ملتے تو نعمان (یعنی میں) ہلاک ہو جاتا،

ارشاد خداوندی ہے:

یایها الذین امنوا اتقوا الله و کونوا مع الصدقین،

"اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ رہو"

سچے وہ لوگ ہیں جو ظاہراً و باطناً شریعت مطہرہ کے پابند ہوں، ان کی معیت کی وجہ سے ظاہر شریعت پر عمل کرنے سے آراستہ ہو جائے گا اور باطن انوار معرفت سے منور ہو جائے گا اور آخرت میں بھی ان کی معیت حاصل ہو گی، المرء مع من احب انسان اس کے ساتھ ہو تا ہے جس سے اس کی محبت ہوتی ہے۔

شنیدم کہ در روز امید و بیم

بداں را بہ نیکاں ببخشد کریم

بروں کو یعنی نیکی میں کوتاہی کرنے والوں کو قیامت کے دن اللہ کریم نیکوں کے طفیل بخش دے گا۔

مور مسکیں ہوسے داشت کہ در کعبہ رسد

دست در پائے کبوتر زود ناگاہ رسید

ضعیف چیونٹی کو کعبہ جانے کا شوق تھا تا کہ اس کا طواف کرے اس آرزو کی تکمیل کے لیے وہ کسی کبوتر کے قدم سے چمٹ گئی کبوتر اڑا اور خانہ کعبہ پہنچا اور بیت اللہ کے سات چکر کئے اس طرح مسکین چیونٹی کا بھی طواف ہو گیا۔ یہ ایک

تمثیل ہے مرید صادق چیونٹی کی طرح کمزور بھی ہو، اس کے باوجود اگر وہ شیخ کامل کے قدم مضبوطی سے پکڑ لے اور اس کے دامن سے پیوستہ ووابستہ رہے تو اللہ پاک اس کے وسیلہ سے مرید کو بھی منزل مقصود تک پہنچادے گا۔

برادر عزیز! شیخ عبد القادر جیلانی (رح) مادر زاد ولی تھے لیکن وہ بھی شیخ کے ہاتھوں میں ہاتھ دیئے بغیر نہ رہ سکے اسی طرح بایزید بسطامی (رح) مادر زاد ولی تھے لیکن داخل سلسلہ ہونے کے لیے شیخ کے محتاج تھے الغرض بہت سے اولیاء اللہ مادر زاد ولی پیدا ہوئے لیکن بغیر صحبت شیخ کے نہ رہ سکے اس لیے کہ الصحبۃ موثرۃ ہر صحبت کا اثر ہوتا ہے نیک کا نیک برے کا برا۔

صحبت صالح ترا صالح کند

صحبت طالح ترا طالح کند

اچھے کی صحبت تجھے اچھا بنادے گی برے کی برا اور یہ اثر صرف انسان ہی میں نہیں بلکہ حیوان میں بھی پیدا ہوتا ہے۔

سگ اصحاب کہف روزے چند

پئے نیکاں گرفت مردم شد

اصحاب کہف کے کتے نے تھوڑے دن نیکوں کی پیروی کی آدمی بن گیا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کی ماہیت اور حقیقت بدل گئی کہ وکلبھم باسط ذراعیہ بالوصید، ان کا کتا غار کی دہلیز پر دونوں ہاتھ پھیلائے بیٹھا تھا نص قطعی ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ اس کی صفات بدل گئیں کیونکہ روایت ہے کہ وہ کتا جنت میں جائے گا اب آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جب صلحاء واولیاء کی صحبت سے کتے کو یہ مقام حاصل ہو سکتا ہے تو اگر مومنین وموحدین صلحاء کے ساتھ صحیح صحبت رکھیں تو ان کا مقام کتنا بلند ہو گا۔ اسی طرح رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ صحیح محبت رکھنے والا مومن وموحد ظاہراً وباطناً شریعت کا عامل بھی ہو تو اس کا مقام کتنا بلند ہو گا؟ اور حیوان کو چھوڑیئے جمادات بھی صحبت کے اثر کو قبول کرتے ہیں۔

گلے خوشبوئے در حمام روزے

رسید از دست محبوبے بدستم

بدو گفتم کہ مشکی یا عبیری
کہ از بوئے دلاویزے تو مستم
بگفتا من گلے ناچیز بودم
ولیکن مدتے باگل نشستم
جمال ہم نشین در من اثر کرد
وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

شیخ سعدی (رح) فرماتے ہیں، ایک دن ایک دوست نے حمام میں مجھے مٹی دی جس سے خوشبو آتی تھی، میں اس مٹی سے ہم کلام ہوا اور پوچھا یہ بتا کہ تو مشک ہے یا عبیر کہ تیری دلآویز خوشبو سے میں مست ہوا جارہا ہوں۔ (خدا نے اسے قوت گویائی عطا فرمائی اور اس نے جواب دیا، میں بیکار مٹی تھی لیکن کچھ دن پھول کے ساتھ رہی تو اس کی خوبی اور خوشبو نے میرے اندر اپنا اثر کیا اور مجھے بھی خوشبودار بنادیا ورنہ میں تو وہی مٹی ہوں جو پہلے تھی۔

تو اے برادر! جب مجتہدین مذاہب اور مادر زاد اولیا اہل باطن کی صحبت سے بے نیاز نہیں ہوئے تو بتایئے ہماری کیا حیثیت ہے کہ ہم اس نعمت کے محتاج نہ ہوں۔ برادران عزیز! دلائل سے جب علمی و عملی بیعت اور صحبت شیخ کی ضرورت واضح ہوگئی تو اٹھو، دیر مت کرو، شیخ کامل کی تلاش کرلو۔ اس کے ہاتھ پر توبہ کرلو۔ آخرت کی فکر میں لگ جاؤ۔ اس کے لیے توشہ جمع کرلو تاکہ وہاں مفلس نہ رہو۔ دنیا کی عزت مال سے ہے آخرت کی عزت اعمال سے ہے۔ پتہ نہیں زندگی کتنی باقی ہے ایسا نہ ہو کہ دنیا سے بلا توبہ چلے جاؤ۔

عمر برف است موت آفتاب تموز
اندکے ماند خواجہ غرہ ہنوز

یعنی عمر بہ منزلہ برف کے ہے اور موت بہ منزلہ تیز دھوپ کے جس طرح دھوپ برف کو پگھلاتی اور بالآخر فنا کردیتی ہے اسی طرح موت عمر کو کھا جاتی ہے اور زندگی کو ختم کردیتی ہے تو اے بھائی! آخر کب تک یہ خواب غفلت؟ بیدار ہوجا اور موت کی اچانک آمد سے پہلے جلد از جلد توبہ کرلے۔

عجلوا بالتوبۃ قبل الموت مرنے سے پہلے توبہ کرنے میں جلدی کرو کہ موت کا وقت معلوم نہیں ہر دن عمر کا آخری دن سمجھ لو اور ہر رات آخری رات۔

بیعت و صحبت شیخ کی ضرورت و اہمیت کے بیان سے آپ پر روز روشن کی طرح اس کی ضرورت واضح ہو گئی تو آپ کے لیے ان آداب کا جاننا بھی ضروری ہے جو ہر مرید کے لیے ضروری ہیں اس لیے وہ بھی بطور اختصار بیان کئے جاتے ہیں اور کچھ شرائط جو شیخ کے لیے ضروری ہیں وہ بھی واضح کی جاتی ہیں تاکہ رسمی بیعت اور گندم نما جو فروشوں کے چکر میں پھنس کر طالبان حق اپنا قیمتی وقت ضائع نہ کریں اور بالآخر پشیمان نہ ہوں۔

(ارشادات حضرت عبداللہ شاہ صاحب (رح))

اسلوب کی تبدیلی

شروع سورت میں حمد اور ثنا کا ذکر تھا اور تعریف اور ثناء غائبانہ زیادہ بہتر ہے اس لیے کہ غائبانہ حمد زیادہ اخلاص کی علامت ہے اور ایک نعبد میں عبادت کا ذکر ہے اور عبادت اور خدمت حضوری میں ہوتی ہے (2) نیز نمازی نے جب نماز شروع کی تو شروع نماز میں بمنزلہ اجنبی کے آکر کھڑا ہو گیا اور خداوند ذوالجلال کی غائبانہ حمد و ثنا شروع کی اور الحمد للہ رب العلمین کہا یعنی اسم ظاہر کے ساتھ اس کی حمد و ثناء کی اور اسم ظاہر حکم میں غائب کے ہے اور جب حمد و ثناء حد کمال کو پہنچی تو جو حجابات درمیان میں تھے وہ اٹھ گئے اور بعد قرب سے اور اجنبیت یگانگت سے بدل گئی اور یہ شخص اس قابل ہو گیا کہ خداوند ذوالجلال کے حضور بصیغہ خطاب عرض معروض کر سکے (3) نیز ایاک نعبد کے بعد ہدایت کے سوال کا ذکر ہے اور سوال اور درخواست حضور ہی میں زیادہ بہتر اور مناسب ہوتی ہے اس لیے کہ جب سخی سے سامنے سوال کیا جائے تو سخی اور کریم اس کے رد کرنے سے شرماتا ہے۔

پناہ بلندی و پستی توئی
ہمہ نیستند آنچہ ہستی توئی

توحید وجود الٰہی دلیل کا محتاج نہیں ہے:

امام اعظم ابو حنیفہ (رح) فرماتے ہیں کہ جو شخص وجود باری یا توحید باری کا منکر ہو وہ ناجی نہیں بلکہ ناری ہے اگر چہ اس کو کسی نبی کی دعوت نہ پہنچی ہو اس لیے کہ وجود باری اور توحید باری کا مسئلہ فطری اور عقلی اور بدیہی ہے اور عقلاء عالم کا اجماع ہے بعثت انبیاء پر موقوف نہیں حجت پوری ہو چکی ہے لہٰذا اب کوئی عذر مسموع نہیں۔

(تفسیر گلدستہ۔ محمد اسحاق)

اس سے پہلی آیات میں بیان ہوا کہ ہر طرح کی حمد و ثنا کا حقیقی مستحق اللہ تعالیٰ ہے جو کہ سب جہانوں کا پالنے والا، بہت مہربان اور رحم فرمانے والا ہے اور اس آیت سے بندوں کو سکھایا جارہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنی بندگی کا اظہار یوں کرو کہ اے اللہ! عَزَّوَجَلَّ، ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں کیونکہ عبادت کا مستحق صرف تو ہی ہے اور تیرے علاوہ اور کوئی اس لائق ہی نہیں کہ اس کی عبادت کی جاسکے اور حقیقی مدد کرنے والا بھی تو ہی ہے۔ تیری اجازت و مرضی کے بغیر کوئی کسی کی کسی قسم کی ظاہری، باطنی، جسمانی روحانی، چھوٹی بڑی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔

عبادت اور تعظیم میں فرق

عبادت کا مفہوم بہت واضح ہے، سمجھنے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ کسی کو عبادت کے لائق سمجھتے ہوئے اس کی کسی قسم کی تعظیم کرنا "عبادت" کہلاتا ہے اور اگر عبادت کے لائق نہ سمجھیں تو وہ محض "تعظیم" ہو گی عبادت نہیں کہلائے گی، جیسے نماز میں ہاتھ باندھ کر کھڑا ہونا عبادت ہے لیکن یہی نماز کی طرح ہاتھ باندھ کر کھڑا ہونا استاد، پیر یا ماں باپ کے لیے ہو تو محض تعظیم ہے عبادت نہیں اور دونوں میں فرق وہی ہے جو ابھی بیان کیا گیا ہے۔

آیت "اِیَّاكَ نَعْبُدُ" سے معلوم ہونے والی اہم باتیں

آیت میں جمع کے صیغے ہیں جیسے ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ نماز جماعت کے ساتھ ادا کرنی چاہیے اور دوسروں کو بھی عبادت کرنے میں شریک کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ گناہ گاروں کی عبادتیں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ کے محبوب اور مقبول بندوں کی عبادتوں کے ساتھ جمع ہو کر قبولیت کا درجہ پالیتی ہیں۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنی حاجت عرض کرنے سے پہلے اپنی بندگی کا اظہار کرنا چاہیے۔ امام عبد اللہ بن احمد نسفی (رح) فرماتے

ہیں: عبادت کو مدد طلب کرنے سے پہلے ذکر کیا گیا کیونکہ حاجت طلب کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں وسیلہ پیش کرنا قبولیت کے زیادہ قریب ہے۔

(مدارک، الفاتحۃ، تحت الآیۃ: ۴، ص ۱۴)

اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں وسیلہ پیش کرنے کی برکت

ہر مسلمان کو چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کسی کا وسیلہ پیش کر کے اپنی حاجات کے لیے دعا کیا کرے تاکہ اس وسیلے کے صدقے دعا جلد مقبول ہو جائے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں وسیلہ پیش کرنا قرآن و حدیث سے ثابت ہے، چنانچہ وسیلے کے بارے میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے

"یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ ابْتَغُوْۤا اِلَیْهِ الْوَسِیْلَةَ" مائدہ: ۳۵)

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور اس کی طرف وسیلہ ڈھونڈو۔

اور "سُنَنِ ابنِ ماجہ" میں ہے کہ ایک نابینا صحابی بارگاہ رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں حاضر ہو کر دعا کے طالب ہوئے تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے انھیں اس طرح دعا مانگنے کا حکم دیا:

" اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْاَلُكَ وَاَتَوَجَّهُ اِلَیْكَ بِمُحَمَّدٍ نَبِیِّ الرَّحْمَةِ یَا مُحَمَّدُ اِنِّیْ قَدْ تَوَجَّهْتُ بِكَ اِلٰی رَبِّیْ فِیْ حَاجَتِیْ هٰذِهٖ لِتُقْضٰی اللّٰهُمَّ فَشَفِّعْهُ فِیَّ "

اے اللہ! عَزَّوَجَلَّ میں تجھ سے سوال کرتا ہوں اور تیری طرف نبی رحمت حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ متوجہ ہوتا ہوں اے محمد! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، میں نے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے وسیلے سے اپنے رب عَزَّوَجَلَّ کی طرف اپنی اس حاجت میں توجہ کی تاکہ میری حاجت پوری کر دی جائے، اے اللہ! عَزَّوَجَلَّ، پس تو میرے لیے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی شفاعت قبول فرما۔ (ابن ماجہ، کتاب الصلاۃ، باب ماجاء فی صلوۃ الحاجۃ، ۲/ ۱۵۷، الحدیث: ۱۳۸۵)

حدیث پاک میں مذکور لفظ ''یا مُحمَّد'' سے متعلق ضروری وضاحت

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان (رح) فرماتے ہیں: ''علماء تصریح فرماتے ہیں: حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو نام لے کر ندا کرنی حرام ہے۔ اور (یہ بات) واقعی محل انصاف ہے، جسے اس کا مالک و مولیٰ تبارک وتعالیٰ نام لے کر نہ پکارے (تو) غلام کی کیا مجال کہ (وہ) راہِ ادب سے تجاوز کرے، بلکہ امام زین الدین مراغی وغیرہ محققین نے فرمایا: اگر یہ لفظ کسی دعا میں وارد ہو جو خود نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے تعلیم فرمائی (ہو) جیسے دعائے ''یَا مُحَمَّدُ اِنِّی تَوَجَّهْتُ بِكَ اِلٰی رَبِّیْ''۔ تاہم اس کی جگہ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ، یَانَبِیَّ اللّٰہِ (کہنا) چاہیے، حالانکہ الفاظ دعا میں حتَّی الوُسع تغییر نہیں کی جاتی۔ یہ مسئلہ مہمہ (یعنی اہم ترین مسئلہ) جس سے اکثر اہل زمانہ غافل ہیں واجب الحفظ ہے۔ (فتاوی رضویہ، ۳۰/۱۵۷-۱۵۸)

{وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ: اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔} اس آیت میں بیان کیا گیا کہ مدد طلب کرنا خواہ واسطے کے ساتھ ہو یا واسطے کے بغیر ہو ہر طرح سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات ہی ایسی ہے جس سے حقیقی طور پر مدد طلب کی جائے۔ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان (رح) فرماتے ہیں: ''حقیقی مدد طلب کرنے سے مراد یہ ہے کہ جس سے مدد طلب کی جائے اسے بالذات قادر، مستقل مالک اور غنی بے نیاز جانا جائے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عطا کے بغیر خود اپنی ذات سے اس کام (یعنی مدد کرنے) کی قدرت رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور کے بارے میں یہ عقیدہ رکھنا ہر مسلمان کے نزدیک ''شرک'' ہے اور کوئی مسلمان اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور کے بارے میں ایسا ''عقیدہ'' نہیں رکھتا اور اللہ تعالیٰ کے مقبول بندوں کے بارے میں مسلمان یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ تک پہنچنے کے لیے واسطہ اور حاجات پوری ہونے کا وسیلہ اور ذریعہ ہیں تو جس طرح حقیقی وجود کہ کسی کے پیدا کئے بغیر خود اپنی ذات سے موجود ہونا اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے، اس کے باوجود کسی کو موجود کہنا اس وقت تک شرک نہیں جب تک وہی حقیقی وجود مراد نہ لیا جائے، یونہی حقیقی علم کہ کسی کی عطا کے بغیر خود اپنی ذات سے ہو اور حقیقی تعلیم کہ کسی چیز کی محتاجی کے بغیر از خود کسی کو سکھانا اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے، اس کے باوجود دوسرے کو عالم کہنا یا اس سے علم طلب کرنا اس وقت تک شرک نہیں ہو سکتا جب تک وہی اصلی معنی مقصود نہ ہوں تو اسی طرح کسی سے مدد طلب

کرنے کا معاملہ ہے کہ اس کا حقیقی معنیٰ اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے اور وسیلہ وواسطہ کے معنی میں اللہ تعالیٰ کے علاوہ کے لیے ثابت ہے اور حق ہے بلکہ یہ معنیٰ تو غیر خدا ہی کے لیے خاص ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ وسیلہ اور واسطہ بننے سے پاک ہے، اس سے اوپر کون ہے کہ یہ اس کی طرف وسیلہ ہو گا اور اس کے سوا حقیقی حاجت روا کون ہے کہ یہ بیچ میں واسطہ بنے گا۔ بدمذہبوں کی طرف سے ہونے والا ایک اعتراض ذکر کر کے اس کے جواب میں فرماتے ہیں: ''یہ نہیں ہو سکتا کہ خدا سے توسل کر کے اسے کسی کے یہاں وسیلہ وذریعہ بنایا جائے، اس وسیلہ بننے کو ہم اولیاء کرام سے مانگتے ہیں کہ وہ دربار الٰہی میں ہمارا وسیلہ، ذریعہ اور قضائے حاجات کا واسطہ ہو جائیں، اس بے وقوفی کے سوال کا جواب اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں دیا ہے:

''وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِیْمًا ﴿۶۴﴾'' (النساء:۶۴)

ترجمہ: اور جب وہ اپنی جانوں پر ظلم یعنی گناہ کر کے تیرے پاس حاضر ہوں اور اللہ سے معافی چاہیں اور معافی مانگے ان کے لیے رسول، تو بیشک اللہ کو توبہ قبول کرنے والا مہربان پائیں گے۔

کیا اللہ تعالیٰ اپنے آپ نہیں بخش سکتا تھا پھر کیوں یہ فرمایا کہ اے نبی! تیرے پاس حاضر ہوں اور تو اللہ سے ان کی بخشش چاہے تو یہ دولت ونعمت پائیں۔ یہی ہمارا مطلب ہے جو قرآن کی آیت صاف فرما رہی ہے۔
(فتاوی رضویہ، ۲۱/ ۳۰۴-۳۰۵، ملخصاً)

زیر تفسیر آیت کریمہ کے بارے میں مزید تفصیل جاننے کے لیے فتاوی رضویہ کی 21 ویں جلد میں موجود اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں (رح) کا رسالہ ''بَرَكَاتُ الْاِمْدَادْ لِاَهْلِ الْاِسْتِمْدَادْ (مدد طلب کرنے والوں کے لیے امداد کی برکتیں) ''کا مطالعہ فرمائیں۔

اللہ تعالیٰ کی عطا سے بندوں کا مدد کرنا اللہ تعالیٰ ہی کا مدد کرنا ہوتا ہے

یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو دوسروں کی مدد کرنے کا اختیار دیتا ہے اور اس اختیار کی بنا پر ان بندوں کا مدد کرنا اللہ تعالیٰ ہی کا مدد کرنا ہوتا ہے، جیسے غزوہ بدر میں فرشتوں نے آکر صحابہ کرام (رض) کی مدد کی، لیکن اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

"وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ "(اٰل عمران:۱۲۳)

ترجمہ کنزالعرفان: اور بیشک اللہ نے بدر میں تمہاری مدد کی جب تم بالکل بے سروسامان تھے۔

یہاں فرشتوں کی مدد کو اللہ تعالیٰ کی مدد کہا گیا، اس کی وجہ یہی ہے کہ فرشتوں کو مدد کرنے کا اختیار اللہ تعالیٰ کے دینے سے ہے تو حقیقتاً یہ اللہ تعالیٰ ہی کی مدد ہوئی۔ یہی معاملہ انبیاء کرام (علیہ السلام) اور اولیائِ عِظام (رح) کا ہے کہ وہ اللہ عَزَّوَجَلَّ کی عطا سے مدد کرتے ہیں اور حقیقتاً وہ مدد اللہ تعالیٰ کی ہوتی ہے، جیسے حضرت سلیمان (علیہ السلام) نے اپنے وزیر حضرت آصف بن برخیا (رض) سے تخت لانے کا فرمایا اور انھوں نے پلک جھپکنے میں تخت حاضر کر دیا۔ اس پر انھوں نے فرمایا: "ہٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّیْ "ترجمہ کنزالعرفان: یہ میرے رب کے فضل سے ہے۔ (نمل:۴۰) اور تاجدار رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی سیرت مبارکہ میں مدد کرنے کی تو اتنی مثالیں موجود ہیں کہ اگر سب جمع کی جائیں تو ایک ضخیم کتاب مرتب ہو سکتی ہے، ان میں سے چند مثالیں یہ ہیں:

(1)۔۔ صحیح بخاری میں ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے تھوڑے سے کھانے سے پورے لشکر کو سیر کیا۔

(بخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ الخندق۔۔ الخ، ۳/ ۵۱۔ ۵۲، الحدیث: ۴۱۰۱، الخصائص الکبری، باب معجزاتہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فی تکثیر الطعام غیر ماتقدّم، ۲/ ۸۵)

(2)۔۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے دودھ کے ایک پیالے سے ستر صحابہ کو سیراب کر دیا۔

(بخاری، کتاب الرقاق، باب کیف کان عیش النبی۔۔ الخ، ۴/ ۲۳۴، الحدیث: ۶۴۵۲، عمدۃ القاری، کتاب الرقاق، باب کیف کان عیش النبی۔۔ الخ، ۱۵/ ۵۳۶)

(3)۔۔ انگلیوں سے پانی کے چشمے جاری کر کے چودہ سو (1400) یا اس سے بھی زائد افراد کو سیراب کر دیا۔

(بخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ الحدیبیۃ، ۳/۶۹، الحدیث: ۴۱۵۲۔۴۱۵۳)

(4)۔۔لُعابِ دہن سے بہت سے لوگوں کو شفاعطا فرمائی۔

(الخصائص الکبری، باب آیاتہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فی ابراء المرضی۔۔الخ، ۲/۱۱۵۔۱۱۸)

اور یہ تمام مددیں چونکہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ طاقت سے تھیں لہٰذا سب اللہ تعالیٰ کی ہی مددیں ہیں۔اس بارے میں مزید تفصیل کے لیے فتاوی رضویہ کی 30ویں جلد میں موجود اعلیٰ حضرت، اِمامِ اَہلسنّت، مولانا شاہ امام احمد رضا خان علیہ رحمۃُ الرَّحمٰن کے رسالے "اَلْاَمْنُ وَالْعُلٰی لِنَاعِتِی الْمُصْطَفٰی بِدَافِعِ الْبَلَاءِ (مصطفیٰ کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو دافع البلاء یعنی بلائیں دور کرنے والا کہنے والوں کے لیے انعامات) "کا مطالعہ فرمایئے۔

(تفسیر صراط الجنان۔ابو صالح محمد قاسم القادری)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: (اے پروردگار!) ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ سے ہی مدد چاہتے ہیں۔(الفاتحہ:۴)

عبادت کا لغوی معنی

علامہ جوہری (رح) لکھتے ہیں:

عبودیت کی اصل خضوع اور ذلت ہے 'عبادت کا معنی ہے: اطاعت کرنا اور تعبد کا معنی ہے: تنسک (فرمان برداری کرنا) (الصحاح ج ۲ ص ۵۰۳ 'مطبوعہ دارالعلم 'بیروت '۱۴۰۴ھ)

علامہ ابن منظور افریقی لکھتے ہیں:

لغت میں عبادت کا معنی ہے خضوع (تواضع اور عاجزی) کے ساتھ اطاعت کرنا۔(لسان العرب ج ۳ ص ۲۷۳ مطبوعہ نشر ادب الحوذۃ 'قم 'ایران)

علامہ سید زبیدی لکھتے ہیں:

عبادت کا معنی ہے طاعت 'بعض ائمہ نے کہا کہ عبودیت کی اصل ذلت اور خشوع ہے 'دوسرے ائمہ نے کہا: عبودیت کا معنی ہے: رب کے فعل پر راضی ہونا 'اور عبادت کا معنی ہے: ایسا فعل کرنا جس سے رب راضی ہو 'اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ آخرت میں عبادت ساقط ہوجائے گی عبودت ساقط نہیں ہوگی 'کیونکہ عبودت یہ ہے کہ دنیا اور

آخرت میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کے حقیقت میں متصرف ہونے کا عقیدہ نہ رکھے ' ہمارے شیخ نے کہا: یہ صوفیہ کی اصطلاح ہے ' اس میں لغت کا دخل نہیں ہے ' ازہری نے کہا: غلام جو اپنے مولی کی خدمت کرتا ہے اس کو عبادت نہیں کہتے اور مسلمان جو اپنے رب کی اطاعت کرتا ہے اس کو عبادت کہتے ہیں اللہ عزوجل نے فرمایا: (آیت) "اعبدوا ربکم " اس کا معنی ہے اپنے رب کی اطاعت کرو ' اور "ایاک نعبد " کا معنی ہے: ہم خضوع اور عاجزی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتے ہیں۔ ابن الاثیر نے کہا: عبادت کا لغت میں معنی ہے: عاجزی کے ساتھ اطاعت کرنا۔ (تاج العروس شرح القاموس ج ۲ ص ۴۱۰ ' مطبوعہ المطبعۃ الخیریہ ' مصر ' ۱۳۰۶ ھ)

عبادت کا اصطلاحی معنی

علامہ میر سید شریف (رح) لکھتے ہیں:
نفس کی خواہش کے خلاف ' اپنے رب کی تعظیم کے لیے مکلف کا کوئی کام کرنا عبادت ہے۔ عہد کو پورا کرنا ' اللہ کی حدود کی حفاظت کرنا ' جو مل جائے اس پر راضی رہنا اور جو نہ ملے اس پر صبر کرنا ' عبودیت ہے۔ (کتاب التعریفات ص ۶۳ ' مطبوعہ المطبعۃ الخیریہ ' مصر ۶، ۱۳ ھ)

قرآن مجید میں عبادت کا لفظ توحید اور اطاعت کے لیے استعمال ہوا ہے

(آیت) "واعبدوا اللہ ولا تشرکوا بہ شیئا (النساء: ۳۶) اللہ کو واحد مانو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔

(آیت) "الم اعھد الیکم یبنی ادم ان لا تعبدوا الشیطن "۔ (یس: ۶۰) اے اولاد آدم! کیا میں نے تم سے یہ عہد نہیں لیا تھا کہ تم شیطان کی اطاعت نہ کرنا۔

یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ عبادت کا اصطلاحی معنی ہے: اعتقاد الوہیت کے ساتھ کسی کی تعظیم اور اطاعت کرنا اور (آیت) "یایها الناس اعبدوا ربکم "کا معنی ہے: اے لوگو! اپنے رب کو الہ مان کر اس کی تعظیم اور اطاعت کرو' اور (آیت) "ایاک نعبد "کا معنی ہے: ہم اعتقاد الوہیت کے ساتھ تیری تعظیم اور اطاعت کرتے ہیں۔

قرآن مجید میں عبد کے اطلاقات

قرآن مجید میں پانچ قسم کے لوگوں پر عبد کا اطلاق کیا گیا ہے:

(۱) غلام اور مملوک پر عبد کا اطلاق کیا گیا ہے:

(آیت) "العبد بالعبد، (البقرہ:۱۷۸) غلام کے بدلہ میں غلام (کو قتل کیا جائے)

(آیت) "ضرب الله مثلا عبدا مملوکا لا یقدر علی شیء "(النحل:۷۵) اللہ مثال بیان فرماتا ہے ایک مملوک (غلام) کی جس کو کسی چیز پر قدرت نہیں ہے۔

(۲) جو اللہ کی تسخیر سے عبد ہیں:

ان کل من فی السموت والارض الا اتی الرحمن عبدا (مریم:۹۳) آسمانوں اور زمین میں جو کوئی بھی ہیں وہ اللہ کی بارگاہ میں بطور عبد حاضر ہوں گے۔

(۳) جو اپنے اختیار سے اللہ کے عبد ہیں اور عبدیت میں کامل ہیں:

(آیت) "ذریة من حملنا مع نوح انه کان عبدا شکورا "۔ (بنی اسرائیل:۳) ان لوگوں کی اولاد جن کو ہم نے نوح کے ساتھ (کشتی پر) سوار کیا تھا' بیشک وہ (نوح) عبد شاکر تھے۔

(آیت) "سبحن الذی اسری بعبده لیلا من المسجد الحرام الی المسجد الاقصا، (بنی اسرائیل:۱) سبحان ہے وہ جو اپنے (مقدس) عبد کو رات کے ایک قلیل حصہ میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گیا۔

(۴) جو اپنے اختیار سے اللہ کے عبد ہیں اور عبدیت میں ناقص ہیں:

(آیت) "ان تعذبهم فانهم عبادك وان تغفر لهم فانك انت العزیز الحکیم (المائدہ:۱۱۸)

اگر تو انھیں عذاب دے تو بیشک وہ تیرے بندے ہیں 'اور اگر تو انھیں بخش دے تو بیشک تو ہی بہت غالب ہے۔ بڑی حکمت والا ہے

(آیت) "قل یعبادی الذین اسرفوا علی انفسھم لا تقنطوا من رحمۃ اللہ"۔ (الزمر:۵۳)

کہیے: اے میرے وہ بندو! جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے 'اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔

(۵) جو اپنے اختیار سے غیر اللہ کے عبد ہیں:

(آیت) "ویوم یحشرھم وما یعبدون من دون اللہ فیقول ءانتم اضللتم عبادی ھؤلآء ام ھم ضلوا السبیل (الفرقان:۱۷)

اور جس دن اللہ انھیں جمع کرے گا اور جن کی وہ اللہ کے سوا عبادت کرتے تھے 'پھر اللہ ان (معبودوں) سے فرمائے گا: کیا تم نے میرے ان بندوں کو گمراہ کیا تھا وہ خود ہی گمراہ ہو گئے تھے؟

(آیت) "یحسرۃ علی العباد ما یاتیھم من رسول الا کانوا بہ یستھزء ون (یس:۳۱)

ہائے افسوس ان بندون پر ان کے پاس جو رسول بھی آیا یہ اس کا مذاق اڑاتے تھے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جو مملوک اور غلام ہیں 'جو تسخیر اعبد ہیں 'جو اپنے اختیار سے اللہ کے عبد ہیں اور عبد کامل ہیں اور جو اپنے اختیار سے اللہ کے عبد ہیں اور عبد ناقص ہیں اور جو اپنے اختیار سے غیر اللہ کے عبد ہیں ان سب پر قرآن مجید میں عبد کا اطلاق کیا گیا ہے۔

اپنے غلام کو "میرا عبد "کہنے کی کراہت اور عبد النبی وغیرہ نام رکھنے کی تحقیق

غلام کے لیے اپنے مالک کو میرا رب کہنا مکروہ تنزیہی ہے 'اسی طرح مالک کا غلام کو میرا عبد کہنا مکروہ تنزیہی ہے۔

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: تم میں کوئی شخص یہ نہ کہے کہ اپنے رب کو کھلاؤ 'اپنے رب کو پلاؤ 'بلکہ میرا سید اور میرا مولا کہے 'اور تم میں سے کوئی شخص یہ نہ کہے: میرا عبد اور

میری بندی ' اسے یہ کہنا چاہیے: میرا نوکر ' میری نوکرانی اور میرا غلام۔ (صحیح بخاری ج ۲ ص ۷ ۳۴۶۔۳۴۷ ' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع ' کراچی ' ۱۳۸۱ھ)

امام احمد بن حنبل (رح) روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: تم میں سے کوئی شخص اپنے مملوک کے لیے میرا عبد نہ کہے، لیکن میرا خادم کہے ' اور نہ مملوک اپنے مالک کو میرا رب کہے لیکن میرا سید کہے۔ (مسند احمد ج ۲ ص ۴۴۴ ' مطبوعہ مکتب اسلامی ' بیروت ' ۱۳۹۸ھ)

علامہ ابن اثیر جزری (رح) لکھتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ (رض) کی حدیث میں ہے: کوئی شخص اپنے مملوک کو میرا عبد نہ کہے بلکہ میرا نوکر یا خادم کہے ' یہ ممانعت اس لیے کی گئی ہے تاکہ مالک سے تکبر اور بڑائی کی نفی کی جائے اور مالک کی طرف غلام کی عبودیت کی نسبت کی نفی کی جائے کیونکہ اس کا مستحق صرف اللہ تعالیٰ ہے اور وہی تمام بندوں کا رب ہے۔ (نہایہ ج ۳ ص ۱۷۰ مطبوعہ موسستہ مطبوعاتی ' ایران ' ۱۳۶۴ھ)

علامہ بدرالدین عینی حنفی (رح) لکھتے ہیں:

کسی شخص کا اپنے مملوک کو میرا عبد کہنا مکروہ تنزیہی ہے حرام نہیں ہے ' کراہت کی وجہ یہ ہے کہ اس کا مملوک اللہ کا عبد ہے اور اس کی عبادت کرتا ہے ' اب اگر اس کا مالک بھی اس کو اپنا عبد کہے تو یہ شرک اور مشابہت کو واجب کرتا ہے ' لہٰذا اس سے احتراز کے لیے مستحب ہے کہ وہ اس کو میرا نوکر اور میرا خادم کہے ' اور یہ حرام اس لیے نہیں ہے کہ قرآن مجید میں مالک کی طرف عبد کی اضافت کی گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(آیت) ”وانکحوا الایامی منکم والصلحین من عبادکم وامآئکم (النور: ۳۲) اور تم اپنے بے نکاح (آزاد) مردوں اور عورتوں کا اپنے نیک عباد (غلاموں) اور باندیوں سے نکاح کردو۔

علامہ ابن بطال نے کہا کہ اس آیت کی رو سے کسی شخص کا اپنے غلام کو میرا عبد کہنا جائز ہے اور احادیث میں ممانعت تغلیظ کے لیے ہے تحریم کے لیے نہیں، اور یہ مکروہ اس لیے ہے کہ یہ لفظ مشترک ہے کیونکہ اس کا غلام بہرحال اللہ کا

عبد ہے ' اب اگر وہ اسے میرا عبد کہے گا تو اس سے اس غلام کا مشترک ہونا لازم آ گیا۔ (عمدۃ القاری ج ۱۳ ص ۱۱۰ ' مطبوعہ ادارۃ الطباعۃ المنیریہ ' مصر ۱۳۴۸ھ)

بعض لوگوں کا نام عبد النبی اور عب الرسول رکھا جاتا ہے۔

شیخ اشرف علی تھانوی (رح) نے کفر اور شرک کی باتوں کا بیان اس عنوان کے تحت لکھا ہے:

علی بخش ' حسین بخش ' عبد النبی ' وغیرہ نام رکھنا۔ (بہشتی زیور ج ۱ ص ۳۵ مطبوعہ ناشران قرآن لمیٹڈ لاہور)

ظاہر ہے کہ یہ دین میں غلو اور زیادتی ہے ' عبد النبی اور عبد الرسول نام رکھنا ' سورۃ نور کی اس آیت کے تحت جائز ہے اور احادیث میں جو ممانعت وارد ہے اس کی وجہ سے مکروہ تنزیہی ہے۔ ہمارے نزدیک مختار یہی ہے کہ عبد النبی ' عبد الرسول اور عبد المصطفی ' نام رکھنا ' ہرچند کہ جائز ہے لیکن چونکہ احادیث میں اس کی ممانعت ہے ' اس لیے مکروہ تنزیہی ہے ' اس لیے افضل اور اولی یہی ہے کہ ان کے بجائے غلام رسول اور غلام مصطفیٰ نام رکھے جائیں۔

علامہ شامی (رح) لکھتے ہیں:

فقہاء نے عبد فلاں نام رکھنے سے منع کیا ہے ' اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عب النبی نام رکھنا ممنوع ہے ' علامہ مناوی نے علامہ دمیری (شافعی) سے نقل کیا ہے کہ ایک قول جواز کا ہے جب کہ اس نسبت سے مشرف ہونا مقصود ہو ' اور اکثر فقہاء نے اس خدشہ سے منع کیا ہے کہ کوئی حقیقت عبودیت کا اعتقاد کرے ' جیسے عبد الدار نام رکھنا جائز نہیں ہے۔ (رد المختار ج ۵ ص ۳۶۹ مطبوعہ مطبعہ عثمانیہ استنبول ' ۱۳۲۷ھ)

عبادت کا اللہ تعالیٰ میں منحصر ہونا

(اے پروردگار!) ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں، اس آیت میں عبادت کا اللہ تعالیٰ کا اللہ تعالیٰ میں حصر کردیا ہے ' بعض علماء نے اس پر بھی بحث کی ہے کہ اس حصر کی وجہ کیا ہے ' اس کا صحیح جواب یہ ہے کہ اللہ کے سوا اور کوئی الہ (مستحق عبادت) نہیں ہے ' اس لیے ہم اسی کی عبادت کرتے ہیں اور کسی کی عبادت نہیں کرتے ' اور اس کی یہ توجیہ بھی کی گئی ہے کہ عبادت نہایت تعظیم کو کہتے ہیں اور نہایت تعظیم اسی کی کی جائے گی جس نے بیشمار نعمتیں دی ہوں اور چونکہ تمام نعمتیں اسی کی دی ہوئی ہیں ' اس لیے عبادت بھی اسی کی کی جاتی ہے ' دیکھئے اللہ ہم کو عدم سے وجود میں لایا '

جہل سے نکال کر علم عطا فرمایا 'پھر تمام زمین 'آسمان 'سیارگان 'جمادات 'نباتات اور حیوانات کو ہمارے نفع کے لیے مسخر کر دیا!

(آیت) "وقد خلقتك من قبل ولم تك شيئا (مریم:۹) اور بیشک میں نے تم کو اس سے پہلے پیدا کیا 'حالانکہ تم کچھ بھی نہ تھے؛

(آیت) "والله اخرجكم من بطون امهتكم لا تعلمون شيئا وجعل لكم السمع والابصار والافئدة لعلكم تشكرون (النحل:۷۸)

اور اللہ نے تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹ سے پیدا کیا 'حالانکہ تمہیں کسی چیز کا علم نہ تھا اور تمہارے کان 'آنکھیں اور دل بنائے تاکہ تم شکر بجالاؤ

(آیت) "وسخر لكم ما في السموت وما في الارض جميعا منه (الجاثیہ:۱۳)

اور جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمینوں میں ہے سب کو اس نے اپنی طرف سے تمہارے نفع کے لیے مسخر کر دیا۔ اس سے بڑا اور کیا انعام ہو گا! تو اس کے سوا اور کون عبادت کا مستحق ہو گا۔

"ایاک نعبد "میں حرف خطاب کو مقدم کرنے کے اسرار اور نکات

اس آیت میں یوں نہیں فرمایا: "نعبدك "ہم تیری عبادت کرتے ہیں 'بلکہ فرمایا ہے:(آیت) "ایاک نعبد " تیری ہی عبادت کرتے ہیں ہم 'اللہ تعالیٰ کا ذکر پہلے ہے اور ہماری عبادت کرنے کا ذکر بعد میں ہے 'اس کی وجہ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ پہلے ہے 'اور ہم اور ہماری عبادات بعد میں ہیں۔ بعض علماء نے کہا ہے: جس شخص کی نظر نعمت کے وقت نعمت کی بجائے منعم پر ہو 'تو مصیبت کے وقت اس کی نظر مصیبت کی بجائے مصیبت میں مبتلا کرنے والے پر ہوتی ہے 'پھر مصیبت 'مصیبت نہیں رہتی اور نعمت آنے کے بعد اگر وہ نعمت زائل ہو جائے تو اس کو ملال نہیں ہوتا ' اور جس کی نظر نعمت پر ہوتی ہے تو حصول نعمت کے وقت بھی وہ پریشان رہتا ہے کہ کہیں وہ نعمت زائل نہ ہو جائے اور مصیبت کے وقت بھی وہ رنج اور افسوس میں مبتلا رہتا ہے 'اور جس کی نظر ہر حال میں اللہ پر ہو وہ ہمیشہ خوش رہتا ہے 'لہذا ان کے مقام کا کیا کہنا جن کی توجہ ہر حال میں صفات کی بجائے ذات کی طرف رہتی ہے۔ حضرت موسیٰ (علیہ

السلام) کی امت سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: (آیت) "واذکروا نعمتی "میری نعمت کو یاد کرو اور حضرت سیدنا محمد کی امت سے فرمایا: (آیت) "فاذکرونی اذکرکم "تم مجھے (میری ذات کو) یاد کرو، میں تمہیں یاد کروں گا 'ان کی رسائی صفت تک تھی ہماری رسائی ذات تک کر دی ہے اور جب اس تصور سے انسان کہے گا: تیری ہی عبادت کرتے ہیں ہم ' اور اس کی ذات کا اس لیے مقدم ذکر کرے گا کہ وہ ہر حال میں پہلے اس کو دیکھتا ہے بعد میں اور کو دیکھتا ہے تو پھر (آیت) "ایاک نعبد "پڑھنے کا کچھ اور لطف ہو گا!

نیز اس میں یہ اشارہ بھی ہے کہ کامل عبادت یہ ہے کہ تم اس طرح عبادت کرو کہ گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو اور اس سے بالمشافہ خطاب کر رہے ہو، اور اس میں یہ حکمت بھی ہے کہ عبادت میں صعوبت اور مشقت تو بہت ہے لیکن جب عابد کی نظر معبود کے جمال پر ہو اور وہ محو نظارہ ذات ہو تو پھر کسی مشقت اور صعوبت کا پتا نہیں چلتا جس طرح مصر کی عورتوں کی نظر جب حسن یوسف پر پڑی تو انھوں نے پھل کی جگہ انگلیاں کاٹ ڈالیں اور ان کو کچھ درد نہیں ہوا 'یہی وجہ ہے کہ ایک صحابی کو نماز کے دوران تیر لگتے رہے 'خون بہتا رہا اور وہ اسی انہماک سے نماز پڑھتے رہے۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۲۹) مسجد کی چھت سے سانپ گر پڑا بھگدڑ مچ گئی اور امام ابوحنفیہ (رح) اسی محویت سے نماز پڑھتے رہے۔ (تفسیر کبیر ج ۱ ص ۱۲۹) امام بخاری (رح) کو نماز میں بتیہ نے سترہ ڈنک مارے اور ان کو کچھ پتا نہیں چلا۔ (فتح الباری ج ۱۴ ص ۴۸۱۔ ۴۸۰) عروہ بن زبیر کے کسی عضو میں زخم ہو گیا 'اس عضو کا کاٹنا ضروری تھا 'جب انھوں نے نماز شروع کی تو لوگوں نے وہ عضو کاٹ دیا اور ان کو ذرا احساس نہیں ہوا۔ (تفسیر کبیر ج ۱ ص ۱۲۹)

(آیت) "میں جمع کا صیغہ لانے کے اسرار اور نکات

اس آیت میں فرمایا ہے: ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں 'یہاں پر لفظ جمع لایا گیا ہے 'کیونکہ اگر بندہ یوں کہتا کہ میں تیری عبادت کرتا ہوں تو اس سے تکبر اور عجب کا وہم ہوتا اور جب کہا: ہم (سب) تیری ہی عبادت کرتے ہیں تو اس کا حاصل یہ ہے کہ میں تیرے عبادت گزار بندوں میں سے ایک عبادت گزار بندہ ہوں اور اس میں تواضع اور انکسار ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ بندہ اپنی عبادت کو اس لائق نہیں سمجھتا کہ اس کا اللہ تعالیٰ کے سامنے ذکر کرے 'اس میں بہت سے نقائص اور تقصیرات ہیں 'اس لیے وہ اپنی عبادت کو تمام عبادت گزاروں کی عبادت میں درج کرکے ذکر کرتا ہے کہ ان عبادت گزاروں میں صالحین اور مقبولین بھی ہیں 'جن کی عبادتوں کو اللہ تعالیٰ قبول فرمائے گا 'اور یہ اس کے کرم سے بعید ہے کہ وہ بعض کی عبادتیں قبول کرے اور بعض کو مسترد کردے۔

علامہ محی الدین درویش لکھتے ہیں:

ایک شرعی مسئلہ یہ ہے کہ جو آدمی مختلف جنس کی چیزوں کو بیع واحد کے ساتھ فروخت کرے 'پھر خریدار بعض چیزوں کے کسی عیب پر مطلع ہو تو اس کو تمام چیزیں واپس کرنے کا اختیار ہے 'یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ بعض چیزوں کو رکھ لے اور بعض کو واپس کردے 'کیونکہ تمام چیزیں بیع واحد کے ساتھ فروخت کی گئی ہیں 'وہ ان میں تفریق نہیں کرسکتا (مثلا کوئی شخص سیبوں کا ایک کریٹ خریدے اور کوئی ایک سیب داغدار ہو تو وہ صرف اس سیب کو واپس نہیں کرسکتا یاسب کو واپس کرے گا یاسب کو رکھے گا) علی ھذا القیاس جب عبادت گزار نے اپنی عبادت کو ناقص اور معیوب جانا تو اس نے اپنی عبادت کو الگ نہیں پیش کیا بلکہ تمام عابدوں کی عبادت میں درج کردیا "اس امید سے کہ تمام عبادات مسترد نہیں ہوں گی 'کیونکہ ان میں بعض مقبولین کی عبادتات بھی ہیں اور جب باقی مقربین کی عبادات مقبول ہوں گی تو اس کی عبادت بھی مقبول ہوجائے گی اور یہی اس کے کرم عظیم کے مناسب اور فضل عمیم کے لائق ہے۔ (اعراب القرآن الکریم وبیانہ ج ۱ص ۱۸ 'دار ابن کثیر بیروت الطبعۃ الثالثہ ۱۴۱۲ھ)

حضرت انس بن مالک (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: گھر میں نماز پڑھنے پر ایک نماز کا اجر ہے اور قبائل کی مسجد (محلہ کی مسجد) میں نماز پڑھنے پر پچیس نمازوں کا اجر ہے (بعض روایات کے مطابق ستائیس نمازوں کا اجر ہے) اور جامع مسجد میں نماز پڑھنے پر پانچ سو نمازوں کا اجر ہے 'اور مسجد اقصی میں پچاس ہزار نمازوں کا اجر ہے 'اور میری مسجد (مسجد نبوی) میں نماز پڑھنے کا (بھی) پچاس ہزار نمازوں کا اجر ہے 'اور مسجد حرام میں نماز پڑھنے کا اجر ایک لاکھ نمازوں کا اجر ہے۔ (مشکوۃ ص ۷۲ 'مطبوعہ اصح المطابع 'دہلی)

اجر میں اس اضافہ کی وجہ ایک تو ان مساجد کی عظمت اور خصوصیت ہے 'دوسری وجہ یہ ہے کہ محلہ کی مسجد کی نسبت جامع مسجد میں زیادہ نمازی ہوتے ہیں 'اور جہاں زیادہ نمازی ہوں گے وہاں اللہ کے نیک بندے بھی زیادہ ہوں گے '

اللہ تعالیٰ اپنے مقرب اور نیک بندوں کو زیادہ اجر عطا فرمائے گا اور ان کے واسطے سے سب نمازیوں کو زیادہ اجر و ثواب عطا فرمادے گا ' علی ھذا القیاس جیسے جیسے نمازیوں کی تعداد بڑھتی جائے گی اجر و ثواب بڑھتا جائے گا ' اس لیے بندہ اپنی عبادت کا علیحدہ ذکر نہیں کرتا بلکہ تمام عابدوں کی عبادت میں اپنی عبادت ضم کر کے ذکر کرتا ہے تاکہ اسے بھی وہ برکتیں مل جائیں جو مقربین بار گاہ نازل کے طفیل سب عابدوں کو ملیں گی۔

غیوبت سے خطاب کی طرف التفات کے اسرار اور نکات

بلاغت کا ایک اسلوب یہ بھی ہے کہ کلام کے پیرائے کو مثلاً صیغہ غائب سے صیغہ خطاب کی طرف منتقل کیا جائے ' اس کو اصطلاح میں التفات کہتے ہیں ' کیونکہ مسلسل ایک طرز سے سننے والا اکتا جاتا ہے اور جب کلام کا پیرایہ تبدیل کیا جاتا ہے تو سننے والے کا ذہن حاضر اور بیدار رہتا ہے اور اس کا شوق برقرار رہتا ہے اور تجسس بڑھتا رہتا ہے۔
سورۃ فاتحہ کے شروع کی آیات میں اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات کا صیغہ غائب کے ساتھ ذکر کیا گیا اور اس کی حمد و ثناء کی گئی ' پھر (آیت) "ایاک نعبد ' ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں " میں اس سے بالمشافہ خطاب کیا گیا ' اس میں

صنعت التفات کے علاو حسب ذیل اسرار ہیں

(۱) جب بندہ نے اللہ تعالیٰ کی صفت ربوبیت ' رحمت اور اس کے مالک ہونے کا ذکر کیا تو اس کو حریم ناز میں داخل ہونے کی اجازت ملی اور اس سے کہا گیا کہ اب تو کہنا ہے بالمشافہ کہو تو بندہ نے کہا (آیت) "ایاك نعبد وایاك نستعین"۔

(۲) دعا اور سوال میں اصل یہ ہے کہ بالمشافہ خطاب کر کے سوال کیا جائے جیسے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: (آیت) "قل رب زدنی علما "۔ (طہ: ۱۱۴) "آپ کہئے کہ اے رب! میرے علم کو زیادہ کر ' سو اسی نہج پر یہاں بہ صورت خطاب دعا کی گئی ہے۔

(۳) (آیت) "الحمد " سے (آیت) "مالك یوم الدین "تک اللہ کی حمد و ثناء ہے ' اور تعریف میں اصل یہ ہے کہ غیاب میں کی جائے اور (آیت) "ایاك نعبد " میں عبادت کا ذکر ہے اور عبادت میں اصل یہ ہے کہ حضور میں

اور بالمشافہ ہو ،کیونکہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "ان تعبد الله كانك تراه"۔ تم اس طرح عبادت کرو گویا کہ اللہ کو دیکھ رہے ہو۔ (امام ابوالحسین مسلم بن حجاج قشیری متوفی ۲۶۱ھ، صحیح مسلم ج ۱ ص ۲۷، مطبوعہ نور محمد اصح المطابع، کراچی ۱۳۷۵ھ)

استعانت کے معنی

استعانت کا لفظ عون سے ماخوذ ہے ،علامہ زبیدی عون کا معنی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:
کسی کام پر مدد کرنے والے کو عون کہتے ہیں ،عرب کہتے ہیں: جب قحط آتا ہے تو اس کے ساتھ اس کے اعوان بھی آتے ہیں ،یعنی ٹڈیاں ،مکھیاں اور بیماریاں ،لیث نے کہا: ہر وہ چیز جو تمہاری مدد کرے وہ تمہاری عون ہے ،جیسے روزہ عبادت کے لیے عون ہے ،اس کی جمع عوان ہے ،اور عرب کہتے ہیں: "استعنته فاعانني" میں نے اس سے مدد طلب کی تو اس نے میری مدد کی۔ (تاج العروس ج ۹ ص ۲۸۵ ،مطبوعہ المطبعۃ الخیریہ ،مصر ،۱۳۰۶ھ)

(آیت) "اياك نستعين" کی تفسیر

علامہ ابوجعفر محمد بن جریر طبری (رح) لکھتے ہیں:
(آیت) "اياك نستعين" کا معنی یہ ہے: اے ہمارے! ہم اپنی عبادات ،اپنی طاعات اور اپنے تمام معاملات میں صرف تجھ سے ہی مدد طلب کرتے ہیں ،تیرے سوا اور کوئی مددگار نہیں ہے ،کفار اپنے معاملات میں اپنے باطل معبودوں سے مدد طلب کرتے ہیں اور ہم اخلاص کے ساتھ تیری عبادت کرتے ہیں اور اپنے تمام امور میں تجھ سے ہی مدد طلب کرتے ہیں۔ حضرت ابن عباس (رض) نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا: ہم اپنی اطاعت اور تمام امور میں تجھ سے ہی مدد طلب کرتے ہیں۔ (جامع البیان ج ۱ ص ۵۳ ،مطبوعہ دارالمعرفۃ بیروت ،۱۴۰۹ھ)

عبادت کو استعانت پر مقدم کرنے کی وجوہ

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ عبادت بھی اللہ تعالیٰ کی مدد کے بغیر نہیں ہو سکتی 'پھر بظاہر یہ چاہیے تھا کہ پہلے (آیت) " ایاك نستعين "ہوتا پھر (آیت) "ایاك نعبد "ہوتا 'اس کا ایک جواب یہ ہے کہ واؤ ترتیب کا تقاضا نہیں کرتی جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:

(آیت) "يمريم اقنتي لربك واسجدي واركعي مع الركعين (آل عمران:۴۳)

اے مریم! اپنے رب کی عبادت کر 'سجدہ کر اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کر۔

اس آیت میں پہلے سجدہ اور پھر رکوع کا ذکر ہے حالانکہ ترتیب کے اعتبار سے پہلے رکوع اور پھر سجدہ ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ وسیلہ مقصود پر مقدم ہوتا ہے 'بندہ کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ جب تم نے دعا اور سوال کرنا ہو تو اس سے پہلے اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو 'تاکہ تمہاری دعا قبول ہو 'اس لیے مدد طلب کرنے سے پہلے عبادت کرنے کا ذکر کیا گیا 'تیسرا جواب یہ ہے کہ اس سے پہلے (آیت) "الحمد لله رب العلمين "اور "مالك يوم الدين "فرمایا تھا تو اسی وزن پر (آیت) "اياك نعبد واياك نستعين "فرمایا اگر (آیت) "اياك نستعين واياك نعبد " ہوتا تو ان آیات کے آخری الفاظ کا اختتام ایک فصل اور ایک وزن پر نہ ہوتا۔

اولیاء اللہ سے استعانت کی تحقیق

علامہ سید محمود آلوسی لکھتے ہیں:

استعانت میں عموم مراد ہے 'ہر چیز میں ہم صرف تجھ سے ہی استعانت کرتے ہیں کیونکہ حدیث صحیح میں نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت ابن عباس (رض) سے فرمایا:

اذا استعنت فاستعن بالله '۔(جامع ترمذی ص ۳۶۱) جب تم مدد طلب کرو تو اللہ سے۔

اسی حدیث کی وجہ سے حضرت ابن عباس (رض) نے استعانت میں عموم کا قول اختیار کیا ہے 'سو جس شخص نے اپنے اہم معاملات بلکہ دوسرے غیر اہم معاملات میں بھی غیر اللہ سے مدد چاہی ہو تو اس نے ایک عبث عمل کیا 'اللہ تعالیٰ

سے کیوں نہیں مدد طلب کی جاتی حالانکہ وہ غنی کبیر ہے اور دوسروں سے کیسے مدد طلب کی جائے گی جب کہ سب اس کے محتاج ہیں ، اور محتاج کا محتاج سے مدد طلب کرنا ناپختہ رائے ہے اور عقل کی کج روی ، اور میں نے کتنے لوگوں کو دیکھا جنہوں نے غیر اللہ سے عزت اور دولت طلب کی اور وہ ذلیل اور فقیر ہوئے ، سو اللہ کے سوا اور کوئی لائق نہیں کہ اس سے مدد طلب کی جائے۔ (روح المعانی ج ۱ ص ۹۱ ، مطبوعہ داراحیاء التراث العربی ، بیروت)

علامہ مراغی (رح) لکھتے ہیں:

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ہمیں یہ حکم دیا ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور کسی کو اس کی عبادت میں شریک نہ کریں اور نہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی ایسی تعظیم کریں جیسی معبود کی تعظیم کی جاتی ہے اور اللہ کے سوا کسی سے مدد نہ طلب کریں اور کسی کام کو پورا کرنے کے لیے جو طاقت درکار ہوتی ہے وہ کسی اور سے نہ مانگیں ماسوا ان اسباب کے جن کا کسب کرنا اور جن کو حاصل کرنا ہمارے لیے عام اسباب میں مشروع اور میسر ہے۔

اس کا بیان یہ ہے کہ اللہ نے اپنی حکمت سے اسباب کو مسببات کے ساتھ مربوط کیا ہے ، اسی طرح ارتفاع موانع پر بھی ان کو موقوف کیا ہے اور ان اسباب کے حصول کے لیے انسان کو علم اور معرفت سے نوازا ہے اور موانع اور رکاوٹوں کے دور کرنے پر انسان کو قدرت عطا کی ہے اور اسی اعتبار سے ہم کو حکم دیا ہے کہ ہم ایک دوسرے کی مدد کریں اور تعاون کریں:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(آیت) ”وتعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان “ (المائدہ:۲)

اور تم نیکی اور پرہیز گاری کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرتے رہو اور گناہ اور ظلم میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو۔

(آیت) ”قال ما مکنی فیہ ربی خیر فاعینونی بقوۃ اجعل بینکم وبینھم ردما (الکہف:۹۵)

ذوالقرنین نے کہا: میرے رب نے جس پر مجھے قدرت دی ہے وہ (تمہارے مال سے) بہتر ہے تو تم (محنت کے کام میں) طاقت سے میری مدد کرو میں تمہارے اور ان کے درمیان نہایت مضبوط دیوار بنادوں گا۔

اسی اعتبار سے ہم بیماروں کی شفا کے لیے اطباء سے دوائیں طلب کرتے ہیں اور دشمنوں پر غلبہ حاصل کرنے کے لیے ہتھیاروں اور سپاہیوں سے مدد طلب کرتے ہیں اور اپنی فصلوں کی فراوانی کے لیے حشرات الارض اور مضر کیڑوں مکوڑوں کو دور کرتے ہیں اور ان کو ہلاک کرتے ہیں، اور ان اسباب کے بغیر اگر ہم بیماروں کے لیے شفاء اور دشمن پر غلبہ چاہتے ہوں تو اس کے لیے صرف اللہ تعالیٰ سے استعانت کی جائے گی اور زمین و آسمان کی تمام حاجات کے لیے صرف اللہ تعالیٰ کے سامنے دست سوال دراز کیا جائے گا اور نبی کی حیات طیبہ میں ہمارے لیے اسوہ اور نمونہ ہے، آپ نے مختلف غزوات میں کفار کے خلاف غلبہ اور فتح کے لیے صرف اللہ کے آگے ہاتھ پھیلائے ہیں، اسی سے فتح اور نصرت کی دعائیں کی ہیں اور اسی سے بیماری میں حصول شفا کے لیے دعا کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہم سے وعدہ کیا ہے کہ تم مجھ سے دعا کرو میں تمہاری دعاؤں کو قبول کروں گا اور فرمایا ہے کہ میں تمہاری شہ رگ سے بھی زیادہ تم سے قریب ہوں۔

سو جو شخص اپنی حاجات پوری کرانے کے لیے کسی بیمار کی شفا کے لیے ' دشمن پر غلبہ کے لیے یا اولاد کی طلب کیلیے اولیاء اللہ کے مزارات پر جا کر ان سے مدد مانگتا ہے وہ شخص سیدھے راستہ سے گمراہ ہو گیا ' اس نے اللہ کی شریعت سے اعراض کیا اور اس نے زمانہ جاہلیت کے بت پرستوں کا سا کام کیا۔

(تفسیر المراغی ج ا ص ۳۴۔۳۳ ' مطبوعہ داراحیاء التراث العربی ' بیروت)

ہمارے نزدیک علامہ مراغی کا یہ فتوی علی الاطلاق صحیح نہیں ہے ' زمانہ جاہلیت میں کفار بتوں کو مستحق عبادت قرار دیتے تھے اور اسی عقیدہ کے ساتھ ان سے استعانت کرتے تھے ' لیکن جو مسلمان اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو مستحق عبادت قرار نہ دیتا ہو، اور نہ اولیا اللہ کو متصرف بالذات سمجھتا ہو ' نہ ان کو تصرف میں مستقل سمجھتا ہو، بلکہ یہ سمجھتا ہو کہ اولیاء اللہ ' اللہ کی دی ہوئی قدرت اور اس کے اذن سے اس کائنات میں تصرف کرتے ہیں اور اسی عقیدہ کے ساتھ ان سے استعانت کرے تو اس مسلمان کا یہ فعل شرک ہے نہ زمانہ جاہلیت کے بت پرستوں کا سا کام ہے ' تاہم ہمارے نزدیک شریعت کا اصل تقاضا یہی ہے کہ ان تمام امور میں صرف اللہ تعالیٰ سے استعانت کرنی چاہیے ' اولیاء اللہ بھی اللہ کے محتاج ہیں اور ہم بھی اللہ تعالیٰ کے محتاج ہیں ' تو سلامت روی اسی میں ہے کہ ہر حاجت اللہ سے طلب کی جائے اور ہر ضرورت میں اس کے آگے دست سوال دراز کیا جائے۔

ہم نے ان پڑھ عوام اور جہلاء کو اولیاء اللہ کے مزارات پر بارہا سجدہ کرتے ہوئے دیکھا ہے 'جو منع کرنیکے باوجود باز نہیں آتے 'اسی طرح ان کو مزارات پر صاحب مزار کی نذر اور منت مانتے ہوئے دیکھا ہے حالانکہ سجدہ عبادت ہو یا سجدہ تعظیم اللہ کے غیر کے لیے جائز نہیں ہے اور نذر بھی عبادت ہے اور غیر اللہ کی نذر ماننا جائز نہیں۔

(آیت) "هو الذی یسیرکم فی البر والبحر حتی اذا کنتم فی الفلك وجرین بهم بریح طیبة وفرحوا بها جآء تها ریح عاصف وجآء هم الموج من کل مکان وظنوا انهم احیط بهم دعوا الله مخلصین له الدین لئن انجیتنا من هذه لنکونن من الشکرین فلما انجهم اذا هم یبغون فی الارض بغیر الحق: (یونس:۲۳۔۲۲)

وہی ہے جو تم کو خشک زمین اور سمندر میں چلاتا ہے، حتی کہ جب تم کو کشتیاں موافق ہوا کے ساتھ لے کر چلتی ہیں اور وہ اس پر خوش ہوتے ہیں، تو (اچانک) کشتیوں پر تند و تیز آندھیاں آئیں اور سمندر کی موجوں نے ان کو ہر طرف سے گھیر لیا اور (مسافروں نے) سمجھ لیا کہ وہ طوفان میں گھر گئے 'تب سب نے اپنے دین کو خالص اللہ کے لیے کر کے دعائیں مانگیں کہ اگر تو نے ہمیں اس (طوفان سے بچالیا تو ہم ضرور تیرے شکر گزاروں میں سے ہو جائیں گے پھر جب اللہ نے ان کو بچالیا تو وہ ناگہاں زمین میں ناحق زیادتی کرنے لگے۔

جب انسان مصائب کے گرداب اور پریشانیوں کے طوفان میں گھر جائے تو کٹر سے کٹر مشرک بھی صرف اللہ ہی کی طرف رجوع کرتا ہے 'سو مسلم اور موحد اس بات کے زیادہ لائق اور مستحق ہے کہ وہ اپنی مصیبتوں اور پریشانیوں میں صرف اللہ تعالیٰ سے التجاء کرے، اسی سے مدد مانگے اور اس کے آگے ہاتھ پھیلائے۔

امام رازی سورۃ یونس آیت: ۱۰ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

ان کافروں نے انبیاء (علیہم السلام) اور اولیاء کرام کی صورتوں کے بت بنا لیے تھے اور ان کا یہ زعم تھا کہ جب وہ ان بتوں کی عبادت کریں گے تو وہ بت اللہ کے پاس ان کی شفاعت کریں گے 'اور اس زمانہ میں اس کی نظیر یہ ہے کہ بہت لوگ اولیاء اللہ کی قبروں کی تعظیم کرتے ہیں اور ان کا یہ اعتقاد ہوتا ہے کہ جب وہ ان قبروں کی تعظیم کریں گے تو وہ اللہ کے پاس ان کی شفاعت کریں گے۔ (تفسیر کبیر ج ۴ ص ۵۵۶ 'مطبوعہ دارالفکر 'بیروت '۱۳۹۸ھ)

قبر کو سجدہ کرنا 'قبر کا طواف کرنا اور حصول منفعت کے لیے صاحب قبر کی نذر ماننا قبر کے سامنے جھکنا 'یہ تمام امور ناجائز اور حرام ہیں۔

اولیاء اللہ سے استعانت کا صحیح طریقہ

ہونا یہ چاہیے کہ اولیاء اللہ کے مزارات کی زیارت کی جائے کیونکہ زیارت قبور سنت ہے 'ان کے مزارات پر ایصال ثواب کیا جائے 'یہ بھی احادیث سے ثابت ہے 'ان کی مغفرت اور ان کے درجات کی بلندی کے لیے دعا کی جائے 'کیونکہ قرآن مجید میں وفات یافتہ مسلمانوں کے لیے دعا کرنے کی تعلیم ہے 'اور ان کے وسیلہ سے اپنی حاجات کی قبولیت کی دعا کی جائے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت فاطمہ بنت اسد کی مغفرت کے لیے اپنے اور انبیاء سابقین کے وسیلہ سے دعا فرمائی ہے اور زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ اولیاء اللہ سے یہ درخواست کی جائے کہ وہ ہماری حاجت روائی کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کردیں اور اس کی اصل نابینا کی حدیث ہے جس کو انشاء اللہ ہم عنقریب تفصیل سے بیان کریں گے 'اب ہم وسیلہ اور غیر اللہ سے استمداد کے موضوع پر تفصیل سے لکھ رہے ہیں۔فنقول وباللہ التوفیق وبہ الاستعانۃ یلیق۔

وسیلہ کا لغوی معنی

علامہ ابن اثیر جزری (رح) لکھتے ہیں:

ھی فی الاصل مایتوصل بہ الی الشیء ویتقرب بہ: جس چیز سے کسی شے کا تقرب حاصل کیا جائے وہ وسیلہ ہے۔(علامہ محمد بن اثیر جزری (رح) متوفی ٦٠٦ ھ نہایہ ج ٥ ص ١٨٥ 'مطبوعہ موسسۃ مطبوعاتی 'ایران '١٣٦٤ ھ)

علامہ ابن منظور افریقی (رح) لکھتے ہیں:

الجوھری: الوسیلة ما یتقرب به الی الغیر ' امام لغت علامہ جوہری (رح) نے کہا ہے کہ جس چیز سے غیر کا تقرب حاصل کیا جائے وہ وسیلہ ہے۔ (سید جمال الدین محمد بن مکرم ابن منظور افریقی (رح) متوفی ۷۱۱ھ 'لسان العرب ج ۱۱ ص ۷۲۵۔ ۷۲۴ مطبوعہ نشر ادب الحوزۃ 'قم 'ایران ۱۴۰۵ھ)

علامہ زبیدی نے ابن اثیر (رح) اور علامہ جوہری (رح) کے حوالوں سے وسیلہ کی تعریف میں مذکور الصدر عبارات نقل کی ہیں۔ (تاج العروس ج ۸ ص ۱۵۴ 'مطبوعہ المطبعۃ الخیریہ 'مصر '۱۳۰۶ھ)

علامہ ابن منظور افریقی (رح) اور علامہ زبیدی (رح) نے علامہ جوہری (رح) کی جس عبارت کا حوالہ دیا ہے وہ یہ ہے جس چیز سے غیر کا تقرب کیا جائے وہ وسیلہ ہے۔ (الصحاح ج ۵ ص ۱۸۴۱ 'مطبوعہ دار العلم 'بیروت '۱۴۰۴ھ)

ائمہ لغت کی ان تصریحات سے واضح ہو گیا کہ جس چیز سے غیر کا تقرب حاصل کیا جائے وہ وسیلہ ہے 'اللہ تعالیٰ کا تقرب اعمال صالحہ اور عبادات سے حاصل ہوتا ہے 'تاہم انبیاء (علیہم السلام) اور اولیاء کرام کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں جو عزت اور وجاہت حاصل ہے 'اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قبولیت دعا کے لیے اس عزت اور وجاہت کو پیش کرنا اور ان سے دعا کی درخواست کرنا بھی جائز ہے 'زندگی میں اور وفات کے بعد بھی۔

انبیاء (علیہم السلام) اور اولیاء کرام کی ذوات سے توسل کے متعلق فقہاء اسلام کی عبارات

امام محمد بن جزری آداب دعا میں لکھتے ہیں: اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں انبیاء (علیہم السلام) اور صالحین کا وسیلہ پیش کرے۔ (حصن حصین مع تحفۃ الذاکرین ص ۳۴ 'مطبوعہ مطبع مصطفی البانی 'مصر '۱۳۵۰ھ)

ملا علی قاری اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

مصنف نے کہا: دعا میں انبیاء اور صالحین کا وسیلہ پیش کرنا امور مستحبہ میں سے ہے کیونکہ "صحیح بخاری" کی کتاب الاستقاء میں ہے:

حضرت عمر (رض) نے فرمایا: پہلے ہم اپنے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے وسیلہ سے دعا کرتے تھے تو (اے اللہ!) تو بارش نازل فرماتا تھا ' اب ہم اپنے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے عم محترم کے وسیلہ سے دعا کرتے ہیں تو ہم پر بارش نازل فرما ' پھر ان پر بارش ہو جاتی ' اور جیسا کہ نابینا کی حدیث میں حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے وسیلہ سے دعا کا ذکر ہے جس کا کو امام حاکم نے اپنی "مستدرک" میں روایت کیا اور کیا یہ کہا کہ یہ حدیث امام بخاری اور امام مسلم کی شرط کے مطابق صحیح ہے ' اور امام ترمذی نے کہا: یہ حدیث صحیح ' غریب ہے اور ہم نے اس کو "حصن" میں ذکر کیا ہے اور حدیث ابوامامہ کی بناء پر جس کو ہم نے صبح کی دعاؤں میں ذکر کیا ہے ' اس حدیث کو امام طبرانی نے "معجم کبیر" اور "کتاب الدعاء" میں ذکر کیا ہے۔ (الحرز الثمین ص ۱۷٦ ' مطبوعہ مطبعہ امیریہ ' مکہ مکرمہ ' ۱۳۰۴ھ)

امام جزری نے حضرت ابوامامہ کی جس حدیث کا حوالہ دیا ہے وہ یہ ہے:

اسئلك بنور وجهك الذی اشرقت له السموات والارض وبكل حق هو لك وبحق السائلين عليك:

(امام محمد بن جزری متوفی ۸۳۳ھ ' حصن حصین مع تحفۃ الذاکرین ص ٦٨ ' مطبوعہ مطبع مصطفی البابی واولادہ ' مصر ' ۱۳۵۰ھ)

ملا علی قاری اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

سوال کرنے والوں کا اللہ پر اس لیے حق ہے کہ اللہ تعالیٰ نے (اپنے کرم سے) ان کی دعا قبول کرنے کا وعدہ فرمایا ہے: گویا کہ بندے نے اللہ تعالیٰ سے بندوں پر اس کے حق کے وسیلہ سے ' اور سائلین کا اللہ پر جو حق ہے اس کے وسیلہ سے سوال کیا ' اللہ تعالیٰ کا حق یہ ہے کہ بندے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کریں ' اس کی حمد و ثناء کریں ' اس کے احکام پر عمل کریں ' اور اس کی منع کی ہوئی چیزوں سے رکیں ' اور بندوں کا اللہ پر یہ حق ہے یہ حق ہے کہ وہ اپنے وعدہ کے مطابق ان کو ثواب عطا کرے ' کیونکہ اس کے وعدہ کا پورا ہونا واجب ہے ' کہ اس کا وعدہ حق ہے اور اس کی خبر صادق ہے۔ (الحرز الثمین ص ۱۷٦ ' مطبوعہ امیریہ ' مکہ مکرمہ ' ۱۳۰۴ھ)

شیخ ابن تیمیہ لکھتے ہیں:

ہم یہ کہتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ سے دعا کرنے والا یہ کہتا ہے کہ میں تجھ سے فلاں کے حق اور فلاں فرشتے اور انبیاء اور صالحین وغیرھم کے حق سے سوال کرتا ہوں یا فلاں کی حرمت اور فلاں کی وجاہت کے وسیلہ سے سوال کرتا ہوں، اس دعا کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ کے نزدیک ان مقربین کی وجاہت ہو، اور یہ دعا صحیح ہے 'کیونکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان مقربین کی وجاہت اور حرمت ہے 'جس کا یہ تقاضا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند کرے اور ان کی قدر افزائی کرے اور جب یہ شفاعت کریں تو ان کی شفاعت قبول کرے 'حالانکہ اللہ تعالیٰ سبحانہ نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر کون اس سے شفاعت کر سکتا ہے۔

(فتاوی ابن تیمیہ ج ا ص ۲۱۱ 'مطبوعہ بامر فہد بن عبد العزیز)

غیر مقلد عالم قاضی شوکانی (رح) لکھتے ہیں:

یہ بھی ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ پر سائلین کے حق میں مراد یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ ان کی دعا کو مسترد نہ کرے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے یہ وعدہ فرمایا ہے: مجھ سے دعا کرو 'میں تمہاری دعا کو قبول کروں گا۔

(تحفۃ الذاکرین ٦٩ 'مطبوعہ مطبع مصطفے البابی واولادہ 'مصر '۱۳۵۰ھ)

نیز قاضی شوکانی لکھتے ہیں:

میں کہتا ہوں کہ انبیاء (علیہم السلام) کے وسیلہ کے جواز پر وہ حدیث دلیل ہے جس کو امام ترمذی (رح) نے روایت کر کے کہا: یہ حدیث حسن ' صحیح اور غریب ہے 'امام نسائی 'امام ابن ماجہ 'اور امام ابن خزیمہ نے اپنی صحیح میں اور امام حاکم نے اس کو روایت کر کے کہا یہ حدیث امام بخاری (رح) اور امام مسلم (رح) کی شرط پر صحیح ہے 'حضرت عثمان بن حنیف (رض) بیان کرتے ہیں کہ ایک نابینا نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس آیا اور عرض کیا: یارسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ میری بصارت بحال کر دے 'آپ نے فرمایا: یا میں رہنے دوں؟ اس نے عرض کیا: یارسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مجھ پر نابینائی بہت دشوار ہے 'آپ نے فرمایا: جاؤ وضو کر کے دو رکعت نماز پڑھو 'پھر کہو: اے اللہ! میں تجھ سے سوال کرتا ہوں 'اور محمد نبی رحمت کے وسیلہ سے میں تیری طرف متوجہ ہوتا ہوں 'الحدیث۔ "حصن حصین "کے باب صلوۃ الحاجۃ میں اس حدیث کا ذکر آئے گا 'اور صالحین کے توسل کے جواز پر وہ حدیث دلیل ہے جو صحیح (بخاری) میں ہے کہ صحابہ نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے

عم محترم حضرت عباس (رض) کے وسیلہ سے بارش کے لیے دعا کی اور حضرت عمر (رض) نے کہا: اے اللہ! ہم تیرے نبی کے عم محترم کے وسیلہ سے دعا کرتے ہیں۔

(تحفہ الذاکرین ص ۳۷' مطبوعہ مطبع مصطفے البابی واولادہ 'مصر' ۱۳۵۰ھ)

حضرت آدم (علیہ السلام) کا رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے وسیلہ سے دعا کرنا

نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ولادت سے پہلے حضرت آدم (علیہ السلام) نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے وسیلہ سے دعا مانگی جس کو خود رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بیان فرمایا:

امام بیہقی (رح) اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت عمر بن خطاب (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جب حضرت آدم (علیہ السلام) سے (اجتہادی) خطاء ہو گئی تو انھوں نے کہا: اے رب! میں تجھ سے بہ حق (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سوال کرتا ہوں کہ تو مجھے بخش دے 'اللہ عزوجل نے فرمایا: اے آدم! تم نے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو کیسے جانا حالانکہ میں نے ابھی ان کو پیدا نہیں کیا؟ حضرت آدم (علیہ السلام) نے کہا: کیونکہ اے رب! جب تو نے مجھے اپنے دست قدرت سے پیدا کیا اور تو نے مجھ میں اپنی پسندیدہ روح پھونکی تو میں سر اٹھا کر دیکھا تو عرش کے پایوں پر " لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ " لکھا ہوا تھا 'سو میں نے جان لیا کہ تو نے جس کے نام کو اپنے نام کے ساتھ ملا کر لکھا ہے وہ تجھ کو تمام مخلوق میں سب سے زیادہ محبوب ہو گا۔ اللہ عزوجل نے فرمایا: اے آدم تم نے سچ کہا وہ مجھے مخلوق میں سب سے زیادہ محبوب ہیں اور کیونکہ تم نے ان کے وسیلہ سے سوال کیا ہے اس لیے میں نے تم کو بخش دیا اور اگر محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو پیدا کرنا نہ ہوتا تو میں تم کو پیدا نہ کرتا۔

(دلائل النبوۃ ص ۴۸۹ 'مطبوعہ دارالکتب العلمیہ 'بیروت)

اس حدیث کی سند میں عبد الرحمن بن زید بن اسلم ایک ضعیف راوی ہے لیکن فضائل میں حدیث ضعیف معتبر ہوتی ہے۔ امام طبرانی (رح) نے بھی اس حدیث کو اپنی سند کے ساتھ حضرت عمر (رض) سے روایت کیا ہے

(معجم صغیر ج ۲ ص ۸۳۔ ۸۲ 'مطبوعہ مکتبہ سلفیہ 'مدینہ منورہ '۱۳۸۸ھ)

امام ابن جوزی (رح) نے بھی اس حدیث کو حضرت عمر (رض) سے روایت کیا ہے 'اور حضرت میسرہ (رض) سے بھی اس مضمون کی حدیث کو روایت کیا ہے۔

(الوفاء ص ۳۳ 'مطبوعہ مکتبہ نوریہ رضویہ 'فیصل آباد)

شیخ ابن تیمیہ نے بھی ان دونوں حدیثوں کو روایت کیا ہے 'لیکن انھوں نے لکھا ہے کہ ابونعیم حافظ نے اس حدیث کو "دلائل النبوۃ" میں روایت کیا ہے 'اس نسبت میں شیخ ابن تیمیہ (رح) کو خطالاحق ہوئی 'یہ حدیث حافظ ابونعیم کی "دلائل النبوۃ" میں نہیں ہے بلکہ حافظ بیہقی (رح) کی "دلائل النبوۃ" میں ہے 'ان دونوں حدیثوں کے متعلق شیخ ابن تیمیہ لکھتے ہیں:

یہ دونوں حدیثیں احادیث صیحہ کی تفسیر کے درجہ میں ہیں۔

(مجموع الفتاوی ج ۲ س ۹۶ 'مطبوعہ دارالجیل 'ریاض '۱۴۱۸ھ)

حضرت عمر (رض) کی اس روایت کو حافظ الہیثمی نے بھی ذکر کیا ہے 'وہ اس روایت کو درج کرنیکے بعد لکھتے ہیں: اس حدیث کو امام طبرانی (رح) نے "معجم صغیر" اور "معجم اوسط" میں روایت کیا ہے اور اس کے ایک راوی کو میں نہیں پہچانتا۔

(مجمع الزوائد ج ۸ ص ۲۵۳ 'مطبوعہ دارالکتاب العربی '۱۴۰۲ھ)

شیخ ناصر الدین البانی نے بھی اس حدیث کا ذکر کیا ہے۔

(توسل ص ۱۰۶ 'مطبوعہ مکتب اسلامی 'بیروت)

امام حاکم نیشاپوری نے بھی اس حدیث کو حضرت عمر (رض) سے روایت کیا ہے اور اس کو صحیح الاسناد لکھا ہے۔

(المستدرک ج ۲ ص ۶۱۵ دار الباز للنشر والتوزیع 'مکہ مکرمہ)

امام حاکم نیشاپوری نے ایک اور حدیث اس کے مقارب روایت کی ہے۔

حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی طرف یہ وحی کی: اے عیسیٰ (علیہ السلام)! محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ایمان لاؤ 'اور جو تمہاری امت میں سے ان کا زمانہ پائے اس کو بھی ان پر 'ایمان لانے کا حکم دو 'کیونکہ اگر محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نہ ہوتے تو میں آدم (علیہ السلام) کو پیدا نہ کرتا اور اگر محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نہ ہوتے تو جنت اور دوزخ کو پیدا نہ کرتا اور میں نے عرش کو پانی پر پیدا کا تو وہ ہلنے لگا ' پھر میں نے اس پر لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ لکھا تو وہ ساکن ہو گیا۔ یہ حدیث صحیح الاسناد ہے اور امام بخاری (رح) اور امام مسلم (رح) نے اس کو روایت نہیں کیا۔

(المستدرک ج ۲ ص ٦١٥ 'مطبوعہ دارالباز للنشر والتوزیع 'مکہ مکرمہ)

علامہ ذہبی (رح) نے ان دونوں حدیثوں کے راویوں کی صحت سے اختلاف کیا ہے 'لیکن شیخ ابن تیمیہ کی تصحیح مقدم ہے۔

علامہ سیوطی (رح) نے امام حاکم 'امام بیہقی (رح) 'امام طبرانی (رح) امام ابونعیم (رح) اور امام ابن عساکر حوالے سے حضرت عمر (رض) کی روایت کو بیان کیا ہے۔ (خصائص کبری ج ۱ ص ٦ 'مطبوعہ مکتبہ نوریہ رضویہ 'فیصل آباد)

علامہ قسطلانی (رح) نے بھی حضرت عمر (رض) کی روایت کو امام حاکم (رح) کے حوالے سے نقل کیا ہے۔

(المواہب اللدنیہ مع الزرقانی ج ۱ ص ۴۴ مطبوعہ دار الفکر بیروت '۱۳۹۳ھ)

علامہ زرقانی (رح) نے اس کی شرح میں امام حاکم (رح) اور ابوالشیخ کے حوالے سے حضرت ابن عباس (رض) کی مذکور الصدر روایت بیان کی ہے اور لکھتے ہیں کہ امام حاکم (رح) اور ابوالشیخ کے حوالے سے حضرت ابن عباس (رض) کی مذکور الصدر روایت بیان کی ہے اور لکھتے ہیں کہ امام حاکم (رح) نے اس روایت کو صحیح قرار دیا ہے اور علامہ سبکی (رح) نے "شفاء القام" میں اور علامہ بلقینی (رح) نے اپنے فتاوی میں اس تصحیح کی تائید کی ہے اور کہا ہے کہ اس قسم کی بات رائے سے نہیں کہی جاسکتی 'اس لیے یہ حدیث حکما مرفوع ہے 'علامہ ذہبی (رح) نے کہا: اس کی سند میں عمرو بن اوس ہے 'پتا نہیں وہ کون ہے؟ اور امام دیلمی (رح) نے حضرت ابن عباس (رض) سے مرفوعا روایت کیا ہے کہ میرے پاس حضرت جبرائیل آئے اور انھوں نے کہا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اگر آپ نہ ہوتے تو میں جنت کو پیدا کرتا نہ نار کو پیدا کرتا۔ (شرح المواہب اللدنیہ ج ۱ ص ۴۴ 'مطبوعہ دار الفکر 'بیروت '۱۳۹۳ھ)

ملا علی قاری نے بھی امام دیلمی (رح) کی اس روایت کو استشہاد کے طور پر پیش کیا ہے۔

(موضوعات کبیر ص ۵۹ مطبوعہ مطبع مجتبائی ' دہلی ' ۱۳۱۵ ھ)

حضرت مجدد الف ثانی (رح) نے حقیقت محمدی پر بحث کرتے ہوئے یہ دو حدیثیں لکھی ہیں:

اگر آپ کو پیدا کرنا نہ ہوتا تو میں افلاک کو پیدا نہ کرتا ' اگر آپ کو پیدا کرنا نہ ہوتا تو میں اپنی ربوبیت کو ظاہر نہ کرتا۔ (مکتوبات دفتر سوم ' حصہ دوم ' مکتوب نمبر ۱۲۲)

یہ حدیثیں ہر چند کہ ان الفاظ کے ساتھ کتب حدیث میں مذکور نہیں ہیں لیکن یہ معنی ثابت ہیں ' حدیث لولاک پر " مقالات سعیدی " میں ہمارا ایک تفصیلی مقالہ ہے۔

ان احادیث سے یہ واضح ہو گیا کہ مقربین بارگاہ کے وسیلہ سے دعا کرنا ابتداء آفرینش سے مشروع اور معمول ہے اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مقام مدح میں اس دعا کا ذکر فرما کر اس کے جواز اور استحسان کو بیان فرما دیا۔

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا خود اپنے وسیلہ سے دعا فرمانا

حافظ الہیثمی (رح) بیان کرتے ہیں:

حضرت انس بن مالک (رض) بیان کرتے ہیں کہ جب حضرت علی (رض) کی والدہ حضرت فاطمہ بنت اسد بن ہاشم (رض) فوت ہو گئیں اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان کی لحد کھودنے سے فارغ ہو گئے تو آپ ان کی لحد میں لیٹ گئے اور یہ دعا کی: اللہ ہی جلاتا ہے اور وہی مارتا ہے ' اور وہی زندہ ہے جسے موت نہیں آئے گی ' اے اللہ! اپنے نبی اور مجھ سے پہلے انبیاء (علیہ السلام) کے وسیلہ سے میری ماں فاطمہ بنت اسد کی مغفرت فرما ' ان کو حجت القا فرما ' اس کی قبر کو وسیع کر ' بلاشبہ تو سب سے زیادہ رحم فرمانے والا ہے ' پھر آپ نے ان کی نماز جنازہ پڑھی اور آپ نے ' حضرت عباس (رض) نے، اور حضرت ابو بکر صدیق (رض) نے ان کو قبر میں اتارا ' اس حدیث کو امام طبرانی (رح) نے " کبیر " اور " اوسط " میں روایت کیا ہے ' اس میں روح بن صلاح نام کا ایک روای ہے ' امام حبان اور امام حاکم نے اس کی توثیق کی ہے اور اس میں ضعف ہے ' اور اس کے باقی روای حدیث صحیح کے روای ہیں۔ (مجمع الزوائد ج ۹ ص ۲۵۷ ' مطبوعہ دار الکتاب العربی ' بیروت ' ۱۴۰۲ ھ)

اس حدیث کو علامہ نورالدین سمہودی (رح) نے بھی ذکر کیا ہے۔ (وفاء الوفاء ج ۳ ص ۸۹۹۔۸۹۸ ' مطبوعہ داراحیاء التراث العربی ' بیروت)

شیخ ناصر الدین البانی (رح) نے بھی اس حدیث کا ذکر کیا ہے۔ (توسل ص ۱۰۲ ' مطبوعہ مکتب اسلامی ' بیروت)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے وسیلہ سے دعا کرنا نہ صرف حضرت آدم (علیہ السلام) کی بلکہ خود نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بھی سنت ہے۔

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا خود اپنے وسیلہ سے دعا کرنے کی ہدایت دینا

انبیاء کرام (علیہم السلام) اور بزرگان دین کے وسیلہ سے دعا کرنے کی اصل یہ حدیث ہے:

حضرت عثمان بن حنیف (رض) بیان کرتے ہیں کہ ایک نابینا شخص نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوا ' اس نے عرض کیا: آپ اللہ سے دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ میری آنکھیں ٹھیک کر دے آپ نے فرمایا: اگر تم چاہو تو میں اس کام کو موخر کردوں اور یہ تمہارے لیے بہتر ہو گا اور اگر تم چاہو تو (ابھی) دعا کر دوں ' اس نے کہا: آپ دعا کر دیجیے آپ نے فرمایا: تم اچھی طرح وضو کرو دو رکعت نماز پڑھو ' اس کے بعد یہ دعا کرو: "اے اللہ! میں تجھ سے سوال کرتا ہوں اور محمد نبی رحمت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے وسیلہ سے تیری طرف متوجہ ہوتا ہوں ' اے محمد !(صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں آپ کے وسیلہ سے اس حاجت میں اپنے رب کی طرف متوجہ ہوا ہوں تاکہ میری یہ حاجت پوری ہو ' اے اللہ! نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو میرے لیے شفاعت کرنے والا بنادے۔

(سنن ابن ماجہ ص ۹۹ مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب ' کراچی)

اس حدیث کو امام ترمذی (رح) نے بھی روایت کیا ہے۔

(جامع ترمذی ص ۵۱۵ ' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب ' کراچی)

اس حدیث کو امام احمد (رح) نے بھی روایت کیا ہے۔

(مسند احمد ج ۴ ص ۱۳۸ ' مطبوعہ مکتب اسلامی ' بیروت ' ۱۳۹۸ھ)

اس حدیث کو امام حاکم (رح) نے بھی روایت کیا ہے۔

(مستدرک ج ا ص ۵۱۹ ،مطبوعہ دار الباز للنشر والتوزیع ،مکہ مکرمہ)

اس حدیث کو امام ابن عساکر (رح) نے بھی روایت کیا ہے۔

(مختصر تاریخ دمشق ج ۳ ص ۳۰۴ ،مطبوعہ دار الفکر ، دمشق)

امام ابن ماجہ (رح) ،امام ترمذی (رح) امام احمد (رح) اور امام حاکم (رح) نے اس حدیث کو عمارہ بن خزیمہ بن ثابت کی سند سے روایت کیا ہے اور امام بیہقی (رح) نے اس حدیث کو اس سند کے علاوہ ابو امامہ بن سہل بن حنیف کی سند سے بھی روایت کیا ہے اس روایت میں یہ اضافہ ہے:

قال عثمان: فو اللہ ما تفرقنا ولا طال الحدیث حتی دخل الرجال وکانہ لم یکن بہ ضر قط۔

(امام ابو بکر احمد بن حسین بیہقی (رح) متوفی ۴۵۸ھ ،دلائل النبوۃ ج ۶ ص ۱۶۷ ،مطبوعہ دار الکتاب العلمیہ بیروت)

حضرت عثمان بن حنیف (رض) نے کہا: بہ خدا! ابھی ہم اس مجلس سے اٹھے نہیں تھے اور نہ ابھی سلسلہ گفتگو دراز ہوا تھا کہ وہ (نابینا) شخص اس حال میں داخل ہوا کہ اس کی آنکھ میں کوئی تکلیف نہیں تھی۔

امام ابن السنی نے بھی اس حدیث کو ابو امامہ بن سہل بن حنیف کی سند سے روایت کیا ہے ،جس میں مذکورہ الصدر اضافہ ہے۔ (عمل الیوم واللیلہ ص ۲۰۲ ،مطبوعہ مجلس الدائرۃ المعارف ،دکن ،۱۳۱۵ھ)

علامہ نووی (رح) نے اس حدیث کو امام ابن ماجہ (رح) اور امام ترمذی (رح) کے حوالوں سے بیان کیا اور اس میں یا محمد کے الفاظ ہیں ،علامہ نووی (رح) نے لکھا ہے کہ امام ترمذی (رح) نے اس حدیث کو حسن صحیح لکھا ہے۔ امام نسائی (رح) نے اس حدیث کو سنن کبری (ج ۶ ص ۱۶۹ ،مطبوعہ دار الکتب العلمیہ ،بیروت ،۱۴۱۱ھ) میں روایت کیا ہے۔

امام محمد جزری (رح) نے اس حدیث کو امام ترمذی (رح) ،امام حاکم (رح) اور امام نسائی (رح) کے حوالوں سے ذکر کیا اور اس میں بھی یا محمد کے الفاظ ہیں۔ (الاذکار ص ۱۲۷ ،مطبوعہ دار الفکر ،بیروت ،۱۳۷۵ھ)

قاضی شوکانی (رح) "حصن حصین "کی شرح میں لکھتے ہیں:

اس حدیث کو امام ترمذی (رح) ،امام حاکم (رح) نے "مستدرک "میں اور نسائی (رح) نے روایت کیا ہے جیسا کہ مصنف (رح) نے بیان کیا ہے ،امام طبرانی (رح) نے اس حدیث کو تمام اسانید بیان کرنے کے بعد کہا: یہ حدیث صحیح ہے ،امام ابن خزیمہ (رح) نے بھی اس حدیث کو صحیح کہا ،سوان ائمہ نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے البتہ نسائی کی

روایت میں یہ تفرد ہے کہ اس میں یہ ذکر بھی ہے: اس نے دو رکعت نماز پڑھی 'اس حدیث میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا وسیلہ پیش کرنے کے جواز کی دلیل ہے 'اس لیے ساتھ یہ اعتقاد لازم ہے کہ حقیقۃ دینے والا اور منع کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے 'جو وہ چاہتا ہے وہ ہو جاتا ہے اور جو وہ نہیں چاہتا وہ نہیں ہوتا۔

(تحفۃ الذاکرین ص ۱۳۸۔۱۳۷ 'مطبوعہ مطبع مصطفےٰ البابی واولادہ 'مصر '۱۳۵۰ھ)

حضرت عثمان بن حنیف (رض) کی یہ حدیث جس کی بکثرت محدثین نے اپنی اپنی تصانیف میں صحت سند کی صراحت کے ساتھ روایت کیا ہے اس مطلوب پر قوی دلیل ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے وسیلہ سے دعا کرنا اور آپ سے دعا کی درخواست کرنا جائز اور مستحسن ہے اور چونکہ آپ کی ہدایات قیامت تک کے مسلمانوں کے لیے حجت ہیں 'اس لیے آپ کے وصال کے بعد بھی آپ کے وسیلہ سے دعا کرنا اور آپ سے دعا کی درخواست کرنا جائز ہے اور بالخصوص آپ کے وصال کے بعد آپ کے توسل سے دعا کے جواز پر دلیل یہ ہے کہ حضرت عثمان بن حنیف (رض) نے حضرت عثمان (رض) کے زمانہ خلافت میں ایک شخص کو اس کی قضاء حاجت کے لیے یہ دعا تعلیم کی 'اس حدیث کو امام طبرانی (رح) اور امام بیہقی (رح) نے اپنی اپنی تصانیف میں صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے 'جیسا کہ عنقریب ہم بیان کریں گے۔ یہاں تک جو ہم نے احادیث بیان کی ہیں ان میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی حیات ظاہرہ میں آپ کے توسل پر دلیل ہے 'اب ہم ایسی احادیث پیش کر رہے ہیں جن میں آپ کی وفات کے بعد آپ کے توسل پر دلیل ہے۔

حضرت عمر (رض) کے زمانہ خلافت میں صحابہ (رض) کا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے دعا کی درخواست کرنا۔

حضرت عمر (رض) کے زمانہ میں ایک سال قحط پڑ گیا تو حضرت بلال بن حارث مزنی (رض) رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے روضہ پر حاضر ہوئے اور عرض کیا: اپنی امت کے لیے بارش کی دعا کیجیے۔

حافظ ابن ابی شیبہ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

مالک الدار 'جو حضرت عمر (رض) کے وزیر خوراک تھے وہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر (رض) کے زمانہ میں (ایک بار) لوگوں پر قحط آ گیا 'ایک شخص (حضرت بلال بن حارث مزنی (رض) رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی قبر

مبارک پر گیا اور عرض کیا: یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! اپنی امت کے لیے بارش کی دعا کیجئے کیونکہ وہ (قحط سے) ہلاک ہورہی ہے 'نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس شخص کے خواب میں تشریف لائے اور فرمایا: عمر کے پاس جاؤان کو سلام کہو اور یہ خبر دو کہ تم پر یقیناً بارش ہوگی 'اور ان سے کہو: تم پر سوجھ بوجھ لازم ہے 'تم پر سوجھ بوجھ لازم ہے 'پھر وہ حضرت عمر (رض) کے پاس گئے اور ان کو یہ خبر دی 'حضرت عمر (رض) رونے لگے اور کہا: اے اللہ! میں صرف اسی چیز کو ترک کرتا ہوں جس میں میں عاجز ہوں۔

(المصنف ج ۱۲ ص ۳۲ 'مطبوعہ ادارۃ القرآن 'کراچی '۱۴۰۶ھ)

نیز حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں:

حافظ ابو بکر بیہقی (رح) اپنی سند کے ساتھ مالک سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب کے زمانہ میں (ایک بار) قحط واقع ہوا ایک شخص (حضرت بلال بن حارث مزنی (رض) نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی قبر مبارک پر حاضر ہوا اور عرض کیا: یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! اپنی امت کے لیے بارش کی دعا کیجئے کیونکہ وہ (قحط سے) ہلاک ہورہی ہے 'نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس شخص کے خواب میں تشریف لائے اور فرمایا: عمر کے پاس جاؤان کو سلام کہو اور یہ خبر دو کہ تم پر یقیناً بارش ہوگی 'اور ان سے کہو: تم پر سوجھ بوجھ لازم ہے 'تم پر سوجھ بوجھ لازم ہے 'پھر وہ حضرت عمر (رض) کے پاس گئے اور ان کو یہ خبر دی 'حضرت عمر (رض) نے کہا: اے میرے رب! میں صرف اسی چیز کو ترک کرتا ہوں جس میں میں عاجز ہوں۔ اس حدیث کی سند صحیح ہے۔

(البدایہ والنہایہ ج ۷ ص ۹۲۔ ۹۱ مطبوعہ دارالفکر 'بیروت)

حافظ ابوعمرو بن عبد البرا (حافظ عمرو یوسف بن عبداللہ عبدالبر قرطبی مالکی متوفی ۴۶۳ھ 'الاستیعاب علی ھامش الاطابہ ج ۲ ص ۴۶۴ 'مطبوعہ دارالفکر 'بیروت) اور حافظ ابن کثیر نے بھی اس روایت کو ذکر کیا ہے۔

(الکامل فی التاریخ ج ۲ ص ۳۹۰۔ ۳۸۹ 'مطبوعہ دارالکتاب العربیہ بیروت '۱۴۰۰ھ)

علم حدیث میں حافظ ابن کثیر کی شخصیت موافقین اور مخالفین سب کے نزدیک مسلم ہے اور حافظ ابن کثیر (رح) نے امام بیہقی (رح) کی اس روایت کو صحیح قرار دیا ہے اور اس روایت میں یہ تصریح ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے وصال کے بعد حضرت بلال بن حارث مزنی (رض) نے آپ کے قبر انور پر جاکر آپ سے بارش کی دعا کے

لیے درخواست کی اور حضرت عمر (رض) سے یہ واقعہ اور اپنا خواب بیان کیا اور حضرت عمر (رض) نے اس کو مقرر رکھا اور اس پر انکار نہیں کیا ' اس سے معلوم ہوا کہ حضرت عمر (رض) کے نزدیک بھی وصال کے بعد صاحب قبر سے دعا کی درخواست کرنا جائز ہے۔

اس حدیث کے متعلق حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں

امام ابن ابی شیبہ نے سند صحیح کے ساتھ حضرت عمر کے خازن مالک الدار سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر (رض) کے زمانہ میں (ایک بار) قحط واقع ہوا ' ایک شخص نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی قبر مبارک پر حاضر ہوا اور عرض کیا : یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ! اپنی امت کے لیے بارش کی دعا کیجئے ' کیونکہ وہ ہلاک ہو رہی ہے ' پھر اس شخص کو خواب میں آپ کی زیارت ہوئی اور یہ کہا گیا کہ عمر کے پاس جاؤ ' الحدیث۔ سیف نے ”فتوح“ میں روایت کیا ہے کہ جس شخص نے یہ خواب دیکھا تھا وہ یکے از صحابہ حضرت بلال بن حارث مزنی (رض) تھے۔

(فتح الباری ج ۲ ص ۴۹۶ مطبوعہ دار نشر الکتب الاسلامیہ ' لاہور ۱۴۰۱ ھ)

اس حدیث کو حافظ ابن کثیر اور حافظ ابن حجر عسقلانی دونوں نے سنداً صحیح قرار دیا ہے اور ان دونوں کی تصحیح کے بعد کسی تردد کی گنجائش باقی نہیں رہتی اور نہ کسی کا انکار درخور اعتناء ہے۔

حضرت عثمان (رض) کے زمانہ خلافت میں صحابہ (رض) کا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے دعا کی درخواست کرنا:

حضرت عثمان بن حنیف (رض) بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص اپنے کسی کام سے حضرت عثمان بن عفان (رض) کے پاس جاتا تھا اور حضرت عثمان (رض) اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتے تھے ' اور نہ اس کے کام کی طرف دھیان دیتے تھے ' ایک دن اس شخص کی حضرت عثمان بن حنیف (رض) سے ملاقات ہوئی ' اس نے حضرت عثمان بن حنیف (رض) سے اس بات کی شکایت کی ' حضرت عثمان (رض) نے اس سے کہا: تم وضو خانہ جا کر وضو کرو ' پھر مسجد میں جاؤ اور وہاں دو رکعت نماز پڑھو ' پھر یہ کہو: اے اللہ ! میں تجھ سے سوال کرتا ہوں اور ہمارے نبی، نبی رحمت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے وسیلہ سے تیری طرف متوجہ ہوتا ہوں ' اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں آپ کے واسطے

سے آپ کے رب عزوجل کی طرف متوجہ ہوا ہوں تاکہ وہ میری حاجت روائی کرے اور اپنی حاجت کا ذکر کرنا ' پھر میرے پاس آنا حتی کہ میں تمہارے ساتھ جاؤں ' وہ شخص گیا اور اس نے حضرت عثمان بن حنیف (رض) کے بتائے ہوئے طریقہ پر عمل کیا ' پھر وہ حضرت عثمان بن عفان (رض) کے پاس گیا ' دربان نے ان کے لیے دروازہ کھولا اور ان کو حضرت عثمان بن عفان (رض) کے پاس لے گیا، حضرت عثمان (رض) نے اس کو اپنے ساتھ مسند پر بٹھایا اور پوچھا ' تمہارا کیا کام ہے ؟ اس نے اپنا کام ذکر کیا ' حضرت عثمان (رض) نے اس کا کام کردیا: تم نے اس سے پہلے اب تک اپنے کام کا ذکر نہیں کیا تھا اور فرمایا: جب بھی تمہیں کوئی کام ہو تو تم میرے پاس آجانا ' پھر وہ شخص حضرت عثمان (رض) کے پاس چلا گیا اور جب اس کی حضرت عثمان بن حنیف (رض) سے ملاقات ہوئی تو اس نے کہا: اللہ تعالیٰ آپ کو جزاء خیر دے ' حضرت عثمان (رض) میری طرف متوجہ نہیں ہوتے تھے اور میرے معاملہ میں غور نہیں کرتے تھے حتی کہ آپ نے ان سے میری سفارش کی ' حضرت عثمان بن حنیف (رض) نے کہا: بخدا! میں نے حضرت عثمان (رض) سے کوئی بات نہیں کی، لیکن ایک مرتبہ میں رسول کی خدمت میں موجود تھا ' آپ کے پاس ایک نابینا شخص آیا اور اس نے اپنی نابینائی کی آپ سے شکایت کی ' نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: کیا تم اس پر صبر کرو گے ؟ اس نے کہا: یارسول اللہ ! مجھے راستہ دکھانے والا کوئی نہیں ہے اور مجھے بڑی مشکل ہوتی ہے ' نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس سے فرمایا: تم وضو خانے جاؤ اور وضو کرو ' پھر دو رکعت نماز پڑھو ' پھر ان کلمات سے دعا کرو ' حضرت عثمان بن حنیف (رض) نے کہا: ابھی ہم الگ نہیں ہوئے تھے اور نہ ابھی زیادہ باتیں ہوئی تھیں کہ وہ نابینا شخص آیا درآں حالیکہ اس میں بالکل نابینائی نہیں تھی، یہ حدیث صحیح ہے۔

حافظ زکی الدین عبدالعظیم بن عبدالقوی منذری متوفی ٦٥٦ ھ نے " الترغیب والترہیب " (ج ١ ص ٤٧٦۔ ٤٧٤ ' مطبوعہ دارالحدیث ' قاہرہ ' ١٤٠٧ ھ) میں اور حافظ الہیثمی (رح) نے مجمع الزوائد (ج ٢ ص ٢٧٩ ' مطبوعہ بیروت) میں اس حدیث کو بیان کرکے لکھا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے۔

شیخ ابن تیمیہ کے حوالے سے حضرت عثمان بن حنیف (رض) کی روایت کی تائید 'توثیق اور تصیح

امام طبرانی (رح) نے اس حدیث کو روایت کر کے کہا: اس حدیث کو شعبہ نے ابو جعفر سے روایت کیا ہے اور شعبہ سے اس حدیث کو صرف عثمان بن عمر (رض) نے روایت کیا ہے اور وہ اس روایت کرنے میں متفرد ہے (یعنی اس کا کوئی متابع نہیں ہے اور یہ حدیث غریب ہے) اور حدیث صحیح ہے 'شیخ ابن تیمیہ نے امام طبرانی (رح) پر اعتراض کیا کہ اس حدیث کو شعبہ سے روایت کرنے میں صرف عثمان بن عمر (رض) متفرد نہیں ہے بلکہ روح بن عبادہ نے بھی اس حدیث کو شعبہ سے روایت کیا ہے اور یہ اسناد صحیح ہے 'اس کا خلاصہ یہ ہے امام طبرانی (رح) کی یہ روایت دو صحیح سندوں سے مروی ہے 'شیخ ابن تیمیہ کی اصل عبارت یہ ہے:

امام طبرانی (رح) نے کہا: اس حدیث کو شعبہ نے ابو جعفر سے روایت کیا ہے اور اس کا نام عمر بن ابی یزید ہے اور وہ ثقہ ہے 'عثمان بن ابی عمر 'شعبہ سے اس روایت میں متفرد ہے۔ ابو عبداللہ مقدسی نے کہا: اور حدیث صحیح ہے۔

میں کہتا ہوں کہ امام طبرانی (رح) نے اپنے مبلغ علم کے اعتبار سے عثمان بن ابی عمر (رض) کو متفرد کہا ہے 'ان کو یہ معلوم نہیں ہوا کہ روح بن عبادہ نے بھی شعبہ سے اس حدیث کو روایت کیا ہے اور یہ اسناد صحیح ہے 'اس سے معلوم ہوا کہ عثمان بن ابی عمر (رض) اس روایت میں متفرد نہیں ہے۔ (مجموع الفتاوی ج ١ ص ١٩٥۔ ١٩٤ 'مطبوعہ دارالجیل 'ریاض '١٤١٨ھ)

طبرانی کی روایت مذکورہ کا صحاح کی دوسری روایت سے تعارض کا جواب

ایک سوال یہ ہو سکتا ہے کہ حضرت عثمان بن حنیف (رض) کی اس روایت کو امام ترمذی (رح) 'امام ابن ماجہ (رح) 'امام احمد (رح) اور امام ابن سنی (رح) نے روایت کیا اور اس میں حضرت عثمان (رض) کے زمانہ خلافت میں وسیلہ کے ساتھ دعا کا ذکر نہیں ہے 'اس کے بر خلاف امام طبرانی (رح) اور امام بیہقی (رح) نے حضرت عثمان بن حنیف (رض)

کی اس روایت میں حضرت عثمان (رض) کے زمانہ خلافت میں بھی حضور سے توسل کرنے کا ذکر کیا ہے ' اس کی کیا وجہ ہے؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ایک حدیث کو بعض ائمہ اختصار کے ساتھ روایت کرتے ہیں اور بعض ائمہ تفصیل کے ساتھ روایت کرتے ہیں ' اعتراض کا محل یہ تھا کہ اس روایت کی سند صحیح نہ ہوتی یا ضعیف ہوتی اور جب شیخ ابن تیمیہ نے خود بیان کیا کہ طبرانی (رح) کی مفصل حدیث دو صحیح سندوں کے ساتھ مروی ہے تو پھر اعتراض کی کب گنجائش ہے؟

امام بیہقی (رح) نے پہلے دو سندوں کے ساتھ اس حدیث کو اختصارا روایت کیا (دلائل النبوۃ ج ۲ ص ۱۶۷۔۱۶۶) پھر اس حدیث کو روح بن قاسم عن ابی جعفر مدینی عن ابی امامہ بن سہل بن حنیف کی سند سے تفصیل کے ساتھ روایت کیا جیسا کہ امام طبرانی نے روایت کیا ہے اور اس کے بعد مزید یہ کہا:

اس حدیث کو ہشام دستوائی نے از ابو جعفر از ابو امامہ بن سہل از عم خود روایت کیا ہے ' ابو امامہ کے چچا حضرت عثمان بن حنیف (رض) ہیں۔ (لائل النبوۃ ج ۶ ص ۱۶۸ ' مطبوعہ دارالکتب العلمیہ ' بیروت)

امام بیہقی (رح) کی اس مفصل روایت کا اور اس دوسری سند کا شیخ ابن تیمیہ نے بھی ذکر کیا ہے ' لکھتے ہیں:

امام بیہقی (رح) نے اس سند کے ساتھ قصہ کو روایت کیا ہے اور اس سے آپ کے وصال کے بعد آپ سے توسل پر استدلال کیا جاتا ہے ' بشرطیکہ یہ روایت صحیح ہو (فتاوی ابن تیمیہ ج ۱ ص ۲۶۸ ' مطبوعہ بامر فہد بن عبدالعزیز آل السعود)

توسل بعد از وصال پر شیخ ابن تیمیہ کے اعتراضات اور مصنف کے جوابات

شیخ ابن تیمیہ (رح) نے یہ تو کہا ہے کہ اگر اس حدیث کی سند صحیح ہو تو اس حدیث سے وفات کے بعد وسیلہ ثابت ہے ' لیکن انھوں نے اس حدیث کی سند پر کوئی اعتراض نہیں کیا اور اس میں کوئی ضعف نہیں نکال سکے ' علاوہ امام بیہقی (رح) کی روایت بیان کرنے کے بعد انھوں نے اسی روایت کو امام طبرانی (رح) کے حوالہ بیان کرچکے ہیں ' لہذا جب امام طبرانی (رح) کی روایت صحیح ہے اور اس روایت کی دوسری سند بھی صحیح ہے تو شیخ ابن تیمیہ کے اپنے اقرار کے

مطابق وفات کے بعد وسیلہ ثابت ہو گیا اور یہ واضح ہو گیا کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے وصال کے بعد آپ سے دعا کی درخواست کرنا اور آپ کو یا محمد کے صیغہ سے ندا کرنا صحابہ کرام (رض) کے نزدیک جائز تھا، جبھی حضرت عثمان بن حنیف (رض) نے ایک شخص کو یہ دعا تلقین کی کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! میں آپ کے وسیلہ سے آپ کے رب کی طرف متوجہ ہوتا ہوں تاکہ وہ میری حاجت پوری کردے۔

شیخ ابن تیمیہ (رح) نے اس بحث میں جو آخری اعتراض کیا ہے وہ یہ ہے:

حافظ ابوبکر بن خیثمہ نے اپنی تاریخ میں اس حدیث کو ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے:

حضرت عثمان بن حنیف (رض) بیان کرتے ہیں کہ ایک نابینا شخص نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے عرض کیا: میری بینائی چلی گئی ہے 'آپ اللہ تعالیٰ سے میرے لیے دعا کیجئے 'آپ نے فرمایا: جاکر وضو کرو اور دو رکعت نماز پڑھو 'پھر کہو: اے اللہ! میں تجھ سے سوال کرتا ہوں اور تیرے نبی محمد نبی رحمت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے وسیلہ سے تیری طرف متوجہ ہوتا ہوں 'اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! میں اپنے رب کے حضور اپنی بصارت لوٹانے کے لیے آپ کی شفاعت طلب کرتا ہوں 'اے الہ! میرے حق میں میری شفاعت کو قبول کر اور میری بصارت لوٹانے میں میری نبی کی شفاعت قبول فرما 'اور اگر تمہیں کوئی اور کام ہو تو پھر اسی طرح کرنا پھر اللہ تعالیٰ نے اس کی بصارت لوٹادی۔ (فتاوی ابن تیمیہ ج ۱ ص ۲۷۵ 'مطبوعہ بامر فہد بن عبدالعزیز آل السعود)

اس روایت پر شیخ ابن تیمیہ نے حسب ذیل اعتراضات کیے ہیں

(۱) اگر تمہیں کوئی اور کام ہو تو اسی طرح کرو" یہ حضرت عثمان بن حنیف (رض) کے الفاظ ہیں 'نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے الفاظ نہیں ہیں۔

(۲) دوسرے راویوں کی روایت میں یہ الفاظ نہیں ہیں (جیسا کہ گزر چکا ہے) اور اگر بالفرض یہ الفاظ ثابت ہوں تب بھی یہ دلیل نہیں ہے 'کیونکہ اس سے زیادہ سے زیادہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ دعا کے بعض الفاظ کافی ہیں 'کیونکہ انھوں نے مشروع دعا کرنے کا حکم نہیں دیا بلکہ دعا کے بعض الفاظ کہنے کا حکم دیا ہے۔

(۳) حضرت عثمان بن حنیف (رض) نے یہ گمان کیا کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی وفات کے بعد بھی اس طرح (یعنی حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے وسیلہ سے) دعا کرنا جائز ہے ' حالانکہ حدیث کے الفاظ اس کے خلاف ہیں ' کیونکہ نابینا صحابی (رض) نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے یہ سوال کیا تھا کہ آپ اس کے لیے دعا کریں اور اس کو یہ یقین تھا کہ آپ اس کے لیے دعا کریں گے اور آپ نے اس کو حکم دیا تھا کہ وہ دعا میں یہ کہے کہ اے اللہ! حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی شفاعت میرے حق میں قبول فرما! اور اس طریقہ سے یہ دعا اس وقت صحیح ہو گی جب نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس کے لیے دعا کریں اور اس کی شفاعت کریں اور جس کو آپ کی دعا کرنے اور آپ کے شفاعت کرنے کا علم نہیں ہے، اس کا اس طریقہ سے دعا کرنا صحیح نہیں ہے ' اس طریقہ سے دعا کرنا اور شفاعت طلب کرنا آپ کی حیات دنیاوی میں ہی درست تھا اور یا قیامت کے دن درست ہو گا جب آپ شفاعت فرمائیں گے۔ (فتاوی ابن تیمیہ ج ۱ ص ۲۷۶۔ ۲۷۴ ' مطبوعہ بامر فہد بن عبد العزیز)

پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ اگر یہ الفاظ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے نہ ہوں بلکہ حضرت عثمان بن حنیف (رض) ہی کے ہوں تب بھی کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ کسی چیز کے جائز ناجائز ہونے میں شیخ ابن تیمیہ کی بہ نسبت صحابی رسول کی فہم اور ان کے اجتہاد پر اعتماد کرنا زیادہ قرین قیاس ہے۔

دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ حافظ ابن ابی خیثمہ کی اس روایت سے ہمارا استدلال نہیں ہے ' اگر اس پر شیخ کو اعتراض ہے تو اس روایت کو ہم چھوڑ دیتے ہیں ' ہمارا استدلال تو امام طبرانی (رح) کی روایت ہے جس کے متعلق خود شیخ ابن تیمیہ (رح) نے تصریح کی ہے کہ یہ دو صحیح سندوں سے مروی ہے۔

تیسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ جب ہم رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے دعا کی درخواست کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ آپ کی اس درخواست کی طرف متوجہ کر دیتا ہے یا اس درخواست پر مطلع کر دیتا ہے ' پھر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہماری دعا کی قبولیت کے لیے اللہ تعالیٰ کے حضور شفاعت کرتے ہیں اور اس میں کونسا شرعی یا عقلی استبعاد ہے؟

امام مسلم (رح) روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوذر (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: مجھ پر میری امت کے اچھے اور برے تمام اعمال پیش کیے جاتے ہیں۔ (صحیح مسلم ج ۱ ص ۲۰۷ ‘مطبوعہ نور محمد اصح المطابع ‘کراچی ‘۱۳۷۵ھ)

اس حدیث کے پیش نظر جب آپ کا کوئی امتی آپ سے دعا کی درخواست کرے گا تو آپ کو اس کا علم ہو جائے گا اور آپ اس کی شفاعت فرمائیں گے ‘کیونکہ آپ نے خود اپنے وسیلہ سے دعا کرنے اور دعا کی درخواست کرنے کی ہدایت دی ہے اور اس ہدایت کو عام رکھا ہے اور اس میں حیات یا بعد از وفات کی قید نہیں لگائی ‘اس لیے شیخ ابن تیمیہ (رح) کا یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ ” اور اس طریقہ سے دعا اس وقت صحیح ہوگی، جب نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس کے لیے دعا کریں اور اس کی شفاعت کریں اور جس کو آپ کے دعا کرنے اور آپ کے شفاعت کرنے کا علم نہیں ہے اس کا اس طریقہ سے دعا کرنا صحیح نہیں ہے “کیونکہ حیات اور ممات میں وسیلہ کے جواز اور عدم جواز کا فرق علم کے ہونے یا نہ ہونے کی وجہ سے ہو سکتا تھا اور آپ کے ہر دو صورت میں علم حاصل ہے۔

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے تمام احکام مسلمانوں کے لیے قیامت تک کے لیے حجت ہیں اور آپ کے افعال مسلمانوں کے لیے اسوہ اور نمونہ ہیں ‘اگر آپ کا کوئی حکم صرف آپ کی حیات مبارکہ کے ساتھ مخصوص ہو اور بعد کے لوگوں کے لیے اس کا کرنا جائز ہو تو آپ پر لازم ہے کہ آپ یہ بیان فرمائیں کہ یہ حکم میری زندگی کے ساتھ خاص ہے اور بعد کے لوگوں کے لیے اس حکم عمل کرنا جائز نہیں ہے جیسا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت ابوبردہ بن نیار (رض) کو ایک شش ماہہ بکرے کی قربانی کرنے کا حکم دیا اور فرمادیا: تمہارے بعد کسی کے لیے یہ عمل جائز نہیں ہے ‘امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت براء (رض) بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابوبردہ (رض) نے نماز عید سے پہلے قربانی کرلی ‘نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اس کے بدلہ میں اور قربانی کرو ‘انھوں نے کہا: میرے پاس صرف چھ ماہ کا ایک بکرا ہے جو سال کے بکرے سے فربہ ہے آپ نے فرمایا: اس کے بدلہ میں اس کی قربانی کردو ‘اور تمہارے بعد کسی اور کے لیے شش ماہہ بکرے کی قربانی جائز نہیں ہوگی۔

(صحیح بخاری ج ۲ ص ۸۳۴ ‘مطبوعہ نور محمد اصح المطابع ‘کراچی ‘۱۳۸۱ھ)

نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ استثناء اس لیے بیان فرمایا کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے تمام اقوال اور افعال مسلمانوں کے حق میں قیامت تک کے لیے حجت ہیں اگر آپ یہ استثناء نہ فرماتے تو چھ ماہ کے بکرے کی قربانی سب کے لیے قیامت تک جائز ہو جاتی ' شیخ ابن تیمیہ (رح) کہتے ہیں: وفات کے بعد کسی بزرگ سے دعا کی درخواست کرنا شرک کی طرف لے جاتا ہے۔

ہر چند کہ انبیاء اور صالحین اپنی اپنی قبروں میں زندہ ہیں اور اگر یہ فرض کیا جائے کہ وہ زندوں کے لیے دعا کرتے ہیں اور بیشک اس کی تائید میں احادیث بھی ہیں ' پھر بھی کسی شخص کے لیے ان سے دعا کو طلب کرنا جائز نہیں ہے اور پہلے لوگوں میں سے کسی نے یہ نہیں کیا کیونکہ یہ شرک کا سبب ہے ' اور اللہ کو چھوڑ کر ان کی عبادت کا ذریعہ ہے ' اس کے برخلاف اگر ان کی زندگی میں ان سے دعا طلب کی جائے تو یہ شرک نہیں ہے۔

(فتاوی ابن تیمیہ ج ا ص ۳۳۰ ' مطبوعہ بامر فہد بن عبدالعزیز آل السعود)

شیخ ابن تیمیہ (رح) کا یہ قاعدہ باطل ہے کیونکہ وفات کے بعد کسی سے دعا کی درخواست کرنا شرک کا سبب ہوتا تو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس نابینا صحابی سے فرما دیتے کہ اس طریقہ سے دعا کرنا صرف میری زندگی میں جائز ہے اور میرے وصال کے بعد اس طریقہ سے دعا کرنا جائز نہیں ہے ' بلکہ شرک کا سبب ہے ' کیونکہ آپ کی بعثت کا مقصد ہی شرک کی بیخ کنی کرنا تھا اور جب نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بغیر کسی استثناء کے نابینا صحابی کو دعا کا یہ طریقہ تعلیم کیا تو معلوم ہوا کہ قیامت تک اس طریقہ سے دعا کرنا جائز ہے اور صحابی رسول حضرت عثمان بن حنیف (رض) نے اس حدیث سے یہی سمجھا تھا ' اسی وجہ سے انھوں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بعد بھی ایک شخص کو دعا کا یہ طریقہ بتلایا اور ہمارے لیے صحابی رسول کے طریقہ کی اتباع کرنا ' شیخ ابن تیمیہ (رح) کے افکار کی اتباع کرنے سے بہتر ہے۔

توسل بعد از وصال کے متعلق شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا نظریہ

شیخ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں:

کاش میری عقل ان لوگوں کے پاس ہوتی ' جو لوگ اولیاء اللہ سے استمداد اور ان کی امداد کا انکار کرتے ہیں ' یہ اس کا کیا مطلب سمجھتے ہیں ؟ جو کچھ ہم سمجھتے ہیں وہ یہ ہے کہ دعا کرنے والا ' اللہ کا محتاج ہے اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہے اور اس سے اپنی حاجت کو طلب کرتا ہے اور یہ عرض کرتا ہے کہ اے اللہ ! تو نے اپنے اس بندہ مکرم پر جو رحمت فرمائی ہے اور اس پر جو لطف و کرم کیا ہے اس کے وسیلہ سے میری اس حاجت کو پورا فرما ' کہ تو دینے والا کریم ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ وہ اس اللہ کے ولی کو ندا کرتا ہے اور اس کو مخاطب کرکے یہ کہتا ہے کہ اے بندہ خدا اور اے اللہ کے ولی ! میری شفاعت کریں اور اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کریں کہ وہ میرا سوال اور مطلوب مجھے عطا کرے اور میری حاجت برلائے ' سو مطلوب کو دینے والا اور حاجت کو پورا کرنے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے ' اور یہ بندہ درمیان میں صرف وسیلہ ہے ' اور قادر ' فاعل اور اشیاء میں تصرف کرنے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے ' اور اولیاء اللہ ' اللہ تعالیٰ کے فعل ' سطوت ' قدرت اور غلبہ میں فانی اور ہلاک ہیں اور ان کو اب قبر میں افعال پر قدرت اور تصرف حاصل ہے اور نہ اس وقت قدرت اور تصرف حاصل تھا ' جب وہ زندہ تھے۔

اور امداد و استمداد کا جو معنی میں نے ذکر کیا ہے اگر موجب شرک اور غیر اللہ کی طرف توجہ کو مستلزم ہوتا جیسا کہ منکر کا زعم فاسد ہے تو چاہیے یہ تھا کہ صالحین سے طلب دعاء اور توسل زندگی میں بھی ناجائز ہوتا حالانکہ یہ بجائے ممنوع ہونے کے بالاتفاق جائز اور مستحسن و مستحب ہے ' اور اگر منکر یہ کہیں کہ موت کے بعد اولیاء اللہ اپنے مرتبہ سے معزول ہو جاتے ہیں اور زندگی میں جو فضیلت و کرامت انھیں حاصل تھی وہ باقی نہیں رہی تو اس پر کیا دلیل ہے ؟ اور اگر یوں کہیں کہ بعد موت کے وہ ایسی آفات و بلیلات میں مبتلا ہوئے کہ انھیں دعا و غیرہ کی فرصت نہ رہی تو یہ قاعدہ کلیہ نہیں ہے اور نہ اس پر دلیل ہے کہ اولیاء کے لیے ابتلا قیامت تک رہتا ہے ' زیادہ سے زیادہ جو کہا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ ہر اہل قبر سے استمداد سود مند نہیں ہوتی بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ بعض اولیاء جذب و استغراق کی کیفیت میں ہوں اور عالم لاہوت کے مشاہدہ میں اس طرح منہمک ہوں کہ اس دنیا کے حالات کی طرف توجہ اور شعور نہ رہے تو وہ اس دنیا میں تصرف نہ کریں جیسا کہ دنیا میں بھی اولیا اللہ کے حالات مختلف ہوتے ہیں۔ ہاں اگر اولیاء اللہ کے حق میں زائرین کا یہ اعتقاد ہو کہ وہ مدد کرنے میں مستقل ہیں اور اللہ کی جانب میں توجہ کئے بغیر بطور خود ذاتی قدرت سے امداد کرتے ہیں ' جیسے بعض جہلاء کا عقیدہ ہے کہ وہ قبر کو بوسہ دیتے ہیں اور سجدہ کرتے ہیں اور اس کی طرف منہ کر

کے نماز پڑھتے ہیں ' یہ تمام افعال ممنوع اور حرام ہیں اور ناواقف عوام کے افعال کا کوئی اعتبار نہیں ' اور وہ خارج از بحث ہیں اور عارف بشریعت وعالم بہ احکام بہ احکام دین ان تمام منکرات سے سخت بیزار ہیں اور مشائخ اور اہل کشف سے ارواح کاملہ سے استفادہ کے بارے میں جو کچھ مروی ہے وہ حصر سے خارج ہے اور ان کی کتابوں میں مشہور اور مذکور ہے ' حاجت نہیں کہ ہم اس کا ذکر کریں اور ممکن ہے کہ وہ منکر متعصب کو فائدہ نہ دے۔ اللہ تعالیٰ ہم کو اس بدعقیدگی سے محفوظ رکھے۔ (اشعۃ اللمعات ج۳ص ۴۰۲۔۴۰۱ مبطوعہ مطبع تیج کمار ' لکھنو)

توسل بعد از وصال کے متعلق علامہ آلوسی (رح) کا نظریہ

علامہ آلوسی (رح) لکھتے ہیں:

نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی زندگی میں اور آپ کے وصال کے بعد آپ کی عزت اور وجاہت کے وسیلہ سے اللہ سے دعا کرنے میں میرے نزدیک کوئی حرج نہیں ہے ' اور آپ کی وجاہت سے یہاں اللہ تعالیٰ کی ایک صفت مراد ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کی آپ سے وہ کامل محبت جس کا یہ تقاضا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی دعا کو مسترد نہ کرے اور آپ کی شفاعت کو قبول فرمائے ' اور جب کوئی شخص دعا میں کہتا ہے: اے اللہ! میں اپنی اس حاجت کے پورا ہونے میں تیری محبت کو وسیلہ بناتا ہوں اور اس دعا میں اور تمہارے اس قول میں کوئی فرق نہیں ہے کہ اے اللہ! میں تیری رحمت کو وسیلہ بناتا ہوں کہ تو میرا یہ کام کر دے ' بلکہ میں یہ کہنا بھی جائز سمجھتا ہوں کہ کوئی شخص یہ کہے کہ اے اللہ! میں تجھ کو نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی وجاہت کی قسم دیتا ہوں کہ تو یہ کام کر دے۔

وجاہت اور حرمت کے ساتھ سوال کرنے میں ایک جیسی بحث ہے ' توسل اور ذات محض کی قسم دینے میں یہ بحث جاری نہیں ہوگی ' ہاں وجاہت اور حرمت کے وسیلہ سے دعا کرنا کسی صحابی سے منقول نہیں ہے اور شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ صحابہ (رض) وسیلہ کے ساتھ دعا کرنے سے اس لیے اجتناب کرتے تھے کہ لوگوں کے ذہنوں میں کوئی بدعقیدگی جگہ نہ پکڑے ' کیونکہ ان کا زمانہ بتوں کے ساتھ توسل کرنے کے قریب تھا ' اس کے بعد ائمہ طاہرین نے بھی صحابہ (رض) کی اقتداء میں وسیلہ کے ساتھ دعا نہیں کی۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کعبہ کی اس وقت کی عمارت کو منہدم کر کے بناء ابراہیم پر اس کو دوبارہ تعمیر کرنا چاہتے تھے ' لیکن چونکہ آپ کی قوم تازہ تازہ کفر سے نکلی

تھی ‘اس لیے آپ نے فتنہ پیدا ہونے کے خدشہ سے اپنے ارادہ کو ترک کر دیا جیسا کہ حدیث صحیح میں ہے ‘میں نے وجاہت سے توسل اور قسم دینے کا جواز اور اس کی توجیہ اس لیے بیان کی ‘تاکہ عام مسلمانوں کو اس دعا میں حرج نہ ہو ‘کیونکہ بعض لوگ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی وجاہت کے وسیلہ سے دعا کرنے پر گمراہی کا حکم لگانے کا دعوی کرتے ہیں، اس تقریر سے میرا یہ مقصد نہیں ہے کہ اس طرح وسیلہ سے دعا کرنا ان دعاؤں سے افضل ہے ‘جو قرآن مجید اور احادیث میں مذکور ہیں اور جن دعاؤں پر صحابہ کرام (رض) کاربند رہے اور اخیار تابعین نے جس طریقہ کو اپنایا ‘یقیناً دعا کا یہی طریقہ زیادہ اچھا ‘زیادہ جامع ‘زیادہ نفع آور اور زیادہ سلامتی والا ہے۔ (روح المعانی ج ٦ ص ١٢٨ ‘مطبوعہ دار احیاء التراث العربی ‘بیروت)

توسل بعد از وصال کے متعلق غیر مقلد عالم شیخ الزمان کا نظریہ

شیخ وحید الزمان لکھتے ہیں: جب دعا میں غیر اللہ کے وسیلہ کا جواز ثابت ہے تو اس کو زندوں کے ساتھ خاص کرنے پر کیا دلیل ہے؟ حضرت عمر (رض) نے جو حضرت عباس (رض) کے وسیلہ سے دعا کی تھی، وہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے وسیلہ سے ممانعت پر دلیل نہیں ہے ‘انھوں نے حضرت عباس (رض) کے وسیلہ سے اس لیے دعا کی تاکہ حضرت عباس (رض) کو لوگوں کے ساتھ دعا میں شریک کریں ‘اور انبیاء (علیہم السلام) اپنی قبروں میں زندہ ہیں ‘ اسی طرح شہداء اور صالحین بھی زندہ ہیں ‘ابن عطاء نے ہمارے شیخ ابن تیمیہ کے خلاف دعوی کیا ‘پھر اس کے سوا اور کچھ ثابت نہیں کیا کہ بطور عبادت نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے استعانت کرنا جائز نہیں ہے ‘ہاں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا وسیلہ پیش کرنا جائز ہے ‘رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی وفات کے بعد حضرت عثمان بن حنیف (رض) نے اس شخص کو آپ کے وسیلہ سے دعا تعلیم کی جو حضرت عثمان (رض) کے پاس جاتا تھا اور حضرت عثمان (رض) اس کی طرف التفات نہیں کرتے تھے، اس دعا میں یہ الفاظ تھے: اے اللہ میں تجھ سے سوال کرتا ہوں اور ہمارے نبی محمد نبی رحمت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے وسیلہ سے تیری طرف متوجہ ہوتا ہوں، اس حدیث کو امام بیہقی (رح) نے سند متصل کے ساتھ ثقہ راویوں سے روایت کیا ہے: کاش میری عقل ان منکرین کے پاس ہوتی! جب کتاب اور سنت کی تصریح سے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اعمال صالحہ کا وسیلہ پیش کرنا جائز ہے تو صالحین

کے وسیلہ کو بھی اس پر قیاس کیا جائے گا اور امام جزری نے "حصن حصین" کے آداب دعا میں لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں انبیاء اور صالحین کا وسیلہ پیش کرنا چاہیے 'اور ایک اور حدیث میں ہے: یا محمد! میں آپ کے وسیلہ سے اپنے رب کی طرف متوجہ ہوتا ہوں 'سید نے کہا کہ یہ حدیث حسن ہے موضوع نہیں ہے 'امام ترمذی (رح) نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے 'ایک حدیث میں ہے: میں تیرے نبی محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور موسیٰ (علیہ السلام) کے وسیلہ سے سوال کرتا ہوں 'اس کو علامہ ابن اثیر (رح) نے "نہایہ" میں اور علامہ طاہر پٹنی (رح) نے "مجمع بحار الانوار" میں ذکر کیا ہے 'اور امام حاکم (رح) 'امام طبرانی (رح) اور امام بیہقی (رح) نے ایک حدیث میں حضرت آدم (علیہ السلام) کی اس دعا کو روایت کیا ہے: اے اللہ! میں تجھ سے بحق محمد سوال کرتا ہوں 'اور ابن منذر (رح) نے روایت کیا ہے: اے اللہ! تیرے نزدیک محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی جو وجاہت اور عزت ہے میں اس کے وسیلہ سے سوال کرتا ہوں 'علامہ سبکی (رح) نے کہا ہے کہ وسیلہ پیش کرنا 'مدد طلب کرنا اور شفاعت طلب کرنا مستحسن ہے 'علامہ قسطلانی (رح) نے یہ اضافہ کیا ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے وسیلہ سے اللہ کی طرف متوجہ ہو کر آہ وزاری کرنے کا متقدمین اور متاخرین میں سے کسی نے انکار نہیں کیا تھا حتیٰ کہ ابن تیمیہ آیا اور اس نے انکار کیا 'قاضی شوکانی نے کہا کہ انبیاء میں سے کسی نبی 'اولیاء میں سے کسی ولی اور علماء میں سے کسی عالم کا بھی وسیلہ پیش کرنا جائز ہے جو شخص قبر پر جا کر زیارت کرے یا فقط اللہ سے دعا کرے اور اس میت کے وسیلہ سے دعا کرے کہ اللہ میں تجھ سے یہ دعا کرتا ہوں کہ تو مجھے فلاں بیماری سے شفاء دے اور میں اس نیک بندے کے وسیلہ سے تجھ سے سوال کرتا ہوں تو اس دعا کے جواز میں کوئی شک نہیں ہے۔ قاضی شوکانی کا کلام ختم ہوا۔ (ہدیۃ المہدی ص ۴۹ ' مطبوعہ میور پریس 'دہلی '۱۳۲۵ھ)

توسل بعد از وصال کے متعلق غیر مقلد عالم قاضی شوکانی کا نظریہ

غیر مقلد عالم شیخ مبارکپوری "الدر النضید" سے قاضی شوکانی کی عبارت نقل کرتے ہیں:
انبیاء اور صالحین کے توسل سے منع کرنے والے قرآن مجید کی ان آیات سے استدلال کرتے ہیں: ہم ان کی صرف اس لیے عبادت کرتے ہیں کہ یہ ہمیں اللہ کے قریب کر دیں۔ (الزمر: ۳) اللہ کے ساتھ کسی کی عبادت نہ کرو۔ (جن

:۱۸)اسی کو(معبود سمجھ کر)پکارنا برحق ہے ،اور جو لوگ اللہ کے سوا دوسروں کو(معبود سمجھ کر)پکارتے ہیں جو ان کو کوئی جواب نہیں دے سکتے۔(الرعد:۱۴)ان آیات سے استدلال صحیح نہیں ہے ،کیونکہ سورۃ زمر کی آیت نمبر ۳ میں یہ تصریح ہے کہ مشرکین بتوں کی عبادت کرتے تھے اور جو شخص مثلاً کسی عالم کے وسیلہ سے دعا کرتا ہے وہ اس کی عبادت نہیں کرتا بلکہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس عالم کے علم کی وجہ سے اس کی اللہ تعالیٰ کے نزدیک فضیلت اور وجاہت ہے ،وہ اس وجہ سے اسی کے وسیلہ سے دعا کرتا ہے وہ اس کی عبادت نہیں کرتا بلکہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس عالم کے علم کی وجہ سے اس کی اللہ تعالیٰ کے نزدیک فضیلت اور وجاہت ہے ،وہ اس وجہ سے اس کے وسیلہ سے دعا کرتا ہے ،اس طرح سورۃ جن کی آیت نمبر ۱۸ میں اللہ کے ساتھ کسی اور کو شریک کرکے پکارنے(یا عبادت کرنے)سے منع کیا ہے ،مثلاً کوئی شخص کہے: میں اللہ اور فلاں کی عبادت کرتا ہوں ،اور جو شخص مثلاً کسی عالم کے وسیلہ سے دعا کرتا ہے وہ صرف اللہ سے دعا کرتا ہے اور اللہ کے بعض نیک بندوں کے اعمال صالحہ کے وسیلہ پیش کرتا ہے، جیسا کہ ایک غار میں تین شخص تھے اور اس غار کے منہ پر ایک چٹان گر گئی تو انھوں نے اپنے اعمال صالحہ کے وسیلہ سے دعا کی ،اسی طرح سورۃ رعد کی آیت نمبر ۱۴ میں ان لوگوں کی مذمت کی ہے جو ان لوگوں کو(معبود سمجھ کر)پکارتے تھے جو ان کو کوئی جواب نہیں دے سکتے تھے اور اپنے رب کو نہیں پکارتے تھے جو ان کی دعا قبول کرتا ہے اور جو شخص مثلاً کسی عالم کے وسیلہ سے دعا کرتا ہے ،وہ صرف اللہ سے دعا کرتا ہے اور کسی اور سے دعا نہیں کرتا ،اللہ کے بغیر نہ اللہ کے ساتھ۔ (تحفۃ الاحوذی ج۴ ص۲۸۳ ،مطبوعہ نشر السنۃ ،ملتان)

انبیاء(علیہم السلام)اور بزرگان دین سے براہ راست استمداد کے متعلق احادیث

انبیاء(علیہم السلام)اور بزرگاں دین سے براہ راست مدد طلب کرنے کی اصل یہ حدیث ہے:

امام ابن ابی شیبہ (رح)روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس(رض)نے فرمایا: کراماً کاتبین کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے فرشتے مقرر کیے ہیں جو درختوں سے گرنے والے پتوں کو لکھ لیتے ہیں ،جب تم میں سے کسی شخص کو سفر میں کوئی مشکل پیش آئے تو وہ یہ ندا کرے: اے اللہ کے بندو! تم پر اللہ رحم فرمائے میری مدد کرو۔(المصنف ج۱۰ ص۳۹۰ مطبوعہ ادارۃ القرآن کراچی ۱۴۰۶ھ)

حافظ ابو بکر دینوری معروف بابن السنی اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت عبد اللہ بن مسعود (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جب تم میں سے کسی ایک شخص کی سواری ویران زمین میں بھاگ جائے تو وہ یہ ندا کرے: اے اللہ کے نیک بندو! اس کو روک لو ' اے اللہ کے نیک بندو اس کو روک لو 'کیونکہ زمین میں اللہ عزوجل کے کچھ روکنے والے ہیں جو اس کو روک لیتے ہیں۔

(عمل الیوم واللیلہ ص ١٦٢ 'مطبوعہ مطبع مجلس الدائرۃ المعارف 'حیدر آباد دکن '١٣١۵ھ)

امام بزار (رح) اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: کراما کاتبین کے سوا 'اللہ تعالیٰ کے فرشتے ہیں جو درخت سے گرنے والے پتوں کو لکھ لیتے ہیں 'جب تم میں سے کسی شخص کو جنگل کی سرزمین میں کوئی مشکل پیش آئے تو وہ یہ ندا کرے: اے اللہ کے نیک بندو! میری مدد کرو۔

(کشف الاستار عن زوائد البزار ج ۴ ص ٣۴ 'مطبوعہ ،وسستہ الرسالۃ بیروت)

حافظ الہیثمی (رح) بیان کرتے ہیں:

حضرت عتبہ بن غزوان (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی شخص کسی چیز کو گم کردے درآن حالیکہ وہ کسی اجنبی جگہ پر ہو تو اس کو یہ کہنا چاہیے کہ اے اللہ کے بندو! میری مدد کرو 'کیونکہ اللہ کے کچھ ایسے بندے ہیں جن کو ہم نہیں دیکھتے۔ یہ امر مجرب ہے 'اس حدیث کو امام طبرانی (رح) نے روایت کیا اور اس کے بعض راویوں کے ضعف کے باوجود ان کی توثیق کی گئی ہے 'البتہ یزید بن علی نے حضرت عتبہ کو نہیں پایا۔ (مجمع الزوائد ج ١٠ ص ١٣٢ 'مطبوعہ دارالکتاب العربی 'بیروت '١۴٠٢ھ)

حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: کراما کاتبین کے سوا اللہ کے فرشتے ہیں جو درخت سے گرنے والے پتوں کو لکھ لیتے ہیں 'جب کسی ویران زمین پر کسی کو مشکل پیش آئے تو وہ یہ ندا کرے: اے اللہ کے نیک بندو! میری مدد کرو (مجمع الزوائد ج ١٠ ص ١٣٢ 'مطبوعہ دارالکتاب العربی 'بیروت ' ١۴٠١ھ)

حضرت عبد اللہ بن مسعود (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جب تم میں سے کسی ایک کی سواری ویران زمین میں بھاگ جائے تو وہ یہ ندا کرے: اے اللہ کے نیک بندو! روک لو ' اے اللہ کے نیک بندو! روک لو ' اے اللہ کے نیک بندو روک لو ' کیونکہ زمین میں اللہ تعالیٰ کے روکنے والے ہیں جو اس کو عنقریب روک لیں گے ' اس کو امام ابویعلی (رح) اور طبرانی (رح) نے روایت کیا ہے اور طبرانی (رح) کی روایت میں یہ اضافہ ہے: وہ اس کو تمہارے لیے روک لیں گے۔

(مجمع الزوائد ج ۱۰ ص ۱۳۲ ' مطبوعہ دار الکتاب العربی ' بیروت ' ۱۴۰۲ ھ)

رجال غیب (ابدال) سے استمداد کے متعلق فقہاء اسلام کے نظریات

علامہ نووی ' امام ابن السنی کی کتاب سے حضرت عبد اللہ بن مسعود (رض) کی روایت نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں: مجھ سے میرے بعض اساتذہ نے بیان کیا جو بہت بڑے عالم تھے کہ ایک مرتبہ ریگستان میں ان کی سواری بھاگ گئی، ان کو اس حدیث کا علم تھا انھوں نے یہ کلمات کہے: (اے اللہ کے بندو! روک لو) اللہ تعالیٰ نے اس سواری کو اسی وقت روک دیا۔ (علامہ نووی فرماتے ہیں:) ایک مرتبہ میں ایک جماعت کے ساتھ سفر میں تھا ' اس جماعت کی ایک سواری بھاگ گئی ' وہ اس کو روکنے سے عاجز آ گئے ' میں نے یہ کلمات کہے تو بغیر کسی اور سبب کے صرف ان کلمات کی وجہ سے وہ سواری اسی وقت رک گئی۔ (کتاب الاذکار ص ۲۰۱ ' مطبوعہ دار الفکر ' بیروت ' طبع رابع ' ۱۳۷۵ ھ)

ملا علی قاری نے بھی علامہ نووی کی عبارت کو نقل کیا ہے۔

(الحرز الثمین شرح حصن حصین علی ہامش الدر الغالی ص ۳۷۸ ' مطبوعہ المطبعۃ المنیریہ ' مکہ مکرمہ ' ۱۳۰۴ ھ)

شیخ شوکانی نے بھی علامہ نووی (رح) کی اس عبارت کو نقل کیا ہے (تحفۃ الذاکرین بعدۃ الحصن الحصین ص ۱۵۵ ' مطبوعہ مطبع مصطفے البابی واولادہ مصر ' ۱۳۵۰ ھ)

ملا علی قاری "یاعباد اللہ" کی شرح میں لکھتے ہیں

"اے اللہ کے بندو "اس سے مراد فرشتے ہیں یا مسلمان جن یا اس سے مردان غیب مراد ہیں جن کو ابدال کہتے ہیں (یعنی اولیاء اللہ)۔(الحرز المثین علی ہامش الدر الغالی ص ۳۷۸ ، مطبوعہ المطبعۃ المیریہ ، مکہ مکرمہ ، ۱۳۰۴ھ)

شیخ محمد بن جزری نے "حصن حصین "میں اس حدیث کو طبرانی ، ابویعلی ، ابن السنی ، بزار اور ابن ابی شیبہ کے حوالوں سے درج کیا ہے ، ان تمام روایات کو درج کرنے کے بعد ملا علی قاری لکھتے ہیں:

بعض ثقہ علماء نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن ہے اور مسافروں کو اس کی ضرورت پڑتی ہے اور مشائخ سے مروی کہ یہ امر مجرب ہے۔(الحرز المثین علی ہامش الدر الغالی ص ۳۷۹ ، مطبوعہ المطبعۃ المیریہ ، مکہ مکرمہ ، ۱۳۰۴ھ)

شیخ شوکانی ، حضرت ابن عباس (رض) کی روایت میں لکھتے ہیں:

مجمع الزوائد میں ہے کہ اس حدیث کے روای ثقہ ہیں ، اس حدیث میں ان لوگوں سے مدد حاصل کرنے پر دلیل ہے جو نظر نہ آتے ہوں ، جیسے فرشتے اور صالح جن ، اور اس میں کوئی حرج نہیں ہے ، جیسا کہ جب سواری کھسک جائے یا بھاگ جائے تو انسانوں سے مدد حاصل کرنا جائز ہے۔(تحفۃ الذاکرین ص ۱۵۶۔۱۵۵ ، مطبوعہ مطبع مصطفے البابی واولادہ ، مصر ، ۱۳۵۰ھ)

امام ابن اثیر اور حافظ ابن کثیر کے حوالوں سے عہد صحابہ (رض) میں ندائے یا محمداہ کا رواج

عہد صحابہ اور تابعین میں مسلمانوں کا یہ شعار تھا کہ وہ شدائد اور ابتلاء کے وقت "یا محمداہ "کہہ کر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ندا کرتے تھے۔

جنگ یمامہ میں جب مسیلمہ کذاب اور مسلمانوں کے درمیان گھمسان کی لڑائی ہو رہی تھی ، اس کا نقشہ کھینچنے کے بعد علامہ ابن اثیر لکھتے ہیں:

پھر حضرت خالد بن ولید نے (دشمن کو) للکارا اور للکارنے والوں کو دعوت (قتال) دی، پھر مسلمانوں کے معمول کے مطابق یا محمداہ کہہ کر نعرہ لگایا، پھر وہ جس شخص کو بھی للکارتے اس کو قتل کر دیتے تھے۔ (الکامل فی التاریخ ج ۲ ص ۲۴۶، مطبوعہ دار الکتاب العربیہ بیروت)

حافظ ابن کثیر بھی جنگ کے اس منظر کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

پھر حضرت خالد (رض) نے مسلمانوں کے معمول کے مطابق نعرہ لگایا اور اس زمانہ میں ان کا معمول یا محمداہ کا نعرہ لگانا تھا۔ (البدایہ والنہایہ ج ۶ ص ۳۲۴، مطبوعہ دار الفکر، بیروت)

حافظ ابن اثیر اور ابن کثیر نے یہ تصریح کی ہے کہ عہد صحابہ اور تابعین میں شدائد اور ابتلاء کے وقت یا محمداہ کہنے کا معمول تھا، ندائے غائب کے منکرین کے ہاں حافظ ابن کثیر کی بہت پذیرائی ہے اور ان کا یہ لکھنا کہ عہد صحابہ و تابعین میں یا محمداہ کہنے کا معمول تھا، ان کے خلاف قوی حجت ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے "المطالب العالیہ" میں ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اگر عیسیٰ میری قبر پر کھڑے ہو کر "یا محمد" کہیں تو میں ان کو ضرور جواب دوں گا۔ (المطالب العالیہ ج ۴ ص ۳۴۹، مطبوعہ مکہ مکرمہ)

ندائے یا محمد اور توسل میں علماء دیوبند کا موقف

شیخ رشید احمد گنگوہی "یارسول اللہ انظر حالنا، یا نبی اللہ اسمع قالنا" کے جواز یا عدم جواز کی بحث میں لکھتے ہیں: یہ خود معلوم آپ کو ہے کہ ندا غیر اللہ تعالیٰ کو دور سے شرک حقیقی جب ہوتا ہے کہ ان کو عالم سامع مستقل عقیدہ کرے ورنہ شرک نہیں، مثلاً یہ جانے کہ حق تعالیٰ ان کو مطلع فرمادیوے گا یا باذنہ تعالیٰ انکشاف ان کو ہو جاوے گا یا باذنہ تعالیٰ ملائکہ پہنچا دیویں گے جیسا کہ درود کی نسبت وارد ہے، یا محض شوقیہ کہتا ہو محبت میں یا عرض حال محل تحسر و حرمان میں، ایسے مواقع میں اگرچہ کلمات خطابیہ بولتے ہیں لیکن ہرگز نہ مقصود اسماع ہوتا ہے نہ عقیدہ، پس ان ہی اقسام سے کلمات مناجات واشعار بزرگان کے ہوتے ہیں کہ فی حد ذاتہ نہ شرک ہیں نہ معصیت مگر ہاں بہ وجہ موہم ہونے کے ان کلمات کا مجامع میں کہنا مکروہ ہے کہ عوام کو ضرر ہے اور فی حد ذاتہ ابہام بھی ہے، لہٰذا ایسے اشعار کا

پڑھنا منع ہے اور نہ اس کے مولف پر طعن ہو سکتا ہے (الی قولہ) مگر اسی طرح پڑھنا اور پڑھوانا کہ اندیشہ عوام کا ہو بندہ پسند نہیں کرتا گو اس کو معصیت بھی نہیں کہہ سکتا مگر خلاف مصلحت وقت کے جانتا ہے۔

(فتاوی رشیدیہ کامل ص ۲۸ ،مطبوعہ محمد سعید اینڈ سنز ،کراچی)

گویا محمد یا رسول اللہ کے نعروں سے علماء دیوبند کا منع کرنا ذاتی ناپسندیدگی کی وجہ سے ہے کوئی حکم شرعی نہیں ہے۔ شیخ گنگوہی سے سوال کیا گیا:

سوال: اشعار اس مضمون کے پڑھنے: "یارسول کبریا فریاد ہے ،یا محمد مصطفےٰ فریاد ہے ،مدد کر بہر خدا حضرت محمد مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میری تم سے ہر گھڑی فریاد ہے "کیسے ہیں؟

جواب: ایسے الفاظ پڑھنے محبت میں اور خلوت میں بایں خیال کہ حق تعالیٰ آپ کی ذات کو مطلع فرمادیوے یا محض محبت سے بلا کسی خیال سے جائز ہیں اور بعقیدہ عالم الغیب اور فریاد رس ہونے کے شرک ہیں اور مجامع میں منع ہیں کہ عوام کے عقائد کو فاسد کرتے ہیں ،لہٰذا مکروہ ہوں گے۔ (فتاوی رشیدیہ کامل ص ۹۵ ،مطبوعہ محمد سعید اینڈ سنز کراچی)

عام مسلمان رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو عالم الغیب نہیں سمجھتے ،عالم الغیب صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے ،البتہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایسی صفت عطا فرمائی ہے جس سے آپ پر حقائق غیبیہ منکشف ہو جاتے ہیں جس طرح ہم کو ایسی صفت عطا فرمائی ہے جس سے ہم پر عالم شہادت کے واقعات منکشف ہو جاتے ہیں ،نہ ہم بذاتہ شہادت (عالم ظاہر) کے عالم ہیں نہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بذاتہ غیب کے عالم ہیں۔ ہم پر اللہ تعالیٰ نے عالم شہادت منکشف کیا اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر اللہ عزوجل نے عالم غیب بھی منکشف کیا۔ یہی عام مسلمانوں کا عقیدہ ہے اور شیخ گنگوہی کی تصریح کے مطابق یہ شرک اور معصیت نہیں ہے بلکہ جائز ہے ،علماء اہل سنت اپنی تقاریر اور تصانیف میں عوام کو یہ فرق ہمیشہ سے ہر دور میں بتاتے رہتے ہیں اور عام مسلمان اس فرق کو جانتے ہیں ،اس لیے عوام کے جلسوں میں بھی اس قسم کے اشعار پڑھنا جائز ہیں کیونکہ جو شخص اللہ تعالیٰ کو وحدہ لا شریک مانتا ہے اور اس کی عبادت بجالاتا ہے اس کے متعلق یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو مستقل سامع یا مستقل عالم گردانتا ہے ،البتہ ذاتی ناپسندیدگی کا ہمارے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔

شیخ رشید احمد گنگوہی لکھتے ہیں:

اور اولیاء کی نسبت بھی یہ عقیدہ ایمان ہے کہ حق تعالیٰ جس وقت چاہے ان کو علم و تصرف دیوے اور عین حالت تصرف میں حق تعالیٰ ہی مصرف ہے 'اولیاء ظاہر میں مصرف ہی معلوم ہوتے ہیں 'عین حالت کرامت و تصرف میں حق تعالیٰ ہی ان کے واسطے سے کچھ کرتا ہے (فتاوی رشیدیہ کامل ص۴۹ 'مطبوعہ محمد سعید اینڈ سنز کراچی)

شیخ محمود الحسن (آیت) "ایاک نستعین" کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

اس کی ذات پاک کے سوا کسی سے حقیقت میں مدد مانگنی بالکل ناجائز ہے 'ہاں اگر کسی مقبول بندہ کو محض واسطہ رحمت اور غیر مستقل سمجھ کر استعانت ظاہری اس سے کرے تو یہ جائز ہے کہ یہ استعانت در حقیقت حق تعالیٰ ہی سے استعانت ہے۔(حاشیتہ القرآن الحکیم ص ۲ 'مطبوعہ تاج کمپنی 'کراچی)

مفتی محمد شفیع دیوبندی لکھتے ہیں:

اور حقیقی طور پر اللہ کے سوا کسی کو حاجت روانہ سمجھے اور کسی کے سامنے دست سوال دراز نہ کرے 'کسی نبی یا ولی وغیرہ کو وسیلہ قرار دے کر اللہ تعالیٰ سے دعا مانگنا اس کے منافی نہیں (معارف القرآن 'مطبوعہ ادارۃ المعارف 'کراچی ' ۱۳۹۷ھ)

شیخ رشید احمد گنگوہی اس سوال کے جواب میں لکھتے ہیں کہ دعا میں بحق رسول وولی اللہ کہنا ثابت ہے یا نہیں 'بعض فقہا و محدثین منع کرتے ہیں 'اس کا کیا سبب ہے؟

جواب: بحق فلاں کہنا درست ہے اور معنی یہ ہیں کہ جو تونے اپنے احسان سے وعدہ فرمالیا ہے اس کے ذریعہ سے مانگتا ہوں مگر معتزلہ اور شیعہ کے نزدیک حق تعالیٰ پر حق لازم ہے اور وہ بحق فلاں کے یہی معنی مراد رکھتے ہیں 'سواس واسطے معنی موہم اور مشابہ معتزلہ ہوگئے تھے 'لہٰذا فقہاء نے اس لفظ کا بولنا منع کر دیا ہے تو بہتر ہے کہ ایسا لفظ نہ کہے جو رافضیوں کے ساتھ تشابہ ہو جاوے فقط۔(فتاوی رشیدیہ کامل ص ۹۴ 'مطبوعہ محمد سعید اینڈ سنز کراچی)

شیخ محمد سرفراز خاں صفدر لکھتے ہیں:

یہاں ہم صرف "المہند" کی عبارت پر اکتفاء کرتے ہیں جو علماء دیوبند کے نزدیک ایک اجماعی کتاب کی حیثیت رکھتی ہے۔

جواب: ہمارے نزدیک اور ہمارے مشائخ کے نزدیک دعاؤں میں انبیاء و اولیاء و صدیقین کا توسل جائز ہے 'ان کی حیات میں یا بعد وفات کے بایں طور کہے کہ یا اللہ! میں بوسیلہ فلاں بزرگ کے تجھ سے دعا کی قبولیت اور حاجت برائی چاہتا ہوں 'اسی جیسے اور کلمات کہے 'چنانچہ اس کی تصریح فرمائی ہے ہمارے مولانا محمد اسحاق دہلوی ثم المکی نے 'پھر مولانا رشید احمد گنگوہی نے بھی اپنے فتاوی میں اس کو بیان فرمایا ہے جو چھپا ہوا آج کل لوگوں کے ہاتھ میں موجود ہے اور یہ مسئلہ اس کی پہلی جلد کے صفحہ نمبر ۹۳ پر مذکور ہے 'جس کا جی چاہے دیکھ لے۔

(انتہی المہند ص ۱۲۔۱۳)(تسکین الصدور ص ۴۱۳ 'مطبوعہ ادارہ نصرۃ العلوم 'گوجرانوالہ)

شیخ اشرف علی تھانوی (رح) امام طبرانی (رح) اور امام بیہقی (رح) کے حوالوں سے حضرت عثمان بن حنیف (رض) کی روایت ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

(ف) اس سے توسل بعد الوفات بھی ثابت ہوا اور علاوہ ثبوت بالروایۃ کے درایۃ بھی ثابت ہے کیونکہ روایت اول کے ذیل میں جو توسل کا حاصل بیان کیا گیا تھا 'وہ دونوں حالتوں میں مشترک ہے۔(نشر الطیب ص ۲۵۳ 'مطبوعہ تاج کمپنی 'کراچی)

حضرت بلال بن حارث (رض) نے حضرت عمر (رض) کے زمانہ میں جو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے روضہ مبارک پر حاضر ہو کر بارش کی دعا کے لیے درخواست کی تھی اس کے متعلق شیخ محمد سرفراز خاں صفدر لکھتے ہیں:

اس روایت کے سب راوی ثقہ ہیں اور حافظ ابن کثیر 'حافظ ابن حجر اور علامہ سمہودی وغیرہ اس روایت کو صحیح کہتے ہیں 'امام ابن جریر (رح) اور حافظ ابن کثیر (رح) فرماتے ہیں کہ یہ واقعہ ۱۷ھ اور ۱۸ھ کی ابتداء (تاریخ طبری ج ۴ ص ۹۸ 'البدایہ والنہایہ ج ۷ ص ۹۱) اور مورخ عبد الرحمن بن محمد بن خلدون (المتوفی ۸۰۸ھ) فرماتے ہیں کہ یہ واقعہ ۱۸ھ کا ہے۔ (ابن خلدون ج ۲ ص ۹۶۹)

یہ واقعہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی وفات حسرت آیات سے تقریباً سات آٹھ سال بعد پیش آیا 'اس وقت بکثرت حضرات صحابہ کرام (رض) موجود تھے۔ خواب دیکھنے والے کوئی مجہول شخص نہیں تھے 'بلکہ جلیل القدر صحابی حضرت بلال بن حارث مزنی (المتوفی ۶۷ھ)(رض) تھے۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی قبر

مبارک کے پاس حاضر ہو کر طلب دعا اور سوال شفاعت شرک نہیں ورنہ یہ جلیل القدر صحابی یہ کارروائی ہر گز نہ کرتے۔

یہ معاملہ نرے خواب کا نہیں ہے بلکہ اس سچے خواب کو خلیفہ راشد حضرت عمر (رض) کی تائید و تصویب حاصل ہے اور اس کارروائی کا حکم پہلے تو "علیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین الحدیث" کے تحت سنیت کا ہو گا ورنہ استحباب اور اقل درجہ جواز سے کیا کم ہو گا

(تسکین الصدور ص ۳۵۲۔۳۴۹ "ملخصا" مطبوعہ ادارہ نصرۃ العلوم "گوجرانوالہ)

نیز شیخ محمد سرفراز خاں صفدر لکھتے ہیں:

علاوہ ازیں متعدد کتابوں میں آپ کی قبر مبارک پر حاضر ہو کر طلب دعا کا تذکرہ ہے 'چنانچہ حافظ ابن کثیر (رح) لکھتے ہیں کہ ایک جماعت نے عتبی سے یہ مشہور حکایت نقل کی ہے جس جماعت میں شیخ ابو منصور الصباغ بھی ہیں 'انھوں نے اپنی کتاب "الشامل" میں بیان کیا ہے کہ عتبی فرماتے ہیں کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی قبر کے پاس بیٹھا ہوا تھا 'کہ ایک اعرابی آیا اور اس نے کہا: السلام علیک یا رسول اللہ! میں نے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد سنا ہے "اور اگر بیشک وہ لوگ جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا تھا تیرے پاس آتے پس وہ اللہ تعالیٰ سے معافی مانگتے اور ان کے لیے رسول بھی اللہ تعالیٰ سے معافی مانگتا تو وہ ضرور اللہ تعالیٰ کو توبہ قبول کرنے والا مہربان پاتے "اس لیے میں اپنے گناہوں کی معافی مانگنے کے لیے آپ کو اللہ تعالیٰ کے ہاں سفارشی پیش کرنے آیا ہوں۔ اس کے بعد اس نے درد دل سے چند اشعار پڑھے اور جذبہ محبت کے پھول نچھاور کر کے چلا گیا 'اور اسی واقعہ کے آخر میں مذکور ہے کہ خواب میں اس کو کامیابی کی بشارت بھی مل گئی۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ اے عتبی! جا کر اعرابی سے کہہ دو کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی مغفرت کر دی ہے (تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۵۲۰) یہ واقعہ امام نووی نے "کتاب الاذکار" ص ۱۸۵ 'طبع مصر میں اور علامہ ابو البرکات عبد اللہ بن احمد النسفی الحنفی المتوفی ۷۱۰ھ نے اپنی تفسیر "مدارک" ج ۱ ص ۳۹۹ میں اور علامہ تقی الدین سبکی نے "شفاء السقام "ص ۴۶ میں اور شیخ عبد الحق نے "جذب القلوب "میں ص ۱۹۵ میں اور علامہ بحر العلوم عبد العلی نے "رسائل الارکان "ص ۲۸۰ طبع لکھنؤ میں نقل کیا ہے 'اور علامہ علی بن عبد الکافی السبکی اور علامہ سمہودی لکھتے ہیں کہ۔

عتبی کی حکایت اس میں مشہور ہے اور تمام مذاہب کے مصنفین نے مناسک کی کتابوں میں اور مورخین نے اس کا ذکر کیا ہے اور سب نے اس کو مستحسن قرار دیا ہے ،اس اسی طرح دیگر متعدد علماء نے قدیماو حدیثا اس کو نقل کیا ہے اور حضرت تھانوی (رح) لکھتے ہیں کہ مواہب میں بسند امام ابو منصور صباغ (رح) اور ابن النجار (رح) اور ابن عساکر (رح) اور ابن الجوزی (رح) اللہ تعالیٰ نے محمد بن حرب ہلالی (رح) سے روایت کیا ہے کہ میں قبر مبارک کی زیاررت کر کے سامنے بیٹھا تھا کہ ایک اعرابی آیا اور زیارت کر کے عرض کیا کہ یا خیر الرسل! اللہ نے آپ پر ایک سچی کتاب نازل فرمائی جس میں ارشاد ہے: (آیت) "**ولو انھم اذظلموا انفسھم جآءوك فاستغفروالله واستغفر لھم الرسول لوجدوا الله توابا رحیما** "(النساء:۶۴) اور میں آپ کے پاس اپنے گناہوں سے استغفار کرتا ہوا اور اپنے رب کے حضور میں آپ کے وسیلہ سے شفاعت چاہتا ہوا آیا ہوں پھر دو شعر پڑھے ،اور اس محمد بن حرب کی وفات ۲۲۸ھ میں ہوئی ہے ،اھ۔ غرض زمانہ خیر القرون کا تھا اور کسی سے اس وقت نکیر منقول نہیں بس حجت ہو گیا۔ (نشر الطیب ص ۲۵۴) اور حضرت مولانا نانوتوی یہ آیت کریمہ لکھ کر فرماتے ہیں: "کیونکہ اس میں کسی کی تخصیص نہیں آپ کے ہم عصر ہوں یا بعد کے امتی ہوں ،اور تخصیص ہو تو کیونکر ہو آپ کا وجود تربیت تمام امت کے لیے یکساں رحمت ہے کہ پچھلے امتیوں کا آپ کی خدمت میں آنا اور استغفار کرنا اور کرانا جب ہی متصور ہے کہ قبر میں زندہ ہوں ،اھ (آب حیات ص ۴۰) اور حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی یہ سابق واقعہ ذکر کر کے آخر میں لکھتے ہیں کہ پس ثابت ہوا کہ اس آیت کریمہ کا حکم آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی وفات کے بعد بھی باقی ہے۔ (اعلاء السنن ج ۱۰ ص ۳۳۰) ان اکابر کے بیان سے معلوم ہوا کہ قبر پر حاضر ہو کر شفاعت مغفرت کی درخواست کرنا قرآن کریم کی آیت کے عموم سے ثابت ہے ،بلکہ امام سبکی فرماتے ہیں کہ یہ آیت کریمہ اس معنی میں صریح ہے۔ (شفاء القام ص ۱۲۸) اور خیر القرون میں یہ کارروائی ہوئی مگر کسی نے انکار نہیں کیا جو اس کے صحیح ہونے کی واضح دلیل ہے۔ (تسکین الصدور ص ۳۶۵۔ ۳۶۲ ،ملخصا ،مطبوعہ ادارہ نصرۃ العلوم ،گوجرانوالہ)

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے روضہ مبارک پر حاضر ہو کر دعا کی درخواست کرنے کو ناجائز ثابت کرنے کے لیے شیخ ابن تیمیہ (رح) ،شیخ ابن قیم (رح) اور شیخ ابن الہادی (رح) وغیرہم کی ایک یہ دلیل ہے کہ حضرت صحابہ

کرام (رض) ‘ائمہ دین اور سلف صالحین سے ایسی کارروائی ثابت نہیں ‘اگر یہ جائز ہوتی تو وہ ضرور ایسا کرتے ‘اس کے جواب میں شیخ محمد سرفراز خان صفدر لکھتے ہیں۔

یہ ان حضرات کا ایک علمی مغالطہ ہے کیونکہ قبر کے پاس حاضر ہو کر سفارش کرانا اور طلب دعا ‘نہ تو فرض و واجب ہے اور نہ سنت موکدہ ‘تاکہ یہ حضرات اس پر خواہ مخواہ ضرور عمل کر کے دکھاتے اور اس کارروائی کے نہ کرنے پر وہ ملامت کئے جاتے ‘اس کارروائی کے مقر اس کو صرف جائز ہی کہتے ہیں اور جواز کے اثبات کے لیے حضرت بلال بن الحارث (رض) کا یہ فعل جس کی حضرت عمر (رض) اور دیگر حضرات صحابہ کرام (رض) نے تائید کی ہے کیا کم ہے ؟ اگر حضرت ابن عمر (رض) صحابی ہیں جنہوں نے ایسا نہیں کیا تو یقین جانئے کہ بلال بن الحارث اور ان کی اس کارروائی کے مصدقین بھی صحابہ کرام (رض) ہیں ‘اگرچہ حافظ ابن تیمیہ (رح) یہ کارروائی تسلیم نہیں کرتے لیکن اس کا اقرار کرتے ہیں کہ یہ کارروائی بعض متاخرین سے ثابت ہے۔

(محصلہ قاعدہ جلیلہ ص ٢٧) (تسکین الصدور ص ٣٥٤ ‘ملخصا ‘مطبوعہ ادارہ نصرۃ العلوم ‘گوجرانوالہ)

خلاصہ یہ ہے کہ تمام اکابر اور اصاغر علماء دیوبند کے نزدیک یارسول اللہ کہنا جائز ہے اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور دیگر مقربین کے وسیلہ سے دعا کرنا اور ان سے دعا کی درخواست کرنا بھی جائز ہے ‘بلکہ سنت اور مستحب ہے اور ہم بھی اس سے زیادہ نہیں کہتے۔

ندائے غیر اللہ اور توسل کے متعلق مصنف کا موقف

انبیاکرام (علیہم السلام) اور اولیاء کرام سے استمداد کے متعلق جو ہم نے احادیث اور فقہاء اسلام کی عبارات نقل کی ہیں اس سے ہمارا صرف یہ منشاء ہے کہ عام مسلمان جو شدائد اور ابتلاء میں یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کہہ کر پکارتے ہیں ‘ان کا یہ پکارنا شرک نہیں ہے اور اس نداء کو شرک کہنا شدید ظلم اور زیادتی ہے کیونکہ یہ لوگ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو بہر حال اللہ کی مخلوق اور اس کا مقرب بندہ گردانتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ حقیقی کارساز صرف اللہ تعالیٰ ہے اور انبیاء کرام (علیہم السلام) اور اولیاء کرام کا ہر فعل اور ہر تصرف اللہ کے اذن ‘اس کی مشیت اور اس کی دی ہوئی قدرت کے تابع ہے ‘انبیاء کرام (علیہم السلام) اور اولیاء کرام ہوں یا عام انسان ‘اس کائنات میں

جس سے بھی جو فعل صادر ہوتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی قدرت سے صادر ہوتی ہے 'اور اللہ تعالیٰ کے بغیر کسی انسان کو کسی شے پر ذرہ بھی قدرت نہیں ہے 'اور اس اعتقاد کے ساتھ ندائے غیر اللہ کو علماء دیوبند بھی جائز کہتے ہیں ' جیسا کہ شیخ گنگوہی کے حوالے سے گزر چکا ہے۔

اس اعتقاد کے ساتھ انبیاء کرام (علیہم السلام) اور اولیاء کرام سے استمداد اور استغاثہ کرنا ہر چندی کہ جائز ہے لیکن افضل 'احسن اور اولیٰ یہی ہے کہ حال میں اور ہر معاملہ میں اللہ تعالیٰ سے سوال کیا جائے اور اسی سے استمداد اور استعانت کی جائے 'امام ترمذی (رح) اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں ایک دن ایک سواری پر نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا 'آپ نے فرمایا: اے بیٹے! میں تم کو چند باتوں کی تعلیم دیتا ہوں 'تم اللہ کو یاد رکھو 'اللہ تعالیٰ تمہاری حفاظت کرے گا 'تم اللہ کو یاد رکھو 'تم اللہ کو سامنے پاؤ گے 'جب تم سوال کرو تو اللہ تعالیٰ سے کرو اور جب تم مدد طلب کرو تو اللہ تعالیٰ سے کرو اور جان لو کہ اگر تمام امت تم کو نفع پہچانے کیلیے جمع ہو جائے تو وہ تم کو صرف اسی چیز کو نفع پہنچا سکتی ہے جو اللہ تعالیٰ نے پہلے تمہارے لیے لکھ دیا ہے 'اگر تمام لوگ تم کو نقصان پہنچانے کیلیے جمع ہو جائیں تو وہ تم کو صرف اسی چیز کا نقصان پہنچا سکتے ہیں جو اللہ نے لکھ دیا ہے 'قلم اٹھا لیے گئے ہیں اور صحیفے خشک ہو چکے ہیں۔ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ (جامع ترمذی ص ۳۶۱ 'مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب 'کراچی)

اس حدیث کو امام ابویعلی (رح) ۱ (امام ابویعلی (رح) احمد بن علی بن المثنی الموصلی ۳۰۷ھ 'مسند ابویعلی موصلی ج ۳ ص ۸۵۔ ۸۲ 'مطبوعہ موسسۃ علوم القرآن 'بیروت) امام بن سنی (رح) ۲ (حافظ ابو بکر احمد بن محمد بن اسحاق دینوری المعروف بابن سنی متوی ۳۶۴ھ 'عمل الیوم واللیلۃ ص ۱۳۶) اور امام ابن عبدالبر (رح) ۳ (حافظ ابو عمر وابن عبدالبر (رح) مالکی متوفی ۴۶۳ھ 'تمہید ج ۴ ص ۱۱۱ 'مطبوعہ مکتبہ قدوسیہ 'لاہور 'لاہور '۱۴۰۴ھ) نے بھی روایت کیا ہے۔

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اس تعلیم اور تلقین کے پیش نظر مسلمانوں کو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ سے سوال کریں اور اسی سے مدد چاہیں 'اور دعا میں مستحسن طریقہ یہ ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے وسیلہ سے دعا مانگیں 'زیادہ محفوظ اور زیادہ سلامتی اس میں ہے کہ وہ دعائیں مانگی جائیں جو قرآن مجید اور احادیث میں مذکور ہیں

تاکہ دعاؤں میں بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی سنت سایہ افگن رہے 'اگر کسی خاص حاجت میں دعا مانگنی ہو تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے وسیلہ سے مانگنی چاہیے۔

ہمارے فاضل معاصر علامہ محمد عبدالحکیم صاحب شرف قادری ثم نقشبندی لکھتے ہیں:

البتہ یہ ظاہر ہے کہ جب حقیقی حاجت روا 'مشکل کشا اور کارساز اللہ تعالیٰ کی ذات ہے تو احسن اور اولی یہی ہے کہ اسی سے مانگا جائے اور اسی سے درخواست کی جائے اور انبیاء واولیاء کا وسیلہ اس کی بارگاہ میں پیش کیا جائے 'کیونکہ حقیقت 'حقیقت ہے اور مجاز 'مجاز ہے 'یا بارگاہ انبیاء واولیاء سے درخواست کی جائے کہ آپ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کریں کہ ہماری مشکلیں آسان فرمادے اور حاجتیں برلائے اس طرح کسی کو غلط فہمی بھی پیدا نہیں ہو گی اور اختلافات کی خلیج بھی زیادہ وسیع نہیں ہو گی۔

(ندائے یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ۱۲ 'مطبوعہ مرکزی مجلس رضا 'لاہور '۱۴۰۵ھ)

خلاصہ یہ ہے کہ نداء غیر اللہ اعتقاد مذکور کے ساتھ ہر چند کہ جائز ہے 'لیکن افضل 'اولی اور احسن یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے سوال کیا جائے اور اسی سے استمداد اور استعانت کی جائے جیسا کہ حدیث مذکور تقاضا ہے۔

انبیاء کرام (علیہم السلام) اور اولیاء کرام سے استمداد 'نداء اور توسل کے متعلق میں نے بہت طویل بحث کی ہے کیونکہ ہمارے زمانہ میں اس مسئلہ میں جانبین سے غلو کیا جاتا ہے 'شیخ ابن تیمیہ (رح) ابن القیم (رح) اور ابن الہادی (رح) کے پیروکار اور علماء نجد 'غیر اللہ سے استمداد اور وصال کے بعد ان کے توسل دعا مانگنے کا ناجائز اور شرک کہتے ہیں اور بعض غالی اور ان پڑھ عوام 'اللہ سے دعا مانگنے کے بجائے ہر معاملہ میں غیر اللہ کی دہائی دیتے ہیں 'انہی کو پکارتے ہیں اور انہی کی نذر مانتے ہیں 'سو میں نے چاہا کہ قرآن مجید 'احادیث صحیحہ 'آثار صحابہ اور فقہاء اسلام کی عبارات کی روشنی میں حق کو واضح کروں 'تاکہ بلاوجہ بلاوجہ کسی مسلمان کو مشرک کہا جائے نہ اللہ تعالیٰ سے دعا اور استعانت کا رابطہ منقطع کیا جائے اور نہ انبیاء کرام (علیہم السلام) اور اولیاء کرام کی تعظیم و تکریم میں کوئی کمی کی جائے۔

الہ العلمین! ان سطور میں اثر آفرینی پیدا فرمایا 'اور جانبین سے غلو کرنے والوں کو اعتدال کی راہ اور صراط مستقیم پر گامزن فرما 'اس کتاب کو میری بخشش کا ذریعہ بنادے اور اس کو میرے لیے صدقہ جاریہ کردے۔ **واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین والصلوۃ والسلام علی سیدنا محمد خاتم النبیین قائد المرسلین**

شفیع المذنبین وعلی الہ الطیبین الطاھرین واصحابہ الکاملین الراشدین وازواجہ امھات المومنین واولیاء امتہ الواصلین وعلماء ملتہ الراسخین والائمۃ والمجتھدین المحدثین والمفسرین وسائر المسلمین اجمعین الی یوم الدین۔

(تفسیر تبیان القرآن۔ علامہ غلام رسول سعیدی)

پہلے الحمد للہ رب العالمین۔ الرحمن الرحیم۔ مالک یوم الدین۔ کہہ کر اللہ تعالیٰ کا ذکر بطور فرد غائب کیا گیا۔ اب اللہ کو خطاب کے صیغوں کے ساتھ یاد کرکے، **ایاك نعبد وایاك نستعین**۔ کہا گیا۔

صوفیاء فرماتے ہیں: بندہ پہلے عالم مجاہدہ میں اس کا ذکر کرکے منازل قریب طے کرتا رہا تا آنکہ وہ بارگاہ ربوبیت میں حاضر ہو گیا اور عالم مشاہدہ میں جاکر کہنے لگا ایاک نعبد، اس مقام پر بندے نے بارگاہ صمدیت کا دب ملحوظ رکھتے ہوئے پہلے اپنے معبود کا ذکر لفظ ایاک سے کیا اس کے بعد وہ لفظ نعبد سے اپنا اور اپنی عبادت کا ذکر لایا۔ اس میں یہ درس ہے کہ بندے کو عبادت میں اپنی ذات اور اپنی عبادت کی بجائے ذات حق پر نظر رکھنی چاہیے۔ گویا ایاک نعبد کا انداز بتاتا ہے کہ بندے کو یوں عبادت کرنا چاہیے جیسے وہ اللہ کو دیکھ رہا ہے اور حدیث مبارکہ میں ہے: احسان (عبادت میں اخلاص) یہ ہے کہ تم اللہ کی یوں عبادت کرو جیسے اسے دیکھ رہے ہو اور اگر تم اسے نہیں دیکھ سکتے تو یہ گمان رکھو کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔

نعبد، صیغہ جمع لانے میں نمایا جماعت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس میں یہ درس بھی ہے کہ بندہ اپنی عبادت کو کامل نہ سمجھے بلکہ اپنی عبادت کو دوسرے مومنین کی عبادت کے ساتھ ملا کر بارگاہ خداوندی میں پیش کرکے کہے یا اللہ ہم سب کی عبادت قبول فرما اور چونکہ مومنین میں اللہ کے وہ مقبولان بارگاہ انبیاء و اولیاء بھی ہیں جن کی عبادت بہر صورت مقبول ہے تو ان کے صدقے ایاک نعبد، کہنے والے کی عبادت بھی مقبول ہو جائے گی۔ لکڑی کے ساتھ لوہا بھی پانی پر تیرتے ہوئے کنارے پہنچ جاتا ہے۔

وایاک نستعین۔ بندے نے پہلے، **الحمد للہ رب العالمین، الرحمن الرحیم، مالك یوم الدین**۔ کہہ کر اللہ کی حمد و ثنا کی تاکہ اس کا مولی خوش ہو کر اس کی جھولی میں رحمت کی بھیک ڈال دے، پھر اس نے، ایاک نعبد، کہہ کر اپنے مولی سے اپنی غلامی و بندگی کا عہد کیا کہ وہ زندگی بھر اس کی بندگی میں رہے گا، اس کے بعد وہ اپنا مدعی زبان پر لایا

اور، وایاک نستعین، کہتے ہوئے دست طلب دراز کر کے اپنے مولیٰ سے مدد کی التجاء کی اور یہی بھکاری طریقہ ہے۔ کہ بھکاری جب بادشاہ کے دروازے پر کھڑا ہو تو پہلے بادشاہ کی عظمت و جلالت کی تعریف و توصیف کرتا ہے پھر اس سے اپنی وفاداری اور اخلاص کا عہد و اقرار کرتا ہے اس کے بعد اس سے مانگتا ہے اللہ تعالیٰ نے بھی سورۃ فاتحہ میں اس سے مانگنے کا یہی انداز مومنین کو سکھلایا ہے کہ پہلے اس کی حمد کہو پھر ایاک نعبد کہہ کر اس سے عہد بندگی کرو پھر اس سے مانگو۔

ایاك نعبد کے بعد، وایاك نستعین۔ اس لیے بھی کہا گیا کہ ہماری عبادت فرشتوں جیسی نہیں۔ شیطان ہماری عبادات میں دکھلاوے کے وسوسے ڈال کر اسے خراب کرنے کے درپے ہے۔ اس لیے ہم عبادت کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے مدد کے خواہاں بھی ہیں کہ وہ شیطان کے مقابلہ میں ہماری مدد فرمائے اور ہماری عبادت اس کی دست برد سے محفوظ رہے۔

ایاك نستعین۔ کے تحت یہ سوال ذہن میں اٹھا کہ ایک طرف ہم نماز میں صرف اللہ سے مدد مانگنے کا عہد کرتے ہیں اور نماز سے باہر نکل کر ہم اپنی مشکلات میں غیر خدا سے مدد مانگنے لگ جاتے ہیں۔ پولیس والوں سے، افسران سے، عدالتوں، دیگر ارباب اختیار اور کنبہ وقبیلہ سے مشکلات میں مدد طلب کرتے ہیں۔ کیا یہ ایاک نستعین کے خلاف نہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ دراصل ہر قوت کا مالک اللہ ہے۔ ان القوۃ للہ جمیعا۔ یعنی تمام قوت اللہ ہی کے لیے ہے۔ (سورۃ بقرہ) اور دنیا میں جو شخص جس کی مدد کرتا ہے اللہ تعالیٰ ہی کی دی ہوئی طاقت سے کرتا ہے تو اس کا مدد کرنا حقیقت میں اللہ ہی کا مدد کرنا ہے اور اس سے مدد مانگنا بھی اللہ ہی سے مدد مانگنا ہے تو ہر طرح کی مدد کا منبع اللہ ہی کی ذات ہے۔ خواہ وہ مدد ماتحت الاسباب ہو یا مافوق الاسباب، مادی ذرائع کے ساتھ ہو یا روحانی، ذرائع کے ساتھ بالواسطہ ہو بلاواسطہ۔

مقبولان خدا سے ان کے وصال کے بعد مدد مانگنے کا جواز

یاد رہے! صحابہ کرام (رض) اجمعین حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے وصال کے بعد بھی آپ کی قبر انور پر حاضر ہو کر آپ سے مدد کے درخواست گزار ہوتے تھے اور اسے وایاک نستعین کے خلاف نہیں سمجھتے تھے آج بھی اہل اسلام

حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بارگاہ میں مدینہ طیبہ میں حاضر ہو کر آپ سے اپنے مسائل و مصائب میں مدد کے طلب گار ہوتے ہیں کہ یارسول اللہ ہماری یہ مشکلات ہیں آپ ہمارے لیے دعا فرمائیں اللہ تعالیٰ انھیں حل کر دے۔ اسی طرح بزرگان دین کی قبور پر جا کر اہل اسلام ان سے اسی طرح مدد چاہتے ہیں، کچھ انتہاء پسند لوگ اسے کفر و شرک سے تعبیر کرتے ہیں اور اسے **وایاك نستعین** کے خلاف قرار دیتے ہیں۔

مگر مسلمانوں کا حق ہے کہ ان سے سوال کریں کہ جب تمہیں کوئی مصیبت آئے تو تم پولیس، عدالتوں، سرکاری افسروں اور قبیلہ و خاندان سے مدد مانگتے ہو کیا یہ کفر و شرک اور، وایاک نستعین، کے خلاف نہیں؟ اللہ کے بندو! اس امت پر رحم کرو، یہ پہلے ہی اغیار کے مظالم کی چکی میں پس رہی ہے، اسے متحد کرو اس پر کفر و شرک کے فتوؤں کی بمباری کر کے اس میں تفرقہ نہ کرو۔ رہا مقبولان خدا کی قبور پر ان سے مدد مانگنا تو یہ حدیث صحیح سے ثابت ہے۔

حضرت مالک الدار (رض) سے روایت ہے کہ حضرت عمر فاروق کے عہد خلافت میں مشہور قحط پڑا ایک صحابی (حضرت بلال بن حارث مزنی) رسول اللہ کی قبر انور پر حاضر ہو کر عرض کرنے لگے، یارسول اللہ، اے آقا، اپنی امت کے لیے بارش کی دعا کیجئے کیونکہ وہ ہلاک ہو رہے ہیں، نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس صحابی کے خواب میں تشریف لائے اور فرمایا: عمر کے پاس جاؤ اس کو میرا سلام کہو اور خبر دو کہ عنقریب بارش ہو گی۔ چنانچہ خوب بارش ہوئی۔ (المصنف بن ابی شیبہ، جلد 7 کتاب الفضائل عمر بن خطاب مطبوعہ دارالفکر بیروت سن طباعت 1409ھ)۔

امام ابن کثیر نے یہی حدیث بیہقی کی روایت سے نقل کی ہے اور آخر میں کہا: وھذا اسناد صحیح، یعنی اس حدیث کی سند صحیح ہے۔ (البدایہ جلد 3)۔ امام ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں: ابن ابی شیبہ نے یہ حدیث روایت کی ہے کہ اور اس کی سند صحیح ہے اور جس صحابی نے قبر رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر بارش طلب کی وہ حضرت بلال بن حارث مزنی (رض) تھے (فتح الباری جلد 2)۔ پھر امام ابن عبد البر قرطبی مالکی نے الاستیعاب جلد 2 ص 464، فضائل عمر فاروق میں یہ حدیث الگ سند کے ساتھ ذکر کی ہے۔

امام دارمی رحمہ اللہ نے سنن دارمی میں مستقل باب باندھا ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے وصال کے بعد آپ سے استغاثہ کرتے تھے اس میں انھوں نے یہ حدیث بھی نقل کی کہ لوگ حضرت سیدہ عائشہ (رض) کے پاس آئے اور بارش نہ ہونے کی شکایت کی آپ نے انھیں فرمایا: کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ

وسلم) کی قبر انور کے اوپر سے چھت کھول دو کہ اس کے اور آسمان کے درمیان کوئی حجاب نہ رہے انھوں نے ایسا ہی کیا تو موسلا دھار بارش برسنے لگی اور اس قدر برسی کہ بے پناہ سبزہ اگا جسے کھا کھا کر جانور موٹے ہو گئے اور ان کی جلدیں پھٹنے لگیں حتی کہ اسے، عام الفتق، کہا گیا (فتق کا معنی پھٹنا ہے)۔ سنن دارمی جلد اول صفحہ 43)۔

اب ہم ان نجدی علماء سے جو انبیاء و اولیاء کے وصال کے بعد ان سے مدد مانگنے اور ان کا وسیلہ پکڑنے کو کفر و شرک قرار دیتے ہیں اور اسے ایاك نعبد وایاك نستعین، کی مخالفت سمجھتے ہیں یہ سوال کرنا چاہتے ہیں کہ کیا وہ صحابہ کرام اور ام المومنین حضرت سیدہ عائشہ صدیقہ پر بھی کفر و شرک کا فتوی لگائیں گے ؟ اور کیا وہ خود کو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم سے بڑا موحد اور دین کا بڑا عالم سمجھتے ہیں کہ جو بات صحابہ کرام کو سمجھ میں نہ آسکی وہ آج یہ لوگ سمجھ گئے ہیں ؟ اگر ایسی بات نہیں ہے تو پھر مسلمانوں کو اسی راستہ پر چلنے دیا جائے جس پر صحابہ کرام اجمعین چلتے رہے

مقبولان خداوندی کو مدد کے لیے غائبانہ پکارنے کا جواز

اس جگہ وہابی نجدی علماء ان مسلمانوں پر بھی کفر و شرک کے فتوے لگاتے ہیں جو یارسول اللہ، یا علی، یا غوث وغیرہ کہہ کر حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور اولیاء کو غائبانہ پکارتے ہیں اور ان کی ارواح کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں تاکہ وہ ان کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کر کے ان کی مشکلات حل کروائیں، حالانکہ حدیث صحیح میں اس کا ثبوت بھی موجود ہے۔

حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جب بھی کوئی شخص مجھ پر سلام بھیجتا ہے تو اللہ مجھ پر میری روح کو لوٹا دیتا ہے حتی کہ میں اس کے سلام کا جواب دیتا ہوں۔

(سنن ابوداؤد شریف کتاب المناسک)۔

امام عسقلانی رحمہ اللہ شارح بخاری المواہب میں فرماتے ہیں:

روح کے لوٹائے جانے کا معنی یہ ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مشاہدہ الٰہی کی ایک خاص حالت میں ہوتے ہیں جب کوئی شخص آپ پر سلام بھیجتا ہے تو اللہ رب العزت آپ کی توجہ اس کی طرف لوٹاتا ہے اور آپ اسے اس کے سلام کا جواب دیتے ہیں پھر امام عسقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ آن واحد میں دنی اسے

لاکھوں لوگ آپ کو (نماز میں اور نماز کے علاوہ) سلام بھیجتے ہیں تو کیا آپ سب کی طرف بیک وقت توجہ فرماتے ہیں؟ امام قسطلانی فرماتے ہیں یہ کچھ بعید از قیاس نہیں حتی کہ اگر ایک ارب مسلمان بیک وقت آپ پر درود سلام پڑھیں تو آپ ان کی طرف توجہ بھی فرماتے ہیں اور سلام کا جواب بھی دیتے ہیں اس کی مثال یہ ہے کہ حضرت عزرائیل آن واحد میں دنیا کے ہزاروں لاکھوں انسانوں کی ارواح قبض کرتے ہیں اور ایک روح قبض کرنا انھیں دوسری روح کے قبض کرنے سے مشغول نہیں کرتا اور اس کے وہ اللہ کی تسبیح و تقدیس میں بھی مصروف ہیں۔ (المواہب اللدنیہ جلد 4)۔ اگر فرشتے کی توجہ کی ہمہ گیری کا یہ عالم ہے تو سید المرسلین کی وسعت نظر کا کیا کہنا۔ لہذا جب بھی کوئی امتی اپنے آقا و مولی کو پکارتا ہے تو آپ اس کی فریاد سنتے اور اس کی طرف نظر رحمت فرماتے ہیں جب آپ سلام سنتے ہیں تو اگر کوئی شخص سلام کے ساتھ فریاد پیش کرتے تو وہ کیوں نہ سنی جائے گی؟ اس لیے امام احمد رضا بریلوی اسی حدیث مبارک کی روشنی میں فرماتے ہیں:

فریاد امتی جو کرے حال زار میں
ممکن نہیں کہ خیر بشر کو خبر نہ ہو۔

صحابہ کرام (رض) کا نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو بعد وصال غائبانہ مدد کو پکارنا

اس جگہ طبرانی نے حدیث صحیح روایت کی ہے کہ عہد حضرت عثمان میں ایک شخص حضرت عثمان بن حنیف سے کہنے لگا کہ وہ اپنی حاجت کے سلسلہ میں کئی بار حضرت عثمان غنی کے پاس گیا ہے مگر (کثر مشاغل کے سبب) انھوں نے اس کی طرف توجہ نہیں کی۔ حضرت عثمان بن حنیف نے اسے کہا کہ تم جا کر وضو کرو مسجد میں دو رکعت پڑھو پھر یوں دعا کرو:

اللھم انی اسئلك واتوجه الیك بنبینا محمد، اے اللہ میں اپنے نبی محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے وسیلہ سے تجھ سے مانگتا اور تیری طرف متوجہ وہتاہوں۔ اس کے بعد یہ کہو: یامحمد انی اتوجه بك الی ربی فیقضی

حاجتی۔یعنی یا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں آپ کے وسیلہ سے اپنے رب کی طرف متوجہ ہوتا ہوں تاکہ وہ میری حاجت پوری کرتے۔ یہ دعا مانگ کر تم حضرت عثمان غنی کے پاس جانا پھر جو وہ کہیں مجھے آکر بتانا۔

وہ شخص یہ دعا مانگ کر حضرت عثمان غنی کے پاس گیا اور دروازے پر کھڑے شخص نے اسے فوراً امیر المومنین کے پاس پہنچادیا، آپ نے اسے اپنی مسند پر اپنے ساتھ بٹھایا اور فرمایا مجھے تمہاری بات بھول گئی تھی اب جب بھی تمہیں کوئی ضرورت ہو میرے پاس سیدھے چلے آنا۔ وہ شخص وہاں سے نکل کر حضرت عثمان بن حنیف کے پاس گیا اور شکریہ ادا کیا ان کی سفارش سے امیر المومنین نے اس کا مسئلہ حل کر دیا۔

وہ کہنے لگے بخدا! میں نے تمہارے لیے کوئی سفارش نہیں کی۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس حاضر تھا اتنے میں ایک نابینا شخص آگیا اور اپنی نابینائی کی شکایت کی یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میرا بازو پکڑنے والا بھی کوئی نہیں آپ؛ نے فرمایا تم جاکر وضو کرو پھر دو رکعت پڑھو پھر یہی دعا کرو: اللھم انی اسئلک، الخ۔ حضرت عثمان بن حنیف (رض) نے فرمایا اللہ کی قسم! ابھی ہم مجلس سے اٹھنے نہ تھے اور نہ ہی بات لمبی ہوئی تھی کہ وہ شخص آگیا اور اس کی آنکھیں یوں درست تھیں جیسے ان میں کوئی مرض نہ تھا۔

(المعجم الکبیر للطبرانی جلد 9 صفحہ 31)۔ امام طبرانی معجم صغیر میں بھی یہ حدیث نقل کی اور اس کے بعد فرمایا، والحدیث صحیح کہ یہ حدیث صحیح ہے۔ معجم صغیر للطبرانی جلد اول)۔

اس حدیث کو امام بیہقی نے بھی دلائل النبوۃ جلد 1 ص 167 مطبوعہ بیروت میں اپنی سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔

اب اس حدیث میں ہے کہ حضرت عثمان بن حنیف (رض) نے وصال نبوی کے بعد اس شخص کو وہ دعا سکھلائی جو رسول اللہ نے نابینا صحابی کو سکھلائی تھی جس میں یہ الفاظ بھی ہیں، **یامحمد انی اتوجه بك الی ربك فیقضی لی حاجتی**، اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں آپ کے وسیلہ سے آپ کے رب کی طرف توجہ کرتا ہوں تاکہ وہ میری یہ حاجت پوری کر دے۔ اس میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو غائبانہ پکارا گیا اور آپ کو بارگاہ الٰہی میں وسیلہ بنا کر پیش کیا گیا ہے اگر یہ شرک ہے تو کیا نجدی علماء صحابی رسول حضرت عثمان بن حنیف پر شرک کا فتوی لگائیں گے؟۔

پھر حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے وصال کے بعد صحابہ کرام پر سب سے مشکل وقت جنگ یمامہ میں آیا جب مسیلمہ کذاب ایک لاکھ کا لشکر لے کر میدان میں اترا۔ اس جنگ میں بارہ سو کے قریب صحابہ کرام اور تابعین شہید ہو گئے جن میں حفاظ و قراء کی کثرت تھی۔ روایات میں ہے، **وکان شعارھم یومئذ یامحمداہ**۔ وہ اس دن **یامحمداہ** کا نعرہ لگاتے تھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام کو اس جنگ میں فتح عطا فرمادی ان تمام احادیث صحیحہ سے معلوم ہوا صحابہ کرام حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی قبر انور پر حاضر ہو کر بھی آپ سے مدد مانگتے تھے اور مصائب میں آپ سے غائبانہ فرمایا بھی کرتے تھے اگر یہ عمل شرک ہے تو صحابہ کرام پر کیا فتوی لگایا جائے ؟۔

نجدی اور دیوبندی علماء کی عبارات سے غائبانہ استغاثہ کا ثبوت

اس جگہ حیرت کی بات یہ ہے کہ خود وہابی علماء بھی اپنی کتابوں میں اپنے اسلاف اور حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے غائبانہ استغاثہ کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ غیر مقلدین کے پیشوا وحید الزمان حیدر آبادی لکھتے ہیں کہ:
"اگر کسی شخص کا یہ گمان ہو کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یا حضرت علی (رض) یا کسی ولی اللہ کی قوت سماعت تمام عالم کو محیط ہے تو اس میں کوئی شرک نہیں کیونکہ اللہ نے بعض فرشتوں کو بلکہ حیوانات کو بھی انسانوں سے بڑھ کر سماعت وبصارت عطا فرمائی ہے، چنانچہ دیلمی نے مسند الفردوس میں اور ابویعلی نے اپنی مسند میں مرفوعا روایت کیا ہے کہ اللہ نے میری قبر پر فرشتہ مقرر کیا ہے (یعنی مقرر کر دے گا) تو جب بھی میرا کوئی امتی مجھ پر درود پڑھے تو وہ فرشتہ مجھے کہتا ہے کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فلاں بن فلاں نے اس وقت پر آپ درود پڑھا ہے (ہدایۃ المہدی)۔

اسی طرح مولوی وحید الزمان حیدرآبادی اس سے دو صفحہ قبل لکھتے ہیں: دعا شرعی عبادت ہے جیسے نماز تو یہ غیر اللہ کے لیے جائز نہیں اور جن آیات میں غیر اللہ سے دعاء سے منع کیا گیا ہے اس میں یہی عبادت کا معنی مراد ہے۔ رہا لغوی دعا، یعنی پکارنا تو وہ غیر اللہ کے مطلقا جائز ہے خواہ وہ زندہ ہو یا مردہ، جیسا کہ نابینا شخص والی حدیث، اے محمد میں آپ کے ذریعہ اپنے رب کی طرف توجہ کرتا ہوں۔ ایک حدیث مبارک میں ہے، اے اللہ کے بندو میری مدد کرو اور حضرت عبد اللہ بن عمر (رض) کا جب قدم ٹل گیا تو انھوں نے کہا تھا، وامحمداہ، اور جب شاہ روم نے شہداء کو نصرانیت

کی دعوت دی تو انھوں نے کہا: یا محمد اہ، اسے ہمارے اصحاب میں سے ابن جوزی نے روایت کیا ہے اور حضرت اویس قرنی نے حضرت عمر فاروق (رض) کی وفات کے بعد کہا تھا، عمر اہ یا عمر اہ یا عمر اہ، اسے ابن حبان نے روایت کیا ہے (ہدایۃ المہدی)۔

اسی پر بس نہیں مولانا وحید الزمان اہل حدیث گھر کی بات بتاتے ہوئے آگے کہتے ہیں کہ علماء اہل حدیث کے پیشوا نواب سید صدیق حسن خاں اپنے مسلک کے پرانے ائمہ علامہ ابن قیم اور قاضی شوکانی کو غائبانہ پکارتے تھے تو وہ کہتے ہیں: وقال السید فی بعض توالیفه:

قبلہ دیں مددے، کعبہ ایماں مددے ابن قیم مددے قاضی شوکاں مددے

یعنی اے قبلہ دیں مدد کرو، اے کعبہ ایماں مدد کرو اے ابن قیم مدد کرو اے قاضی شوکانی مدد کرو۔

(ہدایۃ المھدی ص 23)۔

اسی طرح بانی دار العلوم دیوبند مولا قاسم نانوتوی حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے استغاثہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

مدد کر اے کرم احمدی کہ تیرے سوا نہیں ہے قاسم بے کس کا کوئی حامی کار

جو تو ہی ہم کو نہ پوچھے تو کون پوچھے گا اپنے کو۔ نہ ہمارا تیرے سوا غمخوار

رجاء و خوف کی موجوں میں ہے امید کی ناجو تو ہی ہاتھ لگائے تو ہو وے بیڑا پار۔

(قصائد قاسمیہ مطبوعہ کتب خانہ رشیدیہ اردو بازار دہلی سن طباعت 1360)۔

ادھر مولانا اشرف علی تھانوی رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے استغاثہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

یا شفیع العباد خذ بیدی انت فی الاضطرار معتمدی

لیس لی ملجاء سواک اغث مسنی الضر سیدی سندی

غشنی الدھر یا ابن عبد اللہ کن مغیثا فانت لی مددی

مولانا اشرف علی صاحب نے اپنے ان عربی اشعار کا خود ہی منظوم اردو ترجمہ کیا ہے جو ترتیب وار یہ ہے:

دستگیری کیجئے میری نبی کشمش میں تم ہی ہو میرے نبی

جز تمہارے ہے کہاں میری پناہ فوج کلفت مجھ پر آ غالب ہوئی

ابن عبد اللہ زمانہ ہے خلاف اے میرے مولا خبر لیجئے میری۔ (نشر الطیب فی ذکر النبی الحبیب ص 158)۔

پھر ایک جگہ مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ کی روح سے استمداد کرتے ہوئے کہتے ہیں:

یاسیدی للہ شیئا انہ، انتم لی المجدی وانی جادی۔ یعنی اے میرے سردار، اللہ کے لیے مجھے کچھ دیجئے کہ آپ میرے داتا ہیں اور میں سوالی۔ (تذکرہ الرشید ص 114، مطبوعہ ادارہ اسلامیات انارکلی لاہور)۔

اب اگر مولانا اشرف علی تھانوی اور مولانا قاسم نانوتوی رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو مدد کے لیے پکار رہے ہیں اور ان کے ایمان اور ان کی توحید میں کچھ فرق نہیں آتا تو دوسرے مسلمان جب یارسول اللہ، یاعلی، اور یاغوث کہہ دیں تو وہ کیوں کافر و مشرک ہو جاتے ہیں؟ یہی نہیں اہل حدیث علماء میں سے مولانا سید نواب صدیق حسن خان اپنے فوت شدہ بزرگوں ابن قیم اور قاضی شوکانی کو غائبانہ مدد کے لیے پکارتے ہیں اور مولا اشرف علی تھانوی مولانا رشید احمد گنگوہی صاحب کو ان کے وصال کے بعد غائبانہ مدد کے لیے پکارتے ہیں اس کے باوجود مسلمان ہی رہے ہیں تو دوسرے مسلمانوں پہ حضور پر نور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو مدد کے لیے پکارنے پر کفر و شرک کے فتوؤں سے کیوں نوازا جاتا ہے؟ اللہ تعالیٰ مسلمانوں میں اتحاد پیدا کرے اور وہ سب قرآن و سنت اور عمل صحابہ کرام اجمعین کی طرف لوٹ آئیں

(تفسیر برہان القرآن۔ علامہ قاری محمد طیب)

اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کے بعد اب عبادت کی تعلیم دی جارہی ہے، اس ترتیب سے یہ حقیقت بھی اجاگر ہوگئی کہ اعتقاد، عمل پر مقدم ہے اور عبادت کی قبولیت عقیدے کی صحت پر موقوف ہے۔

انگریزی میں عبادت کو ورشپ (worship) کہا جاتا ہے اور آکسفورڈ ڈکشنری کے مطابق: خدا کے لیے عزت و احترام کے عمل ظاہر کا نام عبادت ہے۔

"the practice of showing respect for God"

اسلام میں بھی عبادت کا مفہوم اسی طرح ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کو معبود سمجھ کر اس کے سامنے عاجزی و انکساری کرے۔ مثال کے طور پر نماز میں انسان رکوع کے بعد ہاتھ چھوڑ کر کھڑا ہے تو بھی عبادت ہے کیونکہ جس ذات کے لیے کھڑا ہے وہ اس کا معبود حقیقی ہے۔ اس کے بر عکس اگر ایک بیٹا اپنے باپ کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہے تو یہ عبادت نہیں بلکہ احترام اور تعظیم ہے کیونکہ کوئی مسلمان بیٹا اپنے باپ کو معبود نہیں سمجھتا۔

نیز قرآن بتاتا ہے کہ فرشتوں نے حضرت آدم (علیہ السلام) کو اور برادران یوسف (علیہ السلام) نے حضرت یوسف (علیہ السلام) کو سجدہ کیا، اس کے باوجود نہ فرشتے مشرک ہوئے اور نہ ہی برادران یوسف (علیہ السلام) کیونکہ وہ مسجود کو معبود نہیں سمجھتے تھے بلکہ صرف تعظیم مقصود تھی۔ اسلام نے عبادت اور تعظیم دونوں کا حکم دیا ہے۔ عبادت اللہ تعالیٰ کی اور تعظیم اللہ والوں کی، لہٰذا عبادت اور تعظیم میں فرق نہ کرنا اور تعظیم کرنے والے پر عبادت کا الزام عائد کر کے اسے مشرک کہنا قرآن کے مزاج کے خلاف ہے۔

عبادت کے لائق صرف اور صرف ذات باری تعالیٰ ہے اور جو شخص کسی مخلوق (نبی، ولی یا سورج، آگ، پتھر وغیرہ) کی عبادت کرتا ہے وہ اس میں کسی خوبی یا جمال سے متاثر ہوتا ہے حالانکہ وہ حسن یا کمال اس کا ذاتی نہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ اس میں یہ خوبی نہ رکھتا تو کوئی انسان اس سے متاثر نہ ہوتا، لہٰذا عبادت کا مستحق صاحب کمال نہیں بلکہ خالق کمال ہے جس نے کائنات کو حسن و کمال سے مزین فرمایا۔

عبادت کے حوالے سے حضرت رابعہ عدویہ رحمۃ اللہ علیہا کا قول غور طلب ہے: تیری قسم اے اللہ تعالیٰ! میں جنت کے لالچ یا دوزخ کے ڈر سے تیری عبادت نہیں کرتی بلکہ اس لیے کرتی ہوں کہ تو ہی عبادت کے لائق ہے۔

اگر حور جنت کی دل میں بسی ہے
عبادت ہی کیا یہ تو سوداگری ہے

(8) ساری کائنات کا خالق، مالک اور رازق اللہ تعالیٰ ہے۔ اس کی مرضی نہ ہو تو کوئی پتہ حرکت نہ کر سکے، اس کی اجازت نہ ہو تو کوئی ستارہ چمک نہ سکے، وہی کارساز حقیقی ہے، وہی اس لائق ہے کہ اس سے مدد مانگی جائے، اسی لیے ہم دن میں درجنوں بار بصد ادب و نیاز عرض کرتے ہیں: ایاک نستعین (اے ہمارے پروردگار! ہم تجھی سے مدد مانگتے ہیں) لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم بیماری کے لیے ڈاکٹر سے مدد نہ مانگیں، دشمن کے لیے ہتھیار کا سہارا نہ لیں، دعا

کے لیے کسی بزرگ کے پاس نہ جائیں۔ دراصل یہ اسباب بھی اللہ تعالیٰ نے ہی پیدا فرمائے ہیں۔ بلاشبہ حقیقی مدد گار تو وہی ہے مگر یہ اس کی قدرت کے مظاہر ہیں۔ مثال کے طور پر نماز اور صبر خدا نہیں ہیں مگر اللہ تعالیٰ نے ان سے مدد لینے کا حکم دیا ہے۔ (قرآن: 2:153) لہٰذا اسباب کا سہارا لینا حقیقت میں اللہ تعالیٰ سے مدد لینا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ ان میں مدد کی صلاحیت نہ رکھتا تو ہمیں ان کے پاس جانے کی ضرورت نہ تھی۔

جس طرح مخلوق کی تعریف درحقیقت خالق کی تعریف ہے اسی طرح مخلوق سے مدد لینا بھی دراصل اللہ تعالیٰ کی ہی مدد ہے کیونکہ ساری کائنات کا کارساز حقیقی وہی ہے۔ ہاں اگر کوئی بیوقوف یہ سمجھے کہ اللہ نہ چاہے تو بھی ڈاکٹر کی دوا اور بزرگ کی دعا شفا دے سکتی ہے تو یہ واضح شرک ہے۔ اس طرح کا عقیدہ رکھنے والا انسان کافر ہو جاتا ہے۔

(تفسیر امداد الکرم۔ محمد امداد حسین پیرزادہ)

پھر ایاک نعبد بندہ عرض کرتا ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ "الٰہی ہم تجھ ہی کو پوجیں"۔ یہ بندہ کا عرض کرنا اس وقت ہوتا ہے جبکہ وہ اس کی ثناء وصفت غائبانہ کرتا ہوا اس کی نعمتوں اور ان عالموں کا مشاہدہ کرتا ہے جو مورد نعمت ہیں تو اس طرف متوجہ ہوتا ہے گویا غیبت سے حضور میں آکر صاحب نعمت کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اس یقین و مشاہدہ کے بعد وہ رتبہ خطاب پا کر بارگاہ الوہیت کو مخاطب کرتا ہوا لفظ ایاك نعبد کہہ کر کلام کرتا ہے اور عرض پیرا ہوتا ہے کہ میں خاص تیری پوجا کرتا ہوں۔ اور حقیقت عبادت یہ ہے کہ انتہاء مراتب تعظیم بجالائے اور اسی وجہ میں یہ عبادت متعدد اقسام پر منقسم ہے۔ بعض کا تعلق اس عبادت میں ظاہری ہوتا ہے۔ بعض اس عبادت میں باطنی تعلق رکھتے ہیں۔ وہ عابد جن کا تعلق ظاہر ہوتا ہے وہ محض زبان سے ذکر و تلاوت اور تسبیح و تہلیل اور ادعیہ ماثورہ پڑھنے اور دعا کرنے تک محدود ہے۔ اور آنکھ سے مشاہدہ مقامات مقدسہ جیسے کعبہ شریف اور قرآن مجید اور زیارت بزرگان دین و اولیاء کاملین رحمہم اللہ اور زیارت مزارات صالحین جنہوں نے راہ حق میں اپنی جانیں فدا کیں اور دوسری مخلوق کا مشاہدہ جیسے آسمان ستارے دریا کشتی اور ہزارہا قسم کے نظاروں تک محدود رہتا ہے۔ ایسے ہی کان سے قرات سننے، ذکر کی سماعت کرنے کے بعد شوق و ذوق اطاعت بڑھانے تک رہتا ہے حتیٰ کہ کبھی رکوع میں کبھی سجدہ میں کبھی قیام میں کبھی قعدہ میں ازخود رفتہ ہوتا رہتا ہے اور بس۔ لیکن جو عبادت کہ متعلق باطن ہوتی ہے اس میں عابد کا فکر آیات و فرامین الٰہی کی طرف جاتا اور معانی قرآن اور حقیقت احکام شرعیہ تک عبور کرتا ہے اور یہ سب عبادت عقلی ہے۔ پھر

عبادت نفس یہ ہے کہ صبر کرے اور ترک مالوفات پر جدوجہد کر کے روزہ و اعتکاف میں رہے اور ہر مصیبت و تکلیف میں جزع و فزع سے اجتناب کرے اور لذائذ حرام و معاصی سے پرہیز کرے۔ پھر عبادت قلب یہ ہے کہ محبوبان حق سے محبت رکھے اور مبغوض الٰہی کو قریب نہ آنے دے اور ثواب کا امیدوار رہتا ہوا عذاب الٰہی سے خائف رہے اور عبادت روح یہ ہے کہ مشاہدہ ذات کی آتش شوق کو تیز سے تیز تر کرے اور اس کی محبت و تصور میں مراقبہ کر کے لذت حاصل کرے۔ اور عبادت سر یہ ہے کہ معرفت الٰہی میں مستغرق ہو کر جتنا تعلق مال سے ہو وہ زکوٰۃ و صدقات و خیرات میں خرچ کرے اور جتنا تعلق اعضاء سے ہے وہ قوائے ظاہر و باطن کے ذریعہ جمیل حقیقی کی محبت میں مرضیات محبوب کی طرف مشغول کرے۔ اور **ایاك نستعین** کہہ کر اپنے مالک حقیقی محبوب تحقیقی کے حضور عرض کرے کہ میں خاص تجھ سے مدد چاہتا ہوں۔ یہ لفظ اس لیے سکھایا اور زبان سے کہلوایا کہ عبادت و ریاضت و تخیل و تصور میں بڑھ کر بندہ کہیں عجب و نخوت کا شکار نہ ہو جائے۔ تو گویا وہ عرض کرے کہ الٰہی یہ جو کچھ عبادت و ریاضت مجھ سے ہو رہی ہے یہ سب تیری ہی معرفت و مدد سے ہے مجھ میں ان کے ادا کرنے کی ہمت اور طاقت کہاں تھی۔ لہٰذا تجھی سے اب بھی مدد طلب کر رہا ہوں تا کہ تیری مدد مجھے اس پر قائم رکھے اور چونکہ دنیا میں۔

تین قسم کی جماعتیں ہیں اور ہر جماعت نستعین سے علیحدہ علیحدہ عقیدہ رکھتی ہے لہٰذا ان سے بھی بچانا محفوظ رکھنا تیرا ہی کام ہے اور تیری جماعت میں رہنے کی توفیق تو ہی دینے والا ہے۔ ایک جماعت ہے جسے جبریہ کہتے ہیں۔ دوسری جماعت قدریہ کے نام سے موسوم ہے۔ تیسری جماعت سنیہ ہے۔

جبری کہتے ہیں کہ ہمیں کچھ اختیار نہیں ہم تو مثل لکڑی اور پتھر کے ہیں جو کچھ کراتا ہے وہ اللہ ہی کراتا ہے۔ لہٰذا ہم پر عذاب ہے نہ ہمیں کوئی ثواب۔ قدری کہتے ہیں کہ ہم ہر قسم کا اختیار رکھتے ہیں اور ہر فعل و حرکت ہماری ایجاد و افعال سے ہے اور ہم ہی سب کچھ کرتے ہیں۔ یہ دونوں جماعتیں اسلام میں مردود و نا محمود ہیں۔ چنانچہ پہلی جماعت کا رد تو احکام شرعیہ و تکلیفات قانونیہ سے کر دیا گیا تا کہ سب سمجھ سکیں کہ اگر ہم لکڑی پتھر کی مثال ہیں تو **اقیموا الصلوۃ** (نماز قائم کرو) کا امر کسے ہے۔ اگر مجبور محض ہیں تو اتوا الزکوۃ (زکواۃ دو) کیوں فرمایا گیا۔ اور دوسرا فرقہ جو کارخانہ خالقیت میں دعویٰ شرکت کرتا ہے ان کے رد کے لیے **ایاك نعبد و ایاك نستعین** (ہم خاص تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں) فرما دیا جس سے در حقیقت جبریہ اور قدریہ دونوں کا رد کامل ہو گیا۔

اب رہا تیسرا فرقہ جسے سنی کہا جاتا ہے۔

وہ کہتا ہے بندگی وعبادت ہم کریں گے اور اس کی توفیق اللہ تعالیٰ سے طلب کریں گے۔ اور بعض عرفا تو یہ کہتے ہیں کہ اس جگہ نستعین سے مراد طلب عون نہیں ہے بلکہ طلب عین معائنہ ہے یعنی اس کے یہ معنی ہیں کہ ہماری طرف سے عبادت ہے اور مرتبہ معائنہ عطا فرمانا اور عین الیقین تک پہنچانا اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔

گویا نعبد اللہ کانك تراہ (تو ایسے اللہ کی عبادت کرے گویا تو اسے دیکھ رہا ہے) میں عبادت من جانب العبد ہے اور اراۃ جمال جمیل یہ جمیل حقیقی کا فضل ہے۔ حضرت شیخ المشائخ سفیان الشوری رحمۃ اللہ ایک روز نماز شام میں تھے اور امام تھے قرات فرماتے ہوئے جب ایاك نعبدو ایاك نستعین پر آئے تو بے ہوش ہو کر گر گئے۔ جب ہوش آیا متقدیوں نے عرض کیا حضور کیا ہوا جو آپ بے ہوش ہو گئے فرمایا جب میں نے ایاك نستعین کہا تو مجھے خوف طاری ہوا کہ اگر مجھ سے جواب طلب ہو گیا کہ جب ہم سے استعانت کرتا تھا تو طبیب سے دوا کیوں مانگی۔ حاکم سے اپنا وظیفہ کیوں طلب کیا۔ بادشاہ سے مددگار و محافظ کیوں چاہے۔

چنانچہ بعض علماء فرماتے ہیں کہ مرد حق آگاہ کو چاہیے کہ اس سے شرم کرے کہ پانچ وقت مواجہہ الٰہی میں کھڑا ہو کر ایاک نستعین کہتا ہے اور غیر سے استعانت کرتا رہتا ہے۔ یہ مسئلہ استعانت اس جگہ سمجھنا ضروری ہے۔ بات یہ ہے کہ استعانت بالغیر اگر اس عقیدہ سے ہو کہ اس پر مطلقاً اعتماد کر لے اور اسے مظہر عون الٰہی نہ جانے تو فی الواقع ایسی استعانت حرام ہے جیسے کسی جاہل کا شعر ہے۔

اگر باب اجابت بند ہو جائے تو کیا غم ہے

کھلا رہتا ہے دروازہ معین الدین چشتی کا (استغفر اللہ)

اس شعر میں جاہل شاعر نے باب اجابت سے بے پرواہ ہو کر باب غریب نواز کو عین معین ظاہر کیا اور یہ حرام ہے اور اگر التفات بجانب حق ہو تو اور جس سے استمداد و استعانت کر رہا ہے اسے مظاہر عون کا ایک مظہر جانتا ہے تو نظر بکارخانہ اسباب و حکمت باری تعالیٰ رکھ کر کسی خدا کے بندے سے مدد طلب کرتا ہے تو یہ بعید از عرفان نہیں اور ایسی استعانت بالغیر شریعت مطہرہ میں جائز ہے اور ایسی استعانت انبیاء و اولیاء کرتے رہے ہیں اور یہ استعانت بالغیر نہیں

بلکہ استعانت بحضرت حق ہی ہے۔ اور اگر اس قسم کی استعانت بھی ایاك نستعین کے خلاف مان لی جائے تو حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کا من انصاری الی اللہ، بھی صحیح نہیں رہتا اور استعینوا بالصبر والصلوۃ بھی غلط قرار پائے گا اس لیے کہ صبر اور صلوۃ خدا نہیں بلکہ ذریعہ قرب خدا ہیں۔ آگے ارشاد ہے۔

(تفسیر الحسنات۔ علامہ ابوالحسنات سید محمد احمد قادری)

اسلام میں عبادت کا تصور

اسلام نے آکر ان تمام تصورات کی اصلاح فرمائی اس نے سب سے پہلے اس بات کو واضح کیا کہ عبادت صرف بند گی کے چند مراسم بجالانے کا نام نہیں۔ بلکہ اس نے عبادات کے نام سے بند گی کے جن طریقوں کو اپنے ماننے والوں کے لیے لازم ٹھہرایا ہے اس کے بارے میں واضح طور پر ارشاد فرمایا کہ یہ اسلام کی بنیادیں ہیں یہ اسلام کی مکمل عمارت نہیں ہے۔ ان کی حیثیت یہ ہے کہ کوئی آدمی ان سے صرف نظر اور انکار کر کے مسلمان ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا لیکن صرف انہی کو بجالانا مکمل عبادت نہیں ہے۔ کیونکہ صرف بنیادیں بھر دینے سے عمارت وجود میں نہیں آجاتی البتہ یہ ضرور ہے کہ جب بھی عمارت بنے گی انہی بنیادوں پر بنے گی۔ چنانچہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد ہے:

بُنِیَ الاِسلَامُ عَلٰی خمسٍ

"اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے۔"

نماز کو عبادت میں سب سے اہم حیثیت حاصل ہے یہاں تک فرمایا گیا کہ نماز قائم کرو اور مشرکین میں سے نہ ہو جاؤ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو نماز نہیں پڑھتا وہ مسلمان کہاں وہ تو مشرک ہے۔ اور یہ بھی فرمایا گیا کہ قیامت کے دن جس عمل کے بارے میں سب سے پہلا سوال ہو گا وہ نماز ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہم قرآن کریم میں دیکھتے ہیں کہ صاف طور پر فرمایا گیا:

اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکرِیْ (طٰہٰ ۲۰:۱۴)

کہ نماز میری یاد کے لیے قائم کرو اس کا مطلب یہ کہ نماز اپنی تمام تر اہمیت کے باوجود اصل مقصود نہیں۔ بلکہ مقصد پوری زندگی میں اللہ کی یاد ہے کہ وہ کسی کام میں بھی دل سے اوجھل نہ ہونے پائے۔ مزید ارشاد فرمایا:

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنۡہٰی عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَالۡمُنۡکَرِ ط (عنکبوت ۲۹:۴۵)

کہ نماز تو بے حیائی اور برے کاموں سے روکتی ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاں نماز مثبت حیثیت سے اللہ کی یاد کا ذریعہ ہے وہاں اس کا منفی پہلو یہ ہے کہ وہ بے حیائی اور منکرات سے روکتی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی نماز آدمی کو بے حیائی اور بری باتوں سے نہیں روکتی تو وہ نماز مقصد نہیں ہے بلکہ اصل مقصد یہ ہے کہ نماز یعنی عبادت ایسی ہونی چاہیے جس کے نتیجے میں پوری زندگی کی فکری اور عملی تطہیر ہو جائے اس لیے اسلام نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اس نے عبادت کو اللہ اور بندے کے درمیان پرائیویٹ معاملہ کی بجائے اس کو پوری زندگی کا دستور اور وظیفہ ٹھہرایا اور دوسرا تصور اس نے یہ دیا کہ اللہ تعالیٰ اپنی تمام عظمتوں کے باوجود انسان کے اس قدر قریب ہے کہ شہ رگ بھی انسان کے اس قدر و قریب نہیں۔ یعنی شہ رگ حیات زندگی کی بقا کی ضامن ہے اس کے کٹ جانے سے زندگی کٹ جاتی ہے ظاہر ہے کہ اس سے بڑھ کر اور کوئی چیز انسان کے قرب نہیں ہو سکتی۔ مگر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ میں انسان کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہوں اور دوسرا اس نے اپنی کتاب میں بار بار فرمایا کہ میں سمیع ہوں، بصیر ہوں، علیم ہوں، تمہارا کوئی عمل حتیٰ کہ تمہاری کوئی احساس اور خیال بھی میرے علم سے باہر نہیں۔ اور تمہاری کوئی حرکت میری نگاہوں سے اوجھل نہیں۔ تو جو ذات اس قدر قریب ہے اور اس قدر انسان سے آگاہ ہے اس کے اور بندے کے درمیان کسی اور واسطے کا کیا معنی۔ اس لیے اس نے بار بار ارشاد فرمایا کہ تم مجھ پر ایمان لائے ہو تو پھر مجھی کو پکارو، میں تمہاری ہر پکار کو سنتا ہوں اور اسے قبول کرتا ہوں۔ اسی طرح اس نے درمیانی واسطے کا تصور ختم کر دیا مزید اس نے یہ اصلاح فرمائی کہ عبادت کا تعلق چونکہ تمہاری پوری زندگی سے ہے اور تم اپنی زندگی دنیا اور اہل دنیا میں رہ کر گذارو گے اس لیے دنیا اور اہل دنیا سے تعلقات تمہاری عبادت سے کیسے خارج ہو سکتے ہیں اور تم دنیا سے لا تعلق ہو کر عبادت کے تقاضوں کو کیسے پورا کر سکتے ہو۔ اس لیے عبادت یہ نہیں کہ تم دنیا سے ترک تعلق کر کے صرف اللہ کا نام پکارتے رہو بلکہ عبادت یہ ہے کہ دنیا میں رہ کر دنیا کو برت کر اس طرح دکھاؤ کہ نہ تمہارا دل کبھی اللہ کے تصور سے غافل ہو اور نہ تمہارا قدم کبھی اس کی عائد کردہ حدود

سے باہر نکلے۔ نہ تمہارا ہاتھ کبھی اس کے حکم کو توڑے اور نہ تمہارے دل و دماغ کی قوتیں کبھی اس سے بغاوت کریں۔ جس طرح تم بھوکے رہ کر اس کی بندگی کے پابند ہو اسی طرح پیٹ بھر کر بھی دولت مند ہو کر بھی حتٰی کہ تخت و تاج کے مالک ہو کر بھی اسی کے بندے ہو اس طرح تمام تصورات کا ابطال فرما کر اور غلط خیالات کو رد کر کے اسلام کا صحیح تصور عبادت پیش کیا۔ لیکن اسلام کا کامل تر تصور عبادت اس وقت تک سمجھ نہیں آئے گا جب تک کہ عبادت کے معنی اور اس کے مصداق کو اچھی طرح نہ سمجھ لیا جائے۔

عبادت کا مفہوم

عربی زبان میں عبودۃ ،عبادت اور عبودیت عَبَدَ سے مصدر ہے۔ اس کے اصل معانی خضوع اور تذلل کے ہیں یعنی تابع ہو جانا ،رام ہو جانا۔ کسی کے سامنے اس طرح سپر انداز ہو جانا کہ اس کے مقابلہ میں کوئی مزاحمت یا انحراف و سر تابی نہ ہو اور وہ اپنی منشا کے مطابق جس طرح چاہے خدمت لے۔ اسی اعتبار سے عرب اس اونٹ کو بعیر معبد کہتے ہیں جو سواری کے لیے پوری طرح رام ہو چکا ہو اور اس راستے کو طریق معبد کہتے ہیں جو کثرت سے پامال ہو کر ہموار ہو گیا ہو پھر اسی اثر سے اس مادہ میں غلامی ،اطاعت ،پوجا ،ملازمت اور قید کے مفہومات پیدا ہوئے۔ چنانچہ اسی مادہ عَبَدَ سے بننے والا ایک مشہور لفظ جو عربی اور اردو دونوں زبانوں میں اکثر مستعمل ہے وہ عبد ہے عبد کا معنی ہے غلام اور یہ اردو اور عربی دونوں میں اسی معنی میں مستعمل ہے اور قرآن کریم نے بھی اس کو اسی معنی میں استعمال کیا ہے۔ مثلاً ایک جگہ فرمایا:

اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ (البقرۃ۲:۱۷۸)

یہاں دیکھئے کہ حر کے بعد جس کا معنی آزاد ہے لفظ عبد غلام کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے اسی طرح ایک جگہ غلاموں اور لونڈیوں کے نکاح کرنے کا حکم دیا گیا تو فرمایا:

وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَآئِكُمْ (النور۲۴:۳۲)

اس آیت میں دیکھئے لونڈیوں کے ساتھ عباد کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جو عبد کی جمع ہے اسی طرح کائنات کی تمام مخلوق کے بارے میں جن میں نمایاں خود حضرت انسان ہے ارشاد فرمایا گیا:

اِنۡ كُلُّ مَنۡ فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ اِلَّاۤ اٰتِى الرَّحۡمٰنِ عَبۡدًا ؕ (النور ۲۴:۹۳)

یہاں بھی دیکھئے عبد کا لفظ غلام کے معنی میں استعمال ہوا ہے اسی طرح قرآن پاک میں اور بھی کیے مواقع پر آپ کو عبد یا عباد کا لفظ غلام کے معنی میں مستعمل نظر آئے گا۔ اسی طرح عبد کو باب تفصیل میں لے جا کر غلام بنانے کے معنی میں قرآن کریم میں ذکر کیا گیا ہے۔ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے حوالے سے بیان کیا گیا:

وَتِلۡكَ نِعۡمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَىَّ اَنۡ عَبَّدْتَّ بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ ؕ (الشعراء ۲۹۔۲۲)

یہاں دیکھئے عُبَّدۡتَّ غلام بنانے کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

مختصر یہ کہ عبد کا معنی ہے غلام اور عبادت، عبودیت، عبد سے مصدر ہے اس کا معنی ہے غلامی۔ یعنی کسی کی بالا دستی و برتری تسلیم کر کے اس کے مقابلے میں اپنی آزادی اور خود مختاری سے دستبردار ہو جانا سر تابی اور مزاحمت چھوڑ دینا اور اس کے لیے رام ہو جانا۔ یہی حقیقت بندگی اور غلامی کی ہے۔ لہٰذا اس لفظ سے اولین تصور جو ایک عرب کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے وہ بندگی اور غلامی ہی کا تصور ہے۔ پھر چونکہ غلام کا اصلی کام اپنے آقا کی اطاعت و فرمان برداری ہے اس لیے لازماً اس کے ساتھ ہی اطاعت کا تصور پیدا ہوتا ہے اور جب غلام اپنے آقا کی بندگی و اطاعت میں محض اپنے آپ کو سپرد ہی نہ کر چکا ہو بلکہ اعتقاداً اس کی برتری کا قائل اور اس کی بزرگی کا معترف بھی ہو اور اس کی مہربانیوں پر شکر و احسان مندی کے جذبہ سے سرشار بھی ہو تو وہ اس کی تعظیم و تکریم میں مبالغہ بھی کرتا ہے۔ مختلف طریقوں سے اعتراف نعمت کا اظہار بھی کرتا ہے اور طرح طرح سے مراسم بندگی بھی بجالاتا ہے اسی کا نام پرستش ہے۔ اور یہ تصور عبدیت کے مفہوم میں صرف اس وقت شامل ہوتا ہے جبکہ غلام کا محض سر ہی آقا کے سامنے جھکا ہوا نہ ہو بلکہ اس کا دل بھی جھکا ہوا ہو۔ چنانچہ قرآن کریم میں ان تینوں معنوں میں عبادت کے لفظ کو استعمال کیا گیا ہے۔ لیکن تینوں حوالوں سے اصل مقصود غلامی ہے اور یہ دونوں تصورات اس سے پھوٹنے والے اجزا ہیں۔ اس لیے اگر غلامی کی حقیقت کو سمجھ لیا جائے تو خود بخود یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام میں عبادت کا صحیح مفہوم کیا ہے۔

اسلام میں غلامی کا مفہوم

اس غلامی کے حوالے سے قرآن وسنت اور اسلامی تاریخ میں ہمیں دو متضاد تصورات پہلو بہ پہلو سفر کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ پہلا تصور یہ ہے کہ غلامی اسلام کی نگاہ میں انتہائی مکروہ اور ناقابل قبول ہے بلکہ یہ ایک ایسی برائی ہے جس کے تصور کو بھی قبول کرنے سے اسلام انکار کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ پورے قرآن پاک میں ہمیں اس کا کہیں ذکر نہیں ملتا کہ اگر امت غلام بنالی جائے تو پھر اسے زندگی کس طرح گزارنی چاہیے بلکہ ہم پورے قرآن کریم میں ایک آزاد قوم کے تصور حیات کو جابجا پھیلا ہوا دیکھتے ہیں بلکہ قرآن پاک میں متعدد مرتبہ اس بات کو دھرایا گیا کہ تمہاری زندگی کے مقاصد میں نمایاں ترین مقصد یہ ہے کہ تم طاغوت سے اجتناب کرو۔ چنانچہ جس آیت شریفہ میں انبیاء کی دعوت کے حوالے سے عبادت کا ذکر کیا گیا ہے اس کے ساتھ یہ بھی فرمایا گیا: "**واجتنبوا الطاغوت**"

اور تاریخ اسلامی میں ایسے متعدد واقعات ہمیں ملتے ہیں جن سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان جن اصولوں کی بنیاد پر حالات بدلنے کے لیے اٹھے تھے ان میں سب سے بڑی بات انسان کو غیر اللہ کی غلامی سے آزاد کرانا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اہل عجم سے جو پہلی بڑی جنگ لڑی گئی ہے وہ جنگ قادسیہ ہے۔ اس میں حضرت ربعی بن عامر (رض) جب مسلمانوں کی طرف سے سفیر بن کر رستم کے دربار میں گئے تو رستم نے پوچھا کہ تم کس مقصد کے لیے آئے ہو تو انھوں نے فرمایا تھا کہ ہم اس لیے آئے ہیں تاکہ انسان کو انسان کی غلامی سے آزاد کرائیں۔ اس سے آپ اندازہ فرما سکتے ہیں کہ غلامی کا تصور اسلام کی نگاہ میں کس قدر ناپسندیدہ اور کس قدر ناقابل قبول ہے لیکن دوسری طرف ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہ تصور بھی قرآن پاک اور اس کی تعلیمات میں پوری طرح سرایت کیے ہوئے ہے اور جابجا ہمیں پھیلا ہوا ملتا ہے کہ قرآنی تعلیمات کا حقیقی مقصد انسان کو اللہ کا غلام بنانا ہے اور جو لوگ اللہ کے حکم کی اطاعت اور اس کے راستے میں سر فروشی کی وجہ سے اس کے قرب کا مقام پالیتے ہیں تو انھیں اس راستے میں جو بڑے سے بڑا اعزاز مل سکتا ہے وہ یہی لفظ عبد ہے جس کا معنی غلام ہے۔ فرشتے اللہ کے حکم اور اس کی اطاعت سے کبھی سرتابی نہیں کرتے۔ ان کی تعریف کرتے ہوتے پروردگار نے فرمایا: بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ۔ "وہ معزز غلام ہیں۔ "(الانبیآء:۲۱۔۲۶) انبیاء کرام کا گروہ انسانیت کا گل سرسبد ہے۔ ان کی تعریف میں جابجا یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ حضرت سلیمان (علیہ السلام)

کے بارہ فرمایا گیا: وَوَهَبْنَا لِدَاوُدَ سُلَيْمٰنَ ط نِعْمَ الْعَبْدُ ط "کہ ہم نے حضرت داؤد (علیہ السلام) کو حضرت سلیمان (علیہ السلام) جیسا بیٹا عطا فرمایا تھا وہ کتنا اچھا غلام تھا۔ "(ص:۳۸۔۳۰) رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جو مقصود کائنات اور سید المرسلین ہیں، ان کا بھی سب سے بڑا اعزاز یہی لفظ عبد ہے۔ معراج شریف کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا گیا: سُبْحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ لَیۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اِلَی الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا

(بنی اسرائیل:۱۷۔۱)"

پاک ہے وہ ذات جو لے گئی اپنے عبد یعنی اپنے غلام کو ایک ہی رات میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک " یہاں دیکھئے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو عبد سے یاد کیا گیا حالانکہ حسی معجزات میں سے معراج حضور کا سب سے بڑا معجزہ ہے۔ اس معجزے کے حوالے سے جب حضور کا ذکر کیا جائے گا تو یقیناً اس اعزاز کے ساتھ کیا جائے گا جو اللہ کی نگاہ میں انتہائی قدر و منزلت کا حامل ہو گا۔ مگر ہم یہاں دیکھتے ہیں کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو عبد کے لفظ سے یاد کیا جارہا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ عبدیت اللہ کی نگاہ میں ایک انسان کے لیے سب سے بڑا اعزاز ہے۔ شائد اسی وجہ سے کلمہ شہادت میں بھی "اشهدان محمدا عبده ورسوله "فرمایا گیا یعنی میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس کے بندے اس کے غلام اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہیں۔

اب دیکھئے یہ متضاد تصورات کہ ایک طرف غلامی سے نفرت اور دوسری طرف غلامی ہی منزل مقصود ہے اس تضاد کو سمجھنے کے لیے ایک بات ذہن میں رکھنی چاہیے وہ یہ کہ انسان کو جو خصوصیات دے کر پیدا کیا گیا ہے اس کو دیکھتے ہوئے یوں معلوم ہوتا ہے کہ غلامی اور عبدیت انسان کی فطرت ہے وہ اس سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ وہ ہزار یہ دعویٰ کرے کہ میں ایک آزاد زندگی اختیار کرنا چاہتا ہوں جس میں کوئی پابندی کسی اطاعت اور کسی بندگی کا شائبہ تک نہ ہو مگر عملاً اس کے لیے یہ ممکن نہیں کیونکہ وہ غذا کا محتاج ہے اس احتیاج سے بچ نہیں سکتا وہ آرام کے حصول کا خوگر ہے اس سے بے نیاز نہیں ہو سکتا وہ نہ جانے کتنے ماؤف لمحوں میں کبھی خوف اور کبھی امید کی گرفت میں آجاتا ہے اس سے وہ آزاد نہیں ہو سکتا۔ محبت اور نفرت اس کے ایسے لاحقے ہیں جو اس سے الگ نہیں کیے جاسکتے بڑا بن کر رہنا اور دوسروں پر برتری ظاہر کرنا یہ اس کی وہ اندرونی خواہشیں ہیں کہ جن کی زنجیروں کو وہ توڑ نہیں سکتا۔ ممکن ہے کہ وہ بادشاہت کی غلامی سے بچ جائے وہ کسی نظام کو ماننے سے انکار کر دے۔ وہ برادری کی برتری سے بغاوت کر دے۔

لیکن سٹیٹس اور پر سٹیج کی پوجا اور خواہشات کی پیروی سے وہ کبھی آزاد نہیں رہ سکتا۔ یہ غلامی کی کہ وہ چند در چند صورتیں ہیں جس کی کسی نہ کسی صورت میں وہ ضرور مقید رہتا ہے اور یہی وہ قیود ہیں جو اس کی صلاحیتوں کے لیے سمِّ قاتل ثابت ہوتی ہیں وہ جتنا جتنا ان غلامیوں سے آزاد ہوتا جاتا ہے ویسے ویسے اس کی شخصیت میں قوت کے سوتے پھوٹتے جاتے ہیں اور جتنا ان غلامیوں کا شکار ہوتا جاتا ہے ویسے ویسے اس کی صلاحیتیں دھیمی پڑتی جاتی ہیں۔ بقول اقبال:

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے کاجوئے کم آب

اور آزادی میں بحر بے کراں ہے زندگی

چنانچہ انسانیت کا مستقبل، انسان کی صلاحیتوں اور اس کے آزاد ارادوں کو بروئے کار لانے اور اس کے ولولوں، ہمہموں اور اس کی امنگوں کے پھلنے پھولنے میں مضمر ہے اس لیے پروردگار نے ہر قسم کی غلامی کو انسان کے لیے حرام قرار دے دیا۔ لیکن دوسری طرف چونکہ غلامی اس کی فطرت میں داخل ہے جس سے وہ کسی صورت بچ نہیں سکتا اس لیے ایک ایسی غلامی اس کی منزل مقصود بنا دی گئی کہ جس غلامی کو قبول کرنے کے بعد آدمی باقی ساری غلامیوں سے نجات پا سکتا ہے۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ اگر مخلوق کی غلامیوں سے کسی غلامی کو مشروع قرار دیا جاتا تو پھر مخلوق کی غلامی سے بچنا ممکن نہ ہوتا اس لیے مخلوق کی ہر غلامی سے آزادی کا حکم دیا گیا اور صرف ایک غلامی کا جواز بخشا گیا بلکہ اس کا حکم دیا گیا وہ ہے ہمارے آقا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور خالق کی غلامی کیونکہ خالق کی پرستش، اور خالق کی اطاعت اس کی غلامی کے بغیر ممکن نہیں اور پھر یہ وہ غلامی ہے جو باقی تمام غلامیوں سے خلاصی اور نجات کا ذریعہ ہے۔ بقول اقبال:

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے

ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

یہی وہ غلامی ہے جس سے مخلوق کی ہر طرح کی غلامی کی جڑ کٹ جاتی ہے اور اس کے نتیجے میں آدمی آزادی کے اس تصور کو پا سکتا ہے جس کے سائے میں اس کی صلاحیتیں پروان چڑھتی ہیں خواہشیں صحیح حدود میں محدود رہتیں اور اس

کے ولولے پوری طرح بروئے کار آتے ہیں۔ چنانچہ ہم آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بعثت سے پہلے عرب و عجم میں جس بری طرح سے انسان کو بگڑا ہوا دیکھتے ہیں اس کی اگر حقیقت کو سمجھا جائے تو اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس دور کا انسان پوری طرح اپنی خواہشوں کی گرفت میں تھا۔ وہ صرف اپنے مفادات کے لیے جیتا اور اپنے مفادات کے لیے مرتا تھا۔ خواہشات اور مفادات میں اجتماعی تصادم سے اللہ تعالیٰ کی یہ زمین فساد سے بھر گئی تھی اور انسانیت کا مستقبل تاریک ہو کر رہ گیا تھا۔ جیسے ہی اس پر اللہ کی غلامی کی سحر طلوع ہوئی اس نے رفتہ رفتہ انسان کو اس کی خود عائد کردہ زنجیروں سے آزاد کیا تو وہ انسان تیار ہوا جس کی نظیر نہ اس سے پہلے کبھی چشم فلک نے دیکھی تھی اور نہ آج پوری طرح دکھائی دیتی ہے۔ لیکن صدیوں سے وقت اس کی راہ تک رہا تھا۔ وہ بالآخر صحابہ کی شکل میں نظر آئی۔ بقول اقبال ؒ

طلب جس کی صدیوں سے تھی زندگی کو
وہ سوز اس نے پایا انہی کے جگر میں
اور پھر دعا کرتا ہے کہ:۔
دلِ مردِ مومن میں پھر زندہ کر دے
وہ بجلی کہ تھی نعرہ لاتذر میں
عزائم کو سینوں میں بیدار کر دے
نگاہِ مسلماں کو تلوار کر دے

اب صرف ایک سوال باقی رہ جاتا ہے کہ اس غلامی کا صحیح مفہوم کیا ہے۔ ہم نہایت اختصار سے عرض کریں گے کہ غلامی کے اس مفہوم میں چار تصورات داخل ہیں۔

1۔ غلام اسے کہتے ہیں جسے حق ملکیت حاصل نہ ہو اس کے پاس جو کچھ ہے چاہے وہ جسم ہے یا جان، اس کی صلاحیتیں ہیں یا اس کی امنگیں' اس کا مال و دولت ہے یا اس کے تعلقات ان میں سے وہ کسی چیز کا مالک نہیں۔ ان تمام چیزوں کا مالک اس کا وہ آقا ہے جس کا وہ غلام ہے۔

2۔ چونکہ وہ کسی چیز کا مالک نہیں اس لیے وہ یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میں اپنے زیر تصرف چیزوں میں اپنی مرضی کرنے کا حق رکھتا ہوں۔ یعنی مجھے آزادانہ تصرف کا حق حاصل ہے کہ جیسے چاہوں اور جہاں چاہوں استعمال کروں۔ اس لیے کہ آزادانہ تصرف کا حق اور من مرضی کا اختیار وہاں ہوتا ہے جہاں آدمی کو حق ملکیت حاصل ہو۔ کیونکہ اسی حق سے باقی حقوق پیدا ہوتے ہیں۔

3۔ غلام وہ ہوتا ہے جو اپنی زندگی کا نصب العین اور زندگی کا مقصد از خود متعین نہیں کر سکتا، وہ خود یہ فیصلہ کرنے کا حق نہیں رکھتا کہ مجھے زندگی کس طرح گزارنا ہے۔ میں ایک عالم بن کر زندگی گذاروں یا ایک استاد بن کر۔ مجھے انجینئر بننا ہے یا ایک تاجر بننا ہے۔ میں زندگی اپنے لیے گزاروں یا لوگوں کی خدمت کے لیے صرف کروں۔ ان میں سے اسے کسی بات کا حق نہیں ہوتا۔ اس کی ان باتوں کا اختیار اس کے آقا کو ہے۔ وہ جو اس کا مقصد زندگی متعین کر دے اسے اسی مقصد کے مطابق زندگی گزارنا ہوگی۔

4۔ اس غلام کا آقا اسے جس حال میں رکھے اسے اس بات کا حق نہیں ہوتا کہ وہ حرف شکایت زبان پر لائے وہ ادب اور احترام سے اپنی ضرورتیں اپنے آقا کی خدمت میں پیش کر سکتا ہے بلکہ شائد آقا کو یہ بات اچھی لگے کہ اس کا غلام اس سے مانگے بلکہ مانگتا رہے۔ لیکن اگر وہ اسے دینا پسند نہ کرے یا اس کی مرضی کے مطابق دینا پسند نہ کرے تو اسے یہ حق نہیں ہے کہ وہ اس کے خلاف سوچے، زبان کھولیٰ یا دوسروں سے شکایت کرے۔

تاریخ میں آتا ہے کہ حضرت عبد اللہ ابن مبارک ایک دن اپنے گھر میں بیٹھے تھے کھڑکیوں کے شیشوں سے انھوں نے گلی میں دیکھا کہ ایک نوجوان بار بار کسی کام کے لیے اس یخ بستہ رات میں آجا رہا ہے۔ انھوں نے اسے غور سے دیکھا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اس نے اکہرا لباس پہن رکھا ہے اور اوپر کوئی گرم چادر تک نہیں بہت حیران ہوئے۔ نہ رہ سکے، اس نوجوان کو اندر طلب کیا پوچھا صاحبزادے تمہیں سردی نہیں لگتی؟ اس نے عرض کیا جی لگتی ہے۔ کہا تم نے گرم کپڑے کیوں نہیں پہنے؟ عرض کیا کہ گرم کپڑے میرے پاس نہیں ہیں۔ فرمایا تم کون ہو؟ عرض کیا کہ میں غلام ہوں۔ پوچھا تم نے اپنے آقا سے گرم کپڑے نہ ہونے کی شکایت نہیں کی۔ اس نے حیران ہو کر حضرت عبد اللہ ابن مبارک کی طرف دیکھا اور ادب سے عرض کیا کہ حضرت میں غلام ہوں میرے آقا جانتے ہیں کہ میرے پاس گرم کپڑے نہیں ہیں۔ یہ بھی جانتے ہیں کہ یہ سردیوں کا موسم ہے۔ اور رات بہت ٹھنڈی ہے اس کے

باوجود وہ باہر مجھے کام کے لیے اس حالت میں بھیج رہے ہیں۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ مجھے اسی حال میں دیکھ کر خوش ہیں۔ اب میری غلامی کا یہ تقاضا ہے کہ جس حال میں میرا آقا خوش رہے میں اس کی خوشی میں خوش رہوں اور اس کے خلاف حرف شکایت زبان پر نہ لاؤں کیونکہ اگر میں نے ایسا کیا تو یہ میری غلامی کے آداب کے خلاف ہوگا۔ یہ جواب سن کر حضرت عبداللہ ابن مبارک پھڑک اٹھے۔ فرمایا نوجوان تم نے میری آنکھیں کھول دیں۔ اور آج مجھے معلوم ہوا کہ غلامی کا حقیقی مفہوم کیا ہے؟ حیرت ہوتی ہے کہ صحابہ کرام (رض) زیادہ پڑھے لکھے لوگ نہیں تھے لیکن آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی صحبت نے ان میں وہ چیزیں پیدا کردی تھیں کہ برس ہا برس کے مطالعہ کے بعد بھی آدمی بصد مشکل سمجھ پاتا ہے۔ روایات میں آتا ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایک صاحب کو مغرب کی نماز پڑھ کر سلام پھیرتے ہی فوراً مسجد سے نکلتے دیکھا تو آپ کو حیرت ہوئی۔ دوسرے تیسرے چوتھے روز بھی آپ نے اسی طرح اسے نکلتے دیکھا تو آپ نے آواز دے کر اسے بلایا اور پوچھا کہ بھئی تم نماز کے فوراً بعد کیوں چلے جاتے ہو؟ اس نے عرض کی کہ حضور کوئی اور پوچھتا تو میں کبھی نہ بتاتا لیکن آپ سے کیسے چھپاؤں؟ بات یہ ہے کہ یہ جو میں اپنے اوپر چادر لے کر آیا ہوں یہی میرے گھر کا کل اثاثہ ہے۔ گھر میں میری بیوی منتظر ہیں کہ میں گھر پہنچوں تاکہ وہ بھی اول وقت میں نماز ادا کرسکیں کیونکہ ان کے پاس کوئی اور چادر نہیں ہے۔ اس لیے میں جلدی چلا جاتا ہوں۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یہ سن کر آبدیدہ ہوگئے اور آپ نے ان کے لیے فراخی رزق کی دعا فرمائی۔ وہ صاحب جب گھر پہنچے تو بیوی نے پوچھا کہ آج آپ کچھ تاخیر سے تشریف لائے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے روک لیا تھا۔ بیوی نے پریشانی سے پوچھا کہ ہیں آپ نے بتا تو نہیں دیا۔ انھوں نے کہا کہ بتا آیا ہوں۔ بیوی نے انتہائی پریشانی کے عالم میں کہا کہ آپ نے اچھا نہیں کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں جس حال میں رکھا تھا ہم اس کے بندے ہیں ہمیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ ہم اس کے خلاف حرف شکایت زبان پر لائیں۔ آپ نے جو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے ذکر کیا کہیں اس کا مطلب یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ ہم اپنے اس حال پر صابر و شاکر نہیں ہیں۔

غلامی کا وہ حقیقی مفہوم

یہ ہے غلامی کا وہ حقیقی مفہوم کہ ہر مسلمان اپنے اللہ کا غلام ہے۔ نہ اس کا جسم اپنا ہے نہ جان نہ اس کی صلاحتیں اور توانائیاں اپنی ہیں نہ جسمانی قوتیں ‘ نہ اولاد پر اسے حق ملکیت حاصل ہے نہ مال و دولت پر ‘ یہ سب کچھ اللہ کی دین ہے۔ وہی ان سب کا مالک ہے۔ مسلمانوں کے پاس یہ اس کی دی ہوئی امانت ہے۔ امانت میں ان حدود سے تجاوز کرنا جو امانت رکھنے والے عائد کر دی ہیں یا اپنی مرضی اس طرح استعمال کرنا جو امانت کو ملکیت بنا دے تو یہ امانت داری نہیں بلکہ خیانت ہے۔ ہم اپنی ان چیزوں میں اپنی مرضی کرنے کے ہرگز مجاز نہیں۔ زندگی اس نے ہمیں گذارنے کے لیے دی ہے تو گزارنے کے طریقے بھی عطا فرمائے ہیں۔ اس میں اپنی مرضی سے لکیریں کھینچنا ‘ اپنی مرضی سے نقشے بنانا ‘ اپنی مرضی سے اس کے اصول و ضوابط اور آداب وضع کرنا یہ بندگی اور غلامی کے آداب کے خلاف ہے اور پھر اس زندگی کے لیے از خود نصب العین اور مقصد زندگی متعین کرنا یہ سراسر حدود سے تجاوز ہے۔ اور پھر زندگی کے ہر شعبے کے لیے جو احکام دیئے گئے ہیں انھیں کامل بندگی کے تصور کے ساتھ بجالانے کی بجائے ان کے خلاف دل و دماغ کی قوتیں صرف کرنا ‘ اس کے خلاف اپنے اعضاء و جوارح کو حرکت میں لانا بلکہ کھلم کھلا اس کے احکام کے خلاف زندگی کا فیصلہ کرنا یہ سراسر اس کی بندگی اور غلامی سے بغاوت ہے اور پھر وہ تنگی و ترشی ‘ عسر و بسر اور امن اور خوف ‘ جس حال میں بھی رکھے اس کے خلاف حرف شکایت زبان پر لانا یا اس کے سوا کسی اور کے سامنے دست سوال دراز کرنا اور کسی اور سے امیدیں باندھنا ‘ محبت کسی اور سے کرنا ‘ نفرت کا حوالہ کسی اور کو بنانا ‘ دل کی دنیا کسی اور سے آباد کرنا ‘ زندگی کے الجھے ہوئے مسائل میں اس کی دی ہوئی ہدایت کے برعکس کوئی اور ہدایت قبول کرنا یہ سب وہ باتیں ہیں جو اس بندگی اور غلامی کے خلاف ہیں۔

یہ غلامی کا وہ حقیقی مفہوم ہے جس میں کائنات کا ذرہ ذرہ جکڑا ہوا ہے۔ خالق حقیقی وہ غالب و قادر آقا ہے کہ اس کی کائنات کی ہر مخلوق اس کے سامنے سراپا تسلیم و انقیاد ہے جس مخلوق کو جس کام میں لگا دیا گیا ہے اس کی مجال نہیں کہ وہ اس سے سرتابی کر سکے۔ ایک چھوٹے سے چھوٹے ذرے سے لے کر بڑے سے بڑے کُرّے تک ہر مخلوق اپنی اپنی مفوضہ ذمہ داری ادا کرنے میں سرتاپا مصروف عمل ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

اللّٰہَ یَسْجُدُ لَہٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ والشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَ کَثِیْرٌ مِّنَ النَّاسِ ط (الحج:۲۲۔۱۸)

(اللہ ہی کے لیے جھکے ہوئے ہیں جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اور سورج اور چاند اور ستارے اور پہاڑ اور درخت اور چارپائے اور بہت سے لوگ (سب اسی کے سامنے سجدہ ریز ہیں)

وَلِلّٰہِ یَسْجُدُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّۃٍ وَّالْمَلٰٓئِکَۃُ وَھُمْ لَا یَسْتَکْبِرُوْنَ۔ یَخَافُوْنَ رَبَّھُمْ مِّنْ فَوْقِھِمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ۔ ع (السجدۃ)

(اور اللہ ہی کے لیے سجدہ کر رہے ہیں جو کوئی آسمانوں میں ہیں اور جو کوئی زمین میں ہیں چارپایوں میں سے اور فرشتوں میں سے اور وہ تکبر نہیں کرتے وہ اپنے اوپر اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور وہ کرتے رہتے ہیں جس کا انھیں حکم دیا جاتا ہے)

وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ وَلٰکِنْ لَّا تَفْقَھُوْنَ تَسْبِیْحَھُمْ ط (بنی اسرائیل:۱۷۔۴۴)

(ہر چیز اس کی تسبیح میں لگی ہوئی ہے مگر تم ان کی تسبیح کو سمجھتے نہیں ہو)

اِنْ کُلُّ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِی الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ط (مریم:۱۹۔۹۳)

(آسمانوں اور زمین میں جو کوئی ہے وہ اللہ کے پاس غلام بن کے آنے والا ہے)

سورج اس کی غلامی میں چمک رہا ہے۔ چاند اس کی بندگی میں دمک رہا ہے ہر سیارہ اس کی چاکری میں محو حرکت ہے۔ پہاڑ اس کے حکم کی تعمیل میں ایستادہ ہیں۔ زمین اس کی اطاعت میں بچھی ہوئی اپنا فرض انجام دے رہی ہے۔ فرشتے اس کے احکام کی بجا آوری میں ہمہ وقت اور ہمہ تن مصروف عمل ہیں کائنات کی ہر مخلوق سراپا خدمت و اطاعت ہے اور ایک لمحے کے لیے بھی اپنی ڈیوٹی سے غفلت یا سرکشی کا شکار نہیں ہوتی۔

مسلمانوں میں عبادت کا غلط تصور

لمحہء فکریہ، یہ ہے کہ یہ تمام مخلوقات جو اپنی تمام تر قوت و شوکت کے باوجود حضرت انسان کے لیے مسخر و مطیع اور تابع فرمان بنادی گئی ہیں اور انسان کو نہ صرف ان سے خدمت لینے کا حق دیا گیا ہے بلکہ کائنات کی پاکیزہ ترین مخلوق

یعنی فرشتوں کا اسے مسجود بنادیا گیاہے اور اشرف المخلوقات کا طغرہ اس کے سر پر سجایا گیا ہے۔ وہ مخلوقات تو اپنے خالق و مالک کی ہمہ وقت اور ہمہ نوع بندگی و غلامی میں مصروف ہیں اور یہ اشرف و اعلیٰ کہلانے والا بندگی و غلامی تو رہی ایک طرف بالعموم معصیت و نافرمانی بلکہ سرکشی و بغاوت پر تلا رہتا ہے۔ اس کی شرافت و فضیلت کا تقاضہ تو یہ تھا کہ یہ بندگی و اطاعت میں باقی تمام مخلوقات سے بڑھ جاتا بلکہ پروردگار کی طرف سے بھی اس پر دوسری مخلوقات سے بڑھ کر بندگی و غلامی کی ذمہ داریوں کا بار ڈالا جاتا جبکہ ہمارے یہاں عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ نماز 'روزہ 'حج اور زکوۃ صرف یہی عبادات ہیں ان پر عمل کر لینے سے عبادت کا حق ادا ہو جاتا ہے یعنی زندگی کے شب و روز میں سے نماز کے چند اوقات بارہ مہینوں میں رمضان کا ایک مہینہ پوری زندگی میں حرمین کی بقصد حج ایک دفعہ کی حاضری اور دولت کی بہتات میں بھی سال بہ سال اڑھائی فیصد زکوۃ کی ادائیگی یہ وہ پروردگار کے حقوق ہیں جن کے ادا کرنے سے عبادت کی ذمہ داری ساقط ہو جاتی ہے۔ یہی وہ غلط فہمی ہے جس نے ہماری اجتماعی زندگی کو عبادت کے ہمہ نوعی اثرات سے محروم کر دیا ہے حالانکہ امر واقعہ یہ ہے کہ ہماری زندگی مہد سے لحد تک عبادت کی ذمہ داریاں رکھتی ہے۔ قبل از بلوغ ماں باپ کے واسطے سے یہ ذمہ داریاں ادا ہوتی ہیں اور بعد از بلوغ ہر مرد و عورت کی مکلف زندگی شروع ہو جاتی ہے۔ جس میں جوانی کی جولانیاں بھی ہیں 'صلاحیتوں اور توانائیوں کا امتحان بھی ہے۔ قلب و ذہن کی رعنائیوں کا نشیب و فراز بھی ہے۔ محبتوں کی ہماہمی بھی ہے 'تنہائیوں کا سوز و گداز بھی ہے۔ ذمہ داریوں کے بار بھی ہیں۔ اور فارغ البالیوں کی سرمستیاں بھی ہیں۔ ڈھلتی ہوئی عمر کا سوز و گداز بھی ہے اور دم توڑتی ہوئی صلاحیتوں کا خمار بھی ہے ان تمام حوالوں سے عبادت اپنا مفہوم رکھتی ہے اور ان تمام بدلتے ہوئے حالات میں پروردگار کے احکام کی اطاعت فی الحقیقت وہ عبادت ہے جس کے بارے میں کل کو سوال ہو گا آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد ہے کہ قیامت کے دن جب ہم میں سے ہر فرد بارگہ حق میں حاضر ہو گا تو زمین ہمارے پاؤں جکڑ لے گی اور اس وقت تک نہیں چھوڑے گی تاوقتیکہ پانچ باتوں کا جواب نہیں دے دیا جائے گا۔ پوچھا جائے گا زندگی کیسے گذار کے آئے ہو جوانی کس طرح کے کاموں میں صرف کی۔ مال کس طرح کمایا اور کہاں خرچ کیا اور علم حاصل کیا یا نہیں اگر کیا تو اس کا کیا حق ادا کیا۔ یعنی زندگی کے ایک ایک لمحے 'نعمتوں میں سے ایک ایک نعمت اور توانائیوں اور صلاحیتوں سے ایک ایک توانائی اور صلاحیت اور عہدہ و مناصب میں سے ایک ایک منصب کا حساب ہو گا۔

دست درازیوں کا بھی حساب ہو گا اور کوتاہیوں کا بھی دل و دماغ کی کج اندیشیوں کے بارے میں بھی پوچھا جائے گا اور نگاہوں کی خیانتوں کے بارے میں بھی قدموں کے حدود سے تجاوز کا بھی حساب ہو گا اور تساہل و تغافل اور لغزش قدم کا بھی مال و دولت کے حوالے سے حرام ذرائع اختیار کرنے پر بھی باز پرس ہو گی اور بخل و اسراف پر گرفت بھی جھونپڑے والا اگر احتساب سے گذرے گا تو تخت و تاج کا مالک بھی اس سے بچ نہ سکے گا۔ رند و مست اگر پکڑا جائے گا تو عابد و زاہد بھی خشوع و خضوع کا حساب دیے گا۔ غرضیکہ انسان کو ہمہ وقتی اور ہمہ نوعی عبادت کا مکلف بنایا گیا ہے جس میں زندگی کا ہر شعبہ اور ہر ذمہ داری شامل ہے۔

نماز، روزہ، حج اور زکوۃ کو عبادت کہنے سے اسلام کی مراد

اسلام نے اگرچہ نماز روزہ حج اور زکوۃ کو عبادت کا نام دیا ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ صرف یہی عبادات ہیں۔ ان کو عبادت کہنے کا مطلب تو یہ ہے کہ یہ اس طرح کی عبادات ہیں کہ ان کو فہم و شعور سے ادا کرنے والا باقی زندگی کو بھی اسی ڈھب پر لے آتا ہے اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ یہ ایسے افعال ہیں جو از اول تا آخر خالصتاً تسلیم و انقیاد اور حضوری حق سے عبارت ہیں جبکہ باقی زندگی کا ہر کام اطاعت خداوندی سے عبادت بنتا ہے۔ یہی وہ غلط فہمی ہے جو بعض صحابہ کو بھی ہوئی انھوں نے صرف انھیں افعال و اعمال کو دینداری اور عبادت سمجھ کر اور باقی معاملات کو دنیاداری جان کر یہ فیصلہ کیا کہ ہم راتیں نماز میں گزاریں گے اور دن روزے میں۔ اور بیویوں سے کوئی تعلق نہیں رکھیں گے۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے انھیں سرزنش کرتے ہوئے فرمایا کہ مجھے دیکھو میں رات کو نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں میں روزے بھی رکھتا ہوں اور چھوڑتا بھی ہوں میں نکاح بھی کرتا ہوں اور بیویوں سے تعلق بھی رکھتا ہوں یہ میرا طریقہ یعنی میری سنت ہے جس نے میرے طریقے کی پیروی کی وہ مجھ سے ہے اور جس نے ایسا نہ کیا اس کا مجھ سے کوئی رشتہ نہیں عجیب بات تو یہ ہے کہ کھانا پینا جو سراسر ایک دنیاداری ہے قرآن کریم نے اسے بھی دینداری اور عبادت قرار دیا۔ ارشاد خداوندی ہے:

يَاۤيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ۔

(البقرۃ ۲:۱۷۲)

(اے مومنو! کھاؤ ان پاکیزہ نعمتوں میں سے جو اللہ نے تمہیں عطا فرمائی ہیں اور اللہ کا شکر بجالاؤ اگر تم اسی کی عبادت کرنا چاہتے ہو)

تو غور فرمایئے اس آیت میں پاکیزہ نعمتوں کے کھانے اور ان پر شکر بجالانے کو عبادت قرار دیا ہے۔

مندرجہ بالا گزارشات سے یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ ہمیں جس عبادت کا حکم دیا گیا ہے اور وہی ہماری تخلیق کا مقصد بھی ہے وہ ایک ہمہ وقتی عبادت ہے جو پوری زندگی پر حاوی ہے اور جس میں زندگی کا ہر شعبہ داخل ہے۔ اس پوری زندگی کی عبادت سے انسان باقی تمام مخلوقات بالخصوص ملائکہ کا ہم پلہ ہو جاتا ہے مگر انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کا تقاضہ تو اس سے کچھ سوا کا تقاضہ کرتا ہے کیونکہ:

جن کے رتبے ہیں سوا ان کی سوا مشکل ہے

اس کی شرافت وفضلیت کا تقاضا تو یہ ہے کہ اس کی عبادت میں کوئی ایسی حقیقت کار فرمائی ہونی چاہیے جو باقی مخلوقات پر اس کا افضل ہونا مبرہن کر دے۔

انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کی دو بنیادی وجوہات

اس حوالے سے جب غور کرتے ہیں تو دو حقائق ہمارے سامنے کھلتے ہیں جو انسان کے افضل و اعلیٰ ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔ ان میں سے پہلی حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوقات جن وانس کے علاوہ ایسی ہیں جن کے بارہ یہ بات مسلم ہے کہ قدرت نے انھیں ارادہ و اختیار کی آزمائش میں مبتلا نہیں کیا۔ ان کی اطاعت وعبارت جیسی کچھ بھی ہے اس میں ان کے اختیار کا کوئی دخل ہیں۔ انھیں انکار کی صلاحیت سے بہرہ ور نہیں کیا گیا بلکہ وہ اپنی فطرت اور جبلت کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کی عبادت و اطاعت اور تسلیم وانقیاد پر مجبور ہیں۔ مگر اس کے برعکس انسان کا حال یہ ہے کہ اسے اس بات کی آزادی دی گئی ہے اور حق و باطل کے اختیار اور خیر و شر کے امتیاز میں اسے آزاد چھوڑا گیا ہے کہ دونوں میں جسے چاہو اختیار کرو۔ اسی طرح احکام کی اطاعت میں بھی کوئی اضطرار نہیں بلکہ یہ اختیار دیا گیا کہ چاہو تو اطاعت کا راستہ اختیار کرو چاہو تو معصیت کا۔ اس قوت تمیز اور اختیار کی آزادی کے صحیح استعمال پر اجر و ثواب کی امید دلائی گئی اور غلط استعمال پر سزا اور عذاب کی تہدید سنائی گئی۔ پھر اسی پر بس نہیں بلکہ اس اختیار اور آزادی کے مزید

امتحان کے لیے انسان کے اندر مکروہات و منکرت اور فواحش کی خواہش اور ہوس کو بھی پیدا کیا گیا۔ اب جو آدمی خواہشات و مرغوبات اور امیدوں اور آرزوؤں کے کانٹوں سے دامن بچا کر ارادہ و اختیار کے صحیح استعمال سے معصیت و نافرمانی اور سرکشی و بغاوت کا راستہ اختیار کرنے کی بجائے عبادت و بندگی کا راستہ اختیار کرتا ہے تو اس کے افضل او اعلیٰ ہونے میں کیا شبہ ہے؟ فرشتہ کبھی گناہ نہیں کرتا۔ اس لیے کہ اس میں گناہ کے لیے رغبت ہی نہیں وہ کبھی انحراف اور سرکشی کا رویہ اختیار نہیں کرتا اس لیے کہ اس میں اس کی طاقت و صلاحیت ہی نہیں وہ شرم و حیا کا پیکر بن کر پاکدامنی کی علامت بن جاتا ہے اس لیے کہ اس میں خواہش نفس کا وجود ہی نہیں۔ مگر جب یہی صفات انسان اختیار کرتا ہے تو بجا طور پر یہ اس کے لیے باعث شرف ہے کیونکہ وہ خواہش نفس کا شکار ہے وہ معصیت کی طرف رغبت رکھتا ہے وہ حُبِّ دنیا اور ہوس زر کا اسیر ہے۔ وہ طاقت اور گھمنڈ کا رسیا ہے۔ وہ عہدہ و منصب کا نخچیر ہے۔

(تفسیر روح القرآن۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی)

لغت میں ہدایت کا معنی ہے لطف و عنایت سے کسی کو منزل مقصود تک پہنچا دینا۔ الھدایۃ دلالۃ بلطف۔ اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی کے بیان کے بعد، اس کے مسلسل انعامات کے اعتراف کے بعد، اپنی عبودیت اور ناتوانی کا اعلان کرنے کے بعد انسان اب اپنے رحمن و رحیم رب کے حضور میں دعا کے لیے ہاتھ پھیلا کر گویا عرض کرتا ہے۔ میں کمزور ہوں۔ نفس کی فریب کاریاں اور شیطان کی وسوسہ اندازیاں بہت شدید ہیں۔ خود تو میری دستگیری فرما اپنے لطف و کرم سے مجھے سیدھے راستہ پر ثابت قدمی سے چلتے رہنے کی توفیق بخش اور اپنی رضا کی منزل تک پہنچا۔ قرب و وصال الٰہی کے اس مقام پر پہنچ کر مومن تنہا اپنی ذات کے لیے ہدایت طلب نہیں کرتا بلکہ ساری امت محمدیہ کے لیے ہدایت کا طلب گار ہے۔ کہا ہے اھدنا ہم سب کو ہدایت دے۔ کیونکہ اگر ہدایت اسلام چند افراد تک محدود رہے گی تو اس کی عالمگیر برکات و فیوض کا اظہار کیونکر ہوگا۔ شرق و غرب میں انسان جن میں گمراہیوں میں ٹھوکریں کھا رہا ہے ان سے کیونکر چھٹکارا پا سکے گا اور کنتم خیر امۃ اخرجت للناس کی تعبیر کیسے ہوگی۔ ہدایت کے بیشمار مدارج ہیں۔ ایک سے ایک بلند۔ ایک سے ایک اعلیٰ۔ مومن جب یہ دعا مانگتا ہے تو اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اسے اس کے موجودہ مقام قرب و ہدایت سے ارفع اور اعلیٰ مقام پر فائز فرمایا جاوے۔ یا شیطان کی وسوہ اندازی اور نفس کی کمزوری کے باعث قدم کے پھسل جانے کا جو ہر لحظہ خطرہ ہے اس سے اسے محفوظ رکھا جائے۔ اور اسے اس راہ پر ثبات

نصیب ہو۔ اور وہ دام واپسیں تک شیطان کے ہر دام فریب کو تار تار کرتا ہوا راہ ہدایت پر بڑھتا چلا جائے۔ وھذا الدعاء من المومنین ومن النبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مع کونھم علی الھدایۃ لطلب التثبت او طلب مزید الھدایۃ فان الالطاف والھدایات من اللہ تعالیٰ لا تتناھی۔

(مظہری) (ضیاء القرآن۔ پیر محمد کرم شاہ الازہری)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ہم کو سیدھا راستہ پر چلا (الفاتحہ:۵)

ہدایت کا لغوی معنی اور اس کی اقسام

'اھد' کا لفظ "ھدایۃ" سے مشتق ہے 'علامہ راغب اصفہانی "ھدایۃ" کا معنی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

جو چیز مطلوب تک پہنچادے اس کی طرف ملائمت اور نرمی سے رہنمائی کرنا ہدایت ہے 'فلاں شخص کو ہدایت دی یعنی اس کی راہنمائی کی 'اللہ تعالیٰ نے انسان کو چار قسم کی ہدایت دی ہے۔

(۱) عقل اور شعور کی ہدایت اور بدیہیات کا علم ہر شخص کو عطا فرمایا ہے:

(آیت) "اعطی کل شیء خلقه ثم ھدی (طہٰ:۵۰) جس نے ہر چیز کو اس کی (مخصوص) بناوٹ عطا فرمائی پھر ہدایت دی

(۲) انبیاء کرام (علیہم السلام) کی زبانوں سے اور آسمانی کتابوں کے ذریعہ ہدایت عطا فرمائی:

(آیت) "وجعلنھم ائمۃ یھدون بامرنا"۔ (الانبیاء:۷۳) اور ہم نے ان کو پیشوا بنایا 'وہ ہمارے حکم سے ہدایت کرتے تھے۔

(۳) توفیق الہٰی جو ہدایت یافتہ لوگوں کے ساتھ مخصوص:

(آیت) والذین اھتدوا زادھم ھدی واتھم تقوھم (محمد:۱۷) اور جن لوگوں کو ہدایت کی توفیق مل گئی (یعنی جنہوں نے ہدایت قبول کی) اللہ نے ان کی ہدایت کو زیادہ کر دیا اور انھوں نے تقوی عطا فرمایا

(۴) آخرت میں جنت کی طرف پہنچانا:

(آیت) ”قالوا الحمد للہ الذی ھدنا لھذا “(الاعراف:۴۳) جنتی کہیں گے: اللہ ہی کے لیے سب تعریفیں ہیں جس نے ہم کو یہاں تک پہنچایا۔

یہ چاروں ہدایتیں ترتیب وار ہیں کیونکہ جس چیز کو ہدایت کی پہلی قسم (عقل و شعور) حاصل نہیں ہے اس کو باقی اقسام بھی حاصل نہیں ہوں گی بلکہ وہ مکلف بھی نہیں ہے ‘ جیسے حیوانات ‘ اور جس کو دوسری قسم کی ہدایت حاصل نہیں ہوئی اس کو باقی دو قسمیں بھی حاصل نہیں ہوں گی ‘(اس میں اشکال ہے) اور جس کو تیسری قسم حاصل نہیں ہوئی جیسے کفار اس کو چوتھی قسم حاصل نہیں ہوگی اور جس کو چوتھی قسم حاصل ہوگی اس کو پہلی تین قسمیں حاصل ہو چکی ہوں گی۔ (المفردات ص ۵۳۹۔ ۵۳۸ ‘ مطبوعہ المکتبۃ المرتضویہ ‘ ایران ‘ ۱۳۴۲ ھ)

ہدایت کی اقسام کی مزید تفصیل

اس تفصیل میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ ہدایت کی پہلی قسم وجدان ہے جو انسان کو مبدء ولادت میں عطا کیا جاتا ہے ‘ جس اس کو بھوک اور پیاس کا ادراک ہوتا ہے ‘ جب وہ غذا کی طلب کے لیے روتا اور چلاتا ہے ‘ اور دوسری قسم جو اس کی ہدایت ہے اور یہ قسمیں انسان اور حیوان میں مشترک ہیں ‘ اور تیسری قسم عقل کی ہدایت ہے جو انسان کے ساتھ مخصوص ہے ‘ عقل کی ہدایت سے انسان حواس کی اصلاح کرتا ہے مثلا صفراوی مزاج والا میٹھی چیزوں کو کڑوا محسوس کرتا ہے تو عقل ہدایت دیتی ہے کہ یہ میٹھی چیز ہے ‘ ہدایت کی چوتھی قسم دین اور شریعت کی ہدایت ہے ‘ اور ہدایت کی پانچویں قسم توفیق ہے۔

وجدان ‘ حواس اور عقل کی ہدایت کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(آیت) ”الم نجعل لہ عینین ولسانا و شفتین وھدینہ النجدین (البلد: ۱۰۔ ۸) کیا ہم نے اس کی دو آنکھیں زبان اور ہونٹ نہیں بنائے اور ہم نے اسے (نیکی اور بدی) دونوں واضح راستے دکھا دیئے

اور دین اور شریعت کی ہدایت کے متعلق فرمایا:

(آیت) ”واما ثمود فھدینھم فاستحبوا العمی علی الھدی (حم السجدۃ:۱۷)اور رہے ثمود کے لوگ تو ہم نے ان کو ہدایت دی سو انھوں نے گمراہی کو ہدایت پر پسند کر لیا۔

اور ہدایت کی توفیق کے متعلق فرمایا:

(آیت) ”اھدنا الصراط المستقیم (الفاتحہ:۵)ہم کو سیدھے راستے پر چلا

اصل مقصود اللہ تعالیٰ کی ذات کا دیدار ‘اس کی رضا اور جنت الفردوس کی ہدایت ہے ‘اس ہدایت کے حصول کے لیے اللہ تعالیٰ نے پہلے ہم کو وجدان ‘عقل اور شعور (حواس سے ادراک) کی ہدایت عطا فرمائی ‘پھر سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور قرآن کریم کے واسطے سے ہم کو دین اور شریعت کی ہدایت میسر کی ‘اب ہم دعا کرتے ہیں کہ اے اللہ! ہم کو دین اور شریعت پر چلا اور اس کی توفیق مرحمت فرما تاکہ ہم کو جنت کی ہدایت حاصل ہو سکے۔

اللہ تعالیٰ کی ہدایت اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ہدایت کا فرق

ہدایت کا ایک معنی ”ایصال الی المطلوب الخیر “(نیک مطلوب تک پہنچانا) ہے اور دوسرا معنی ”ارشاد “اور ” اراءۃ الطریق “(راستہ دکھانا) ہے ‘مطلوب خیر تک پہنچانا یہ اللہ تعالیٰ کی شان ہے ‘اس کو ہدایت یافتہ بنانا اور باطن میں ہدایت دینے سے بھی تعبیر کرتے ہیں اور ”راستہ دکھانا “نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا منصب ہے ‘اس کو ہدایت نافذ کرنے اور ظاہراً ہدایت دینے سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔ قرآن مجید میں جہاں نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف ہدایت کی نسبت کی گئی ہے اس سے مراد راستہ دکھانا ہے اور جہاں آپ سے ہدایت دینے کی نفی کی گئی اس سے مراد ہدایت یافتہ بنانا ہے ‘مثلا قرآن مجید میں ہے:

(آیت) ”انک لا تھدی من احببت ولکن اللہ یھدی من یشآء (القصص:۵۶)بیشک آپ اس کو ہدایت یافتہ نہیں بناتے جس کو آپ چاہیں ‘لیکن اللہ جس کو چاہتا ہے ہدایت یافتہ بنا دیتا ہے۔

لیس علیک ھدھم ولکن اللہ یھدی من یشآء (البقرہ:۲۷۲)انھیں ہدایت یافتہ بنانا آپ کے ذمہ نہیں لیکن اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت یافتہ بنا دیتا ہے۔

ہدایت یافتہ بنانا ‘مطلوب خیر تک پہنچانا اور باطن میں ہدایت دینا یہ آپ کا منصب نہیں ہے ‘آپ کا منصب اللہ کی ہدایت کو نافذ کرنا ‘ظاہراً ہدایت دینا اور راستہ دکھانا ہے اسی اعتبار سے فرمایا:

(آیت) وانك لتهدی الی صراط مستقیم "اور بیشک آپ ضرور صراط مستقیم دکھاتے ہیں (الشوریٰ:۵۲)

صراط مستقیم کا لغوی اور شرعی معنی

دو نقطوں کو ملانے والے سب سے چھوٹے خط کو لغت میں صراط مستقیم کہتے ہیں اور شریعت میں صراط مستقیم سے مراد وہ عقائد ہیں جو سعادت دارین تک پہنچاتے ہیں ‘یعنی وہ دین اسلام جس کو دے کر تمام انبیاء اور رسل کو مبعوث کیا گیا اور ان تمام کی نبوات اور رسالات کو حضرت سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت اور رسالت پر ختم کر دیا گیا ‘جس دین سے اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی صحیح معرفت ہو اور تمام احکام شرعیہ کا علم ہو وہ صراط مستقیم ہے۔ یہ صراط مستقیم کا خاص معنی ہے ‘اور اس کا عام معنی یہ ہے:

تمام اخلاق ‘اعمال اور امور میں افراط اور تفریط کے درمیان متوسط طریقہ:

خواص مسلمین کے نزدیک صراط مستقیم کا معنی یہ ہے

کفر ،فسق ،جہل ‘بدعت اور ہوائے نفسانیہ کے جہنم کی پشت پر علم ،عمل ،خلق اور حال کے اعتبار سے شریعت پر استقامت کا پل:

اس معنی میں صراط مستقیم سے ذہن آخرت کے پل صراط کی طرف متوجہ ہوتا ہے ‘پل صراط کے متعلق احادیث میں ہے کہ وہ بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہے اور شریعت پر استقامت بھی بال سے زیادہ اور تلوار سے زیادہ تیز ہے ‘مثلاً ہمارے ہاں عام طور پر دیور اور بھابھی میں پردہ نہیں ہوتا، حالانکہ شریعت میں ان کے درمیان پردہ کی سخت تاکید ہے ‘سرکاری ملازمتیں رشوت ‘سود اور بے ایمانی کی آمدنی کے بغیر نہیں ‘یونیورسٹیوں میں اعلی تعلیم مخلوط طریقہ تعلیم کے بغیر ناممکن ہے ‘دکاندار اور ٹھیلے والے پولیس کو بھتہ دیئے بغیر اپنا کاروبار نہیں چلا سکتے ‘ نجی اداروں اور دفاتر میں مردوں اور عورتوں کا مخلوط اسٹاف ہوتا ہے ‘استقبالیہ اور معلوماتی کاؤنٹر پر بے پردہ خواتین

سے گفتگو کرنی پڑتی ہے ،سرکاری ٹینڈرز پر کوئی ٹھیکہ رشوت کے بغیر منظور نہیں ہو سکتا ،پولیس اور دیگر سرکاری محکموں میں کوئی رشوت میں ملوث ہوئے بغیر ملازمت نہیں کر سکتا غرضیکہ پورا معاشرہ شریعت کی خلاف ورزیوں اور اخلاقی پستیوں میں ڈوبا ہوا ہے ،ایسے معاشرہ میں اگر کوئی شخص شریعت پر مستقیم رہنا چاہے تو یہ صراط مستقیم بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہے اور جو اس صراط مستقیم پر آسانی سے گزر گیا وہ آخرت کی پل صراط سے بھی آسانی سے گزر جائے گا۔

اور عوام مسلمین کے اعتبار سے صراط مستقیم کا یہ معنی ہے:

اللہ تعالیٰ کے ہر حکم کو ماننا اور اس پر عمل کرنا اور ہر اس کام سے رکنا جس سے اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہے۔

خواص جب (آیت) "اھدنا الصراط المستقیم "کہتے ہیں تو اس کا معنی یہ ہے: اے اللہ ہمیں "سیر الی اللہ "کے بعد "سیر فی اللہ "عطا فرما اور ہم پر اپنے جمال اور جلال کی صفات غیر متناہیہ منکشف کر دے اور جب عوام (آیت) "اھدنا الصراط المستقیم "کہتے ہیں تو اس کا معنی ہے: اے اللہ ہمیں اپنے تمام احکام پر عمل کی توفیق عطا فرما۔

کیا نمازی کا صراط مستقیم کی دعا کرنا تحصیل حاصل ہے ؟

اس جگہ ایک مشہور سوال یہ ہے کہ جب نماز نماز میں کہتا ہے (آیت) "اھدنا الصراط المستقیم "سو وہ تو خود صراط مستقیم کی ہدایت پر ہے ،اگر صراط مستقیم پر نہ ہوتا تو نماز کیسے پڑھتا ،لہٰذا یہ تحصیل حاصل ہے، اس کے دو جواب ہیں:

(ا) اس دعا کا معنی یہ ہے کہ اے اللہ مجھ کو صراط مستقیم کی ہدایت پر قائم اور ثابت رکھ اور اس میں دوام عطا فرما۔

معنی عوام مسلمین کے اعتبار سے ہے اور اس کی تائید قرآن مجید کی اس آیت میں ہے:

(آیت) "ربنا لاتزغ قلوبنا بعد اذھدیتنا "(آل عمران: ۸) اے ہمارے رب! ہمیں ہدایت دینے کے بعد ہمارے ہمارے دلوں کو ٹیڑھا نہ کر۔

اور اس حدیث میں بھی اس کی تائید ہے: امام ترمذی روایت کرتے ہیں:

"عن انس قال کان رسول الله (صلی الله علیه وآله وسلم) یکثر ان یقول یا مقلب القلوب ثبت قلبی علی دینك "(جامع ترمذی ص ۳۱۲، مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب، کراچی) حضرت انس (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ بہ کثرت یہ کہتے تھے: اے دلوں کے پلٹنے والے! میرے دل کو بھی اپنے دین پر قائم اور ثابت رکھ۔

اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کی معرفت کے بعد اس کی عبادت اور حقیقی مددگار ہونے کا ذکر کیا گیا اور اب یہاں سے ایک دعا سکھائی جارہی ہے کہ بندہ یوں عرض کرے: اے اللہ! عَزَّوَجَلَّ، تو نے اپنی توفیق سے ہمیں سیدھا راستہ دکھا دیا اب ہماری اس راستے کی طرف ہدایت میں اضافہ فرما اور ہمیں اس پر ثابت قدم رکھ۔

صراطِ مستقیم کا معنی

صراطِ مستقیم سے مراد "عقائد کا سیدھا راستہ" ہے، جس پر تمام انبیاء کرام (علیہ السلام) چلے یا اس سے مراد "اسلام کا سیدھا راستہ" ہے جس پر صحابہ کرام (رض)، بزرگانِ دین اور اولیائِ عِظام (رح) چلے جیسا کہ اگلی آیت میں موجود بھی ہے اور یہ راستہ اہلسنّت کا ہے کہ آج تک اولیاءِ کرام (رح) صرف اسی مسلک اہلسنّت میں گزرے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے انہی کے راستے پر چلنے اور انہی کے ساتھ ہونے کا فرمایا ہے۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

"یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ ﴿۱۱۹﴾" (التوبۃ:۱۱۹)

ترجمہ کنزالعرفان: اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ ہو جاؤ۔

اور حضرت انس (رض) سے روایت ہے، سید المرسلین (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: "بیشک میری امت کبھی گمراہی پر جمع نہیں ہو گی، اور جب تم (لوگوں میں) اختلاف دیکھو تو تم پر لازم ہے کہ سوادِ اعظم (یعنی مسلمانوں کے بڑے گروہ) کے ساتھ ہو جاؤ۔ (ابن ماجہ، کتاب الفتن، باب السواد الاعظم، ۴/ ۳۲۷، الحدیث: ۳۹۵۰)

حضرت عبد اللہ بن عمرو (رض) سے روایت ہے، نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: "بنی اسرائیل 72 فرقوں میں تقسیم ہو گئے تھے اور میری امت 73 فرقوں میں تقسیم ہو جائے گی، ان میں سے ایک کے علاوہ سب

جہنم میں جائیں گے۔ صحابہ کرام (رض) نے عرض کی: یارسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، نجات پانے والا فرقہ کونسا ہے؟ ارشاد فرمایا: "(وہ اس طریقے پر ہو گا) جس پر میں اور میرے صحابہ ہیں۔
(ترمذی، کتاب الایمان، باب ماجاء فی افتراق۔۔ الخ، ۴/ ۲۹۱۔ ۲۹۲، الحدیث: ۲۶۵۰)

ہدایت حاصل کرنے کے ذرائع

یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہدایت حاصل کرنے کے بہت سے ذرائع عطا فرمائے ہیں، ان میں سے چند یہ ہیں:
(1)۔۔ انسان کی ظاہری باطنی صلاحیتیں جنہیں استعمال کرکے وہ ہدایت حاصل کر سکتا ہے۔
(2)۔۔ آسمانوں، زمینوں میں اللہ تعالیٰ کی قدرت و وحدانیت پر دلالت کرنے والی نشانیاں جن میں غور و فکر کر کے انسان
ہدایت پاسکتا ہے۔
(3)۔۔ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتابیں، ان میں سے تورات، انجیل اور زبور قرآن پاک نازل ہونے سے پہلے لوگوں کے لیے ہدایت کا باعث تھیں اور اب قرآن مجید لوگوں کے لیے ہدایت حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔
(4)۔۔ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے خاص بندے انبیاء کرام اور مرسلین عظام (علیہ السلام)، یہ اپنی اپنی قوموں کے لیے ہدایت حاصل کرنے کا ذریعہ تھے اور ہمارے نبی حضرت محمد مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قیامت تک آنے والے تمام لوگوں کے لیے ہدایت کا ذریعہ ہیں۔
آیت "اِهۡدِنَا الصِّرٰطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ " سے معلوم ہونے والے احکام:
اس آیت سے تین باتیں معلوم ہوئیں:
(1)۔۔ ہر مسلمان کو اللہ تعالیٰ سے سیدھے راستے پر ثابت قدمی کی دعا مانگنی چاہیے کیونکہ سیدھا راستہ منزل مقصود تک پہنچا دیتا ہے اور ٹیڑھا راستہ مقصود تک نہیں پہنچاتا۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ عقل والے اس طرح دعا مانگتے ہیں:
" رَبَّنَا لَا تُزِغۡ قُلُوۡبَنَا بَعۡدَ اِذۡ هَدَيۡتَنَا وَهَبۡ لَنَا مِنۡ لَّدُنۡكَ رَحۡمَةً ‌ۚ اِنَّكَ اَنۡتَ الۡوَهَّابُ ﴿۸﴾

(آل عمران:۸)

ترجمہ: اے ہمارے رب! تو نے ہمیں ہدایت عطا فرمائی ہے، اس کے بعد ہمارے دلوں کو ٹیڑھا نہ کر اور ہمیں اپنے پاس سے رحمت عطا فرما، بیشک تو بڑا عطا فرمانے والا ہے۔

اور حضرت انس (رض) فرماتے ہیں: حضور پر نور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کثرت سے یہ دعا فرمایا کرتے تھے: " يَامُقَلِّبَ الْقُلُوبِ ثَبِّتْ قَلْبِيْ عَلٰى دِيْنِكَ " اے دلوں کو پھیرنے والے! میرے دل کو اپنے دین پر ثابت قدم رکھ۔ تو میں نے عرض کی: یارسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، ہم آپ پر اور جو کچھ آپ لائے ہیں اس پر ایمان رکھتے ہیں تو کیا آپ کو ہمارے بارے میں کوئی خوف ہے؟ حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: " ہاں! بیشک دل اللہ تعالیٰ کی (شان کے لائق اس کی) انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان ہیں وہ جیسے چاہتا ہے انھیں پھیر دیتا ہے۔ (ترمذی، کتاب القدر، باب ماجاء انّ القلوب۔۔ الخ، ۴/۵۵، الحدیث: ۲۱۴۷)

(2)۔۔ عبادت کرنے کے بعد بندے کو دعا میں مشغول ہونا چاہیے۔

(3)۔۔ صرف اپنے لیے دعا نہیں مانگنی چاہیے بلکہ سب مسلمانوں کے لیے دعا مانگنی چاہیے کہ اس طرح دعا زیادہ قبول ہوتی ہے۔

(تفسیر تبیان القرآن۔ علامہ غلام رسول سعیدی)

اے اللہ ہمیں سیدھی راہ پر چلا۔ حضرت جابر بن عبداللہ (رض) فرماتے ہیں: صراط مستقیم سے دین اسلام مراد ہے، ابن مسعود اور دیگر متعدد صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اس سے قرآن مراد لیتے ہیں اور طبرانی نے حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت کیا ہے کہ اس سے وہ طریقہ مراد ہے جس پر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) صحابہ کرام کو چھوڑ کر گئے۔ حاکم نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ اس سے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور ابو بکر صدیق و عمر فاروق (رض) کی سیرت مراد ہے (در منثور)۔

الغرض قرآن وحدیث، سیرت محمدیہ اور کردار صحابہ کرام ہی صراط مستقیم ہے، جس پر قائم رہنے کی یہاں ہمیں دعا سکھلائی جارہی ہے اسی لیے حدیث میں ہے: عليكم بستني وسنة الخلفاء الراشدين المهديين، تم پر میرے اور میرے ہدایت یافتہ خلفاء کے راستہ کا اپنانا ضروری ہے (ابوداؤد کتاب السنۃ باب 5)۔

یاد رہے !سیدھا راستہ کسی سڑک کے درمیان میں ہوتا ہے، دائیں بائیں عموماً پتھر کیچڑ اور گڑھے وغیرہ ہوتے ہیں۔ جو شخص چاہے کہ اس کی گاڑی سیدھی چلے تو اسے راستہ کے درمیان میں چلنا چاہیے اگر وہ دائیں بائیں چلے گا تو کسی حادثہ کے شکار ہونے کا امکان ہے اسی طرح مومن کو چاہیے کہ افراط و تفریط سے بچ کر درمیانے طریقہ پر چلے اسی لیے فرمایا گیا، وکذالک جعلناکم امۃ وسطا، کہ ہم نے تمہیں درمیانی امت بنایا ہے۔(سورۃ بقرہ آیت نمبر 143)جو افراط و تفریط میں پڑا وہ ہلاک ہوا۔ یہود نے انبیاء کرام کی گستاخیاں بلکہ انھیں قتل کرنے کا طریقہ اپنایا،

ویقتلون الانبیاء بغیر حق۔ (سورۃ آل عمران، آیت نمبر 112) یہ تفریط ہے اور عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اور اپنے دوسرے مذہبی راہ نماؤں کو درجہ ربوبیت دے دیا۔

اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا من دون اللہ والمسیح ابن مریم۔ (سورۃ توبہ 31)

یہ افراط ہے۔ ان دونوں انتہاؤں سے بچ کر انبیاء و اولیاء کی وہ تعظیم و تکریم بجالانا ہے جو ان کا حق ہے صراط مستقیم ہے اور یہی طریقہ اہل سنت والجماعت کا ہے۔

اسی طرح رافضی لوگ حضرت علی (رض) اور دیگر اہل بیت کو انبیاء کرام سے بھی افضل بتا رہے ہیں اور خارجی گروہ ان کی شان میں بے ادبیاں کر رہا ہے جبکہ ان کی وہ فضیلت ماننا جو انہیں قرآن وحدیث نے عطا کی ہے صراط مستقیم ہے اور یہی طریقہ اہل سنت جماعت ہے سیدھے راستے کی یہ نشانی بھی ہے کہ اس پر اکثر لوگ چلتے ہیں (اور اکثر لوگ راستہ کے درمیان ہی میں رہتے ہیں) اس لیے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: **اتبعوا السواد الاعظم فانہ من شذ شذ فی النار**۔ بڑی جماعت کی پیروی کرو کہ جو اس سے ہٹا وہ جہنم میں جا گرا۔ (ترمذی کتاب الفتن)

الحمدللہ آج بھی مسلمانوں کی اکثریت انہی عقائد و نظریات کی حامل ہے جن پر صحابہ کرام (رض) قائم تھے۔

(تفسیر برہان القرآن۔ علامہ قاری محمد طیب)

دوسری حقیقت جس نے انسان کو شرافت و فضیلت کے تخت پر فائز کیا ہے وہ یہ ہے کہ کائنات کی ہر مخلوق نے صرف عبادت کی ہے یعنی احکام کی اطاعت کی ہے۔ زندگی بھر اس سے انحراف نہیں کیا۔ سجدہ و قیام اور رکوع و قعود میں رہ

کر بندگی کا حق ادا کیا ہے اور یہ بھی بلاشبہ متاع بے بہا ہے مگر انسان نے صرف بندگی نہیں کی بلکہ کچھ اور بھی کیا ہے۔ اس نے صرف اطاعت و بندگی میں میں سر ہی نہیں جھکایا بلکہ برگشتہ سروں اور تنی ہوئی گردنوں کو اپنے مالک کے سامنے جھکنے پر مجبور بھی کیا ہے۔ اس کے لیے وطن چھوڑا ہے گھر سے بے گھر ہوا ہے اولاد کی قربانی دی ہے۔ دنیا بھر سے لڑائی لڑی ہے۔ دنیا کے ہر خطے کو اپنی سرفروشی و جانفشانی سے زندگی بخشتی ہے۔ اور اس شمع کو لے کر ہر اس جگہ پہنچا ہے جہاں دھرتی پانی دیتی ہے اور جہاں انسان کی اولاد بستی ہے پھر کبھی اس راستے میں مال لٹایا ہے کبھی پسینہ بہایا ہے اور کبھی حون دیا ہے بقول اقبال:

مقامِ بندگی دیگر مقام عاشقی دیگر

زنوری سجدہ مے خواہی زخاکی بیش ازاں خواہی

ازاں خود رانگہ داری کہ باایں بے نیازی ہا

شہادت بروجود خود زخون دوستاں خواہی

یہ عبادت کی اعلی اور برترین صورت ہے جو حضرت انسان کے لیے ودیعت کی گئی اور جس کا نام عاشقی اور شہادت رکھا گیا۔ اس میں ایک طرف انسان اپنے جسم و جان قوت و صلاحیت عقل و دانش ،مال و دولت اور ارادہ و اختیار سے اپنے مالک حقیقی کے لیے دستبردار ہوتا ہے۔ اپنی زندگی کے لیے فیصلوں کا حق انفرادی اور اجتماعی سطح پر اسی کو تفویض کرتا ہے اور بندگی و عبودیت کی تصویر بن کر راضی بہ رضا ہو جاتا ہے۔ دوسری طرف اگر ضرورت پڑتی ہے تو بدیہ جان لے کر اس کی بارگاہ میں پیش کر دیتا ہے اور اگر یہ بدیہ قبول کر لیا جاتا ہے تو پکار اٹھتا ہے "فُزْتُ وَرَبِّ الْكَعْبَةِ" اور اس کامل تر بندگی و عبادت کو وہ حقیقی زندگی سمجھتا اور کامیابی و کامرانی کی ضمانت جانتا ہے۔ بقول اقبال:

برتر از اندیشہء سود و زیاں ہے زندگی

ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی

حاصل کلام یہ کہ عبادت اپنی بندگی و عبودیت کا نذرانہ حضور حق میں صرف اسی کی رضا و خوشنودی کے حصول کے لیے پیش کرنے کا نام ہے مگر اس میں مدارج اور مراتب ہیں ،جن و انس کے علاوہ باقی مخلوقات کی عبادت اضطراری

عبودیت یا بے اختیار غلامی ہے اور جنوں کی عبادت اگرچہ بالا ختیار عبودیت ہے یعنی وہ اپنے اختیار اور ارادہ سے اللہ تعالیٰ کی بندگی بجالاتے ہیں اور اس میں انسانوں ہی کی طرح کامل فدویت امتثال امر انکساری اور فدائیت کی روح کار فرما ہوتی ہے۔ مگر انسانوں کو اپنی عبادت میں ایک اختصاص اور امتیاز حاصل ہے وہ یہ کہ حضرت انسان ایک طرف تو اللہ تعالیٰ کا غلام بے دام غلام اور بندہ حقیر ہے مگر دوسری طرف وہ زمین پر اپنے مالک و آقا کا خلیفہ بھی ہے۔ اس لیے اس کے اندر عبودیت و فدائیت اور عشق و سرمستی کے ساتھ ساتھ حق خلافت کی ادائیگی کے لیے ایک اولوالعزمی بھی پائی جاتی ہے۔ جس کا حق وہ نوع بہ نوع ایثار و قربانی اور بالآخر راہ حق میں اپنے خون کا آخری قطرہ بہا کر ادا کرتا ہے اور اسی وجہ سے جنوں اور فرشتوں سمیت تمام مخلوقات سے اشرف و اعلیٰ ہونے کا شرف پاتا ہے۔

حاصل کلام!

ہماری اب تک کی گزارشات سے یہ بات واضح ہو گئی ہو گی کہ عبادت زندگی کا ایک ایسا مجموعی اور ہمہ گیر عمل ہے جس کا تعلق انسان کی انفرادی زندگی سے بھی ہے اور اس کی اجتماعی زندگی سے بھی۔ زندگی کا کوئی دائرہ اس سے باہر نہیں۔ اسی طرح زندگی کا کوئی شعبہ اور زندگی کا کوئی ہدف اس سے آزاد نہیں۔ افراد انسانی تمام تر تنوعات کے باوجود عبادت کے پابند ہیں۔ اور مزید یہ بات کہ جس طرح عبادت پوری انسانی زندگی پر محیط ہے اسی طرح وہ زندگی کا سب سے مشکل کام بھی ہے اس میں جسمانی صلاحیتیں بھی صرف ہوتی ہیں اور دماغی رعنائیاں بھی کام میں لانا پڑتی ہیں۔ خواہشات کی قربانی بھی دینا پڑتی ہے اور حوصلوں کی آزمائش بھی ہوتی ہے۔ حتیٰ کے بعض دفعہ نقد جان بھی پیش کرنا پڑتا ہے۔ اور انفرادی اور اجتماعی زندگی سے گزر کر قومی اور ملی زندگی کو بھی اس میں شریک ہونا پڑتا ہے کیونکہ عبادت کا عمل جس طرح شہادت کے راستے سے گزرتا ہے اسی طرح خلافت کی گراں باریاں بھی رکھتا ہے سوچنے کی بات یہ ہے کہ جس عمل کی وسعتوں کا یہ عالم ہو اور جس کی گراں باریوں اور مشکلات بے نہائت اور بے اندازہ ہوں کیا یہ ممکن ہے کہ انسان اپنی صلاحیتوں کے بل بوتے پر اور اپنی ہمتوں پر اعتماد کرتا ہوا اس گھاٹی کو سر کر لے۔ یقیناً ایسا نہیں ہو سکتا۔ لازمی بات ہے کہ اس کی ذمہ داریوں سے عہدہ بر آ ہونے اور اس کے حقوق کی ادائیگی کے لیے اسی ذات کو پکارا جائے اور اسی سے مدد مانگی جائے۔ جس کی عبادت کا جذبہ اور جس کی بندگی کی وارفتگی اس دروازے تک

کھینچ لائی ہے۔ اس لیے جب ایک بندہ بندگی کے جذبے سے سرشار ہو کر ایاک نعبد کہتا ہے تو عبادت کی حقیقت اور وسعت کو محسوس کرتے ہوئے بے ساختہ پکار اٹھتا ہے۔

وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ

ایک اور بات بھی قابل توجہ ہے کہ ہماری محولہ بالا گزارشات سے یہ بات بھی واضح ہو گئی ہو گی کہ عبادت فی الحقیقت اللہ کی بندگی اور غلامی کا نام ہے اور غلامی بھی ایسی جس کے بعد ہر آستانے کا راستہ بند ہو جاتا ہے۔ اور ہر چوکھٹ سے گردن آزاد ہو جاتی ہے۔ لمحہ فکریہ یہ ہے کہ جب ایک بندہ ہر غلامی سے آزاد ہو کر صرف اللہ ہی کی غلامی کا قلادہ گلے میں ڈال لیتا ہے اور وہ ہر ایک سے تعلق توڑ کر اللہ کا ہو جاتا ہے تو کیا ایسے غلام کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ اپنے آقا کے علاوہ استعانت کے لیے کسی اور دروازے پر دستک دے۔ وہ ضرورت مند ہو تو ضرورتیں کسی اور آقا کے پاس لے کر جائے۔ اسے دکھ اور غم گھیر لیں تو مدد کے لیے کسی اور کو پکارے۔ جب اس کے سب ظاہری سہارے جواب دے جائیں تو وہ کسی اور کو آواز دے۔ ایسا کرنا یقیناً اس کی غلامی کے تصور کے خلاف ہے اور اس کے آقا کی توہین ہے۔ اس لیے جب بندہ ایک اللہ کی غلامی کا اعتراف کرتا ہے تو پھر وہ اپنا کشکول بھی توڑ دیتا ہے اس کے ارادوں کی کمزوری قوت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس کی غلامی کو ایسی سربلندی ملتی ہے کہ بادشاہوں کی رعونتیں بھی اس کے سامنے دم توڑنے لگتی ہیں۔ وہ بڑی سے بڑی قوت سے بھی مرعوب ہونے سے انکار کر دیتا ہے کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ میری غلامی کا رشتہ اس ذات سے ہے جو شہنشاہ کائنات اور آقائے کل ہے۔ جہاں تک اسباب کی دنیا کا تعلق ہے وہ لین دین تکافل و تعاون اور اعانت و استعانت میں بالکل دوسرے انسانوں کی طرح ہوتا ہے لیکن ماورائے اسباب کسی طاقت کے سامنے اللہ کے سوا کبھی ہاتھ نہیں پھیلاتا اگر اسباب ٹوٹنے لگیں اور ظاہری سہارے جواب دینے لگیں تو وہ پریشان ہونے کی بجائے مسبب الاسباب کو پکارتا ہے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ کائنات میں سب سے بڑی ذات اللہ کے بعد محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ہے۔ لیکن وہ بھی جنگ بدر میں رات بھر اللہ سے مانگتے رہے اور پھر جب اس کی طرف سے مدد اور نصرت کا پیغام پہنچ گیا تو پھر اسی کی مدد سے مسلح ہو کر ریت سے مٹھی بھر کر پھینکی اور دشمن کی فوج کے پاؤں اکھڑ گئے۔ اور قرآن کریم نے اس خیال سے کہ کہیں لوگوں کو یہ غلط فہمی نہ ہو جائے کہ جس مٹھی بھر ریت نے فوج کے قدم اکھاڑے ہیں اس کے پیچھے شاید اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی قوت کارفرما تھی ارشاد فرمایا:

وَمَا رَمَيۡتَ اِذۡ رَمَيۡتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ج (الانفال:۸۔۱۷)

(اے پیغمبر آپ نے جو مٹھی پھینکی وہ آپ نے نہیں پھینکی وہ تو اللہ نے پھینکی)

اللہ کے ولیوں سے دعا کروانا اور برکت حاصل کرنا

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نبیوں کے معجزات اور اللہ تعالیٰ کے ولیوں کی کرامات در حقیقت انبیاء اور اولیاء کے ذاتی اعمال نہیں ہوتے۔ بلکہ ان کے ذریعے سے اللہ کی قوت کا اظہار ہوتا ہے ان کے ہاتھ کو اس لیے استعمال کیا جاتا ہے تاکہ لوگوں کی نگاہوں میں ان کی حیثیت اور عظمت واضح ہو جائے ورنہ ہر مشکل وقت میں اللہ کے نبی اور ولی اللہ ہی کے سامنے ہاتھ پھیلاتے اور مدد کے طلب گار ہوتے ہیں اللہ کے ولیوں سے دعا کے لیے کہنا اور ان سے برکت حاصل کرنا یہ قرآن و سنت سے ثابت ہے۔ کیونکہ اس سے مقصود اللہ ہی سے مدد حاصل کرنا ہوتا ہے۔ لیکن اگر کوئی اس لیے کسی اللہ کے بندے کے پاس جائے کہ وہ ذاتی طور پر اللہ تعالیٰ کے اختیارات کا مالک ہے تو اس کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں۔ جس طرح اِیَّاکَ نَعۡبُدُ سے ہر طرح کی غلامی اور بندگی کا جواز ختم ہو گیا اسی طرح وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ سے ماورائے اسباب ہر طرح کی مدد طلب کرنا ناجائز ٹھہرا اور اس تصور نے جس طرح انسان کو ہر آستانے سے بے نیاز کر دیا اور اس کے اندر وہ فکری توانائی پیدا کی جو ایک مرد مومن کی علامت ٹھہری اسی طرح اس کی ہر کمزوری کا علاج کر دیا وہ تمام سہاروں سے بے نیاز ہو کر محض اللہ کے سہارے پر اس طرح زندگی گزارتا ہے کہ مشکل سے مشکل ماؤف لمحوں میں بھی کبھی مایوسی کا شکار نہیں ہوتا۔ اسے موت بھی آئے تو وہ اسے اللہ کا پیغام سمجھ کر مسکراتا ہوا قبول کرتا ہے۔

اعتراف سے دعا تک کا سفر

سورۃ الفاتحہ کے آغاز سے وَاِيَّاكَ نَسۡتَعِيۡنُ تک پورا سفر ایک بندے کے اقرار و اعتراف کا سفر ہے وہ اللہ تعالیٰ کی بے پایاں نعمت اور اس کے مسلسل نظام ربوبیت کے ساتھ ساتھ جب اس کی رحمت کو اپنے اندر باہر دائیں بائیں بلکہ

پوری کائنات میں پھوار کی طرح برستا ہوا دیکھتا ہے تو بے ساختہ اس کی زبان سے حمد و ثنا کا نغمہ جاری ہو جاتا ہے۔ پھر اسی کیفیت میں جب وہ اپنی اور مخلوقات کی زندگیوں میں قانون مکافات کو جاری و ساری پاتا ہے تو اللہ کی صفت عدالت اور اس کی ہمہ گیر حاکمیت کا تصور اس کے ذہن میں ابھرنے لگتا ہے یہ دونوں تصورات جب اس کی شخصیت کا حصہ بن جاتے ہیں کہ ایک طرف وہ اللہ کی حمد و ثنا میں ڈوبا ہوا ہے اور دوسری طرف قانون مکافات اس کی فکر مندیوں میں اضافہ کر رہا ہے تو وہ بے ساختہ اللہ کے آستانے پر ڈھیر ہو جاتا ہے۔ اسی کی بندگی اور غلامی اور اسی سے استعانت اس کی زندگی کا سرمایہ بن جاتی ہے۔ یہی اس کے لیے پناہ گاہ بھی ہے اور اس کے قلب و ضمیر کے لیے فرحت بخش بھی۔ وہ بندگی کے اعتراف سے سرشار ہوتا ہے تو توکل و اعتماد اس کی شخصیت میں پختگی پیدا کر دیتے ہیں۔ لیکن جب ان احساسات کے ساتھ وہ اللہ کی بندگی کے لیے زندگی کے کٹھن راستوں پر سفر کرنا چاہتا ہے تو اسے سب سے پہلے اپنی فکری شخصیت کی تعمیر کی طرف متوجہ ہونا پڑتا ہے وہ دیکھتا ہے کہ یہاں قیاسی فلسفوں نے اس قدر دھول اڑائی ہے کہ حقیقت نفس الامری کا سراغ لگانا بہت مشکل ہو گیا ہے پھر وہ انسانی زندگی کے در و بست کو سمجھنا چاہتا ہے تو اسے یہ دیکھ کر پریشانی ہوتی ہے کہ صحیح نظام اخلاق کی بنیادیں تلاش کرنا ہی ایک مشکل کام ہو گیا ہے چہ جائیکہ اس پورے نظام کو تلاش کیا جائے۔ پھر وہ انسانی احساسات، انفعالات، خواہشات اور مزعومات کی دنیا کو سنوارنا چاہتا ہے۔ لیکن اس کے لیے اسے بیشمار پگڈنڈیوں سے واسطہ پڑتا ہے وہ پریشانیوں میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔ ایک طرف اس کے اندر کا بے پناہ جذبہ ہے جو اسے بندگی کے سفر پر رواں دواں رکھنا چاہتا ہے اور دوسری طرف متذکرہ بالا سفر کی دشواریاں ہیں جو اسے ایک ایک قدم اٹھانے سے روکتی ہیں۔ اب تک تو اقرار و اعتراف کے جذبات نے اسے یہاں تک پہنچایا تھا لیکن اب جب وہ اپنے سامنے کوئی راستہ کھلتا ہوا نہیں دیکھتا تو مجبوراً یا بے ساختہ اقرار و اعتراف کے اسلوب سے ہٹ کر وہ دعا کا اسلوب اختیار کرتا ہے اور اپنے پروردگار سے وہ دولت مانگتا ہے جو اس کی زندگی کے لیے کلید کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے دل سے آواز اٹھتی ہے۔

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۔ لا (الفاتحہ ۱:۶)

(یا اللہ ہمیں وہ سیدھی راہ دکھا جو ہمیں تیری رضا تک پہنچا دے)

یہاں پہنچ کر جب ہم پلٹ کر سورۃ فاتحہ میں بیان کردہ اللہ تعالیٰ کی پہلی صفت ربوبیت کو دیکھتے ہیں۔ تو فوراً ذہن کے افق پر اس کی صفت ربوبیت کی وہ وسعتیں روشن ہو جاتی ہیں جس کا ذکر پروردگار نے کتاب پاک میں تفصیل سے کیا ہے۔ ان ساری تفصیلات کو سمیٹنا تو ہم جیسے عاجز لوگوں کے بس کا کام نہیں البتہ اسے سمجھنے کے لیے مختصر گزارشات پیش خدمت ہیں۔

تکوین وجود کے چار مراتب

خالق کائنات نے اپنی آخری کتاب میں تکوین وجود کے چار مراتب بیان فرمائے ہیں۔ خلق، تسویہ، تقدیر اور ہدایت۔ کائنات کی ہر مخلوق کا عدم سے وجود میں آنا اس کی صفت خلق کا اظہار ہے۔ مگر ہر مخلوق کا اس طرح پیدا کیا جانا جس طرح اسے ہونا چاہیے تھا اور اس کے نک سک کا درست ہونا اور اس میں انتہا درجہ کا تناسب پایا جانا اور ہر طرح سے اپنے ماحول سے اس کا مناسبت رکھنا اور ماحول کا اس کے ساتھ مناسب ہونا یہ وہ چیز ہے جو کو تسویہ کہا گیا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ کائنات کی ہر مخلوق اپنے وجود کے اعتبار سے اس طرح واقع ہوئی ہے کہ اس کا جسم اور اس کا ماحول باہم دگر ایک دوسرے کے لیے معاون و مددگار بن گئے ہیں۔ پرند ہوا میں اڑتے ہیں تو انھیں پر عطا کیے گئے۔ مچھلیاں پانی میں پیدا ہوتی ہیں تو انھیں تیرنا سکھایا گیا۔ حشرات الارض کوڑا کرکٹ میں پیدا ہوتے ہیں تو انھیں رینگنا سکھایا۔ مچھلی خشکی میں پیدا نھیں کی گئی۔ پرندے پانی میں پیدا نہیں کیے گئے اس لیے کہ ان کا جسمانی تناسب اس کی اجازت نہیں دیتا۔ پھر اسی پر اکتفا نہیں بلکہ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ہر مخلوق کے لیے یہ پہلے سے طے کر دیا گیا کہ اسے کس طرح کا کام انجام دینا ہے؟ اس کی حدود کار کیا ہوں گی؟ اس کی قوت عمل کس طرح کی ہوگی؟ اسے کب تک کس حال میں رہنا ہے؟ اور کس حد تک اپنے کام کو انجام دینا ہے؟ اس کی زندگی کا مقصد کیا ہے؟ اور اس مقصد کو بروئے کار لانے کے لیے اسے کون سی صلاحیت درکار ہے؟ یہ وہ چیز ہے جسے قرآن کریم میں تقدیر کا نام دیا گیا ہے۔ چنانچہ سورج کو پیدا کیا گیا تو اس کا مقصد وجود مقرر کر دیا گیا۔ چاند کو پیدا کیا گیا تو اس کے عمل کا ایک دائرہ ٹھہرا دیا گیا۔ ستارے بنائے گئے تو انھیں ان کی ڈیوٹیاں سمجھا دی گئیں۔ نباتات سے لے کر آسمان کی ہر مخلوق تک ہر ایک کے لیے ایک تقدیر بنا دی گئی۔ چنانچہ یہ ممکن نہیں ہے کہ سورج اپنے دائرہ کار سے باہر نکل جائے اپنے مقصد وجود یعنی کائنات

کو روشنی دینے اور گرمی پہنچانے سے رک جائے۔ یہ ممکن نہیں کہ چاند اپنی حلاوت سے اہل زمین کو محروم کر دے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ستارے جھلملانا چھوڑ دیں۔ یہ ناممکن ہے کہ پھول خوشبو دینے اور پانی پیاس بجھانے سے انکار کر دے۔ ہر ایک اپنے اپنے کام پر لگا ہوا ہے اور انھیں اپنا مقصد وجود اور دائرہ کار اچھی طرح معلوم ہے اور اگر شعور کی آنکھ سے مزید کام لیا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ تمام مخلوقات کو یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ تمہیں اپنے اپنے فرائض کس طرح انجام دینا ہیں۔ مچھلی کو اگر پانی میں تیرنے کا حکم دیا گیا تو ایسا نہیں کہ اسے تیرنا نہ سکھایا گیا ہو۔ پرندے کے لیے اگر ہوا میں اڑنا مقدر کیا گیا تو ایسا نہیں ہے کہ اسے اڑنے کی تعلیم نہ دی گئی ہو۔ سورج، چاند اور ستاروں کو جس کام پر لگا دیا گیا ہے ایسا نہیں ہے کہ انھیں اس کی ہدایت نہ دی گئی ہو۔ قرآن کریم کہتا ہے:

لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ؕ (یٰسٓ ۳۶:۴۰)

(سورج کی مجال نہیں کہ وہ چاند کو جا پکڑے اور رات کو اس کی اجازت نہیں ہے کہ وہ دن سے آگے بڑھ جائے، ہر ایک کا اپنا دائرہ کار ہے اور اپنے دائرے میں مصروف عمل ہے)

اس کی ہدایت کی ہمہ گیری کا عالم یہ ہے کہ کائنات کی کوئی چیز ایسی دکھائی نہیں دیتی کہ اسے وجود ملا ہو اور وہ غایت وجود سے بے خبر ہو اور پھر اس کو روبعمل لانے سے وہ بے بہرہ ہو۔ اس نے کلیوں کو پیدا کیا ہے تو انھیں چٹکنا بھی سکھایا۔ اس نے پھول کو پیدا کیا تو اس کو مہکنا بھی سکھایا۔ اس نے درختوں کو پیدا کیا تو انھیں لہکنا بھی سکھایا۔ اس نے ستاروں کو پیدا کیا تو انھیں جھلملانا اور ٹمٹمانا بھی سکھایا ہے۔ اس نے بادل کو پیدا کیا تو اسے کڑکنا بھی سکھایا۔ اس نے رعد کو گرجنا اور بجلی کو کوندنا بھی سکھایا۔ اس نے پرندے کو چہکنا اور ہوا کو چلنا سکھایا۔ اس نے آگ کو جلانا اور پانی کو بہنا سکھایا۔ اس نے حسن کو مچلنا اور عشق کو پگھلنا سکھایا۔ غرضیکہ کائنات کی کوئی چیز ایسی نہیں جسے اس نے تقدیر اور ہدایت سے نہ نوازا ہو۔ حتیٰ کے غور و فکر کے اگر چند اور اوراق الٹے جائیں تو بعض چیزیں ایسی سامنے آتی ہیں کہ آدمی حیرت میں ڈوب جاتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ مچھلیوں میں سے دو کا سفر بہت حیرت انگیز ہے۔

1۔ سامن مچھلی

یہ اگر کسی ندی میں پیدا ہو تو جوان ہونے کے بعد یہ پہلے دریا میں اور وہاں سے سمندر میں چلی جاتی ہے اور وہاں مدتوں رہتی ہے اور جب اسے محسوس ہوتا ہے کہ اس کی موت قریب آگئی ہے تو وہ واپس چل پڑتی ہے۔ یہ سمندر اور دریا سے ہوتی ہوئی ندی کے اس مقام پر جا رکتی ہے جہاں وہ پیدا ہوئی تھی۔ اگر وہ دوران سفر کسی غلط ندی کی طرف مڑ جائے تو اسے فوراً اپنی غلطی کا احساس ہو جاتا ہے اور وہ واپس آجاتی ہے۔

2۔ ایل مچھلی

یہ کسی ندی میں ہو یا دریا میں جوان ہونے کے بعد اپنے وطن سے چل پڑتی ہے اور ہزاروں میل دور جزائر برمودہ (اوقیانوس) میں چلی جاتی ہے۔ وہاں بچے دے کر مر جاتی ہے یہ بچے وہاں سے چل کر اپنی ماں کے وطن میں آجاتے ہیں اور وہاں سے پھر جزائر برمودہ میں پہنچ کر پہلے بچے دیتے ہیں بعد ازاں مر جاتے ہیں۔

ہدایت کے چار مراحل

تکوین وجود اور تکمیل وجود کے یہ چار مراحل ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر مخلوق کو پیدا فرمایا پھر اس کا تسویہ کیا، پھر اس کی ایک تقدیر مقرر کر دی اور پھر اسے اس کی تقدیر کے مطابق زندگی اور معیشت کی راہ پر چلنے کا طریقہ سکھایا۔ یعنی ہدایت عطا فرمائی۔

ہدایت الہام

1۔ اس ہدایت پر اگر غور کیا جائے تو اس کے چار طریقے معلوم ہوتے ہیں۔ نباتات میں یہ ہدایت فطری رہنمائی کا درجہ رکھتی ہے جس کے نتیجے میں بیلیں زمین پر پھیلتی، پودے سر اٹھاتے، درخت تن کر کھڑے ہوتے ہیں پھر ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی ہدایت کے مطابق برگ و بار لاتا اور پھل اور پھول دیتا ہے۔ لیکن حیوانات میں ہم اس فطری ہدایت کو اندرونی الہام کی شکل میں دیکھتے ہیں کہ ہر حیوان کا بچہ ادھر پیدا ہوتا ہے ادھر کوئی الہام کرنے والا اسے یہ الہام کرتا ہے کہ تیری غذا ماں کے سینے میں یا تیرے قریب ہی رکھ دی گئی ہے وہاں سے تجھے اس طرح حاصل کرنا ہے۔ چنانچہ ہم بلی کے بچے کو دیکھتے ہیں کہ ابھی اس نے آنکھیں کھولی نہیں اور خارج کے موثرات نے اسے چھوا

تک نہیں مگر وہ اپنی ماں کی چھاتی کو ٹٹولتا ہے اس پر منہ مارتا ہے اور پستان کو منہ میں لے کر چوسنے لگتا ہے اور بلی فرط محبت سے اسے چاٹ رہی ہے۔ آپ نے بلی کو دیکھا ہو گا ج سے اس سے پہلے بچے کو جننے کا کوئی تجربہ نہیں ہے مگر جیسے ہی اس کے وضع حمل کے دن قریب آتے ہیں وہ الگ تھلگ کونے کی تلاش میں ماری ماری پھرتی ہے اور پھر کسی الگ کونے کو عافیت کی جگہ سمجھتے ہوئے بیٹھ جاتی ہے اور بچے جن دیتی ہے اور پھر وہ جس طرح اپنے بچوں کی نگہداشت کرتی ہے اور ایک موہوم خطرہ محسوس کرتے ہوئے مختلف جگہیں بدلتی ہے یہ اس کے سوا اور کیا ہے کہ کوئی اندرونی الہام ہے جو اسے ہر معاملہ کی ہدایت دے رہا ہے۔ خود انسان کا بچہ جو جانوروں کے بچوں سے بھی زیادہ بے بس ہوتا ہے جس کے بارے میں قرآن کریم کہتا ہے کہ:

وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْــــًٔا ۙ (النحل ۱۶:۷۸)

"وہ ذات ہے جس نے تمھیں تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے نکالا اس حال میں کہ تم کچھ نہیں جانتے تھے۔"

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ بچے کے پیدا ہوتے ہی ماں کی مامتا بے تاب ہو کر اسے سینے سے لگاتی ہے اور وہ ماں کی چھاتی کے ساتھ منہ مارنے لگتا ہے اور پستان منہ میں لے کر چوسنے لگتا ہے تاکہ اپنی غذا حاصل کر سکے۔ سوال یہ ہے کہ آخر اس بچے کو یہ کون سکھاتا ہے کہ تیری غذا ماں کی چھاتی میں ہے اور تجھے اس طرح اسے چوسنا ہے یہ وہ اندرونی الہام ہے جس کے ذریعے انسان کو سب سے پہلی ہدایت دی جاتی ہے۔

ہدایت حواس

2۔ ہدایت کا دوسرا مرتبہ حواس اور مدرکات ذہنی کی ہدایت ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اگرچہ حیوانات اس جوہر دماغ سے محروم ہیں جسے عقل و فکر سے تعبیر کیا جاتا ہے تاہم فطرت نے انھیں ادراک و احساس کی وہ تمام قوتیں دے دی ہیں جن کی زندگی و معیشت کے لیے ضرورت تھی اور ان کی مدد سے وہ اپنے رہنے سہنے، کھانے پینے، توالد و تناسل اور ہدایت و نگرانی کے تمام فرائض حسن وخوبی کے ساتھ انجام دیتے رہتے ہیں۔ پھر حواس وادراک کی یہ ہدایت ہر حیوان کے لیے ایک ہی طرح کی نہیں بلکہ ہر وجود کو اتنی ہی اور ویسی ہی استعداد دی گئی جیسی استعداد اس کے احوال فطرت کے لیے ضروری تھی۔ چیونٹی کی قوت شامہ نہایت دوررس ہوتی ہے اس لیے کہ اسی قوت کے ذریعے وہ اپنی غذا حاصل کرتی ہے، چیل اور عقاب کی نگاہ تیز ہوتی ہے کیونکہ اگر ان کی نگاہ تیز نہ ہو تو بلندی میں اڑتے ہوئے اپنا شکار

نہ دیکھ سکیں یہی وہ ہدایت ہے جس کی طرف حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی زبانی ارشاد کیا گیا ہے فرعون نے جب پوچھا:

فَمَنۡ رَّبُّکُمَا یٰمُوۡسٰی (طٰہٰ ۲۰:۴۹)

(اے موسیٰ تمہارا پروردگار کون ہے؟) حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا:

قَالَ رَبُّنَا الَّذِیۡۤ اَعۡطٰی کُلَّ شَیۡءٍ خَلۡقَہٗ ثُمَّ ہَدٰی (طٰہٰ ۲۰:۵۰)

(ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کو پیدا کیا، پھر اسے ہدایت دی)

یعنی اس پر زندگی اور معیشت کی راہ کھول دی۔ پھر یہی وہ ہدایت ہے جسے دوسری جگہ راہ عمل آسان کر دینے سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ فرمایا:

مِنۡ اَیِّ شَیۡءٍ خَلَقَہٗ ؕ مِنۡ نُّطۡفَۃٍ ؕ خَلَقَہٗ فَقَدَّرَہٗ ۙ ثُمَّ السَّبِیۡلَ یَسَّرَہٗ ۙ

(عبس ۸۰:۱۸۔۲۰)

(اس نے انسان کو کس چیز سے پیدا کیا۔ نطفہ سے پیدا کیا پھر اس کی تمام ظاہری اور باطنی قوتوں کے لیے ایک اندازہ ٹھہرا دیا پھر اس پر زندگی اور عمل کی راہ آسان کر دی)

ہدایت کے یہ دو مرتبے ہوئے جسے ہم ہدایت الہام اور ہدایت حواس کے نام سے جانتے ہیں۔ یہ دونوں مرتبے انسان اور حیوان سب کے لیے ہیں۔ الہام کی ہدایت انسان اور حیوان میں سعی و طلب کا ولولہ پیدا کرتی ہے۔ حواس کی ہدایت کا مرتبہ اس سے بلند تر ہے۔ یہ ہمیں دیکھنے، سننے، چکھنے، چھونے اور سونگھنے کی قوتیں بخشتی ہیں اور انہی کے ذریعے ہم خارج کا علم حاصل کرتے ہیں۔ اور یہ ہدایت ہمارے لیے معلومات بہم پہنچاتی ہے۔

جوہر عقل

3۔ حیوان کے لیے تو ہدایت کے یہ دونوں مرتبے کافی ہیں۔ کیونکہ اسے زندگی کا جو طریقہ اور جو نصب العین سکھایا گیا ہے اس کے لیے کسی تیسرے مرتبہ ہدایت کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن انسان کے حیوان کے لیے تو ہدایت کے یہ دونوں مرتبے کافی ہیں کیونکہ اسے زندگی کا جو طریقہ اور جو نصب العین سکھایا گیا ہے اس کے لیے کسی تیسرے مرتبہ

ہدایت کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن انسان کے لیے ایک تیسرے مرتبہ ہدایت کی بھی ضرورت ہے۔ کیونکہ اس کے لیے مجرد احساس کافی نہیں اور نہ صرف محسوسات کا علم اس کے لیے کفایت کرتا ہے۔ انسان کو تو استنباط اور استنتاج کی بھی ضرورت ہے۔ احکام کی بھی ضرورت ہے اور کلیات کی بھی ضرورت ہے۔ اور یہ کام صرف حواس کی ہدایت سے ممکن نہیں۔ اس لیے انسان کو ایک تیسرے مرتبہ ءہدایت سے نوازا گیا۔ یہ وہ ہے جسے جوہر عقل کے نام سے یاد کیا جاتا ہے جوہر عقل دراصل اسی قوت کی ایک ترقی یافتہ حالت ہے جس نے حیوانات میں الہام ووجدان اور حواس کی روشنی پیدا کر دی ہے۔ جس طرح انسان کا جسم اجسامِ ارضی کی سب سے اعلیٰ کڑی ہے اسی طرح اس کی معنوی قوت بھی تمام معنوی قوتوں کا بدترین جوہر ہے۔ روح حیوانی کا وہ جوہر ادراک جو نباتات میں مخفی اور حیوانات کے وجدان و مشاعر میں نمایاں تھا انسان کے مرتبہ میں پہنچ کر درجہ ءکمال تک پہنچ گیا اور جوہر عقل کے نام سے پکارا گیا۔ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ ہدایت فطرت کے ان تینوں مرتبوں میں سے ہر مرتبہ اپنی قوت و عمل کا ایک خاص دائرہ رکھتا ہے۔ اس سے آگے نہیں بڑھ سکتا اور اگر اس مرتبہ سے ایک بلند تر مرتبہ موجود نہ ہوتا تو ہماری معنوی قوتیں اس حد تک ترقی نہ کر سکتیں جس حد تک فطرت کی رہنمائی سے ترقی کر رہی ہیں۔ الہام کی ہدایت ہم میں طلب وسعی کا جوش پیدا کرتی ہے۔ مطلوبات زندگی کی راہ پر لگاتی ہے۔ لیکن ہمارے وجود سے باہر جو کچھ موجود ہے اس کا ادراک حاصل نہیں کر سکتی۔ یہ کام حواس کی ہدایت کا ہے۔ وجدان کی راہنمائی جب درماندہ ہو جاتی ہے تو حواس کی دستگیری نمایاں ہوتی ہے۔ آنکھ دیکھتی ہے، کان سنتے ہیں، زبان چکھتی ہے، ہاتھ چھوتا ہے، ناک سونگھتی ہے۔ اور اس طرح ہم اپنے وجود کے باہر کی تمام محسوس اشیا کا ادراک حاصل کر لیتے ہیں۔ لیکن حواس کی ہدایت بھی ایک خاص حد تک ہی کام دے سکتی ہے۔ اس سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔ آنکھ دیکھتی ہے مگر صرف اسی حالت میں جبکہ دیکھنے کی تمام شرطیں موجود ہوں اور اگر کوئی ایک شرط بھی نہ پائی جائے۔ مثلاً روشنی نہ ہو یا فاصلہ زیادہ ہو تو ہم آنکھ رکھتے ہوئے بھی ایک موجود چیز کو براہ راست نہیں دیکھ سکتے۔ علاوہ بریں حواس کی ہدایت صرف اتنا ہی کر سکتی ہے کہ اشیا کا احساس پیدا کر دے لیکن مجرد احساس کافی نہیں ہے ہمیں استنباط واستنتاج کی بھی ضرورت ہے۔ جس کے نتیجے میں ہم کلیات وضع کرتے ہیں اور کلیات سے احکام نکالتے ہیں۔ اور یہ کام عقل کی ہدایت کا ہے۔

اسے مثال سے یوں واضح کیا جاسکتا ہے کہ حواس تعمیر کے کام میں مزدوروں کی طرح ہیں۔ جن کا کام خام مواد مہیا کرنا، بکھری ہوئی چیزیں فراہم کرنا اور مسالہ بہم پہنچانا ہے اور عقل کی حیثیت ایک معمار کی ہے جس کا کام بکھرے ہوئے مواد کو جوڑ کر ایک عمارت کی تشکیل دینا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر حواس کے بعد عقل کا جوہر عطانہ کیا جاتا تو ہماری بکھری ہوئی معلومات، ہمارے منتشر محسوسات، ہماری زندگی کے کسی شعبہ کے لیے معاون ثابت نہ ہوتے کیونکہ ان سے کام لینا، انھیں ترتیب دینا اور ان سے کلیات وضع کرنا اور پھر ان سے احکام استنباط کرنا۔ عقل کا کام ہے اور عقل کی عدم موجودگی میں ظاہر ہے یہ کام نہیں ہو سکتا تھا اور ہم زندگی کے میدان میں ناکام ہو جاتے۔ پھر ایک اور پہلو بھی قابل غور ہے وہ یہ کہ جس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ وجدان اور فطری الہام کی نگرانی کے لیے حواس کی راہنمائی کی ضرورت ہے کیونکہ وجدان اور احساس غلطیوں سے مبرا نہیں۔ ان کی تصحیح و نگرانی کے لیے ہمیں حواس کی راہنمائی کی ضروت ہے اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ حواس کی راہنمائی بھی نارسائی کا شکار ہوتی ہے اور غلطیوں سے محفوظ بھی نہیں۔ مثلاً ہم دور سے ایک چیز دیکھتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں ایک سیاہ نقطے سے زیادہ حجم نہیں رکھتی۔ حالانکہ وہ ایک عظیم الشان گنبد ہوتی ہے۔ ہم بیماری کی حالت میں شہد جیسی میٹھی چیز چکھتے ہیں لیکن ہماری قوت ذائقہ ہمیں یقین دلاتی ہے کہ اس کا مزا کڑوا ہے۔ ہم تالاب میں لکڑی کا عکس دیکھتے ہیں لکڑی بالکل سیدھی ہوتی ہے۔ لیکن عکس میں ٹیڑھی دکھائی دیتی ہے۔ بارہا ایسا ہوتا ہے کہ کسی عارضے کی وجہ سے کان بجنے لگتے ہیں اور ہمیں ایسی آوازیں سنائی دینے لگتی ہیں۔ جن کا خارج میں کوئی وجود نہیں اب اگر مرتبہء حواس سے ایک بلند تر مرتبہء ہدایت کا وجود نہ ہوتا تو ممکن نہیں تھا کہ ہم حواس کی درماندگیوں میں حقیقت کا سراغ پاسکتے لیکن ان تمام حالتوں میں عقل کی ہدایت نمودار ہوتی ہے۔ وہ حواس کی درماندگیوں میں ہماری راہنمائی کرتی ہے وہ ہمیں بتلاتی ہے کہ سورج ایک عظیم الشان کرہ ہے۔ اگرچہ ہماری آنکھ اسے ایک سنہری تھال سے زیادہ محسوس نہیں کرتی ہے۔ وہ ہمیں بتاتی ہے کہ شہد کا مزا ہر حال میں میٹھا ہے اور اگر ہمیں کڑوا محسوس ہوتا ہے تو یہ اس لیے ہے کہ ہمارے منہ کا مزا بگڑ گیا ہے۔ وہ ہمیں بتلاتی ہے کہ بعض اوقات خشکی بڑھ جانے سے کان بجنے لگتے ہیں۔ اور ایسی حالت میں جو صدائیں سنائی دیتی ہیں۔ وہ خارج کی صدائیں نہیں خود ہمارے دماغ کی گونج ہوتی ہے۔

عقل کو مکمل ہدایت تسلیم کرنے کے نقصانات

گزشتہ معروضات میں آپ نے دیکھا کہ وجدان اور الہام کی ہدایت کے بعد حواس کی ہدایت نمودار ہوئی کیونکہ وجدان کی ہدایت ایک خاص حد سے نہیں بڑھ سکتی تھی۔ اور پھر حواس کے بعد عقل کی ہدایت نمودار ہوئی۔ کیونکہ حواس کی ہدایت بھی ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھ سکتی تھی۔ اور اس کے ساتھ یہ بات بھی کہ وہ غلطیوں اور نارسائیوں سے محفوظ بھی نہیں تھی۔ ٹھیک اسی طرح ہم محسوس کرتے ہیں کہ یہ دونوں کمزوریاں عقل کے ساتھ بھی لگی ہوئی ہیں۔ کیونکہ عقل زندگی کے ہر شعبہ میں نہ تو مکمل رہنما ہے اور نہ بالکل صحیح رہنما ہے۔ اس کا بھی ایک محدود دائرہ عمل ہے جس سے یہ آگے نہیں بڑھ سکتی۔ اور اس کی کارفرمائی بھی غلطیوں سے مبرا نہیں۔ کیونکہ اس کا دائرہ عمل جیسا کچھ بھی ہے وہ محسوسات کے دائرے میں محدود ہے۔ یعنی وہ صرف اس حد تک کام دے سکتا ہے۔ جس حد تک ہمارے حواس خمسہ معلومات بہم پہنچاتے رہتے ہیں۔ لیکن محسوسات کی سرحد سے آگے کیا ہے؟ اس پردے کے پیچھے کیا ہے؟ جس سے آگے ہماری چشم حواس نہیں بڑھ سکتی۔ یہاں پہنچ کر عقل یک قلم درماندہ ہو جاتی ہے اور اس کی ہدایت ہمیں کوئی روشنی نہیں دے سکتی۔ بقول اقبال:

خرد سے راہرو روشن بصر ہے
خرد کیا ہے چراغ رہگذر ہے
درونِ خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا
چراغِ رہگذر کو کیا خبر ہے

یوں کہنا چاہیے کہ عقل ایک صحیح راہنما ہے۔ لیکن مکمل نہیں۔ غلطی ہماری ہے کہ ہم اسے ایک مکمل راہنما سمجھ کر زندگی کے ہر دائرہ عمل میں اس سے راہنمائی کے طالب ہوتے ہیں۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے کہ جیسے کسی آدمی نے کسی صراف سے یہ پوچھا کہ صراف میاں تمہارا میزان کیسا ہے؟ اس نے کہا بالکل صحیح ہے۔ بالکل صحیح تولتا ہے۔ ذرہ بھر کمی بیشی نہیں ہونے دیتا۔ اس نے کہا اگر تمہاری بات صحیح ہے تو پھر اس میں اپنی دکان تول کر دکھاؤ۔ اس نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور کہا بھلے آدمی یہ دکانیں تولنے کے لیے تھوڑے بنایا گیا ہے۔ اس میں تو سونا چاندی تولتے

ہیں۔ اس نے کہا کہ تم نے تو کہا تھا کہ تمہارا میزان صحیح ہے۔ اس نے کہا میں نے صحیح کہا تھا۔ یہ غلطی میزان کی نہیں تمہاری ہے کہ تم اس میں وہ چیز تلوانا چاہتے ہو جو اس کے دائرہ کار سے باہر ہے۔ ہم بھی عقل سے وہ کام لینا چاہتے ہیں جو اس کے دائرہ کار میں نہیں آتا۔ اس کا دائرہ کار محسوسات تک محدود ہے۔ طبیعات تک محدود ہے رہی یہ بات کہ محسوسات کے دائرہ کے پیچھے کیا ہے اور مابعد الطبعیات کیا ہے عالم لاہوت اور عالم الٰہیات کیا ہے، عالم ملکوت کا کیا حال ہے؟ عالم برزخ میں کیا ہو رہا ہے؟ عالم آخرت میں کیا ہو گا؟ موت اور زندگی کی حقیقت کیا ہے؟ روح کس چیز کا نام ہے کائنات کی ابتدا کیا ہے اور انتہا کیا ہے؟ اللہ کی صفات کیا ہیں؟ اخلاقی مسلمات کی حقیقت کیا ہے؟ قوموں کے عروج وزوال کے اصل اسباب کیا ہیں؟ وہ اخلاقی نقطہ کیا ہے جس سے انسانیت کا آغاز ہوتا ہے اور پھر انسانیت پروان چڑھتی ہے؟ انسانیت کے مسلّمہ مسائل کا اجتماعی حل کیا ہے؟ انسان کے اندر بیٹھا ہوا انسان کس چیز سے مرتا اور کس چیز سے جیتا ہے؟ یہ وہ زندگی اور کائنات کے حقائق ہیں جس سے پردہ اٹھانا عقل کی بساط سے باہر ہے۔ لیکن جب ہم انہی چیزوں کا جواب عقل سے مانگتے ہیں تو ہم اس پر ایک ایسا بوجھ لاد دیتے ہیں جس کا تحمل اس میں نہیں ہے۔ بلکہ بعض دفعہ ہم دیکھتے ہیں کہ زندگی کے بالکل پیش پا افتادہ حقائق بھی انسانی عقل کی گرفت سے باہر معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً آپ غور فرمایئے کہ نفس انسانی طرح طرح کی خواہشوں اور جذبوں میں کچھ اس طرح گھرا ہوا ہے بلکہ اس طرح مقہور واقع ہوا ہے کہ جب بھی عقل اور جذبات میں کشمکش ہوتی ہے تو اکثر حالتوں میں فتح جذبات ہی کی ہوتی ہے۔ بسا اوقات عقل ہمیں یقین دلاتی ہے کہ فلاں فعل مضر اور مہلک ہے لیکن جذبات ہمیں ترغیب دیتے ہیں اور ہم اس کے ارتکاب سے اپنے آپ کو روک نہیں سکتے۔ عقل کی بڑی سے بڑی دلیل بھی ہمیں ایسا نہیں بنا دے سکتی کہ غصے کی حالت میں بے قابو نہ ہو جائیں اور بھوک کی حالت میں مضر غذا کی طرف ہاتھ نہ بڑھائیں۔

جذبات تو پھر بھی ایک زوردار شے ہے۔ وہم تو انسانی احساسات میں سے ایک کمزور حس کا درجہ رکھتا ہے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ بسا اوقات وہم جیسا کمزور جذبہ بھی عقل انسانی پر غالب آ جاتا ہے۔ عقل جانتی ہے کہ ایک انسان کو گزرنے کے لیے ایک فٹ یا زیادہ سے زیادہ دو تین فٹ چوڑی گزر گاہ کافی ہے۔ اگر کسی عقل کے پرستار سے یہ پوچھا جائے کہ دریا کے اوپر گزر گاہ بنانے کے لیے کتنا چوڑا پل ہونا چاہیے تو وہ عقل کے مطابق اتنی ہی چوڑائی تجویز کرے گا۔ لیکن اگر کسی عقل کے پرستار سے کسی ایسے پل پر سے گزرنے کو کہا جائے جو تین فٹ چوڑا ہو لیکن اس کے نیچے

سے گزرنے والا دریا طغیانی پر آیا ہوا ہو جس کی موجیں اچھل کر دریا کے پل کو چھو رہی ہوں تو یہی عقل کا پرستار کبھی اس پل پر سے گزرنے کی جرات نہیں کرے گا۔ بلکہ اندیشہ ہائے دور دراز کا شکار ہو کر گزرنے سے صاف انکار کر دے گا۔ غور فرمایئے کہ جس عقل کو جذبات اپنا اسیر بنا لیں اور وہم اسے شکست دے دے وہ زندگی کے معاملات حل کرنے میں کہاں تک موثر ہو سکتی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے کہ عقل کے میزان ہونے اور موثر رہنما ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ مشکل اس وقت پیش آتی ہے جب اس کے دائرہ کار سے باہر اس کو استعمال کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور اسے ایک مکمل رہنما سمجھ لیا جاتا ہے۔ حالانکہ اس کی کمزوری کا عالم بھی آپ نے دیکھا کہ وہ اپنے آپ کو جذبات اور وہم کی زنجیروں سے آزاد کرنے سے بھی عاجز ہے۔ یہاں تک تو معاملہ پھر بھی عقل کے موثر نہ ہونے کا ہے لیکن اس وقت تو معاملہ بہت خطرناک ہو جاتا ہے جب عقل نہ صرف یہ کہ موثر نہیں رہتی بلکہ بعض دفعہ اپنی رہنمائی میں وہ غلط نتائج پیدا کرتی ہے جس کے نتیجے میں اخلاقی زندگی تباہ و برباد ہو کر رہ جاتی ہے۔ یہ موقع وہ ہے جب عقل کو خواہشات کا غلام بنا دیا جاتا ہے انسان عجیب واقع ہوا ہے کہ وہ اصلاً ان خواہشات کی پیروی کرنا چاہتا ہے لیکن اسے بروئے کار لاتے ہوئے نام عقل کا رکھتا ہے۔ حالانکہ اگر دیانت داری سے غور کیا جائے تو وہاں عمل دخل عقل کا نہیں بلکہ سراسر خواہشات کا ہوتا ہے۔ یہی وہ بات ہے جو قرآن کریم نے ایک جگہ ارشاد فرمائی:

وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ أَهْوَاءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْأَرْضُ وَمَنْ فِيهِنَّ

(المومنون: ۲۳۔۷۱)

(کہ اگر حق ہوائے نفس کی پیروی کرنے لگے تو زمین و آسمان اور اس میں جو کچھ ہے وہ تباہ ہو جائے)

اور یہ کوئی مفروضہ نہیں بلکہ امر واقعہ ہے کہ فلسفہ قانون میں فلاسفہ کا ایک گروہ پایا جاتا ہے جن کا نمایاں نمائندہ مشہور ماہر قانون ڈاکٹر فرائیڈ میں ہے۔ انھوں نے اپنے نظریہ کی وضاحت کے لیے "دی لیگل تھیوری" کے نام سے ایک کتاب لکھی اس میں ایک جگہ وہ لکھتے ہیں:

"عقل صرف انسانی جذبات و خواہشات کی غلام ہے اور اس کو انہی کا غلام ہونا بھی چاہیے۔ عقل کا اس کے سوا اور کوئی کام ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ ان جذبات کی بندگی اور ان کی اطاعت کرے۔"

پھر اس نظریئے سے جو نتیجہ نکلنا چاہیے وہ ڈاکٹر فرائیڈ میں کے الفاظ میں یہ ہے کہ:
" اس کے سوا ہر چیز یہاں تک کہ اچھے برے کے تصورات اور یہ الفاظ کہ فلاں کام ہونا چاہیے اور فلاں کام ہونے کے لائق ہے کلی طور پر جذباتی باتیں ہیں اور دنیا میں اخلاق نام کی کوئی چیز موجود نہیں ہے۔"
ممکن ہے کہ آپ اسے محض ایک فلسفی کی بڑ سمجھیں لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ دنیا میں جہاں جہاں عقل کی برتری کا دعویٰ کیا جاتا ہے بلکہ عقل کی غلامی کی جارہی ہے وہاں عملی زندگی میں یہی فلسفہ ہمیں حاکم دکھائی دیتا ہے۔ جس کے نتیجے میں اخلاق کی ہر قدر رفتہ رفتہ شکست وریخت کا شکار ہے۔ رحم اتنی بڑی اخلاقی قدر ہے کہ شائد کوئی اس کا انکار نہ کرسکے۔ ہیروشیما اور ناگاساکی پر گرائے جانے والے بموں سے انسانیت پر جو ظلم ہوا انسانیت کی پیشانی آج بھی اس سے عرق آلود ہے۔ لیکن اندازہ فرمائیے کہ جب اس واقعہ کو خالصتاً عقل کی نگاہ سے دیکھا گیا تو اسے ظلم کی بجائے رحم بنادیا گیا ہے۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جیسی علمی اور عالمی کتاب میں ان تباہ کاریوں کا ذکر بعد میں کیا گیا جو ایٹم بم کی بدولت ہیروشیما اور ناگاساکی میں برپا ہوئیں لیکن ایٹم بم کے تعارف میں یہ جملہ سب سے پہلے لکھا گیا ہے:
" سابق وزیر اعظم ونسٹن چرچل نے یہ اندازہ لگایا ہے کہ ایٹم بم نے جنگ کو مختصر کرکے دس لاکھ امریکی سپاہیوں اور اڑھائی لاکھ برطانوی سپاہیوں کی جانیں بچائیں۔"
انداہ فرمائیے کہ اس قسم کی منطق میں کون سے ظلم وستم اور کون سی سفاکی ایسی ہے جسے عقل کے خلاف کہا جاسکے۔
اسی طرح شرم وحیا انسان کا سب سے بڑا جوہر ہے لیکن خالص عقل کے پیروکاروں نے جس طرح اس کی مٹی پلید کی ہے اور اس بنیادی قدر کو جس طرح انسانی زندگی سے خارج کردیا ہے اس کو سمجھنے کے لیے میں شرم وحیاء سے معذرت کے ساتھ آٹھ سو سالہ پرانی ایک مثال پیش کررہا ہوں۔
تاریخ اسلام میں ایک فرقہ "باطنیہ" کے نام سے گزرا ہے۔ اس کا ایک مشہور لیڈر عبید اللہ القیروانی اپنے ایک مکتوب میں لکھتا ہے:
وما العجب من شئی کالعجب من رجل یدعی العقل ثم یکون له اخت او بنت حسناء ولیست له زوجة فی حسنها فیحرمها علی نفس وینکحها من اجنبی ولو عقل الجاهل لعلم انه احق باخته

وبنته من الاجنبی وما وجه ذلك الا ان صاحبهم حرم علیهما الطیبات

(الفرق بین الفرق لعبد القاہر البغدادی)

اس سے زیادہ تعجب کی بات کیا ہو سکتی ہے کہ ایک شخص عقل کا دعویدار ہونے کے باوجود ایسی حماقتیں کرتا ہے کہ اس کے پاس نہایت خوبصورت بہن یا بیٹی موجود ہوتی ہے اور خود اس کی بیوی اتنی حسین نہیں ہوتی مگر وہ اس خوبصورت بہن یا بیٹی کو اپنے اوپر حرام قرار دے کر اسے کسی اجنبی سے بیاہ دیتا ہے حالانکہ ان جاہلوں کو اگر عقل ہوتی تو وہ یہ سمجھتے کہ ایک اجنبی شخص کے مقابلے میں اپنی بہن اور بیٹی کے وہ خود زیادہ حق دار ہیں۔ اس بے عقلی کی وجہ دراصل صرف یہ ہے ان کے آقا نے ان پر عمدہ چیزوں کو حرام کر دیا ہے۔

آپ ممکن ہے کہ اسے آٹھ سو سالہ پرانی غیر ترقی یافتہ حالت کی عکاس سمجھ کر نظر انداز کر دیں۔ لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ اس ترقی یافتہ دور میں جس طرح عقل خالص کی پیروی میں اضافہ ہوا ہے اسی طرح اس کے نتیجے میں اخلاقی اقدار کی پامالی میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ آج کے دور میں بہن سے نکاح باقاعدہ ایک نعرہ بن چکا ہے اور امریکہ کی بعض ریاستوں میں باقاعدہ اس کے حق میں جلوس نکالے گئے ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے اس بد اخلاقی کو روکنے کے لیے میڈیکل سائنس کے حوالے سے یہ دلیل دی جاتی رہی ہے کہ استلذاذ بالا قارب سے طبی نقصانات ہوتے ہیں۔ لیکن آج مغربی دنیا میں اس موضوع پر کتابیں آ رہی ہیں انھوں نے نہ صرف ان طبی نقصانات کی توجیہ کو غلط ثابت کر دیا ہے بلکہ استلذاذ بالا قارب کو انھوں نے انسان کی فطری خواہش یعنی ہیومن ارج (Human Urge) قرار دے کر انسان کا بنیادی حق تسلیم کرانے کی کوشش کی ہے اور اس پر باقاعدہ کتابیں لکھی جا رہی ہیں۔ اور اسی رویہ کا نتیجہ یہ ہے کہ برطانیہ کی پارلیمنٹ ہم جنس پرستی کے جواز کا بل تالیوں کی گونج میں منظور کر چکی ہے اور یہ اخلاقی اعتبار سے انتہائی قابل نفرت خصلت جس کی وجہ سے قوم لوط پر اللہ کا عذاب نازل ہو چکا ہے۔ نہ صرف کوئی برائی نہیں رہی بلکہ اسے باقاعدہ ایک علم بنا دیا گیا ہے۔ آپ امریکہ کی لائبریریوں میں جائیں تو وہاں آپ کو اس برائی کے حق میں لکھی ہوئی کتابوں پر مشتمل علیحدہ سیکشن ملے گا۔ جس کا عنوان ہو گا۔ ”گے اسٹائل آف لائف“ (Gay Style of life)

چند سال پیشتر امریکی رسالے ٹائم نے لکھا کہ خلیج کی جنگ میں حصہ لینے والے فوجیوں میں سے تقریباً ایک ہزار افراد کو صرف اس لیے فوج سے نکال دیا گیا کہ وہ ہم جنس پرست تھے۔ لیکن اس اقدام کے خلاف امریکہ میں شور مچ رہا

ہے۔ مظاہرے ہو رہے ہیں اور چاروں طرف سے آوازیں اٹھ رہی ہیں کہ آپ نے جن لوگوں کو ہم جنس پرست ہونے کی وجہ سے فوج کے عہدوں سے برخاست کیا ہے یہ آپ نے ایک خلاف عقل حرکت کی ہے۔ اس لیے ان کو دوبارہ بحال ہونا چاہیے اور اس کے حق میں دلیل یہ دی جارہی ہے کہ یہ ایک ہیومن ارج ہے اور ہیومین ارج کو دبایا نہیں جاسکتا اور یہ سب کچھ عقل کی بنیاد پر ہو رہا ہے اور اب تو یہ معاملہ یہاں تک بڑھ گیا ہے کہ بات صرف جنس انسانی کی نہیں رہی بلکہ اب تو جانوروں کتوں، گدھوں اور گھوڑوں تک نوبت پہنچ گئی ہے اور اس کو بھی باقاعدہ فخریہ بیان کیا جارہا ہے۔

وحی نبوت کی ہدایت

اس تمام بحث سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ انسان اور حیوان کی زندگی کے تحفظ اور اس کو معیشت کی راہ پر لگانے کے لیے سب سے پہلے فطری رہنمائی کی ضرورت پڑتی ہے۔ وہ ایک خاص حد تک اپنا کام کرتی ہے۔ اس کے بعد باہر کی زندگی کی راہنمائی کے لیے اللہ تعالیٰ نے حواس خمسہ کی راہنمائی مہیا فرمائی۔ حواس خمسہ نے محسوسات کے دائرے میں رہ کر انسانی زندگی کو آگے بڑھایا۔ پھر جب انسان کے قدم محسوسات سے آگے بڑھے تو اسے عقل کی راہنمائی عطا فرمائی گئی۔ اب ہم نے تفصیل سے دیکھا کہ عقل انسان کی راہنمائی کے لیے بہت موثر رہنما ہونے کے باوجود اعمال کی درستگی اور انضباط کے لیے کافی نہیں۔ وہ قدم قدم پر جذبات کی اسیر ہو جاتی ہے اور بعض دفعہ قوت واہمہ سے شکست کھا جاتی ہے اور اگر یہ جذبات ہوائے نفس کی لپیٹ میں آجائیں تو پھر عقل نہ صرف اس کے سامنے بے دست و پا ہو جاتی ہے بلکہ عموماً وہ ہوائے نفس کی وکالت کرنے لگتی ہے۔ جس کے نتیجے میں اخلاقی قدریں تباہ و برباد ہو جاتی ہیں۔ عقلی مسلمات شکست وریخت کا شکار ہونے لگتے ہیں۔ اب جس پروردگار نے قدم قدم پر حیوان اور انسان کی راہنمائی فرمائی کیا یہ ممکن ہے کہ وہ انسان کو غلطان و پیچاں چھوڑ دے کہ وہ ہوائے نفس کا شکار ہو کر اپنی زندگی اور آخرت کو تباہ کرلے۔ قرآن کہتا ہے کہ اس پروردگار کی رحمت سے یہ بات یقیناً بعید ہے کہ وہ عقل کے بعد انسان کو کسی اور راہنمائی سے محروم فرمادے بلکہ قرآن ہمیں یہ بتاتا ہے کہ جس طرح وجدان کے بعد حواس کی رہنمائی پروردگار نے

عطا فرمائی اور حواس کے بعد عقل کی، اسی طرح اس نے اپنے ذمہ یہ بات لے رکھی ہے کہ عقل کے بعد زندگی کو رہنما سے محروم نہیں رکھے گا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس نے جابجا ان مراتب ہدایت کا ذکر کیا ہے۔ ارشاد فرمایا:

اِنَّا خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ مِنۡ نُّطۡفَةٍ اَمۡشَاجٍ نَّبۡتَلِيۡهِ فَجَعَلۡنٰهُ سَمِيۡعًۢا بَصِيۡرًا ۔ اِنَّا هَدَيۡنٰهُ السَّبِيۡلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوۡرًا ۔ (الدھر ۷۶: ۲۔۳)

(ہم نے انسان کو ملے جلے نطفے سے پیدا کیا جسے ایک کے بعد ایک، مختلف حالتوں میں پلٹتے ہیں۔ پھر اسے ایسا بنادیا کہ سننے والا، دیکھنے والا وجود ہو گیا۔ ہم نے اس پر راہ عقل کھول دی۔ اب یہ اس کا کام ہے کہ یا تو شکر کرنے والا ہو یا ناشکرا۔ یعنی یا تو اللہ کی دی ہوئی قوتیں ٹھیک ٹھیک کام میں لائے اور فلاح و سعادت کی راہ اختیار کرے یا ان سے کام نہ لے اور گمراہ ہو جائے)

اَلَمۡ نَجۡعَلۡ لَّهٗ عَيۡنَيۡنِ ۔ وَلِسَانًا وَّشَفَتَيۡنِ ۔ وَهَدَيۡنٰهُ النَّجۡدَيۡنِ ۔

(البلد ۹۰: ۸۔۹)

کیا ہم نے اسے ایک چھوڑ دو دو آنکھیں نہیں دے دی ہیں (جن سے وہ دیکھتا ہے) اور زبان اور ہونٹ نہیں دیئے ہیں (جو گویائی کا ذریعہ ہیں) اور کیا اس کو ہم نے (سعادت و شقاوت کی، دونوں راہیں نہیں دکھادیں؟)

وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمۡعَ وَالۡاَبۡصَارَ وَالۡاَفۡـِٕدَةَ ؕ قَلِيۡلًا مَّا تَشۡكُرُوۡنَ ۔ (السجدہ ۳۲: ۹)

(اور اللہ نے تمہارے لیے سننے اور دیکھنے کے حواس پیدا کر دیئے اور سوچنے کے لیے دل (یعنی عقل) تاکہ تم شکر گزار رہو (یعنی اللہ کی دی ہوئی قوتیں ٹھیک طریقہ پر کام میں لاؤ)

ان آیات اور ان کے ہم معنی آیات میں حواس اور مشاعر اور عقل و فکر کی ہدایت کی طرف اشارے کیے گئے ہیں، لیکن وہ تمام مقامات جہاں انسان کی روحانی سعادت و شقاوت کا ذکر کیا گیا ہے وحی و نبوت کی ہدایت سے متعلق ہیں۔ مثلاً

اِنَّ عَلَيۡنَا لَلۡهُدٰى ۔ ز وَاِنَّ لَنَا لَلۡاٰخِرَةَ وَالۡاُوۡلٰى ۔ (الیل ۹۲: ۱۲۔۱۳)

(بلاشبہ یہ ہمارا کام ہے کہ ہم راہنمائی کریں اور یقیناً آخرت اور دنیا دونوں ہمارے ہی لیے ہیں)

یعنی دنیا و آخرت کی ضرورتوں کے لیے رہنمائی ہماری ذمہ داری ہے۔

وَاَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى (حم السجدہ ۴۱:۱۷)

اور باقی رہی قوم ثمود، تو اسے بھی ہم نے راہ حق دکھلا دی تھی۔ لیکن اس نے ہدایت کی راہ چھوڑ کر اندھے پن کا شیوہ اختیار کیا)

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ط وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ۔ ع

(العنکبوت ۲۹:۶۹)

(اور جن لوگوں نے ہماری راہ میں جانفشانی کی تو ضروری ہے کہ ہم ان پر اپنی راہیں کھول دیں اور بلاشبہ اللہ ان لوگوں کا ساتھی ہے جو نیک عمل ہیں)

انسانی زندگی کی ضرورتیں جہاں کھانا پینا، اوڑھنا پہننا، لوگوں سے میل جول رکھنا، عناصر قدرت اور عناصر فطرت سے مستفید ہونا ہیں وہاں اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ یہ جانے کہ باہمی میل جول کے آداب کیا ہیں، خود میری زندگی کی حقیقت کیا ہے؟ میری زندگی کے کیا فرائض اور کیا حقوق ہیں؟ شائستگی اور دل بستگی کیا ہے؟ ان کے آداب کیا ہیں؟ دوسروں کے مجھ پر حقوق کیا ہیں؟ ہمسائیگی کیا ہے؟ اخوت و محبت کسے کہتے ہیں؟ ماں باپ کا احترام کیا ہے؟ علم کس چیز کا نام ہے اور اس کی حدود کیا ہیں؟ عورت اور مرد کا رشتہ کیا ہے اور اس کی نزاکتیں کیا ہیں؟ محرم کسے کہتے ہیں اور نا محرم کون ہے؟ عبادات کی حقیقت کیا ہے؟ یہ دنیا ہمیشہ رہے گی یا ختم ہو جائیگی؟ اس کا انجام فنا ہے یا بقاء ہے؟ کیا کوئی دوسری دنیا بھی ہے؟ تو اس کی حقیقت کیا ہے؟ کیا میں مرنے کے بعد ہمیشہ کے لیے فنا ہو جاؤں گا؟ یہ عالم برزخ کیا ہے؟ اور عالم آخرت کیا ہے؟ اللہ کی صفات کیسی ہیں؟ وہ اگر ہمارا مالک ہے تو وہ کن باتوں میں راضی ہے اور کن باتوں سے ناراض ہوتا ہے؟ قربانیوں کی حقیقت کیا ہے؟ آدمی ایک دوسرے کے لیے ایثار کرتا ہے تو اس کا صلہ کیا ہو گا؟ اخلاقی مسلمات کیا ہیں اور ان کی حقیقت کیا ہے؟ قوموں کے عروج وزوال کے اسباب کیا ہیں؟ روح کی حقیقت کیا ہے؟ یہ کن کاموں سے زندہ ہوتی ہے اور کن کاموں سے مر جاتی ہے؟ اور اسی طرح کے بیشمار سوالات ہیں جن کا جواب انسان کو ملنا چاہیے۔ مگر یہ امر واقعہ ہے کہ ان کا جواب نہ حواس کے پاس ہے اور نہ عقل کے پاس۔ اب اگر ہمیں اپنے محسوسات کی دنیا میں جوابات دینے کے لیے حواس و عقل کی راہنمائی دی گئی ہے تو کیا عالم ناسوت اور عالم ملکوت کی حقیقتوں کے لیے اور اپنی دنیا میں سر فرازی اور آخرت میں سرخروئی کے لیے اور اس آنکھ کے پردے

کے پیچھے کے حقائق کو جاننے کے لیے ہمیں کوئی راہنمائی نہیں دی جائے گی؟ اور ہم بے خبری میں غلط سلط فیصلے کرتے رہیں گے۔

یقیناوہ ذات جس نے چیونٹی تک کی ضرورتیں پوری کی ہیں وہ انسان کو اس سے بے خبر نہیں رکھ سکتی۔ چنانچہ اس نے حواس و عقل کے ذریعے کے بعد ہمیں ایک اور ذریعہ ء علم بھی بخشا جس کا نام وحی اور رسالت ہے اور اس وحی کے حاملین کو پیغمبر نبی یا رسول کہتے ہیں۔ اس ذریعہ سے انسانوں کو وہ سب کچھ بتایا گیا جو اس کی دنیوی، اخروی اور انفرادی اور اجتماعی زندگی کی ضرورت تھی۔ بلکہ اس ذریعہ علم کے ذریعے انسانوں کی دنیا بھی اور آخرت بھی تباہ ہونے سے بچالی گئی۔ تاریخی حقائق ہمارے سامنے ہیں کتنی قومیں اس صفحہ ہستی پر قوت کا نشان بن کر اٹھیں لیکن اپنی اخلاقی بے راہ روی اور غلط فیصلوں کے نتیجے میں اللہ کے عذاب کا نشانہ بنیں۔ آسمانی کتابوں نے جابجا اس تاریخ کو بیان کیا ہے تاکہ انسان اس بات کو سمجھے کہ انسانی بقاء کا دارومدار اس کی اخلاقی زندگی اور توانائی پر ہے۔ کیونکہ اخلاقی زندگی میں گراوٹ انسان کو انسان نہیں رہنے دیتی۔ بلکہ انسانیت سے تہی دامن کر دیتی ہے۔ وہ شرم وحیا سے عاری ہو کر کتوں، بلیوں کی سطح پر آجاتا ہے۔ رحم و مروت سے بے بہرہ ہو کر درندوں کی صف میں شامل ہو جاتا ہے۔ حرام و حلال سے بے گانہ ہو کر حشرات الارض کی جگہ نشے کی حالت میں گلی کوچوں میں پڑا دکھائی دیتا ہے۔ آخرت کی محبت سے محروم ہو کر اور حب دنیا کا اسیر بن کر بندہ درہم و دینار بن جاتا ہے۔ اس ناگفتہ بہ صورت حال سے بچنے کی ایک ہی صورت ہے کہ ہم اس ذریعہ علم کو پہچانیں جسے وحی الہٰی کہا جاتا ہے۔

چنانچہ اسی علم کی یافت اور اسی دولت کے حصول کے لیے ہمیں یہ دعا سکھائی گئی اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ۔ لا ہمیں سیدھی راہ دکھا۔ کیونکہ یہ وہ ہدایت ہے جس کا سررشتہ سراسر پروردگار کے ہاتھ میں ہے۔ کیونکہ اس ہدایت کا تعلق ان معاملات سے ہے جن کا حل کرنا فطری الہام حواس خمسہ اور عقل کے بس کا کام نہیں جس کی تفصیل ہم اس سے پہلے بیان کر چکے ہیں اور دوسری طرف انسانی زندگی کی ضرورت کا حال یہ ہے کہ وہ اس علم اور ہدایت کے بغیر چند قدم بھی سفر نہیں کر سکتی۔ دین اور دنیا دونوں میں کامیابی کی ضمانت اگر کوئی ہو سکتی ہے تو وہ صرف یہی راہنمائی اور ہدایت ہے اور مزید یہ بات بھی کہ یہاں جس ہدایت کے لیے دعا کی تلقین کی گئی ہے وہ صرف ذہنی یا عملی راہنمائی کے لیے ہی نہیں بلکہ قلب و ضمیر کی راہنمائی بھی ہے۔ انسانی عقل بڑے سے بڑا معجزہ بھی اگر سر کر ڈالے تو اس کا

تعلق یقیناً انسانی ذہن سے ہوتا ہے لیکن جہاں تک قلبی نور و بصیرت اور انسان کے احساسات کی تطہیر کا تعلق ہے اور قوت عمل میں افزونی اور قبولیت میں آسانی کا تعلق ہے جسے توفیق کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے یہ تو سراسر اللہ کے ہاتھ میں ہے اور یہ اس کے سوا کوئی عطا نہیں کر سکتا اور یہاں جس صراط مستقیم کی ہدایت کے لیے دعا مانگی جارہی ہے اس میں صرف صراط مستقیم کی عطا ہی شامل نہیں بلکہ اس کے لیے حالات کو ہموار کرنا توفیق عطا ہونا اور قبولیت کی امید پیدا ہونا یہ سب کچھ شامل ہے۔ ہدایت کی اس وسعت کو دیکھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتنی بڑی دولت ہے جو یقیناً اللہ ہی سے مانگی جاسکتی ہے اور وہی اس کا عطا کرنے والا بھی ہے۔ اس عظیم دولت کی تعبیر یہاں اس قدر سہل اور آسان بنا کے پیش کی گئی ہے کہ اس سے زیادہ آسان تعبیر کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ ہدایت کا لفظ بھی جانا پہچانا ہے اور صراط مستقیم بھی ایک آسان ترکیب ہے جو نہ صرف عربی زبان میں کثرت سے استعمال ہوتی ہے بلکہ اس کا مفہوم اور معنی تو ہر زبان میں بکثرت مستعمل ہے لیکن یہ دونوں لفظ چونکہ قرآن پاک کی اصطلاح بن چکے ہیں اس لیے قرآن پاک نے مختلف مقامات پر انھیں جن معنوں میں استعمال کیا ہے اس سے ایک مفہوم متعین کرنے میں آسانی ہو جاتی ہے اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ نہایت اختصار سے اس کی کسی حد تک وضاحت کر دیں۔

ہدایت کا مفہوم

ہدایت کا لفظ جس طرح راہنمائی کرنے، راہ دکھانے اور راہ پر لگا دینے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اسی طرح یہ منزل مقصود تک پہنچانے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ ایک مسافر جب کسی سے راستہ پوچھتا ہے تو راستہ بتانے والا کبھی تو اسے وہیں کھڑا کھڑا ہاتھ کے اشارے سے مختلف نشانات بتا کر راستے کو واضح کر دیتا ہے، اسے راستہ دکھانا اور عربی میں اراء الطریق کہتے ہیں اور دوسری صورت راستہ بتانے کی یہ ہوتی ہے کہ مسافر کا ہاتھ پکڑ کر اسے منزل تک پہنچا دیا جائے۔ اسے ایصال الی المطلوب کہتے ہیں۔ تیسری صورت یہ ہے کہ راستہ چلنے والا اپنی منزل کی دوری اور راستے کی دشواریوں کے باعث گھبرا اٹھتا ہے۔ بعض دفعہ سفر کے آغاز ہی کے لیے تیار نہیں ہوتا اور بعض دفعہ راستہ کی کٹھنائیاں دیکھ کر سفر کا ارادہ چھوڑ دیتا ہے اور ناکامی کا داغ لیے اپنے گھر کو لوٹ آتا ہے۔ ایسی صورت میں ضروری ہے کہ اس کے دل میں سفر کی امنگ پیدا کی جائے، راستہ کی دشواریوں کو سر کرنے کے لیے حوصلے کی دولت دی جائے اور

وہ سفر پر روانہ ہونے سے پہلے ذہن میں یہ بات بٹھالے کہ راہ کی سختیاں حقیقت میں سامان سفر ہوتی ہیں جس کے بغیر سفر کبھی ممکن نہیں ہوتا۔ طبیعت میں اس کیفیت کا پیدا کرنا کبھی تو قلبی نور و بصیرت کے ذریعے ہوتا ہے کہ دل میں ایک روشنی پیدا ہوتی ہے جس سے تمام تاریکیاں روشن ہو جاتی ہیں اور سفر کے آغاز کی ہمت ہو جاتی ہے اور کبھی دل میں حوصلے کی ایسی ترنگ اٹھتی ہے جو راہ کی سختیوں کو سفر کی سنت سمجھ کر برداشت کرنے کا شوق پیدا کرتی ہے، اسے اللہ کی توفیق سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ قرآن کریم نے تینوں معنوں میں ہدایت کے لفظ کو بار بار استعمال کیا ہے جب وہ کہتا ہے کہ قرآن کریم تمام جن وانس کے لیے ہدایت بن کر آیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ انھیں زندگی گزارنے کا وہ راستہ بتاتا ہے جس پر چل کر وہ اللہ کی خوشنودی حاصل کر سکتے ہیں اور جب وہ یہ بتاتا ہے کہ اصحاب کہف چند لڑکے بالے تھے جب وہ اللہ پر ایمان لے آئے اور پھر ایمان کے مطابق زندگی گزارنا، بت پرستوں کے دیس میں ان کے لیے مشکل ہو گیا اور دل ان کے ڈولنے لگے تو ہم نے ان کی ہدایت میں اضافہ کیا یعنی ان کے دلوں کو حوصلے سے باندھ دیا اور ان کے دلوں میں وہ استقامت اور اولوالعزمی پیدا کی جس کے نتیجے میں وہ آبادی چھوڑ کر غاروں کا راستہ اختیار کرنے پر تیار ہو گئے۔ یہ وہ دل کا نور اور بصیرت ہے جس نے ان کے لیے مشکلات آسان کر دیں اور کبھی قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ط (الروم: ۳۰۔۶۹) جو لوگ ہمارے راستے میں کوشش کرتے ہیں ہم ان کو اپنے راستوں کی توفیق دیتے ہیں یعنی ان کے راستے کی دشواریاں ہم ان کے لیے سہل بنا دیتے ہیں اور منزل انھیں اس حد تک محبوب ہو جاتی ہے کہ وہ اس کی طرف بڑھنا ان کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد بن جاتا ہے۔

اس تفصیل سے آپ کو یہ بات سمجھنے میں آسانی ہو جائیگی کہ سورۃ فاتحہ میں صراط مستقیم کی ہدایت کی جو دعا سکھائی گئی ہے وہ سب کے لیے ہے اس میں عوام بھی شامل ہیں اور خواص بھی حتیٰ کہ انبیائے کرام بھی اللہ سے ہمیشہ یہی دعا مانگتے رہے۔ اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بھی ہمیشہ نماز میں یہ دعا کیا کرتے تھے۔ اگر ہدایت کا ایک ہی مفہوم ہوتا تو یقیناً سب کے لیے مناسب نہ ہوتا۔ عوام کی دعا اور ہوتی اور خواص کی اور لیکن ہدایت کے ان مختلف مفاہیم کو دیکھ کر یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ ہر دعا مانگنے والا اپنے اپنے مقام و مرتبہ کے مطابق اللہ سے ہدایت مانگتا ہے۔ پھر دل کا نور اور بصیرت سب کے لیے یکساں نہیں ہوتی۔ ایک عامی کے لیے اس کے دل و دماغ کے مطابق فی الجملہ

اطمینان کافی ہے لیکن قربت خداوندی کے مسافروں کے لیے تو ہمت کے مطابق الگ الگ مقامات ہیں۔ کوئی ایک مقام پر پہنچ کر مطمئن ہو جاتا ہے تو دوسرا سالک اپنی منزل کو بہت دور سمجھتا ہے اس لیے وہ اگلے مقام کے لیے بے قرار رہتا ہے۔ اللہ کی توفیق سب کی دستگیری کرتی ہے۔ لیکن ہر ایک کو بقدر ہمت عطا ہوتی ہے۔ دل کا اطمینان دماغ کی آسودگی اور بندگی کا سوز و گداز اس دعا کے نتیجے میں سب کو ملتا ہے لیکن ہر ایک اپنے اپنے مقام و مرتبہ کے مطابق نوازا جاتا ہے صالحین صلاحیت عمل سے نوازے جاتے ہیں اولیاء و ولایت کے مرتبے سے اور انبیاء کرام نبوت کے مدارج اعلیٰ پر فائز کیے جاتے ہیں۔ اور پھر تمام انبیاء بھی یکساں مقام نہیں رکھتے۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد ہے کہ میں کبھی اپنے اللہ کے ساتھ ایسے قرب سے نوازا جاتا ہوں جہاں کسی مقرب فرشتے کا بھی گزر نہیں ہوتا۔

الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کا مفہوم

اِهْدِنَاالصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ میں ضمیر جمع کی ہے۔ حالانکہ ہر مانگنے والا واحد ہوتا ہے لیکن وہ اپنی دعا میں جمع کا صیغہ استعمال کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ہمیں صراط مستقیم کی ہدایت عطا فرما۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ میں تیرے چاہنے والوں کے قافلے کا ایک فرد ہوں۔ میری عاجزی میری بے بسی میری بے بضاعتی میری کم ہمتی پر پروردگار نظر نہ فرما بلکہ جب اس قافلے کے بڑے بڑے لوگوں پر رحمت کی برکھا برسے تو میں بھی اسی بارش سے نہال کیا جاؤں۔ سمندر کا قطرہ بھی سمندر میں رہ کر سمندر ہی ہوتا ہے۔ میں بے قدر و بے قیمت سہی لیکن بڑے لوگوں کے ساتھ تیری رحمت یقیناً مجھے ان کے ساتھ نوازنے میں بخل نہیں کرے گی۔

اس دعا میں صراط مستقیم کا لفظ بھی قابل غور ہے۔ صراط کے معنی راہ کے ہیں اور مستقیم کے معنی سیدھا ہونے کے۔ پس صراط مستقیم ایسی راہ ہوئی جو سیدھی ہو کسی قسم کا پیچ و خم نہ ہو۔ اللہ کے دین کے لیے اس سے بہتر تعبیر ممکن نہیں۔ کیونکہ جب بھی آدمی کسی منزل پر پہنچنے کے ارادے سے نکلتا ہے تو اس کی سب سے پہلے کوشش یہ ہوتی ہے کہ میں ایسا راستہ اختیار کروں جو سیدھا منزل تک جاتا ہو۔ کیونکہ سیدھی راہ ہی ہمیشہ مختصر ہوتی ہے اور بالآخر وہی شاہراہ عام کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ جتنے غلط راستے ہوتے ہیں وہ ہمیشہ طویل اور ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈیوں پر مشتمل

ہوتے ہیں۔ اس لیے دنیا کی ہر زبان میں ہمیشہ صحیح بات اور صحیح طرز عمل کو مستقیم سے تعبیر کیا گیا ہے۔ کیونکہ انسان کے فکر و عمل کا کوئی گوشہ ہو صحت و درستگی کی راہ ہمیشہ وہی ہو گی جو سیدھی راہ ہو، جہاں انحراف اور کجی پیدا ہوئی نقص و فساد ظہور میں آ گیا۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی تمام زبانوں میں سیدھا ہونا اور سیدھی چال چلنا فلاح و سعادت کے معنی میں عام طور پر بولا جاتا ہے گویا اچھائی کے معنی میں یہ ایک ایسی تعبیر ہے جو تمام نوع انسانی کی عالم گیر تعبیر کہی جا سکتی ہے۔

حضرت مسیح کے چار سو برس پہلے دارایوش اول نے جو فرامین کندہ کرائے تھے ان میں سے بے ستون کا کتبہ آج تک موجود ہے۔ اور اس کا خاتمہ ان جملوں پر ہوتا ہے (اے انسان! ہورامزدا کا (یعنی خدا کا) تیرے لیے حکم یہ ہے کہ برائی کا دھیان نہ کر سیدھا راستہ نہ چھوڑ گناہ سے بچتا رہ) خود پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بھی حقیقت کی وضاحت کے لیے یہی تعبیر اختیار فرمائی۔

عن ابن مسعود قال خط لنا رسول الله (صلى الله عليه وآله وسلم) بيده ثم قال هذا سبيل الله مستقيما ثم خط خطوطا عن يمين ذلك الخط وعن شماله ثم قال هذه السبيل ليس منها سبيل الا عليه شيطان يدعو اليه ثم قرء هذه الاية (اخرجها لنسائی و احمد و البزار و ابن منذر و ابو الشيخ و الحاكم وصحه)

(عبداللہ بن مسعود کہتے ہیں، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنی انگلی سے ایک لکیر کھینچی اور فرمایا کہ یہ اللہ کا ٹھہرایا ہوا راستہ ہے، بالکل سیدھا اس کے بعد اس لکیر کے دونوں طرف بہت سی ترچھی لکیریں کھینچ دیں، اور فرمایا یہ طرح طرح کے راستے ہیں جو بنا لیے گئے ہیں، اور ان میں کوئی راستہ نہیں جس کی طرف بلانے کے لیے ایک شیطان موجود نہ ہو۔ پھر یہ آیت پڑھی)

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِىْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ (الانعام ۶:۱۵۳)

مزید ہم دیکھتے ہیں کہ الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ پر الف لام عہد کا ہے اس سے یہ اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ اس صراط مستقیم سے ہر سیدھا راستہ مراد نہیں بلکہ کوئی خاص راستہ ہے جس کی طرف یہاں اشارہ کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ بعد کے الفاظ میں اس اشارے کو کھول دیا ہے۔ البتہ صراط مستقیم کے لفظ میں اس راستے پر چلنے والوں کو یہ خوشخبری سنائی ہے

کہ تم اس راستے پر چلنے سے پہلے گھبرانہ جانا۔ کیونکہ یہ راستہ سیدھا راستہ ہے اور سیدھے راستے کبھی دشوار نہیں ہوتے وہ تمام راستوں میں قریب تر اور سہل تر ہوتے ہیں۔ لیکن اس کو واضح کرنے کے لیے فرمایا کہ یہ ان لوگوں کا راستہ ہے جن پر اللہ نے انعام کیا۔ ان لوگوں کا راستہ نہیں جن پر غضب ہوا یا وہ گمراہ ہوئے۔ اس میں متعدد باتیں قابل غور ہیں۔ سب سے پہلی بات یہ کہ دعا مانگنے والا جو اس وضاحت سے صراط مستقیم کی دعا مانگ رہا ہے کیا وہ یہ سمجھ رہا ہے کہ اگر اس نے یہ وضاحت نہ کی تو اللہ تعالیٰ شاید اس کی دعا کو پوری طرح سمجھ نہ سکے کوئی بھی اس راستے کا مسافر ایسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہو سکتا۔ تو پھر اس وضاحت کا کیا مقصد ہو سکتا ہے؟ معمولی سے تدبر سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دعا مانگنے والا اس وضاحت سے اپنے شوق اور وارفتگی کا اظہار کر رہا ہے۔ اور اس کا بے قرار دل عبادت کے جذبے سے سرشار اس راستے کی تلاش میں بے چین ہو رہا ہے جس پر چل کر وہ اپنی زندگی کو شریعت کے مطابق گزار سکتا ہے اور اللہ کی رضا کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ اور وہ جلد از جلد ان بڑے لوگوں کے قافلے میں شریک ہونا چاہتا ہے جو اس صراط مستقیم پر چلنے میں کامیاب ہوئے اور اللہ کے انعام کے مستحق ٹھہرے۔ وہ اپنی کمزوریوں اور ناتوانیوں کو دیکھتے ہوئے ان انعام یافتہ بندوں میں شامل ہونا چاہتا ہے تاکہ ان کی قربت اور ان سے نسبت اس کی کوتاہیوں کی تلافی کر دے۔ اور غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ۔ ؏ (الفاتحہ:۷) کہہ کر اپنی بے زاری اور نفرت کا اظہار ان لوگوں سے کر رہا ہے جنھوں نے صراط مستقیم پر چلنے سے انکار کر دیا یا اس سے بھٹک گئے اور اس طرح وہ اللہ کے غضب کا شکار ہوئے۔ اس طرح وہ اپنے لیے استقامت واستواری کی دعا کرتا ہے۔ اور ان لوگوں سے بچنے کی توفیق مانگتا ہے جو اس صراط مستقیم سے بے گانہ یا افراط و تفریط کا شکار ہیں۔

(تفسیر روح القرآن۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی)

اہل علم نے ہدایت کے مدارج کی بہت سی قسمیں بیان فرمائی ہیں لیکن بنیادی طور پر اس کی چار اقسام ہیں:

1 طبعی اور فطری ہدایت 2 الہامی ہدایت 3 توفیقی ہدایت 4 ہدایت وحی۔

طبعی اور فطری ہدایت

چاند، سورج اور سیارے طبعی رہنمائی کے مطابق اپنے مدار میں رواں دواں ہیں۔ ہوائیں اسی اصول کی روشنی میں رخ بدلتی اور چلتی ہیں۔ بادل فطری رہنمائی سے ہی راستے تبدیل کرتے اور برستے ہیں حتیٰ کہ اسی اصول کے تحت درخت روشنی کی تلاش میں ایک دوسرے سے اوپر نکلتے ہیں۔ فطری ہدایت کے مطابق ہی مرغی کا بچہ انڈے سے نکلتے ہی ماں کے قدموں میں پڑ جاتا ہے، بطخ کا بچہ خود بخود پانی کی طرف چلتا اور انسان کا نومولود ماں کی چھاتی کے ساتھ چمٹتا ہے۔

اس طبعی اور فطری ہدایت کی قرآن نے اس طرح رہنمائی فرمائی ہے:

(وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ۔)[البلد:۱۰]

”ہم نے اسے دو واضح راستے دکھا دیئے۔“

الہامی ہدایت

الہام وحی کی ایک قسم ہے لیکن وحی اور الہام میں فرق یہ ہے کہ وحی صرف انبیاء کے ساتھ خاص ہے جب کہ الہام انبیاء کے علاوہ نیک اور عام آدمی حتیٰ کہ قرآن مجید نے شہد کی مکھیوں کے لیے بھی وحی یعنی الہام کا لفظ استعمال فرمایا ہے جس کا معنٰی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کے دل میں کوئی بات القا فرما دیتا ہے۔ اسے ہدایت وہبی بھی کہا جاتا ہے۔

ہدایت بمعنٰی توفیق اور استقامت

ہدایت کی تیسری قسم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی عنایت اور توفیق سے اپنے بندے کی رہنمائی کرتے ہوئے اسے صراط مستقیم پر گامزن رہنے کی توفیق عطا فرما دے۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اکثر یہ دعا کرتے تھے۔

(يَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ ثَبِّتْ قَلْبِيْ عَلٰى دِيْنِكَ) (رواہ الترمذی: کتاب الدعوات)

”اے دلوں کو پھیرنے والے! میرے دل کو اپنے دین پر ثابت رکھنا۔“

(اَللّٰھُمَّ اَلْھِمْنِیْ رُشْدِیْ وَأَعِذْنِیْ مِنْ شَرِّ نَفْسِیْ)

(رواہ الترمذی: کتاب الدعوات، باب ماء فی جامع الدعوات)

"اے اللہ! میری راہنمائی فرما اور مجھے میرے نفس کے شر سے محفوظ فرما۔"

وحی اور حقیقی ہدایت

یہ بات اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ اس ہدایت کی دو شکلیں ہیں اور دونوں آپس میں لازم وملزوم اور ضروری ہیں۔ ایک ہدایت ہے ہر نیکی کی ظاہری حالت اور اس کی ادائیگی کا طریقہ جو ہر حال میں سنت نبوی کے مطابق ہونا چاہیے۔ دوسری اس کی روح اور اصل۔ اسے قرآن نے اخلاص سے تعبیر فرمایا ہے۔

اخلاص کے اثرات دل پر اثر انداز ہوں گے تو اللہ تعالیٰ کی قربت حاصل ہو گی جس کا بدلہ جنت ہے۔ کردار پر مرتب ہوں گے تو نفس اور معاشرے میں پاکیزگی پیدا ہو گی جس سے آدمی کو دنیا میں نیک نامی اور کامیابی حاصل ہو گی۔ بندہ اللہ کے حضور ہاتھ باندھے، نظریں جھکائے، نہایت عاجزی اور بے بسی کے عالم میں عرض کرتا ہے۔ میرے خالق ومالک! میں تیری بارگاہ میں عرض گزار ہوں کہ میں دنیا کی رزم گاہ میں کمزور اور ناتواں ہوں۔ میرا دشمن بڑا ذلیل، طاقتور، عیّار اور چالاک ہے جو چاروں طرف سے اپنے لشکروں کے ساتھ ہر آن مجھ پر حملہ آور ہو رہا ہے۔ اور میں اسے دیکھ بھی نہیں سکتا۔ وہ ہر دم مجھے پھسلانے کے درپے ہے۔ تیری دست گیری اور رہنمائی کے بغیر نہ میں اس کا مقابلہ کر سکتا ہوں اور نہ ہی سیدھی راہ پر گامزن رہ سکتا ہوں۔ دنیا کے گھٹاٹوپ اندھیروں، مسائل کے طوفانوں اور مشکلات کے جھگڑوں میں میری عاجزانہ درخواست ہے کہ مجھے لحہ لحہ اور قدم قدم پر صراط مستقیم کی رہنمائی اور اس پر ثابت قدمی کی توفیق نصیب فرما۔

مومن اپنے ساتھ دوسروں کے لیے بھی ہدایت اور مدد کا طالب ہوتا ہے تاکہ ایک فرد کی بجائے ہدایت یافتہ لوگوں کا ایک قافلہ اور کارواں ہو تاکہ شیطانی لشکروں کا مقابلہ کرنا اور غلبہ دین آسان ہو جائے۔

اللہ تعالیٰ نے رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو گفتگو کا ملکہ اور ایسا معجزانہ اسلوب عنایت فرمایا تھا جو بنی نوع انسان میں کسی کو نہ حاصل ہوا نہ ہو گا۔ آپ نے بڑے بڑے پیچیدہ مسائل چند الفاظ اور انتہائی سادہ انداز میں بیان

فرما دیے ہیں۔ لیکن صراط مستقیم کی اہمیت اور افادیت کے پیش نظر اس مسئلہ کو ایک نقشہ کے ذریعے سمجھانے کا طریقہ اختیار فرمایا تاکہ کوئی ابہام باقی نہ رہے۔

(عَنْ عَبْدِاللّٰہِ(رض) قَالَ خَطَّ رَسُوْلُ اللّٰہِ(صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) خَطًّا بِیَدِہٖ ثُمَّ قَالَ ھٰذَا سَبِیْلُ اللّٰہِ مُسْتَقِیْمًا قَالَ ثُمَّ خَطَّ عَنْ یَّمِیْنِہٖ وَشِمَالِہٖ ثُمَّ قَالَ ھٰذِہِ السُّبُلُ وَلَیْسَ مِنْھَا سَبِیْلٌ إِلَّا عَلَیْہِ شَیْطَانٌ یَدْعُوْ إِلَیْہِ ثُمَّ قَرَأَ (وَاَنَّ ھٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْہُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ)

(مسند احمد: کتاب مسند المکثرین من الصحابۃ، باب مسند عبداللہ بن مسعود)

”حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) بیان کرتے ہیں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنے ہاتھ سے ایک لکیر کھینچی پھر فرمایا یہ اللہ کا سیدھا راستہ ہے پھر اس کے دائیں اور بائیں خط کھینچ کر فرمایا یہ راستے ہیں۔ ان میں ہر ایک پر شیطان کھڑا ہے اور وہ اس کی طرف بلاتا ہے پھر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس آیت کی تلاوت کی (بے شک یہ میرا سیدھا راستہ ہے اسی پر چلتے رہنا اور پگڈنڈیوں پر نہ چلنا۔“

قرآن مجید نے اس راستے کو نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا راستہ قرار دیا اور اسے بصیرت سے تعبیر کیا ہے۔

(قُلْ ھٰذِہٖ سَبِیْلِیْٓ أَدْعُوْٓا إِلَی اللّٰہِ عَلٰی بَصِیْرَۃٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِیْ) (یوسف:۱۰۸)

”آپ فرما دیجئے یہ میرا راستہ ہے میں اور میرے پیروکار بصیرت کی بنیاد پر اللہ کی طرف بلاتے ہیں۔“

(عَنِ الْعِرْبَاضِ بْنِ سَارِیَۃَ (رض) یَقُوْلُ وَعَظَنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ(صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مَوْعِظَۃً ذَرَفَتْ مِنْھَا الْعُیُوْنُ وَوَجِلَتْ مِنْھَا الْقُلُوْبُ فَقُلْنَا یَارَسُوْلَ اللّٰہِ إِنَّ ھٰذِہٖ لَمَوْعِظَۃُ مُوَدِّعٍ فَمَاذَا تَعْھَدُ إِلَیْنَا قَالَ قَدْ تَرَکْتُکُمْ عَلَی الْبَیْضَاءِ لَیْلُھَا کَنَھَارِھَا لَا یَزِیْغُ عَنْھَا بَعْدِیْ إِلَّا ھَالِکٌ مَنْ یَّعِشْ مِنْکُمْ فَسَیَرٰی اخْتِلَافًا کَثِیْرًا فَعَلَیْکُمْ بِمَا عَرَفْتُمْ مِنْ سُنَّتِیْ وَسُنَّۃِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِیْنَ الْمَھْدِیِّیْنَ عَضُّوْا عَلَیْھَا بِالنَّوَاجِذِ وَعَلَیْکُمْ بِالطَّاعَۃِ وَإِنْ عَبْدًا حَبَشِیًّا فَإِنَّمَا الْمُؤْمِنُ کَالْجَمَلِ الْأَنِفِ حَیْثُمَا قِیْدَ انْقَادَ) [رواہ ابن ماجۃ: کتاب المقدمۃ، باب اتباع سنۃ الخلفاء الراشدین المھدیین]

”حضرت عرباض بن ساریہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ ہمیں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایسا وعظ فرمایا جس سے آنکھیں بہہ پڑیں اور دل ڈر گئے ہم نے کہا اللہ کے رسول یقیناً یہ تو الوداعی وعظ لگتا ہے لہٰذا آپ ہمیں کیا حکم

دیتے ہیں؟ آپ نے فرمایا میں تمہیں واضح دین پر چھوڑ کر جا رہا ہوں جس کی رات بھی دن کی مانند ہے ہلاک ہونے والے کے علاوہ کوئی اس سے نہیں ہٹے گا تم میں سے جو زندہ رہے گا عنقریب وہ بہت سے اختلاف دیکھے گا۔ تم پر جو میرا اور میرے صحابہ کا طریقہ پر چلنا لازم ہے اسے داڑھوں کے ساتھ مضبوطی سے پکڑنا اور امیر کی اطاعت کرتے رہنا اگرچہ وہ حبشی ہی کیوں نہ ہو۔ مومن نکیل والے اونٹ کی طرح ہوتا ہے اسے جہاں بھی لے جایا جائے وہ جاتا ہے۔"

(تفسیر فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل)

اھدنا الصراط المستقیم۔ یعنی چلا ہمیں سیدھا راستہ "یہاں یہ بات سمجھنا ضروری ہے کہ ہر شخص بعض امور میں راہ راست پر ضرور چلتا ہے۔ لیکن باوجود اس کے اسے طلب راہ راست کے بغیر چارہ نہیں اس لیے کہ ہر مرتبہ کمال کے بعد اس سے بالاتر مرتبہ ضرور ہوتا ہے تو جو نیچے درجہ کے مرتبہ پر ہے وہ لازمی طور پر اس سے اونچے درجہ کی راہ کا متلاشی رہے گا۔ بہ قول جامی علیہ الرحمۃ

مصلحت نیست مرا سیری ازاں آب حیات

ضاعف اللہ بہ کل زمان عطشی

(اس آب حیات سے سیر ہو جانا مصلحت کے خلاف ہے۔ اللہ ہر وقت اس کے ساتھ میری پیاس کو بڑھاتا رہے)

تو یہ ترقی الی غیر النہایہ ہے اور استقامت راہ بھی چند وجوہ پر ہوتی ہے۔ اول قرب راہ اس لیے کہ نزدیک راستہ لازماً راہ راست ہو گا بہ نسبت دور کے راستہ کے۔ دوسرے صفائی راہ اس راہ سے بہترین و مستقیم ہو گی جس میں پتھر روڑے اور کانٹے ہوں اور اسی معنی میں سعدی نے کہا۔ "راہ راست بروا گرچہ دوراست"۔

تیسرے اس راستہ سے جو پر خطر ہو جس میں راہزن اور درندے ہوں یا جس راستہ میں آب و دانہ میسر نہ آئے وہ راستہ صراط مستقیم نہ مانا جائے گا اور جس میں امن ہو۔ آب و دانہ میسر آئے راہزنوں سے بے خوفی دامن ہو وہ صراط مستقیم ہے۔ بہرحال ہر سہ پہلو کے ماتحت راہ راست میں وصول بہ مطلوب شرط اول ہے۔ اگرچہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ہر ایک کسی نہ کسی پہلو سے راہ راست پر ہوتا ہے لیکن راہ راست پر ہوتے ہوئے بھی کسی نہ کسی قسم کی راہ راست اس کے

لیے لازم ہو گی۔ یعنی اگر وہ طے مراحل میں راہ راست پر ہے تو علائق نفسانیہ سے علیحدہ ہو کر ذکر و استغراق کی راہ حاصل کرنا ضروری ہو گی۔ تاکہ مشاہدہ میں اقرب ہو اور راہ عبادت و فکر اور درایت فی النفس عن اتباع شریعت کی راہ پر چل کر ہر قسم کے توسوسات سے مصون و مامون رہے اور راہبانیت کی راہ پر خسارے سے بھی بچا رہے۔ اسی وجہ سے استقامت کو تین قسم پر منقسم کیا ہے۔

استقامت اقوال۔

استقامت افعال۔

استقامت احوال۔

اس سے یہ امر اظہر من الشمس ہو جاتا ہے ہر سہ استقامت سے اگر ایک استقامت حاصل ہو جائے تو دو استق امتوں کا بہر حال محتاج رہے گا۔ تو راہ راست کی طلب سے کوئی مبتدی ہو یا منتہی یا متوسط مستغنیٰ نہیں لہٰذا بندہ کا فرض ہے کہ بوقت مناجات **اھدنا الصراط المستقیم** کہہ کر ہر قسم کے افراط و تفریط سے اجتناب رکھے۔ افراط و تفریط عقائد میں بھی ہو سکتی ہے اور اعمال میں بھی۔ عقائد میں تو یہ کہ رب جل مجدہ و عز اسمہ سے کسی کی تشبیہ جائز رکھے اور اپنے معبود کو مخلوق کے رنگ میں پیش کرے اس کے لیے مکان اور جہت ثابت کرنے لگے اس کی ذات کو محتاج اسباب مانے۔ یہ مذہب اسلام میں بالکل باطل ہے۔ ایسے ہی اعمال کی شکل میں افراط و تفریط کہ نوافل میں اتنی کثرت کرے کہ دوامی اس پر عمل پیرا نہ رہ سکے۔ اسی بنا پر حضور کا ارشاد ہے **خیر الاعمال مادام علیہ صاحبھا** (بہترین عمل وہ ہے جس پر عامل ہمیشگی کرے) و قس علی ہذا۔ یہی وجہ ہے کہ اھدنا الصراط المستقیم کے ساتھ **صراط الذین انعمت علیھم** کی بھی تصریح فرمادی۔ یعنی صراط مستقیم میرے گمان و خیال والی نہیں بلکہ وہ راہ جس راہ پر چلنے والوں پر تو نے انعام فرمایا۔ اس کی وضاحت دوسری جگہ قرآن کریم میں ہے کہ

منعم علیہم چار فرقے ہیں۔ انبیاء علیہم السلام، صدیق، شہید، صالح رحمہم اللہ۔

اس سے واضح ہو گیا کہ راہ راست ان چار فرقوں کی راہ ہے۔ بندہ کو چاہیے کہ دعا مناجات کے وقت اپنے رب سے ان چار فرقوں کی راہ طلب کرے۔ چنانچہ سورۃ نساء میں ان چار کی یوں تصریح فرمائی گئی۔

ومن یطع اللہ و الرسول فاؤلیك مع الذین انعم اللہ علیھم من النبیین و الصدیقین و الشھداء و الصلحین وحسن اولیك رفیقا ۔ یعنی جو اطاعت اللہ ورسول کرے اور ان کے فرمان واحکام پر عمل پیرا رہے وہ ان لوگوں کے ساتھ محشور ہو گا جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا۔ نبیوں، صدیقوں، شہیدوں اور صالحوں سے اور یہ گروہ اچھا رفیق ہے۔

تو اھدنا الصراط المستقیم میں راہ حق کی جستجو ہے اور صراط الذین انعمت علیھم میں طلب رفیق راہ ہے جیسا کہ مقولہ ہے الرفیق ثم الطریق پہلے رفیق تلاش کر پھر راستہ پر چل۔

یہاں یہ سمجھ لینا بھی ضروری ہے کہ

عامہ مومنین کو رفاقت صلحاء رحمہم اللہ لازم ہے۔

اور صالحین کو رفاقت شہداء رحمہم اللہ لازم ہے۔

اور شہداء کو رفاقت صدیقین رحمہم اللہ لازم ہے۔

اور صدیقین کو رفاقت انبیاء کرام (علیہم السلام) لازم ہے۔ اور اگر کسی کو عامہ مومنین سے یہ خواہش ہو جائے کہ رفاقت انبیاء کرام (علیہم السلام) طلب کرے اسے درجہ بدرجہ ان تین کی رفاقت ناگزیر ہے۔

جیسے اگر کوئی بادشاہ تک رسائی چاہے تو وزراء حکومت کے بغیر اسے یہ رسائی ناممکن ہے۔ تو اس تقریر سے واضح ولائح ہو گیا کہ ہر درجہ، درجہ بدرجہ حاصل ہو تا ہے۔ اسی طرح طریق اہل اللہ میں داخلہ بلا توسل اولیاء رحمہم اللہ ممکن نہیں اور یہ اسلام واہل سلام میں محمود و پسندیدہ ہے۔ چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ اصل راہ عالم غیب سے انبیاء کرام (علیہم السلام) کو تعلیم کی گئی۔ اور انبیاء کرام (علیہم السلام) سے صدیقان خاص رحمہم اللہ کو یہ تعلیم ملی۔

اور صدیقین سے شہداء رحمہم اللہ کو اور شہداء سے صالحین رحمہم اللہ تک پہنچی۔ تو لازم آیا کہ اول معرفت انبیاء (علیہم السلام) حاصل ہو۔ اس کے بعد ان تین گروہ کی معرفت حاصل کی جائے تاکہ طالب کو ان کی رفاقت حاصل ہو جائے۔ اب یہ بھی سمجھ لیں کہ نبی (علیہ السلام) کی حقیقت کیا ہے۔ ارباب کلام بتاتے ہیں کہ نبی (علیہ السلام) ایک ایسا انسان ہے جو قوت نظری سے اشیاء کو جان لیتا ہے اور قوت عملی کے ذریعہ نیک کردار اس سے صادر ہوں۔ اور یہ ایسا انسان ہے کہ بلاواسطہ تربیت بشری کو کامل کر کے تاثیر نورالقدس سے اسے ایسے ظاہر ہو کہ واہمہ غلطی اور

شائبہ اشتباہ اس کی معلومات میں قطعانہ رہے وہ عام انسانوں سے ممتاز ہوتا ہے جس میں شائبہ غفلت اور توسوس ہوتا ہے نبی (علیہ السلام) اس سے منزہ ہوتا ہے۔ اس کی قوت عملیہ میں وہ ملکہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کی وجہ سے وہ اعمال صالحہ کی طرف بکمال رغبت مائل رہتا ہے اور اعمال بد سے اسے کمال تنفر ہوتا ہے بلکہ خود اس سے محفوظ و مصون ہوتا ہے۔ جب اس کے قوائے بدنی کمال کو پہنچ جاتے ہیں اور عقل تجربی اس کی منتہا کو پہنچ جاتی ہے تو اسے تکمیل خلق کے لیے مبعوث کیا جاتا ہے۔ پھر اس کی تصدیق معجزات کرتے ہیں۔ اور یہ معجزہ کبھی از جنس اقوال ہوتا ہے جیسے قرآن کریم۔ اور کبھی از جنس فعل ہوتا ہے جیسے انگشتہائے مبارک سے پانی جاری کر دینا، ڈوبے سورج کو واپس لانا، چاند کے دو ٹکڑے کر دینا، نکلی ہوئی آنکھ تندرست کر دینا، ٹوٹی پنڈلی جوڑ دینا وغیرہ وغیرہ۔ پھر ان معجزات کے ساتھ آیات عقلیہ بھی دی جاتی ہیں تاکہ عوام و خواص کے ایمان کا موجب ہو۔ چنانچہ معجزہ تحیر میں ڈالنے والا نہیں ہوتا بلکہ موجب ایمان عوام بھی ہوتا ہے۔ پھر یہ آیات عقلیہ چند قسم پر ہوتی ہیں۔ منجملہ ان کے اخلاص کریمہ اور علوم صادقہ بیان شافی حجت واضح انوار صحبت جیسے نیچے درجے والے معجزات سے استدلال کرتے ہیں ارباب کمال کمالات نبوت سے استدلال کرتے ہیں علی الخصوص معالجہ امراض روحانیہ اور تکمیل نفوس ناقصہ اور فیضان اشعہ انوار حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے صحابہ علیہم رضوان مشاہدہ کر کے یقین جازم ان کی نبوت کا حاصل کرتے ہیں یہ مختصر تعریف نبی (علیہ السلام) کی ہے۔ ایسے ہی صدیق کی شناخت یہ ہے کہ اس کی قوت نظریہ مثل قوت نظریہ انبیاء (علیہم السلام) کامل ہوتی ہے۔ اور ابتداء عمر سے جھوٹ بولنا، دوغلی باتیں کرنا اس کی شایان شان نہیں ہوتا اور مقدمات دین میں اس کے اخلاق تام ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ حظ نفس ان میں بھی نہیں ہوتا اور اس کا نفس اصلاح پذیر ہوتا ہے اور صدیق کی علامتوں میں سے یہ بھی ایک علامت ہے کہ اپنا عزم وارادہ بلاتر دد رکھے۔ اور نماز میں جو بھی حادثہ پیش آئے تو چپ وراست التفات نہ کرے۔ اور خفیہ وعلانیہ یکساں رہے اور کسی پر لعن طعن کرنے سے مجتنب رہے۔ اور علم تعبیر ورویا کا خوب عالم ہو۔ اور شہید وہ ہے کہ اس کا قلب مشاہدہ میں متحقق ہو اور انبیاء کرام (علیہم السلام) جو کچھ اسے پہنچائیں اس کے قبول میں کسی نہج سے انکار نہ کرے۔ حتیٰ کہ جان دینے میں امر دین کے لیے اسے اصلاً عذر نہ ہو۔ اور صالح وہ ہے جس کی قوت نظری و عملی مرتبہ کمال انبیاء (علیہم السلام) سے پست تر ہو لیکن بسبب کمال متابعت اپنا ظاہر معاصی سے پاک رکھے اور اس کا باطن اعتقادات فاسدہ اور اخلاق ذمیمہ سے پاک ہو۔ اور یاد الٰہی سے اس کا دل اتنا مملو ہو کہ

اس میں کسی دوسری چیز کی گنجائش ہی نہ رہے۔ اور ولی ہر چند کہ ان تین گروہ میں شامل ہے لیکن ولی صالحین سے زیادہ ہوتا ہے اس لیے کہ ولی وہ ہے جس میں مذکورہ چاروں افراد کی صفتیں ہوں اور سب سے بڑی علامت اس کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے محبوب رکھے اور اس کی روزی کا کفیل ہو اور لوگوں کے دلوں میں اس کی محبت عام ہو ان الذین امنوا وعملوا الصلحت سیجعل لھم الرحمن ودا۔ بیشک جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے اللہ تعالیٰ ان کے لیے محبت رکھ دیں گے۔

"غیر المغضوب علیھم ولا الضالین۔ نہ راستہ ان کا جن پر تیرا غضب ہوا اور نہ گمراہوں کا"۔

ان جملوں میں گویا یہ تعلیم دی گئی کہ طلب راہ مستقیم میں احتیاط کرنی چاہیے اور گمراہوں اور مغضوبوں کو جو بزعم خود اپنے کو باریاب راہ مستقیم سمجھتے اور انبیاء (علیہ السلام) واولیاء رحمہم اللہ کے طریق مستقیم کو نہیں سمجھتے بلکہ ان کے راہ مستقیم سے احتراز کرتے ہوئے طریق باطل کو منظور کئے ہوئے ہوں۔ ان سے اپنے کو بچانے کے لیے بارگاہ حق میں دعا کرتے رہیں۔ یہاں یہ امر بھی سمجھ لینا ضروری ہے کہ غضب آدمی میں کس کیفیت کا ہوتا ہے اور حق تعالیٰ شانہ کا غضب کس کیفیت کا ہوتا ہے خالق و مخلوق کے غضب کی نوعیت علیحدہ علیحدہ ہے۔ آدمی میں جو غضب ہوتا ہے وہ ایک کیفیت ہے جو دل میں خون کے جوش سے شروع ہوتی ہے اور اس جوش کو روح حیوانی قہریت و مکروہات خارج کرنے کی طرف متوجہ ہوتی ہے یہ کیفیت غضب رب الارباب جل وعلاء شانہ کی نہیں۔ بلکہ غضب الٰہی کی حقیقت یہ ہے کہ مغضوب کے حق میں اسباب حکمت کا افاضہ روک دے تاکہ وہ منزل مقصود تک نہ پہنچ سکے اور اس غضب کا مبدا کفران نعمت ہے جیسا کہ ارشاد ہے ولین کفرتم ان عذابی لشدید۔ (اور اگر تم ناشکری کروگے تو میرا عذاب بڑا سخت ہے) اور اس کا اثر لعنت و مذمت ہے جس کا مقابلہ رضا سے ہے جس کی حقیقت اسباب حکمت کا پہنچانا ہے تاکہ بندہ منزل مقصود تک پہنچ سکے اس کا مبداء شکر ہے کما قال تعالیٰ لین شکر تم لازیدنکم (اگر تم شکر کروگے تو میں تمہیں زیادہ دوں گا) اس کا اثر ثناء وعطا ہے۔ اور ضلال کی تعریف یہ ہے کہ ایسا راستہ اختیار کرے جس کے ذریعے مطلوب تک نہ پہنچ سکے اور گمراہی کبھی بسبب غفلت ہوتی ہے کہ دنیاوی لذتیں غالب آجاتی ہیں اور لذات روحانیہ نظر انداز ہو جاتی ہیں اور کبھی نفس امارہ خواہشات کی طرف مائل کر دیتا ہے اور یہ غلط فہمی پیدا ہو جاتی ہے کہ دنیا دنو

سے ہے۔ یہاں کے منافع نقد ہیں اور آخرت موخر ہے تو ادھار کے مقابل نقد سودا اچھا ہے حالانکہ یہ غلط ہے اس لیے کہ دس روپے ادھار ایک نقد سے بہتر ہیں بشرطیکہ اس ادھار کی وصولی کا یقین ہو تو من جاء بالحسنة فله عشر امثالها۔ (جو ایک نیکی لائے گا تو اسے دس گنا ملے گا) میں اخروی ادھار دس گنا وصولی پر ہے اور اس کے وصول کا یقین ہونا انبیاء کرام (علیہم السلام) اور اولیاء عظام اور علماء ذوی الاحترام رحمہم اللہ کی زبان سے ہے۔

اس پر منکرین مجرمین بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس پر ہمیں یقین نہیں۔ ہمارا تو ان وعدوں پر یہی کہنا ہے کہ ماوعدنا اللہ و رسولہ الا غرورا۔ (ہم سے اللہ اور اس کے رسول نے صرف دھوکے کا وعدہ کیا) تو ہم اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ دنیا میں اہل دنیا پر تقلید انبیاء (علیہم السلام) و اولیاء رحمہم اللہ لازم ہے اگرچہ ان کے ہاں براہین میں شک ہو۔ یہ بھی چند روز میں ختم ہو سکتا ہے اس لیے کہ مریض دوائی پینے میں اگر اس کے ذائقہ کی بنا پر شفا ہونے میں شک کرتا ہے لیکن اگر وہ طبیب کی تقلید نہیں کرتا تو بیمار رہے گا۔ اور اگر شک کرتا ہوا بھی تقلید طبیب میں دوا پی لے گا تو بعد صحت وہ شک خود بخود رفع ہو جائے گا یہی وجہ ہے کہ مریض دوائے تلخ پینے میں متنفر و منکر ہوتا ہے آخر اسے بہ اتباع طبیب دوا پینی پڑتی ہے پھر شفایاب ہونے پر اس کی مدحت کرتا ہے۔ ایسے طبیب روحانی انبیاء (علیہم السلام) و اولیاء اور علماء رحمہم اللہ کے تجویز کردہ نسخے قبول نہ کرنے والے مریض روحانی ہوتے ہیں اس پر واجب ہے کہ طبیب کا اتباع کرے اگرچہ صحت یاب ہونے میں شک ہی رکھے لیکن بعد صحت یابی انھیں یقین ہوتا ہے کہ میرا شک غلط تھا اور ان کی ہدایت صحیح تھی۔ اور کبھی غلبہ خواہش نفسانی اس پر اتنا مستولی ہو جاتا ہے کہ عمل خیر سے دل تنگ ہو جاتا ہے اور اعمال بد کی طرف میلان تام بڑھ جاتا ہے یہ مرض سخت مخوف ہیں۔ اس لیے کہ جب یہ حالت بڑھ جاتی ہے تو اس رین طاری ہو جاتا ہے جس کے متعلق قرآن کریم میں ارشاد ہے کلا بل ران علی قلوبھم ماکانو ایکسبون۔ (ہرگز نہیں بلکہ ان کے دلوں پر زنگ ہے ان کے اعمال کی وجہ سے) عربی میں رین کہتے ہیں الرين صدا يعلوا الشئ الجليل۔ قال بل وان على قلوبهم اى صار ذالك الصداء على جلاء قلوبهم فعمى عليهم معرفة الخير من الشر

قال الشاعر

اذا راين العراس بهم و قدرين على قلبه

(رین وہ میل کچیل ہے جو کسی اچھی چیز پر چڑھ جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا بلکہ ان کے دلوں پر میل ہے یعنی یہ میل چڑھ گئی ان کے صاف دلوں پر تو ان کو بھلائی برائی کی تمیز نہ رہی۔ شاعر نے کہا۔ انھوں نے دیکھا کہ وہ اونگھ رہے ہیں حالانکہ ان کے دلوں پر زنگ آ چکا ہے۔)

تو گویا رین بمعنی زنگ اور حجاب مستعمل ہے تو آیہ کریمہ کا ترجمہ یہ ہوا کلا یہ بات نہیں بلکہ بات یہ ہے کہ ان کے دلوں پر ان کے اعمال بد سے زنگ آ گیا ہے۔

تو خلاصہ کلام یہ ہوا کہ جب نفس کی خواہشات اس درجہ غالب آ جائیں کہ برے اعمال کا احساس بھی نہ رہے تو زنگ قلب کی وجہ سے انھیں برا فعل برا نظر نہیں آتا۔

پھر بڑھتے بڑھتے نوبت غشاء تک آتی ہے پھر دل پر مہر جہالت لگ جاتی ہے پھر عقل بھی تیرہ ہو جاتی ہے حتیٰ کہ پھر موت قلب واقع ہو جاتی ہے حتیٰ کہ **لا ینفع الایات و النذر**۔

ایسے ہی اس کے بر خلاف صورتحال یہ ہوتی ہے کہ نفس کشادہ ہو کر حسنات کی طرف مائل ہوتا ہے۔ پھر انشراح صدر ہوتا ہے تو اول نزول سکون ہوتا ہے اور جب درجہ کمال حاصل کر لیتا ہے تو درجہ عصمت پر پہنچ جاتا ہے۔ اب یہ سمجھ لو کہ عدول طریق مستقیم دو طرح ہوتا ہے۔ پہلی قسم موجب غضب الٰہی ہو جاتی ہے خواہ حد کفر تک نوبت پہنچ جائے۔ اور دوسری قسم کو ضلال کہتے ہیں یہ بھی حد کفر تک پہنچے یا نہ پہنچے۔ تو مغضوب علیہم وہ جماعت ہوئی جو کفر کے ساتھ معاند بھی ہو اور ایسا عناد کرے کہ دیدہ دانستہ احکام الٰہی سے انکار کرے اور عمداً مرتکب معاصی ہو۔ چنانچہ یہودیوں کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ عزاسمہ ہے۔ **الذین اتینھم الکتب یعرفونہ کما یعرفون ابناء ھم و ان فریقاً منھم لیکتمون الحق وھم یعلمون**۔ (وہ جن کو دی ہم نے کتاب پہچانتے ہیں اس کو جیسے پہچانتے ہیں اپنے بیٹوں کو اور ان میں سے ایک فرقہ حق کو چھپاتے ہیں حالانکہ وہ جانتے ہیں)

اور ارشاد ہے **ولقد علموا لمن اشترلہ مالہ فی الاخرۃ من خلاق**۔ (اور وہ یقیناً جانتے ہیں کہ جو اسے خریدے آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہے)

اور ارشاد ہے ولا تلبسوا الحق بالباطل و تکتموا الحق و انتم تعلمون۔(اور حق کو باطل کے ساتھ نہ ملاؤ اور تم حق کو چھپاتے ہو حالانکہ تم جانتے ہو)

گویا یہود کا طبقہ دیدہ و دانستہ حق سے منکر ہے اور ضال وہ ہیں جو کفر میں اپنے آباؤ اجداد اور اپنے بڑوں کے پیرو ہیں۔ اسی وجہ سے نصاریٰ کے حق میں ارشاد ہے اضلوا کثیر او صلوا عن سواء السبیل (انہوں نے بہت لوگوں کو گمراہ کیا اور خود بھی سیدھی راہ سے گمراہ ہوئے)

بحمد اللہ تفسیر الحمد یہاں ختم ہو گئی۔ اب چند لطائف و نکات جن کا تعلق اسی سورۃ مبارکہ سے ہے عرض کرتا ہوں۔ اول یہ سمجھنا ضروری ہے کہ لطائف و نکات اس سورۃ مبارکہ کے دو قسم پر ہیں۔ ایک یہ کہ آیات کے ساتھ فرداً فرداً متعلق ہیں۔ دوسرے یہ کہ تمام سورۃ کے ساتھ مجموعی طور پر تعلق رکھتے ہیں۔ تو اول قسم میں الحمد کا تعلق بسم اللہ سے ہے اور وہ یہ ہے کہ تمام علوم جو توریت، انجیل، زبور اور قرآن کریم میں ہیں وہ تمام کے تمام الحمد میں ہیں اور الحمد شریف میں جتنے علوم ہیں وہ تمام بسم اللہ میں ہیں اور بسم اللہ کے تمام علوم حرف بسم اللہ کی ب میں ہیں۔

اس اجمال کی توضیح یہ ہے کہ تمام علوم کا تعلق ذات واجب تعالیٰ شانہ سے ہے اور بسم اللہ اول اسم ذات ہے تو اس میں تمام علوم مضمر ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ بچے کی تعلیم کی ابتداء الف سے ہوتی ہے اور کتاب اللہ کی ابتداء حرف "ب" سے ہوتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ الف بسبب تطاول تو ترفع محل نظر رحمت نہ رہا۔ اور "ب" بسبب انکسار و افتاد گی جناب کبریائی میں مقبول ہو گئی اور حدیث میں بھی آیا ہے من تواضع للہ رفعہ اللہ جو اللہ کے حضور تواضع سے پیش ہو اللہ تعالیٰ اسے بلند فرماتا ہے۔ اس کے علاوہ عام عادت ہے کہ بادشاہ جب کوئی شے خریدتے ہیں تو اس پر شاہی مہر لگا دیتے ہیں تاکہ کوئی چور اس پر جرات نہ کرے ایسے ہی جب جانور خریدتے ہیں اور اصطبل شاہی میں داخل کرتے ہیں تو اس کی پشت پر مہر کا داغ لگا دیتے ہیں تاکہ رہزن وڈا کو اس پر قبضہ کرنے سے خائف رہیں۔ ایسے ہی جب بندہ عمل وطاعت کرتا ہے تو اس کی پیشانی پر مہر الٰہی لگ جاتی ہے سیماھم فی وجوھھم من اثر السجود۔

(ان کے چہروں پر سجدے کے نشان ہیں)

اور یہی بسم اللہ کا مضمون ہے چنانچہ روایت ہے کہ جب حضرت نوح (علیہ السلام) کشتی پر سوار ہوئے تو طوفان میں خوف غرق سے نجات کے لیے آپ نے اس پر بسم اللہ مجرھا و مرسھا۔ لکھ دیا اور زبان مبارک سے بھی پڑھا۔ آپ کی

کشتی غرق سے مامون رہی۔ تو جب بندہ اس کلمہ کو تمام عمر اپنی مواظبت میں رکھتا ہے تو کس طرح وہ نجات سے محروم ہو سکتا ہے۔ کہتے ہیں ایک عارف نے بسم اللہ لکھ کر وصیت کی تھی کہ یہ بسم اللہ الرحمن الرحیم میرے کفن میں رکھ دی جائے لوگوں نے وجہ پوچھی کہ حضرت یہ وصیت کس غرض سے فرمائی ہے۔ فرمایا میں نے سنا ہے کہ ایک فقیر بلند دروازہ پر کھڑا ہو کر سوال کرنے لگا اسے تھوڑا سا مال دیا گیا وہ چلا اور تیشہ لا کر دروازہ توڑنے لگا صاحب خانہ آیا اور بولا یہ کیا کر رہا ہے؟ فقیر نے کہا یا دروازے کو اپنے قابل بنا کر بھیک دے یا بھیک دروازے کی بلندی کے مطابق دے۔ یعنی بلند و بالا دروازہ رکھا ہے تو بھیک بھی بلند دے اور اگر اس قابل نہیں تو اتنا بلند دروازہ نہ رکھ۔ روایت ہے کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم کے ۱۹ حروف ہیں اور جہنم کے محافظ و موکل بھی ۱۹ ہیں۔ ہر حرف بسم اللہ کا ایک موکل سے بچاتا ہے اور بلا جہنم سے محفوظ رکھتا ہے۔ ایک قول ہے کہ رات دن کی چوبیس ساعت میں پانچ ساعتوں کے لیے پنجوقتہ نمازیں مقرر ہیں۔ باقی انیس ساعتوں کے لیے یہ انیس حروف بسم اللہ ہیں تا کہ ہر نشت و برخاست اور حرکت و سکون میں ذکر الٰہی کے ساتھ بندہ مستغرق رہے۔ ایک قول ہے کہ سورۃ برات مشتمل بر قتل کفار ہے اسی وجہ سے اسے بسم اللہ بغیر رکھا گیا اور ذبحہ ذبیحہ کے وقت بسم اللہ اللہ اکبر کہا جاتا ہے۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم نہیں کہا جاتا۔ اس لیے کہ صورت ذبح صورت قہر ہے اور مقتضائے رحمت یہ نہیں کہ قہر ہو اور بسم اللہ میں تمام و کمال رحمت ہے اس لیے ذبح پر بسم اللہ الرحمن الرحیم نہیں پڑھتے۔ چنانچہ سب میں بڑی فضیلت بسم اللہ کی ہے کہ جو ہر وقت و ہر آن بسم اللہ زبان پر جاری رکھے یا کم از کم ستر بار فرائض پنجگانہ کے بعد پڑھ لے یقین ہے کہ وہ ہر وقت غضب و عذاب سے محفوظ رہے گا۔ علاوہ بریں یہ کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ انسان جب بیت الخلاء کو جائے اسے چاہیے بسم اللہ پڑھے تا کہ اس کی شرمگاہ اور نظر جنیال کے مابین حجاب ہو جائے۔ اور جب یہ بسم اللہ دشمنان دنیوی سے حجاب بن جاتی ہے تو ایسے ہی عقبیٰ میں عذاب سے یقیناً حجاب ہو گی۔ اب الحمد شریف کے متعلق خاص نکات و لطائف عرض ہیں۔ اس سورۃ مبارکہ میں تین چیزیں ہیں۔ اول حمد۔

دوسرے مدح۔ تیسرے شکر۔ چنانچہ حمد محض زندہ کے لیے ہوتی ہے اور بعد احسان کی جاتی ہے اور یہ ہمیشہ جائز و مستحب ہے۔ چنانچہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا من لم یحمد الناس لم یحمد اللہ جو لوگوں کی حمد نہیں کرتا اللہ کی تعریف بھی نہیں کرتا اور حمد بہر حال کی جاتی ہے خواہ نعمت ملے یا نہ ملے بلکہ ہر کمال ذاتی پر بس حمد کی

جاتی ہے اسی وجہ سے حمد کو مدح اور شکر پر مقدم رکھا۔ گویا بندہ کو تعلیم دی گئی کہ وہ احمد اللہ کہے یعنی میں اللہ تعالیٰ عزوجل کی حمد کرتا ہوں مگر چونکہ بندہ از بس عاجز ہے اس لیے وہ حمد تک نہیں پہنچ سکتا تو مافوق الطاقت مکلف کرنا رب تعالیٰ شانہ کو منظور نہ ہوا اس بنا پر الحمد فرمایا یعنی کمال حق حمد اور ملک اسی کے لیے ہے خواہ بندہ اس کی حمد کرنے پر قادر ہو یا نہ ہو۔

چنانچہ حضرت داؤد (علیہ السلام) نے جناب باری میں عرض کیا یا رب کیف اشکرك الٰہی میں کیسے تیرا شکر ادا کروں اس لیے کہ شکر بھی تیری توفیق و تعلیم سے میں ادا کر سکتا ہوں اور یہ توفیق حمد و شکر تیرا دوسرا انعام ہے اس پر مجھے پھر شکر کرنا لازم ہے اور اس میں تسلسل لازم آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ارشاد ہوا اے داؤد جب تم ہمارے شکر سے اپنے کو عاجز سمجھتے ہو تو تم نے ہمارا شکر ادا کر لیا۔ ایسے ہی جب احمد اللہ کہا تو یہ کہنا اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ کہنے والا حمد کر رہا ہے حالانکہ وہ محمود قبل از حمد حامد محمود ہے اس لیے فرمایا الحمدللہ یعنی تمام اقسام حمد و ثنا اسی کو لائق و زیبا ہیں جو ازل سے ابد تک جتنے حامد ہیں سب سے اول محمود تھا اور جسے عموم کے ساتھ کہا جاتا ہے کہ فلاں صاحب نعمت مستحق حمد ہے۔ یہ بھی در حقیقت محمود اول کی حمد ہے مثلاً پیر کی حمد مرید کی طرف سے استاد کی حمد شاگرد کی طرف سے بادشاہ عادل کی حمد رعایا کی طرف سے اولاد کی طرف سے والدہ کی حمد یہ تمام انواع حمد کا حقدار حقیقی اور مالک حقیقی وہی ایک محمود اول ہے کیونکہ ہر نعمت جب کسی کو ملی اس کا منعم حقیقی وہی ایک ہی ہے۔

تو گویا در پردہ صورت انسان میں وہی ایک تعالیٰ شانہ جلوہ ریزی فرماتا ہے ہر دل صاحب نعمت میں ارادہ انعام پیدا کرنے والا وہی ہے اور وہ نعمت جس پر فرمائی گئی اس سے کسی کو متمتع کرنے کی توفیق بھی دینے والا ہے تو معلوم ہوا کہ انفاع نعمت اور انقطاع نعمت یہ سب اسی واجب تعالیٰ شانہ کا فعل ہے چنانچہ ارشاد ہے **ومابکم من نعمة فمن الله** تو واجب تعالیٰ شانہ جتنے منعم مجازی ہیں سب مثل خدمت گار ہیں جو بحکم مالک حقیقی خوانہائے طعام دوسروں کو پہنچاتے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ جس سے جو کچھ ملتا ہے وہ تو اس کی طرف دست سوال بڑھائے گا لیکن اگرچہ مجازاً وہ مجازی منعم و معطی مستحق حمد مجازی ہو مگر در حقیقت ہر نعمت پر وہی منعم حقیقی مستحق حمد ہے۔

نہ کس میدہاند نہ کس میدہد

خدا مے دہاند خدا میدہد

یہاں ایک شبہ وارد ہوتا ہے کہ عام طور پر ہر جگہ تسبیح تحمید پر مقدم رکھی گئی ہے جیسے سبحان اللہ والحمد للہ وغیرہ میں سوہ فاتحہ میں تحمید کس لیے مقدم فرمائی گئی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ تقدیم تسبیح تحمید پر جب کی جاتی ہے جبکہ کلام میں دونوں کا ذکر ہو۔ یہاں فقط حمد کا ذکر ہے اس لیے تسبیح نہیں۔ دوسرے اکتفا تحمید کے ساتھ کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مضمون تسبیح تحمید میں موجود ہے اور مضمون تسبیح یہ ہے کہ ذات واجب تعالیٰ شانہ اپنی صفات میں تمام نقصانات سے منزہ ہے اور مضمون تحمید یہ ہے کہ کمال و نعمت جو ذہن و خیال بشر میں ہے وہ تمام اس جناب سے ہیں اور جب تمام کمالات و نعم اس ذات کی طرف سے اعتقاد بشر میں ہیں تو لازم آیا کہ اس کی ذات میں کوئی نقص نہیں۔

ایک لطیفہ عجیب اور ہے کہ لفظ الحمد للہ میں آٹھ حرف ہیں یعنی الف، لام، ح، م، دال، ل، ہمزہ، ہ اور آٹھ ہی دروازے بہشت بریں کے ہیں۔ اور حمد کو دو چیز سے تعلق ہے اول ماضی سے کہ شکر نعمتہائے سابقہ کرے دوسرے مستقبل سے کہ وہ شکر ہے اور شکر مزید نعمت ہے جیسا کہ ارشاد ہے **لین شکرتم لازیدنکم**۔ تو بموجب تعلق اول دروازہ ہائے جہنم حمد کرنے والے پر مسدود ہو جاتے ہیں اس لیے کہ مواخدہ اور عتاب و عذاب بندہ شاکر سے نہیں ہوتا۔ اور بموجب تعلق دوم شاکر عقلاً مستحق ہوتا ہے کہ اس پر ہشت درہائے بہشت کشادہ ہوں۔ ایک قول ہے کہ الحمد للہ ایک عظیم البرکت کلمہ ہے لیکن لازم یہ ہے کہ اسے اس کے موقعہ پر استعمال کیا جائے تاکہ اس کا ثمرہ بوجہ احسن حاصل ہو۔ حضرت سری سقطی قدس سرہ سے منقول ہے کہ آپ (رح) فرماتے ہیں کہ میں نے ایک بار الحمد للہ کہا تو تیس سال استغفار کی۔ اس کا سبب یہ ہوا کہ ایک بار بغداد میں آگ لگی جس سے بازار اور دکانیں جل گئیں مگر میری دکان محفوظ رہی۔ ایک شخص میرے پاس آیا اور بولا تمام دکانیں جل گئیں مگر آپ کی دکان محفوظ رہی تو میں نے کہا الحمد للہ۔ پھر میں نے سوچا تو خیال آیا کہ یہاں الحمد للہ مجھے نہ کہنا چاہیے تھا کہ یہ دین و مروت کے خلاف تھا۔ اس لیے کہ تمام مسلمان اور احباء دین مصیبت میں پڑے اور میں محض اپنے قلیل و ذلیل منافع پر خوش ہوا۔ اور میں نے الحمد للہ کہہ دیا۔ چنانچہ میں جب سے مشغول استغفار ہوں۔ قرآن کریم میں ہے **واخر دعولھم**

ان **الحمدللہ رب العلمین**۔ اہل جنت کا آخر کلمہ **الحمدللہ رب لعلمین** ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ ابتداء انسان بھی حمد سے ہے اور اس کا خاتمہ بھی حمد پر ہے۔ تو بندہ پر لازم ہے کہ اپنا اول اعمال اور آخر اعمال کلمہ حمد کے ساتھ ہی رکھے۔ اور مدح کبھی قبل از احسان ہوتی ہے اور کبھی بعد از احسان کی جاتی ہے اور یہ کبھی ممنوع بھی ہوتی ہے جیسا کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا **احثوا التراب فی وجوہ المداحین** خاک ڈالو مداحوں کے منہ میں۔ چنانچہ مداح قصیدہ گوؤں کے منہ میں خاک ڈالنے کا حکم ہے۔ اب رہا شکر یہ ہمیشہ اس کا کیا جاتا ہے جس سے اسے کوئی نعمت حاصل ہو۔ اب یہ بھی سمجھ لینا ضروری ہے کہ اس سورۃ مبارکہ کا نزول بندوں کی تعلیم کے لیے ہوا تاکہ وہ مناجات الٰہی کرتے وقت الحمدللہ اول کہیں۔ لیکن اس میں قولوا مضمر رکھیں اور صراحتاً قولوا نہ کہیں اس لیے کہ اگر صراحتاً قولوا کہا جائے تو امتثال امر میں نہ کہنے والے قصوروار قرار پائیں گے اور قصوروار سزاوار عتاب ہو جاتا ہے مثلاً اگر باپ بیٹے کو کہے کہ فلاں کام کر اور وہ نہ کرے تو وہ بیٹا داغدار حقوق والدین ہو جاتا ہے۔ برخلاف اس کے کوئی کہنے والا اگر کہے کہ فلاں اچھی چیز ہے اس پر اگر عدم امتثال ہو تو یہ عقوق و نافرمانی نہیں کہلاتا۔ تو الحمدللہ فرمانے میں رحمت الٰہی نے تقاضا کیا کہ بطریق تلقین حضور الٰہی میں بیان کرے تاکہ حکم اطاعت اس عمل میں پورا ہو جائے۔

اب رب العالمین کے متعلق عرض ہے۔ رب العالمین میں عالم کا رب ہونا فرمایا گیا ہے۔ اس کی توضیح یہ ہے کہ عالم میں دیکھی سنی تمام اشیاء دو حال سے خالی نہیں۔ یا وہ واجب لذاتہ ہوں گی یعنی خود بخود موجود ہوں گی اور ان کا نابود ہونا محال ہو گا۔ یہ صرف اور صرف ذات واجب تعالیٰ شانہ کی ذات ہے۔ یا وہ ممکن لذاتہ ہوں گی کہ اس کی ہر دو طرف وجود و عدم میں برابر ہوں۔ یا وہ بہ ایجاد الٰہی موجود ہو تو جو اس قسم کی اشیاء ہیں وہ عالم ہیں اور عالم علامت سے مشتق ہے اسی بنا پر اس کا نام عالم رکھا گیا کہ یہ اسماء وصفات الٰہی ہے اس لیے کہ ہر فرد مظہر ہے ایک اسم الٰہی کا اور صفات سے ایک صفت ہے۔ اور یہ اجناس وانواع یہ مظاہر اسماء کلیہ اور صفات اطلاقیہ ہیں۔ پھر جبکہ ہر فرد افراد عالم سے اسم کا مظہر ہے اسماء الٰہی سے تو عوالم غیر منتہی ہیں۔ لیکن جو کچھ شرائع میں مقرر ہے اس کا بیان یہ ہے کہ جو کچھ عالم میں موجود ہے وہ یا ذات ہے یا صفات۔ ذات اسے کہتے ہیں جو اپنے وجود میں کسی چیز کا محتاج نہ ہو جیسے آسمان و زمین۔ اور صفات اسے کہتے ہیں جو اپنے وجود میں کسی دوسری چیز کا محتاج ہو جیسے رنگ، بو، مزہ وغیرہ۔ اور ذات عرف معقولیاں میں جوہر کو کہتے ہیں۔ اور صفت کو عرض کہتے ہیں۔ پھر ذات بھی دو قسم پر ہے۔ ایک جسم۔ دوسرا روح۔ جسم وہ ہے جو

ایک مقدار اور ایک شکل معین رکھے اور وہ اپنی مقدار و شکل کو کبھی نہ چھوڑے۔ اور روح چونکہ مقدار و شکل معین نہیں رکھتی۔ اسی وجہ سے اشکال مختلفہ اور مقدار متفاوتہ میں ظاہر ہوتی ہے۔ اور جسم کی بھی دو قسم ہیں۔ علوی اور سفلی۔ پھر علوی بھی بہت سی قسم رکھتا ہے۔ جیسے عرش، کرسی، سدرۃ المنتہیٰ، لوح، قلم، معدن بہشت معدن دوزخ اور ستارے ثوابت و سیارے اور ہفت آسمان۔ ایسے ہی سفلی بھی دو قسم ہے۔ بسیط جیسے عناصر اربعہ، زمین، پانی، ہوا، آگ ہے۔ دوسرے مرکب یہ بھی دو قسم پر ہے۔ اس لیے کہ یہ تمام عناصر سے مرکب ہے۔ بعض مرکب ہے بعض عناصر سے۔ پہلی قسم کو ناقص کہتے ہیں اور دوسری قسم کو تام۔ مرکب تام منحصر تین عالم پر ہے۔ عالم معاون، عالم نباتات، عالم حیوان۔ پھر یہ ہر ایک بہت سے عالموں پر مشتمل ہیں۔ ان کی تفصیل موجب تطویل ہے۔ اور مرکب ناقص بھی تین قسم پر ہے۔

بخار: یعنی آب و ہوا۔

غبار: یعنی خاک و ہوا۔

دخان: یعنی آگ و ہوا۔

ان تینوں سے بھی بہت سے عالم پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ خالص غبار سے بہت سے بگولے بنتے ہیں اور ان کے رنگ مختلف ہوتے ہیں۔ اور بخار سے بارشیں ہوتی ہیں اور جب بخار بہت بلندی پر چلا جاتا ہے تو سردی سے منجمد ہو کر ژالہ اور برف بن جاتا ہے۔

اور دھواں جب بلندی پر پہنچ جاتا ہے تو برق اور صاعقہ اور شہاب اور سارہ دمدار اور بہت سی صورتوں میں متشکل ہوتا ہے۔ ایسے ہی بخار اور دخان جب منعکس ہو کر زمین میں محبوس ہو جاتا ہے تو زمین کو ہلا دیتا ہے جسے زلزلہ کہتے ہیں۔ اور جب بخار زمین میں محتبس ہو جاتا ہے اور ہوا کی قوت سے باہر آتا ہے تو چشمے جاری کر دیتا ہے۔ اور اگر بخار لطیف مابین سما اور ارض سردی کی وجہ سے منجمد ہو کر زمین پر گرتا ہے وہ شبنم کہلاتا ہے۔ اور اگر وہی بخار لطیف منجمد شدہ فضا میں پراگندہ ہو جائے اسے صقیع کہتے ہیں جس کا نام کہر ہے۔ اور بعض ملکوں میں بخارات لطیفہ منجمد ہو کر برنگ شکر سفید و سرخ زمین پر برس پڑیں تو اسے ترنجین اور انگبین خشک اور من اور شیر خشت کہہ دیا جاتا ہے۔ یہ ہیں مختصر اقسام مرکب ناقص کے۔ اور یہی بطریق خرق عادت عجیب و غریب چیزیں پیدا کر دیتا ہے اس کی تفصیل کی یہاں

گنجائش نہیں کتب عجائب الکائنات میں اس کا مطالعہ کریں اور روح یا محض نیک ہے اسے فرشتہ کہتے ہیں۔ یا خالص بد اور خبیث ہے اسے شیطان کہتے ہیں۔ یا مختلط نیک و بد میں ہیں یہ دو قسم پر ہیں جنہیں جن یا ارواح بنی آدم کہتے ہیں۔ اور فرشتے بھی تین قسم پر ہیں۔ اول وہ فرشتے جو اجسام سے متعلق ہیں خواہ وہ اجسام علوی سے متعلق ہوں جیسے عاملان عرش اور خازنان کرسی اور داروغہائے بہشت و دوزخ اور ساکنان سدرۃ المنتہی اور مجاوران بیت المعمور اور کشیدن ستا رہا اور محرکان سماوات اور دربانان سما۔ دوسرے وہ فرشتے جو اجسام سفلی سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ جو ابر و باد سے مربوط ہیں اور ہر قطرہ باراں کے ساتھ نازل ہوتے ہیں اور دریا اور پہاڑ اور اشجار و بنی آدم پر موکل ہیں اور ان کے اعمال و اوراد اور عزیمتوں کے ساتھ موکل ہیں۔ اسماء الٰہی اور عزیمت خوانان اور زکوۃ دہندگان سے ارتباط رکھتے ہیں۔

ایک قسم ان ملائکہ کی ہے۔ جو عبادت الٰہی میں مستغرق ہیں ان کی اتنی کثیر تعداد ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ آسمانوں میں ان کی وجہ سے ایک بالشت بھی جگہ خالی نہیں ہے اور یہ تمام فرشتے آسمانوں میں قیام اور رکوع اور سجود میں ہیں۔ تیسری قسم ان ملائکہ کی ہے۔ جو مقربین خاص ہیں۔ ان کے سپرد تدبیر عالم ہے مثلاً وحی لے کر انبیاء کرام (علیہم السلام) پر آنا، احکام شرعیہ پہنچانا، ایصال رزق و دولت اور امداد و تصرف کرنا، کسی کو الٹنا، کسی کو ملک دینا، دولت بڑھانا گھٹانا، قبض روح کرنا۔ اور چار فرشتے ان پر حاکم ہیں جنہیں رسول ملائکہ کہتے ہیں۔ وہ جبرائیل و میکائیل و اسرافیل و عزرائیل (علیہم السلام) ہیں۔ ان کے لشکر و اعوان اسی قسم میں داخل ہیں۔ اور ان کے حالات و مقدار سوائے رب العزت تبارک و تعالیٰ اور یا بعطائے الٰہی محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کوئی نہیں جانتا وما یعلم جنود ربک الا ھو۔ اور اس کے علاوہ بھی بہت سے عالم ہیں مثل مکان، زمان، کم، کیف، وضع اور نسبت جہت وغیرہ ان کی تعریف کتب متداولہ حکمت میں موجود ہیں۔ مختصر یہ کہ جو ان پر احاطہ اور ان کے احوال پر عبور چاہے اسے تفسیر رب العالمین پر غور کرنا چاہیے ہم نے یہاں مختصر عرض کر دیا ہے۔

اب الرحمن الرحیم سے جو متعلق ہیں وہ ملاحظہ فرمائیں حقیقت رحمت حق باری تعالیٰ میں ایصال خیر و دفع شر ہے اور رحمت حق تعالیٰ شانہ کی دو قسم ہیں ایک رحمت ذاتی دوسری رحمت صفاتی پھر ذاتی کی دو قسم ہیں عام اور دوسرے خاص عام تو وہ رحمت ہے جس کا افاضہ ہر موجود کے لیے ہے اور خاص یہ کہ جسے استعداد تقرب الی اللہ بخش دی جائے اسے اسے کے لیے مخصوص کر لیا جاتا ہے ایسے ہی صفاتی بھی دو قسم پر ہے یعنی عام اور خاص عام تو یہ ہے کہ ہر موجود

کو اس کی صفات سے جتنا اس کے لائق ہوا اسے دیا جائے اور خاص یہ کہ ہر موجود کو کچھ دے کر اس کے ذریعہ دوسروں پر فضیلت بخشی جائے اس تفصیل کے بعد معلوم ہوا کہ بسم اللہ میں رحمن ورحیم فرما کر الحمد میں دوبارہ رحمن ورحیم فرمانا محض تکرار نہیں ہے بلکہ **بسم اللہ** میں **رحمن و رحیم** ذاتی ہے اور الحمد میں رحمن ورحیم صفاتی ہے اور ذاتی کی دو قسم ہیں عام اور خاص یہ دلالت کرتی ہیں بسم اللہ کے دو اسم رحمن ورحیم پر اور صفاتی کی بھی دو قسم ہیں عام اور خاص یہ دلالت کرتی ہیں الحمد کے مذکورہ دو اسموں رحمن ورحیم پر بعض نے کہا کہ ذکر رحمن ورحیم بسم اللہ میں برائے تسکین مصیبت ہے کہ اسم اللہ کے ساتھ ہمت مضبوط کرے اور دل کو یہ نام مدہوش کر دے۔ اور الحمد میں بندوں کو امیدوار بنانے کے لیے اسم رحمن ورحیم لایا گیا تا کہ مالک یوم الدین کے خوف سے بے تاب نہ ہو اور آئندہ کلام میں عبادت مذکور ہے جو بندہ پر لازماً شاق ہے تو قائد رجا اور سائق خوف ساتھ دے دیا۔ کہ ہر مقام خوف ورجا پر یہ دو اسم رحمن ورحیم ساتھ رہیں کہ ایک تسکین مصیبت عوام کرے اور عوام کو امیدوار بنائے اور دوسرا اسم رحیم برائے خواص ہے۔ اور ایک روایت ہے کہ ظہور علم کی ابتداء رحمت عام وخاص کے ساتھ ہوئی اور اس کی انتہاء بھی رحمت کے ساتھ ہے چنانچہ بسم اللہ میں بشارت ابتداء رحمت کی ہے اور الحمد میں انتہا رحمت پر ہے۔ اور ایک قول ہے کہ رحمن لفظ میں خاص ہے اور معنی میں عام اس لیے کہ یہ وصف سوائے ذات واجب تعالیٰ شانہ کسی غیر کے لیے نہیں ہوتا اگر چہ خالقیت ورزاقیت اور منفعت رسانی کے جو ہر قسم کے موجودات کو شامل ہے تو باعتبار معنی یہ عام ہے مگر باعتبار تلفظ خاص۔ بر خلاف رحیم کے کہ وہ تلفظ میں عام ہے لیکن معنی میں خاص ہے اس لیے کہ مخلوقات کو اس وصف سے متصف کر سکتے ہیں اور کہہ سکتے ہیں فلاح رحیم ہے کہ لطف وتوفیق کو مدلول اسی اسم کا ہے مومنین کے لیے مخصوص ہے۔ ضحاک (رح) کہتے ہیں کہ رحمن میں اشارہ اللہ تعالیٰ کی طرف ہے کہ وہ مکان سماوی پر رحمن ہے اور رحیم میں اشارہ اللہ تعالیٰ کی اس نزول رحمت کی طرف ہے جو اہل زمین پر دہ فرماتا ہے۔ ابن مبارک (رح) کہتے ہیں کہ رحمن وہ ہے کہ جب اس سے سوال کیا جائے دے اور رحیم اسے کہتے ہیں کہ جب اس سے سوال نہ کیا جائے تو غضب فرمائے۔ بعض نے کہا کہ دنیا و آخرت میں جتنے آثار رحمت ہیں وہ اسم رحمن کے مقتضیات سے ہیں اور دفع بلا و آفات دارین بمقتضائے رحمت رحیم ہے۔ بہر حال رحمن سے کمال رحمت کا اظہار ہے کہ جس سے تمام بڑی نعمتیں اور کلیات واصول منافع حاصل ہوتے ہیں اور رحیم سے ہلکی اور حقیر نعمتیں اور جزئیات وفروع حاصل ہیں اور یہ دو اسم اس لیے

لائے گئے تا کہ بندہ بلند نعمتیں مانگتے ہوئے حقیر نعمتوں کے سوال پر نہ شرمائے۔ گو یا دو اسم ظاہر فرما کر اس طرف اشارہ فرمایا کہ ہم سے جو مانگنا چاہو بے محابا مانگو اور بڑی نعمتیں طلب کرتے ہوئے حقیر نعمتیں مانگتے یہ وہم نہ کرو کہ اس رحمن سے ہلکی چیز مانگنا بے ادبی ہے۔ یہ بندہ کی جبلت ہے کہ بڑی چیزیں دے۔ اور ہلکی چیزوں کے سوال پر خشمگیں ہو جائے۔ ایک روایت ہے کہ کسی شخص نے دربار شاہی میں معمولی سوال کیا بادشاہ نے حکم دیا کہ اسے سزا دی جائے کہ اس نے ہمارے حضور معمولی چیز کا سوال کیا۔ ایسا سوال تو اسے کسی معمولی آدمی سے کرنا تھا۔ اس نے ہماری توہین کی ہے۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ اپنی شان ارفع و اعلیٰ ظاہر فرماتا ہے بندہ ہم سے جو مانگے ہم اسے ضرور دیں گے۔ اگر زندگی، قوت، شنوائی، بنائی، فرزند وزن مانگے گا ہم اسے دیں گے اور اگر نمک چارہ پاپوش کپڑا طلب کرے گا تو وہ بھی ہم اسے عطا فرمائیں گے تو گویا اگر ایسی چیز طلب کرے گا جو ہمارے سوا دوسرا نہ دے سکے تو بھی ہم بخشیں گے۔ اور اگر ایسی چیز مانگے گا جو بندہ بندہ سے طلب کرے تو مل جائے ہم وہ بھی اسے عطا فرمائیں گے۔ مثلاً تشخیص مرض اور معالجہ و دوا کے ساتھ متعین کرنا، یا روزینہ مانگنا اور امور معاش میں یا معاد میں مدد طلب کرنا یہ سب ہم سے مانگ سکتا ہے حالانکہ یہ کام بندہ بندہ سے بھی کرا سکتا ہے۔ گو یا یہ فرمایا کہ ہم رحمن ہیں تو نے گندہ نطفہ ہمارے سپرد کیا۔ تو ہم نے تجھے مرد خوش قامت نیک منظر بنا کر تجھے عطا فرمایا اور سوکھا دانہ ہمارے سپرد کیا ہم نے اسے اپنی رحمت سے شاخ بابرگ وبار کر کے تجھے دیا۔ تو نے ناقص طاعت ہمارے پیش کی ہم نے اس کے بدلے بلند کوشک حور و قصور اشجار و انہار کے ساتھ عطا فرمائے۔ اور ہم رحیم بھی ہیں کہ جو کچھ تو ماں باپ خاوند اور مالک استاد اور پیر طبیب و عطار سے آقا و مربی سے حاصل کر سکتا تھا ان کا ہم سے امید وار ہو تو وہ بھی ہم تجھے بخش دیں گے۔ یہاں ایک شبہ پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ

جب اللہ تعالیٰ رحمن ورحیم ہے اور اس کے مقتضیات وہ ہیں جو بیان ہوئے تو پھر اس نے کس لیے اشیائے قبیحہ پیدا فرمائے اور افعال مذموم کیوں خلق کئے اور اخلاق ردیہ اور ہموم و غموم اور افکار و حاجات جو تخلیق فرمائے یہ کہاں رحمن ورحیم کے مقتضیات سے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ شبہ نہیں بلکہ کوتاہ نظری ہے کہ مذکورہ اشیاء کو خلاف شان رحمن ورحیم سمجھا گیا اور صفت رحمن ورحیم کے مخالف جانا ایسے معترض کو سمجھنا چاہیے کہ اگر پدر مشفق اپنی اولاد کو تادیباً مارے تو یہ مارنا بہ اقتضائے رحمت ہے اگرچہ بظاہر یہ تادیب عذاب کی صورت میں ہے مگر بچہ پر عین

رحمت ہے۔ اگر بچہ کو باپ صبح ہی پکڑ کر اسے استاد کے سپرد کرے جو بظاہر نہایت خشمگیں اور بے رحم ہے تو یہ سپرد کرنا عین رحمت ہے اس لیے فرمایا کہ والدین کے حق میں رب ارحمهما کما ربینی صغیرا۔

(اے میرے رب ان دونوں پر رحم فرمانا جس طرح انھوں نے بچپن میں میری پرورش کی) دعا کیا کرو۔ اگر بچے کو ایام تعلیم میں کھیل کود سے روک کر تعلیم دی جائے اور چھٹی کے روز جمعہ کو اسے نائی کے سپرد کرکے بال ترشوائے جائیں۔ گرم پانی سے غسل کرا کر میلے کپڑے اتار کر صاف پہنائے جائیں تو اگرچہ بظاہر بچہ پر یہ ظلم ہے کہ اسے کھیلنے سے روکا، آزادی سے گلگشت نہ کرنے دی ہم چشموں میں آوارہ گردی سے باز رکھا لیکن اس نگہداشت اور تربیت کا نتیجہ جب اس پر روشن ہوتا ہے تو وہ صمیم دل سے رب الرحمهما کمار بنی صغیرا۔ کہہ کہہ کر والدین کے حق میں دست بدعا ہوتا ہے۔ ایسے ہی اگر احیاناً بچہ کو تخمہ ہو جائے اور بدہضمی سے اس کے معدہ میں زہر طعام پھیل جائے تو والدین اسے آب ودانہ سے روکتے اور ادویہ بدذائقہ کھانے کو مجبور کرتے ہیں تاکہ اس مرض سے وہ بچہ نجات پاکر جسیم وتوانا ہو جائے۔ یہ سب صورتیں بظاہر عذاب ہیں مگر حقیقتاً عین رحمت ہیں۔

من لم یو دبه الابو ان ادبه الملوان (جسے ماں باپ ادب نہ سکھائیں اسے زمانہ ادب سکھاتا ہے) البتہ ناقص العقل بچہ ایام طفولیت میں اس تادیب کو عذاب سمجھتا ہے مگر سمجھ بوجھ سیانی ہونے پر وہ والدین کا شکر گزار ہوتا ہے۔ اس بنا پر اس رحمن ورحیم نے فرمایا

عسیٰ ان تکرھوا شیا وھو خیر لکم وعسیٰ ان تحبوا شیا وھو شر لکم، واللہ یعلم وانتم لاتعلمون۔

(ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو برا سمجھو اور وہ تمہارے لیے بہتر ہو اور ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو پسند کرو اور وہ تمہارے لیے بری ہو اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے)۔

یہاں یہ سمجھ لینا بھی ضروری ہے کہ دنیا و آخرت میں مخلوق پر جو کچھ ہوتا ہے۔ اس کی چار قسمیں ہیں۔ اول یہ کہ اسے جو چیز ملی وہ نافع بھی ہے اور ضروری بھی۔ جیسے سانس کہ اگر ایک لمحہ کے لیے بند ہو جائے تو زندگی ہی ختم ہو جائے۔ یا معرفت الٰہی کہ آخرت میں اگر ایک لحظہ کے لیے دل سے زائل ہو جائے تو مستوجب عذاب ابد الا آباد بنا کر رکھ دے۔ دوسری قسم یہ کہ نفع دیتی ہے مگر ضروری نہیں جیسے مال دنیاوی اور کثرت علوم و معارف یا کثرت نوافل و

طاعات کہ اس کا فائدہ آخرت میں ہے۔ تیسری قسم یہ ہے کہ وہ ضروری ہے مگر نافع نہیں جیسے امراض شتی و آفات دنیا کہ یہ دنیا میں آتے ضرور ہیں لیکن ان کا نفع آخرت میں ہے دنیا میں نہیں۔ چوتھی قسم وہ ہے کہ وہ نافع بھی نہیں اور ضروری بھی نہیں جیسے تفاخر، غنا، تکبر کہ یہ اگر انسان میں ہو تو اس سے فائدہ بھی نہیں اور یہ ضروری بھی نہیں۔
اب ملک یوم الدین کے متعلق ملاحظہ فرمائیں۔ یہ فلسفہ ناقابل انکار ہے کہ مطیع و نافرمان موافق و مخالف محسن و بد خلق کے مابین بہ متقضائے عدالت بین فرق ہے اور یہ فرق روز جزا کے بغیر ظاہر نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ اگر دنیا میں نیکوں کو نعمت و دولت اور عافیت دی جاتی اور بروں کو فقر و مصیبت اور محنت و مرض میں مبتلا کر دیا جاتا تو لوگ لازمی طور پر نیکی کی راہ قبول کرتے اور افعال مذموم سے بخوف مرض و محنت مجتنب رہتے اور حصول دولت و صحت و عافیت کے طمع میں سب نیک سے نیک ہوتے لیکن ایمان و ایقان و اطمینان سے ان کا کوئی واسطہ نہ ہوتا اس کو تکلیف و محنت صعوبت و کربت کا خوف کارہائے نیک کی طرف مضطربانہ صورت میں مجبور کرتا اور اعمال نیک اضطراری حالت میں بے اختیار ان سے ظہور میں آتے نہ کہ تعمیل حکم الٰہی سے وہ مائل بہ اعمال صالحہ ہوتے۔ اس لیے روز جزا کو روز عمل سے ممتاز فرمایا تاکہ حقیقت تکلیف و معاد ہمارے فہم پر متحقق ہو۔ آیہ کریمہ میں قرات متواترہ صحیحہ دو ہیں۔ مالک یوم الدین اور ملک یوم الدین اور ان دونوں قراتوں پر پڑھنا اگرچہ درست ہے لیکن علمائے محققین نے ان میں سے ایک کو ترجیح دی ہے یعنی مالک یوم الدین ارجح بتائی ہے اور اس کی چند وجہ بیان فرمائیں۔ اول یہ کہ مالکیت مرد اور غیر مرد پر عام ہے اور ملک و شہنشاہی خاص مردوں تک محدود ہے۔ دوسرے یہ کہ مالک کو مملوک پر کمال قدرت حاصل ہے اگر وہ چاہے تو اپنے مملوک کو بیچ ڈالے اور جسے چاہے بخش دے بر خلاف ملک و بادشاہ کے کہ اس کی قدرت صرف اور صرف رعایا پر ایا تک محدود ہوتی ہے اس لیے مالک یوم الدین ارجح ہے۔ تیسرے یہ کہ مالکیت کی نسبت ملکیت و بادشاہی سے قوی تر ہے اس لیے کہ مملوک و ملکیت مالک سے نکلنا ممکن نہیں بر خلاف رعیت کے کہ وہ بادشاہ کا محکوم ہونے سے نکل سکتا ہے سلطنت بادشاہ سے نکل کر دوسری سلطنت میں چلا جائے تو اب وہ پہلے بادشاہ کی رعیت نہیں کہلائے گا گویا رعیت رہنا باختیار رعیت ہوتا ہے۔
چوتھے یہ کہ مالک کا رتبہ مملوک سے افزوں تر ہوتا ہے اور بادشاہ کا رتبہ رعیت پر اس درجہ بلند نہیں ہوتا اس لیے کہ مملوک مالک کے حضور پست تر ہے رعیت ہے۔ اور استیلاء قہر مالکیت میں جتنا عام ہے رعیت پر شاہی استیلاء اتنا

نہیں اس لیے کہ غلام پر خدمت مالک واجب ہے اور رعایا پر واجب نہیں۔ دوسرے غلام بلا اذن مالک باختیار خود کسی کام کا مجاز نہیں برخلاف رعیت کے کہ اسے اپنے گھریلو معاملات میں اختیار ہے۔ تیسرے یہ کہ رعیت کا واسطہ ملک اور بادشاہ سے عدل و انصاف اور ہیبت اور سیاست تک ہے مگر غلام و مملوک کہ وہ اپنے مالک و مولا سے خوراک و پوشاک اور تربیت ورافت اور رحمت و حفاظت میں ہر حالت کے ساتھ مربوط ہے۔ تو قرات مالک یوم الدین اقرب بہ امید ہے کہ بندہ اپنے مالک سے عفو و تربیت رافت ورحمت کا ہر حال میں امیدوار و محتاج مالک ہے چنانچہ حدیث قدسی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

یاعبادی کلکم جائع الامن اطعمته فاستطعمونی اطعمکم یاعبادی کلکم عار الامن اکسوته فاستکسونی اکسکم۔

اے میرے بندو تم سب بھوکے ہو مگر جسے میں روزی دیتا ہوں وہ شکم سیر ہے لہٰذا مجھ سے رزق طلب کرو تاکہ میں تمہیں روزی عطا کروں۔ اے میرے بندو تم سب برہنہ ہو مگر جسے میں کپڑا پہنا دوں تو تم مجھ سے ہی کپڑا مانگو تاکہ میں تمہیں کپڑا پہناؤں۔ بادشاہ وہ ہے جو اپنے موجودہ لشکر پر نگرانی رکھتا ہے اور ضعیف و شکست حال اور مریض و عاجز کو دیکھتا ہے تو خبر گیری کرتا ہے۔ اور مالک حاضر و غائب اپنے بندوں، غلاموں، ضعیفوں، مریضوں، بڑھوں پر انتہائی رحمت فرماتا ہے اور ان کے علاج میں مدد کرتا ہے۔ تو مالک کا رتبہ بادشاہ کے مرتبہ سے افزوں ہے ویسے بھی اگر دیکھا جائے تو مالک میں ملک سے ایک حرف زائد ہے تو مالک کی بخشش بھی ملک سے افزوں تر ہے۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ بروز قیامت بہت سے بادشاہ ہوں گے جو اپنی اپنی حالت میں گرفتار ہوں اور اس دن کوئی مالک نہ ہو سوا ایک مالک الملک ذوالجلال والاکرام کے۔ تو مالک یوم الدین کا مفہوم یہ ہوا کہ وہ مالک علی الاطلاق ہے قیامت کے دن کا کہ بادشاہ اور غلام آزاد اور احرار سب اس کے زیر حکم ہوں گے اور مالک الملک اسماء حسنیٰ میں بھی اسم الٰہی ہے اور ملک الناس بھی حقیقتاً اسی ذات واحد کا اسم ہے جیسا کہ سورۃ ناس میں مذکور ہے۔

اب یوم الدین کے متعلق بھی سمجھنا ضروری ہے

عرف عربی میں یوم کہتے ہیں ابتداء طلوع سے غروب تک کو اور شرعاً یوم کا اطلاق طلوع صبح صادق سے غروب تک پر ہے۔ اور کبھی روز کا اطلاق مطلق وقت پر بھی ہوتا ہے خواہ وہ دن ہو یا رات مہینہ ہو یا سال جیسے کہتے ہیں روز صفین ایسا ایسا ہوا یوم خندق یہ ہوا۔ حالانکہ یہ ایک دن کا واقعہ نہیں بلکہ مہینے اور شب و روز کا واقعہ ہے تو ثابت ہوا کہ یوم الدین ایک دن نہیں بلکہ اس کی مدت نفخہ ثانیہ سے لیکر جنت دوزخ میں داخل ہونے تک کی ہے اس میں بہت سے وقائع اور کافی حالات واقع ہوں گے۔ اب یہ ذہین نشین کرنا بھی ضروری ہے کہ اس سورۃ مبارکہ میں دو مضمون ہیں۔ اول مضمون حمد و ثنا جو بندہ کی زبان سے جناب الٰہی میں عرض کیا گیا۔ دوسرا خواہش مطلب کہ بعد از القاب حمد و ثناء بندہ کرتا ہے۔ اور اس سورۃ مبارکہ میں پانچ نام اسماء حسنیٰ مذکور ہیں۔ اللہ، رب، رحمن، رحیم، مالک یوم الدین۔ یہ پانچوں نام اپنے مفہوم میں ارتباط کامل رکھتے ہیں اور سب مرادف اسم دیان ہیں۔ اس لیے کہ حمد باعتبار کمال ذاتی واجب تعالیٰ شانہ کی اس لیے کی گئی کہ لفظ اللہ کا مقتضی ہے دوسرے باعتبار افاضہ وجود و توابع وجود یہ مفاد ہے اسم رب کا۔ تیسرے باعتبار نعمت میسر اسباب معاش اور دنیا میں زندہ رہنا رحمن سے مفہوم ہوتا ہے۔ چوتھے باعتبار توفیق اصلاح معاد مضمون رحم ہے۔ پانچویں نعمت جزا پر ترتب اکمال حمد و شکر پر ملک یوم الدین ہے۔ دوسرے پہلو یہ بھی واضح ہے کہ عبادت مقتضائے الوہیت ہے اور استعانت بمقتضائے ربوبیت ہے اور طلب ہدایت بمقتضائے رحمانیت ہے اور استقامت بمقتضاء اسم رحیم ہے اور یہ پانچ انعام بمقتضائے مالکیت ہیں۔ اب ایاک نعبد کے معلق عرض ہے۔ عربی زبان میں تقدیم مفعول مفید اختصاص ہے جیسا کہ آیہ کریمہ ایاک نعبد میں ہے اس کے یہ معنی ہیں کہ ہم سوا تیرے کسی کی عبادت نہیں کرتے اور یہاں لفظ نعبد سے یہ اختصاص مفہوم نہیں ہوتا بلکہ وجہ اختصاص عبادت اس ذات پاک سے یہ ہے کہ حقیقت عبادت غایت تذلل ہے جو نہایت تعظیم کے لیے کی جاتی ہے۔ تو یہ عبادت اور تعظیم اگر تسخیراً ہے یا تمسخر تو یہ عبادت اظہار تذلل کے لیے نہیں ایسے ہی اگر تذلل اضطراراً ہو تو وہ بھی عبادت نہیں اور اسے محسوب بعبادت نہیں کیا جاسکتا اس لیے کہ تسخیر تمسخراً یا اضطراراً جو عبادت ہو گی وہ بداہتہ کسی کے لیے مسلم نہیں ہو گی جب تک کہ وہ عبادت ایسے ہو کہ اپنے منعم کی طرف سے نعمت حاصل کر کے اظہار شکر کے لیے ادا کرے اور ایسا منعم

حقیقی سوا اس ذات واجب تعالیٰ شانہ کے اور کوئی بھی نہیں ہو سکتا۔

(تفسیر الحسنات۔علامہ ابو الحسنات سید محمد احمد قادری)

حصول مقصد کا بہترین طریقہ

جمہور نے صراط پڑھا ہے۔ بعض نے سراط کہا ہے اور زے کی بھی ایک قراۃ ہے۔ فرا کہتے ہیں بنی عذرہ اور بنی کلب کی قراۃ یہی ہے چونکہ پہلے ثناوصفت بیان کی تو اب مناسب تھا کہ اپنی حاجت طلب کرے۔ جیسے کہ پہلے حدیث میں گزر چکا ہے کہ اس کا آدھا حصہ میرے لیے ہے اور آدھا میرے بندے کے لیے اور میرے بندے کے لیے وہ ہے جو وہ طلب کرے۔ خیال کیجئے کہ اس میں کس قدر لطافت اور عمدگی ہے کہ پہلے پروردگار عالم کی تعریف وتوصیف کی، پھر اپنی اور اپنے بھائیوں کی حاجت طلب کی۔ یہ وہ لطیف انداز ہے جو مقصود کو حاصل کرنے اور مراد کو پالینے کے لیے تیر بہدف ہے، اس کامل طریقہ کو پسند فرما کر اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کی ہدایت کی۔ کبھی سوال اس طرح ہوتا ہے کہ سائل اپنی حالت اور حاجت کو ظاہر کر دیتا ہے جیسے موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا تھا آیت (رب انی لما انزلت الی من خیر فقیر) پروردگار جو بھلائیاں تو میری طرف نازل فرمائے میں اس کا محتاج ہوں۔ حضرت یونس (علیہ السلام) نے بھی اپنی دعا میں کہا آیت (اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّىْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ) 21۔الانبیآء:87)
الٰہی تیرے سوا کوئی معبود نہیں تو پاک ہے میں ظالموں میں سے ہوں کبھی سوال اس طرح بھی ہوتا ہے کہ سائل صرف تعریف اور بزرگی بیان کر کے چپ ہو جاتا ہے جیسے کسی شاعر کا قول ہے کہ مجھے اپنی حاجت کے بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تیری مہربانیوں بھری بخشش مجھے کافی ہے میں جانتا ہوں کہ دادودہش تیری پاک عادتوں میں داخل ہے لیکن تیری پاکیزگی بیان کر دینا، تیری حمد وثنا کرنا ہی مجھے اپنی حاجت پوری کرنے کے لیے کافی ہے۔ ہدایت کے معنی یہاں پر ارشاد اور توفیق کے ہیں۔ کبھی تو ہدایت بنفسہ متعدی ہوتی ہے جیسے یہاں ہے تو معنی حدیث (الهمنا وفقنا ارزقنا اور اعطنا) یعنی ہمیں عطا فرمائے ہوں گے اور جگہ ہے آیت (وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ) 90۔البلد :10) یعنی ہم نے اسے دونوں راستے دکھا دیئے بھلائی اور برائی دونوں کے۔ اور کبھی ہدایت "الی" کے ساتھ متعدی

ہوتی ہے جیسے فرمایا آیت (اِجْتَبٰىهُ وَهَدٰىهُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ) 16۔ النحل:121) اور فرمایا آیت (فَاهْدُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطِ الْجَحِيْمِ) 37۔ الصافات:23) یہاں "ہدایت" ارشاد اور دلالت کے معنی میں ہے۔ اسی طرح فرمان ہے آیت (وانک لتھدی) الخ یعنی تو البتہ سیدھی راہ دکھاتا ہے اور کبھی ہدایت لام کے ساتھ متعدی ہوتی ہے جیسے جنتیوں کا قول قرآن کریم میں ہے آیت (اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰىنَا لِهٰذَا ۣ وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَآ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ) 7۔ الاعراف:43) یعنی اللہ کا شکر ہے کہ اس نے ہمیں اس کی راہ دکھائی یعنی توفیق دی اور ہدایت والا بنایا۔ صراط مستقیم کے معنی سنئے۔ امام ابو جعفر ابن جریر فرماتے ہیں مراد اس سے واضح اور صاف راستہ ہے جو کہیں سے ٹیڑھا نہ ہو۔ عرب کی لغت میں اور شاعروں کے شعر میں یہ معنی صاف طور پر پائے جاتے ہیں اور اس پر بیشمار شواہد موجود ہیں۔ صراط کا استعمال بطور استعارہ کے قول اور فعل پر بھی آتا ہے اور پھر اس کا وصف استقامت اور ٹیڑھا پن کے ساتھ بھی آتا ہے۔ سلف اور متاخرین مفسرین سے اس کی بہت سی تفسیریں منقول ہیں اور ان سب کا خلاصہ ایک ہی ہے اور وہ اللہ اور رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اتباع اور تابعداری ہے۔

صراط مستقیم کیا ہے؟

ایک مرفوع حدیث میں ہے کہ صراط مستقیم کتاب اللہ ہے۔ ابن ابی حاتم اور ابن جریر نے بھی روایت کی ہے فضائل قرآن کے بارے میں پہلے حدیث گزر چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مضبوط رسی، حکمتوں والا ذکر اور سیدھی راہ یعنی صراط مستقیم یہی اللہ کی کتاب قرآن کریم ہے۔ مسند احمد ترمذی حضرت علی کا قول بھی یہی ہے اور مرفوع حدیث کا بھی موقوف ہونا ہی زیادہ مشابہ ہے واللہ اعلم۔ حضرت عبداللہ سے بھی یہی روایت ہے ابن عباس کا قول ہے کہ جبرائیل (علیہ السلام) نے کہا کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آیت (اھدنا الصراط مستقیم) کہئے یعنی ہمیں ہدایت والے راستہ کا الہام کر اور اس دین قیم کی سمجھ دے جس میں کوئی کجی نہیں۔ آپ سے یہ قول بھی مروی ہے کہ اس سے مراد اسلام ہے۔ ابن عباس، ابن مسعود اور بہت سے صحابہ سے بھی یہی تفسیر منقول ہے۔ حضرت جابر (رض) فرماتے ہیں صراط مستقیم سے مراد اسلام ہے جو ہر اس چیز سے جو آسمان اور زمین کے درمیان ہے زیادہ

وسعت والا ہے۔ ابن حنفیہ فرماتے ہیں اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا وہ دین ہے جس کے سوا اور دین مقبول نہیں۔ عبدالرحمن بن زید بن اسلم کا قول ہے کہ صراط مستقیم اسلام ہے۔ مسند احمد کی ایک حدیث میں بھی مروی ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک مثال بیان کی کہ صراط مستقیم کے دونوں طرف دو دیواریں ہیں، ان میں کئی ایک کھلے ہوئے دروازے اور دروازوں پر پردے لٹک رہے ہیں، صراط مستقیم کے دروازے پر ایک پکارنے والا مقرر ہے، جو کہتا ہے کہ اے لوگو! تم سب کے سب اسی سیدھی راہ پر چلے جاؤ، ٹیڑھی ترچھی ادھر ادھر کی راہوں کو نہ دیکھو نہ ان پر جاؤ۔ اور اس راستے سے گزرنے والا کوئی شخص جب ان دروازوں میں سے کسی ایک کو کھولنا چاہتا ہے تو ایک پکارنے والا کہتا ہے خبر دار اسے نہ کھولنا۔ اگر کھولا تو اس راہ لگ جاؤ گے اور صراط مستقیم سے ہٹ جاؤ گے۔ پس صراط مستقیم تو اسلام ہے اور دیواریں اللہ کی حدیں ہیں اور کھلے ہوئے دروازے اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ چیزیں ہیں اور دروازے پر پکارنے والا قرآن کریم ہے اور راستے کے اوپر سے پکارنے والا زندہ ضمیر ہے جو ہر ایماندار کے دل میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطور واعظ کے ہوتا ہے۔ یہ حدیث ابن ابی حاتم ابن جریر ترمذی اور نسائی میں بھی ہے اور اس کی اسناد حسن صحیح ہیں واللہ اعلم۔ مجاہد فرماتے ہیں اس سے مراد حق ہے۔ ان کا قول سب سے زیادہ مقبول ہے اور مذکورہ اقوال کا کوئی مخالف نہیں۔ ابو العالیہ فرماتے ہیں اس سے مراد نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور آپ کے بعد کے آپ کے دونوں خلیفہ ہیں۔ ابو العالیہ اس قول کی تصدیق اور تحسین کرتے ہیں دراصل یہ سب اقوال صحیح ہیں اور ایک دوسرے سے ملے جلے ہیں۔ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور آپ کے دونوں خلفاء صدیق و فاروق کا تابعدار حق کا تابع ہے اور حق کا تابع اسلام کا تابع ہے اور اسلام کا تابع قرآن کا مطیع ہے اور قرآن اللہ کی کتاب اس کی طرف کی مضبوط رسی اور اس کی سیدھی راہ ہے۔ لہٰذا صراط مستقیم کی تفسیر میں یہ تمام اقوال صحیح ہیں اور ایک دوسرے کی تصدیق کرتے ہیں۔ فالحمدللہ۔ حضرت عبداللہ فرماتے ہیں۔ صراط مستقیم وہ ہے جس پر ہمیں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے چھوڑا۔ امام ابو جعفر بن جریر (رح) کا فیصلہ ہے کہ میرے نزدیک اس آیت کی تفسیر میں سب سے اولیٰ یہ ہے کہ ہم کو توفیق دی جائے اس کی جو اللہ کی مرضی کی ہو اور جس پر چلنے کی وجہ سے اللہ اپنے بندوں سے راضی ہوا ہو اور ان پر انعام کیا ہو، صراط مستقیم یہی ہے۔ اس لیے کہ جس شخص کو اس کی توفیق مل جائے جس کی توفیق اللہ کے نیک بندوں کو تھی جن پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہوا تھا جو نبی، صدیق، شہید

اور صالح لوگ تھے انھوں نے اسلام کی اور رسولوں کی تصدیق کی، کتاب اللہ کو مضبوط تھام رکھا، اللہ تعالیٰ کے احکام کو بجالائے۔ اس کے منع کئے ہوئے کاموں سے رک گئے اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور آپ کے چاروں خلیفوں اور تمام نیک بندوں کی راہ کی توفیق مل جائے گی تو یہی صراط مستقیم ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ مومن کو تو اللہ کی طرف سے ہدایت حاصل ہو چکی ہے پھر نماز اور غیر نماز میں ہدایت مانگنے کی کیا ضرورت ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ مراد اس سے ہدایت پر ثابت قدمی اور رسوخ اور بینائی اور ہمیشہ کی طلب ہے اس لیے کہ بندہ ہر ساعت اور ہر حالت میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا محتاج ہے وہ خود اپنی جان کے نفع نقصان کا مالک نہیں بلکہ دن رات اپنے اللہ کا محتاج ہے اسی لیے اسے سکھایا کہ ہر وقت وہ اللہ تعالیٰ سے ہدایت طلب کرتا رہے اور ثابت قدمی اور توفیق چاہتا رہے۔ بھلا اور نیک بخت انسان وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ اپنے در کا بھکاری بنالے وہ اللہ ہر پکارنے والے کی پکار کے قبول کرنے کا کفیل ہے۔ بالخصوص بے قرار محتاج اور اس کے سامنے اپنی حاجت دن رات پیش کرنے والے کی ہر پکار کو قبول کرنے کا وہ ضامن ہے۔ اور جگہ قرآن کریم میں ہے۔ آیت (يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰي رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ)4۔ النسآء:136) اے ایمان والو اللہ پر، اس کے رسولوں پر اس کی اس کتاب پر، جو اس نے اپنے رسول کی طرف نازل فرمائی اور جو کتابیں اس سے پہلے نازل ہوئیں، سب پر ایمان لاؤ۔ اس آیت میں ایمان والوں کو ایمان لانے کا حکم دینا اور ہدایت والوں کو ایمان لانے کا حکم دینا ایسا ہی ہے جیسے یہاں ہدایت والوں کو ہدایت کی طلب کرنے کا حکم دینا۔ مراد دونوں جگہ ثابت قدمی اور استمرار ہے اور ایسے اعمال پر ہیشگی کرنا جو اس مقصد کے حاصل کرنے میں مدد پہنچائیں۔ اس پر یہ اعتراض وارد ہو بھی نہیں سکتا کہ یہ حاصل شدہ چیز کا حاصل کرنا ہے۔ واللہ اعلم۔ اور دیکھئے اللہ رب العزت نے اپنے ایمان دار بندوں کو حکم دیا ہے کہ وہ کہیں آیت (رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ)3۔ آل عمران:8) یعنی اے ہمارے رب ہمارے دلوں کو ہدایت کے بعد ٹیڑھا نہ کر اور ہمیں اپنے پاس سے رحمت عطا فرما تو بہت بڑا دینے والا اور عطا کرنے والا ہے۔ یہ بھی وارد ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق (رض) نماز مغرب کی تیسری رکعت سورۃ فاتحہ کے بعد اس آیت کو پوشیدگی سے پڑھا کرتے تھے پس آیت (اھدنا الصراط المستقیم) کے معنی یہ ہوئے کہ اللہ ہمیں صراط مستقیم پر ثابت قدم رکھ اور اس سے ہمیں نہ ہٹا۔

(تفسیر ابن کثیر۔حافظ عماد الدین ابو الفداء ابن کثیر)

(۲) اللہ تعالیٰ کی صفات اور اس کی معرفت کے درجات غیر متناہی ہیں اور نمازی معرفت کے جس درجہ میں ہے وہ اس سے اگلے مقام کی معرفت کی دعا کرتا ہے ' خلاصہ یہ ہے کہ میری ہدایت میں ترقی عطا فرما۔ یہ خواص مسلمین کے اعتبار سے ہے۔ اور اس کی تائید ان آیات میں ہے:

(آیت) "ویزید اللہ الذین اھتدوا ھدی"۔ (مریم:۷۶) اور ہدایت یافتہ لوگوں کی ہدایت میں اللہ تعالیٰ زیادتی فرماتا ہے۔

(آیت) "والذین اھتدوا زادھم ھدی واتھم تقوھم (محمد:۱۷) اور ہدایت یافتہ لوگوں کی ہدایت کو اللہ نے زیادہ کیا اور انھیں ان کا تقوی عطا فرمایا۔

(آیت) "وللاخرۃ خیر لك من الاولی ' (الضحی:۴) اور بیشک آپ کی ہر بعد کی گھڑی ' پہلی گھڑی سے بہتر ہے۔

جمع کے صیغہ سے دعا کرنے کی وجہ اور ربط آیات:

دوسرا سوال یہ ہے کہ یہاں جمع کے صیغہ سے دعا کی تعلیم ہے "" ہم کو سیدھے راستہ پر چلا " واحد کا صیغہ کیوں نہیں ہے؟ " مجھ کو سیدھے راستہ پر چلا " اس کا جواب یہ ہے کہ جب نمازی تمام مسلمانوں کے لیے دعا کرے گا تو ان میں کچھ اللہ کے مقرب اور مقبول بندے بھی ہوں گے جن کے حق میں اللہ تعالیٰ دعا کو قبول فرمائے گا اور یہ اس کے کرم عمیم سے بعید ہے کہ وہ بعض کے حق میں دعا قبول کرے اور باقی بعض کے حق میں دعا کو مسترد کر دے۔

ان آیات میں ربط اس طرح ہے کہ جب بندوں نے کہا: اے پروردگار! ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ سے ہی مدد چاہتے ہیں تو گویا اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تمہاری مہمات یا عبادات میں ' میں تمہاری کیسے مدد کروں؟ پس بندوں نے کہا: ہمیں دین اسلام پر چلا اور چونکہ دین اسلام پر چلنا اللہ کی خاص نعمت ہے اس لیے فرمایا:

ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام فرمایا نہ ان لوگوں کا راستہ جن پر غضب ہوا اور نہ گمراہوں کا (الفاتحہ:۷)

جن لوگوں پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ہے وہ گزشتہ امتوں میں سے انبیاء ' صدیقین ' شہداء اور صالحین ہیں۔ امام ابن جریر (رح) نے اپنی سند کے ساتھ حضرت ابن عباس (رض) سے روایت کیا ہے: ہمیں ان لوگوں کے راستہ پر چلا جن

پر تونے اپنی اطاعت اور عبادت کا انعام کیا ہے جو ملائکہ ' انبیاء 'صدیقین 'شہداء اور صالحین ہیں 'جنہوں نے تیری اطاعت اور عبادت کی۔ (جامع البیان ج ا ص ۵۹-۵۸ 'مطبوعہ دارالمعرفۃ بیروت '۱۴۰۹ھ)

یہاں پر اللہ تعالیٰ نے انعام یافتہ لوگوں کا اجمالاً ذکر کیا ہے اور اس کی تفصیل ان آیتوں میں ہے:

انعام یافتہ لوگوں کا بیان

(آیت) "ومن یطع اللہ والرسول فاولئك مع الذین انعم اللہ علیھم من النبیین والصدیقین والشھدآء والصلحین۔ (النساء:۶۹)

اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کریں گے وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام کیا جو انبیاء 'صدیقین 'شہداء اور صالحین ہیں۔

(آیت) اولئك الذین انعم اللہ علیھم من النبیین من ذریة ادم وممن حملنا مع نوح، ومن ذریة ابرھیم واسرآءیل وممن ھدینا واجتبینا اذا تتلی علیھم ایت الرحمن خروا سجدا وبکیا (مریم:۵۸)

جن لوگوں پر اللہ نے انعام کیا وہ اولاد آدم میں سے انبیاء ہیں اور ان لوگوں (کی نسل) سے جن کو ہم نے نوح کے ساتھ (کشتی میں) سوار کیا 'اور ابراہیم اور یعقوب کی نسل سے اور ان میں سے جن کو ہم نے ہدایت دی اور ان کو منتخب کر لیا 'جب ان پر رحمن کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو وہ سجدہ کرتے ہیں اور روتے ہوئے گر پڑتے ہیں

انعام یافتہ لوگوں کے راستوں کا بیان

ان انعام یافتہ نفوس قدسیہ پر چلنے کا تقاضا یہ ہے کہ بندہ اپنے آپ کو بالکلیہ اطاعت الٰہی اور اس کی قضاء پر راضی ہونے میں جذب کر لے 'اور ایسا ہو جائے کہ اگر اس کو یہ حکم دیا جائے کہ وہ اپنے بیٹے کو ذبح کر دے تو اس کی اس طرح اطاعت کرے جیسے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے کی تھی 'اور اگر خود اس کو ذبح ہونے کا حکم دیا جائے تو اپنے آپ

کو حضرت اسماعیل (علیہ السلام) کی طرح ذبح کے لیے تیار پائے، اور اگر کسی بڑے منصب پر فائز ہونے کے بعد اس کو کسی سے علم حاصل کرنے کا حکم دیا جائے تو حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی طرح طلب علم کے لیے روانہ ہو جائے ' اور اپنی بڑائی کو عار نہ بنائے اور اگر اس کو یہ حکم دیا جائے کہ نیکی کا حکم دے اور برائی سے روکے خواہ اس راہ میں اس کو آرے سے چیر دیا جائے تو حضرت یحیٰ (علیہ السلام) اور زکریا (علیہ السلام) کی طرح قتل ہو جائے اور اف نہ کرے ' سخت موذی بیماریوں میں مبتلا کیا جائے تو حضرت ایوب (علیہ السلام) کی طرح صبر کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دے ' اگر قاضی اور حاکم بنے تو عدل اور انصاف کے سامنے جھکنے میں عار محسوس نہ کرے اور اگر اس کے بیٹے کا کیا ہوا فیصلہ اس کے ہوئے فیصلہ کے مقابلہ میں صحیح ہو تو قبول حق کے راستہ میں انانیت کو نہ آنے دے ' جیسے حضرت داؤد (علیہ السلام) نے اپنے کئے ہوئے فیصلہ کے مقابلہ میں حضرت سلیمان (علیہ السلام) کے فیصلہ کو راجح قرار دیا تھا ' اور سلطنت اور شاہی ملے تو حکومت کے رعب اور دبدبہ میں اللہ کی یاد ' عبادت و ریاضت اور شب بیداری کو نہ بھولے ' جیسے حضرت سلیمان (علیہ السلام) اتنی عظیم الشان حکومت ملنے کے باوجود اطاعت الٰہی سے غافل نہ تھے اور رکوع اور سجدوں میں راتیں گزارتے تھے اور اگر قضاء الٰہی سے کسی بلا اور مصیبت میں گرفتار ہو جائے تو شکوہ و شکایت نہ کرے بلکہ اپنے قصور نفس کا اعتراف کرے اور اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تہلیل میں مصروف رہے جیسے حضرت یونس (علیہ السلام) مچھلی کے پیٹ میں گرفتار ہو کر بھی اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تہلیل کرتے رہے ' اگر نوجوان ' حسین و جمیل اور پیارا بیٹا گم ہو جائے تو حرف شکایت زبان پر نہ لائے اور حضرت یعقوب (علیہ السلام) کی طرح صبر جمیل کرے ' اور اگر کوئی بااختیار و اقتدار حسین و جمیل عورت کسی جوان مرد کو گناہ کی دعوت دے تو قید خانے میں جانا منظور کر لے اور گناہ سے دامن بچائے رکھے اور جب قید خانہ میں جائے تو وہاں بھی دعوت و ارشاد کو نہ بھولے اور وہاں کے قیدیوں کو اللہ کی توحید اور اس کی اطاعت کی دعوت دے اور یہ حضرت یوسف (علیہ السلام) کا اسوہ اور نمونہ ہے اور ان کا راستہ ہے۔

یہ سابق انعام یافتہ لوگوں کی سیرتوں کا اجمالی بیان ہے اور سب سے زیادہ انعام حضرت سید المرسلین و سیدنا محمد مصطفے (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر کیا گیا ہے اور ان کی سیرت تمام انبیاء سابقین کی سیرتوں کی جامع ' کامل ' اتم اور اکمل ہے اور یہ سارا قرآن انہی کی سیرت کا بیان ہے اور اس کی تفصیل آپ کی احادیث اور سنت میں ہے ' اس لیے قرآن اور

سنت ہی دراصل صراط مستقیم ہے ' اس لیے جو شخص انعام یافتہ نفوس قدسیہ کی صراط مستقیم پر چلنا چاہتا ہو وہ قرآن اور سنت کو دانتوں سے پکڑلے اور اس پر پورا پورا عمل کرے۔

اَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ سے مراد

دوسری بات جو اس میں غور کرنے سے معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ یہاں صراط مستقیم کی وضاحت کے لیے کچھ ایسے لوگوں کا حوالہ دیا گیا ہے جن پر اس صراط مستقیم کا حق ادا کرنے کے باعث انعام واکرام ہوا۔ حالانکہ اس کی وضاحت کے لیے یہ بات کہی جاسکتی تھی، کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کا راستہ ہے تم اسے اختیار کرو۔ تو بجائے صراط اللہ یا صراط الرسول کہنے کے آخر اس تعبیر میں کیا حکمت ہے۔ حقیقت تو اللہ جانتا ہے لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس میں انسانی فطرت کا لحاظ کیا گیا ہے۔ انسانی فطرت یہ ہے کہ وہ کتابوں سے اس قدر نہیں سیکھتی جس قدر انسانی شخصیات سے متاثر ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ نے انسانوں کی ہدایت کے لیے صرف کتابیں نہیں اتاریں بلکہ نبی اور رسول بھی بھیجے۔ کیونکہ کتاب کے الفاظ انسانی تربیت کے لیے کافی نہیں ہوتے۔ بلکہ انسان تربیت کے لیے انسانی شخصیات کی ضرورت پڑتی ہے۔ ماں کی گود بچے کا پہلا مدرسہ ثابت ہوتی ہے۔ اس مدرسے کے کھینچے ہوئے نقوش دیرپا ثابت ہوتے ہیں۔ اس سے صرف معلومات نہیں ملتیں بلکہ کردار اور صالح احساس ملتا ہے۔ کیونکہ کورس تو لفظ ہی سکھاتے ہیں آدمی آدمی بناتے ہیں۔

اگر صرف صراط اللہ کہا جاتا تو اللہ کے راستے کی تلاش اور اس پر چلنے میں ہزاروں الجھنیں پیدا ہوتیں اسی طرح اگر صراط رسول کہہ دیا جاتا تو وہ بھی وضاحت کے لیے کافی نہ ہوتا۔ کیونکہ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی حیات ظاہری ہمیشہ کے لیے نہیں تھی۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد یقیناً اس راستے کے تعین میں دشواری ہوتی شاید یہی وجہ ہے کہ جب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے پوچھا گیا کہ جب یہ امت پچھلی امتوں کی طرح مختلف فرقوں میں بٹ جائے گی تو ان میں سے کون سی جماعت حق پر ہوگی۔ تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہاں بھی محسوس انسانوں کا حوالہ دیا تاکہ راستے کے تعین میں دشواری پیش نہ آئے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا **ماانا علیہ و اصحابی** "جس پر میں ہوں اور میرے صحابہ ہیں۔ "یعنی

میرے بعد تمہیں اس راستے پر چلنے میں رہنمائی میرے صحابہ سے ملے گی۔ اب سوال یہ ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے جن مخصوص لوگوں کی طرف یہ کہہ کر اشارہ کیا ہے کہ جن پر اللہ نے انعام کیا ہے یعنی وہ اللہ کا انعام یافتہ گروہ ہے وہ کون ہیں؟ اس کا جواب ایک دوسری آیت کریمہ میں دیا گیا ہے۔ ارشاد فرمایا:

الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ

(النساء:۴۔۶۹)

(وہ لوگ جن پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہوا وہ انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین ہیں)

1۔ نبی

تو یہ چار طرح کے لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہوتا رہا۔ دنیا میں بھی جن کی حفاظت فرمائی اور عزت اور سرفرازی سے نوازا اور آخرت میں بھی یہی لوگ سربلند ہوں گے۔ تاریخ شاہد ہے کہ طوفان نوح آیا تو کشتی نجات نے ان کو اپنی آغوش میں جگہ دی جو نوح (علیہ السلام) پر ایمان لانے والے اور اس راستے کے مسافر تھے۔ اور جتنے لوگوں نے اس راستے پر چلنے سے انکار کیا وہ سب اس طوفان کی نذر ہو گئے۔ قوم عاد قوم ثمود قوم لوط قوم صالح اور بھی چند قوموں کے انجام تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہیں ہر جگہ ایک ہی حقیقت کار فرما نظر آتی ہے۔ کہ انبیاء اور ان کے ساتھی بچ گئے اور ان کے مخالفین کو تباہ کر دیا گیا۔ اب قیامت تک کے لیے یہی اصول بتا دیا گیا کہ وہ لوگ جو راہ راست اختیار کریں گے اور نبی آخر الزمان کے طریقے پر چلیں گے وہ دنیا اور آخرت میں کامیاب ہوں گے اور جو ان کے راستے پر چلنے سے انکار کر دیں گے وہ خائب و خاسر ہوں گے اسی لیے قرآن کریم نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف سے یہ اعلان کیا گیا وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ (الانعام:۶۔۱۵۳) یہ ہے میرا سیدھا راستہ اسی کی پیروی کرو۔ یعنی میں جس راستے کی دعوت دے رہا ہوں جس پر میں خود چل رہا ہوں مجھ پر جو شریعت نازل ہوئی ہے اور جو مجھ پر کتاب اتری ہے اور جسے میں نے اپنے عمل سے سنت بنا دیا ہے۔ اور جسے میں نے اپنے جذبے ایثار اور استقامت سے تحریک کی شکل دے دی ہے اور پھر جس طرح مخالفتوں کے ہجوم میں میں نے یقین کی قوت اور اعتماد علی اللہ سے اس تحریک کو آگے بڑھایا اور اپنے اصحاب کو حوصلے کا سامان بخشا ہے اور پھر جس

طرح دعوت الی اللہ کو زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ اور سب سے بڑی متاع کے طور پر پیش کیا ہے اور جس طرح قدم قدم پر دین کو دنیا پر ترجیح دی اور عبادات کے سوز سے حُبِّ دنیا کے بحران کو سرد کیا ہے اور جس طرح مادی دنیا میں فنا ہونے والوں کو اور دنیوی نعمتوں کے رسیا لوگوں کو آخرت کا مسافر بنایا ہے یہ وہ صراط مستقیم ہے۔ جو شخص اس کی پیروی کرے گا۔ وہی میرا پیروکار ہو گا اور وہی صراط مستقیم پر ہو گا۔ البتہ اس راستے پر چلنے والے سارے یکساں نہیں ہوں گے۔ اور نہ اس راستے پر چلنے والوں کی ضرورتیں اور صفات یکساں ہیں۔ اس لیے تم اپنی ہمت طلب اور ضرورت کے مطابق اس راستے کے رہنماؤں کو چننا۔ لیکن یہ دیکھنا کہ ان میں سے کسی کا عمل اور طرز عمل میری سنت کے خلاف نہ ہو۔ یعنی تمہیں اپنی رہنمائی اور زندگی بنانے کے لیے ہر دور میں ایسے رہنماؤں کی ضرورت ہو گی جو محسوس شکل میں تمہارے لیے رہنمائی فراہم کر سکیں اور تمہارے لیے نمونہ بن سکیں لیکن انھیں اختیار کرنے سے پہلے یہ ضرور دیکھ لینا کہ ان کا عمل کتاب و سنت کے مطابق ہے یا نہیں وہ تین طرح کے لوگ ہوں گے صدیق، شہید اور صالح۔ اب ہم ہر ایک کی اختصار سے وضاحت کرتے ہیں۔

2۔ صدیق

صدیق صراط مستقیم پر چلنے والے قافلے میں سب سے مخلص سب سے متقی، سب سے زیادہ وفاشعار اور سب سے زیادہ ایثار پیشہ فرد کا نام ہے۔ جو بھی اسلامی تعلیمات پر عمل کرتے ہوئے اس کی معراج کو پہنچنے کی کوشش میں زندگی گزار دے گا وہ صدیق کے مرتبے پر فائز ہو سکتا ہے اس لیے عام طور پر اللہ کے ہر ولی کو صدیق کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ لیکن اسلام کی تاریخ میں حضرت ابو بکر صدیق کا نام چونکہ ایک استعارہ بن گیا ہے اور قرآن کریم کی آیت نے اس لفظ کو ایک اصطلاح کے طور پر استعمال کیا ہے۔ اس لیے اہل علم کا خیال ہے کہ صدیق اصل میں اس عظیم شخصیت کو کہتے ہیں جو کمالات ظاہری کے ساتھ کمالات باطنی میں بھی سب سے بڑھا ہوا ہو اس کا باطن اس قدر مصفا اور مجلا ہو کہ ایمانیات اور احکام شریعت کا عکس اس طرح اس کے باطن پر آسانی سے ثبت ہو جائے جس طرح آئینے کے سامنے اگر شمع جلائی جائے تو شمع جلتے ہی آئینے میں اس کا عکس بھی جل اٹھتا ہے۔ حضرت صدیق اکبر کے بارے میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد بھی اس بات کو واضح کرتا ہے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے

فرمایا کہ میں نے جس کسی کے سامنے بھی اسلام پیش کیا اسے ماننے میں تھوڑا یا زیادہ تردد ضرور پیش آیا لیکن جب میں نے ابو بکر کے سامنے اسلام پیش کیا تو ایسا معلوم ہوا جیسے وہ اس کے لیے پہلے سے تیار تھے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ہر ارشاد اور حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ہر عمل حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ہر پسند آپ کے آئینۂ دل کے سامنے شمع کی طرح جل اٹھتی تھی۔ معاہدہ حدیبیہ میں آپ کا حضرت عمر فاروق کو جواب معراج کے واقعہ میں آپ کا قریش مکہ کو جواب اور بعض آیات کے نزول کے وقت فوراً اس کی مراد کو پاجانا ایسی بہت ساری مثالیں آپ کے مقام صدیقیت کو نمایاں کرتی ہیں۔ مشکل اور پر خطر حالات میں استقامت کا ثبوت دینا یوں تو ہر مرد مومن کی صفت ہے لیکن اس لحاظ سے بھی صدیق دوسرے اصحاب ایمان کے لیے نمونہ ہوتا ہے۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے انتقال پر ملال کے بعد حضرت صدیق اکبر کا طرز عمل اس کی نمایاں شہادت ہے۔ مزید ہم یہ دیکھتے ہیں کہ صفات صدیق میں سب سے بڑی صفت یہ ہوتی ہے کہ وہ ہمیشہ عزیمت پر عمل کرتا ہے اور اللہ اور اس کا رسول اس کے لیے ایسی متاع عزیز بن جاتے ہیں کہ وہ ان کے مقابلے میں جائز سہولتوں سے فائدہ اٹھانا بھی گناہ سمجھتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ تمام صحابہ نے اللہ کی راہ میں بڑھ چڑھ کر انفاق اور ایثار کیا لیکن اپنے اور اپنے اہل خانہ کے لیے کچھ نہ کچھ بچا کر بھی رکھا لیکن حضرت صدیق اکبر سے جب بھی انفاق کا مطالبہ ہوا تو آپ نے سب کچھ اٹھا کر بارگاہ رسالت میں پیش کر دیا۔ یہی وہ مقام صدیقیت ہے جس کے لیے بطور اصطلاح یا استعارہ یہاں قرآن کریم نے اس لفظ کو استعمال کیا ہے۔ اور یہ ایک جامہ ہے جو حضرت صدیق اکبر پر راست آتا ہے۔ ٹھیک کہا اقبال نے:

پروانے کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس

صدیق کے لیے ہے خدا کا رسول بس

3۔ شہید

شہید کا معنی تو گواہ ہوتا ہے لیکن یہ لفظ بھی قرآن کریم میں بطور اصطلاح استعمال ہوا ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ شخص جو صرف اللہ کی خوشنودی کی خاطر اللہ کے کلمے کو بلند کرنے یا اسلامی ملک کے تحفظ کی خاطر یا مسلمانوں کے دفاع میں جان دے دیتا ہے، اس کو شہید کہتے ہیں۔ لیکن ایک دوسرے پہلو سے اس کے لفظی معنی اور اس کے اصطلاحی معنی میں یکسانیت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ اس طرح کہ جو آدمی اللہ کی دین کی سربلندی کے لیے سر کٹواتا ہے۔ وہ در حقیقت اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اللہ کے اس دین کی سچائی اور حقانیت میں کوئی شبہ نہیں کیونکہ اگر اس دین کی سچائی میں کوئی شبہ ہوتا تو میں اپنی زندگی جیسی انمول متاع کو کبھی اس پر قربان نہ کرتا۔ آدمی کسی چیز کی صداقت کے لیے تین طریقوں سے گواہی دیتا ہے۔ کبھی اپنی زبان سے اس کے حق میں کلمہ تائید کہہ کر اور کبھی اپنے عمل سے اسے اپنی زندگی کا طرز عمل بنا کر اور کبھی اس کے لیے مال و متاع اور بدرجہ آخر جان دے کر، زبان سے دی ہوئی گواہی میں شبہ کیا جاسکتا ہے۔ عمل پر بھی الزام دھرا جاسکتا ہے۔ لیکن جو آدمی اپنا سب کچھ حتیٰ کے زندگی بھی کسی صداقت پر قربان کر دیتا ہے اس پر شبہ کرنا سنگدلی یا کور ذوقی کے سوا کچھ نہیں۔ یہاں ایسے ہی لوگوں کا تذکرہ کیا جارہا ہے کہ وہ لوگ جو اپنا سب کچھ اللہ کے راستوں میں قربان کر دیتے ہیں وہ اللہ کے ایسے گواہ ہیں جن سے دین کو قوت ملتی ہے۔ انسانیت کو جلا ملتی ہے اور تاریخ آئندہ نسلوں کے لیے اسے ایک نمونے کے طور پر پیش کرتی ہے۔ کیونکہ انھوں نے اپنا خون دے کر ایک ایسی روشنی مہیا کی ہے جو تادیر تاریکیوں کو کافور کرتی رہے گی۔

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

4۔ صالحین

یہ صالح کی جمع ہے، اس کا معنی ہے نیکوکار۔ یعنی ایسا آدمی جو اپنے طرز عمل سے نیکی کی علامت بن جاتا ہے۔ یہ بھی شریعت کی اصطلاح ہے۔ اسے قرآن کریم نے مختلف جہتوں سے استعمال کیا ہے۔ لیکن ہم اس کا صرف عام معنی

عرض کر رہے ہیں۔ ایک ایسا شخص جو فرائض، واجبات، اور مستحبات کا پابند، آداب شریعت کا لحاظ رکھنے والا، حقوق العباد کا ادا کرنے والا اور دین کے تقاضوں کو بجالانے والا ہو، اسے صالح کہتے ہیں۔

ان تینوں اصطلاحات کے ذکر کرنے سے مقصود یہ معلوم ہوتا ہے کہ صراط مستقیم، اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا راستہ ہے۔ لیکن اس پر چلتے ہوئے تمہارے سامنے یہ تین طرح کے معیارات رہنے چاہئیں۔ تمہیں عام زندگی میں ایک صالح آدمی کی طرح زندگی گزارنا چاہیے۔ لیکن اگر کبھی اسلامی حمیت یا اسلامی ضرورت قربانی و ایثار کا تقاضا کرے تو سر کٹوانے سے بھی دریغ نہیں کرنا چاہیے۔ لیکن تمہارا اصل ہدف اس زندگی کا حصول ہے جس میں شہادت کی تڑپ اور حسن عمل کے نور کے ساتھ ساتھ آئینہ دل ایسی آب و تاب رکھتا ہو جس میں قرآن و سنت کے احکام اور اس راستے پر چلنے والوں کے اتباع کے سوا کوئی اور جذبہ اپنی جگہ نہ بنا سکے۔ یہی وہ دل ہے جس پر بالآخر اللہ کے انوار اور رحمتوں کی بارش ہوتی ہے۔

صراطِ مستقیم کی اس مثبت وضاحت کے بعد جس میں اس راستے پر چلنے والے ان نمائندہ لوگوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے جن کی حیثیت اس راستے کے رہنماؤں کی بھی ہے اور سنگ ہائے میل کی بھی۔ جن سے تاریخ کے ہر دور میں اس راستے پر چلنے والے فائدہ اٹھاتے رہے ہیں اور اٹھاتے رہیں گے۔ کیونکہ مسلمانوں کی تاریخ کا کوئی دور ایسا نہیں گزرا جب یہ تینوں نمونے مسلمانوں میں موجود نہ رہے ہوں۔ البتہ اس راستے کے ہر مسافر کے لیے انھیں تلاش کرنا ضروری ہے کیونکہ کوئی بھی قابل قدر نعمت کبھی تلاش کیے بغیر نہیں ملا کرتی۔

ہر مسافر کے لیے جس طرح راستے کی پہچان اور راہنماؤں کی شناخت ضروری ہے اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ راستے کی مشکلات اور منفی قوتوں کا بھی اسے علم ہو جو راستے میں اس کے لیے مشکلات کا باعث بن سکتی ہیں یا اس کے بہکانے کی کوشش کر سکتی ہیں۔ اسی طرح ان منفی قوتوں کے نمائندوں کی شناخت بھی ہونی چاہیے اور یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ جو لوگ صراط مستقیم چھوڑ کر دوسرے راستوں پر چلتے رہے ان کا انجام کیا ہوا۔ چنانچہ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ارشاد فرمایا: غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۔ ع (الفاتحہ:۷) ”جو نہ مغضوب ہوئے نہ گمراہ“۔

(آیت) ”مغضوب “کا معنی

علامہ راغب اصفہانی (رح) لکھتے ہیں: غضب کا معنی ہے: انتقام کے ارادے سے دل کے خون کا کھولنا اور جوش میں آنا ‘اس لیے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: غضب سے بچو کیونکہ یہ ایک انگارہ ہے جو بنو آدم کے دلوں میں دہکتا ہے کیا تم غضبان شخص کی گردن کی پھولی ہوئی رگوں اور اس کی سرخ آنکھوں کو نہیں دیکھتے ‘اور جب اس لفظ کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو اس سے صرف انتقام مراد ہوتا ہے۔

قرآن مجید میں ہے:

(آیت) ”وغضب اللہ علیہ ولعنہ “۔(النساء: ۹۴) اور اللہ (مومن کے قاتل سے) انتقام لے گا اور اس کو اپنی رحمت سے دور کرے گا۔

(آیت) المغضوب علیہم “کی تفسیر میں ایک قول یہ ہے کہ اس سے یہود مراد ہیں۔ (المفردات ص ۳۶۱ ‘ مطبوعہ المکتبۃ المرتضویہ ‘ایران ‘۱۳۴۲ ھ)

(آیت) ”المغضوب علیہم “کی ماثور تفسیر

امام ابن جریر (رح) نے متعدد اسانید کے ساتھ حضرت عدی بن حاتم (رض)، حضرت ابن عباس (رض)، حضرت ابن مسعود (رض) اور دیگر صحابہ کرام (رض) سے روایت کیا ہے کہ (آیت) ”المغضوب علیہم “سے مراد یہود ہیں (جامع البیان ج ۱ ص ۶۲۔ ۶۱ ‘مطبوعہ دارالمعرفتہ بیروت ‘۱۴۰۹ ھ)

مغضوب کا معنی بیان کرنے میں بعض علماء کی لغزش:

سید ابوالاعلی مودودی (رح) نے (آیت) ”المغضوب علیہم “کے ترجمہ میں لکھا ہے ”اور جو معتوب نہیں ہوئے“۔ (تفہیم القرآن ج ۱ ص ۴۵ ‘مطبوعہ ادارہ ترجمان القرآن ‘لاہور ‘۱۹۸۳ء)

ہمارے شیخ علامہ سید احمد کاظمی قدس سرہ العزیز اس پر تعاقب کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ایک معاصر نے (آیت) "غیر المغضوب علیهم "کا ترجمہ کرتے ہوئے لکھا "جو معتوب نہیں ہوئے " یہاں ""مغضوب "کا ترجمہ ""معتوب " صحیح نہیں 'عہد رسالت سے لے کر آج تک کسی نے یہ ترجمہ نہیں کیا 'بلکہ ادنی تامل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ غضب سے عتاب مراد لینا مراد الہی کے قطعا خلاف ہے 'اس لیے کہ اللہ کا غضب انہی لوگوں کے ساتھ ہے جن سے اللہ تعالیٰ نے ارادہ انتقام متعلق فرمایا۔ رہا "عتاب "تو فی الجملہ وہ رسولوں کی طرف بھی متوجہ ہوا۔ صحیحین کی متفق علیہ حدیث میں ہے۔ "عتب الله علیه "اللہ تعالیٰ نے موسیٰ (علیہ السلام) کو عتاب فرمایا۔ "(صحیح بخاری ج ا ص ۲۳) بلکہ سورۃ (آیت) "عبس و تولی "کی تفسیر میں یہ حدیث وارد ہے 'رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت عبد اللہ ابن مکتوم کی آمد پر فرمایا: "مرحبا بمن عاتبني فيه ربي "جس کی وجہ سے مجھ پر عتاب ہوا اس کو خوش آمدید (تفسیر ابن کبیر ج ۸ ص ۴۰۷، روح المعانی ج ۳۰ ص ۳۹، ابن جریر ج ۳۰۔ ۲۹۔ ۲۸، ارشاد الساری ج ۷ ص ۴۱۱) جس سے ظاہر ہوا کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف بھی عتاب متوجہ ہوا۔ اگر ""مغضوب "کا ترجمہ ""معتوب " صحیح مان لیا جائے تو معاذ اللہ حبیب و کلیم علیہما الصلوۃ والتسلیم بھی (آیت) "مغضوب علیهم "میں شامل ہو جائیں گئے۔ واضح رہے کہ غضب جو اللہ کی صفت ہے اس کی بنیاد صرف عقوبت اور ارادہ انتقام ہے 'اور اس عتاب کا مبنی مودت و محبت ہے۔ اہل لغت نے عتاب کے معنے "مخاطبۃ الادلال "لکھے ہیں یعنی محبوب کی لاپروائی یا بے توجہی پر محبت بھری خفگی کا اظہار۔ صاحب "لسان العرب "اور "صاحب تاج العروس "نے اس معنی پر بطور شاہد یہ شعر نقل کئے:

اعاتب ذا المودۃ من صدیق اذا ما رابنی منہ اجتناب
اذا ذھب العتاب فلیس ود و یبقی الود ما بقی العتاب۔

(لسان العرب ج ا ص ۵۷۷، تاج العروس ج ا ص ۳۶۵)

"محبت والے دوست کے ساتھ میں عتاب سے پیش آتا ہوں 'جب مجھے اس کی کنارہ کشی کا اندیشہ ہو 'جب عتاب گیا تو محبت بھی نہ رہی کہ محبت اسی وقت تک رہتی ہے جب تک عتاب باقی رہے "یعنی عتاب سے پیش آنا محبت کی نشانی ہے۔ اگر کہا جائے کہ اردو لغت کی کتابوں میں "غضب "کے معنی عتاب اور "عتاب "کے معنی غضب اور "

مغضوب "کے معنی "زیر عتاب "لکھے ہیں تو عرض کروں گا کہ ہر زبان کے علماء لغت کی طرح اردو لغت والوں نے بھی اپنی اردو زبان کے استعمالات و محاورات کو اردو لغت کی کتابوں میں جمع کر دیا ،مگر قرآن مجید "اردو "میں نہیں بلکہ عربی زبان میں نازل ہوا ہے۔ہر زبان کے محاروات و استعمالات اس کے ساتھ مخصوص ہوتے ہیں ،اس لیے اردو استعمالات پر عربی استعمالات کا قیاس درست نہیں ،بالخصوص قرآنی استعمالات میں غضب اللہ سے عتاب مراد لینا یا مغضوب کا ترجمہ معتوب کرنا کسی طرح صحیح نہیں۔(التبیان ج ا ص ۳۳۔۳۲ مطبوعہ کاظمی پبلیکیشنز ،ملتان ۱۹۹۳ء)

"ضالین "کے معنی

علامہ راغب اصفہانی (رح) لکھتے ہیں:

ضلال کے معنی ہیں: طریق مستقیم سے عدول اور اعراض کرنا ،اس کی ضد ہدایت ہے ،قرآن مجید میں ہے:(آیت) " من اھتدی فانما یھتدی لنفسہ، ومن ضل فانما یضل علیھا "۔(بنی اسرائیل:۱۵) جس نے ہدایت قبول کی تو اس نے اپنے ہی نفع کے لیے ہدایت قبول کی اور جو گمراہ ہوا تو اس کی گمراہی کا وبال اسی پر پڑا۔

صحیح راستہ سے ہر انحراف کو ضلال کہتے ہیں خواہ وہ انحراف عمدا ہو یا سہوا ،کم ہو یا زیادہ کیونکہ جو صحیح راستہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ ہے اس پر چلنا بہت دشوار ہے ،نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: مستقیم رہو اور تم ہرگز اس کا احاطہ نہ کر سکو گے ،بعض حکماء نے کہا: ہمارے صحت اور صواب پر ہونے کی ایک وجہ ہے اور ہمارے ضلال پر ہونے کی بہت سی وجوہ ہیں ،بعض صالحین نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خواب میں زیارت کی تو پوچھا: آپ نے یہ کیوں فرمایا تھا کہ مجھے سورۃ ھود اور اس کی نظائر نے بوڑھا کر دیا! ان میں آیت نے آپ کو بوڑھا کر دیا ، فرمایا:(آیت) "فاستقم کما امرت "،جس طرح تمہیں حکم دیا گیا ہے اس طرح مستقیم رہو۔ "(ھود:۱۱۲) اور جب کہ ضلال کا معنی ہے: طریق مستقیم کو ترک کرنا ،خواہ یہ ترک کرنا عمدا ہو یا سہوا ،کم ہو یا زیادہ تو ضلال کا استعمال متعدد وجوہ سے ہوتا ہے ،یہ لفظ انبیاء کرام (علیہم السلام) کے لیے بھی استعمال ہوا ہے اور کفار کے لیے بھی استعمال

ہوا ہے اگرچہ دونوں کی ضلالت میں بہت زیادہ فرق ہے ' حضرت یعقوب (علیہ السلام) کے متعلق ان کے بیٹوں نے کہا:

(آیت) "قالوا تاللہ انک لفی ضللک القدیم (یوسف:۹۵)

(ترجمہ) وہ بولے: اللہ کی قسم! یقیناً آپ اسی اپنی پرانی محبت میں ہیں

حضرت یوسف (علیہ السلام) کے ساتھ حضرت یعقوب (علیہ السلام) کو شدید محبت تھی اور یوسف (علیہ السلام) کے بھائیوں کے خیال میں یہ بے جا محبت تھی ' اس لیے انھوں نے اس محبت کو ضلال کے ساتھ تعبیر کیا۔ اسی طرح نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جو اللہ تعالیٰ کی محبت میں بالکل وارفتہ ہوگئے تھے تو آپ کو امت کی طرف متوجہ کرنے کے لیے فرمایا:

(آیت) "ووجدک ضآلا فھدی (الضحیٰ:۷) (ترجمہ) اور آپ کو (اپنی محبت میں) وارفتہ پایا تو (امت کی طرف) راہ دی

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا:

(آیت) "قال فعلتھا اذا وانا من الضالین "۔ (الشعراء:۲۰) (ترجمہ) موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا: میں نے وہ کام اس وقت کیا جب میں بیخبروں میں سے تھا

اس میں یہ تنبیہ ہے کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے قبطی کا قتل سہوا ہوا تھا ضلال نسیان کے معنی میں بھی مستعمل ہے:

(آیت) "ان تضل احدھما فتذکر احدھما الاخری: (البقرہ:۲۸۲) (ترجمہ) کہ ان دو میں سے کوئی ایک (عورت) بھول جائے تو ان میں سے دوسری اس کو یاد دلائے۔

علم اور عمل کے اعتبار سے ضلال کے دو اور معنی ہیں: ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت ' اس کی وحدانیت اور نبوت اور رسالت میں کوئی شخص صحیح راہ سے بھٹک جائے ' اس معنی کا استعمال اس آیت میں ہے:

(آیت) ”ومن یکفر باللہ وملئکتہ و کتبہ ورسلہ والیوم الاخر فقد ضل ضلا بعید(النساء:۱۳۶)
(ترجمہ) جو شخص اللہ ‘اس کے فرشتوں ‘اس کی کتابوں ‘اس کے رسولوں اور روز قیامت کے ساتھ کفر کرے تو بیشک وہ گمراہ ہوگیا(سیدھ راہ سے) بہت دور جا پڑا

دوسرا معنی ہے: عبادات اور احکام شرعیہ میں صحیح راہ سے بھٹک جانا، اس معنی کا استعمال اس آیت میں ہے۔
(آیت) ”ان الذین کفروا وصدوا عن سبیل اللہ قد ضلوا ضللا بعیدا (النساء:۱۶۷) بیشک جن لوگوں نے کفر کیا اور (لوگوں کو) اللہ کی راہ سے روکا یقیناً وہ گمراہ ہوگئے (سیدھی راہ سے) بہت دور جا پڑے

ضلال غفلت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے

(آیت) ”قال علمھا عند ربی فی کتب، لا یضل ربی ولا ینسی (طہ:۵۲)
(ترجمہ) (موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا: پچھلی قوموں کا) علم میرے رب کے پاس ایک کتاب (لوح محفوظ) میں ہے ‘میرا رب نہ غافل ہوتا ہے نہ بھولتا ہے

زیر بحث آیت میں ضالین سے مراد نصاری ہیں۔ (المفردات ص ۱۹۸۔ ۱۹۷ ‘مطبوعہ المکتبۃ المرتضویہ ‘ایران)

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور صحابہ کرام (رض) سے ضالین کی منقول تفسیر

امام ابن جریر (رح) لکھتے ہیں:
حضرت ابن مسعود (رض) اور کئی اصحاب (رض) سے مروی ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا:
(آیت) ”الضالین“ سے مراد نصاری ہیں۔ (جامع البیان ج ۱ ص ۶۴ ‘مطبوعہ دارالمعرفتہ بیروت ‘۱۴۰۹ ھ)
ہر وہ شخص جو سیدھے راستہ سے انحراف کرے اس کو عرب ضال کہتے ہیں ‘اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے عیسائیوں کو ضالین فرمایا ‘کیونکہ انھوں نے سیدھے راستہ سے انحراف کرکے غلط راستہ اختیار کرلیا۔ اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ

یہود نے بھی تو طریق مستقیم سے انحراف کر کے غیر طریق مستقیم اختیار کر لیا' پھر کیا وجہ ہے کہ ان کو مغضوب کی صفت کے ساتھ مخصوص کیا اور نصاری کو ضالین کی صفت کے ساتھ ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ دونوں ہی ضالین ہیں لیکن نصاری نبی کی محبت میں گمراہ ہوئے اور نبی کو خدا کا بیٹا کہا' اور یہود نبی سے بغض میں گمراہ ہوئے کیونکہ انھوں نے کئی نبیوں کو قتل کر ڈالا' اس لیے یہود پر اللہ تعالیٰ کا غضب زیادہ ہے اور ان کو مغضوب فرمایا۔

(تفسیر تبیان القرآن۔ علامہ غلام رسول سعیدی)

مَغۡضُوۡبِ عَلَيۡهِمۡ

مَغۡضُوۡبِ عَلَيۡهِمۡ سے مراد دو قسم کے لوگ ہیں۔ ایک وہ جن پر اللہ تعالیٰ نے اپنی شریعت کی نعمت نازل فرمائی لیکن انھوں نے سرکشی کے سبب نہ صرف یہ کہ اس کو قبول نہیں کیا بلکہ اس کی مخالفت کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور جن لوگوں نے اس کو ان کے سامنے پیش کیا ان کی بیخ کنی کی اور قتل کے درپے ہوئے جن کی پاداش میں ان پر اللہ کا غضب نازل ہوا اور وہ ہلاک کر دیئے گئے۔

دوسرے وہ لوگ جنھوں نے قبول تو کیا لیکن دل کی آمادگی کے ساتھ نہیں بلکہ مارے باندھے قبول کیا، پھر بہت جلد شہوات نفس میں پڑ کر انھوں نے اس کے کچھ حصہ کو ضائع کر دیا، کچھ حصہ میں کتر بیونت کر کے اس کو اپنی خواہشات کے مطابق بنالیا اور جن لوگوں نے ان کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی یا ان کو صحیح راستہ پر لانا چاہا انھوں نے ان میں سے بعض کو جھٹلا دیا اور بعض کو قتل کر دیا۔ پچھلی امتوں میں اس کی سب سے واضح مثال یہود ہیں۔ چنانچہ ان کے معتوب و مغضوب ہونے کا ذکر قرآن میں تصریح کے ساتھ ہوا بھی ہے۔ مثلاً:

مَنۡ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَيۡهِ وَجَعَلَ مِنۡهُمُ الۡقِرَدَةَ وَالۡخَنَازِيۡرَ (مائدہ:۵۔۶۰)

(جن پر اللہ نے لعنت کی اور جن پر اس کا غضب ہوا اور جن کے اندر سے اس نے بندر اور خنزیر بنائے)

وَضُرِبَتۡ عَلَيۡهِمُ الذِّلَّةُ وَالۡمَسۡكَنَةُ وَبَآءُوۡ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ (البقرۃ:۲۔۶۱۔بقرۃ)

(اور ان پر ذلت اور مسکنت تھوپ دی گئی اور وہ اللہ کا غضب لے کر پلٹے)

ضَآلِّیْنَ سے مراد

ضَآلِّیْنَ سے مراد وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے دین میں غلو کیا، جنھوں نے اپنے پیغمبر کا رتبہ اتنا بڑھایا کہ اس کو خدا بنا کر رکھ دیا، جو صرف انہی عبادتوں اور طاعتوں پر قانع نہیں ہوئے۔ جو اللہ اور اللہ کے رسول نے مقرر کی تھیں۔ بلکہ اپنے جی سے رہبانیت کا ایک پورا نظام کھڑا کر دیا۔ جنھوں نے اپنے اگلوں کی ایجاد کی ہوئی بدعتوں اور گمراہیوں کی آنکھ بند کر کے پیروی کی اور اس طرح صراط مستقیم سے ہٹ کر گمراہی کی پگڈنڈیوں پر نکل گئے۔ پچھلی امتوں میں سے اس کی نہایت واضح مثال نصاریٰ ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید نے انہی وجوہ کی بنا پر جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے ان کو گمراہ اور گمراہ کرنے والے قرار دیا ہے۔ مثلاً:

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوْٓا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ۔ع (المائدہ:۵۔۷۷)

(کہہ دو اے اہل کتاب! تم اپنے دین میں ناحق غلو نہ کرو اور ان لوگوں کی خواہشوں و بدعتوں کی پیروی نہ کرو جو پہلے سے گمراہ چلے آرہے ہیں اور جنھوں نے بہتوں کو اللہ کے راستہ سے بھٹکایا اور جو خود بھی اس کے رستہ سے بھٹکے)

مَغْضُوْبِ اور ضَآلِّیْنَ کی مثال دینے سے مقصود کیا ہے؟

یہ دو طرح کے لوگ جن کی نشاندہی ہماری دعا کے جواب میں بطور خاص اس لیے فرمائی گئی ہے کہ اے امت مسلمہ کے لوگو جس طرح تم ایک حامل دعوت امت ہو اور جس طرح تم پر آخری کتاب اتری ہے اسی طرح ان لوگوں پر بھی اللہ کی کتابیں اتری تھیں۔ انھیں حامل دعوت امتیں بنایا گیا تھا۔ انھیں رہنمائی دینے کے لیے اللہ کے نبی اور رسول آتے رہے اور بالکل انہی ذمہ داریوں سے انھیں گراں بار کیا گیا تھا جو ذمہ داریاں تمہارے حوالے کی گئی ہیں ان لوگوں نے جب اپنی ذمہ داریاں ادا نہ کیں وہ یا تو انبیاء و رسل کی دشمنی اور اللہ کی شریعت کی نافرمانی کے باعث اللہ کے غضب کے مستحق ہوئے اور یا اللہ کے نبیوں کی محبت میں غلو کے باعث شرک اور بدعات و خرافات کے ارتکاب کے مجرم ٹھہرے۔ یعنی یا تو انھیں شریعت کی دشمنی لے بیٹھی اور یا اللہ کے نیک بندوں کی محبت میں حد سے بڑھ جانا

ان کی تباہی کا باعث بنا۔ دیکھنا تم یہ رویہ اختیار نہ کرنا تم آخری امت ہو آخری کتاب تم پہ نازل ہو چکی آخری رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تمہاری طرف مبعوث ہو چکے۔ تمہاری ہدایت کے لیے اب کوئی اور آنے والا نہیں آئے گا۔ اگر تم نے اپنی ذمہ داریوں میں کوتاہی برتی اور اللہ کی زمین پر اللہ کے دین کو غالب کرنے میں کمزوری دکھائی اور تم انہی راہوں میں چلے جن راہوں میں پہلی قومیں چل کر تباہ ہوئیں تو یاد رکھنا تم اس انجام سے نہیں بچ سکو گے جس انجام سے وہ دوچار ہو چکے ہیں۔ تمہاری عافیت، سرفرازی اور بقاء کا ایک ہی راستہ ہے کہ تم ان لوگوں کے راستوں پر چلو جن پر اللہ کا انعام ہوا، تاکہ تم بھی ان انعامات کے مستحق ٹھہرو۔ (تفسیر روح القرآن)

جن لوگوں تک اسلام کا پیغام نہیں پہنچا آیا وہ شریعت کے مکلف ہیں یا نہیں؟

ضالین کا مصداق وہ لوگ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ کی بالکل معرفت حاصل نہیں ہوئی 'یا ان کو اللہ تعالیٰ کی صحیح معرفت حاصل نہیں ہوئی 'اول الذکر وہ لوگ ہیں جن کو نبوت کا پیغام نہیں پہنچا 'اور ثانی الذر وہ لوگ ہیں جن کو پیغام نبوت پہنچا لیکن ان پر حق اور باطل اور صواب اور خطا میں اشتباہ ہو گیا 'اور جن لوگوں کے زمانہ میں نبی مبعوث نہیں ہوا 'وہ اصحاب فترت ہیں 'وہ کسی شریعت کے مکلف ہیں نہ آخرت میں ان کو عذاب ہو گا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(آیت) "وما کنا معذبین حتی نبعث رسولا (بنی اسرائیل:۱۶)

(ترجمہ) اور جب تک رسول کو نہ بھیج دیں 'ہم عذاب دینے والے نہیں ہیں

جمہور کی رائے یہی ہے 'لیکن علماء کی ایک جماعت کا یہ نظریہ ہے کہ شریعت کا مکلف ہونے کے لیے صرف عقل کافی ہے 'سو جس شخص کو عقل دی گئی ہے اس پر لازم ہے کہ آسمانوں اور زمین کی نشانیوں میں غور و فکر کرے اور ان کے خالق کی معرفت حاصل کرے اور جس طرح اس کی عقل ہدایت دے اس کے مطابق خالق کی تعظیم اور عبادت کرے اور نعمتوں پر اس کا شکر بجالائے۔

علامہ محب اللہ بہاری (رح) لکھتے ہیں:

جو شخص دور دراز کے پہاڑوں میں بلوغت کی عمر پالے اور اس کو پیغام نہ پہنچے اور وہ عقائد صحیحہ کا معتقد نہ ہو اور احکام شرعیہ پر عمل نہ کرے تو معتزلہ اور بعض احناف کے نزدیک اس کو آخرت میں عذاب ہو گا 'کیونکہ جن امور کا عقل

ادراک کر سکتی ہے اس نے ان کے تقاضوں پر عمل نہیں کیا ' اور اشاعرہ اور جمہور احناف کے نزدیک اس کو آخرت میں عذاب نہیں ہو گا 'کیونکہ انسان احکام کا مکلف شریعت سے ہوتا ہے اور فرض یہ کیا گیا ہے کہ اس کو شریعت کی دعوت نہیں پہنچی۔ (مسلم الثبوت مع شرحہ للخیر آبادی ص ٦٢ 'مطبوعہ مکتبہ اسلامیہ 'کوئٹہ)

آمین کا معنی

علامہ ابن منظور افریقی (رح) لکھتے ہیں:

یہ وہ کلمہ ہے جو دعا کے بعد کہا جاتا ہے 'یہ اسم اور فعل سے مرکب ہے اور اس کا معنی ہے: "اللھم استجب لی "۔اے اللہ! میری دعا کو قبول فرما "اور اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے فرعون اور اس کے حامیوں کے لیے دعاء ضرر کی اور فرمایا:

(آیت) "ربنا اطمس علی اموالھم واشدد علی قلوبھم "۔(یونس:٨٨) اے ہمارے رب! ان کے اموال کو تباہ و برباد کر دے اور ان کے دلوں کو سخت کر دے۔

جب حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے یہ دعا کی تو حضرت ہارون (علیہ السلام) نے کہا: آمین۔

ایک قول یہ ہے کہ آمین کا معنی ہے: اسی طرح ہو گا۔ زجاج نے کہا ہے: اس میں دو لغتیں ہیں: امین اور آمین۔

ابو العباس نے کہا ہے کہ آمین عاصین کی طرح جمع کا صیغہ ہے 'لیکن یہ صحیح نہیں ہے 'کیونکہ حسن سے منقول ہے کہ آمین اللہ عزوجل کے اسماء میں سے ایک اسم ہے 'مجاہد نے بھی کہا ہے کہ یہ اللہ کا ایک اسم ہے اور یہ یا اللہ کے معنی میں ہے اور اس کے بعد "استجب "مقدر ہے 'ازھری نے کہا: یہ قول صحیح نہیں ہے۔

حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت ہے کہ آمین رب العالمین کی اپنے بندوں پر مہر ہے 'کیونکہ اللہ تعالیٰ بندوں کی آفات اور بلیلات کو آمین سے دور کر دیتا ہے جیسے جب کسی لفافے پر مہر لگا دی جائے تو اس مہر کی وجہ سے اس میں فاسد اور ناپسندیدہ چیز داخل نہیں ہو سکتی۔ حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت ہے کہ امین جنت میں ایک درجہ ہے ' ابو بکر (رض) نے کہا اس کا معنی یہ ہے کہ آمین کہنے والے کو جنت میں ایک درجہ ملے گا۔

(لسان العرب ج ۱۳ ص ۲۷۔۲۶ مطبوعہ نشر ادب الحوزۃ، قم، ایران ۱۴۰۵ھ)

نماز میں آمین کہنے کے متعلق مذاہب اربعہ

علامہ شمس الدین محمد بن ابی العباس الرملی الشافعی لکھتے ہیں:

سورۃ فاتحہ یا اس کے قائم مقام کسی دعا کے بعد کچھ وقفہ سے آمین کہنا سنت ہے، خواہ وہ نماز میں ہو یا غیر نماز میں، لیکن نماز میں یہ بہت زیادہ مستحب ہے کیونکہ حدیث میں ہے کہ جب نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سورۃ فاتحہ کی قرات سے فارغ ہوتے تو بلند آواز کے ساتھ آمین کہتے اور الف کو کھینچ کر (دراز کرکے) آمین کہتے۔

(نہایۃ المحتاج ج ۱ ص ۴۸۹۔۴۸۸، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۴ھ)

علامہ محمد بن عبداللہ خرچی مالکی لکھتے ہیں:

"ولا الضالین" کے بعد آہستہ آواز کے ساتھ آمین کہنا مستحب ہے، سری نماز میں صرف امام آمین کہے اور جہری نماز میں امام اور مقتدی دونوں پست آواز کے ساتھ آمین کہیں کیونکہ آمین دعا ہے اور دعا میں اصل یہ ہے کہ پست آواز کے ساتھ کی جائے۔ (الخرشی علی مختصر خلیل ج ۱ ص ۲۸۲، مطبوعہ دار صادر، بیروت)

علامہ ابن قدامہ حنبلی لکھتے ہیں:

سنت یہ ہے کہ جہری نمازوں میں امام اور مقتدی جہراً آمین کہیں اور سری نمازوں میں دونوں سراً آمین کہیں۔ امام ابوحنفیہ (رح) اور امام مالک کے نزدیک آمین آہستہ کہیں، ہماری دلیل یہ ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بہ آواز بلند آمین کہی اور آپ نے امام کے آمین کہنے کے وقت آمین کہنے کا حکم دیا، اگر امام نے بلند آواز سے آمین نہ کہی تو امام کی آمین پر مقتدی کی آمین نہیں ہو سکے گی۔

(المغنی ج ۱ ص ۲۹۰، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۰۵ھ)

علامہ حصکفی حنفی لکھتے ہیں:

امام اور مقتدی پست آواز سے آمین کہیں خواہ سراً ہو یا جہراً اور جس حدیث میں یہ ہے کہ جب امام آمین کہے تو آمین کہو یہ پست آواز سے آمین کہنے کے منافی نہیں ہے، کیونکہ یہ معلوم اور متعین ہے کہ "ولا الضالین" کے بعد

آمین کہی جاتی ہے ' اس لیے مقتدی کا آمین کہنا ' امام سے سننے پر موقوف نہیں ہے ' کیونکہ سورۃ فاتحہ کے اخیر میں آمین کہی جاتی ہے ' حدیث میں ہے: جب امام (آیت) "ولا الضالین" کہے تو آمین کہو۔

(در مختار مع حاشیۃ الطحطاوی ' ج ۱ ص ۲۲۰۔۲۱۹ ' مطبوعہ دارالمعرفتہ ' بیروت)

آمین کہنے کی فضیلت میں احادیث

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی شخص آمین کہتا ہے تو آسمان میں فرشتے (بھی) آمین کہتے ہیں ' پس جب ایک فریق کی آمین دوسرے کے موافق ہو جائے تو اس کے پچھلے گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں۔

(صحیح بخاری ج ۱ ص ۱۰۸ ' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع ' کراچی ' ۱۳۸۱ھ)

اس حدیث کو امام مسلم (صحیح مسلم ج ۱ ص ۱۷۶) ' امام ابوداؤد (سنن ابوداؤد ج ۱ ص ۱۳۵) ' امام نسائی (سنن نسائی ج ۱ ص ۱۴۷) ' امام مالک (موطا امام مالک ص ۶۹) ' اور امام احمد (مسند احمد ج ۲ ص ۴۵۹) نے بھی روایت کیا ہے۔

امام ابن ماجہ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابودرداء (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جب کوئی شخص اپنے مسلمان بھائی کے لیے پس پست دعا کرتا ہے تو وہ قبول ہوتی ہے ' جب بھی وہ اپنے بھائی کے لیے خیر کی دعا کرتا ہے تو اس کے پاس کھڑا ہوا ایک فرشتہ آمین کہتا ہے اور وہ فرشتہ اس کے لیے بھی وہی دعا کرتا ہے۔

(سنن ابن ماجہ ص ۲۰۸ ' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب ' کراچی)

اس حدیث کو امام احمد نے بھی روایت کیا ہے۔ (مسند احمد ج ۱ ص ' ۱۹۵ ' ج ۶ ص ۴۵۲ مطبوعہ دارالفکر ' بیروت)

امام ابن ماجہ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: یہود تم سے کسی چیز پر اتنا حسد نہیں کرتے جتنا وہ تم سے آمین پر حسد کرتے ہیں سو تم بہ کثرت آمین کہا کرو۔

(سنن ابن ماجہ ص ٦١ ' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب ' کراچی)

(عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ (رض) أَنَّ النَّبِيَّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قَالَ إِذَا أَمَّنَ الْإِمَامُ فَأَمِّنُوْا فَإِنَّهٗ مَنْ وَّافَقَ تَأْمِيْنُهٗ تَامِيْنَ الْمَلآءِ كَةِ غُفِرَلَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ) (رواہ البخاری : کتاب الأذان، باب جهر الإمام بالتأمين)

”حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جب امام آمین کہے تو تم بھی آمین کہو کیونکہ جس کی آمین فرشتوں کی آمین سے ہم آہنگ ہوگئی اس کے پہلے تمام گناہ معاف کردیے گئے۔“

آمین کی فضیلت واہمیت:

(عَنْ أَبِيْ مُصَبِّحِ الْمَقْرَاءِيِّ قَالَ كُنَّا نَجْلِسُ إِلٰى أَبِيْ زُهَيْرٍ النُّمَيْرِيِّ وَكَانَ مِنَ الصَّحَابَةِ فَيَتَحَدَّثُ أَحْسَنَ الْحَدِيْثِ فَإِذَا دَعَا الرَّجُلُ مِنَّا بِدُعَاءٍ قَالَ اخْتِمْهُ بِآمِيْنَ فَإِنَّ آمِيْنَ مِثْلُ الطَّابِعِ عَلَى الصَّحِيْفَةِ)

[رواہ ابوداؤد: کتاب الصلاۃ، باب التأمین وراء الإمام]

”حضرت ابو مصبح المقرائی (رض) فرماتے ہیں ہم ابو زہیر نمیری (رض) کے ہاں بیٹھے تھے جو صحابی تھے وہ اچھی اچھی باتیں بیان کرتے تھے۔ ہم میں سے ایک آدمی نے دعا شروع کی تو صحابی نے فرمایا دعا ”آمین“ کے ساتھ ختم کرو کیونکہ دعا کو آمین کے ساتھ ختم کرنا ایسے ہی ہے جیسے خط پر مہر لگا دی جائے۔“

سورۃ فاتحہ کی آیات کے متعلق اختلاف پایا جاتا ہے امام شافعی کے نزدیک بسم اللہ سورۃ فاتحہ کا حصہ ہے اور یہی ساتویں آیت ہے اور اس کا پڑھنا واجب ہے۔ لیکن راجح قول کے مطابق بسم اللہ سورۃ فاتحہ کا حصہ نہیں بلکہ صراط الذین انعمت علیہم الگ آیت ہے اور غیر المغضوب علیہم والضالین الگ آیت ہے۔ (دیکھیے ایسر التفاسیر جلد ا صفحہ نمبر ١٠)

(تفسیر فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل)

آمین بالجہر کے متعلق احادیث

امام ابوداؤد روایت کرتے ہیں:

حضرت وائل بن حجر (رض) بیان کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) (آیت) "ولا الضالین" پڑھتے تو بہ آواز بلند فرماتے: آمین (سنن ابوداؤد ج ۱ ص ۱۳۵۔ ۱۳۴ مطبوعہ مطبع مجتبائی، پاکستان، لاہور)

امام ترمذی (رح) نے اس حدیث کو اسی سند کے ساتھ روایت کیا ہے، اس میں "رفع بھا صوته" کی بجائے "مد بھا صوته" (آمین کو مد کے ساتھ پڑھا) ہے۔

(جامع ترمذی ص ۶۳، مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب، کراچی)

نیز امام ابوداؤد روایت کرتے ہیں:

حضرت وائل بن حجر (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اقتداء میں نماز پڑھی تو آپ نے بہ آواز بلند آمین کہی۔ (سنن ابوداؤد ج ۱ ص ۱۳۵ مطبوعہ مطبع مجتبائی، پاکستان، لاہور)

امام نسائی روایت کرتے ہیں:

حضرت وائل بن حجر (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اقتداء میں نماز پڑھی، آپ نے اللہ اکبر کہہ کر کانوں کے بالمقابل رفع یدین کیا، پھر آپ نے سورۃ فاتحہ پڑھی اور اس سے فارغ ہو کر بہ آواز بلند آمین کہی۔ (سنن نسائی ج ۱ ص ۱۴۰ مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب، کراچی)

امام ابن ماجہ (رح) روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ لوگوں نے آمین کہنا ترک کر دیا ہے حالانکہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جب (آیت) "ولا الضالین" پڑھتے تھے تو آمین کہتے تھے جس کو صف اول والے سنتے تھے، پھر آمین کی آواز سے مسجد گونج اٹھتی تھی۔ (سنن ابن ماجہ ص ۶۱، مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب، کراچی)

اس حدیث کو امام ابوداؤد (رح) نے بھی روایت کیا ہے لیکن اس میں یہ نہیں ہے کہ آمین سے مسجد گونج اٹھتی تھی۔

(سنن ابوداؤد ج ۱ ص ۱۳۵ مطبوعہ مطبع مجتبائی، پاکستان، لاہور ۱۴۰۶ ھ)

فقہاء احناف اور فقہاء مالکیہ کے نزدیک یہ تمام احادیث ابتداء امر اور تعلیم پر محمول ہیں۔

آمین بالسر کے متعلق احادیث

امام مسلم (رح) روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جب قرآن پڑھنے والا (آیت) ”غیر المغضوب علیہم ولا الضالین “ کہے اور اس کے پیچھے (نمازی) آمین کہے اور اس کا قول آسمان والوں کے موافق ہو جائے تو اس کے پچھلے گناہ معاف کر دیئے جائیں گے۔

(صحیح مسلم ج ۱ ص ۱۷۶، مطبوعہ نور محمد اصح المطابع، کراچی، ۱۳۷۵ھ)

اس حدیث سے وجہ استدلال یہ ہے کہ فرشتوں کی موافقت جہر سے نہیں اخفاء سے حاصل ہو گی۔

امام ترمذی (رح) روایت کرتے ہیں:

حضرت وائل بن حجر (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے (آیت) ”غیر المغضوب علیہم ولا الضالین “ پڑھا پھر کہا: آمین اور پست آواز سے کہا۔ (جامع ترمذی ص ۶۳، مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب، کراچی)

حافظ زیلعی (رح) نے لکھا ہے کہ اس حدیث کو امام احمد (رح)، امام ابوداؤد (رح)، وطیالسی اور امام ابویعلی موصلی (رح) نے اپنی مسانید میں، امام طبرانی (رح) نے اپنی معجم میں اور امام دار قطنی (رح) نے اپنی سنن میں روایت کیا ہے۔ (نصب الرایہ ج ۱ ص ۳۶۹، مطبوعہ مجلس علمی، سورت ھند ۱۳۵۷ھ)

امام بغوی (رح) روایت کرتے ہیں:

شعبہ نے سلمہ سے روایت کیا ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے آمین کو آہستہ کہا:

(شرح السنۃ ج ۲ ص ۲۰۸، مطبوعہ دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۲ھ)

ہر چند کہ امام بغوی (رح) نے اس کے مقابلہ میں سفیان کی روایت کو زیادہ صحیح کہا ہے جس میں "مدبھا صوتہ " ہے "آمین کو کھینچ کر پڑھا "لیکن مد کے ساتھ پڑھنا آہستہ پڑھنے کے خلاف نہیں ہے ' نیز شعبہ کی روایت کو بھی انھوں نے صحیح کہا ہے ضعیف نہیں قرار دیا۔

حافظ سیوطی (رح) بیان کرتے ہیں:

حضرت ابووائل (رض) بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر (رض) اور حضرت علی (رض) (نماز میں) "بسم اللہ الرحمن الرحیم ' اعوذباللہ من الشیطن الرجیم " اور آمین کو بلند آواز کے ساتھ نہیں پڑھتے تھے۔

(جامع الاحادیث الکبیر ج ۷ ا ص ۴۶۷ 'مطبوعہ دارالفکر 'بیروت '۱۴۱۴ ھ)

"آمین " قرآن مجید کا جز نہیں ہے

علامہ آلوسی لکھتے ہیں:

اس پر اجماع ہے کہ آمین قرآن مجید کا جز نہیں ہے 'اسی وجہ سے سورۃ فاتحہ اور آمین کے درمیان تھوڑا سا وقفہ کیا جاتا ہے 'مجاہد سے یہ منقول ہے کہ آمین سورت کا جز ہے لیکن یہ قطعا باطل قول ہے 'مصحف عثمان اور دیگر مصاحف میں آمین کو نہیں لکھا جاتا 'اور متعدد علماء نے یہ کہا کہ آمین کو قرآن کا جز ماننا کفر ہے۔ (روح المعانی ج ا ص ۹۷ 'مطبوعہ داراحیاء التراث العربی 'بیروت)

فاتحہ خلف الامام میں فقہاء شافعیہ کا نظریہ

امام مسلم (رح) روایت کرتے ہیں:

حضرت عبادہ بن صامت (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اس شخص کی نماز (کامل) نہیں ہوتی جو سورۃ فاتحہ کو نہ پڑھے۔ (صحیح مسلم ج ا ص ۱۶۹ 'مطبوعہ نور محمد اصح المطابع 'کراچی '۱۳۷۵ ھ)

علامہ یحییٰ بن شرف نووی شافعی (رح) لکھتے ہیں:

اس حدیث سے نماز میں سورۃ فاتحہ کی قرات کا وجوب ثابت ہوتا ہے اور اس سورت کا نماز میں پڑھنا متعین ہے ' اس کے سوا کوئی دوسری سورت اس سے کفایت نہیں کرتی الا یہ کہ کوئی شخص اس کی قرات سے عاجز ہو ' یہ امام مالک (رح) ' امام شافعی (رح)، جمہور فقہاء صحابہ کرام (رض) تابعین اور بعد کے علماء کا مذہب ہے ' اور امام ابوحنفیہ (رح) اور ایک قلیل جماعت کا یہ نظریہ ہے کہ نماز میں سورۃ فاتحہ کا پڑھنا واجب نہیں ہے ' بلکہ قرآن مجید کی کسی ایک آیت کا پڑھنا واجب ہے ' کیونکہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد ہے: جو کچھ تم آسانی سے پڑھ سکو وہ پڑھو۔ (علامہ نووی (رح) نے یہ صحیح نہیں لکھا ' امام ابوحنفیہ (رح) کے نزدیک نماز میں سورۃ فاتحہ کا پڑھنا فرض نہیں ہے کیونکہ فرضیت قطعی الثبوت اور قطعی الدلالۃ دلیل سے حاصل ہوتی ہے اور اس حدیث کی بناپر امام ابوحنفیہ (رح) نماز میں سورۃ فاتحہ پڑھنے کو واجب کہتے ہیں ' امام اعظم کا مذہب ہم انشاء اللہ عنقریب بیان کریں گے۔ سعیدی غفرلہ)

جمہور کی دلیل ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد ہے: ام القرآن (سورۃ فاتحہ) کے بغیر (کامل) نہیں ہوتی۔ اگر انھوں نے کہا: اس سے مراد یہ ہیں کہ نماز کامل نہیں ہوتی تو یہ خلاف ظاہر ہے (بلکہ یہی ظاہر ہے کیونکہ حدیث میں ہے: جس نے سورۃ فاتحہ کو نہیں پڑھا اس کی نماز ناقص ہے ' یہ کلمہ آپ نے تین بار فرمایا اور ناقص کے مقابلہ میں کامل ہے ' اگر سورۃ فاتحہ کا پڑھنا فرض ہوتا تو آپ فرماتے: جس نے سورۃ فاتحہ نہیں پڑھی اس کی نماز باطل ہے ' اور اس کی تائید حضرت ابوہریرہ (رض) کی اس حدیث سے ہوتی ہے: وہ نماز کافی نہیں ہوتی جس میں سورۃ فاتحہ کی قرات نہ کی جائے ' اس حدیث کو امام ابن خزیمہ (رح) نے اپنی صحیح میں سند صحیح کے ساتھ بیان کیا ہے ' اور ابوحاتم بن حبان نے بھی بیان کیا ہے ' اور جس حدیث میں ہے: جو کچھ تم آسانی سے پڑھ سکو وہ پڑھو ' وہ سورۃ فاتحہ پڑھنے پر محمول ہے کیونکہ اس کا پڑھنا آسان ہے۔ (یہ جواب صحیح نہیں ہے کیونکہ حدیث میں لفظ "ما" ہے جو عام ہے۔ سعیدی غفرلہ)

اس حدیث میں امام شافعی (رح) اور ان کے موافقین کے مذہب پر دلیل ہے ' جو یہ کہتے ہیں کہ امام ' مقتدی اور منفرد سب پر سورۃ فاتحہ کا پڑھنا واجب ہے ' مقتدی پر سورۃ فاتحہ پڑھنے کے وجوب کی دلیل یہ ہے کہ حضرت ابوہریرہ (رض) سے کسی نے کہا: ہم امام کے پیچھے ہوتے ہیں تو کیا کریں؟ حضرت ابوہریرہ (رض) نے کہا: سورۃ فاتحہ کو

دل میں پڑھو ' اس کا معنی ہے: اس کو چپکے چپکے پڑھو جس کو تم خود سنو اور بعض مالکیہ و غیر ہم نے جو اس کا یہ محمل بیان کیا ہے کہ سورۃ فاتحہ کے معانی میں تدبر کرو یہ غیر مقبول ہے 'کیونکہ قرات کا اطلاق صرف زبان کی اس حرکت پر ہوتا ہے جو سنائی دے اسی وجہ سے اس پر اتفاق ہے کہ جنبی اور حائض اگر زبان کی حرکت کے بغیر قرآن مجید کے معانی میں تدبر کریں تو اس پر قرات کا اطلاق نہیں ہو گا۔

(شرح مسلم ج ۱ ص ' ۱۷۰ مطبوعہ نور محمد اصح المطابع 'کراچی '۱۳۷۵ھ)

علامہ نووی کا یہ جواب بھی صحیح نہیں ہے، زبان کی جو حرکت سنائی دے خواہ آہستہ یا زور سے وہ قرات لفظی ہے قرات نفسی نہیں ہے 'قرات نفسی کا معنی یہی ہے کہ الفاظ کے معانی میں تدبر کیا جائے، جیسا کہ علامہ نووی (رح) نے بعض مالکیہ سے نقل کیا ہے اور اگر جنبی قرآن کے معنی میں تدبر کرے تو اس کو قرات نفسی کہہ سکتے ہیں۔

فاتحہ خلف الامام میں فقہاء حنبلیہ کا نظریہ

علامہ ابن قدامہ حنبلی لکھتے ہیں:

صحیح مذہب یہ ہے کہ ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ کا پڑھنا واجب ہے 'یہ امام مالک 'امام اوزاعی اور امام شافعی کا مذہب ہے 'امام احمد سے ایک روایت ہے کہ نماز کی صرف دو رکعتوں میں میں سورۃ فاتحہ کا پڑھنا واجب ہے 'نخعی 'ثوری اور امام ابوحنفیہ (رح) سے بھی اسی طرح روایت ہے 'کیونکہ حضرت علی (رض) نے فرمایا: پہلی دو رکعتوں میں قرات کرو اور دوسری دو رکعتوں میں تسبیح کرو 'نیز اگر باقی رکعات میں قرات واجب ہوتی تو جہری نمازوں میں ان میں جہر سے قرات واجب ہوتی 'حسن بصری سے روایت ہے کہ اگر ایک رکعت میں قرات کرلی تو کافی ہے 'کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(آیت) فاقرءوا ماتیسر من القرآن "(المزمل: ۲۰) تو قرآن سے جتنا (تم پر) آسان ہو پڑھ لیا کرو۔

اور امام مالک (رح) سے ایک روایت یہ ہے کہ اگر تین رکعات میں قرات کرلی تو کافی ہے کیونکہ وہ نماز کا اکثر حصہ ہیں، ہماری دلیل یہ ہے کہ امام بخاری اور امام مسلم (رح) نے روایت کیا ہے: حضرت ابو قتادہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ظہر کی پہلی دو رکعات میں سورۃ فاتحہ اور کوئی اور سورت پڑھتے تھے 'پہلی

رکعت میں زیادہ قرات کرتے اور دوسری میں کم ' اور کبھی ہم کو قرات سناتے تھے ' اور دوسری دو رکعت میں صرف سورۃ فاتحہ پڑھتے تھے ' نیز امام بخاری (رح) اور امام مسلم (رح) کی روایت ہے: اس طرح نماز پڑھو ' جس طرح تم مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو ' اور حضرت ابوسعید خدری (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جو شخص ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ نہ پڑھے ' اس کی نماز (کامل) نہیں ہوتی ' اور حضرت ابوسعید (رض) اور حضرت عبادہ بیان کرتے ہیں کہ ہمیں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ حکم دیا ہے کہ ہم ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ کو پڑھیں ' نیز جس شخص نے اچھی طرح نماز پڑھی تھی اس کو جب نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے نماز کی پہلی رکعت سکھائی تو اس کو فرمایا: تمام رکعات اس طرح پڑھو اور یہ حکم تمام رکعات میں قرات کو بھی شامل ہے ' حضرت جابر (رض) نے فرمایا: جس شخص نے ایک رکعت نماز پڑھی اور اس میں قرات نہیں کی تو اس کی یہ نماز صرف امام کے پیچھے ہو سکتی ہے۔ (اس سے یہ معلوم ہوا کہ امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ پڑھنا فرض نہیں ہے۔ سعیدی غفرلہ) اس حدیث کو امام مالک نے موطا میں روایت کیا ہے ' اور اس سے پہلے جو حضرت علی (رض) کا اثر بیان کیا گیا ہے اس کی سند میں حارث اعور ہے اور اس کو شعبی نے کذاب کہا ہے ' نیز حضرت عمر (رض) اور حضرت جابر (رض) نے اس کی مخالفت کی ہے۔ (المغنی ج ۱ ص ۲۸۸ ' مطبوعہ دارالفکر ' بیروت ' ۱۴۰۵ ھ)

نیز علامہ ابن قدامہ حنبلی (رح) لکھتے ہیں:

امام کے لیے مستحب یہ ہے کہ سورۃ فاتحہ پڑھنے کے بعد کچھ دیر خاموش رہے اور آرام کرے تاکہ اس وقفہ میں مقتدی سورۃ فاتحہ پڑھ لیں تاکہ مقتدی سورۃ فاتحہ پڑھنے میں امام کے ساتھ کھینچا تانی نہ کریں ' یہ امام اوزاعی (رح) امام شافعی (رح) اور اسحاق کا مذہب ہے ' امام مالک (رح) اور اصحاب رائے نے اس کو مکروہ کہا ہے۔ ہماری دلیل یہ ہے کہ امام ابوداؤد (رح) اور امام ابن ماجہ نے روایت (رح) کیا ہے کہ حضرت سمرہ (رض) کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے دو سکتے یاد رکھے ہیں ' ایک سکتہ تکبیر تحریمہ کے بعد اور ایک سکتہ (آیت) " غیر المغضوب علیہم ولا الضالین " کی قرات کے بعد ' عمران نے اس کا انکار کیا اور ان دونوں نے حضرت ابی بن کعب کو خط لکھا ' انھوں نے جواب دیا کہ سمرہ کو یہ حدیث محفوظ ہے ' اور ابوسلمہ بن عبدالرحمن نے کہا: امام کے لیے دو سکتے ہیں ' ان میں سورۃ فاتحہ کی قرات کو غنیمت جانو ' ایک سکتہ نماز کے شروع کے وقت ہے اور ایک سکتہ جب وہ

(آیت) "ولا الضالین" کہتا ہے تو میں اس وقت سورۃ فاتحہ پڑھ لیتا ہوں اور جب وہ سورت ختم کرتا ہے تو میں رکوع سے پہلے قرات کرلیتا ہوں 'یہ روایات اس پر دلالت کرتی ہیں کہ امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ کا پڑھنا ان کے نزدیک معروف تھا۔(المغنی ج۱ ص ۲۹۱ 'مطبوعہ دارالفکر 'بیروت '۱۴۰۵ھ)

فاتحہ خلف الامام میں فقہاء مالکیہ کا نظریہ

علامہ وشتانی ابی مالکی لکھتے ہیں:

قاضی عیاض مالکی (رح) نے بیان کیا ہے کہ اشہب مالکی 'ابن وہب مالکی (رح) اور کوفیوں کا قول یہ ہے کہ امام کے پیچھے کسی حال میں قرات نہ کی جائے صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت ہے کہ سورۃ فاتحہ کے بغیر نماز ناقص ہے۔ان سے کہا گیا کہ بعض اوقات ہم امام کے پیچھے ہوتے ہیں؟ حضرت ابوہریرہ (رض) نے کہا: اس وقت اپنے دل میں پڑھو۔اس حدیث کا معنی یہ ہے کہ جب امام قرات کرے تو اس کے معانی میں تدبر کرو 'تدبر کرو ' تابعین کی ایک جماعت کا یہ قول ہے کہ امام کے پیچھے کسی حال میں قرات نہ کی جائے 'وہ کہتے ہیں کہ صرف ہونٹ ہلائے جائیں اور خود کو بھی آواز نہ آئے 'اور جس نے خود کو سنایا اس نے اچھا کیا 'امام مالک (رح) اور ان کے عام اصحاب اور بہت سے متقدمین نے یہ کہا ہے: مقتدی امام کے ساتھ نمازوں میں پڑھے اور جہری نمازوں میں نہ پڑھے ' امام احمد (رح) نے یہ کہا ہے کہ امام کے پیچھے سری اور جہری دونوں نمازوں میں سورۃ فاتحہ پڑھے 'امام شافعی کے اس میں تین قول ہیں 'ایک قول کوفیین کی طرح ہے، ایک قول امام احمد (رح) کی مثل ہے اور ایک قول جمہور صحابہ اور تابعین کی مثل ہے 'امام احمد (رح) اور داؤد ظاہری کے نزدیک سورۃ فاتحہ کا سری نمازوں میں پڑھنا فرض ہے ' ہمارے نزدیک اس میں اختلاف ہے 'ایک قول سنت ہے اور ایک قول مستحب ہے۔

(اکمال اکمال المعلم ج ۲ ص ۱۵۰۔۱۴۹، مطبوعہ دارالکتب العلمیہ 'بیروت)

فاتحہ خلف الامام میں فقہاء احناف کا نظریہ

علامہ مرغینانی حنفی لکھتے ہیں:

مقتدی امام کے پیچھے قرات نہ کرے ‘ہماری دلیل یہ ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد ہے کہ جس شخص کا امام ہو ‘تو امام کی قرات اس کی قرات ہے۔ (سنن ابن ماجہ وطحاوی) اور اس پر صحابہ کا اجماع ہے ‘یہ رکن امام اور مقتدی دونوں کے درمیان مشترک ہے ‘لیکن مقتدی کا کام یہ ہے کہ وہ خاموش رہے اور سنے ‘نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد ہے: جب امام قرات کرے تو خاموش رہو ‘امام محمد سے ایک روایت یہ ہے کہ احتیاط قرات کرنا مستحسن ہے اور امام ابوحنفیہ (رح) اور امام ابویوسف (رح) کے نزدیک امام کے پیچھے قرات کرنا مکروہ ہے کیونکہ اس پر وعید ہے۔

علامہ کمال الدین ابن ہمام حنفی (رح) لکھتے ہیں:

قرآن مجید میں تمام نمازیوں کو قرات کرنے حکم دیا گیا ہے (آیت) ”فاقرءوا ماتیسر منه “جس قدر قرآن مجید آسانی سے پڑھ سکتے ہو پڑھو “اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا بھی حکم ہے کہ کوئی نماز قرآن مجید پڑھے بغیر نہیں ہوسکتی “لیکن جب حدیث صحیح میں وارد ہے: جس شخص کا امام ہو تو امام کی قرات اس شخص کی قرات ہے ‘تو اس آیت اور حدیث کے عموم کی تخصیص کرنا واجب ہے جیسا کہ ائمہ ثلاثہ کا قاعدہ ہے ‘اس لیے مقتدی اس حکم کے عموم سے خارج ہے ‘نیز اس پر اجماع ہے کہ رکوع میں نماز کو پانے والا نماز کی رکعت کو پالیتا ہے حالانکہ اس رکعت میں اس نے قرات نہیں کی ہے ‘اس سے معلوم ہوا کہ مدرک رکوع بھی قرات کے عمومی حکم سے خارج ہے ‘اسی طرح جس حدیث میں ہے: اللہ اکبر کہو پھر تم کو جس قدر قرآن یاد ہے پڑھو ‘یہ بھی مقتدی کے غیر پر محمول ہے تاکہ دلائل میں تطبیق ہو ‘بلکہ یہ کہا جائے گا کہ مقتدی کے لیے بھی شرعا قرات ثابت ہے ‘کیونکہ امام کی قرات مقتدی کی قرات ہے ‘اگر مقتدی نے قرات کی تو ایک نماز میں دو قراتیں ہوجائیں گی ‘یہ حدیث متعدد اسانید سے حضرت جابر بن عبداللہ نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے روایت کی ہے ‘امام دار قطنی ‘امام بیہقی اور امام ابن عدی نے کہا ہے کہ اس حدیث کا مرفوع ہونا ضعیف ہے ‘اور صحیح یہ ہے کہ یہ حدیث مرسل ہے ‘متعدد راویوں نے اس حدیث کو ارسال سے بیان کیا ہے ‘ایک سند سے امام ابوحنفیہ (رح) نے بھی اس کو مرسلا روایت کیا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ اکثر اہل علم کے نزدیک حدیث مرسل حجت ہے اور اس سے صرف نظر کر کے ہم یہ کہتے ہیں کہ امام ابوحنفیہ (رح) نے سند صحیح کے ساتھ اس حدیث کو مرفوعا بھی روایت کیا ہے ‘امام محمد بن الحسن نے اپنی ”موطا “میں روایت کیا ہے از

ابوحنفیہ (رح)، از ابو الحسن موسیٰ بن ابی عائشہ از عبداللہ بن شداد از جابر (رض) از نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ نے فرمایا: جس شخص نے امام کے پیچھے نماز پڑھی تو بیشک امام کی قرات اس شخص کی قرات ہے ' اس حدیث کو سفیان ' شریک جریر اور ابو الزبیر نے اپنی اپنی اسانید صحیحہ کے ساتھ اپنی اپنی مسانید میں مرفوعا روایت کیا ہے اور سفیان کی سند امام مسلم کی شرط کے مطابق صحیح ہے ' اس لیے مخالفین کا اس حدیث کو مرسل قرار دینے پر اصرار کرنا باطل ہے ' کیونکہ اگر ثقہ روای کسی حدیث میں متفرد ہو تو اس کو قبول کرنا واجب ہے اور رفع ارسال پر زیادتی ہے اور ثقہ اگر متفرد ہو تب بھی اس کی زیادتی مقبول ہوتی ہے ' چہ جائیکہ یہاں چار سے زائد ثقہ راوی اس حدیث کو مرفوعا روایت کر رہے ہیں اور ثقہ راوی کبھی حدیث کی ایک سند کو ارسال سے بیان کرتا ہے اور کبھی اتصال سے ' امام ابو عبداللہ حاکم نے اپنی سند کے ساتھ حضرت جابر (رض) سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے نماز پڑھائی ' آپ کے پیچھے ایک شخص قرات کر رہا تھا، نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ایک صحابی اس کو نماز میں قرات سے روکتے رہے ' جب وہ شخص نماز سے فارغ ہوا تو اس نے صحابہ کرام (رض) سے کہا: کیا تم مجھ کو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پیچھے نماز میں قرات کرنے سے منع کرتے ہو؟ وہ دونوں تکرار کرنے لگے ' حتی کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے اس کا ذکر کیا گیا ' نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جو شخص امام کے پیچھے نماز پڑھے تو امام کی قرات اس شخص کی ہوتی ہے ' امام ابوحنفیہ (رح) نے ایک روایت سے بیان کیا ہے کہ ظہر یا عصر کی نماز میں ایک شخص نے قرات کی تو اس کو ایک صحابی (رض) نے منع کیا ' الحدیث ' اس سے معلوم ہوا کہ حدیث کی اصل یہ واقعہ ہے اور حضرت جابر (رض) نے کبھی پورا واقعہ بیان کیا اور کبھی صرف اس کا حکم بیان کر دیا اور کبھی امام کے پیچھے قرات کی ممانعت کو بیان کر دیا۔

اس حدیث کے معارض یہ روایت ہے: مجھ سے قرآن کیوں کھینچا جا رہا تھا ' اگر کسی مقتدی نے ضرور قرآن پڑھنا ہو تو وہ صرف سورۃ فاتحہ پڑھے ' اسی طرح امام داؤد (رح) اور امام ترمذی (رح) نے حضرت عبادہ بن صامت (رض) سے روایت کیا ہے کہ ہم رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پیچھے فجر کی نماز پڑھ رہے تھے، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے قرآن مجید پڑھا تو آپ پر قرآن پڑھنا دشوار ہوا ' جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو آپ نے فرمایا: شاید تم اپنے امام کے پیچھے قرآن پڑھ رہے تھے! ہم نے کہا: ہاں! یا رسول اللہ! آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا

:سوا سورۃ فاتحہ کے اس طرح نہ کرو کیونکہ جو سورۃ فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز نہیں ہوتی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جس حدیث میں امام کے پیچھے قرآن مجید پڑھنے سے منع کیا ہے اس کی سند زیادہ قوی ہے اور اس میں ممانعت علی الاطلاق ہے ' اس لیے قوت سند اور عموم کی وجہ سے وہ حدیث ان احادیث پر مقدم ہے۔

حضرت جابر (رض) کی حدیث دیگر احادیث سے موید ہے ' ہر چند کہ ان کی اسانید ضعیف ہیں اور صحابہ کرام (رض) کے مذاہب سے بھی موید ہے ' حتیٰ کہ صاحب "ہدایہ" نے یہ کہا کہ امام کے پیچھے قرات نہ کرنے پر اجماع صحابہ ہے ' وہ احادیث حسب ذیل ہیں:

(۱) امام مالک نے اپنی "موطا" میں از نافع از ابن عمر (رض) سے روایت کیا: جب تم میں سے کوئی شخص امام کے پیچھے نماز پڑھے تو امام کی قرات اس کے لیے کافی ہے اور جب وہ تنہا نماز پڑھے تو قرات کرے ' اور حضرت ابن عمر امام کے پیچھے قرات نہیں کرتے تھے۔

(۲) امام دار قطنی (رح) نے اس حدیث کو مرفوعا بیان کیا ہے اور یہ کہا کہ اس کا مرفوع ہونا روای کا وہم ہے لیکن یہ حکم مرفوع ہے کیونکہ حضرت ابن عمر (رض) کا یہ قول رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے سماع پر محمول ہے۔

(۳) امام ابن عدی (رح) نے "کامل" میں حضرت سعید خدری (رض) سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جس شخص کا امام ہو تو امام کی قرات اس شخص کی قرات ہے ' اس حدیث کی سند میں اسماعیل ضعیف راوی ہے ' اس کا کوئی متابع نہیں ہے۔

امام ابن عدی (رح) کا یہ کہنا صحیح نہیں ہے ' بلکہ اسماعیل کا متابع ہے نضر بن عبداللہ (رح)، امام طبرانی (رح) نے " معجم اوسط " میں نضر بن عبد اللہ از حسن اس حدیث کو روایت کیا ہے اور حسن سے سندا اور متنا یہی روایت ہے امام طبرانی (رح) نے اس حدیث کو حضرت ابن عباس (رض) سے بھی مرفوعا روایت کیا ہے لیکن اس میں کلام ہے۔

(۴) امام طحاوی (رح) نے "شرح معانی الآثار" میں اپنی سند کے ساتھ روایت کیا ہے کہ عبد اللہ بن مقاسم (رح) نے حضرت عبد اللہ بن عمر (رض) حضرت زید بن ثابت (رض) اور حضرت جابر بن عبد اللہ (رض) سے سوال کیا تو انھوں نے کہا: کسی نماز میں بھی امام کے پیچھے قرات نہ کرو۔

(۵) امام محمد بن حسن (رح) نے اپنی "موطا" میں اپنی سند کے ساتھ ابو وائل سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) سے امام کے پیچھے قراءت کے متعلق سوال کیا تو انھوں نے کہا: خاموش رہو 'نماز میں صرف ایک شغل ہے اور تمہارے لیے امام کافی ہے اور اسی کتاب میں حضرت سعد (رض) کے بعض بیٹوں سے روایت کیا ہے کہ حضرت سعد (رض) نے کہا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ جو شخص امام کے پیچھے قرات کرے اس کے منہ میں انگارے ڈال دوں، اس کو امام عبدالرزاق نے بھی روایت کیا ہے مگر ان کی روایت میں ہے: میں اس کے منہ میں پتھر ڈال دوں۔

(٦) امام محمد (رح) نے اپنی "موطا" میں اپنی سند کے ساتھ حضرت عمر بن خطاب (رض) سے روایت کیا ہے 'انھوں نے کہا: جو شخص امام کے پیچھے قرات کرتا ہے کاش! اس کے منہ میں پتھر ہوتے 'اس اثر کو امام عبدالرزاق نے بھی روایت کیا ہے۔

(۷) امام طحاوی (رح) نے اپنی سند کے ساتھ ابو جمرہ سے روایت کیا ہے کہ میں نے حضرت ابن عباس (رض) سے پوچھا: کیا میں امام کے ہوتے ہوئے قرات کروں؟ انھوں نے کہا: نہیں۔

"(۸) امام ابن ابی شیبہ (رح) نے اپنی "مصنف 'میں حضرت جابر (رض) سے روایت کیا کہ امام کے پیچھے قرات نہ کرو خواہ جہری نماز ہو یا سری۔

(۹) امام عبدالرزاق (رح) نے روایت کیا ہے کہ حضرت علی (رض) نے فرمایا: جس شخص نے امام کے پیچھے قرات کی اس نے فطرت میں خطا کی۔

(۱۰) امام نسائی (رح) نے حضرت ابو درداء (رض) سے روایت کیا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے سوال کیا گیا: کیا ہر نماز میں قرات ہے؟ فرمایا: ہاں! انصار کے ایک شخص نے کہا: قرات واجب ہو گئی، حضرت ابو درداء کہتے ہیں: میں نے اس کی طرف مڑ کر دیکھا اور کہا: جب امام کسی قوم کو نماز پڑھائے تو اس کی قرات قوم کی لیے کافی ہے۔
اگر موخر الذکر نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا کلام نہ ہو بلکہ حضرت ابو دارداء کا کلام ہو تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ پہلے وہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے یہ روایت کریں کہ ہر نماز میں قرات ہے 'پھر امام کی قرات کو مقتدی

کی قرات قرار دیں' یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب ان کو یہ علم ہو کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مقتدی کی قرات کو امام کی قرات قرار دیا ہے۔

اسی (۸۰) کبار صحابہ (رض) سے امام کے پیچھے قرات کی ممانعت منقول ہے 'ان میں حضرت علی المرتضی (رض)، حضرت عبداللہ بن مسعود (رض)، حضرت عبداللہ بن عمر (رض)، حضرت عبداللہ بن عباس (رض)، اور حضرت عبداللہ بن زبیر (رض)، کے اسماء شامل ہیں 'اور محدثین نے ان تمام صحابہ کرام کے اسماء کو ضبط کیا ہے۔ امام شافعی (رح) یہ کہتے ہیں کہ قرات نماز کا ایک رکن ہے اور اس میں امام اور مقتدی دونوں مشترک ہیں 'ہم کہتے ہیں کہ دونوں مشترک ہیں لیکن متقدی کا حصہ قرآن مجید سننا اور خاموش رہنا ہے 'کیونکہ قرات سے مطلوب تدبر اور تفکر ہے اور اس پر عمل کرنا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

(آیت) "کتب انزلنه الیك مبرك لیدبروا ایته۔ (ص:۲۹) (ترجمہ) یہ (قرآن مجید) مبارک کتاب ہے جو ہم نے آپ کی طرف نازل فرمائی ہے تاکہ وہ اس کی آیات میں غور کریں۔

اور یہ مقصد اسی وقت حاصل ہو گا جب وہ قرآن مجید کو سنیں گے جیسے جمعہ کا خطبہ 'وعظ اور تذکیر کے لیے مشروع کیا گیا ہے تو اس کا سننا واجب ہے تاکہ اس کا فائدہ حاصل ہو یہ نہیں کہ ہر شخص اپنے نفس کو خطبہ دینے لگے، اس کے برخلاف باقی ارکان خشوع کے لیے مشروع کئے گئے ہیں اور خشوع رکوع اور سجود سے حاصل ہوتا ہے۔ اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ یہ وجہ تو صرف جہری نماز میں درست ہو سکتی ہے اور قرات خلاف الامام کا اختلاف تو سری نماز میں بھی ہے اس میں یہ فائدہ کس طرح حاصل ہو گا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن مجید میں دو چیزوں کا حکم دیا گیا ہے سننے کا اور خاموش رہنے کا:

(آیت) "واذا قری القرآن فاستمعوا له وانصتوا العلکم ترحمون (الاعراف:۲۰۴) (ترجمہ) اور جب قرآن پڑھا جائے تو اسے کان لگا کر سنو اور خاموش رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے

امام مسلم (رح) روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: امام قرات کرے تو تم خاموش رہو۔

امام مسلم (رح) نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے۔ (صحیح مسلم ج ا ص ۱۷۴ مطبوعہ نور محمد اصح المطابع، کراچی)
خلاصہ یہ ہے کہ قرآن مجید اور احادیث میں دو چیزوں کا حکم ہے، سننے کا اور خاموش رہنے کا اور جب امام زور سے قرات نہ کرے اور اس کے لیے سننا ممکن نہ ہو تو اس کے لیے خاموش رہنا تو ممکن ہے "" محیط "میں مذکور ہے کہ مقتدی سے قرات ساقط نہیں ہوئی لیکن امام کی قرات اس کی قرات ہے، حتی کہ وہ امام کے ساتھ قیام میں شریک ہو جائے جو قرات کا محل ہے دوسرا جواب یہ ہے کہ ہم یہ نہیں مانتے کہ مقتدی کیلیے بھی قرات رکن ہے کیونکہ اگر مقتدی کو رکعت فوت ہونے کا خوف ہو (اور وہ رکوع میں مل جائے) تو اس نماز کو جائز ہے، خواہ وہ بالکل قرات نہ کرے اور اس کے جواز پر اجماع ہے، مثلا جب ایک شخص امام کو رکوع میں پائے اور اگر مقتدی کے لیے بھی قرات رکن ہوتی تو اس عذر کی وجہ سے اس سے قرات ساقط نہ ہوتی، جیسے رکوع اور سجود اس سے ساقط نہیں ہوتے، اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ کیا رکوع کے فوت ہونے کے خدشہ سے قیام ساقط نہیں ہوتا؟ تو ہم کہیں گے: نہیں کیونکہ اگر کوئی شخص رکوع کی حالت میں اللہ اکبر کہے تو یہ جائز نہیں ہے، بلکہ اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ کھڑا ہو کر اللہ اکبر کہے، البتہ قیام کا امتداد رکوع کے فوت ہونے کے خدشہ کی وجہ سے اس سے ساقط ہو جاتا ہے اور قیام کا فرض ادنی قیام سے حاصل ہو جاتا ہے جیسے رکوع مطلقا جھکنے سے حاصل ہو جاتا ہے۔

(فتح القدیر ج ا ص ۲۹۷۔۲۹۴، مخلصا و موضحا، مطبوعہ مکتبہ نوریہ رضویہ، سکھر)

امام دار قطنی روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جس نے امام کی پشت سیدھی ہونے سے پہلے امام کو رکوع میں پالیا اس نے نماز (کی رکعت) کو پالیا۔

(سنن دار قطنی ج ا ص ۳۴۷، مطبوعہ نشر السنۃ، ملتان)

"شرح صحیح مسلم، جلد اول میں ہم نے قرات خلف الامام کے موضوع پر مزید دلائل تحریر کئے ہیں۔

(تفسیر تبیان القرآن۔ علامہ غلام رسول سعیدی)

اب انعام یافتہ اور ہدایت یافتہ جماعت کا راستہ، ان کے ساتھ محبت اور ان کی معیت کی درخواست کی جاتی ہے جب کہ دوسرے گروہ سے اجتناب اور نفرت کا اظہار کیا جاتا ہے۔ جس کارواں کے راستہ کی دعا کی جارہی ہے وہ محض عقیدت

کی بنیاد پر ہی نہیں بلکہ ان کے کردار اور اعلیٰ مقام کی وجہ سے ہے۔ جو خدا کے فرستادہ، پسندیدہ اور انعام یافتہ انبیائے کرام (علیہم السلام) ہیں ان پر سب سے بڑا انعام یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں اپنے پیغام اور کام کے لیے منتخب فرمایا تاکہ وہ لوگوں کو سیدھا راستہ بتلائیں اور اس پر چل کر دکھائیں۔ اس قافلہ قدسیہ کے معزز افراد ایک مشن کے داعی، خاندان نبوت کے افراد اور رشتہ رسالت کے حوالے سے ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ رسالت مآب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا:

(أَنَا أَوْلَى النَّاسِ بِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَالْأَنْبِيَاءُ إِخْوَةٌ لِعَلَّاتٍ أُمَّهَاتُهُمْ شَتَّى وَدِينُهُمْ وَاحِدٌ) (رواہ البخاری: کتاب أحادیث الأنبیاء، باب قول اللہ واذکر فی الکتاب مریم)

”لوگو! میں عیسیٰ بن مریم (علیہ السلام) کے دنیا وآخرت میں سب سے زیادہ قریب ہوں اور انبیاء کی جماعت علاتی بھائی ہیں ان کی مائیں جدا جدا ہیں لیکن دین ایک ہے۔“

انعام یافتہ لوگوں کا تذکرہ:

(فَأُولَٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ وَحَسُنَ أُولَٰئِكَ رَفِيقًا ۔)(النساء:٦٩)

”تو وہ لوگ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام کیا ہے یعنی انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کے ساتھ۔ رفیق ہونے کے لحاظ سے یہ لوگ کتنے اچھے ہیں۔“

پہلے انبیاء کی نبوتوں اور شخصیتوں کی تائید کرنا ہمارے لیے ضروری اور ہمارے ایمان کا حصہ ہے لیکن سمع وطاعت صرف نبی آخر الزمان محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی کرنا ہو گی۔ اس سے اس نظریہ کی از خود نفی ہو جاتی ہے جو رسالت مآب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ارشادات کے مقابلہ میں کسی نبی یا شخصیت کے اقوال پیش کرتے ہیں۔ فاتحہ کے آخر میں جس گروہ سے نفرت کا اظہار اور جن کی عادات اور رسومات سے بچنے کی دعا کی جا رہی ہے وہ صرف گروہ بندی کی بنیاد پر نہیں بلکہ ان سے اس لیے الگ رہنا ہے کہ وہ اپنی بے اعتدالیوں اور بد اعمالیوں کی وجہ سے اللہ کے غضب کے سزاوار ٹھہرے ہیں۔

”

اس کی تفصیل یہ ہے کہ بندہ کے لیے تین حال ہیں۔ماضی، حال، مستقبل۔

ماضی بندہ کی یہ ہے کہ وہ معدوم محض تھا اسے اس کے منعم حقیقی نے کتم عدم سے منصہ شہود پر لا کر شرف وجود سے مشرف فرمایا جیسا کہ وقد خلقتک من قبل ولم تک شیا۔ ہم نے تجھے پیدا کیا۔ حالانکہ پہلے تو کچھ بھی نہ تھا۔ نطفہ کی صورت میں جب تو مردہ تھا تو تجھے زندہ کیاو کنتم امواتاً فاحیا کم۔ پھر زندہ ہو کر بھی جاہل تھا تو تجھے علم دیا اور اسباب علم حواس وعقل تجھے بخشے **کما قال اخرجکم من بطون امھتکم لا تعلمون شیئا وجعل لکم السمع والابصار والافدۃ**۔ اور زمانہ حال بندہ کا یہ ہے کہ اس کی حاجتیں حد سے زیادہ ہیں جو ابتدائے عمر سے آخر عمر تک اگر خیال کیا جائے تو اس کی گنتی نہیں اور پھر باوجود تقصیرات و معاصی جو دمبدم اس سے سرزد ہوتی ہیں اس کا فضل واحسان منقطع نہیں ہوتا اور مستقبل بندہ کا یہ ہے کہ موت کے وقت سے حشر و نشر تک محافظت عذاب و عقاب کی امید صرف اور صرف جناب رحمن ورحیم سے توقع رکھتا ہے۔ بہر حال بندہ کو سوائے ذات رحمن ورحیم کوئی بچاؤ وپناہ کسی حال میں احوال ثلاثہ سے نہیں۔ تو بندہ کی عبادت کا وہی مستحق ہے نہ کہ کوئی اور جو کچھ عالم میں ہے دیدہ و شنیدہ ہے یا ہر وہ چیز جس سے انفاع حاصل ہو وہ بتامہ قبل از وجود تھا نہ بعد از موت ہوگا۔ مثل آفتاب وماہتاب اور دریا اور زمین اور پہاڑ کے یہ زمان ماضی میں نفع دیتی ہے اگرچہ ہمیں نہیں تو ہمارے آباؤاجداد کو زمان ماضی میں دیتی رہی اور زمان حال میں دے رہی ہے اور زمانہ آئندہ میں دے گی اور ارواح طیبہ سے جو نفع ہوتا ہے یہ سب کچھ اس وقت واجب تعالیٰ شانہ سے ہے۔ لہٰذا اس صورت میں بھی وہی مستحق عبادت ہے۔ اسی وجہ سے ارشاد ہے وقضی ربک الا تعبدوالا ایاہ (اور تیرے رب نے فیصلہ کیا ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو)

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایاک نعبد کو ملک یوم الدین کے ساتھ کیا مناسبت ہے کہ **ملك یوم الدین** کے بعد ایاک نعبد لایا گیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ عبادت کے تین درجے ہیں۔ اول یہ کہ عبادت ثواب کے لیے ہو کہ اس کے بدلے میں حور و قصور جنات وانہار ملیں گے تو یہ عبادت در حقیقت ایک مزدوری ہے کہ محنت کے بدلے میں مال حاصل ہو۔ اس لیے کہ عاقل خوب سمجھتا ہے کہ دنیا کی **انعمہ و اطعمہ اور امتعہ** فانی اور محض فانی ہیں لیکن عطائے اخروی ابدی ہے اور فانی کے مقابل ابدی نعمت افضل واشرف ہے لہٰذا عبادت کا بدلہ اخروی بہتر ہے۔

دوسرے یہ کہ عبادت خوف عذاب وعقاب سے ہو اس لیے کہ انبیاء کرام (علیہم السلام) جن کی تعداد بعض روایات سے ایک لاکھ چوبیس ہزار ہے سب نے اعلان فرمایا اور قاطبۃً بتایا کہ اگر بندے عبادت الٰہی نہ کریں گے تو مستوجب عقاب وعذاب ہوں گے اور جبکہ محض ایک صادق وامین کی خبر مفید یقین ہوتی ہے تو ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء کرام (علیہم السلام) کی خبر پر کیونکر احتمال شک ہو سکتا ہے لیکن یہ عبادت بھی مثل اطاعت غلام وکیسز کے ہے کہ خوف سزا سے ناچار خدمت مولا ومالک کرتے ہیں اور امید انعام واکرام رکھتے ہیں۔

تیسرے یہ کہ بندہ کی عبادت محض مشاہدہ جمال جمیل کے لیے ہو یہ عبادت پہلے دو درجوں سے نہایت ارفع واعلیٰ ہے۔ چنانچہ اسی عبادت پر ہمیں حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تعبداللہ کانك تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراك (اللہ کی عبادت اس طرح کر گویا کہ تو اسے دیکھ رہا ہے اور اگر تو اسے نہیں دیکھتا تو وہ تجھے دیکھ رہا ہے) اور اس قسم کی نماز کی نیت بھی ہے کہ اصلی للہ والثواب للہ والخلاص من عذاب اللہ (میں اللہ کے لیے نماز پڑھتا ہوں اور اس کا ثواب بھی اللہ کیلئے ہے اور اللہ کے عذاب سے نجات بھی)

چنانچہ یہ عبادت کرنے والا عابد حالت سکر میں والہانہ کہہ گیا۔

امروز چوں جمال تو بے پردہ ظاہر است

در حیرتم کہ وعدہ فردا برائے چیست

تو ثابت ہوا کہ چونکہ ہر سہ مرتبہ والی عبادت کا تعلق روز جزا سے ہے لہٰذا ملک یوم الدین کو ایاک نعبد کے ساتھ مرتب ہونا ضروری تھا۔ ایک واقعہ ہے جس سے ہمارے دعویٰ کی مکمل تائید ہوتی ہے۔ ایک شخص نامی گرامی پہلوان تھا۔ اس کی کشتی کسی کمزور آدمی سے مقرر ہوگئی جب دونوں اکھاڑے میں اتر کر کشتی کرنے لگے تو کسی نے اس پہلوان سے کہا تجھے معلوم بھی ہے تو کس سے کشتی کر رہا ہے۔ اس نے حیرت سے دریافت کیا لوگوں نے اسے بتایا کہ یہ فلاں استاد ہے۔ یہ سنتے ہی وہ قوی الجثہ پہلوان گر گیا اور اس سے کشتی ہار گیا۔ تو جب ایک قوی الجثہ پہلوان پر ایک استاد پہلوان کا نام یہ رعب طاری کر سکتا ہے تو اس قوی ومتین کا نام کس درجہ موجب خشیت واجلال ہو گا۔ دوسرے یہ کہ بندے نے جب رحمن ورحیم کا نام سن لیا تو اس کی برکت سے ایک قوت اسے حاصل ہوگئی جس نے ثقل عبودیت اس

سے ہلکا کر دیا جیسے کسی سے جب زور کا کام لیا جاتا ہے تو اول اسے یا قوتی یا غذائے مقوی دیتے ہیں تا کہ اس کی غذائے لطیف اسے اس کار ثقیل کو ہلکا کر دے۔

ایسے ہی جب نام الٰہی قبل از عبادت زبان پر لیا گیا تو بندہ کو حضور معنوی حاصل ہو گیا اور جیسے عاشق کو حضوری محبوب کے بعد کوئی کلفت نہیں رہتی ایسے ہی جمال جہاں آراء محبوب کے تصور سے عابد پر بھی کوئی بار نہیں رہتا چنانچہ ارشاد ہے ان الذین اتقوا اذا مسھم طئف من الشیطن تذکروا فاذاھم مبصرون۔ واخوانھم (پرہیز گاروں کو جب کوئی شیطانی وسوسہ پہنچتا ہے تو وہ ہوشیار ہو جاتے ہیں اور ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں)

بنابریں بندہ کو چاہیے کہ قبل از عبادت بھی اپنے معبود کا نام یاد کرے اس بنا پر اللہ اکبر تکبیر تحریمہ میں پکارا جاتا ہے تا کہ شیطان اس کی عبادت میں کسی غفلت کا نقصان نہ ڈالے اور وہ عبادت بحضور قلب ادا کرے۔

اب یہ امر بھی سمجھ لینا ضروری ہے کہ عبادت کنندہ ایک ہوتا ہے اور الحمد ایاک نعبد صیغہ جمع کے ساتھ کس لیے استعمال ہوا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بندہ اپنی ناقص عبادت کو کاملوں کی عبادت میں مخلوط کر کے حضور اقدس میں پیش کرتا ہے تا کہ رحمن ورحیم اپنے کرم سے کاملوں کی کامل عبادت کے ساتھ اس کی ناقص بھی قبول فرمالے اور عبادت اولیاء رحمھم اللہ وانبیاء وملائکہ (علیھم السلام) کے ساتھ اس بندہ کی ناقص عبادت بھی قبول ہو جائے۔ چنانچہ فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص دس چیزیں فروخت کرے ان میں بعض ناقص بھی ہوں تو خریدار کو لازم ہے کہ تمام کی تمام ہی لے اگر ناقص واپس کر کے اچھی چھانٹ لے تو یہ بیع کے خلاف ہے۔ تو بارگاہ اکرم الاکرمین سے تو یہ کسی طرح متصور ہی نہیں ہو سکتا بلکہ وہ اپنے کرم سے سب ہی قبول کر لیتا ہے۔

می پذیرند بداں را بہ طفیل نیکاں
رشتہ واپس نہ دہد ہر کہ گہرے گیرد

موتیوں کی لڑی لینے والا دھاگہ بھی موتیوں کے ساتھ قبول کر لیتا ہے یہ نہیں ہو تا کہ موتی قبول کر کے دھاگہ واپس کر دے۔ دوسرے صیغہ جمع کے ساتھ سیدنا ابراہیم (علیہ السلام) کی صفت بھی فرمائی گئی حالانکہ قانت وحنیف صرف وہی تھے جیسا کہ ارساد ہے ان ابرھیم کان امۃ قانت اللہ حنیفا۔ (بے شک ابراہیم ایک جماعت تھے اللہ کے فرمان

بر دار اور ایک رخ) اور اگر ایاک اعبد فرمایا جاتا تو بھی مضمون صحیح ہو جاتا کہ میں تیرا بندہ ہوں اور ایک نعبد میں یہ عبادت ہوتی ہے کہ میں بھی ایک بندہ ہوں تیرے بندوں میں سے اور یہ مضمون زیادہ مناسب اور قریب ادب ہے۔ اس میں تواضع زیادہ ہے۔

اب ایاك نستعین کے متعلق عرض ہے۔

نستعین صیغہ جمع متکلم استعانت سے ہے اور حقیقت استعانت طلب معونت ہے اور طلب معونت ہر کام میں چار طرح کی جاتی ہے۔ اول اس امر کی مدد چاہنا کہ اس کام پر اسے قدرت حاصل ہو جائے۔ دوسرے جو کام کرنا چاہتا ہے اس میں آسانی ہو جائے۔ تیسرے جو کام کرنا ہے اس میں اتنی مدد حاصل ہو جائے کہ وہ کام نزدیک ہو جائے۔ چوتھے جو کام کرنا چاہتا ہے اس کی طرف اتنی رغبت ہو جائے کہ عقل و ہوش اور شعور دست و پا سب اس میں مصروف ہو سکیں۔ تو اس کی تقسیم اس طرح ہے کہ عقل و شعور اور دست و پا بخشنا ہے عبادت کے لیے یہ قسم اول سے ہے اور رفع موانع اور اشتغال و فراغ خاطر دینا دوسری قسم سے ہے اور اس کے دواعی کو دل میں ڈالنا اور اس کا پسندیدہ ہونا نظر عقل میں اور لذت عبادت اور انشراح خاطر بڑھانا قسم سوم سے ہے اور کسی مرشد کو انبیاء (علیہم السلام) و اولیاء رحمہم اللہ کی طرف سے پیدا کر دینا تاکہ پند و نصیحت سے عبادت کی طرف میلان بڑھے یہ قسم چہارم سے ہے اور یہاں ایاک کو نستعین پر مقدم کرنا بھی مفید حصر و اختصاص ہے جس کے صاف معنی ہوئے کہ الٰہی تیرے سوا میں کسی سے مدد نہیں لینا چاہتا۔ پھر یہ استعانت عبادت کے لیے خاص ہو گی یا عام ہو گی تو تمام امور دنیا و دین کے لیے ہو گی۔ اگر خاص ہے تو اس استعانت میں یہ سر ہے کہ عبادت اگرچہ ہر چند بندہ کے کسب و عمل سے ہے مگر بندہ بہ سبب خواطر نفسانی یہ عمل کرتا ہے اور اس میں بندہ کو خالص عبادت کا شعور بغیر اللہ تعالیٰ کی توفیق کے کارگر نہیں۔ اور عقل کا کام یہ ہے کہ انجام پر نظر رکھے اور جو کچھ انجام کار بہتر نظر آئے اسے اختیار کرے اگرچہ اول اول اس میں مشقت لازم ہو اور نفس کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ فی الحال جو نفع دے اسے اختیار کیا جائے اور عواقب کار اس پر پوشیدہ رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عقل اور نفس کی خواہش میں کشاکش اور تنازع رہتا ہے اور لشکر ہوا و ہوس غلبہ کرکے اسے ہلاکت قلب تک پہنچا دیتا ہے اس کا سدباب سوائے عون الٰہی ممکن نہیں اور عبادت بندہ پر آسان نہیں ہوتی۔ جب تک

عوائق رفع نہ ہوں اور وہ چار ہیں۔ دنیا، خلائق، شیطان اور نفس امارہ۔ اور یہ چاروں دفع ہوتے ہیں جب ان کے عوارض دفع ہوں اور عوارض کے دفع کرنے میں مصائب و خطرات اور ہموم و غموم لازم ہیں۔ ان سے بندہ بے پرواہ جب ہوتا ہے جبکہ عبادت میں ریاوسمعہ اور عجب نہ آئے اور یہ تمام اس وقت تک دفع نہیں ہوتے جب تک بندہ میں خوف ورجا اور اشتیاق مشاہدہ حق پیدا نہ ہو اور یہ چاروں کیفیت بغیر عون الٰہی متصور نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ارباب تحقیق نے عبادت کو وسیلہ فرمایا اور استعانت کو حاجت کہا۔ کمافی تفسیر عزیزی۔ اور ظاہر ہے کہ وسیلہ حاجت پر مقدم ہے تو جب استعانت اتمام عبادت کے لیے ہے تو چونکہ ہر چیز کا اتمام بعد شروع کرنے کے ہوتا ہے بنابریں استعانت بعد شروع عبادت ہی ضروری ہوئی تو ایاک نعبد مقدم اور ایاک نستعین کو موخر لانا بالکل صحیح اور درست ہے۔ گویا بندہ کا بارگاہ حق میں یہ عرض کرنا ہے کہ الٰہی میں تیرے حکم کی تعمیل میں عبادت کرتا ہوں لیکن اس کا اتمام میرے ہاتھ میں نہیں۔ مبادا کوئی مانع یا عارض پیش آجائے تو تجھ سے استعانت کرتا ہوں کہ اتمام کو تو ہی پہنچانے والا ہے السعی منی والاتمام من اللہ (کوشش میرا کام اور پورا کرنا اللہ تعالیٰ کا کام) میرا عقیدہ ہے فان قلب المومن بین اصبعین من اصابع الرحمن (مومن کا دل اللہ تعالیٰ کی دو انگلیوں کے درمیان ہے) اور اگر یہ استعانت عام ہے امور دنیا و دین میں تو اس کی وجہ اختصاص یہ ہے کہ جو اپنے غیر کی اعانت کرتا ہے تو اس کا منشا کار یہ ہے کہ اس کے دل میں داعیہ اعانت اس کے غیر کی ڈالتا ہے اور یہ فعل سوائے ذات واجب تعالیٰ شانہ کوئی نہیں کر سکتا۔ تو گویا بندہ بارگاہ الٰہی میں عرض پرواز ہے کہ الٰہی میری مدد سوائے تیرے کوئی نہیں کر سکتا مگر جس کو تو میری مدد کرنے کی اجازت فرمادے تو اسے جب اسباب اعانت بہم ہوں گے اور تو اس کے دل میں میری اعانت کا جذبہ ڈال دے تو غیر بھی میری مدد کریگا۔ تو میں تیرے ہی حضور وسائط قطع نظر کرتا ہوں اور غیر کی اعانت بھی میں بہ نظر حقیقت تیری ہی اعانت دیکھتا ہوں۔ اس اجمالی تقریر کی وضاحت یہ ہے کہ بندہ کو بظاہر کچھ قدرت ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ سے اسے ملی ہے تو اس قدرت کو دیکھ کر بندہ گمان کرتا ہے کہ کسی فعل کا کرنا نہ کرنا میرے اختیار میں ہے لیکن ترجیح فعل اس کے ترک پر ہرگز اس کی قدرت میں نہیں ہے۔ اس لیے کہ اگر کوئی مرجع بندہ کی جانب سے ہوگا تو اس کا مرجع بھی لازمی ہوگا اور اس میں تسلسل لازم آتا ہے اور یہ باطل ہے۔ لہٰذا ماننا پڑے گا کہ مرجع سوائے ذات واجب تعالیٰ کوئی نہیں اور ہم دیکھتے ہیں کہ مخلوق اپنی مطلوبات طلب کرتی ہے حالانکہ اس کی قدرت میں عقل و شعور اور کوشش اور جدوجہد میں کوئی کسر

نہیں رکھتا مگر اکثر و بیشتر وہ تمام مساعی بیکار جاتی ہیں اور مطلوب حاصل نہیں ہوتا اور بعض کو حاصل ہو جاتا ہے اور یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ انسان انسان سے اپنی مطلب براری کے لیے مدتوں سعی کرتا رہتا ہے مگر جس سے اسے کام ہے وہ اسے قبول نہیں کرتا کہ اچانک اس سے اس کی حاجت پوری ہو جاتی ہے۔ اس جگہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس کے دل کو بدلنے والا وہی مقلب القلوب ہے۔ جو غیب سے اس کے دل کی کنجی کھول دیتا ہے اور اسی سے کام کرا دیتا ہے جس سے یہ مایوس تھا۔ تو مومن کو چاہیے کہ اپنے ابنائے جنس کی اعانت کو بھی اللہ کی اعانت سمجھے۔ اور شائبہ شرک سے مجتنب رہے اور سعدی (رح) کے اس قول کو اپنا عقیدہ بنائے کہ

نہ کس میدہاند نہ کس میدہد

خدامی دہاند خدا مے دہد

تو ایاک نعبد و ایاک نستعین کا مفہوم واضح ولائح روشن اور ظاہر و باہر ہو گیا۔ چنانچہ خلیل (علیہ السلام) کو جب نمرود لعین نے ہاتھ پاؤں باندھ کر آگ میں ڈالا تھا تو جبرائیل (علیہ السلام) پہنچے اور عرض کیا کہ آپ کو مجھ سے کوئی حاجت ہے تو فرمایئے۔ خلیل (علیہ السلام) نے فرمایا اما الیك فلا۔ جبرائیل تجھ سے کوئی حاجت نہیں۔ جبرائیل (علیہ السلام) نے عرض کیا۔ پھر اپنے رب سے عرض کیجئے خلیل اللہ (علیہ السلام) نے فرمایا علمه بحالی حسبی من سوالی۔ وہ دانائے نہاں و آشکارا ہے میرے عرض کرنے کی وہاں ضرورت نہیں۔

یہی نقشہ خلیل مومن کے لیے ظاہر میں ہے کہ جب نیت کر لیتا ہے تو دونوں پیر چلنے سے حرکت کرنے سے بند ہو جاتے ہیں دونوں ہاتھ بند ہو جاتے ہیں کسی چیز کو پکڑنے سے معطل ہوتے ہیں حتی کہ زبان بھی سوا قرات اور ثناء کے کچھ نہیں کہہ سکتی۔ گویا کہ اسباب طلب و ہرب بے کار ہوتے ہیں تو اس وقت تمام اسباب کو بے کار دیکھ کر بارگاہ الوہیت میں عرض پیرا ہوتا ہے ایاك نعبد و ایاك نستعین اور یہاں سے سر تقدیم نعبد، نستعین پر واضح ہو جاتا ہے۔ اس سورۃ مبارکہ میں دو مقام ہیں۔ ایک مقام معرفت ربوبیت دوسرا مقام معرفت عبودیت جب یہ دو مقام جمع ہو جاتے ہیں بندے کا معاملہ خدا تعالیٰ سے تمام ہو جاتا ہے۔ پھر اوفوا بعهدی اوف بعهد کم جلوہ گر ہوتا ہے۔

ابتداء سورت سے ملک یوم الدین تک مقام ربوبیت ہے اور ایاک نعبد بیان ابتداء مقام عبودیت ہے۔ اور ایاک

نستعین میں بیان کمال عبودیت ہے اور جب ہر دو جانب سے عہد پورا ہو گیا تو اس پر ثمرہ مترتب ہو گیا اور حسب موقع یہ بھی بیان کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عبادت و استعانت میں مشرکین اور اہل اسلام کے مابین کیا اختلاف ہے۔ وہ اختلاف یہ ہے کہ وہ اجسام معدنیہ کو پوجتے ہیں اور ان کی عبادت کرتے ہیں جیسے پہاڑ، سیم وزر اور نباتات میں پیپل، تلسی اور روحانیت میں دیو، بھوت، جن، ملائکہ کو پوجتے ہیں اور انھیں اپنا مربی جانتے ہیں۔ حتیٰ کہ حرارت و برودت، رطوبت و یبوست کو بھی ایک روح سمجھتے ہیں اور اس سے استعانت کرتے ہیں اور چونکہ ارواح نظر سے مخفی ہوتے ہیں تو ان کی صورت اور تمثال بنا کر اسے پوجتے ہیں۔ اس کے آگے تضرع کرتے ہیں بعض وہ ہیں کہ افراد انسانی سے کامل ہستیوں کی پوجا پاٹ کرتے ہیں۔ بعض وہ ہیں کہ اجسام بسیط کو خواہ وہ سفلی ہوں جیسے آگ کو مجوس آتش پرست اسے معبود اعتقاد کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ بہت زیادہ لطیف اور نورانی ہے لہٰذا معبود ہے۔ بعض آفتاب و ماہتاب کے پرستار ہیں بعض ستاروں کے پجاری ہیں بعض نور و ظلمت کے پجاری ہیں۔ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے ان کے مقابل ایاك نعبد و ایاك نستعین کا عقیدہ پیش فرمایا اور بتایا کہ عبادت و استعانت از غیر جس میں غایت تذلل اور نہایت تعظیم ہو وہ دین حنیف میں جائز نہیں بلکہ مخصوص بحضرت حق تعالیٰ شانہ ہے۔

لیکن وہ تعظیم و تکریم جو مادر و پدر استاذ و مرشد اور آقا و حاکم کے ساتھ ہوتی ہے وہ یہ سمجھ کر کی جاتی ہے کہ یہ مظاہر انعام حق ہیں ان کی تعظیم و تکریم میں غایت تذلل و تعظیم متحقق نہیں ایسی تعظیم و تکریم سے اتلاف حق مالک الملک علی الاطلاق لازم نہیں آتا اور اس میں تشابہ بالمشرکین نہیں۔ یہ استعانت ویسی ہی ہے جیسے انسان بھوک کے دفع کرنے کو گندم چاول سے مدد لیتا ہے۔ پیاس بجھانے کو پانی، شربت، برف کی مدد حاصل کرتا ہے۔ دھوپ کی شدت گرمی کی حرارت سے راحت حاصل کرنے کو سایہ دار درخت وغیرہ کا سہارا لیتا ہے۔ دفع مرض کے لیے ادویہ عقاقیر سے مدد لیتا ہے۔ طبیب کی مدد سے ان ادویہ کا تعین کرتا ہے یہ استعانت بلا کراہت جائز ہے اس لیے کہ در حقیقت یہ استعانت نہیں اور اگر استعانت مان بھی لیا جائے تو اس میں مستعان حقیقی وہی ذات واجب تعالیٰ شانہ ہے اور باعتبار وسیلہ یہ استعانت بالغیر ہے۔

حکام و ارباب حکومت سے مالی مدد۔ اولیاء و بزرگان دین رحمہم اللہ سے دعائیں کرانا وغیرہ یہ سب استعانت مطلقاً جائز ہیں۔ اس لیے کہ ان سے استعانت انھیں مظاہر عون سمجھ کر کی جاتی ہے نہ کہ مالک الملک سمجھ کر بر خلاف مشرکین

کے کہ وہ بتوں سے جو استعانت کرتے ہیں وہ انھیں معین مطلق سمجھ کر کرتے ہیں اور روحانیات فلکیہ کو اور روحانیات عنصریہ کو مستقل بالذات معین جانتے ہیں جیسے بھوانی، پونا چماری، شیخ سدو وغیرہ ان سے استعانت عین شرک ہے اور اس قسم کی استعانتیں منافی ملت اسلامی ہیں۔

اب اھدنا الصراط المستقیم کے متعلق تصریح ملاحظہ ہو۔ یہاں اہدنا میں طلب ہدایت ہے اور ہدایت کا معنی یہ ہیں کہ مطلوب کا نشان دینا بہ الہام جیسے بچہ اپنی والدہ کے پستان بلا کسی تعلیم کے چوسنے لگتا ہے حالانکہ اسے پیدائش کے بعد کوئی تعلیم نہیں ہوتی۔ پھر دودھ طلب کرنے کا طریقہ اس کے رونے سے القاہوا یہ ہدایت القائی ہے ایسے ہی جب حواس انسانی بطور ظاہر و باطن قوت پکڑ لیتے ہیں تو اچھی بری چیز کا امتیاز کر لیتے ہیں۔ اور جن امور کو عقل مدرکہ نہیں سمجھ سکتی اور ادراک انسانی اس تک نہیں پہنچتا اس کے بتانے کے لیے پیغمبران اولوالعزم کو مبعوث فرمایا گیا اور یہی وہ ہدایت ہے جو ارسال رسل کرام و انزال کتب الہیہ سے متحقق ہوتی ہے۔ اس کی دو قسم ہیں عام اور خاص۔

عام ہدایت تو یہ ہے کہ خیر و شر کی راہ واضح کر دی جائے جیسا کسی شاعر نے کہا

خیر و شر سے تجھ کو واقف کر دیا اب تو اپنے فعل کا مختار ہے

اس کی بھی دو قسم ہیں تبیانی اور توفیقی

تبیانی یہ ہے کہ ماجاء الرسول کی شرح اس حد تک ہو کہ پھر شک و شبہ کا احتمال فہم سامع میں راہ نہ پائے۔ اور توفیقی یہ ہے کہ تمسک بہ ہدایت انبیاء (علیہم السلام) کسی کے حق میں فراہم ہوں اور اس پر تمسک آسان ہو جائے حتی کہ وہ سعادت ابدیہ کے ساتھ واصل ہو کر مقام اصطفا پر مشرف ہو جائے اور اس توفیق کا منتہی آخرت میں بہشت ہو اور دنیا میں عرفان حق حاصل ہوتا ہے۔ اور خاص یہ ہے کہ ایک نور انوار نبوت سے اس کے علم ولایت میں مدرکہ قلب پر مشرق ہو اور پھر انکشاف حقائق علی ماہی علیہ حاصل ہو جائے۔ اور یہ بھی تین درجہ رکھتا ہے۔

پہلا درجہ من اللہ ہے جس کے متعلق ارشاد الٰہی ہے۔ قل ان ھدی اللہ ھو الھدی۔ دوسرا درجہ الی اللہ ہے جس کے متعلق تذکرہ ہے۔ انی ذاھب الی ربی سیھدین۔ تیسرا درجہ باللہ ہے جیسا کہ حدیث میں ہے۔ لولا اللہ

مااھت دینا۔ یہ اخص الخواص کے تین درجات ہدایت ہیں۔ اس میں سے جو درجہ بھی بندہ کی امداد میں منجاب اللہ حاصل ہو وہ اثناء سیر سلوک میں حالاً فحالاً یکے بعد دیگرے حاصل ہوتا ہے۔

تو یہ آیہ کریمہ اھدنا الصراط المستقیم میں ان درجات کو دیکھ کر کمال عجز وناتوانی کے ساتھ عرض پیرا ہوتا ہے کہ الٰہی یہ راہ اتنی دشوار گزار ہے کہ محض اراءۃ الطریق میرے لیے کافی نہیں۔ بلکہ تیرا ہی فضل مجھے واصل الی المطلوب کر سکتا ہے لٰہذا اپنے فضل کو میرا رفیق مسافت بنادے وہ میرا ہاتھ پکڑ کر بہ مقتضاء نعبد اور نستعین اور اھدنا مجھے ان میں ہی شامل کر دے جو ساجدین وحامدین ہیں تو اھدنا الصراط المستقیم میں بھی مجھے تنہا نہ چھوڑ اور ایاك نعبد میں بھی مجھے اپنے خواص میں داخل رکھ اور نستعین میں بھی بصیغہ جمع مجھے سب میں شریک فرما۔ ورنہ تنہا میرا جانا مجھے ورطہ ضلالت میں گرفتار کر دے گا اور کہیں نہ کہیں توسوس شیطانی مجھے کسی مہلکہ میں ہلاک کر دے گا۔ مجھ پر بلائے قیل و قال اگر مستولی ہو گی تو میرا دل جنگ وجدل سے مکدر ہو جائے گا اور تیرا اقرب اور مقام صداقت مجھ سے دور ہو جائے گا اس لیے اھدنا الصراط المستقیم کی دعا کے ساتھ صراط الذین انعمت علیھم بھی عرض کرتا ہوں۔ اس لیے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ عزوجل کی طرف سے تین قوتیں ودیعت ہیں۔

قوت نطقیہ کہ اسے قوت عقلیہ بھی کہتے ہیں۔ اس کی تعریف یہ ہے کہ اس کی مدد سے انسان اشیاء کو جانتا اور اس کے حقائق پر عبور کرتا ہے اور حقائق یا تو ذات وصفات باری تعالیٰ ہیں۔ یا اس کے افعال و آثار دنیا و آخرت میں اور اس علم کے جاننے کو علم الٰہی کہتے ہیں اور اس میں افراط و تفریط یہ ہوتی ہے کہ ذات واجب تعالیٰ شانہ کی تحقیق میں پڑ کر سر ذات کے جاننے کے درپے ہو جائے۔ یا صفات الٰہی کی مطلقاً نفی کر دے اور ذات واجب تعالیٰ کی تنزیہ کرتے کرتے اثبات صفات میں نہج تشبیہ کی طرف مائل ہو کر خالق کو مخلوق کے ہمرنگ بنادے۔ یہ توحید زنادقہ ہے۔

یا وہ صفات جنہیں شارع (علیہ السلام) نے ثابت کیا انھیں بتاویل باطل باطل ٹھہرا کر انکار کر دے۔ مثل شاھد یا سمع و بصر اور رویت الٰہی اور رضا و غضب کے یا الٰہی افعال کو اپنے افعال سے تشبیہ دے جیسے نفخت فیہ من روحی کے ترجمہ میں منہ سے پھونک مار کر بتادے کہ ایسے اللہ تعالیٰ نے پھونک ماری اور ید اللہ فوق ایدیھم کے ترجمہ میں اپنا ہاتھ کسی پر رکھ کر کہہ دے کہ ایسے ہی اللہ تعالیٰ نے ہاتھ رکھا۔ اس لیے کہ ید اللہ وہ ید اللہ ہے جس کی لیس

کمثلہ شی۔(اس کی کوئی مثال نہیں)شان ہے۔تو ایسی تشبیہات دینا خالص زندقہ ہے الی غیر ذالك من العقائد الباطلة المائلة الی جانب الافراط (ایسے ہی اور عقائد باطلہ جو افراط کی طرف مائل ہوں)۔اور علم نبوات جس کا تعلق ارواح وملائکہ وانبیاء واولیا(علیہم السلام)دائمہ دین رحمہم اللہ اور خلفاء راشدین علیہم رضوان سے ہے۔ اس میں افراط تفریط یہ ہے کہ ان مراتب کی اصلاح کرتے کرتے ان سے انکار کر دے اور کہنے لگے کہ وہ ہمارے جیسے ہی تھے ان میں کوئی امتیاز تقرب الی اللہ کا نہیں۔یا ان کی عقیدت اتنی بڑھائے کہ ان کی عصمت انبیاء(علیہم السلام)کی عصمت کے برابر قرار دے اور نبیوں (علیہم السلام)کی طرح انھیں بھی خطاونسیان سے محفوظ جان لے۔ اور رتبہ ائمہ واولیاء رحمہم اللہ کو رتبہ انبیاء(علیہم السلام)کے مساوی سمجھ لے۔یا انبیاء کرام(علیہم السلام)کو لوازم الوہیت جیسے علم غیب ذاتی بلاعطا یا فریادرس بلاعطا قوت ہر ولی(رح)نبی(علیہ السلام)کو ماننا یا صور وتماثیل اور قبور و تعزیہ کو معبود اعتقاد کرلینا یہ خالص بے دینی وگمراہی ہے۔یا اولیاء رحمہم اللہ انبیاء ورسل کرام(علیہم السلام)کو بعطاء الٰہی بھی کسی امر میں متصرف نہ جاننا مجبور محض سمجھ لینا۔قبور اولیاء رحمہم اللہ کو مٹی کا ڈھیر سمجھ لینا یہ بھی زندقہ والحاد ہے۔ہمارا عقیدہ اور جمہور اہل سنت کا عقیدہ یہ ہے کہ علم غیب اور قوت تصرف اور غائبانہ سماعت ندا یہ سب بعطاء الٰہی غوث قطب ولی رحمہم اللہ نبی مرسلین کرام(علیہم السلام)کو حاصل ہے۔اسی بناء پر بعض حدیثوں سے ثابت ہے اذا تخیر تم فی الامور فاستعینوا باصحاب القبور،جب تم اپنے کسی معاملہ میں پریشان ہو تو اصحاب قبور سے مدد لیا کرو۔چنانچہ ایک قول یہ بھی ہے کہ صراط مستقیم سے مراد اقتداء بہ انبیاء(علیہم السلام)ہے۔اور اس کی قدر مشترک یہ ہے کہ انسان دل سے ان کی پیروی میں اس قدر منہمک ہو کہ ماسوا سے قطعاً اعراض کرلے اور اس کا دل بالکلیہ اپنے خالق کی طرف متوجہ ہو حتی کہ اگر حکم جناب باری آئے کہ اپنے لخت جگر کو ہماری راہ میں ذبح کر تو مثل ابراہیم خلیل(علیہ السلام)دل سے امتثال امر میں اپنے فرزند کو قربان کرنے کے لیے آمادہ ہو جائے۔اور اگر ارشاد ہو کہ اپنی جان ہماری راہ میں نثار کر تو کمال بشاشت اور انتہاء مسرت سے مثل حضرات اسماعیل(علیہ السلام)تیار ہو جائے۔اور اگر فرمان ہو کہ اپنے کو دریا میں ڈال تو مثل حضرت یونس(علیہ السلام)اپنے کو دریا میں ڈال دے۔اور اگر بعد بخشش و عنایت منصب اعلیٰ اور عطائے مراتب اشارہ فرمایا جائے کہ اپنے کو شاگردی کے رنگ میں ایک شخص کے آگے

زانوئے ادب طے کر کے ایک دو باتیں سیکھ تو تعمیل حکم میں عار نہ ہو اور مثل حضرت موسیٰ کلیم اللہ خضر (علیہم السلام) کے سامنے پہنچ کر شاگر دی اختیار کرے۔

حدیث میں ہے کہ صحابہ کرام علیہم رضوان کو جب مکہ معظمہ میں کفار مکہ کی طرف سے اذیتیں پہنچیں تو بار گاہ رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں انھوں نے شکایت کی اس وقت حضور سرور عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کعبۃ اللہ کے سایہ میں تشریف فرماتھے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے صحابہ علیہم رضوان سے فرمایا کہ تم سے قبل اہل ایمان کو دست کفار سے بہت سی اذیتیں پہنچ چکی ہیں حتی کہ کسی کو آرے سے دو پھانکیں کر دیا جیسے حضرت زکریا (علیہ السلام) لیکن انھوں نے دین حق کی پیروی سے اصلاً انحراف نہ کیا۔ کسی کے جسم سے لوہے کی کنگھی کے ذریعہ گوشت نوچا گیا لیکن وہ اپنے دین پر قائم رہے۔ یہی وجہ ہے کہ صراط مستقیم چھوٹے سے چھوٹے خط کو کہتے ہیں۔ جو دو لفظوں کے مابین ہوتا ہے گویا اهدنا الصراط المستقیم میں بندہ اپنے رب کے حضور اپنی ناتوانی اور ضعف کا اظہار کرتا ہے عرض پیرا ہے کہ الٰہی میں طویل اور لمبے راہ کی عبور کی طاقت نہیں رکھتا لہٰذا مجھے صراط مستقیم کی مختصر راہ سے موصل الی المطلوب فرمادے کہ کمزور و نحیف راہ پیمائی کے وقت مختصر اور کم مسافت راہ کا متلاشی ہوتا ہے اور لمبے راہ سے بچنا چاہتا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ بندہ جب تک دنیا میں ہے کشمکش مشیر اں اور اختلاف راہ نما میں پھنسا رہتا ہے۔ چنانچہ بیوی بچے ایک راہ پر پہنچانا چاہتے ہیں۔ تو مادر و پدر ایک دوسری راہ پر چلانا چاہتے ہیں۔ استاد اور مشفق دوست ایک راہ کا مشورہ دیتے ہیں۔ تو دشمن اور حاسد ایک دوسری راہ دکھاتے ہیں۔ نفس امارہ ایک راہ پر پہنچانا چاہتا ہے۔ تو شیطان ایک دوسری راہ پر کھینچتا ہے۔ پھر شہوات ایک طرف پہنچانا چاہتی ہیں۔ تو غضبانیات ایک نئے راہ پر ڈالنے پر آمادہ ہوتی ہے۔ اعتقادیات اگر ایک راہ دکھاتے ہیں تو عقل اسے ضعیف کر کے اس کی عمر کو تاہ دکھا کر عرصہ سعی تنگ کر دیتی ہے تو حیران و ششدر سا ہو کر در الٰہی پر دست بستہ کھڑا ہوا فریاد کرتا اور عرض کرتا ہے۔ اهدنا الصراط المستقیم۔ اب یہاں یہ اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ جب بندہ نماز میں کھڑا ہو گیا تو ہدایت پا چکا۔ اب اهدنا کہنا تحصیل حاصل ہے۔ اور صراط مستقیم حاصل کر کے اس کی طلب کرنا بے معنی ہے۔ اس شبہ اور واہمہ کا یہ جواب ہے کہ مراتب ہدایت بہت ہیں جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں تو بندہ ہر وقت ہدایت طلب کرنے سے مستغنی نہیں ہو سکتا۔ جیسا کہ محققین نے کہا کہ علم آدمی کو کسی چیز سے حاصل ہوتا ہے تو اس سے زائد کی طرف اس کی خواہش ہوتی ہے مثلاً مٹی

کا انسان کو علم ہے تو اب اس کے اجزاء کی تحقیق کی طرف وہ جاتا ہے اور معلوم کرتا ہے کہ فلاں مٹی میں لوہا ہے فلاں مٹی میں شیشہ۔ اس مٹی میں تانبہ ہے اور اس مٹی میں سونا۔ اس میں چاندی ہے تو اس میں سکہ،۔ اس میں جست ہے اور اس میں پلاٹنیم حتی کہ ایک علم کے ساتھ زائد علم کی طرف رجحان لازمی ہے۔ پھر سوال بعد حصول یوں بھی ضروری ہے کہ جو علم حاصل ہوا ہے۔ وہ دوامی رہے دوسرے جیسے ایک دلیل سے حاصل ہوا ہے اس پر اور دلائل بھی حاصل ہوں۔ اس لیے کہ جو علم ایک دلیل سے حاصل ہوا ہے وہ اس کے برابر نہیں ہو سکتا جو متعدد دلائل سے ثابت ہوا اور یہ نا قابل انکار حقیقت ہے کہ ممکنات جتنے بھی عالم موجودات میں ہیں ان میں ہر ایک میں ایک دلیل ہے جو ذات پر اور علم و قدرت رحمت و حکمت من جانب اللہ ہر ایک میں ودیعت کی گئی ہے چنانچہ لبید نے کہا۔

وفی کل شئ لہ ایۃ

تدل علی انہ واحد

اور کسی نے کہا

ہر گیاہے از زمین روئد

وحدہ لاشریک لہ گوید

کوئی کہتا ہے

برگ درختاں سبز در نظر ہوشیار

ہر ورق دفتریست از معرفت کردگار

تو ثابت ہوا کہ علم آدمی کو ہر وقت زیادتی و ترقی کی طرف مائل رکھتا ہے۔ بقول شاعر

دربند آں مباش کہ مضمون نہ ماندہ است

صد سال میتواں سخن از زلف یار گفت

چنانچہ حضرت شیر خدا اسد اللہ کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ اھدنا کی تفسیر یہ ہے ثبتنا علی الھدایۃ ہمیں ہدایت پر ثابت رکھ۔

اور قرآن کریم میں بھی گویا اس اھدنا کی تفسیر دوسری جگہ فرمائی ربنالا تزغ قلوبنا بعد اذ ھدیتنا اور اھدنا اور ربنالا تزغ قلوبنامیں اس حکمت کا مظاہرہ ہے کہ واجب تعالیٰ شانہ بندہ کو اپنے حضور تضرع وزاری کے ساتھ عرض پیرا رہنا پسند فرماتا ہے تاکہ اس کا نفس متکبر نہ ہو جائے اور اس کے ہر وقت سوال کرنے سے ہماری رحمت اس کی طرف مبذول رہے اس لیے کہ ہمارا قانون قدرت ہی یہ ہے کہ

تانہ گرید طفل کے جوشد لبن

تانہ گرید ابر کے خندد چمن

اور دعاوسوال اسی وجہ سے منافی رضابقضا نہیں ہے اس لیے کہ جو چیز جائز ہے اس میں رضا الٰہی ہے اور تذلل وزاری اللہ کو محبوب ہے اور عطابعد طلب اس کا قانون ہے ادعونی استجب لکم۔ اب یہ سمجھ لینا بھی ضروری ہے کہ سوال ہدایت استعانت پر متفرع ہے اس لیے کہ ہدایت استعانت کی ایک قسم ہے چنانچہ ارشاد ہے۔ والذین جاھدوافینا لنھدینھم سبلنا۔ تو مجاہدہ محتاج استعانت ہے اور مالک یوم الدین کا مفہوم بھی اس سے ظاہر ہو گیا اس لیے کہ نفع ہدایت یوم دین ہی میں ظاہر ہو گا اور وہ بواسطہ ہدایت وعبادت کاملہ ہی ہو گا اور یہ سب کچھ خواہ رحمت عام ہو خواہ رحمت خاص رب العالمین کی طرف سے ظاہر ہوتا ہے اور وہ ان کے ہی لیے ہے جو ثابت علی الصراط المستقیم ہیں تو اب صراط الذین انعمت علیھم کی بھی تفسیر ضروری ہے وہ یہ ہے کہ حقیقت نعمت یہ ہے کہ وہ ایک ایسا نفع ہے جو بطور احسان کسی کو دیا جاتا ہے۔ اور دینے والا اس سے اپنے لیے نفع کا غرض مند نہ ہو تو منعم حقیقی اور ایسا منعم کہ بلاغرض منفعت کسی پر انعام کرے کوئی نہیں ہو سکتا سوا اس ذات منعم کے جل جلالہ وعم نوالہ ولا الہ غیرہ۔ اس لیے کہ مخلوقات کسی پر انعام کر ہی نہیں سکتی جب تک اس انعام واحسان میں اس کا اپنا ذاتی فائدہ نہ ہو۔ پھر مخلوق میں سے جو بھی کسی پر احسان وانعام کیا جائے گا وہ وہی ہو گا جو وفادار اور خدمت گزار مطیع ہو گا یہ شان صرف اور صرف اسی منعم حقیقی کی ہے کہ مطیع ومنکر کافر وفاسق ملحد وجاحد مومن اور بے ایمان سب پر عام انعام اور روزی رساں ہے اگرچہ کافر وفاسق کے حق میں وہ فراخی نعمت ورزق در حقیقت نعمت نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس پر احسان منظور نہیں بلکہ وہ بصورت نعمت اور بمعنی اس کے لیے امہال ہے اس لیے سعدی کہتے ہیں۔

اے کریمے کہ از خزانہ غیب
گبر وترسا وظیفہ خورداری
دوستاں را کجا کنی محروم
تو کہ با دشمنان نظر داری

توکافر و مشرک اگرچہ دشمن ہے لیکن رب الارباب کا مربوب ضرور ہے۔بنابریں اسے ڈھیل دینے اور صم بکم عمی بنانے اور یمدھم فی طغیانہم یعمھون۔کا مظاہرہ کرنے کو بھی مرزوق بنایا گیا چنانچہ دوسری جگہ صاف ارشاد ہوا۔

وما من دابۃ فی الارض الا علی اللہ رزقھا۔(نہیں کوئی چلنے والا مگر اس کا رزق اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے)۔اور منکروں کو دنیا میں وسعت و فراخی دینے کا اس طرح اظہار ہوا۔

ولولا ان یکون الناس امۃ واحدۃ لجعلنا لمن یکفر بالرحمن لبیوتھم سقفا من فضۃ و معارج علیھا یظھرون۔ولبیوتھم ابواباً وسرراً علیھا یتکون۔وزخرفا۔وان کل ذلك لما متاع الحیوۃ الدنیا و الاخرۃ عند ربك للمتقین۔ (زخرف)

(اور اگر یہ بات نہ ہوتی کہ سب لوگ ایک ہی طریقہ کے ہو جائیں گے تو (سازوسامان دنیا ہمارے ہاں اتنا حقیر ہے کہ) جو لوگ اللہ کے کفر کرتے ہیں جو رحمن ہے ان کے لیے ان کے گھروں کی چھتیں ہم چاندی کی کرادیتے اور (چھتوں کے علاوہ چاندی کے) زینے کہ ان پر چڑھتے اور ان کے دروازے چاندی کے اور تخت کہ ان پر تکیہ لگا کر بیٹھا کرتے اور سونے کے بھی اور یہ سب کچھ دنیا کی چند روزہ زندگی تک ہے اور اے محبوب اخروی نعمتیں تمہارے رب کے پاس ہیں جو پرہیز گاروں کے لیے ہیں)

اور ارشاد ہے من کان یرید حرث الاخرۃ نزد لہ فی حرثہ و من کان یرید حرث الدنیا نوتہ منھا و ما لہ فی الاخرۃ من نصیب۔ (شوری پ۲۵)

(جو آخرت کی کھیتی کا طالب ہو تو ہم اسے اس کی کھیتی میں برکت دیں گے اور جو دنیا کی کھیتی چاہے تو ہم اسے دنیا دیں گے مگر اب آخرت میں اس کا کچھ حصہ نہیں)

تو خلاصہ یہ نکلا کہ کافر و فاسق کو جو بطور فراخی رزق انعام فرمایا جاتا ہے وہ حقیقت میں انعام نہیں بلکہ اس کے لیے بلاوآفت ہے۔ گویا وہ دینا ایسا ہے جیسے زہر یلاہل حلوے میں لپیٹ کر دیا جائے۔ یا لذیذ حلوا ایک بیو قوف دہقانی کو دیا جائے کہ وہ معدہ سے مستحیل ہو کر اخلاط میں زہر ہو جائے اور زہر یلاہل کا اثر دکھائے۔ یا وہ لذیذ حلوا ایک بیو قوف دہقانی کو دیا جائے اور وہ ہضم کی مقدار سے اتنا زیادہ کھالے کہ بد ہضمی کی وجہ سے تخمہ یا ہیضہ کر دے۔ اس لیے قرآن کریم میں ارشاد ہے **ولا یحسبن الذین کفروا انما نملی لھم خیر لانفسھم، انما نملی لھم لیزدادوا اثما ولھم عذاب مھین۔** (پ۴ ال عمران)

اور وہ لوگ جو کافر ہوئے اس گمان میں نہ رہیں کہ ہم انھیں ڈھیل دے رہے ہیں وہ ان کے لیے بہتر ہے ہم تو صرف انھیں ڈھیل دے رہے ہیں تا کہ اور گناہ سمیٹ لیں اور ان کے لیے ذلت کا عذاب ہے۔ اور نعمت الٰہی جن کے لیے خاص ہے وہ چار گروہ ہیں۔ انبیاء صدیق، شہدائ، صالحین۔ جیسا کہ ارشاد ہے۔

ومن یطع اللہ والرسول فاؤلیك مع الذین انعم اللہ علیھم من النبیین والصدیقین والشھداء والصلحین وحسن اولیك رفیقا۔ (پ۵، سورۃ نسائ)

اور جو پیروی کرے اللہ اور رسول کی وہی ہیں جو جنت میں ان (منعم علیہم کے ساتھ) ہوں گے (جن پر اللہ نے بڑے بڑے احسانات کئے) یعنی نبی اور صدیق اور شہید اور صالحین اور یہ لوگ اچھے ساتھی ہیں۔ حدیث میں آیا ہے کہ جناب سرور عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ایک روز جبل احد پر تشریف فرما تھے آپ کے ساتھ صدیق اکبر، عمر فاروق اور ذوالنورین رضوان اللہ علیہم اجمعین تھے اتنے میں احد لرزنے لگا۔ یعنی بھونچال آگیا۔ تو حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اثبت یا احد اے احد ٹھہر تجھ پر نبی اور صدیق اور شہید ہیں۔ غرض کہ اس حدیث میں نبی اور صدیق اور شہید کی تفسیر فرما دی۔ چنانچہ صدیق اکبر شروع سے بلا طلب دلیل اور بلا انتظار معجزہ حضور پر ایمان لے آئے اور خدا نے انھیں ایسا پاک دل عطا فرمایا تھا کہ حضور کا نبی ہونا ان کی باتوں سے ان کے ذہن نشین ہو گیا تھا آپ کو صدیق

کا خطاب اسی وجہ سے ملا۔ اور فاروق و عثمان کا شہید ہونا تواریخ واحادیث سے ثابت ہے۔ اگرچہ انعمت علیہم بظاہر عام ہے لیکن در حقیقت انہی چار کے لیے مخصوص ہے۔

یہاں بعض نے یہ نکتہ بیان کیا کہ حق تعالیٰ شانہ نے **صراط الذین انعمت علیہم** فرمایااور **صراط من انعمت علیہم** نہیں فرمایااس لیے کہ من لغت عرب میں نکرہ موصوفہ ہوتاہے تو اگر یہ فرمایاجاتاتو منعم علیہم جو معروف ہیں ان کا اختصاص نہ رہتا۔ اور انعمت بصیغہ ماضی لانے میں بھی یہ مقصد ہے کہ کسی کو اس انعام میں شک نہ ہو جائے اس لیے کہ مستقبل محل شک ہے۔ اب ایک اور شبہ پیدا ہوتاہے کہ صراط مستقیم ایک راستہ ہے۔ اور یہاں چار گروہ مختلف الطریق ہیں تو ایک راہ پر مختلف الطریق کیسے رہ سکتے ہیں پھر ہر نبی (علیہ السلام) اپنی شریعت اور وضع علیحدہ رکھتا ہے اور ہر ولی کا طریقہ ذکر و شغل علیحدہ ہے پھر باوجود طرق متعدد چاروں گروہ طریق الی اللہ پر کیونکر پہنچ سکتے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ طب یونان کو یوں سمجھا جائے کہ علاج میں راہ مستقیم ہے۔ لیکن بقراط کے دور سے جالینوس تک اور جالینوس سے لیکر عہد علوی خاں تک وہ راہ مستقیم علاج میں محفوظ و مسلوک رہیں مگر طریق علاج بقراط اور جالینوس اپنے اپنے زمانہ میں علیحدہ رہااور معالجات علوی خان اور حکیم گیلانی اپنے اپنے دور میں علیحدہ رہاہے۔ علوی خان مفردات سے علاج کرتے اور فصد سے تنقید کرنایااسہال وغیرہ کرنا بحد غایت معیوب جانتے تھے۔ حکیم گیلانی مرکبات اور معاجین واشربہ کام میں لاتے تھے اور ہر مرض میں فصد واسہال کو مقدم رکھتے تھے۔ لیکن اس طریقہ علاج کو منافی وحدت طریق کسی نے نہیں بتایااور بعض اطباء یونانی واضح قواعد یونانی جدیدہ ہوئے اور بعض سلف کے مقلد بنے رہے لیکن یہ اختلاف بھی موجب اختلاف نہیں کہلاتا۔ دوسری مثال سے سمجھئے کہ ایک قافلہ ایک شہر سے دوسرے شہر میں روانہ ہوا مگر ان میں بعض تاجر ہیں اور بعض حمال اور کرایہ کش ہیں اور بعض اس قافلہ کے پاسبان ہیں اگرچہ سب ایک راہ جارہے ہیں لیکن کام سب کے مختلف ہیں سب اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ ایسے ہی انبیاء (علیہم السلام) جس راہ سے گزر رہے ہیں اسی راہ سے صدیق و شہداء اور صالح بھی گزر رہے ہیں لیکن مرتبہ بمرتبہ رفیق سفر ہیں کوئی کسی کا ہاتھ تھامے گزر رہاہے کوئی باربرداری کر رہاہے کوئی قافلہ کی پاسبانی میں مصروف ہے۔ تو سب جانے والے منافی وحدت طریق نہیں۔ ایسے ہی انبیاء (علیہم السلام) وصدیقین و شہداء وصالحین رحمہم اللہ کے افعال مختلفہ وحدت نہیں بلکہ اپنے اپنے منصب و مرتبہ کے مطابق خدمات کرتے ہیں۔ انبیاء (علیہم السلام) کی معیت

میں قطع منازل اور طے مراحل کر رہے ہیں۔ ایسے ہی اگر ایک طبیب حارالمزاج کو موسم تابستان میں آبزن کر رہا ہے اور ادویہ باردہ اور اغذیہ مرطبہ تجویز کر رہا ہے تو دوسرا طبیب مریض باردالمزاج کو موسم زمستاں میں حمام کرائے اور ادویہ گرم کھلائے تو یہ دونوں ایک دوسرے کے خلاف نہیں ہو سکتے۔ اس لیے کہ یہی دونوں طبیب بدل کر پہلے مریض کا یہ دوسرا معالج ہو اور دوسرے کا پہلا معالج ہو جائے تو اس کی تجویز بعینہ ایک دوسرے کے مطابق ہوں گی۔ چنانچہ یہی مفہوم حدیث سے نکلتا ہے کما قال النبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) **لو کان موسیٰ حیاما وسعہ الااتباعی**۔ یعنی اگر موسیٰ (علیہ السلام) جو اپنے وقت کے اولوالعزم نبی ہیں آج میرے زمانہ میں ہوتے تو انھیں میری پیروی بغیر چارہ نہ تھا۔

اب **غیر المغضوب علیھم ولاالضالین** کے متعلق ملاحظہ فرمائیں۔

یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ جب انعام الٰہی دنیا و آخرت میں بندہ کا حصہ ہو جاتے ہیں تو احتمال غضب و گمراہی تمام مراحل میں بندہ سے دور ہو جاتے ہیں۔ اس پر قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر حاجت احتراز از غضب و گمراہی کس لیے اور **غیر المغضوب علیھم ولاالضالین** اپنی دعا میں کیوں؟

اس کا جواب اول بھی ہو چکا ہے کہ وہ جماعت جو اپنے کو اصحاب نعمت یعنی انبیاء (علیہم السلام) و اولیاء رحمہم اللہ کی معیت سے نسبت کرتی ہے لیکن یہ شان بے نیازی بے نیاز ہے کہ ان میں بھی بعض ورطہ غضب و گمراہی میں گرفتار ہو جاتے ہیں مگر وہ اپنے کو اتباع انبیاء (علیہم السلام) و اولیاء رحمہم اللہ کا گمان کرتے ہوئے غضب و ضلال میں پڑ جاتے ہیں۔ اس لیے بغرض دفع استثناء **غیر المغضوب** لایا گیا کہ استقامت **علی الصبر والابتلاء** بلاتوفیق الٰہی کسی کو حاصل نہیں ہو سکتی اور اکثر مفسرین نے **غیر المغضوب علیھم** اور ضالین میں تعیین فرمایا ہے۔ چنانچہ قاضی بیضاوی (رح) فرماتے ہیں کہ **مغضوب علیھم** سے مراد عاصیان امت ہیں اور ضالین سے مراد جاہلان امت ہیں۔ اس لیے کہ نعمت الٰہی اس بندہ کے لیے ہے جو معرفت الٰہی اور عمل صالح دونوں کا اہل ہو۔ اور جسے یہ دونوں نصیب نہیں اس پر نعمت الٰہی بھی نہیں۔ اور جو معرفت حق تو رکھتا ہے مگر اعمال صالح سے محروم ہے وہ فاسق ہے اور مستحیل الغضب اور جو رحمت حق سے محروم ہے مگر عمل صالح کرتا ہے وہ جاہل و گمراہ ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ

مغضوب علیھم سے مراد دو فرقے ہیں۔ ایک کافر معاند کہ دیدہ دانستہ انکار امر حق ہے۔ دوسرا عاصی معتمد کہ دیدہ دانستہ ارتکاب گناہ کرتا ہے۔ ایسے ہی ضالین کے دو فرقے ہیں۔ ایک وہ جو کورانہ تقلید میں کفر میں پڑا ہے اس لیے کہ بوجہ قصور نظر حقیقت دین اس پر واضح نہ ہو۔ دوسرے ایسا گناہ گار کہ اسے اعتماد کرم عفو پر اتنا ہو کہ ارتکاب معاصی کرے اور وجیہ بن جاوے۔ بعض نے کہا کہ مغضوب علیہم کافر ہیں ضال عام مبتدع ہیں۔ بعض نے کہا کہ مغضوب علیہم وہ ہیں جن سے یقیناً انتقام بروز قیامت لیا جائے گا۔ اور ضالین عام ہیں ان کے حق میں احتمال عفو بھی ہے۔ اور حدیث شریف میں ہے کہ حضرت عدی (رض) جو حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے فیض صحبت سے مشرف رہے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے مغضوب علیہم اور ضالین کے معنی دریافت کئے تو حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ مغضوب علیہم فرقہ یہودیاں ہے اور ضالین نصاریٰ اس پر تصدیق قرآن کریم سے بیان فرمائی کہ یہود کے لیے ارشاد ہے **وباوا بغضب من اللہ**۔

اور نصاریٰ کے حق میں ارشاد ہوا **وضلوا عن سواء السبیل**۔ اب یہ بھی معلوم رہنا ضروری ہے کہ یہ سورۃ مبارکہ نماز میں دوبار پڑھنی واجب ہے اور اس میں سات آیات ہیں۔ اور اعمال محسوسہ نماز میں بھی سات رکن ہیں۔ وہ ارکان سبعہ نماز میں یہ ہیں۔ (۱) قیام (۲) رکوع (۳) قومہ (۴) سجدہ اولیٰ (۵) جلسہ، بین السجدتین (۶) سجدہ ثانیہ (۷) قعدہ۔ یہ سات عمل مثل ہفت اندام انسان کے ہیں۔ اندام جسم انسانی بھی سات ہیں۔ جسد بے روح۔ تو یہ سورۃ مبارکہ بمنزلہ روح ہے تو جب روح جسم سے متصل ہو جاتی ہے تو حیات اور زندگی حاصل ہو جاتی ہے۔ تو بسم اللہ الرحمن الرحیم کو مقابل قیام تصور کرنا چاہیے اس لیے کہ قیام وجود ہر شے کا ظہور اسم الٰہی سے ہے۔ اور اس لیے بسم اللہ کے ساتھ ہی ہر کام کی ابتداء رکھی گئی اور فرمایا **کل امر ذی بال لم یبدء ببسم اللہ فھو ابتر** (جو کام بھی بسم اللہ کے بغیر شروع کیا جائے وہ بے برکت ہے)۔ اور قیام نماز کے بعد آیۃ **الحمد للہ رب العلمین** ہے۔ جو رکوع کے مقابل ہے اس لیے کہ حمد میں بندہ کی نظر حق سبحانہ کی طرف بھی ہے اور مخلوق پر بھی اور منعم حقیقی کی طرف بھی اور نعمت منعم پر بھی۔ تو یہ حالت **متوسط بین النظر والا استغراق** ہوئی۔ چنانچہ رکوع کی ہی وہ کیفیت ہے جو متوسط ہے قیام و قعود و سجود کے مابین۔ یا یوں سمجھئے کہ جب بندہ حمد میں اپنے رب کی نعمتیں بیشمار دیکھتا

ہے تو بار احسان سے اس کی پشت دوتا ہو جاتی ہے اور منحنی ہو کر رکوع کی صورت میں آ کر الرحمن الرحیم کہتا ہے جو قومہ ہے کہ ہر بندہ جب بلندی پاتا ہے تو اپنے رب کے حضور اپنے کو پست دیکھ کر علو کو پستی سے بدلتا ہے تو رحمت حق تعالیٰ اسے پہلی حالت علو کی طرف واپس لاتا ہے جیسا کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا **من تواضع للہ رفعه الله** اور جو اللہ کے لیے جھکے گا اللہ اسے بلند کرے گا۔ ملک یوم الدین مناسب سجدہ اولیٰ ہے۔ جو دلالت کرتا ہے تجلی قہری و جلالی کی طرف جو موجب خوف شدید اور مثمر نہایت تذلیل و خضوع ہے اور خاک کی طرف اپنے کو پامال کرتا ہے اور اپنا چہرہ خاک پر ملنا عین فروتنی ہے چنانچہ کسی شاعر نے خوب کہا ہے

فروتنی است نشان رسید گان کمال

کہ چوں سوار بہ منزل رسید پیادہ شد

ایک اور شعر بھی اسی مضمون کا موید ہے۔

ہر کہ شد خاک نشیں برگ و برے پیدا کرد

دانہ باخاک چو پیوست سرے پیدا کرد

اور **ملك يوم الدين** میں یوم الدین در حقیقت موت کے بعد سے ہی شروع ہوتا ہے اس لیے کہ بعد موت بندہ اپنے اصل کی طرف رجوع کرتا ہے اور اصل مٹی ہے **منها خلقنكم وفيها نعيدكم ومنها نخرجكم** (اسی سے ہم نے تمہیں پیدا کیا اور اسی میں لوٹائیں گے اور اسی سے تمہیں نکالیں گے) میں یہی فلسفہ بیان فرمایا گیا ہے۔ پھر **اياك نعبد و اياك نستعين** مناسب **قعده بين السجدتين** ہے اس لیے کہ ایاک نعبد میں سجدہ اولیٰ سے فراغت کا بیان ہے جس میں غایت لذلل مراد ہے اور دوسرے سجدہ کے لیے **اياك نستعين** کہہ کر استعانت طلب کرتا ہے۔ اور **اهدنا الصراط المستقيم** میں ایک اہم مطلب کا سوال ہے جو مناسب سجدہ دوم ہے اور یہی محل اجابت ہے اور **صراط الذين انعمت عليهم غير المغضوب عليهم ولا الضالين** میں حصول مطلب اور وصول انعام الٰہی کے ساتھ تفاول ہے تو یہ مناسب قعدہ ہے اس لیے دربار شاہی میں یہ طریقہ مستمرہ ہے کہ جب بندہ اور رعایا کا فرد غایت تواضع سے مجرا کر لیتا ہے تو اسے بیٹھنے کا حکم ہوتا ہے جب وہ بیٹھ جاتا ہے تو انعام و

اکرام سے نوازا جاتا ہے اور شہنشاہ کے حضور بٹیھنا ہی خود ایک مرتبہ انعام واکرام ہوتا ہے۔ لہٰذا بعد از حصول مرتبہ تقرب شکر و ثنا منعم حقیقی اور درود و سلام اپنے وکیل مقدمہ کے حضور پیش کرتا ہے جو جناب رسالت مآب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہیں۔ ایک خاص اور لطیف بحث اور ہے وہ بھی سمجھ لیجئے۔ سورۃ فاتحہ میں دس چیزیں ہیں پانچ صفات ربوبیت ہیں یعنی اللہ، رب، رحمن، رحیم، مالک۔ اور پانچ صفات عبودیت ہیں۔ عبادت، استعانت، طلب ہدایت و استقامت، طلب نعمت، پناہ از غضب الٰہی۔ عبادت اللہ تعالیٰ سے متعلق ہے اور استعانت رب تعالیٰ کے نام کے ساتھ اور طلب ہدایت اسم رحمن سے متعلق ہے اور طلب استقامت اسم رحیم سے متعلق ہے اور طلب نعمت وپناہ از غضب اسم مالک سے متعلق ہے۔ اور انسان بھی پانچ چیزوں سے مرکب ہے۔ بدن، نفس شیطانی، نفس سبعی، نفس بہیمی اور جوہر ملکی جسے عقل کہتے ہیں۔ تو جوہر ملکی کا متجلی اسم اللہ ہے جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے **الابذکر اللہ تطمئن القلوب**۔ (خبردار! اللہ کے ذکر سے دل اطمینان پکڑتے ہیں) اور نسبت انقیاد نفس شیطانی متجلی اسم رب ہے جیسا کہ ارشاد ہے **رب اعوذبك من همزت الشيطين**۔ (اے میرے رب میں شیطانی وسوسوں سے تیری پناہ لیتا ہوں)

اور اصلاح نفس سبعی متجلی اسم رحمن سے ہے جیسا کہ ارشاد ہے **الملك يومئذ الحق للرحمن**۔ (اصلی بادشاہی اس دن رحمن کی ہو گی)۔ اور اصلاح نفس بہیمی بہ تجلی اسم رحیم ہے جیسا کہ ارشاد ہے **ومن رحمة جعل لكم اليل والنهار لتسكنوا فيه ولتبتغوا من فضله ولعلكم تشكرون** (اور اپنی رحمت سے بنائے اس نے تمہارے لیے دن اور رات تاکہ تم اس میں سکون پاؤ اور اس کا فضل تلاش کرو تاکہ تم شکر کرو)

اور ازالہ غفلت و کثافت بدن بہ تجلی حضرت مالکیت ہے جیسا کہ ارشاد ہے **لمن الملك اليوم لله الواحد القهار**۔ (آج کس کی بادشاہی ہے؟ اللہ اکیلے زبردست کی)

اور جب انسان ان اسماء کی تجلیات سے بجمیع اجزاء صالح و مہذب ہو جاتا ہے تو اس کا رجوع اس کے مطلب کی طرف ہوتا ہے اور اطاعت بدنی کے ساتھ ایاک نعبد کہتا ہے۔ اور اطاعت نفس بہیمی ترک کر کے لذت و ارتکاب منکرات میں آسانی حاصل کر کے ایاک نستعین کہتا ہے اور خلاصی استیلاء نفس سبعی کی غرض سے **اهدنا الصراط**

المستقیم عرض کرتا ہے۔ اور دفع مکائد نفس شیطانی کے لیے استعانت بذات حق کر کے اصلاح جوہر ملکی کے لیے موافقت ارواح مقدسہ حاصل کرنے کو صراط الذین انعمت علیھم کہتا ہے اور غیر المغضوب علیھم ولاالضالین کہہ کر منکرات سے دوری چاہتا ہے۔ اس سورۃ مبارکہ کے بہت سے نام ہیں جن کی وجہ تسمیہ ہم اول لکھ چکے ہیں۔ یہاں اسماء سورۃ مبارکہ کا اعادہ کئے دیتے ہیں اور وہ یہ ہیں اور وجہ تسمیہ پیش نہیں کریں گے۔ فاتحۃ الکتاب، فاتحہ، سورۃ الحمد، سورۃ لشکر، سورۃ الاساس، سورۃ الکنز، سورۃ المناجات، سورۃ وافیہ، سورۃ التفویض، سورۃ الشفائ، سورۃ الرقیہ، سبع مثانی، سورۃ قرآن عظیم، سورۃ تعلیم المسئلۃ، سورۃ کافیہ، ام القرآن۔ اب کچھ فضائل الحمد شریف بھی حسب موقع بیان کر دینے مناسب ہیں۔ مسند دارمی، مسند امام احمد اور ترمذی ونسائی اور سنن بیہقی اور صحیح ابن خزیمہ رحمہم اللہ میں سید القراء حضرت ابی بن کعب (رض) سے مروی ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اتحب ان اعلمك سورۃ لم تنزل فی التورآتہ ولا فی الانجیل ولا فی الزبور ولا فی القرآن مثلھا قال ابی نعم بعدہ قال (علیہ السلام) ھو ام القرآن۔ (کیا تو پسند کرتا ہے کہ میں تجھے ایک ایسی سورت سکھاؤں کہ اس کی مثل کوئی سورت توریت، انجیل، زبور اور قرآن میں نہیں اتاری گئی تو ابی (رض) نے کہاں ہاں تو حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا وہ سورۃ ام القرآن ہے کہ ہر نماز میں اسے پڑھنا ہے)۔ اور صحیح مسلم اور نسائی اور ابن حبان اور طبرانی اور حاکم میں بروایت ابن عباس (رض) مروی ہے کہ ایک دن جبرائیل امین حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے حضور حاضر تھے کہ آسمان سے دروازہ کھلنے کی آواز آئی جبرائیل (علیہ السلام) نے بغور دیکھا اور فرمایا کہ یہ وہ فرشتہ ہے کہ آج ہی نازل ہوا ہے اس سے پہلے تخلیق آدم سے لیکر آج تک زمین پر نہیں آیا۔ پھر جب وہ فرشتہ حضور کی خدمت میں حاضر ہوا تو عرض کرنے لگا حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو مبارک ہو اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایک نور عطا فرمایا اور آپ سے قبل کسی کو نہیں دیا گیا۔ وہ سورۃ فاتحہ الکتاب اور آمن الرسول سے آخر سورۃ بقرہ تک ہے اس کا ایک حرف اگر پڑھا جائے تو ثواب عظیم ہے۔ اور بخاری مسلم میں ہے اس کے علاوہ صحاح ستہ کی دوسری کتابوں میں بھی ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اصحاب علیہم رضوان اس سورۃ کو مارگزیدہ اور عقرب گزیدہ اور مصروعین ومجانین پر پڑھ کر دم کرتے تھے۔ اور حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے

اس سورۃ مبارکہ کو پڑھ کر دم کرنا تجویز فرمایا اور ارشاد ہوا ایۃ فاتحۃ الکتاب شفاء من کل داء۔ (الحمد ہر بیماری کی شفاء ہے)

اور بزار (رح) نے اپنی مسند میں انس بن مالک (رح) سے روایت کیا کہ جو شخص اپنا پہلو زمین پر رکھ کر الحمد اور اخلاص پڑھ کر اپنے اوپر دم کرے ہر بلا سے امن میں رہے۔ سوائے موت کے جو اس کے لیے مقدر ہو چکی ہو۔

عبد بن حمید (رح) اپنی مسند میں ابن عباس (رض) سے مرفوعاً روایت کرتے ہیں کہ فاتحۃ الکتاب دو ثلث قرآن کریم کے ثواب کے برابر ہے۔ ابن مردویہ اور دیلمی اور ضیاء مقدسی رحمہم اللہ اپنی احادیث مختارہ میں راوی ہیں کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا چار چیزیں خزانہ عرش سے مجھے ملی ہیں اور کسی کو یہ نہیں ملیں۔ ام الکتاب آیتہ الکرسی اور آخر سورۃ بقر اور سورۃ الکوثر۔ اور ابو نعیم اور دیلمی ابو درداء رحمہم اللہ سے راوی ہیں کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا الحمد ان سب چیزوں پر کفایت کرتی ہے جن پر تمام قرآن کفایت نہیں کرتا اور اگر ایک پلہ میں الحمد اور دوسرے پلہ میں سات قرآن ہوں تو الحمد بڑھ جائے اور ابو عبیدہ فضائل قرآن کریم میں حضرت حسن بصری (رض) سے روایت کرتے ہیں کہ حضور نے فرمایا الحمد شریف جس نے تلاوت کی اس نے گویا توریت، انجیل، زبور اور قرآن کریم کی تلاوت کی۔

اور تفسیر مر یسیع اور کتاب المصاف میں ابن انباری سے اور کتاب العظمہ میں ابو الشیخ اور ابو نعیم سے روایت ہے کہ شیطان کو تمام عمر میں چار بار نوحہ کرتے ہوئے پایا اور خاک سر پر ڈالتے ہوئے دیکھا اول جبکہ اس پر ان علیك لعنتی الی یوم الدین۔ (بے شک تجھ پر قیامت تک میری لعنت ہے) کا حکم ہوا۔ دوسرے جب اسے آسمان سے زمین پر ڈالا، تیسرے جب حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بعثت ہوئی، چوتھے جب سورۃ فاتحہ کا نزول ہوا۔

اعمال و اوراد سورۃ الفاتحہ

ابو الشیخ کتاب الثواب میں فرماتے ہیں کہ جس کسی کو کوئی حاجت درپیش ہو اسے چاہیے کہ الحمد شریف پڑھے اور حاجث کے لیے دعا کرے۔ انشاء اللہ اس کی حاجت پوری ہو گی۔ ثعلبی فرماتے ہیں کہ ایک شخص علامہ شعمی کے

دروازے پر آیا اور درد گردہ کی شکایت لایا۔ آپ نے فرمایا کہ اساس القرآن پڑھ کر درد کی جگہ دم کر۔ اس نے عرض کی اساس القرآن کیا ہے۔ فرمایا الحمد شریف۔ اور مشائخ کرام کے اعمال مجربہ میں مذکور ہے کہ سورۃ فاتحہ اسم اعظم ہے اسے جس مطلب کے لیے پڑھا جائے اکسیر کا حکم رکھتی ہے۔ اس کے پڑھنے کے دو طریق ہیں۔ اول یہ کہ نماز فجر کی سنتوں اور فرضوں کے مابین بسم اللہ الرحمن الرحیم کی م کو الحمد کے لام سے ملا کر اکتالیس بار چالیس دن پڑھیں۔ جو حاجت بھی ہو وہ ضرور پوری ہو گی۔ اور اگر مریض کے لیے یا مسحور کے واسطے پانی پر دم کر کے پلائیں اسے شفا ہو۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ قمری مہینہ کے پہلے ایک شنبہ (اتوار) کو اکتالیس بار پڑھے جو حاجت ہو وہ پوری ہو جائے تو فبہا ر نہ دوسرے مہینہ ایسا ہی کرے اگر پھر بھی نہ ہو تو تیسرے مہینہ پھر کرے حاجت روا ہو۔ اگر چینی کے پیالہ میں گلاب، مشک اور زعفران سے لکھ کر مریض کو چالیس روز پلائیں، امراض مزمنہ سے شفایاب ہو۔ اور درددندان، دردسر، درد شکم وغیرہ میں سات بار پڑھ کر دم کرے تو مجرب ہے۔ اس سورۃ میں سات آیتیں ستائیس کلمے اور ایک سو چالیس حروف ہیں۔

شان نزول

کے متعلق عمرو بن سرحبیل (رح) کی ایک روایت بھی ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت ام المومنین خدیجۃ الکبری (رض) سے فرمایا میں سنا کرتا ہوں جس میں (اقرائ) کہا جاتا ہے۔ ام المومنین نے یہ حال ورقہ بن نوفل کو سنایا۔ انھوں نے فرمایا، جب یہ ندا آئے آپ باطمینان سنا کریں۔ اس کے بعد حضرت جبرائیل (علیہ السلام) نے حاضر ہو کر عرض کیا۔ فرمایئے بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ الحمد اللہ رب العلمین۔ اس روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ نزول میں یہ سورۃ مبارکہ پہلی سورۃ ہے مگر دوسری روائتیں اس امر کو ظاہر کرتی ہیں کہ باعتبار نزول پہلی سورت سورۃ اقراء ہے۔ مفسرین نے اس سورت کو مکہ معظمہ میں نازل ہونا بتایا اور بعض نے مدینہ میں اور بعض نے مکہ مدینہ دونوں میں۔

مضامین

اس سورۃ مبارکہ میں حمد الٰہی، ثناء الٰہی، ربوبیت ذات، رحمت خاص، مالک یت مستقلہ، استحقاق عبادت، بذات حق، توفیق خیر، ہدایت عبد، توجہ الی اللہ، اختصاص عبادت، استعانت، طلب رشد، آداب دعا، احوال صالحین سے موافقت، گمراہوں سے اجتناب و نفرت، جزاء اور روز جزا کا مصرح بیان ہے۔

مختصر تفسیر الحمد

ہر کام کی ابتداء میں بسم اللہ کی طرح حمد الٰہی بھی ضروری ہے۔ حمد بھی واجب ہوتی ہے جیسے خطبہ جمعہ میں اور کبھی مستحب جیسے خطبہ نکاح و دعا میں اور ہر کھانے کے بعد پانی پی کر کبھی سنت موکدہ ہوتی ہے جیسے چھینک آنے کے بعد (طحطاوی) رب العلمین اس لیے فرمایا کہ اس میں تمام کائنات کے حارث و ممکن اور محتاج و مربوب ہونے کی طرف اشارہ ہے اور ذات واجب تعالیٰ شانہ کے واجب قدیم، ازلی، ابدی، سرمدی، حی و قیوم قادر و علیم ہونے کا اعلان ہے جس ذات کے لیے صفت رب العالمین مستلزم ہے اس کے متعلق علم الٰہیات کے تمام اہم مباحث انھیں دو لفظوں میں طے ہو گئے۔

ملک یوم الدین میں ظہور مالک یت تام کا بیان ہے اور یہ دلیل ہے کہ جو مالک ہے وہی مستحق عبادت ہے کیونکہ سب اس کے مملوک ہیں اور مملوک مستحق عبادت نہیں ہو سکتا اس سے یہ بھی واضح ہوا کہ دنیا دارالعمل ہے اور اس کیلئے ایک آخر ہے اس سلسلہ حیات کو ازل اور قدیم کہنا باطل ہے اس لیے کہ اختتام دنیا کے بعد ایک یوم جزا بھی ہے اس سے واہمہ تناسخ بھی باطل ہو گیا۔

ایک نعبد ذکر ذات و بیان صفات کے بعد یہ فرمانا اس امر کی طرف مشیر ہے کہ اعتقاد عمل پر مقدم ہے اور قبولیت اعمال صحت اعتقاد پر موقوف ہے۔

نعبد میں صیغہ جمع لانا اس امر کی طرف بھی مشیر ہے کہ عبادات مفروضہ بجماعت ادا ہوں اور یہ بھی مستفاد ہوتا ہے کہ عوام کی عبادتیں محبوبوں، مقبولوں کی عبادتوں کے ساتھ درجہ قبول حاصل کر لیں۔ ایاک کے ساتھ نعبد کہنے سے رد شرک بھی ہو جاتا ہے کہ سوائے ایک ذات کے کسی کی پوجا نہ کرنے کا اعتراف و اقرار ہے۔ وایاک نستعین میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ استعانت خواہ بواسطہ ہو یا بلاواسطہ بہر صورت اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے اس لیے کہ مستعان

حقیقی وہ ہے باقی اسباب وذرائع آلات وخدام اور احباب وغیرہ اولیاء انبیاء علیہم الصلوۃ والتحیہ یہ سب مظہر عون الٰہی ہیں تو پھر لازم ہے کہ ہر اعانت میں اس ذات پر نظر رکھے اور ہر چیز میں دست قدرت کو کارکن دیکھے۔ اس سے یہ سمجھنا کہ اولیاء رحمہم اللہ وانبیاء (علیہم السلام) سے مدد چاہنا شرک ہے محض جہالت اور عقیدہ باطل ہے۔ اس لیے کہ مقربان حق کی امداد در حقیقت امداد حق ہے نہ کہ استعانت بالغیر۔

اگر ایاک نستعین کے یہ معنی ہوتے جو جہالت مآب سمجھے تو قرآن پاک میں **استعینوا بالصبر والصلواۃ** اور **اعینونی بقوۃ** ہرگز وارد نہ ہوتا۔ اس لیے کہ صبر اور صلوۃ خدا نہیں اور ان دونوں سے مدد واستعانت کا حکم دیا جارہا ہے اور قوت محضہ بھی خدا نہیں باوجود اس کے قوت سے بھی مدد حاصل کرنے کی تعلیم ہورہی ہے۔ علاوہ ازیں احادیث میں بہت سے مقامات پر اہل اللہ وخاصان بارگاہ سے استعانت کی تعلیم دی گئی ہے۔ **اذا تحیر تم فی الامور فاستعینوا باصحاب القبور** وغیرہ وغیرہ مذکور ہے۔

اھدنا الصراط المستقیم میں معرفت ذات وصفات کے بعد عبادت وغیرہ کی تعلیم دے کر طریقہ دعا تعلیم فرمایا اور یہ بتایا کہ عبادت کے بعد بندے کو مشغول دعا ہونا چاہیے اور احادیث میں بھی بعد نماز دعا کی تعلیم دی گئی ہے۔

(طبرانی فی الکبیر، بیہقی فی السنن)

صراط مستقیم سے مراد اسلام یا قرآن کریم یا خلق نبی رحیم یا خود حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یا آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اہل واصحاب علیہم الرضوان ہیں اس سے ثابت ہوتا ہے کہ صراط مستقیم طریق اہل سنت ہے جس میں اہل بیت واصحاب علیہم الرضوان اور سنت وکتاب کے ماتحت چلنا ہے اور سواد اعظم ہی اس صراط مستقیم پر ہے۔ صراط الذین انعمت علیہم یہ پہلے جملے کی تفسیر ہے یعنی تفسیر القرآن بالقرآن، یعنی صراط مستقیم سے مراد وہ صراط اور راستہ ہے جو طریق مسلمین ومومنین ہے وہ راستہ مطلوب ہے جس پر چلنے والے منعم علیہم ہیں۔ جن پر تیرا انعام ہوا۔ اس سے مسائل تو بہت نکلتے ہیں لیکن بر سبیل اختصار یوں سمجھئے کہ وہ راستہ جس کے متعلق حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ماانا علیہ واصحابی فرمایا۔ وہ طریق مستقیم اور وہ امور جن پر خاصان خاص اور برگزیدہ افراد کا عمل رہا ہو وہی در حقیقت صراط مستقیم ہے۔ غیر المغضوب علیہم ولا الضالین اس میں ہدایت ہے کہ طالب حق وہدایت دشمنان الٰہی

سے ضرور اجتناب کرے اور ان کی رسم وراہ وضع و طور سے پرہیز رکھے۔ ترمذی شریف میں ہے کہ مغضوب علیہم جن پر غضب ہوا ان سے مراد یہود ہیں اور ضالین جو راہ سے بہکے ہوئے ہیں۔ وہ نصاریٰ ہیں۔

تحقیق لفظ ضالین

ضاد اور ظاء میں مباینت ذاتی ہے۔ اس میں مخارج اور اداو تلفظ میں کسی صفت کا اشتراک دونوں کو متحد نہیں کر سکتا بنابریں غیر المغضوب کو غیر المغظوب پڑھنا اگر بقصد ہو تو تحریف کلام اللہ کا جرم بن کر پڑھنے والوں کا کافر بنا دیتا ہے اگر بلا قصد ہو تو نا جائز ہے۔ جو ضاد کی جگہ ظاء پڑھے۔ اس کی امامت جائز نہیں (محیط برہانی)

اس کے بعد آمین کہنا سنت ہے خواہ نماز میں ہو یا خارج نماز ہمارے امام ابو حنیفہ النعمان (رض) کی تحقیق میں نماز کے اندر آمین بالخفا کہنی چاہیے۔ احادیث پر نظر اور تنقید کے بعد یہی نتیجہ حاصل ہوا ہے۔ جہر کی روایتوں میں جو حدیثیں لائی جاتی ہیں۔ اس میں مدبھا کا لفظ ہے جس سے جہر ہر گز ثابت نہیں ہوتا اور جن روایتوں میں جہر کا بیان ہے ان کی سند میں کلام و جرح ہے۔ بنابریں آمین بالخفاہی پڑھنا مذہب حنفی میں صحیح ہے جس کی تحقیق ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔

(قادری ابوالحسنات سید محمد احمد قادری (نور اللہ مرقدہ) خطیب جامع مسجد وزیر خان لاہور)

اے اللہ! ہمیں ان لوگوں کے راستہ پر چلا جن پر تونے انعام فرمایا، اب اللہ تعالیٰ نے کن پر انعام فرمایا؟ تو اس کا جواب قرآن نے دیا: انعم اللہ علیہم من النبیین والصدیقین والشہداء والصالحین۔ اللہ تعالیٰ نے جن پر انعام فرمایا، یعنی انبیاء، صدیقین، (صدیقین سے عموماوہ لوگ مراد ہوتے ہیں جنہوں نے انبیاء کی صحبت حاصل کی اور ان کے ساتھی بن گئے یعنی صحابہ کرام) شہداء اور صالحٰن (اور اولیاء کاملین) سورۃ نساء آیت نمبر 69)۔

گویا اس جگہ ہمیں تلقین کی گئی ہے کہ ہم سب سے پہلے انبیاء کے راستہ پر چلیں کہ جس طرح انھوں نے وقت کے ہر نمرود و فرعون سے ٹکر لی مگر کلمہ حق کو بلند کر کے چھوڑا، اسی طرح ہم حق گوئی اور راست بازی کا طریقہ اپنائیں پھر ہم صحابہ کرام کے طریقہ پر چل کر حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لائے ہوئے دین کو جہاد اور عمل صالح کی تلوار کے ساتھ دنیا بھر میں پھیلائیں اور شہداء کے طریقہ پر چل کر راہ حق پر استقامت کے لیے جان دینے سے بھی دریغ نہ کریں اور اولیاء کاملین کا طریقہ اپنا کر دنیا سے نفرت اور آخرت سے محبت اپنائیں۔

غیر المغضوب علیھم ولا الضالین

عدی بن حاتم (رض) سے روایت ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جن پر غضب کیا گیا وہ یہود ہیں اور جو گمراہ ہوئے وہ عیسائی (ترمذی کتاب التفسیر سورۃ فاتحہ حدیث 2954، ابن جریر، ابن حبان)۔ یوں تو یہود و نصاریٰ دونوں اللہ تعالیٰ کے مغضوب بھی ہیں اور گمراہ بھی مگر یہود کی اسلام سے سرکشی و عناد، نصاریٰ سے بہت زیادہ ہے اس لیے انھیں قرآن میں کئی جگہ لفظ غضب کا مصداق ٹھہرایا گیا جو لفظ گمراہ سے سخت ترجمہ آیات ہے جیسے: فباء وبغضب علی غضب (سورۃ بقرہ) من لعنہ اللہ وغضب علیہ (سورۃ مائدہ) جبکہ نصاریٰ کے لیے کہا گیا: وضلوا عن سواء السبیل (سورۃ مائدہ 77) یعنی اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہود و نصاریٰ کے راستہ پر نہ چلنے کا درس دیتے ہوئے فرمایا:

غیر المغضوب علیھم ولا الضالین۔

مگر افسوس ہم مسلمان آج یہود و نصاریٰ کا طرز زندگی اپنائے ہوئے ہیں مسلم مردوں نے ان جیسا بے ریش چہرہ، ان جیسی حجامت، اور ان جیسا لباس اپنالیا ہے اور مسلم عورتوں نے ان کی پیروی میں مختصر لباس پہننے اور یہود عیسائی عورتوں کی طرح بے حیائی کے طریقے اپنا لیے ہیں، اے کاش! ہم قرآن کریم کی پہلی سورت جو ہم ہر نماز میں پڑھتے ہیں کے آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھ لیں (آمین)۔

آمین کہنے کی فضیلت

چونکہ سورۃ فاتحہ دعا ہے۔ **اھدنا الصراط المستقیم ۔ صراط الذین انعمت علیھم، غیر المغضوب علیھم ولا الضالین۔** تو جب بھی سورۃ فاتحہ پڑھی جائے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد ہے کہ اس کے ساتھ آمین کہو۔ سیدنا ابن عباس (رض) سے مروی ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے میں نے عرض کیا آمین کا کیا معنی ہے؟ فرمایا، اس کا معنی ہے اے اللہ، ایسے ہی کردے (جیسے دعا مانگی گئی ہے)۔ سیدنا ابوہریرہ (رض) سے روایت ہے کہ جبرائیل امین نے حضور کو سورہ فاتحہ سکھلائی، جب ولا الضالین، پر پہنچے تو کہا آمین کہیں تو آپ نے بھی آمین کہا۔ (ابن شیبہ)۔ حضرت ابو موسی اشعری (رض) سے روایت ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے

فرمایا جب امام ولا الضالین، کہے تو تم آمین کہو اللہ تم سے محبت کرے گا (مسلم ابو داؤد نسائی)۔ حضرت انس (رض) سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا جس نے بسم اللہ الرحمن الرحیم، پڑھ کر سورہ فاتحہ پڑھی پھر آمین کہا تو آسمان کا کوئی فرشتہ ایسا نہیں جو اسکے لیے استغفار نہ کرے (در منثور جلد اول)۔

نماز میں آمین آہستہ کہنے کا حکم

حضرت ابو ہریرہ (رض) سے مروی ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا: جب امام آمین کہے تو تم بھی آمین کہو، کیونکہ جس کی آمین فرشتوں کی آمین سے موافق ہوئی اس کی بخشش کر دی جائے گی۔ (بخاری کتاب صفۃ الصلوۃ، مسلم، ابو داؤد، نسائی)۔ یعنی جب امام آمین کہے تو فرشتے بھی آمین کہتے ہیں تو تم بھی آمین کہو، اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اسی نمازی کے گناہ بخشے جائیں گے جس کی آمین فرشتوں کی آمین سے مشابہ ہو۔ اور آج تک کسی نے فرشتوں کی آمین نہیں سنی، ثابت ہوا کہ آمین کا آہستہ کہا جانا ہی مطلوب ہے۔ حضرت وائل بن حجر (رض) سے مروی ہے کہ انھوں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ نماز پڑھی جب آپ نے **غیر المغضوب علیھم ولا الضالین** پڑھا تو آمین کہا، واخفی بھا صوتہ، اور اس میں آپ نے اپنی آواز کو آہستہ رکھا۔ (حاکم جلد 2)۔

حضرت وائل (رض) سے ہی مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ سے سنا آپ نے سورۃ فاتحہ کے بعد آمین کہا: **واخفض بھاصوتہ**، آپ نے آواز کو پست رکھا (ترمذی کتاب الصلوۃ حدیث 248)۔

(تفسیر برہان القرآن۔ علامہ قاری محمد طیب)

غیر المغضوب علیھم ! یہ وہ لوگ ہیں جو ظواہر کے ساتھ ٹھہر گئے اور نعمت رحمانیہ نعیم جسمانی اور حقائق روحانی سے ذوقی حتی نعیم قلبی اور ذوق عقلی کے ساتھ مجوب ہو گئے جیسا کہ یہودی ہیں اس لئے کہ وہ ظواہر اور جنت اور خور قصور کی دعوت دیتے ہیں تو ان پر غضب ہوا کیونکہ غضب ڈور ہٹائے جانے اور بعد کو مستلزم ہے۔ اور ظواہر کے ساتھ شہر جانا ہی وہ حجاب ظلمانی ہے جو انتہائی دوری ہے۔ ولا الضالین ! یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے باطن کے ساتھ وقوف کیا محض باطن پر ٹھہر جانا نورانی پردہ ہے اور بیلوگ رحمانیت سے نعمت رحیمیہ کے ساتھ پردے میں ہیں اور ظاہریت حق

سے غافل ہیں اور برابر راستے سے بھٹکے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ ہر ایک میں جمال محبوب کو حرام کہتے ہیں جیسا کہ نصاری کیونکہ یہ لوگ باطنوں اور عالم قدوس کے انوار کی دعوت دیتے ہیں اور محمدی موحدین ظاہر و باطن سب کی طرف دعوت دیتے ہیں اور جمال ذات اور محسن صفات کے درمیان جمع ہیں یعنی دونوں کو مانتے ہیں جیسا کہ وارد ہوا۔

وسارعوا إلى مغفرة من ربكم وجنة یعنی اپنے رب کی بخشش اور جنت کی طرف دوڑو۔ (سورۃ آل عمران آیت ۱۳۳) **اتقوا الله وامنوا برسوله يؤتكم كفلين من رحمته ويجعل لكه نورا شمشون به** "اللہ سے ڈرو اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ وہ اپنی رحمت کے دو حصے تمہیں عطا فرمائے گا اور تمہارے لئے نُور کر دے گا جس میں تم چلو "(سورۃ الحدید آیت ۲۸) "**واعبدوا الله ولا تشركوا به شيئا** "یعنی اللہ کی عبادت کرو اور اس کا کسی چیز کو شریک نہ بناؤ۔ "(سورۃ النساء آیت ۳۶) توان لوگوں کی تینوں دعائیں قبول کی جاتی ہیں جیسا کہ ان کے حق میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے! **ويرجون رحمته ويخافون عذابه** ""اس کی رحمت کے امیدوار ہیں اور اس کے عذاب سے خوفزدہ ہیں۔ (سورۃ بنی اسرائیل آیت ۵۷) **يقولون ربنا الملتائورتا** "ان باسایہ دکہیں گے اے ہمارے رب ہمارا نور پورا فرمادے (سورۃ التحریم آیت ۸) **يت إن الذين قالوا ربنا اله ثم استقاموا** "وہ جو کہتے ہیں اللہ ہمارا رب ہے پھر اس پر قائم رہتے ہیں۔ (سورۃ حم السجدہ آیت ۳۰) تو اللہ تبارک و تعالیٰ نے جو خبر دی ہے یہ لوگ اس تمام کے ساتھ ثواب حاصل کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کا بدلہ جنت کے باغات ہیں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ **جزاؤهم عند ربهم جنت عدن** "ان کا صلہ ان کے رب کے پاس بسنے کے باغ ہیں۔ "**ان الاجنا در "لهم أجرهم ونورهم** (سورۃ البیت آیت ۸) "ان کے لئے ان کا ثواب اور ان کا نور ہے۔ "**اقيه موال الان** (سورۃ "**فأينما تولوا فثم وجه الله** الحدید آیت ۱۹) تو تم جدھر منہ کرو ادھر وجہ اللہ (خدا کی رحمت تمہاری طرف متوجہ) (سورۃ البقرہ ۱۱۵) "**الذين أحسنوا الحسنى وزيادة** "" بھلائی والوں کے لئے بھلائی ہے اور اس سے بھی زائد۔ "(سورۃ یونس آیت ۲۶)

(تفسیر ابن عربی۔ محی الدین ابن عربی مترجم صائم)

نعمت ا: لغت میں نرمی کو کہتے ہیں۔ ثوب ناعم اور جلد ناعم بولتے ہیں۔ یعنی نرم کپڑا یا نرم جلد۔ پھر اس حالت سرور و لذت پر اس مناسبت سے لفظ نعمت ۲ بولنے لگے لیکن مراد اس سے وہ چیزیں لینے لگے کہ جن سے انسان کو راحت اور سرور پیدا ہوتا ہے اور انعام نعمت کسی کو اس طرح پر دینا کہ اس سے صرف احسان مقصود ہو اپنی کوئی غرض نہ ہو اور اسی لیے خدائے تعالیٰ کے سوا کسی کو منعم حقیقی نہیں کہہ سکتے ہاں مجازاً اطلاق کر سکتے ہیں۔

ہر چند خدائے تعالیٰ کی نعمتیں بیشمار ہیں جیسا کہ وہ خود فرماتا ہے **وَإِنۡ تَعُدُّوۡا نِعۡمَةَ اللّٰهِ لَا تُحۡصُوۡهَا** (ترجمہ) ''کہ اگر تم خدا کی نعمتیں گنو تو شمار نہ کر سکو گے ''لیکن ان کی دو قسمیں ہیں ایک دنیوی دوسری اخروی۔ پھر دنیوی کی دو قسم ہیں ایک وہبی کہ جس میں بندہ کو کچھ دخل نہیں۔ دوسرے کسبی کہ جو بندے کے کسب اور کام سے علاقہ رکھتے ہیں۔ پھر وہبی کی دو قسم ہیں ایک روحانی جیسا کہ اس کی روح کو پیدا کرنا اور پھر اس کے بدن سے متعلق کرنا کہ جس کو زندگی دنیاوی کہتے ہیں اور پھر اس کو عقل سے منور کرنا اور اس کے متعلق قوی فہم و فکر و نطق وغیرہ عطا کرنا۔ دوسرے جسمانی جیسا کہ اس کا بدن پیدا کرنا اور اس میں قوائے غادیہ و نامیہ وغیرہا کہ جن سے اس کا قوام بدن ہے 'عطا کرنا اور اس کے اعضا ہاتھ پاؤں آنکھ ناک کو کامل بنانا اور پھر اس کے متعلق کھانا اور کپڑا اور دیگر حوائج وزینت 'روپیہ پیسہ ' زن و فرزند 'مکان و سواری وغیرہ وغیرہ بیشمار چیزیں ہیں یہ نعمتیں خدائے تعالیٰ کی کافر و مومن نیک و بد سب کو عطا ہیں چونکہ بندہ کو مفت ملی ہیں اس لیے قدر نہیں کرتا اگر ان میں سے ایک تندرستی اور فراخ دستی ہی کو دیکھا جائے تو کیسی نعمت ہے اور پھر ایک آنکھ یا ناک وغیرہ اعضاء کے لیے اگر لاکھوں روپیہ صرف کرے تو کہیں دستیاب نہ ہوں۔ ادنیٰ سی بات جوانی میں بالوں کا سیاہ ہونا ہے پھر اس کے لیے بڑھاپے میں لوگ خضاب لگا کر جو کچھ مشقت اٹھاتے ہیں بیان سے باہر ہے۔ پھر پانی اور ہوا اور طرح طرح کی خوشبوئیں اور میوے اور قسم قسم کے اناج اور نفیس کپڑے سب خدا کی مخلوق ہیں جو بندہ کے کام میں آتے ہیں بندہ کا اس میں خانہ زاد کچھ بھی نہیں اور کسبی بھی بہت سی نعمتیں ہیں جیسا کہ اخلاق حمیدہ سے نفس کو مزین بنانا اور علم و فضل 'صنعت اور طرح طرح کی آرائشیں ظاہری و باطنی پیدا کرنا۔ یہ بھی سب ادھر سے ہیں لیکن قدرے بندے کے کام کو دخل ہے مگر مراد کو وہی پہنچاتا ہے۔ ورنہ اپنی سعی و کوشش سلطنت اور دیگر کمالات حاصل کرنے میں کون کمی کرتا ہے۔ اخروی نعمتوں کے بھی بیشمار اقسام ہیں جیسا کہ بندہ کو اپنی معرفت اور ہدایت اور تقرب وغیرہ آخرت کے وسائل عطا کرنا اور اس کے گناہ معاف کرنا اور مرنے کے بعد

اس کو عالم برزخ (قبر) اور عالم حشر میں جنت دینا اور اس میں صدہاوہ نعمتیں کہ جن کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کان نے سنا ہے نہ کسی کے دل پر ان کا خیال گزرا ہے اور سب سے بڑھ کر وہاں کا دوام اور اس کا دیدار ہے اللہم ارزقنا رویتک فی جنت الفردوس۔ آمین

۱؎ نعمت بالفتح۔ ۱۲ منہ۔

۲؎ نعمت بالکسر یہ دنیا کی تمام عیش و عشرت ٬ دولت و جوانی ٬ حسن وخوبی ٬ اقبال و شہرت سب خواب وخیال ہیں جس طرح کوئی رات کو خواب میں شادی کرے اور نہایت خرمی اٹھاوے یا تخت سلطنت پاوے صبح کو جب آنکھ کھلے تو کچھ نہ دیکھنا۔ یہی حال اس چندروزہ زندگی اور اس کی بہار کا ہے۔ اگر کسی کو اس بات کا معائنہ کرنا ہو تو پرانے کھنڈرات بالخصوص پرانی دہلی میں بادشاہوں کی شکستہ عمارات اور کوشک ہزار ستون کی بنیاد دیکھے اور توزک سلاطین تیموریہ کا آئینہ عبرت لال قلعہ ہے۔ دہلی کے کسی بڑے بادشاہ نے اخیر عمر میں جب بر سفر تھے کیا حسرت کے یہ اشعار کہے۔

چوں گل دریں جہاں چمیدیم

سیار نعیم وناز دیدیم

اسپان بلند بر نشتیم

ترکان گراں بہا خریدیم

کردیم بسے نشاط وآخر

چوں قامت ماہ نو خمیدیم

عالم گیر کے اشعار

پس آپ کو جب نعمائے الٰہی کا کسی قدر حال معلوم ہوا تو اب یہ جان لیجئے کہ اس آیت میں (کہ جن پر اے خدا تو نے نعمت کی ہے ان کی راہ پر چلا) نعمت اخرویہ مراد ہے۔ کس لیے کہ دراصل جس قدر دنیا کی نعمتیں ہیں سب فانی ہیں باقی نعمتیں اخرویہ ہیں۔ سو ان کے مقابلہ میں کالعدم ہیں۔ دوم دنیاوی نعمتوں میں تو گمراہ بھی شریک ہیں پھر ان کی راہ کیونکر مطلوب ہو سکتی ہے ان کی راہ تو سیدھی غم کدہ جہنم میں جاتی ہے اعاذنا اللہ منہا اور یہ بھی واضح ہو کہ جن کو

خدائے تعالیٰ نے اخروی نعمتیں عطا فرمائی ہیں وہ چار گروہ ہیں جیسا کہ خود ایک جگہ فرماتا ھے وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا "کہ جس نے اللہ اور رسول کی اطاعت کی تو وہ ان لوگوں کے ساتھ رہے گا کہ جن پر خدا نے انعام کیا اور وہ انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صالحین ہیں اور یہ اچھے رفیق ہیں۔"

آپ کو یہ تو معلوم ہو گیا کہ عالم غیب سے یہ صراط مستقیم اول انبیاء (علیہم السلام) کو عطا ہوتا ہے اور پھر ان کا پر تو صدیقین پر پڑتا ہے اور ان کا شہیدوں پر اور ان کا صالحین پر۔ کس لیے کہ خدائے تعالیٰ نے انسان کو دو قوتیں عطا فرمائی ہیں۔ ایک قوت نظریہ کہ جس کی وجہ سے اشیاء کا علم حاصل ہوتا ہے اور اس قوت کی تکمیل کی دو صورتیں ہیں ایک انکشاف کہ روح کو نور قدس سے وہ صفائی حاصل ہو کہ پھر حجابات اور ظلمات ادراک حقائق اشیاء سے مانع نہ آویں۔ اس کا قلب عالم غیب کا خزانہ ہو جائے اگر بغیر اکتساب و تعلیم یہ بات اس کو حاصل ہے تو وہ نبی ہے۔ پھر انبیاء کے بھی مراتب متفاوت ہیں۔ اعلیٰ درجہ میں رسول اولوالعزم ہیں اور ان سب کا سلسلہ ایک شخص کی طرف منتہی ہے کہ جو عالم روحانی میں خداوند تعالیٰ کے ظہور کا اول پر تو ہے کہ پھر جو اور مخلوقات ہے سب اس کی تفصیلات ہیں اور عالم حسی میں وہ سب سے اخیر ہے جس کو حقیقت محمدیہ کہتے ہیں (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کیا خوب کہا ہے کسی نے۔

تو اصل وجود آمدی از نخست
دگر ہر چہ موجود شد فرع تست

پس چونکہ کل کائنات اسی کے وجود کے انبساطات ہیں اس لیے جس طرح اپنے وجود کا علم ضروری ہے ان کا بھی ضروری ہے۔ اس لیے تمام علوم کا سرچشمہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہیں چنانچہ خود بھی ارشاد فرماتے ہیں کہ مجھ کو تمام اولین و آخرین کے علم دیئے گئے ہیں اور چونکہ بنی آدم از علم یابد کمال کمال کا اعلیٰ مرتبہ قوت علمیہ کی تکمیل ہے اور آپ اس میں سب سے بڑھ کر ہیں۔ اس لیے آنحضرت سید المرسلین قرار پائے۔ الحاصل نبی وہ ہے جس کی قوت علمیہ انکشاف الٰہی سے نہایت کمال کو پہنچ جائے کہ پھر اس میں غلطی کا احتمال نہ رہے اور اس کی قوت

عملیہ بھی مکمل ہو جاتی ہے کہ جس سے ہر قسم کے گناہوں سے محفوظ و معصوم رہتا ہے اور اس کی روحانی قوت سے خرق ۲؎ عادات و معجزات اس کی

۱؎ اس کی ایک چھوٹی سی مثال دیتا ہوں کہ جس سے ایک چیز کا سب سے اول ہونا اور آخر ہونا سمجھ میں آجائے۔ کسی درخت کے تخم کو دیکھئے کہ وہ اس درخت کی اصل ہے پھر اس سے دو پتے نکلتے ہیں یہ ایک مرتبہ تفصیل کا ہوا پھر کس قدر شاخیں نکالتا ہے یہ دوسرا مرتبہ اس تخم کی تفصیل کا ہوا۔ پھر تمام شاخیں اور پتے اور پھل پھول نمودار ہوتے ہیں۔ یہ تیسرا مرتبہ تفصیل کا ہوا کہ اس تخم میں جس قدر یہ چیزیں مجملاً ودیعت تھیں سب باہر آ گئیں اور تفصیل ہو گئیں پھر تخم سب سے اخیر پھل میں آ گیا۔ یہ تخم جو پھل میں نمودار ہوا ہوا اگر کسی قدر تعینات کا لحاظ کیا جائے تو وہی پھل ہے کہ جس سے یہ تمام درخت پیدا ہوا۔ اب دیکھئے یہ تخم سارے درخت سے مقدم ہے مگر موخر بھی ہے۔ یہی حال حقیقت محمدیہ اور تمام سلسلہ انبیاء کا ہے فتامل۔ ۱۲ منہ

۲؎ معجزات کبھی اقوال ہوتے ہیں جیسا کہ غیب کی خبر دینا اور بے مثل کلام کہ جس میں کہ ہر طرح کی ہدایت مع غایت فصاحت ہو جیسا کہ قرآن مجید یا افعال ہیں جیسا کہ انگلیوں سے پانی جاری کرنا اور چاند کے دو ٹکڑے کر دینا اور درختوں کا حاضر کر دینا۔ ایک مشت خاک سے لشکر کو اندھا کر دینا وغیرہ وغیرہ اور جس طرح انبیاء کو تصدیق کے لیے معجزات دیے جاتے ہیں اسی طرح ان کو آیات عقلیہ بھی ملتی ہیں۔ پھر ان آیات عقلیہ کی یہی چند قسم ہیں۔ ازان

تصدیق کے لیے ظاہر ہوتے ہیں اور جو لوگ ان کے فیض صحبت اور اثر تربیت سے اس درجہ علیا کو پہنچتے ہیں ان کو صدیق کہتے ہیں جیسا کہ صحابہ میں ابو بکر (رض) تھے اور پھر تابعین اور تبع تابعین اور ان کے بعد اور ہزارہا صدیقین گزرے ہیں کہ جن کے فیوض اور انوار نے ایک عالم کو منور کر رکھا ہے اگرچہ حکمائے اشراقیہ اور دیگر اہل ریاضت جیسا کہ ہنود کے جوگی وغیرہم بھی اس انکشاف سے کسی قدر بہرہ یاب ہوتے ہیں مگر بسبب اختلاط قوت وہمیہ کے غلطیوں سے محفوظ نہیں اور نہ یہ قوت ان کے حد کمال تک پہنچتی ہے بلکہ وہ ایسے ہیں کہ جس طرح کسی طائر کے تھوڑے سے پر ہوں اور وہ اچھی طرح نہیں اڑ سکتا کسی قدر تڑپتا ہے اور گر پڑتا ہے اور وہ لوگ عقاب کی طرح اڑتے ہیں اس لیے ان کا اعتبار نہیں ان کا اعتبار ہے اور وہی قابل اقتداء ہیں مگر عام لوگ ان کی ان ادنیٰ باتوں پر بھی گرویدہ ہو جاتے ہیں اور ان کو خدا بنا لیتے ہیں۔ چنانچہ مدینہ منورہ میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے عہد میں ایک

شخص ابن صیاد تھا کہ حضرت نے اس سے دخان دل میں رکھ کر پوچھا تو دخ کہہ کے رہ گیا اور اب بھی ہزاروں ایسے شعبدہ باز ہیں۔ دوسری صورت استدلال اور تجربہ وغیرہ امور ہیں گو ان چیزوں سے عقل کو ترقی ہوتی ہے مگر کمال کو نہیں پہنچتی۔ کس لیے کہ استدلال میں جو کچھ خرابیاں پیش آتی ہیں اس کے تو حکمائے مشائین بھی قائل ہیں کہ جن کی اصلاح کے لیے فن منطق تدوین کیا تھا اور اس کے بعد بھی ارسطا طالیس وغیرہ بہت سے حکیم اغلاط سے نجات نہ پا سکے جیسا کہ ان کے فلسفہ سے ظاہر ہے۔ کیا خوب کہا ہے کسی نے۔

پائے استدلالیاں چوبیں بود
پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود

اور تجربہ کا یہ حال ہے کہ انسان کی جوں جوں عمر زیادہ ہوتی جاتی ہے تجربہ اور مشاہدہ سے عقل بڑھتی جاتی ہے مگر اس کے ساتھ ہی یوماً فیوماً حواس میں بھی فرق آنے لگتا ہے پس جس طرح بوڑھے لوگ دانائی کے لقب سے ممتاز ہیں اسی طرح کم عقلی کا بھی خطاب ان کو ملتا ہے۔ اس کے سوائے تجربہ کو امور آخرت وغیرہ یعنی فن نبوات سے کیا علاقہ ؟ اس لیے یہ فریق بھی معتبر نہ رہا اور ان کو خود حضرات انبیاء (علیہم السلام) کا متبع ہونا پڑا۔ دوسری قوت علمیہ ہے کہ جس سے کسی قول کے نتیجہ پر یقین کر کے اس کو عمل میں لاتے ہیں۔ پس جن لوگوں پر انبیاء (علیہم السلام) اور ان کے صدیقوں کا اثر پڑتا ہے اور ان کو ثواب اور وعدہ الٰہی کی پوری تصدیق ہو جاتی ہے (گویا یہ اس کے پاس پہنچ گئے ہیں اور اس وجہ سے اس پر یہاں تک عمل کرنے کو آمادہ ہیں کہ اپنی جان تک دریغ نہیں کرتے) ان کو شہیدا کہتے ہیں گو وہ زندہ ہوں مگر جب اس مرتبہ پر پہنچ گیا۔

جملہا خلاق حمیدہ ہیں وبیان شافی وحجۃ واضحہ ہے۔ انوارِ صحبت تکمیل نفس ہے کہ اس نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی صحبت سے نفس کو کمال حاصل ہو جائے۔ ازان جملہ خیر وبرکات ونیک وقتی ہے کہ اس کے یمن وبرکت سے انسان کو ہر قسم کی نیک چلنی اور خیر وبرکت حامل ہو جائے۔ پس جس طرح کہ ناقص لوگوں کو معجزات سے نبی کی تصدیق ہوتی ہے کاملوں کو اس سے بڑھ کر آیات عقلیہ سے تصدیق ہو جایا کرتی ہے۔ ہمارے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اس قدر معجزات عطا ہوئے تھے کہ آج تک کسی نبی کو نہیں ملے مگر ان سے دوچند حضرت کو آیات عقلیہ عنایت ہوئی تھیں جس سے امت محمدیہ کا کمال معلوم ہوتا ہے یعنی جناب محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی امت ایسی کوڑ مغزی نہیں کہ

ان کو سوائے موٹی موٹی باتوں کے اور لطیف باتوں سے نبوت کے دریافت کرنے کا حصہ ہی نہیں ملا۔ دیکھئے اہل سنت اور حکمائی اشراقیہ آیت عقلیہ سے دوسرے شخص کے کمالات کیسے جلد دریافت کر لیتے ہیں اور دیکھئے وائسرائے کا حاکم ہندوستان ہونا حامیوں کو ظاہری تحمل فوج وشوکت سے معلوم ہوتا ہے اور جو پارلیمنٹ کے ممبر ہیں ان کو اس کی کچھ حاجت نہیں وہ بغیر اس ظاہری تحمل کے یقین کامل کرتے ہیں۔ پس زیادہ ظاہری تحمل کے ساتھ رہنا وایسرائے کی خوبی اور کمال نہیں۔ بلکہ عامیوں کے نقصان عقل کی دلیل ہے۔ ۱۲ منہ

۱ پس جس طرح نبی کو اس لیے نبی کہتے ہیں کہ لفظ نبوت کے معنی علم وخبر کے ہیں اور وہ لوگوں کو اپنے علم سے خبر دیتا ہے اسی طرح صدیق چونکہ صداقت والا ہوتا ہے اور نبی کی تصدیق کرتا ہے اس کو صدیق کہتے ہیں اور شہادت کے معنی حاضر ہونے کے ہیں اور چونکہ گواہ مواقع پر حاضر ہوتا ہے۔ اس لیے اس کو شاہد

جاتے ہیں تو شہید ہی کہلاتے ہیں اور چونکہ انھوں نے اپنی حیات مستعار کو دریغ نہ کیا تو اس کے بدلہ میں خدا ان کو حیات ابدی نصیب کرتا ہے کہ جس کی نسبت فرماتا ہے وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ " کہ جو خدا کی راہ میں مارے گئے ان کو مردہ نہ کہو وہ زندہ ہیں مگر تم کو خبر نہیں۔ " کیا خوب کہا ہے کسی نے

کشتگان خنجر تسلیم را
ہر زماں از غیب جانے دیگر است

اور اسی لیے بعد مردن بھی ان کی روح سے امور عجیبہ اور اسرار غریبہ سرزد ہوتے ہیں۔ اور چونکہ ان کی یہ کارروائی ملائی اعلیٰ کے موافق اور حسب خواہش ہوتی ہے تو ان کی یہ خواہش باغ اور خوشبو اور طرح طرح کی راحتوں میں ظہور کرتی ہے۔ اسی لیے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ہے کہ دنیا میں پھر آنے کی کوئی آرزو نہ کرے گا مگر شہید کہ وہ اس ذائقہ کے لیے پھر آنے کی آرزو کرے گا اور اسی لیے اس شہادت کی آرزو میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فرماتے ہیں کہ واللہ میری یہ آرزو ہے کہ خدا کی راہ میں مارا جاؤں اور پھر زندہ ہوؤں اور پھر مارا جاؤں (مشکوٰۃ) یہ بات کہ اول قطرہ خون سے شہید کے تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں منجملہ اور فضائل کے ایک ادنیٰ بات

ہے۔اسی لیے حضرت عمر(رض) یہ کہا کرتے تھے اللّٰھُمَّ ارْزُقْنِیْ شَھَادَۃً فِیْ سَبِیْلِكَ وَاجْعَلْ مَوْتِیْ بِبَلَدِ رَسُوْلِكَ "الٰہی مجھ کو اپنی راہ میں شہادت نصیب کر اور اپنے رسول کے شہر میں موت دیجیو" چنانچہ خدا نے ان کی دعا قبول کی۔الٰہی میں بھی دعا کرتا ہوں۔

آرزو یہ ہے کہ تیری راہ میں
ٹھوکریں کھاتا ہمارا سر چلے

جس طرح حضرت مسیح (علیہ السلام) کے مریدوں میں استیقان (رح) یروشلم میں شہید ہوئے ہیں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے صحابہ ہر جگہ صدہا شہید ہوئے ہیں اور اگر یہ دونوں قوتیں کمال پر نہیں پہنچیں مگر اس کو حضرات انبیاء سے کمال درجہ کا اتباع ہے تو اس کو صالح کہتے ہیں۔پس یہ وہ لوگ ہیں کہ جن پر خدائے تعالیٰ نے رحمت کی اور نعمت دی۔حضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی امت میں قیامت تک صدیق اور شہید اور صالح پیدا ہوتے رہیں گے۔

متعلقات:غضب:انسان کی ایک کیفیت ہے کہ جس میں خون دل جوش مارتا ہے اور روح حیوانی مکروہ کے دفع کرنے کو اور دشمن کے مقہور کرنے کو باہر کی طرف متوجہ ہوتی ہے۔پس یہ بات ذات باری تعالیٰ کی نسبت محال ہے کیونکہ خون دل کا جوش مارنا جسمانی چیزوں اور ممکنات کا خاصہ ہے۔پس اس صفت سے مراد اس کی غایت اور اثر ہے یعنی دشمن اور مخالف کا مقہور کرنا اور تمام صفات رحمت اور استہزاء اور خدع اور مکر وغیرہ جو قرآن مجید میں خدائے تعالیٰ کی نسبت واقع ہیں سب کے مجازی معنی اثر اور غایت مراد ہے۔کس لیے کہ خدا تعالیٰ کو ممکنات سے کسی بات میں اشتراک نہیں مگر جب کہ اس کی صفات تعبیر کرنی پڑیں تو لا محالہ وہی الفاظ استعمال کرنے پڑے کہ جو بندوں کی صفات کے لیے وضع کئے گئے تھے۔خدا تعالیٰ کا غصہ اس کی برخلافی اور سرکشی پر ہوتا ہے کہ جس کا نتیجہ دین و دنیا کی خرابی و بربادی ہے۔خدا اپنے غضب سے محفوظ رکھے۔آمین

ضلال:ہدایت کا ضد ہے۔یعنی اس رستہ پر چلنا کہ جس سے مقصود کو نہ پہنچے۔پس جس طرح ہدایت کے مراتب مرتبہ ہیں اسی طرح

کہتے ہیں اور شہید چونکہ اپنے دل سے ایسی تعمیل کرتا ہے گویا اس کے نتیجہ کے پاس پہنچ گیا اور حاضر ہو گیا۔ اس لیے اس کو شہید کہتے ہیں۔ اور چونکہ صالح نیک ہوتا ہے اس کو صالح کہتے ہیں۔ یہ لغوی معنی ہیں ورنہ حقیقت ہر ایک کی ہم اوپر بیان کر آئے ہیں۔ ۱۲ منہ

ضلالت کے مراتب مرتبہ ہیں اور جس طرح ہدایت کے مراتب غیر متناہی ہیں اسی طرح ضلالت کے مراتب بھی لاانتہا ہیں۔ الغرض ہر ہدایت کے مقابلہ میں ایک ضلالت ہے۔ پس جس کو دس مرتبے ہدایت کے حاصل ہوئے اس سے اوپر گیارہویں مرتبہ میں ہنوز ضلالت ہے۔ ایک بڑے سے بڑے کامل کو کہ ہنوز اخیر مرتبہ کمال کی اس کو ہدایت نہیں ہوئی اس مرتبہ کے لحاظ سے ضال کہہ سکتے ہیں اور اسی وجہ سے قرآن مجید میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ فرمایا ہے وَوَجَدَکَ ضَآلًّا فَھَدٰی کہ آپ جب تک مرتبہ نبوت اور وحی جلی کی ہدایت کو نہ پہنچے تھے۔ اس مرتبہ میں ضال تھے۔ پھر اس کی آپ کو ہدایت کر دی۔ بعض بے علم عیسائیوں نے اس لفظ کو عرفی ضلالت پر محمول کر کے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نسبت قبل نبوت گمراہی کا الزام لگایا ہے اور پولوس مقدس پر قیاس کیا ہے کہ ابتداء میں سخت بے دین تھا۔ چنانچہ حضرت استیفان کے شہید کرنے والوں میں شامل تھا اور پھر ہر روز دینداروں کو قتل کرتا اور ستاتا تھا۔ اور دمشق کو کاہنوں کا خط لے کر ایمانداروں کو قتل کرنے چلا تھا کہ حضرت مسیح (علیہ السلام) نے روحانی تصرف سے اس کو اندھا کر دیا اور پھر یہ شخص عیسائیوں کا وہ پیشوا ہوا کہ جس نے حضرت مسیح (علیہ السلام) کو بھی ملعون کہا اور تمام شریعت موسیٰ (علیہ السلام) اور توراۃ کو منسوخ کر دیا۔ چنانچہ یہ سب باتیں کتاب اعمال اور نامجات سے ظاہر ہوتی ہیں۔

یہ ضلالت یعنی گمراہی کبھی اختیاری ہوتی ہے کہ اسباب گمراہی کو از خود اختیار کر لیا جاوے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَاَمَّا ثَمُوْدُ فَھَدَیْنٰاھُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰی عَلَی الْھُدٰی ''کہ ہم نے ثمود کو اسباب ہدایت تو میسر کر دیے تھے مگر انھوں نے از خود اسباب گمراہی کو اختیار کیا۔ ''وَاَضَلَّہُ اللّٰہُ عَلٰی عِلْمٍ بھی اسی قبیل سے ہے۔ اور یہ بات کبھی لذات جسمانیہ کو لذات روحانیہ پر مقدم کرنے سے حاصل ہوتی ہے اور کبھی حبِّ جاہ و مال سے پیدا ہوتی ہے اور کبھی پابندی رسم و عادات سے بھی حاصل ہوتی ہے اور کبھی صحبت بد سے اور کبھی نفس کو لذات اور خواہشوں میں شتر

بے مہار کرنے سے اور جب نفس موٹا ہو جاتا ہے تو اسے نیکی سے نفرت پیدا ہوتی ہے جیسا کہ آج کل ہم اوباشوں کو دیکھتے ہیں کہ دن رات چانڈو اور بھنگ اور افیون اور شراب اور ناچ و رنگ گنجفہ و شطرنج میں غرق رہتے ہیں اور رنڈی بھڑووں کو ہر وقت اپنی صحبت میں رکھنا اور رہا ہو ہو اور فحش بکنے میں شب کے دو بجے تک جاگنا اور صبح کو دس بجے اٹھنا اور پھر کنگھی چوٹی میں باقی وقت ضائع کر دینا اور پھر بٹیر بازی ' کبوتر بازی ' پتنگ بازی میں مصروف ہونا ان کے خمیر میں داخل ہو گیا۔ الغرض رات دن میں نہ خدا کا نام کبھی ان کے منہ سے نکلتا ہے نہ موت کا دھیان آتا ہے اور نہ دنیا کے کاروبار کا دل و دماغ ' نہ سلطنت و ملک کی کچھ خبر۔ عدل و انتظام مالی و ملکی تو کجا اور بیدار مغزی سے کیا علاقہ۔ ان لوگوں کا جس طرح حصہ دینی برباد ہو گیا دنیاوی حصہ بھی برباد ہوتا جاتا ہے۔ اگر باور نہ آئے تو ہندوستان کے رئیسوں اور امیروں کو دیکھ لیجئے اور ان کے ملک کی اندرونی حالت کو غور کر لیجئے انھیں خرافات کی بدولت سلطنت تیموریہ برباد ہوئی ' انھیں کی وجہ سے لکھنؤ اور مرشد آباد وغیرہ بڑی بڑی ریاستوں پر جھاڑو پھر گئی اور جو باقی ہیں ان کو عبرت نہیں۔ لشکر کی یہ حالت کہ پرانی توپوں پر زنگ لگا ہوا ہے۔ توڑے دار بندوقوں اور بیڈول اور نکمے ہتھیاروں کے بوجھ نے سپاہیوں کی پشت کو توڑ دیا ہے۔ ایک پاؤں میں جوتی تو دوسرا ننگا۔ وردی ندارد اور جو پھٹی پرانی کہیں سرکار انگریزی سے نیلام میں خرید لی ہے تو اس کی درستگی کی نوبت نہیں پہنچتی۔ نہ قواعد نہ پریڈ۔ نہ افسر قواعد جنگ سے واقف۔ افسر کون ؟ وہی امیروں کی نالائق اولاد کہ جن کو اپنے تن کا بھی ہوش نہیں۔ رئیس کے دیوان یا وزیر کون وہی عیاش یا ان کی اولاد کہ جنھوں نے رئیس کو لغویات میں بالکل بے ہوش کر رکھا ہے۔ خزانہ کی حالت تباہ ' دروازے پر ہزاروں داد خواہ۔ نہ رعایات میں دینی مدارس نہ فنون کی تعلیم نہ علوم جدیدہ کے لیے کوئی جماعت مستثنیٰ۔ حتیٰ کہ تمام ملک میں کوئی کارخانہ عمدہ بھی کسی چیز کا نہیں اور جو ہے تو غیر لوگوں کے اہتمام سے۔ نہ یہ توفیق کہ اپنی رعایا میں سے دس بیس کو غیر ممالک میں تعلیم پانے کو بھیج کر اپنی رعایا میں وہ ہنر عموماً شائع کئے جاویں۔ نہ کوئی جنگی فوج کا حصہ

1 اور اسی لیے باوجودیکہ بندہ اس کے روبرو پہنچ گیا پھر اھدنا الصراط المستقیم کے سوال کرنے کا حکم ہوا کیونکہ قرب الٰہی کی نہایت نہیں۔

اے برادر بے نہایت در گہیست
ہر چہ بر دی میر سی بر وے بایست

کہ جس سے مخالف کے دل پر کوئی اثر ہو نہ رعایا کو عام قواعد سکھانے کی خواہش۔ نہ والنٹیر لشکر رکھنے کی لیاقت۔ قلم کہاں سے کہاں چل نکلا۔ الغرض اس مرتبہ میں دل پر ایک زنگ لگ جاتا ہے کہ جس کو رین کہتے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کلاَّ بَلْ رَّانَ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ مَاکَانُوْا یَکْسِبُوْنَ پھر جب اس حالت کو توبہ اور تنبیہ کے صابون سے نہیں دھویا جاتا تو غشاوہ کی نوبت آتی ہے یعنی دلوں پر پردے پڑ جاتے ہیں۔ پھر اس پر جب کچھ مدت گزرتی ہے تو ختم کی نوبت آتی یعنی دلوں پر مہر لگ جاتی ہے۔ اس کے بعد نوبت قفل کی آتی ہے اس کے بعد دل مر جاتا ہے۔ اس کے بعد نہ کوئی نصیحت اثر کرتی ہے نہ کوئی معجزہ کارگر ہوتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَایَنْفَعُ الاٰ یَاتِ وَالنُّذُوْرُ اور یہ بھی آتا ہے۔ سَوَآئٌ عَلَیْھِمْ ئَاَنْذَرْتَھُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْھُمْ لَایُؤْمِنُوْنَ اور کبھی ضلالت بے اختیاری بھی ہوتی ہے کہ مبدہ غیب سے اس بدنصیب کو اس کی بداستعدادی کی وجہ سے سامان ہدایت عطا نہ ہوئے۔ ایسے شخص کو گمراہ ازلی اور شقی بطنی کہتے ہیں کہ ماں کے پیٹ ہی میں بدبخت تھا۔ ایسے لوگوں کی نسبت خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ ان لوگوں کو ہم نے جہنم کے لیے پیدا کیا ہے اور کچھ پروا نہیں۔ پس ان لوگوں سے بے خوف وخطر برائیاں اس طرح ظاہر ہوتی ہیں کہ جس طرح مقتضیات طبع سونا 'کھانا وغیرہ باتیں بلا تکلف سرزد ہوتی ہیں۔

جب آپ کو نعمت اور غضب اور ضلالت کے معنی بہ خوبی معلوم ہوگئے تو اب ہم ان دونوں آیتوں کی تفسیر بیان کرتے ہیں۔ آپ جان چکے ہیں کہ صراط مستقیم کی وضاحت کے لیے یہ دونوں آیتیں وارد ہیں اور صراط مستقیم درمیانی راستہ کو کہتے ہیں اور مخاطب کو وہ نشان دیا کرتے ہیں کہ جس کو وہ جانتا ہو اور جس کو مانتا ہو تو اس لیے خدائے تعالیٰ نے اپنے کلام مقدس میں تینوں چیزوں کا ایک ایک ایسا مسلّم وصف بیان کیا اور معلوم ومشہور نشان دیا کہ جس کو ہر شخص تسلیم کرتا ہے اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ہر درمیانی راہ کی دو طرف مخالف ہوتی ہیں ایک افراط دوسری تفریط۔ پس یہ دو ہوئے ایک وہ درمیانی حالت۔ یہ تین رستے نکل آئے اس لیے سب سے مقدم درمیانی رستہ کو تو صراط الذین انعمت سے واضح کیا کہ صراط مستقیم وہ ہے کہ جس پر چلنے سے نیک نتیجہ پیدا ہو اور وہ خدا کی نعمت ہے۔ پس جس رستہ پر نیک نتیجہ مرتب نہ ہو وہ صراط مستقیم نہیں کیونکہ صراط مستقیم ہوتا تو مطلوب (جو رحمت ہے) حاصل ہوتا۔ یہ

نشان صراط مستقیم کا وہ ہے کہ جس کو ہر شخص تسلیم کرتا ہے اور جو لوگ طبع سلیم رکھتے ہیں وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ در حقیقت خدا کا کامل انعام انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صالحین ہی پر ہے۔ اس لیے ان کی پیروی اور تقلید واجب ہوئی اور عہد آدم سے اس وقت تک آپ جس قدر بنی آدم کو دیکھیں گے اکثر کو ان چاروں فریق کا مقلد و متبع پاویں گے۔ پس مخاطب کے لیے صراط مستقیم ثابت کرنے کے لیے اس جملہ صراط الذین انعمت علیہم الخ سے بڑھ کر اور کوئی دلیل نہیں (وللہ الحجۃ البالغہ) اور اس صراط مستقیم کے ایک جانب مخالف اعنی افراط کو غیر المغضوب علیہم سے واضح کر دیا اور دوسری جانب تفریط کو ولا الضالین سے کھول دیا اور یہ بتلا دیا کہ جن پر خدا کا غصہ بھڑکا اور جو گمراہ ہیں صراط مستقیم سے برطرف ہیں خواہ وہ یہودی ہوں خواہ نصاریٰ خواہ بت پرست ہوں خواہ منافق گنہگار۔

نکات: (۱) انسان کی پوری سعادت یہ ہے کہ اس کی دونوں قوتیں کامل ہو جاویں اور وہ دونوں یہ ہیں۔ قوت نظریہ کہ جس سے علم و معرفتِ الٰہی حاصل ہوتی ہے اور مبدا و معاد کے متعلق عقائد کی درستی میسر آتی ہے۔ دوسری قوت عملیہ کہ جس سے عمدہ اعمال ظہور میں آتے ہیں۔ پس یہ جس کی دونوں قوتیں مکمل ہو گئیں اس کو بڑی نعمت نصیب ہوئی اس لیے اس گروہ کو خدا نے انعمت علیہم سے یاد فرمایا اور اس لفظ سے ان دونوں قوتوں کے مکمل کرنے کی رغبت دلائی۔ اور جس کی اول قوت میں نقصان ہے۔ یعنی خدائے تعالیٰ کی ذات و صفات قیامت اور رسولوں اور فرشتوں کی بابت برا عقیدہ ہے بلکہ خیالات فاسدہ اور توہمات کاسدہ ہی کو علم و معرفت تصور کر کے مست و مغرور ہے تو ان پر غضب الٰہی پر ضرور ہے۔ کس لیے کہ سزا بقدر گناہ ہوتی ہے اور قوت نظریہ انسان کی سعادت کا اعلیٰ بازو ہے کہ جو بعد مردن بھی باقی رہتی ہے اور عمل کا اسی پر مدار ہے کیونکہ جب علم ہوتا ہے تب اس کے موافق عمل کرتا ہے۔ پس جس نے اس عمدہ قوت کو کہ جس کی وجہ سے ملائکہ میں مل سکتا ہے خراب کیا تو اس پر غضب الٰہی نازل ہوا۔ اور اس گروہ میں کافر و مشرک و منافق اور دہریہ وغیرہم داخل ہیں ان لوگوں کو مغضوب علیہم سے یاد کیا تاکہ سزا اور نتیجہ برا خیال میں آوے اور ہر شخص اس شریف قوت کے خراب کرنے سے ڈر جاوے۔ پس وہ جو صحابہ (رض) سے منقول ہے کہ مغضوب علیہم یہود ہیں ہمارے قول کا مؤید ہے اور جس کی قوت عملیہ میں خرابی ہے تو وہ چوری ' زنا ' حسد و بغض وغیرہ بد کام کرتا ہے اور نیک کاموں میں کوتاہی کرتا ہے۔ نماز ' روزہ ' عبادات ' سخاوت ' محبت ' انصاف وغیرہ چیزوں سے بے بہرہ رہتا ہے۔ سو وہ گو اس مرتبہ کا گناہ گار نہیں کہ اس پر غضب الٰہی بھڑکے اور وہ ہمیشہ جہنم میں

رہے۔ مگر راہ راست اور طریق ثواب سے ضرور دور ہے اور اسی لیے کافر کو فاسق سے زیادہ قابل عقوبت شرع نے بیان کیا ہے اس فریق کو خدا نے ضالین سے تعبیر کیا تا کہ ان کی ناراستی معلوم ہو جائے۔

(۲) یا یوں کہو کہ بندوں کی تین قسم ہیں (اول) وہ لوگ جو خدا کے ظاہراً و باطناً فرمان بردار ہیں اور ان کو مومن کہتے ہیں (دوم) وہ کہ جو ظاہر و باطن نافرمان ہیں ان کو کافر کہتے ہیں (سوم) وہ کہ جو ظاہر میں کسی خوف یا لالچ دنیاوی سے فرمان بردار شریعت ہیں اور درپردہ مخالف۔ ان کو منافق کہتے ہیں۔ پس اول فریق کو بلفظ انعمت علیہم تعبیر فرمایا اور فرمان برداری کا نتیجہ بتلا دیا۔ دوسرے اور تیسرے فریق کو بلفظ مغضوب علیہم ولا الضالین تعبیر کیا تا کہ ان کے اس کام کا بد نتیجہ معلوم ہو جائے لیکن منافق گو کفر میں کافر کے برابر ہے مگر اس کی فریب بازی سے عام اہل اسلام کو مضرت پہنچتی ہے۔ اور اسی لیے جس قدر فتنہ و فساد اول دن سے اسلام میں اب تک واقع ہوئے ہیں انھیں بد نصیبوں کی وجہ سے واقع ہوئے ہیں۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے عہد میں جو کچھ ہوا سو معلوم ہے مگر اب بھی جو فتنے ان لوگوں نے برپا کر رکھے ہیں (کہ بظاہر مسلمان کہلاتے ہیں اور درپردہ اسلام کے سخت دشمن جیسا کہ نیچریہ) فتنہ مسیح الدجال سے کم نہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ کہ ”منافق جہنم کے سب سے نیچے کے درجے میں ہوں گے “اسی لیے پیشتر ان کو بہ لفظ مغضوب علیہم تعبیر کیا اور کفار کو بلفظ ضالین تعبیر کیا۔ خواہ یہود ہوں خواہ نصاریٰ۔

(۳) صراط مستقیم کے بیان کرنے میں ضرور تھا کہ تین فریق کا ذکر ہوتا۔ ایک وہ کہ جو صراط مستقیم پر ہے۔ دوسرے وہ کہ جو افراط و تفریط میں پڑ کر اس کو چھوڑ گئے لیکن کسی شخص خاص یا قوم خاص کا نام لینا منصب نصیحت و پایہ ہدایت کو مناسب نہ تھا دو وجہ سے۔ اول یہ کہ جس کو صراط مستقیم پر قائم کہا جاتا اور جس کو برخلاف کہا جاتا تو وہ خود پسندی اور یہ ناراضگی ظاہر کرتے اور یہ سمجھتے کہ اب تو ہم صراط مستقیم پر ہیں کچھ پروا نہیں اور ہم گمراہ ازلی ہیں جستجو بے فائدہ ہے۔ دوم یہ کہ کسی فریق کے نام لینے سے ان تینوں فریق کے نتیجوں کا ذکر رہ جاتا ہے جو مقصود اصلی تھا۔ علاوہ اس کے شارع کے احکام کلیہ ہونے چاہئیں جو ازمان و اشخاص کے بدلنے سے نہ بدلیں اور اقوام کا کیا اعتبار۔ کوئی قوم کبھی کیسی اور کبھی کیسی ہو جاتی ہے۔ اچھوں کو برا اور بروں کو اچھا ہوتے دیکھا ہے۔ پس اس نکتہ کے لیے خدائے پاک نے کسی کا نام نہ لیا بلکہ یہ کہہ دیا کہ صراط مستقیم ان کا طریق ہے کہ جن پر فضل الٰہی ہوا نہ ان کا کہ جن پر غصہ

ہوا۔ نہ ان کا کہ جو بے راہ ہیں۔ ایسی عام نصیحت دل پر موثر ہوتی ہے یہاں تک کہ جو مختصراً ہم نے بیان کیا وہ ہر ہر جملہ کی بابت بیان کیا ہے۔ اب ہم مجموعہ کلام کے نکات اور اسرار بیان کرتے ہیں۔

اسرار مجموعہ سورۃ

(۱) اس سورۃ میں پانچ چیزیں خدائے تعالیٰ کے متعلق اور پانچ بندہ کے متعلق مذکور ہیں۔ خدائے تعالیٰ کے متعلق یہ ہیں۔ اللہ ' رب ' رحمن ' رحیم ' مالک اور بندہ کے متعلق یہ ہیں۔ عبادت ' استعانت ' طلب ہدایت ' طلب استقامت ' طلب نعمت اور غضب الٰہی سے پناہ۔ پس عبادت لفظ اللہ سے اور استعانت لفظ رب سے اور ہدایت لفظ رحمن سے اور طلب استقامت لفظ رحیم سے اور نعمت باقیہ کا طلب کرنا اور غضب سے محفوظ ہونا مالک کے متعلق ہے اور اسی طرح انسان پانچ چیز سے مرکب ہے۔ بدن ' نفس شیطانی ' نفس سبعی ' نفس بہیمی ' جوہر ملکی سے کہ جس کو عقل کہتے ہیں۔ پس یہ پانچوں چیزیں ان پانچوں اسماء سے ایک مناسبت خاصہ رکھتی ہیں کہ جس سے ان کی اصلاح ہوتی ہے۔ چنانچہ جوہر ملکی اسم اللہ سے چمکتا ہے آَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ اور کثافت بدنی رب العالمین کے ملاحظہ سے دور ہو جاتی ہے۔ اور نفس سبعی کی اصلاح لفظ رحمن سے ہوتی ہے اور نفس شیطانی کی اصلاح لفظ رحیم سے متعلق ہے اور نفس بہیمی پر مالک یوم الدین سے دہشت طاری ہوتی ہے۔ جب ان پانچوں ناموں کی تجلی سے آدمی بالکل مہذب اور شائستہ ہو گیا ہے تو اپنے مقصود کی طرف چلا۔ پس طاعت بدن کے لیے ایاک نعبد کہا اور نفس بہیمی کے زیر کرنے کو **ایاك نستعين** زبان پر لایا اور نفس سبعی کے پنجہ اور شیطان کے چنگل سے رہائی پانے کو **اهدنا الصراط المستقيم** کہا اور جن کا جوہر ملکی کامل ہے (یعنی ارواح مقدسہ) ان کی رفاقت طلب کرنے کے لیے **صراط الذين انعمت** کہا اور غضب سے بچنے اور ارواح خبیثہ سے دور رہنے کے لیے **غير المغضوب عليهم ولا الضالين** کہا۔

(۲) جب کہ بندے نے مقام مناجات میں کھڑے ہو کر کمالات وصفات باری تعالیٰ کا الحمد للہ سے لے کر مالک یوم الدین تک ملاحظہ کیا تو اس کو بے اختیار شوق الی اللہ پیدا ہوا پھر اس کو اس سفر کا کاٹنا ضرور پڑا اور ایسے سفر میں توشہ

اور سواری ضرور ہے۔ پس ایاک نعبد کا توشہ لیا یعنی عبادت کو اس سفر کا زادراہ اور ایاک نستعین اعنی استعانت کو سواری بنایا کیونکہ گو عبادت سے خدائے تعالیٰ کا وصال ہے مگر بغیر اعانت الٰہی اور مدد غیبی محال ہے۔ جب زاد وراحلہ مہیا ہو تو سیدھے رستے کے درپے ہوا اور اھدنا الصراط المستقیم کہا اور جب کہ سیدھی سڑک مل گئی تو رستے کے رفیق بھی درکار ہوئے کہ جن کے سبب سے اس رستہ کی تمام صعوبتیں آسان ہو جاویں اور اس کے مشابہ دوسرے رستہ پر نہ پڑ جائے تو اس لیے صراط الذین انعمت علیہم کہا اور جب کہ راہزنوں سے خوف پیدا ہوا تو **غیر المغضوب علیہم ولا الضالین** کہا۔

(۳) اس تھوڑے کلام میں نہایت خوش اسلوبی سے خدا تعالیٰ نے وہ تینوں علم بیان کر دیے جن کے لیے انبیاء (علیہم السلام) آئے اور ان کے قبول و تصدیق کرنے کے لیے معجزات و آیات دکھائے۔ اس لیے اس سورۃ کو تمام کتب سماویہ کا خلاصہ کہیں تو بجا ہے اور سب کا عطر کہیں تو روا ہے اور اسی لیے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ یہ وہ سورۃ ہے کہ اس کے برابر توراۃ وانجیل و قرآن میں کوئی سورۃ نہیں (کما سیأتی) اور وہ تین علم یہ ہیں علم شریعت یعنی وہ قانون الٰہی کہ جس کے مطابق چلنا بندوں پر ضرور ہے۔ علم طریقت کہ جس میں دل کے معاملات پہچانے جاتے ہیں۔ علم حقیقت یعنی مکاشفات ارواح اور تجلی علمی۔

علم شریعت: کی دو قسم ہیں۔ اول علم عقائد کہ جس کو اصول کہتے ہیں دوسرا علم احکام فقہیہ کہ جس کو فروع کہتے ہیں پھر

علم عقائد کی تین قسم ہیں

(۱) خدا تعالیٰ کی ذات و صفات کے متعلق عقائد کہ وہ موجود ہے واحد لاشریک ہے۔ ہر چیز کا اس کو علم ہے۔ دیکھتا، سنتا ہے، ازلی ہے ابدی ہے، عادل، رحیم و کریم ہے۔ کھانے، پینے، سونے، مکان و زمان میں ہونے و دیگر عیوب سے پاک ہے۔ کوئی چیز اس کے مثل نہیں نہ کوئی اس کی اولاد ہے نہ وہ کسی کی۔ سب کاموں میں بے نیاز اور ہر چیز پر قادر ہے۔ کوئی اس کے حکم کو ٹال نہیں سکتا۔ نہ اس سے مقابلہ کر سکتا ہے سو یہ سب باتیں خدائے تعالیٰ نے الحمد للہ رب العالمین الرحمن الرحیم سے ثابت کر دیں۔ کیونکہ جب تمام عالم کا وہ مربی ہو تو اب کون چیز ہے جو اس کی شریک و سہیم ہے۔ اور مربی بغیر رحیم و علیم، قادر و سمیع و بصیر اور حی قیوم ہونے کے نہیں ہو سکتا اور جب تمام عالم کا مربی

ہے تو عالم کی ذات سے اس کی ذات غیر ہے کسی کے مشابہ و مانند نہیں تو جمیع اوصاف حوادث سے لامحالہ بری ہوا۔ بالخصوص ان سے کہ جن سے اس کی تقدیس میں فرق آتا ہے۔

(۲) آخرت کے متعلق عقائد کہ مرنے کے بعد روح باقی رہتی ہے وہاں جا کر ہر قسم کے آرام وراحت پاتی یا تکلیف دکھ اٹھاتی ہے اور ہر نیکی و بدی کا بدلہ ضرور ہے اور اعمال کے بموجب اپنے کئے کو ہر شخص پاوے گا۔ اور ایمانداروں پر وہ وہاں مہربانی فرماوے گا۔ سو یہ سب باتیں اس نے مالک یوم الدین سے ثابت کر دیں کیونکہ جو شخص جزا کے دن کا مالک ہے تو اس کے لیے یہ باتیں ضرور ہیں کَمَا لَا یَخْفٰی۔ ان دونوں قسموں کے علم کو علم مبدء و معاد بھی کہتے ہیں کہ تمام عالم کی ابتداء انتہاء انجام کار سب کچھ بیان کر دیا کہ ابتدا میں وہی ایک تھا اور پھر سب کے پیچھے وہی ایک واحد قہار رہ جائے گا۔

(۳) نبوت و امامت وولایت کے متعلق عقائد اور ان کے مقابلے میں کفر اور بدعت اور شرک کی پہچان۔ سو ان سب باتوں کو مجملاً صراط الذین انعمت علیہم الخ میں مع ان کے نیک و بد نتیجہ کے بیان کر دیا۔ اھدنا الصراط المستقیم کہا تو سیدھے رستے کی خواہش ظاہر کی اور صراط الذین انعمت میں اس رستہ پر چلنے والوں انبیاء و صدیقین و شہداء و صالحین کا منعم علیہ ہونا بیان کر دیا اور انبیاء کی عصمت ثابت کر دی اور ان کا پیشوا اور رہبر ہونا بتلا دیا اور اسی طرح ان کے مقابلہ میں برے لوگوں کا حال بیان کر دیا اور علم فقہ کی دو قسم ہیں عبادات کہ عبادت و استعانت ہر قسم کی خدائے تعالیٰ ہی کو سزاوار ہے نہ کسی کو سجدہ کرنا چاہیے نہ رکوع۔ اور نہ کسی اور کو بوقت حاجت پکارنا چاہیے۔ اسی سے ہر کام میں مدد مانگنی چاہیے۔ اور مال و بدن میں ہر قسم کی عبادت اسی کا حق ہے پس ان سب باتوں کو ایاك نعبد و ایاك نستعین سے ثابت کر دیا دوسرے معاملات اعنی بیع و شراء، نکاح و طلاق، قرض و امانت وغیرہ وغیرہ جملہ احکام کو اھدنا الصراط المستقیم میں واضح کر دیا اور ہر امر و نہی، فرض و واجب، مندوب و مکروہ حرام کا نتیجہ صراط الذین انعمت علیہم غیر المغضوب علیہم و لا الضالین سے مؤکد کر دیا۔

علم طریقت: کو اجمالاً اھدنا الصراط المستقیم میں بیان کر دیا اور اس کی دونوں جانب افراط و تفریط کو

غیر المغضوب علیھم ولا الضالین سے خوب واضح کر دیا۔ پھر اہل طریقت کے تینوں مرتبوں کو بھی بیان کر دیا۔ کس لیے کہ طریقت کا مرتبہ ابتدائی ہے کہ جس بغیر طریقت حاصل نہیں ہوتی اس کو عبادت کہتے ہیں۔ سو اس کو ایاک نعبد کے ساتھ تعبیر کر دیا اور اس کا درمیانی مرتبہ استعانت اور اس کو ایاك نستعین سے واضح کیا اور انتہائی مرتبہ استقامت ہے اور اس کو اھدنا الصراط المستقیم میں ذکر کیا اور اس علم میں بڑھ کر دو چیزوں کے حالات سے مطلع رہنا اصل الاصول ہے۔ اول نفس کہ جو ہر دم ہر طرح کی خواہشوں کی طرف رغبت دلاتا اور راہ راست سے ادھر ادھر لے جاتا ہے کہ جس کے مطیع کرنے کو لوگ سخت ریاضت کرتے ہیں۔ بھوک و پیاس وغیرہ زائد تکلیفیں دے کر اس موذی کو مارتے ہیں۔ مگر خدائے تعالیٰ نے غیر المغضوب علیھم ولا الضالین میں اس کی لگام کی دونوں باگیں سالک کے ہاتھ میں دے دیں۔ یعنی در صورت زیادتی غضب اور در صورت کمی ضلالت ہے۔ پس جو شخص ان دونوں باتوں کو ملحوظ رکھے گا۔ نفس کو ادھر ادھر جانے نہ دے گا۔ (دوم) قلب کہ جس کی سلامتی اللہ تعالیٰ کی ایک بڑی نعمت ہے۔ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ اس قلب کا کام شوق اور محبت ہے۔ جس کا دل محبت الٰہی سے معمور ہو گیا وہ مراد کو پہنچ گیا۔ اس لیے اس سورۃ میں خدا نے اپنے سے ہر قسم کے محبت کے پیدا کرنے کا طریقہ بتلا دیا۔ محبت ذاتیہ لفظ الحمد للہ سے اور صفاتیہ رب العالمین الرحمن الرحیم مالک یوم الدین سے تلقین کر دی اور پھر ایاك نعبد و ایاك نستعین میں تو صاف صاف محبت پیدا کرنے کا طریقہ تعلیم کر دیا کہ جس سے محبان خدا اور خاصان کبریا سے ملنے کا بے حد شوق پیدا ہو۔

نالہ من برسانید بمرغان چمن
کہ ہم آواز شما در قفس سے افتادہ است

اور نہایت اشتیاق میں اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیھم کہا اب مومن کا دل محبت الٰہی سے ایسا بھر گیا کہ اور کی جگہ بھی نہ رہی۔ اس قلب کی حفاظت پر تمام انبیاء صدیقین تاکید کرتے چلے آئے ہیں۔

پاسبانی کن بسے در کوئے دل
زاں کہ دردانند در پہلوئے دل

واضح ہو: کہ جن چیزوں کی اصلاح اہل طریقت کے نزدیک زیادہ تر ملحوظ ہے وہ تین قوت ہیں۔ ایک شہوت ' دوسری غضب 'تیسری ہواء۔ قوت شہوت کو نفس بہیمی یا بہیمیت کہتے ہیں اور اس کی کمی زیادتی جسم کی کمی زیادتی سے ہوتی ہے اور غضب کو نفس سبعی اور سبعیت بھی کہتے ہیں یعنی درندہ پن اور ہوا کو نفس شیطانی اور شیطانیت بھی کہتے ہیں۔ لیکن سب میں زیادہ تیز ہوا ہے کہ جو جسم کے پژمردہ ہونے سے بھی کم نہیں ہوتی۔ اس کے بعد غضب ہے پھر شہوت۔ آپ یہ بھی جان چکے ہیں کہ جب یہ تینوں صلاحیت پر آتی ہیں تو عفت اور حلم وغیرہ صفات حمیدہ پیدا ہوتی ہیں کہ جن کو عدالت کہتے ہیں کہ جس کے سبب حضرت انسان ملائکہ سے فوقیت لے گئے اور خلیفہ بنائے گئے۔ مگر اسی طرح جب یہ قویٰ خراب ہوتے ہیں تو انسان کو درندہ 'گدھا 'شیطان بنا دیتے ہیں۔ پس شہوت سے حرص اور بخل پیدا ہوتا ہے اور غضب سے خود پسندی اور تکبر اور ہوا سے کفر اور بدعت اور اسی لیے کہتے ہیں کہ شہوت سے انسان اپنے نفس پر ظلم کرتا ہے اور غضب سے غیر پر اور ہوا تو خدائے تعالیٰ و تقدس کی جناب میں بغاوت کرنے کا باعث ہوتی ہے۔ اسی لیے اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ آیا اور اس کی بخشش نہیں۔ اس کے بعد غضب کا نتیجہ حقوق العباد میں دست اندازی ہے وہ بھی بہ نسبت گناہ شہوانی کے زیادہ ہے اور جب یہ چند اوصاف رزیلہ جمع ہو جاتے ہیں تو ان سے حسد پیدا ہوتا ہے کہ جو سخت مرض روحانی ہے۔ پس جب ان اوصاف رزیلہ کا علاج کلام الٰہی اور کتاب آسمانی میں ضرور تھا تو خدائے تعالیٰ نے اپنے کلام بالخصوص اس سورت میں بھی اس کا علاج نہایت عمدگی سے فرمایا۔ الحمد للہ رب العالمین میں سب سے بڑھ کر مرض حسد کا تدارک کیا۔ کس لیے کہ جب بندہ خدائے تعالیٰ کو رب العالمین خیال کرے گا اور ہر ایک نعمت کا مبدء وفیاض اور مالک اور عطا کنندہ اسی کو سمجھے گا تو پھر کسی کی نعمت دیکھ کر نہ جلے گا اور خدائے تعالیٰ کے فیض عام اور خوان بیدریغ کو دیکھ کر اس ناپاک خیال کو دل سے نکال دے گا۔ کیونکہ خدا کے دیے کو کون لے سکتا ہے ؟ اور پھر کس کس کی نعمت کا زوال چاہیے ایک دو نہیں بلکہ تمام عالم اس انعام سے مالا مال ہے اور بخل کا علاج بھی ملاحظہ رب العالمین سے بخوبی ہو جاتا ہے کیونکہ ہر نعمت کا پیدا کرنے والا خدا کو تصور کرے گا تو اس کی ملک میں بخل کرنا قبیح جانے گا اور غضب کو اپنی رحمت یاد دلا کر اور اپنا جلال اخروی دکھا کر الرحمن الرحیم مالک یوم الدین سے فرو کر دیا۔ کس لیے کہ جب مضمون رحمت دل پر آیا اور اس کے ساتھ خدا کی شان کبریائی دل میں سمائی تو غضب کافور ہوا اور خود پسندی کا علاج ایاک نعبد سے کر دیا۔ کس لیے کہ جب عاجزانہ خدا کے آگے جھکا تمام خود پسندی رخصت ہوئی

اور تکبر **ایاك نستعین** سے پست کر دیا۔ کس لیے کہ جب عاجزانہ ہر کام میں اس کی طرف ہاتھ پھیلانا بتلایا تو تکبر کو اڑادیا اور کفر و شرک وبدعت کو **اھدنا الصراط المستقیم** سے دور کیا۔ کس لیے کہ ہر امر میں میانہ پن کفر و بدعت کے منافی ہے پھر **غیر المغضوب علیھم** سے کفر کا بد نتیجہ دکھا کر ڈرادیا اور ولا الضالین سے اہل بدعت کا مآل کار بتلادیا۔ الغرض بسم اللہ الرحمن الرحیم میں تین اسمائے الٰہی سے ان تینوں بد صفات کو مٹایا کس لیے کہ جس نے اللہ کو جانا شیطان ہوا کو بھگادیا اور جس نے خدا کو جانا دل میں نرمی آئی۔ غضب و غصہ دور ہوا اور جس نے اس کی رحیمی کا لحاظ کیا اپنی جان حزیں کو شہوات کے ظلم سے محفوظ رکھا اور الحمد کی سات آیتوں میں ان سات خصلتوں کی اصلاح کر دی کہ جو ان تینوں سے پیدا ہوتی ہیں۔ جیسا کہ ابھی اوپر بیان ہوا۔ سبحان اللہ کیا کلام ہے۔ عیسائی حضرت مسیح (علیہ السلام) کے پہاڑی وعظ کو مکارم اخلاق کی تعلیم میں ہر جگہ قرآن کے مقابلہ میں پیش کیا کرتے ہیں۔ اگر انصاف فرما دیں تو یقیناً معلوم ہو جاوے کہ اس وعظ کو اس کلام سے کچھ بھی نسبت نہیں۔

علم حقیقت: کو بھی (کہ جو مکاشفہ روحانی ہی ہے) اس سورۃ میں بخوبی ذکر کر دیا۔ چنانچہ تمام اسرار ربوبیت کو الحمد للہ رب العالمین میں بھر دیا گویا کہ عارف کے دل پر اس جملہ میں یہ منکشف کر دیا کہ تمام عالم کی ہستی اور ہر چیز کا وجود اس کے وجود واجب کا پرتو اور اس آفتاب حقیقی کی شعاعیں ہیں۔ اس عالم کی جس چیز کو دیکھے گا تو مرتبہ ذات میں معدوم پائے گا۔ اور خود بھی فرماتا ہے **الم تر الی ربك کیف مد الظل**۔ کس لیے کہ جب عارف اس مضمون کا (کہ تمام خوبیاں اس ذات جامع الصفات کمالیہ کو جو کہ تمام عالموں کو ہر وقت پرورش اور تربیت کرتا ہے) مراقبہ کرے گا تو پھر اس کی چشم حقیقت بیں کے آگے اس کے سوا کچھ اور دکھائی نہ دے گا اور جب وہ اس مقام سے لے کر الرحمن الرحیم مالک یوم الدین تک تجلیات جلالیہ و جمالیہ کی سیر کرتا ہوا آوے گا تو اس کو مرتبہ علم الیقین حاصل ہو جائے گا۔ اور جب اس نور سے روح مسرور و منور ہو جائے گی تو تمام حجاب مرتفع ہو جائیں گے اور **ایاك نعبد و ایاك نستعین** کے مرتبہ میں عین الیقین حاصل ہو جائے گا اور اس مرتبہ میں لطائف خمسہ (نفس، قلب، روح، خفی اخفی، ضلال و استعانت و ہدایت و استقامت و انعام کے ملاحظہ سے) نہایت درجہ پر جاری ہو جاویں گی اور پھر ان کے ذریعہ سے ہر چیز کی حقیقت کماہی معلوم ہونے لگے گی اور حق الیقین کا مرتبہ نصیب ہو جائے گا اور جب سیر الی

اللہ سے فارغ ہو چکا تو سیر من اللہ شروع کی اور **اهدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیهم غیر المغضوب علیه ولا الضالین** میں امور آخرت اور اعمال کی حقیقت دریافت کرتا ہوا پھر وہیں لوٹ کر آ گیا تو **هو الاول هو الآخر** کی کیفیت منکشف ہو گئی۔

چونکہ باریک باتوں کے بیان کرنے کی میری قلم میں طاقت نہیں لہٰذا اسی پر بس کرتا ہوں۔ یہاں سے آپ کو اس دعوے کی تصدیق ہو گئی ہو گی کہ جس طرح بسم اللہ الرحمن الرحیم میں تمام الحمد کا مضمون ملخص ہے اسی طرح الحمد میں قرآن اور جمیع کتب سماویہ کا مضمون جمع ہے۔

(۴) خدائے تعالیٰ نے اجمالی طور پر اس سورۃ میں بیشمار وہ علوم جمع کر دیے کہ جن کو تمام انبیاء اپنی کتابوں میں عہد آدم سے لے کر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تک جمع نہ کر سکے چنانچہ یہ بات آپ کو دفعہ سابق سے بخوبی معلوم ہو گئی ہو گی کہ علم شریعت طریقت حقیقت جو دریائے ذخار ہیں اس سورت میں کس خوبی کے ساتھ مذکور ہیں مگر اس مسئلہ کی اور تشریح کرنی ضروری ہے۔ واضح ہو کہ بسم اللہ میں ذات اور بیشمار اسمائے الٰہی کی طرف اشارہ ہے اور الرحمن الرحیم میں خدا تعالیٰ کی صفات کمالیہ کی طرف اشارہ ہے اور الحمد میں ان نعمائے الٰہی کی طرف اشارہ ہے کہ جن کا بیان کرنا محال ہے خواہ وہ وجود آسمان و زمین اور عناصر اور کواکب اور انسان کی تندرستی اور اناج اور کپڑے اور چیزیں وغیرہ ہوں کہ جن کے متعلق ہزار ہا مسائل ہیں۔ چنانچہ منجملہ ان کے بدن انسان سے جو کچھ متعلق ہے تخمیناً پانچ ہزار مسئلے ہیں کہ جن کو اطبا بھی جانتے ہیں اور رب العالمین میں تربیت کی ہزار ہا اقسام کہ کیونکر تربیت ہوتی ہے۔ حیوانات 'نباتات 'جمادات کے اصناف و انواع ہی کی تربیت کو لکھا جاوے تو سینکڑوں کتابیں بنیں پھر عالم کے اقسام 'ارواح و اجسام 'شہودی و مثالی و اعراض و جواہر کا جاننا ہزاروں مسائل حکمت سے متعلق ہیں اور اس جملہ کی تفسیر لکھی جاوے تو صدہا کتابیں بنیں اور الرحمن الرحیم میں دنیا و آخرت کے متعلق وہ صدہا باتیں کہ جو انسان کی حالت سے متعلق ہیں اجمالاً مذکور ہیں۔ اور مالک یوم الدین میں ابدان سے جدا ہونے کے بعد نفوس کی بقا اور ان کی سعادت و شقاوت کی طرف اور وہاں کے عذاب و ثواب اور مرنے کے بعد زندہ ہونے اور نفخ صور اور وقوف عرصات و حساب و میزان و دوزخ و جنت کے درجات اور انبیاء و صدیقین و دیگر اولیاء کی شفاعت کی طرف اجمالاً اشارہ ہے کہ جن کے لیے دفتر درکار ہیں اور ایاک نعبد میں عبادت کے اقسام قلبی و قالبی مالی و بدنی کی طرف اشارہ ہے اور ان کے ارکان و

شروط کی طرف کہ جن کا ذکر کتب فقہ و سلوک و اوراد و اشغال کے رسائل میں ہے اور یہ بھی سینکڑوں مسائل مہمہ ہیں اور ایاك نستعین میں تمام معونتوں اور دنیا کی جمیع صنعتوں اور کل حرفوں کی طرف مجملاً اشارہ ہے۔ کس لیے کہ تمام پیشوں اور صنعتوں میں خدائے تعالیٰ سے اس کی مخلوقات کے ذریعہ سے استعانت ہے۔ پس ان صنعتوں اور پیشوں کے بیان کرنے کے لیے ایک دفتر چاہیے۔ تاکہ پورے طور پر استعانتِ الٰہی کا حال معلوم ہو۔ یہ ہزارہا مسائل اور بیشمار مباحث ہیں کہ جو اس کلمہ میں مندرج ہیں۔ اھدنا الصراط المستقیم میں تو اس قدر بیشمار مسائل علوم حکمیہ کی طرف اشارہ ہے کہ جن کا کچھ شمار ہی نہیں۔ کس لیے کہ دنیاوی امور بیاہ شادی 'مرنے جینے 'بیع و شرا 'لین دین وغیرہ معاملات میں صراط مستقیم بھی ایک دریائے بے کنار ہے اور اسی طرح اخلاق انسانیہ سخاوت و شجاعت و صبر و قناعت وغیرہا صراط مستقیم ہزارہا مسائل متعلق ہیں۔ پھر ہر امر میں صراط مستقیم کی ہدایت کے دو فریق ہیں ایک استدلال سے صراط مستقیم حاصل کرنا جیسا کہ مشائین کرتے ہیں پھر اور امور تو درکنار خاص ذات باری کے لیے عالم علوی و سفلی کا ہر ایک ذرہ شاہد عدل ہے کہ جو اس کی کمال ذات و تقدس صفات و عظمت قدرت پر زبان حال سے گواہی دے رہا ہے۔ کیا خوب کہا ہے کسی نے۔

وفی کل شییٍٔ لہ شاہد

یدل علی انہ واحد

دوسرا طریق انکشاف باطنی اور نور روحانی ہے کہ جو اشراقین کا ہے پھر یہ ہزارہا مسائل اور بیشمار علوم ہیں کہ جو اس ایک جملہ میں مجتمع کر دیے گئے ہیں۔ صراط الذین انعمت علیہم میں مباحث نبوات اور ولایت کی طرف اور انبیاء (علیہم السلام) کی شریعتوں اور ان کے عقائد اور حالات اور سرگزشت کی طرف اشارہ ہے کہ جو صدہا مسائل ملت و تاریخی واقعات سے متعلق ہیں۔ گویا اس جملہ میں تمام انبیاء اور ان کے پیرؤوں کی تاریخ اور ان کی شریعت مجملاً بیان کر دی۔ غیر المغضوب علیھم ولا الضالین میں تمام کفار اور مشرکین کے حالات اور کل بدعتیوں کی سرگزشت اور ان کے مذاہب باطلہ اور عقائد فاسدہ اور خراب چال و چلن کی طرف اشارہ ہے کہ جس کی تفصیل کے لیے ملل و نحل اور دبستان مذاہب وغیرہا صدہا کتابیں بھی کافی نہیں اور جن کی تاریخ عبرت انگیز بیشمار کتابوں میں نہیں آسکتی۔

الحاصل مبدء معاد ،ملت ،شریعت ،الٰہیات ،طبیعات ،تاریخ انبیاء وصلحاء ،مخالفین کے حالات وغیرہا بیشمار علوم خدائے تعالیٰ نے اجمالاً بترتیب اس سورۃ میں جمع کر دیے ہیں۔

(۵) دعا خدا اور بندہ میں ایک ایسا عمدہ ارتباط ہے کہ اس سے بڑھ کر پھر کوئی واسطہ نہیں۔ کس لیے کہ دعا میں دو باتیں ضرور ہوتی ہیں۔ ایک اپنی عاجزی اور فروماندگی کا اظہار اور کسی مقصود کا سوال۔ دوسرے خدائے تعالیٰ کی دل سے کامل عظمت اور اس کی جناب میں کامل درجہ کا اعتقاد کہ وہ ہر چیز پر بالخصوص میرے اس مقصد کے عطا کرنے پر قادر ہے۔ گویا دعا پوری عبودیت کا اظہار اور اس کی الوہیت کا اقرار ہے کہ جو دل سے اور زبان سے ادا کر رہا ہے اور اعضاء سے اس کی شہادت دے رہا ہے اور اسی لیے حدیث میں آیا ہے کہ دعا عبادت کا مغز ہے (رواہ الترمذی) اور یہ بھی آیا ہے کہ دعا سے زیادہ خدا کے نزدیک کوئی چیز بڑی نہیں (رواہ الترمذی وابن ماجہ) پس دعا جس طرح بندہ کی روح کو جنبش دیتی ہے اسی طرح رحمت الٰہی کو تحریک کرتی ہے جس سے خدا تعالیٰ یا تو اس دعا سے کسی مصیبت آیندہ کو ٹال دیتا ہے یا اس کام کے اسباب پیدا کر کے اس کو پورا کر دیتا ہے یا کبھی بطور خرق عادت بلا اسباب مقصد کو جس کے لیے دعا مانگی گئی ہے پورا کر دیتا ہے جیسا کہ انبیاء (علیہم السلام) اور اولیاء کرام کی دعا سے ظہور میں آیا جس کی شہادت کتب احادیث وسیر وروایت ثقافت دے رہی ہے اور یہی اجابت[1] ہے

[1] محرف القرآن اپنی تفسیر میں قواعد نیچریہ کے موافق صفحہ ۱۰ میں تحریر فرماتے ہیں:

قولہ۔ مگر لوگ دعا کے مقصد اور استجابت کا مطلب سمجھنے میں غلطی کرتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ جس مطلب کے لیے دعا کرتے ہیں وہ دعا سے حاصل ہو جائے گا اور استجابت کے معنی اس مطلب کا حاصل ہونا سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ غلطی ہے۔ حصول مطلب کے جو اسباب خدا نے مقرر کیے ہیں وہ مطلب تو انھیں اسباب کے جمع ہونے سے حاصل ہوتا ہے۔ مگر دعا نہ اس مطلب کے اسباب میں سے ہے اور نہ اس مطلب کے اسباب جمع کرنے والی ہے بلکہ وہ اس قوت کو تحریک دیتی ہے جس سے اضطراب میں تسکین ہوتی ہے اور ایسی کیفیت کا دل میں پیدا ہونا دعا کا مستجاب ہونا ہوتا ہے۔ انتہیٰ۔ ملخصاً

اقول۔ بیشک اصول نیچریہ کے مطابق نہ وہ اسے مطلب کے اسباب خدا پیدا کرنے پر قادر ہے نہ اس کو قدرت ہے کہ وہ بندہ کو اس کے عجز وزاری سے اس کا مطلب عطا کرے کس لیے کہ سرے سے نیچر کے نزدیک خدائے قادر کا وجود ہی مسلم نہیں ورنہ اسباب پیدا کرنے سے عجز کے کیا معنی اور بطور

اور چونکہ دعا اعلیٰ عبادت ہے تو ضرور ہوا کہ اس کے آداب تعلیم فرمائے جائیں۔ پس اس لیے اس سورۃ میں تعلیم کر دیا کہ اول خدائے تعالیٰ کی ثناوصفت کرنی چاہیے جیسا کہ الحمد سے لے کر مالک یوم الدین تک پایا جاتا ہے اور پھر اپنا اخلاص اور نیاز ظاہر کرنا چاہیے جیسا کہ ایاك نعبد وایاك نستعین سے ظاہر ہے پھر دعا کرنی چاہیے جیسا کہ اھدنا الصراط المستقیم الخ سے ظاہر ہے۔ مگر ایسے بادشاہ حقیقی سے دعا بھی وہ کرنی چاہیے کہ جو تمام دینی و دنیاوی امور کو حاوی ہو جیسا کہ الصراط المستقیم الخ سے ظاہر ہے اور اسی حکمت بالغہ سے ہر نماز میں دوبار اس سورۃ کا پڑھنا واجب ٹھہرا خدا نے اپنے بندوں کو کیا ہی عمدہ دعا تعلیم فرمائی ہے۔

(٦) تعلیم کی یہ خوبی ہے کہ ایک بار اجمالاً تمام مراتب ہدایت تعلیم کر دے پھر تدریجاً ان کی تفصیل کرے کیونکہ اجمال کے بعد تفصیل دل پر نقش ہوتی ہے اور اس اجمالی فہرست پر عمل کرنا اور ان مضامین کو اس مختصر متن سے دریافت کرنا بھی زیادہ تر آساں ہوتا ہے پس خدائے تعالیٰ نے اس سورۃ مقدسہ میں یہی کیا کہ تمام الہامی مضامین کو مجملاً مجتمع کر دیا پھر باقی قرآن مجید میں ان کی تفصیل فرمائی چنانچہ (١) خداوند تقدس وتعالیٰ کی ذات وصفات کی بابت جس قدر آیات ہیں جیسا کہ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ الآیت اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ وَاِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٍ ، لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ یُدْرِكُ الْاَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ وَلَیْسَ كَمِثْلِهٖ شَیْءٌ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ وَلَمْ یَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدًا وغیرہا من الآیات اور (٢) اسی طرح جو کچھ ابتدائے آفرینش آسمان و زمین اور حجر و شجر کے متعلق بیان ہے جیسا کہ قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِیْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِیْ یَوْمَیْنِ الایات وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ثُمَّ اسْتَوٰٓی اِلَی السَّمَآءِ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ اور (٣) اسی طرح جو کچھ اس کی علامات قدرت اور دنیا کی نعمتوں کی بابت مذکور ہے جیسا کہ اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ وَفِیْ خَلْقِكُمْ مَا یَبُثُّ مِنْ دَآبَّةٍ اٰیٰتٌ لِّقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ

وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ رِزْقٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَتَصْرِيفُ الرِّيَاحِ آيَاتٌ

خرق عادات دعا پر مطلب حاصل کرنے ناچار ہونے کے کی کیا وجہ بلکہ ان کے نزدیک خدا ایک فرضی چیز ہے کہ جس کو باطبع اوہام عامہ ہونے کے وجود کی طرح اختراع کرتے ہیں اور جس طرح لڑکوں کو ہوّے سے ڈرانے کے یہ معنی ہیں کہ ان میں ایک کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح دعا کے مستجاب ہونے کے یہ معنی ہیں کہ بیوقوفوں کو کچھ تسکین سی ہو جاتی ہے۔ العیاذ باللہ مگر یہ معنی عقل سلیم اور اصول ادیان سماویہ بالخصوص قواعد اسلام کے نزدیک بالکل مردود و مطرود ہے کس لیے کہ جب ادلۃ عقلیہ و نقلیہ سے عالم کے بانی کا ایک ایسا وجود تسلیم کر لیا گیا ہے کہ جس کی نہ ابتدا ہے نہ انتہا اور وہ ہر ممکن پر قادر ہے۔ اور ممکنات پر تصرف کرنے سے کوئی چیز اس کو نہیں روک سکتی اور دعا کے بعد اسباب کا پیدا کر دینا بلکہ مطلب کا حاصل کر دینا یہ سب کچھ اس قادر مطلق کے نزدیک ممکن ہے تو پھر اس تصرف سے کس کا ہاتھ اس کو روک سکتا ہے۔ اور نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بیشمار احادیث میں دعا سے مطلب کا حاصل ہونا پایا جاتا ہے۔ چنانچہ انھیں حضرت ترمذی نے کہ جن کی روایت کو مفسر صاحب آگے چل کر لکھتے ہیں۔ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے روایت کیا ہے کہ حضرت فرماتے ہیں ما من احد ادعوا بدعاء الا ما اتاء اللہ اسال او کف عنہ السوء مثلہ ما لم یدع باثم وقطیعۃ رحم (رواہ الترمذی) ”کہ جو شخص خدا سے دعا کرتا ہے خدا تعالیٰ اس کا مطلب عطا کرتا ہے اس کی مثل اس سے برائی دور کر دیتا ہے جب تک کہ گناہ اور قطعہ رحم کی دعا نہ مانگے“۔ وعن ابن عمر قال قال رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان الدعاء ینفع مما نزل ومما ینزل فعلیکم عباد اللہ بالدعاء (رواہ الترمذی ورواہ احمد عن معاذ بن جبل کہ ”دعا ہر حال میں بہتر ہے۔ بلائے نازل شدہ میں صبر واجر دیتی ہے اور جو ہنوز نازل نہیں ہوئی ہے اس کو دفع کرتی ہے“ وعن سلیمان الفارسی قال قال رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) لا یرد القضاء الا الدعاء رواہ الترمذی ”کہ دعا کے سوا قضا کو اور کوئی چیز نہیں رد کرتی“۔

اسی طرح تمام کتب سماویہ میں پایا جاتا ہے۔ مگر چونکہ اکثر لوگ اس فریق کے وہ ہیں کہ جن کو امور دنیا میں کامیابی ہے اس لیے وہ دعا کے اثر کو فضول جانتے ہیں اور اکثر اہل دنیا ایسا ہی جانا کرتے ہیں۔

لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ ۔ اِنَّ اللّٰہَ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخۡرَجۡنَا بِہٖ ثَمَرٰتٍ مُّخۡتَلِفًا اَلۡوَانُہَا الآیات اور انھیں اقسام کی جملہ آیات سب الحمدللہ رب العالمین الرحمن الرحیم کی تفصیل اور شرح ہے جیسا کہ اوپر بیان ہوا اور (۴) جو کچھ انسان کی موت اور موت کے بعد عذاب ثواب اور دنیا کی بے ثباتی اور نفخ صور اور احوال قیامت اور دوزخ اور جنت کی کیفیت کے متعلق قرآن میں مذکور ہے جیسا کہ کُلُّ نَفۡسٍ ذَآئِقَۃُ الۡمَوۡتِ ۔ اِنَّكَ مَیِّتٌ وَّاِنَّھُمۡ مَّیِّتُوۡنَ ۔ یٰۤاَیُّہَا الۡاِنۡسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰی رَبِّكَ كَدۡحًا فَمُلٰقِیۡہِ الایۃ ۔ اِنَّمَا مَثَلُ الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا كَمَآءٍ اَنۡزَلۡنٰہُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخۡتَلَطَ بِہٖ نَبَاتُ الۡاَرۡضِ ○

وَنُفِخَ فِی الصُّوۡرِ فَصَعِقَ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنۡ فِی الۡاَرۡضِ اِلَّا مَنۡ شَآءَ اللّٰہُ ثُمَّ نُفِخَ فِیۡہِ اُخۡرٰی فَاِذَا ھُمۡ قِیَامٌ یَّنۡظُرُوۡنَ وَاَشۡرَقَتِ الۡاَرۡضُ بِنُوۡرِ رَبِّہَا وَوُضِعَ الۡكِتٰبُ وَجِآیۡٓءَ بِالنَّبِیّٖنَ وَالشُّہَدَآءِ وَقُضِیَ بَیۡنَہُمۡ بِالۡحَقِّ الآیات ۔ یہ آیات اور سورۃ رحمن وغیرہا کہ جو جنت اور دوزخ کے حالات سے پر ہیں اور وہ آیات کہ جن میں دیدار الٰہی کا ذکر ہے ۔ سب مالک یوم الدین کی تفسیر اور تفصیل ہے اور (۵) اسی طرح جس قدر آیات میں نماز وروزہ ، حج وزکوۃ وصدقہ وخیرات اور خدا کے ساتھ اخلاص ومحبت اور دل سے اس کی اطاعت وفرمان برداری کا ذکر ہے جیسا کہ اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّكٰوۃَ وَاَتِمُّوا الۡحَجَّ وَالۡعُمۡرَۃَ لِلّٰہِ الآیۃ وَیَبِیۡتُوۡنَ لِرَبِّہِمۡ سُجَّدًا وَّ قِیَامًا ۔ وَبِالۡاَسۡحَارِ ھُمۡ یَسۡتَغۡفِرُوۡنَ وَفِیۡۤ اَمۡوَالِهِمۡ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالۡمَحۡرُوۡمِ وَاَقۡرِضُوا اللّٰہَ قَرۡضًا حَسَنًا ، كُتِبَ عَلَیۡكُمُ الصِّیَامُ ، وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ ، وَاَطِیۡعُوا اللّٰہَ ، وَاذۡكُرُوا اللّٰہَ كَثِیۡرًا لَّعَلَّكُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ یہ سب ایاك نعبدوایاك نستعین کی تفصیل ہے اور (۶) اسی طرح جو کچھ باہمی معاملات میں نیک چلنی اور لوگوں سے نیکی سے پیش آنے کی بابت اور گناہوں سے بچنے کی بابت اور اخلاق حمیدہ کی بابت اور ہر امر میں میانہ روی کی بابت قرآن میں مختلف سورتوں میں مختلف عنوانوں سے وارد ہوا ہے جیسا کہ اِدۡفَعۡ بِالَّتِیۡ ھِیَ اَحۡسَنُ "کہ بدی کے مقابلہ میں نیکی کرو"۔ (حضرت مسیح (علیہ السلام) نے تو یہی فرمایا تھا کہ جو تیرے ایک گال پر طمانچہ مارے تو اس کی طرف دوسرا گال بھی کر دے) مگر سید المرسلین کی معرفت اس سے بھی بڑھ کر یہ تعلیم دی گئی کہ بدی کے بدلہ میں نیکی کرو) وَذَرُوۡا ظَاهِرَ الۡاِثۡمِ وَبَاطِنَهٗ اَلَّذِیۡنَ یَجۡتَنِبُوۡنَ كَبٰٓئِرَ الۡاِثۡمِ وَالۡفَوَاحِشَ وَالَّذِیۡنَ اِذَاۤ اَنۡفَقُوۡا لَمۡ یُسۡرِفُوۡا وَلَمۡ یَقۡتُرُوۡا وَكَانَ بَیۡنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ، وَالَّذِیۡنَ لَا یَدۡعُوۡنَ مَعَ اللّٰہِ اِلٰـہًا

اُخِرُ ،وَلاَ یَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰہُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلاَ یَزْنُوْنَ الآیات یہ سب اھدنا الصراط المستقیم کی تفسیر ہے اور (۷) اسی طرح جو کچھ انبیاء (علیہم السلام) اور ان کے پیرؤوں کے محامد اور ان پر ملائکہ پر ایمان لانے کی بابت اور ان کے طریقہ کی بابت جو کچھ مختلف سورتوں میں آیا ہے جیسا کہ سورۃ قصص اور سورۃ انبیاء اور سورۃ یوسف اور سورۃ نوح اور سورۃ شعراء اور سورۃ نمل اور سورۃ یونس اور سورۃ مومنون اور سورۃ طٰہٰ اور سورۃ مریم اور سورۃ مائدہ اور سورۃ کہف میں مذکور ہے۔ سب صراط الذین انعمت علیھم کی تفصیل ہے اور (۸) اسی طرح جس قدر سرکشوں کے قصے اور ان پر عذاب الٰہی نازل ہونا اور قہر خدا کا نازل ہونا قرآن کریم میں مذکور ہے۔ جیسا کہ سورۃ مذکور میں فرعون وہامان اور قارون اور قوم عاد و ثمود کا قصہ کہ جو سورۃ اعراف وغیرہ میں بھی مذکور ہے اور اسی طرح اور گمراہوں اور نافرمانوں اور کافروں کے حالات عبرت انگیز جس قدر قرآن میں مذکور ہیں سب غیر المغضوب علیہم ولا الضالین کی تفسیر و تشریح ہے۔ یہ مضامین اس خوبی سے کسی کتاب میں نہیں اور جو کوئی دعویٰ کرے تو دکھادے۔ وید ،دساتیر ،انجیل ،توراۃ ،سب اس خوبی سے معرا ہیں۔

(۹) جو کچھ بلاغت اور فصاحت اور سلاست الفاظ (کہ جس کا مزہ اہل زبان لیتے ہیں) اس سورۃ میں ہے وہ بیان سے باہر ہے۔ ازاں جملہ یہ کہ الحمد للہ کہا۔ نحمد اللہ یا احمد اللہ جملہ فعلیہ نہ کہا دو وجہ سے۔ اول یہ کہ جملہ فعلیہ تجدد اور حدوث پر دلالت کرتا ہے اور وہ اس کے علوِّشان کے مناسب نہیں بخلاف اسمیہ کے کہ جو دوام واستمرار پر دلالت کرتا ہے۔ (دوم) یہ کہ خدا کی حمد کوئی کیا کر سکتا ہے لاکھوں نعمتیں ہیں اور ہزاروں خوبیاں پس اس کی حمد کا دعویٰ کرنا چھوٹا منہ بڑی بات ہے۔ اس لیے الحمد للہ کہہ دیا کہ حمد خدا کے لیے ہے۔ ازاں جملہ صنعت التفات ہے کہ الحمد للہ سے لے کر مالک یوم الدین تک تو غائبانہ گفتگو تھی۔ پھر ایاک نعبد وایاک نستعین میں مخاطب بنا کر کلام کیا اور پھر اھدنا الصراط الخ میں صیغہ متکلم بولا اور یہ صنعت زبان عرب میں نہایت محمود ہے تا کہ ایک طرح کے کلام سے دل پر ملال نہ آجائے جیسا کہ امراء القیس عرب کا مشہور شاعر اپنے ان اشعار میں اس صنعت کو استعمال کرتا ہے۔

تطاول لیلک بالاثمد

ونام الخلی ولم ترقد

وبات وباتت لہ لیلۃ

کلیلۃ ذی العائر الدمد

وذلک من بناء جائنی

وخبرتہ عن ابی الاسود

کلام کے اسلوب کے بدلنے سے نشاط خاطر پیدا ہوتا ہے کہ جس کو ہر صاحب ذوق سلیم جانتا ہے اور یہ کلام میں ایسا ہے کہ جیسا کھانے میں نمک اور انھیں خوبیوں سے عرب قرآن سن کر وجد میں آتے اور آنکھوں سے آنسو بہاتے تھے۔ روایت ہے کہ ہجرت سے پہلے مکہ میں جب چند لوگ ایمان لائے تھے اور مشرکین کے خوف سے بیچارے ایماندار بلکہ سید ابرار پوشیدہ رہتے تھے اور جس طرح شہر یروشلم میں حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اور ان کے حواریوں پر ہر طرف سے مار مار اور طعن و تشنیع کی بوچھاڑ تھی یہی حال مکہ میں حضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور صحابہ جانباز کا تھا مگر حضرت ابو بکر صدیق (رض) چونکہ بڑے تاجر تھے لوگ ان کا خیال کرتے تھے 'اس لیے گھر سے باہر ایک چبوترہ تھا اس پر بیٹھ کر نہایت درد سے قرآن مجید پڑھتے اور اس کے اثر جانگداز سے شمع کی طرح روتے تھے ایک تو قرآن مجید کے وہ روح کو کپکپا دینے والے الفاظ 'نئی نئی باتیں رستہ چلنے والی عورتوں اور مردوں اور بڈھوں اور بچوں کے کان میں پڑنا اس پر صدیق اکبر کا درد اور اصلی لب ولہجہ سے پڑھنا

وصف اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا

بن گیا رقیب آخر تھا جو راز داں اپنا

پھر تو جو سنتا تھا کھڑا ہو کر سر دھنتا تھا۔ ایک اژدھام اور مجمع خاص و عام ہو جاتا تھا۔ جو سخت منکر ننگی تلوار لے کر مارنے آتے تھے آنکھوں سے آنسو پونچھتے جاتے تھے جس کا یہ اثر ہوا کہ ہر روز بہت سی عورتیں اور بہت سے مرد ایمان لاتے اور اس پر مخالفوں کی ہر قسم کی اذیت اٹھاتے تھے۔ کوئی دھوپ میں چومیخا کیا جاتا ہے کسی پر کوڑے پڑ رہے ہیں کسی کو مار پیٹ رہی ہے۔ کوئی جلاوطن کیا جاتا ہے کوئی جان سے مارا جاتا ہے۔ میاں سے بی بی اس بارے میں لڑ رہے ہیں میاں بی بی کو سمجھا رہا ہے مگر دل میں قرآن کا اثر روز افزوں اور عشق الٰہی میں ہر دم حالت دگرگوں ہے۔ نہ کسی قسم کی

تکلیف کا ڈر نہ جلاوطنی کا خوف و خطر۔ یہ حال دیکھ کر لوگوں نے یہ کہا کہ ابو بکر جادوگر ہے جانے یہ کیا پڑھتا ہے کہ جو نہایت پر اثر ہے۔ لہٰذا صدیق اکبر (رض) کو بھی مکہ سے نکال دیا۔ الغرض قرآن مجید کے اس اثر بے حد سے تمام عرب میں کھلبلی پڑ گئی۔ جہاں چند صحابہ نے جاکر قرآن کی منادی کی وہیں ہزاروں سرکش اور بت پرست سن کر لوٹ پوٹ ہو گئے۔ اور جب چند صحابہ ملک حبشہ میں گئے اور وہاں کے بادشاہ نجاشی نے کہ جو اہل کتاب کا بڑا عالم تھا قرآن سنا اس کا اور اس کے ارکان دولت کا دل ایمان سے بھر گیا اور سب ارباب حبشہ بے اختیار رونے لگے۔ اسی طرح جہاں قرآن پہنچا وہیں اس نے اپنا اثر دکھایا۔ اس لیے چند سال میں شرق سے غرب تک اکثر سرسبز سلطنتوں میں اسلام پھیل گیا۔ افسوس متعصب پادری شیوع اسلام تلوار کے زور سے بتا کر اسلام پر عیب لگاتے ہیں۔ اب ہم قرآن کا مقابلہ اور کتابوں سے کرتے ہیں اور الحمد کی سات آیتوں کے مقابلہ میں ہر کتاب کے سات جملہ لکھ کر دکھاتے ہیں۔

مقابلہ

رات محفل میں ہر کامہ پارہ گرم لاف تھا
صبح کو خورشید جب نکلا تو مطلع صاف تھا

توراۃ

زبُور

دساتیر

رگوید

انجیل

قرآن مجید

کہ جس کو بقول اہل کتاب حضرت موسیٰ کے صدہا سال بعد علمائے یہود نے جمع کیا اور جس طرح کوئی کسی مردے کی ہڈیاں جمع کر کے نام اس شخص کا رکھے اسی طرح اس مجموعہ کا نام توراۃ رکھا۔

مطبوعہ مرزاپور۔ نارتھ انڈیا ۱۸۶۸ء

بقول اہل کتاب اس کے مصنف کا اب تک صحیح پتہ نہیں کہ حضرت داؤد (علیہ السلام) یا کوئی اور شخص ہے۔

مطبوعہ مطبع مذکور

کہ جن کو ساسان پنجم نے پاژندی زبان سے دری میں ترجمہ کیا

مطبوعہ مطبع سراجی دہلی ۱۳۸۰ھ

کہ جس کو بیاس جی شاگرد زردشت نے لوگوں کے منتر لے کر جمع کیا ترجمہ لچھمن داس دہلوی

مطبوعہ دہلی ۱۸۸۲ء

بقول نصاریٰ چار شخصوں متی۔ مرقس۔ لوقا۔ یوحنا نے حضرت مسیح کے بعد تاریخ کے طور پر ان کے حالات کو جمع کیا۔

مطبوعہ مرزاپور ۱۸۷۰ء

عرب میں شہر مکہ مدینہ میں جناب محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) خاتم الانبیاء پر بواسطہ جبرائیل (علیہ السلام) خدا کی طرف سے آیا بلا تغیر حرف اہل اسلام میں موجود ہے۔

باب اول

ابتدا میں خدا نے آسمان کو اور زمین کو پیدا کیا۔

اول زبور

مبارک وہ آدمی ہے جو شریروں کی صلاح پر نہیں چلتا اور خطاکاروں کی راہ پر کھڑا نہیں رہتا اور ٹھٹھا کرنے والوں کے جلسہ میں نہیں بیٹھتا

پناہم بہ یزداں از منش خوئی بد وزشت وگمراہ کنندہ وبراہ برندہ ورنج دہندہ وآزار رسانندہ

اگنی

میں دیوتا کی فیوم کا بڑا اگروکار کن اور بڑے دیوتاؤں کو نذریں پہنچانے والا اور بڑا اثروت والا ہی مہما کرتا ہوں یعنی میں آگ کی ستائش کرتا ہوں۔

یسوع مسیح ابن داؤد ابن ابرہام کا نسب نامہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان اور رحم والا ہے الحمد للہ رب العالمین سب خوبیاں اللہ کو کہ جو تمام عالم کا پرورش کرنے والا ہے۔

(۲) اور زمین ویران اور سنسان تھی اور گہراؤ کے اوپر اندھیرا تھا اور خدا کی روح پانیوں پر جنبش کرتی تھی

(۲) بلکہ خداوند کی شریعت میں مگن رہتا اور دن رات اس کی شریعت میں سوچا کرتا ہے۔

(۲) بنام ایزد بخشایندہ بخشایشگر مہربان داد گر۔

(۲) ایسا ہو کہ اگنی جس کی مہا زمانہ قدیم اور زمانہ حال کے رشی کرتے چلے آئے ہیں دیوتاؤں کو اس طرف متوجہ کرے۔

(۲) ابراہیم سے اسحاق اور اسحاق سے یعقوب پیدا ہوا اور یعقوب سے یہوداہ اور اس کے بھائی پیدا ہوئے۔

(۲) الرحمٰن الرحیم۔ جو نہایت مہربان اور رحیم ہے۔

(۳) اور خدا نے کہا کہ اجالا ہو اور اجالا ہو گیا۔

(۳) سو وہ اس درخت کی مانند ہو گا جو پانی کی نہروں

(۳) بنام یزداں

(۳) اگنی کے وسیلہ سے پوجاری کو ایسی آسودگی

(۳) یہودہ سے پھارس اور زارح تمر کے پیٹ

(۳) مالک یوم الدین اور جزا کے دن کا مالک ہے۔

کے کنارے لگایا جائے اور اپنے وقت پر میوہ لاوے جس کی پتے مرجھائے نہیں اور اپنے ہر کام میں پھولتا پھلتا رہے گا۔

حاصل ہوتی ہے جو روز بروز بڑھتی جاتی ہے اور جو شہرت کا سرچشمہ اور انسان کے نسل کی بڑھانے والی ہے۔

سے پیدا ہوئے اور پھارس سے حصروم پیدا ہوا اور حصروم سے آرام پیدا ہوا

(۴)اور خدا نے اجالے کو دیکھا کہ اچھا ہے اور خدا نے اجالے کو اندھیرے سے جدا کیا۔

(۴)شریر ایسے نہیں بلکہ وہ بھوسی کی مانند ہیں جسے ہوا اڑالے جاتی ہے۔

(۴)ایں بود ایزد نتواں دانست چناں کہ ہست او کہ یارو (یعنی حقیقت وجود خدائے تعالیٰ کو سوائے اس کے اور کوئی نہیں جان سکتا)۔

(۴)اے اگنی یک جس کو کوئی نہیں روک سکتا اور جس کی تو ہر طرف سے رکھشا کرنے والا ہے تحقیقاً دیوتاؤں کو پہنچتا ہے۔

(۴)اور آرام سے عمیند اب پیدا ہوا اور عمیند اب سے نحسون پیدا ہوا اور نحسون سے سلمون پیدا ہوا

(۴)ایاک نعبد وایاک نستعین ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔

(۵)اور خدا نے اجالے کو دن کہا اور اندھیرے کو رات کہا سو شام اور صبح پہلا دن ہوا۔

(۵)سو شریر عدالت میں کھڑے نہ ہوویں گے نہ خطاکار صادقوں کی جماعت میں

(۵)ہستی ویکتائی وکسی سراسر فروزہا آوند گوہر اوست وازوبیرون نیست (یعنی اس کی ہستی اور تمام صفات اس کی ذات میں ہیں)

(۵)ایسا ہو کہ اگنی جو نذرون کا پہچاننے والا اور علم کا حاصل کرنے والا اور سچا نامور دیوتا ہے مع دیوتاؤں کے یہاں آئے۔

(۵)اور سلمون سے بوغر راجاب کے پیدا ہوا اور بوغر سے عوبید دوت کے پیٹ سے پیدا ہوا اور عوبید سے یسنی پیدا ہوا۔

(۵)اھدنا الصراط المستقیم ہم کو سیدھی راہ پر چلا۔

(۶)اور خدا نے کہا کہ پانیوں کے بیچ فضا ہووے اور پانیوں کو پانی سے جدا کرے۔

(۶)کیونکہ خداوند صادقوں کی راہ جانتا ہے پر شریروں کی راہ نیست ونابود ہوگی۔ (یہاں تک اول زبور تمام ہوا)

(۶)خبر آغاز وانجام وانباز ودشمن ومانند دیار وپدر ومادر وزن وفرزند وجائے وسوے وتن وتن آسا وتنانی ورنگ و بوست (یعنی خدائے تعالیٰ ابتدا وانتہا دشمن اور شریک اور مادر وپدر جسم ورنگ وبو سے پاک ہے)

(٦)اے اگنی جس قدر تیرے سے ہو سکے اپنے نذر دینے والے کو فائدہ پہنچا۔ وہ یقینا تیرے پاس آئے۔ اینگر اور پس آئے گا۔

(٦)اور یسیٰ سے داؤد بادشاہ پیدا ہوا اور داؤد بادشاہ سے سلیمان اس سے جو اریاہ کی جورو تھی پیدا ہوا۔

(٦)صراط الذین انعمت علیھم راہ ان لوگوں کی کہ جن پر تو نے انعام کیا۔

(٧)تب خدا نے فضا کو بنایا اور فضا کے نیچے پانیوں کو فضا کے اوپر کے پانیوں سے جدا کیا اور ایسا ہی ہو گیا

(٧)زندہ و دانا و توانا و بے نیار و داد گر دبر شنودن و دیدن و بودن آگاہ است (یعنی خدا زندہ و دانا و لا شریک اور سنتا اور خبر دار ہے۔

(٧)اے اگنی ہم ہر روز صبح اور شام اطاعت کے ساتھ تیرا و بیان کر تیرے پاس آتے ہیں۔

(٧)اور سلیمان سے رحبعام پیدا ہوا اور رحبعام سے ابیاہ اور ابیاہ سے آسا پیدا ہوا۔

(٧)غیر المغضوب علیھم والا الضالین نہ ان کی جن پر غضب نازل ہوا نہ گمراہوں کی۔ آمین۔

اس کے بعد بطرز حکمائے یونان خدائے تعالیٰ سے عقل اول کا پیدا ہونا اور اس سے عقل دوم اور نویں آسمان کا پیدا ہونا لکھا ہے اور اسی طرح آسمانوں کے عدم خرق والتیام پر دلائل لایا ہے۔ مگر اس کلام میں بھی چند نظر ہیں (ا) یہ کہ سب ترجمہ ساسان پنجم کا ہے کہ جس نے زمانہ اسلام کو بھی دیکھا ہے۔ اگر اس نے اہل اسلام کی تقلید سے صفات باری میں کچھ بیان کیا ہو تو کچھ تعجب نہیں۔ چنانچہ اعوذ باللہ اور بسم اللہ کا ترجمہ شاہد عدل ہے۔

اس سورۃ کو مع ان تمام اسرار کے ملاحظہ کرنا چاہیے کہ جو اوپر بیان ہوئے اور ان کے سوا اور بیشمار اسرار ہیں کہ جن کو میں نہیں جانتا اور جانتا ہوں تو بیان کرنے سے عاجز ہوں کہ جن کو اولیائے امت اور اہل باطن جانتے ہیں وہ سب اسرار ان لفظوں سے ذرا تامل کرنے سے بے ساختہ منکشف ہوتے چلے جاتے ہیں۔ فقط

توراۃ زبور دساتیر وید انجیل

(٨)اور خدا نے فضا کو آسمان کہا سو شام اور صبح دوسرا دن ہوا۔

(٩)اور خدا نے کہا کہ آسمان کے نیچے کے پانی ایک جگہ جمع ہو ویں کہ خشکی نظر آئے اور ایسا ہی ہو گیا۔

(۱۰)اور خدا نے خشکی کو زمین کہا اور جمع ہوئے پانیوں کو سمندر کہا(یہاں سے ۲۶ آیت تک زمین کی گھاس اور جاندار اور باقی دنوں کا بیان

یہاں بھی کچھ کلام ہے۔

(۱) یہ کہ اس میں کچھ شک نہیں کہ یہ کلام عمدہ ہے اور اس کو الہامی کہہ سکتے ہیں مگر اس میں جو کچھ ہے صرف شریعت پر عمل کرنے کی تاکید ہے۔

مگر جس قدر تاکید اور جو خوبی اھدنا الصراط المستقیم الخ میں ہے کہ شریعت کے نتیجہ کو مشاہدہ کرادیا ہے)اس میں دسواں حصہ بھی نہیں علاوہ اس کے اور باقی مضامین سورۃ الحمد کے مقابلے میں تو کچھ بھی اس زبور میں نہیں۔ پھر جو اس کو کلام الٰہی کہتے ہیں ان کو ضرور ہے کہ سورۃ الحمد کو بھی کلام الٰہی کہیں

(۲) یہ کہ جن کتابوں کو ہم غیر الہامی کہتے ہیں ان سے یہ مراد ہرگز نہیں کہ ان میں کوئی بات بھی حق نہیں اور یہ کیونکر ہو سکتا ہے۔ شاید خدا نے ایران میں بھی انبیاء بھیجے ہوں اور ان پر

کتاب نازل کی ہو اور پھر ان کی کتابوں اور دین میں تحریف ہوگئی ہو(جیسا کہ توراۃ اور انجیل میں ہوئی) لیکن اس مضمون کو الحمد للہ رب العالمین الرحمن الرحیم مالک یوم الدین سے کچھ بھی نسبت نہیں کس لیے کہ الحمد میں برہان تربیت ہے خدا تعالیٰ کی ذات اور جملہ صفات کا کامل ثبوت اور ہر نقص

(۸)اے اگنی جوتی سروپ یک کی رکشا کرنے والی ' دوستی کو فروغ دینے والی اور اپنے مکان میں کثیر ہونے والی ہم تیرے پاس آتے ہیں۔

(۹)اے اگنی ایسی کرپا کر کہ ہم تجھ تک آسانی سے پہنچ سکیں یہ جیسے فرزند باپ کے پاس جب چاہے جا سکتا ہے ہماری بھلائی کے واسطے ہمیشہ ہمارے ساتھ رہو۔

یہ بات تو ظاہر ہے کہ اس کلام کو الحمد سے کچھ بھی نسبت نہیں بلکہ یہ سراسر توحید اور خدا پرستی کے مخالف ہے شرک کی برائی اور

(۸)اور آسا سے یہوسفط پیدا ہوا اور یہوسفط سے یورام پیدا ہوا اور یورام سے غریاہ پیدا ہوا۔

(۹)اور غریاہ سے یونام پیدا ہوا اور یونام سے آخز پیدا ہوا اور آخز سے خزقیاہ پیدا ہوا

(۱۰)اور خزقیاہ سے منسّی پیدا ہوا اور منسی سے امون پیدا ہوا اور آمون سے یوسیاہ پیدا ہوا۔

ہے۔

(۲۶)تب خدا نے کہا کہ ہم انسان کو اپنی صورت اور اپنی مانند بنادیں۔ الخ

(۲۷)اور خدا نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا الخ (باب دوم)

(۲۸)اور خدا نے عدن میں پورب کی طرف سے ایک باغ لگایا اور آدم کو جس نے اسے بنایا تھا وہاں رکھا۔ الخ

(۱۰)اور عدن سے ایک ندی باغ کے سیر اب کرنے کو نکلی اور وہاں سے تقسیم ہو کے چار سرے نہروں کے بنے۔

(۱۱)پہلے کا نام فیسون جو حویلہ کی ساری زمین کو گھیرتی ہے وہاں سونا ہوتا ہے۔

(۱۲)اور اس زمین کا سونا اچھا ہے اور وہاں موتی بھی ہیں۔

(۱۳)دوسری نہر کا نام جیحون ہے جو کوش کی ساری زمین کو گھیرتی ہے۔

(۱۴)اور تیسری نہر کا نام دجلہ ہے جو آسور کی پورب جاتی ہے۔

(۱۵)اور چوتھی نہر کا نام ذات ہے الخ۔ اگرچہ اس توراۃ موجودہ میں اصلی توراۃ کی بہت سی باتیں ہیں کہ جن کا ورنہ انصاف سے بعید ہے۔

(۲)یہ کہ اس کے مولف اور ملہم کا اب تک تحقیق حال معلوم نہیں کہ کون ہے آیا حضرت داؤد ہیں یا کوئی اور۔ جو حضرت داؤد ہوں تو ان کی نسبت حموئیل کی دوسری کتاب کی ۱۱ باب میں اوریا کی جورو سے زنا کرنا لکھا ہے۔ پھر جب انھوں نے خود شریعت پر عمل نہ کیا تو ان کی بات کا کیا اعتبار رہا؟

(۳)عیسائیوں کے نزدیک تو یہ زبور بالکل لغو ہونی چاہیے کس لیے کہ پولوس نے کہ جو ان کے نزدیک بڑا رسول ہے اپنے اس خط میں کہ جو گلتیون کو لکھا ہے اور جس کو عیسائی کلام الٰہی جانتے ہیں اس کے تیسرے باب میں شریعت پر چلنے والے کو بلکہ خود عیسیٰ (علیہ السلام) کو ملعون لکھتا ہے۔

چنانچہ اس کے دس و گیارہویں و بارہویں جملہ میں اس کی تصریح ہے پھر اس کے بموجب تو یہ زبور کچھ بھی نہیں۔

(۴) لیکن بایں ہمہ ہم اہل اسلام حضرت داؤد (علیہ السلام) کو سچا رسول اور پاک اور اس کلام کو حق سمجھتے ہیں۔

سے تنزیہ اور تقدیس ہے کہ جس

کو ہر منکر مجبور ہو کر تسلیم کرتا ہے جیسا کہ اوپر بیان ہوا بخلاف نامہ مہ آباد کے کہ وہاں منکر وجود باری وصفات باری کے مقابلہ میں کچھ بھی بیاں نہیں اور نہ جملہ صفات مذکور ہیں۔ صرف حکیمانہ طور پر صفت کے عین وغیرہ ہونے میں موشگافی کی ہے کہ جو منصب انبیاء (علیہم السلام) سے بعید ہے۔ پھر عقل

اول اور اس کے وسیلہ سے تمام مخلوقات کا پیدا ہونا اور آسمانوں کا خرق التیام کو قبول کرنا لکھا ہے وہ یا تو حکمائے یونان کی تقلید ہے کہ جو سکندر کی فتح یابی سے ایرانیوں پر غالب آگئی تھی کہ جس کی اغلاط کو علماء کلام نے شرح مواقف و شرح مقاصد وغیرہما کتب میں طشت ازبام کر دیا۔ نہایت سے نہایت اس

رسالہ کو ہدایت الحکمۃ کی برابر سمجھا جائے گا اور بس اور باقی اور مضامین حکمت عملیۃ و نظریہ جو الحمد میں ہیں وہ یہاں کہاں نہ اسرار آخرت نہ عبادت الٰہی نہ اخلاق کی درستی نہ ہر امر میں نیک چلنی۔

(۳) اس دعویٰ پر کہ اس مجموعہ دساتیر کو الہامی نہیں کہہ سکتے یہ دلیل ہے کہ نامہ دخشور گلشاہ میں زحل ستارہ کی پرستش کا حکم

بت پرستی اور عناصر پرستی کی

قباحت اس وقت تہذیب یافتہ ہندوؤں کے دلوں پر بھی نقش حجر ہو گئی ہے۔ اب وہ زمانہ گیا کہ جو توہمات اور مخلوق پرستی کی کتابوں کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جائے۔ یہ کتاب اور اس کا مؤلف عقل مندوں کے نزدیک نہایت جہالت میں گرفتار ہے۔

(۲) یہاں سے معلوم ہوا کہ ہندوؤں میں جو مشہور ہے کہ وید برہما کے منہ سے نکلا ہے محض بے اصل بات ہے کہ جو وید سے ناواقفیت پر دلالت کرتی ہے۔ کس لیے کہ وید کے دو حصہ ہیں اول حصہ کو سن تھا کہتے ہیں جس میں سکت یعنی منتر اور دعائیں جو مختلف رشیوں یعنی مصنفوں نے عناصر اور اندر

وغیرہ کی ہمایعنی ستایش میں بنائے ہیں یہ حصہ اول تصنیف ہوا ہے اس کے بعد دوسرا حصہ برہمنا تصنیف ہوا ہے جس میں منتروں کے قواعد اور یک وغیرہ رسوم کے اصل حالات اور منتروں کے استعمال کے مواضع کہ اس کو فلاں موقع پر

آہستہ یا پکار کے پڑھنا چاہیے اور اس کے متعلق کہانیاں۔ اور سرگزشتیں اس رگوید میں اتریا برہمنا نہایت مشہور ہے جس

(۱۱) یوسیاہ سے یکونیا اور اس کے بھائی بابل کو اٹھ جاتے وقت پیدا ہوئے۔

(۱۲) اور بابل کو اٹھ جانے کے بعد یکویناہ سے سلتائیل پیدا ہوا اور سلتائیل سے زور بابل پیدا ہوا۔

(۱۳) زور بابل سے ابیود پیدا ہوا اور ابیود سے الیاقیم پیدا ہوا اور الیاقیم سے عازور پیدا ہوا۔

(۱۴) اور عازور سے صدوق پیدا ہوا اور صدوق سے آخیم پیدا ہوا اور آخیم سے الیہود پیدا ہوا۔

(۱۵) الیہود سے الغرر پیدا ہوا اور الغرر سے مہتان پیدا ہوا اور مہتان سے یعقوب پیدا ہوا

(۱۶) یعقوب سے یوسف پیدا ہوا جو شوہر تھا مریم کا جس سے یسوع جو مسیح کہلاتا ہے پیدا ہوا۔

(۱۷) پس سب پشتیں ابرہام سے داؤد تک چودہ ہیں اور داؤد سے بابل اٹھ جانے تک چودہ اور بابل اٹھ جانے سے مسیح تک چودہ پشتیں ہوئیں۔

(۱۸) اب یسوع مسیح کی پیدائش یوں ہوئی کہ جب اس کی ماں مریم کی منگنی یوسف سے ہوئی تو ان کے جمع ہونے سے قرآن مصدق ہے مگر اس وقت میں اس کلام کی نسبت یہ کہتا ہوں اور یہ کلام غلطی سے خالی نہیں کیونکہ دوسری اور پہلی آیت میں تصریح ہے کہ خدا نے زمین و آسمان پیدا کیا اور زمین پر پانی اور اندھیریاں تھیں اور آیت میں پانیوں کے اندر کی فضا کو آسمان کہا ہے۔

اور اس کی ستایش میں یہ کلمات ہیں۔

(۷) وایں گونہ ستائی کیوان راتا یاور تو باشد نام ونشان شناخت دشناسائے چیز ویاد داشت ودریافت افسر از شگرف بزرگ

میں اس وقت کے بہت سے افسانے جمع ہیں اور پیشتر گل بکاؤلی اور بدر منیر کے سے وہ افسانے ہیں کہ جو خیالات اور توہمات پر مبنی ہیں۔ دوسرا اترمادار نابرہمنا ہے جس میں بعید از قیاس باتیں ہیں اور

پہلے وہ روح القدس سے حاملہ پائی گئی۔

(۱۹) تب اس کے شوہر یوسف نے الخ چاہا کہ اسے چپکے سے چھوڑ دے۔ الخ یہاں چند ابحاث ہیں اور یہ کہ اس تمام نسب نامہ میں نہ خدا کی حمد ہے نہ اس کی ذات وصفات کا ثبوت ہے نہ عالم آخرت کے احوال ہیں نہ عبادت واستعانت اسراء آخرت نہ عبادت الٰہی نہ اخلاق کی درستی نہ ہر امر میں نیک چلنی کا

توراۃ

دساتیر

وید

انجیل

پہلی بات کے خلاف ہے اور پھر نویں آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ آسمانوں کے پانی کو ایک جگہ جمع کرنے سے خشکی یعنی زمین پیدا ہوئی حالانکہ یہ ہی اول بات کے خلاف ہے اور اس امر کو صحیح طور پر قرآن نے بیان کیا ہے جیسا کہ آپ کو آگے چل کر معلوم ہوگا۔

(۲) یہ کہ خدا بے مثل اور بے صورت

ہے پھر آدم کا اس کی مثل اور صورت پر بنانا تقدس ذات میں دھبہ لگانا ہے۔

(۳) یہ کہ عدن کی نہر سے دجلہ اور فرات اور جیحون اور فیسوں کا نکلنا بالکل غلط ہے۔ اول تو عدن سے کوئی نہر نہیں نکلتی دوم دجلہ اور فرات اور جیحوں کجا یہ ایسی بات ہے کہ جس کی تفسیر میں اب تک تمام علمائے اہل کتاب حیران و سرگردان ہیں۔ پادری لوگ جو مسلمانوں سے سدِّ ذوالقرنین پوچھا کرتے اور قرآن پر بے جا عیب لگایا

وسترگ کیایش وشکوہ رخشندہ و بخشائندہ و بخشائیشگر و دہشور دادگر۔ الخ۔ دیکھئے جو کلمات خدا تعالیٰ کی نسبت تھے وہی اس کے حق میں بھی اطلاق کر دیے۔ پھر نامہ دحشور ہوشنگ میں مریخ کی پرستش اور اس کی بڑی لمبی چوڑی تسبیح مذکور ہے اور پھر نامہ دخشور قہمورس میں آفتاب کی بابت یہ ہے۔

آفتاب یادر تست اور کہ خور شید باشد پر مودم کہ تراہر زید وہد بس ستائی اور ایں گونہ۔یعنی میں نے خورشید کو تیری اعانت کا حکم دیاہے تو اس کی ستایش کر آگے بہت کچھ ستایش مذکور ہے۔اسی طرح ماہتاب اور دیگر ستاروں کی پرستش اور ان سے استمداد اور دعا کرنا مذکور ہے اور نامہ دخشور یاسان میں ہاتھ پاؤں دھو کر دن میں تین یا چار یا دو بار ششش کاخ کے آگے نماز پڑھنے کا حکم ہے اور ششش کاخ ستاروں اور تاگ کو

یجر دید کا ستاپا تھا برھما چودہ جلد میں ہے جس میں از حد بے اصل قصے ہیں جیسے کہ سوتے وقت بوڑھیاں کہانیاں کہہ کر بچوں کو بہلایا کرتی ہیں اس قسم کی کہانیاں اس میں ہیں باقی شاید اور اتھر بن وید میں بہت کم برہمنا ہیں پھر صدہا سال بعد پنڈتوں نے ان ویدوں کے بعد برہمنا۔۔کے رسالے تتمہ یا

ضمیمہ کے طور پر لگادیے ہیں ان کو اوپنشد بھی کہتے ہیں اور اسی طرح علم نجوم اور علم موسیقی اور مذہبی قواعد کے رسالے کہ جن کو وید الگا کہتے ہیں وید کے ضمیمہ میں اس کی تصنیف کا زمانہ وہ ہے کہ جب ہندوؤں میں کسی قدر شائستگی نے ظہور کیا تھا سب سے قدیم رگوید ہے اس کے ہزار سے زیادہ سکت ہیں اور دس ہزار جاتیں یعنی فقرے کل سکت آٹھ کھنڈوں یعنی اسٹکوں (حصہ) پر منقسم ہیں اور ہر کھنڈ یا اسٹک میں آٹھ ذکر ہے اور جملہ امور دنیاوی میں استقامت اور صراط مستقیم کا اشارہ ہے اور اگلے برے بھلے لوگوں کے حالات عبرت انگیز نصیحت خیز اس لیے اس کو سورۃ الحمد سے کچھ بھی نسبت نہیں۔

(۲) قطع نظر اس کے کہ اس کو سورۃ الحمد سے کچھ بھی نسبت نہیں فی نفسہٖ یہ کلام اس قابل نہیں کہ اس کو الہامی کہا جائے

اور اس کی تصنیف کو امر اہم خیال کر کے الہام کی ضرورت مانی جائے۔عام تاریخوں میں جس طرح نسب نامہ ہیں اسی طرح یہ بھی ہے اگر وہ الہامی ہیں تو یہ بھی ہے اور وہ نہیں تو یہ بھی نہیں کوئی خصوصیت اس میں نہیں۔

(۳) یہ نسب عامہ غلط ہے کیونکہ حضرت مسیح (علیہ السلام) میں عیسائی لوگ دو جہت مانتے ہیں ایک الوہیت دوسری انسانیت۔

جہت اول سے تو یہ نسب نامہ قطعی غلط ہے کیونکہ مسیح جہت الوہیت سے یوسف

کرتے ہیں براہ مہربانی اس نہر کا تو پتا بتلا دیں۔

(۳) الہامی کتاب اور نبی کا یہ منصب نہیں کہ وہ تاریخ بیان کیا کرے اور نہ یہ اہم کام ہے کہ جس کے لیے الہام اور نبی کی ضرورت بیان کی جائے کیونکہ ایسے امور کو عام مؤرخ بیان کر سکتے ہیں۔ شاید اسی ضرورت کو آریہ سماج فضول سمجھ کر نبوت کے قائل نہیں اور اگر یہ بھی تسلیم کیا جائے اور اس مضمون کے نقصوں سے چشم پوشی کی جائے اور اس کو حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی وہی اصلی توراۃ مانا جائے کہ جس کا قرآن میں ذکر ہے مگر پھر بھی اس کو الحمد سے مضامین مذکورہ بالا میں کون سے مضمون میں ہمسری ہے نہ اس میں خدا کی ستایش نہ اس کی ذات وصفات کا ثبوت قطعی نہ عالم آخرت اور نہ جزا وسزا کی بابت اشارہ نہ عبادت خدا کا ذکر نہ عموماً ہر امر میں نیک چلنی اور میانہ روی کی ترغیب نہ بھلے لوگوں کے رستے کی تحریص نہ برے لوگوں کے طریقے سے حذر پھر جو شخص خدا ترس اس کو کلام الٰہی اور الہامی کہے تو اس پر فرض ہے کہ قرآن مجید کو بھی کہے اور اس سے زیادہ صدق دل سے اس آسمانی کلام پر ایمان لائے۔

ہم اہل قرآن ہر اچھی بات اور کلام الٰہی کے تسلیم میں انکار نہیں کرتے جو شخص اپنی کتاب کو الہامی ثابت کر دے تو ہماری سر آنکھوں پر۔ فقط

کہتے ہیں چنانچہ خود کہتا ہے 'قولہ 'پس برابر شش کاخ آئی و نماز کن و شش کاخ ستارگان اندو آتش کہ فروغند گانند۔ بایں ہر گاہ شش کاخے بہ بیند نماز برید۔ یعنی جہاں کہیں ستارہ اور آگ کو دیکھو تو اس کے آگے جھکو۔ آگے شش کاخ کی نماز کا دستور بیان کرتا ہے۔ بار دوم بہر شش کاخ سر بر زمین گزارو پیشانی بر زمین رساں الخ۔ واگر آتش باشد گوید۔ اے پروردگارو نماز مرا بہ یزداں رساں۔ الخ۔ اسی طرح آگے چل کر عناصر کی تعظیم اور عبادت کا حکم دیتا ہے۔ الغرض جانوروں کو ذبح نہ کرنا 'آگ اور ستاروں کو پوجنا اور آفتاب کی پرستش کرنا اور ہر روز غسل کرنا اور عناصر کی عبادت کرنا وغیرہ دس توراۃ کہ جن کو ہنود بھی عمل میں لاتے ہیں اور آگ جلا کر جگ اور ہوم کرتے اور اس کو پوجتے ہیں جیسا کہ وید بالخصوص رگوید میں موجود ہے یہ سب دساتیر میں موجود ہے۔ سو یہ باتیں ہند میں غالباً سری بیاس جی جامع وید نے مروج کی ہیں۔ چنانچہ نامہ زرتشت میں اول سکندر کے ذریعہ سے علم کا یونان میں پہنچنا اور ایک یونانی کا زرتشت کے پاس آنا اور تعلیم پانا لکھ کر جیکرن گوچہ ہندی کا تعلیم پا کر جانا لکھا ہے۔ انھوں نے برہمنے بیاس نام از ہند آمد پس دانا کہ بر زمین کم است چناں در دل دارد کہ نخست از پر تو پر سد

الخ۔ الغرض یہ مخلوق پرستی اور سخت مجاہدات اور جگ اور ہوم کرنا سب کا سرچشمہ دساتیر ہیں۔ یہ دساتیر اور وید تو اس قابل بھی نہیں کہ ان کو موحدین کی کتابوں کی فہرست میں لکھا جائے کیونکہ محض شرک اور بری تعلیم ہے کہ جس کو عقل و نقل رد کرتی ہے۔ فقط

ادھیاتی ہیں۔ ہر منتر نظم ہے اس کا جداگانہ وزن اور علیحدہ مصنف ہے اور

ہر منتر میں ایک یا دو دیوتا کی مہما ہے۔ چنانچہ اس رگوید کے ایک سو اکیس منتروں میں ۳۷ صرف آگ کی تعریف میں ہیں اور ان کے مصنف مدھو جن داس اور اس کا بیٹا جری اور مدہانی کالوا کا بیٹا وغیرہ ہیں۔ اور کہیں کہیں اگنی کے ساتھ اور دیوتاؤں کی بھی مدح ہے اور ۴۵ میں اندر کی مہما بر تن یعنی ستایش ہے اور منجملہ باقی منتروں کے لمبرہ منتر مروت جنی ہما کے دیوتاؤں کی تعریف میں ہیں کہ جو اندر کی ہمراہی میں ہیں اور گیارہ آسونوں کی تعریف میں کہ جو سورج کے پوتر ہیں چار صبح کے دیوتا کی تعریف میں باقی ادنیٰ دیوتاؤں کی مدح میں ہیں اور دوسرے منڈل کے منتر گریسمدا۔ سناہوزا کے فرزند کی تصنیف جو اینگرا کے خاندان میں تھا۔ تیسرے منڈلا کے منتر دشواستر اور اس کے بیٹوں یا رشتہ داروں کی تصنیف ہیں اور یہ شخص راجہ رام چندر کا استاد ہے۔

چوتھے منڈل کے منتر واما دیوا کی تصنیف ہیں۔ پانچواں منڈل اتری اور اس کے فرزندوں کی طرف منسوب ہے چھٹے کا مصنف بھاردواج ہے اور ساتویں کا اس تھا اور اس کی اولاد ہے۔ ان سب منتروں یعنی اشعار کو (کہ جن کو عناصر او غیر مرئی چیزوں اور آفتاب سے مدد مانگنے اور دشمن پر فتح پانے اور ان کے محامد کے بیان میں مختلف شاعروں نے بنایا تھا کہ جو ہنود کے نزدیک بڑے کامل تصور کیے جاتے تھے) پراسر عابد

اور یعقوب یا کسی اور انسان سے کچھ بھی علاقہ نہیں رکھتے بلکہ معاذ اللہ خدا کے

بیٹے ہیں تب یوں کہنا تھا کہ مسیح جبرائیل کا بیٹا خدا کا پوتا یا بالعکس اور دوسری جہت سے بھی غلط ہے کس لیے کہ انسانیت کے طور پر نسب حمل سے ثابت ہوتا ہے اور مسیح (علیہ السلام) تو مریم کے پیٹ میں یوسف کے پاس آنے سے پیشتر کوار پنے میں پائے گئے تھے جیسا کہ خود اسی متی کے (۱۸) جملہ سے صاف ظاہر ہے اور یہ احتمال ہو نہیں سکتا کہ یہ نسب نامہ حضرت مریم کا ہو کیونکہ مریم یوسف کی بیٹی نہیں بلکہ بیوی تھیں۔

(۴) اگر یہ نسب نامہ صحیح فرض کیا جائے تو لازم آوے کہ حضرت عیسیٰ (خدا اور خدا کے بیٹے تو کجا) بلکہ اس کی جماعت سے بھی باہر کئے جائیں کیونکہ کتاب استثنا ۲۳ باب کے اول ہی میں یہ ہے (حرامی بچہ خداوند کی جماعت میں داخل نہ ہووے اس کی دسویں پشت تک خدا کی جماعت میں شامل حال نہ ہو۔ الخ (۳) کوئی عمونی یا موابی الخ) ہمیشہ تک خدا کی جماعت میں شامل نہ ہوں۔ الخ اور حضرت داؤد کا باپ یسیٰ اور اس کا باپ عوبید ہے کہ جو بوغر کے نطفہ سے ردت کے شکم سے پیدا ہوا تھا کہ جو موابی ہے جیسا کہ اس کتاب کے چوتھے باب میں ہے اور اس پر لطف یہ کہ بوغر راحاب فاحشہ کے پیٹ سے پیدا ہوا ہے اور راحاب کا فاجر ہونا کتاب یشوع کے ۲ باب سے ظاہر ہے کہ پھارس کہ جس کو حضرت مسیح کے نسب نامہ میں یہوداہ کا بیٹا لکھا ہے وہ تمر کے

وید

انجیل

کے بیٹے کرشناوہ پیانانے کہ جس کو ویاس یعنی بیاس جی کہتے ہیں کوروں پانڈوں کے زمانہ میں جمع کیا اور مرتب کر کے اس کا نام وید رکھا اور ویاسا کے معنی ترتیب دینے والے کے ہیں۔ غالباً بعد فتح پانڈوں کے راجہ یدھشتر نے اس کام کے لیے بیاس کو مصروف کیا ہے اور اس کے علاوہ اور بھی پنڈت جو اس زمانے میں مختلف منتروں سے واقف تھے۔ سن تھا یعنی منتروں کے مجموعہ کے تیار کرنے میں حسب تفصیل ذیل مصروف تھے۔

پٹیل رگوید کے اور دیشمپائن یجر وید کے اور چمن شام وید کے اور سمنٹو اتھرون وید جمع کرنے پر مصروف تھا اور کچھ عجب نہیں کہ بیاس جی ان کے مہتمم اور سرپرست ہوں۔ ہر چہ باشد اس میں کوئی شک نہیں کہ کوئی شخص وید ایک شخص خاص کی تصنیف نہیں نہ ایک زمانہ میں تصنیف ہوا چہ جائے کہ برہما کی تصنیف اس کا کوئی لکھا پڑھا ہندو جی قائل نہیں عوام کا کیا اعتبار ہے پس جب اصل الاصول وید الہامی کیا بلکہ روشنی علم کے زمانہ کے بھی تصنیف نہیں نہ کوئی الہامی اور عاقلانہ بات اس میں ہے۔ تو پھر اس کتاب کو نجات کا مدار جان کر پرانی جہالت کے خیالات اور توہمات میں گرفتار ہونا مرنے کے بعد بڑی حسرت اٹھانے کا سامان ہے۔ العیاذ باللہ اور جب وید کا یہ حال ہے تو اس کے بعد جو پران اور دیگر پشتک انھیں خیالات کی بنائے فاسد پر بنائے گئے ہیں اور اس کا نام دھرم رکھا گیا ہے اور جگ کرنا اور آگ جلا

کر دیو تاؤں کی نذوں کے لیے کر چھیوں میں گھی ڈالنا اور رگوید کے یہ منتر پڑھ کر دنیا و آخرت کی بھلائی تلاش کرنا خیال خام اور تقلید عام ہے۔ تمام ہوا وید۔ فقط

پیٹ سے زناکاری سے پیدا ہوئے ہیں جیسا کہ کتاب پیدائش کے ۳۸ باب میں تصریح ہے کہ یہوداہ نے اپنی بہو تمر سے زنا کیا جس سے پھارس پیدا ہوا۔ پھر اسی طرح حضرت سلیمان اور یاکی جورو سے پیدا ہوئے ہیں کہ جس نے داؤد سے زنا کرایا۔ خیال کیجئے کہ مسیح کے نسب نامہ میں کیسے پاکدامن لوگ ہیں۔

(۵) اس نسب نامہ میں اور بھی اغلاط ہیں (۱) اول یہ کہ خود ابراہیم کا اور ادھر داؤد کو شمار کر لیں تو اول قسمت میں اور دوسرے میں چودہ چودہ نام آجاتے ہیں مگر تیسری قسمت جو سلت ایل سے شروع اور یوسف پر تمام ہوتی ہے اس میں کل ۱۲ شخص ہیں اور جو خود حضرت مسیح کو ملا دیں تو تیرہ ہوتے ہیں چودہ نہیں۔ جس کا دل چاہے شمار کر لے۔ پادری عماد الدین نے یکویناہ کو دوبار گن کر ٹھگوں کی سی ہمت پھیری کی ہے۔ مگر غلط اس انجیل میں غلطی کا ضرور دھبہ لگتا ہے (۲) دوسری قسمت جو سلیمان سے شروع ہو کر یکویناہ پر ختم ہوتی ہے متی نے اس کی چودہ گنوائی ہیں حالانکہ یہ صریح غلط ہے بلکہ اول کتاب التاریخ کے ۳ باب میں اٹھارہ شخص لکھے ہیں اگر انجیل متی غلط نہیں تو کتاب التاریخ جس کو تمام عیسائی اور یہودی الہامی مانتے ہیں غلط ہے (۳) متی نے سلت ایل سے زور بابل کا پیدا ہونا لکھا ہے حالانکہ کتاب التاریخ میں زور بابل کو لذایاہ کا بیٹا لکھا ہے جو سلت ایل کا بھائی ہے (۴) سلت ایل کو یکویناہ کا بیٹا لکھ کر چودہ پشتیں بابل کے اٹھ جانے تک گنوائی ہیں سو یہ غلط کیونکہ سلت ایل کو کتاب تاریخ میں ایسر کا بیٹا لکھا ہے کہ جو یکویناہ کا بیٹا ہے۔ اب اس میں ایک شخص اور بڑھ گیا چودہ کہنا غلط ہوا۔ (تمام ہوئی انجیل)

سوال: یہ تسلیم کہ جس قدر مذاہب اور ان کی کتابوں کا قرآن مجید سے مقابلہ کر کے دیکھا گیا سب میں اسلام کو من جانب اللہ اور دین الٰہی پایا جس میں خدا پرستی اور اس کی صفات کاملہ اور ملائکہ اور انبیاء اور قیامت پر ایمان لانے کی بڑی تاکید ہے اور انسان کی روح کی صفائی کی بابت اور دنیا میں ہر طرح سے نیک چلنی اور مرنے کے بعد جو کچھ وہاں پیش آتا ہے اس کی بابت کامل بیان ہے اور اس کے مقابلہ میں یہ سب مذاہب باطل یا بالکل باطل ہیں۔ مگر ہنوز اور صدہا مذاہب دنیا میں ہیں جیسا کہ دبستان المذاہب میں لکھا ہے اور ان کے اصول حمیدہ بیان کئے ہیں ان سے ہنوز

اسلام کا مقابلہ نہیں ہوا، جائز ہے کہ وہ حق ہوں پوری تحقیق جب ہے کہ ان سے بھی مقابلہ کر کے اسلام کا حق ہونا بتلایا جاوے ورنہ پھر تقلیداً اسلام کو حق ماننا پڑے گا۔

جواب: دنیا میں جس قدر مشہور و معروف مذاہب قدیم سے ہیں وہ یہی مذاہب ہیں کہ جن کی کتاب کو آپ نے آنکھ سے دیکھا، باقی وہ جو صدہا مذاہب دبستان المذاہب میں لکھے ہیں سب یا بیشتر ان ہی کی شاخیں ہیں کیونکہ بہتر فرقے تو اس میں اسلام کے لکھے ہیں اور پھر ہندوؤں کے بہت سے فریق جوگی اور سنیاسی وغیرہ لکھے ہیں کہ جن کی ریاضات اور شعبدوں پر صاحب دبستان لٹو ہو کر ہر مذہب پر منہ میں پانی بھر لاتے ہیں اور ناظر کو شک میں ڈالتے ہیں اور پھر آتش پرستوں کے فریق کا بہت کچھ بیان اور اپنا شوق عیاں کیا ہے اور پھر کسی قدر یہود و نصاریٰ کے مذہب کا بیان ہے اور تحقیق کسی مذہب کی بھی حضرت کو میسر نہیں ہوئی۔ سنی سنائی باتیں اور اپنے دیکھے ہوئے حالات بیان کر دیے ہیں نہ وید انھوں نے دیکھے نہ توراۃ نہ زبور نہ انجیل۔ اسلام کے اصول و مسائل میں کچھ بے خبری سے بیان کر کے بے علموں کو حیرت میں ڈال دیا ہے اور ہم نے توسب کے اصول بیان کر دیے۔ ان کی فروع اور شاخوں سے کیا غرض۔ البتہ حکمائے یونان اور قدیم اہل مصر اور دہریوں اور جینیوں اور دیگر صحرائی قوموں کا مذہب نہیں بیان کیا۔ سوواضح ہو کہ حکمائے مصر اور قدمائے یونان دونوں کواکب اور عناصر پرست ہیں۔ مصریوں کے عقائد ہندوؤں سے بہت ملتے ہیں ان کے ہاں بھی بیل کو پوجتے ہیں کہ جس کو ابیس کہتے ہیں اور اسی تقلید سے بنی اسرائیل نے بچھڑا بنا کر پوجا تھا۔ چنانچہ یہ باتیں کتب تاریخ میں مذکور ہیں۔ ان کے پاس کوئی تاریخ نہیں تھی اور دہریوں کا نہ کوئی اصول ہے نہ مذہب، وہ خدا تعالیٰ اور عالم آخرت کے منکر ہیں۔ سو یہ بات ادلہ عقلیہ و نقلیہ سے باطل ٹھہر چکی ہے خود قرآن نے اس کو رد کر دیا ہے اور ایک مختصر سی بات میں بھی سناتا ہوں کہ بھائی اگر نہ خدا ہے، نہ قیامت ہے، نہ جزا، نہ سزا تو ہم کو بھی کچھ خوف نہیں۔ غایۃ الامر نماز، روزہ طاعت وعبادت کا ثمرہ نہ ملا اور کسی قدر حرام لذتوں سے مزہ نہ اٹھایا تو کچھ پروا نہیں، دنیا کی تکلیف کیا اور مزہ کیا اور جو خدا تعالیٰ اور عالم آخرت سب کچھ حق ہوا (اور قطعی ہے) تو کہئے تیرے لیے کیا خرابی ہو گی۔ اب تو محل خطر میں ہے یا ہم؟ اور جینیوں کا مذہب بودھ کی شاخ ہے وہ بھی بت پرست ہیں ان کے ہاں بھی کوئی کتاب ایسی نہیں کہ جس کو وہ الہامی کہتے ہوں باقی بت پرست اور صحرائی قومیں جیسا کہ افریقہ میں ہیں تو ان کا

مذہب تو کیا سرے سے ان کو تو عقل انسانوں کی فہرست میں ہی لکھتے ہوئے ہاتھ کھینچتی ہے۔اب روئے زمین پر کوئی مذہب عقلاً و نقلاً اسلام کے برابر نہ نکلا۔ الحمد اللہ علیٰ دین الاسلام۔

فضائل: اس سورۃ کے بیشمار فضائل ہیں بخاری وغیرہ محدثین نے ابی سعید بن معلی سے روایت کی ہے کہ میں نماز پڑھ رہا تھا کہ مجھ کو نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے پکارا میں بوجہ نماز جواب نہ دے سکا جب فارغ ہو کر حاضر ہوا تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا میں نے تجھ کو بلایا تو نے کیوں جواب نہ دیا؟ عرض کیا کہ حضور میں نماز میں تھا۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ ایسے وقت بھی رسول کا جواب دینا چاہیے کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِیْبُوْا لِلّٰہِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاکُمْ لِمَا یُحْیِیْکُمْ۔ الآیہ پھر آپ نے فرمایا کہ دیکھ میں تجھ کو مسجد سے باہر جانے سے پیشتر قرآن میں جو بڑی سورۃ ہے تعلیم کروں گا اور پھر میرا ہاتھ پکڑ کر چلے۔ جب مسجد سے باہر ہونے لگے میں نے یاد دلایا۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ وہ سورۃ الحمد ہے جس کی سات آیت ہیں اور وہ قرآن عظیم ہے جو مجھ کو عطا ہوا۔ صحیح مسلم وغیرہ کتب میں عبداللہ بن عباس (رض) سے مروی ہے کہ حضرت کے پاس جبرائیل حاضر تھے کہ ایک فرشتہ آسمان سے نازل ہوا، جبرائیل نے کہا کہ یہ آج سے پہلے کبھی زمین پر نہ آیا تھا، اس فرشتے نے کہا یا نبی اللہ مژدہ ہو کہ آپ کو خدا نے دو نور عطا فرمائے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے پہلے کسی نبی کو نہیں ملے۔ ایک سورۃ فاتحہ اور دوسرا اخیر سورۃ بقرہ ہے جو حرف آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان میں سے پڑھیں گے اس کا ثواب ملے گا۔ دارمی اور بیہقی نے روایت کی ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ہے کہ سورۃ الحمد ہر مرض کے لیے شفا ہے اور صحیح مسلم و نسائی وغیرہ کتابوں میں ہے کہ صحابہ سانپ اور بچھو کے کاٹے پر اور مجنون اور اہل صرح پر یہ سورت پڑھ کر دم کرتے تھے، اسی وقت مریض تندرست ہو جاتا تھا (جیسا کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا ہے بیمار ان کے ہاتھ لگانے سے تندرست ہو جائے گا) یہ معجزہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ہر قرن میں متواتر چلا آتا ہے۔ چنانچہ اب بھی سورۃ الحمد کا فجر کی سنتوں اور فرض کے بیچ میں اکتالیس بار ہر روز بسم اللہ کا میم الحمد کے لام سے ملا کر چالیس روز تک پڑھنا ہر کام کے لیے عمل مجرب ہے اور بیمار کو دم کر کے پلانا اور چینی یا شیشہ کے برتن پر

ا۔میں اس بات کانہایت شکر ادا کرتاہوں کہ میں نے اسلام کو تمام روئے زمین کے مذاہب سے ملا کر دیکھااور کسوٹی پر اس کولگایاہر طرح سے کھر اپایااور محققانہ طور پر مسلمان ہوااگر میرے ماں باپ مسلمان نہ ہوتے اور قدیم سے اسلام میں میرے آباؤاجداد حصہ نہ پاتے تو بھی میں از خود اسلام ہی کو اختیار کرتا۔ان بھائیوں پر ہزار افسوس کہ جو محض تقلید اور رسم اور نفسانیت سے اس نور کے زمانے میں بھی باطل خیالات اور غلط مذاہب پر اڑے ہوئے ہیں۔

مشک وگلاب اور زعفران سے لکھ کر چالیس روز تک بیمار کو پلانا مجرب ہے اور اِدرد گردہ کے لیے ایک سانس سے گیارہ بار پڑھ کر دم کرنا مجرب سریع الاثر ہے۔ مگر اعتقاد کامل اور ہمت جازم شرط ہے۔ترمذی نے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے روایت کی ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فرماتے ہیں مجھ کو اس ذات کی قسم کہ جس کے قبضے میں میری جان ہے (یعنی خدا تعالیٰ کی) سورۃ الحمد کی مثل کوئی سورۃ نہ توراۃ میں ہے نہ انجیل میں نہ زبور میں، نہ قرآن میں۔ چنانچہ اس حدیث کی تصدیق ہمارے اس مقابلے سے بہ خوبی ہو سکتی ہے جو ابھی ہم نے توراۃ وانجیل و زبور کو لکھ کر کیاہے۔ حقیقت میں یہ سورت ایک دریائے ذخار اور مجمع اسرار بیشمار ہے۔دنیاودین کے متعلق کوئی بات ایسی نہیں کہ جو کامل طور پر اس سورۃ میں نہ ہو، مگر کسی قدر فہم خداداد شرط ہے،ورنہ بہت سے عیسائی اور دیگر متعصب لوگ کہ جن کے انوار فطرت عداوت وقساوت سے مٹ گئے ہیں،وہ یہی کہتے ہیں کہ لفظوں سے کوئی بات بھی سورۃ الحمد سے ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ مسلمان اپنی ذکاوت خرچ کر کے یہ باریکیاں پیدا کرتے ہیں۔ہم کہتے ہیں کہ نہیں بلکہیہ سب باتیں ظاہر الفاظ سے مستفاد ہیں اور اچھایہی سہی آپ بھی تو روحانی تعلیم سے بہرہ یابی کا دعویٰ کرتے ہیں ہم آپ کو بیس برس کی اجازت دیتے ہیں اور تمام جہان کے لوگوں سے مدد لینے کو بھی جائز رکھ کر یہ کہتے ہیں کہ آپ بھی توکسی جملہ توراۃ وانجیل وزبور ویدودساتیر سے اس قدر باتیں پیدا کر دیجئے اور جو نہ کر سکو تو یقین کیجئے کہ یہ خاص اعجاز قرآن ہے۔اب ہم اس سورۃ مقدسہ کی تفسیر سے فارغ ہو چکے مگر اس کے متعلق تین بحث اور باقی ہیں کہ جن کا ذکر کرنا اس تفسیر میں بعض وجہ سے نہایت مناسب ہے۔

بحث اول: یہ سورۃ نماز میں پڑھی جاتی ہے اور ہر نماز میں اس کا پڑھنا (ان خوبیوں کی وجہ سے کہ جن کا اوپر ذکر ہوا) شرع نے ضروری کر دیا، یہاں تک کہ جس نماز میں یہ سورۃ نہ پڑھی جائے وہ فاسد یاباطل ہے، چنانچہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فرماتے ہیں: من صلی صلوۃ لم یقرا فیہا بام القرآن فہی خداجثلثا غیر تمام الحدیث رواہ مسلم کہ ”جس نے

نماز میں الحمد نہیں پڑھی وہ نماز ناقص ہے، تین بار یہ فرمایا"۔ وعن عبادۃ بن الصامت (رض) قال قال رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) لاصلوٰۃ لمن لم یقرء بفاتحہ الکتاب متفق علیہ کہ جس نے الحمد نہیں پڑھی اس کی نماز نہیں ہوئی۔ یہ مسئلہ توسب کے نزدیک مسلم ہے کہ نماز میں الحمد کا پڑھنا واجب ہے مگر جبکہ نماز جماعت سے ہو تو مقتدی کو بھی الحمد پڑھنا چاہیے یا جماعت میں صرف امام کا پڑھنا سب مقتدیوں کی طرف سے کافی ہے۔ حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ اور ان کے شاگرد امام یوسف و امام محمد و امام مالک اور امام احمد اور اسحاق اور سفیان ثوری اور ابن شہاب زہری اور ابراہیم نخعی اور عبداللہ بن مبارک اور قاسم بن محمد اور عروہ بن زبیر (رح) بڑے بڑے محدثین تابعین اور صحابہ کبار کا یہ مذہب ہے کہ مقتدی الحمد نہ پڑھے بلکہ چپ ہو کر امام کی قرأت کو سنے اور ختم کرنے کے وقت آمین کہہ کر اپنی مشارکت ثابت کر دے۔ ان چند دلائل کی وجہ سے (ا) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَاِذَا قُرِیَٔ الْقُرْآنَ فَاسْتَمِعُوْالَہٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ۔ کہ جب قرآن پڑھا جائے تو چپ ہو کر سنو تا کہ تم پر رحمت ہو۔ بعض لوگ اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ یہ خطبے کے بارے میں نازل ہوئی، یعنی خطبہ کے وقت چپ کرنا مراد ہے۔ مگر یہ جواب صحیح نہیں اولاً تو یوں کہ یہ آیت مکیہ ہے اور خطبہ مدینہ میں آکر جب جمعہ شروع ہوا تب مقرر ہوا چنانچہ اکثر مفسرین بالخصوص امام محی السنۃ بغوی شافعی اپنی

ا عیسائی بالخصوص پراٹسٹنٹ اور وہ جو ان میں الحاد کا دم بھرتے ہیں اور وہ ہندوستان کے نیچری جو ان کی تقلید کرتے ہیں ان باتوں کے سخت منکر ہیں اور یہ انکار ان کا بجا ہے کس لیے کہ ان کی روح پر اس درجہ تاریکی چھائی ہوئی ہے کہ کوئی روحانی اثر ان کو محسوس نہیں ہوتا (گویا روح مر گئی) نہ خود ان کو عمر بھر ایسی باتوں کا اتفاق ہوتا ہے نہ اپنے ملک میں کہ جہاں کفر والحاد کی تاریکی چاروں طرف محیط ہے کسی کو ایسا دیکھتے ہیں اگر صدق دل سے توبہ کرکے مسلمان ہو جائیں اور کسی روشن ضمیر سے (چند روز روح کو منور کرنے والے) اشغال دیکھیں تو پھر عالم مثال کے اسرار اور ایسے کلمات کے آثار ان کو دکھائی دیویں اور وہ روحانیت کا اثر اپنے اوپر معائنہ کریں کہ ان کی زبان اور ہاتھ پاؤں سے کس قدر خرق عادت سرزد ہوتے ہیں اور جو ہم اہل اسلام نے صدہا مخالفوں کو ایسی برکات کا مشاہدہ بھی کرا دیا ہو تو پھر جس قدر اس مشاہدہ سے محروم ہیں وہ کب مانتے ہیں بلکہ خیالی باتیں اور ڈھکوسلے جانتے ہیں۔

تفسیر معالم التنزیل میں اس کے مقر ہیں۔ ثانیاً یوں کہ گو خطبے کے بارے میں آیت کا نازل ہونا فرض کیا جاوے مگر لحاظ عبارت کا ہوتا ہے نہ موقع نزول کا۔ کس لیے کہ آیت سرقہ اور آیت لعان اور دیگر آیات خاص اشخاص کے معاملوں میں نازل ہوئی ہیں مگر ان کی عبارت پر لحاظ کر کے عام حکم جاری کیا جاتا ہے۔ ثالثاً جب خطبہ میں (کہ جہاں غالباً نصیحت حسب وقت ہوتی ہے سراسر قرآن مجید نہیں پڑھا جایا کرتا) چپ رہنا واجب ہوا تو جہاں قرآن پڑھا جاوے اور حالت نماز اور توجہ الی اللہ ہو تو وہاں بدرجہ اولیٰ سکوت کرنا چاہیے۔

(۲) عن ابی ہریرہ (رض) قال قال رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) انما جعل الامام لیوتم بہ فاذا اکبر فکبر وا واذا قرء فانصتوا رواہ ابوداؤد والنسائی وابن ماجہ۔ یعنی "نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ہے کہ امام صرف اس لیے مقرر کیا گیا ہے کہ لوگ نماز میں اس کا اقتدا کریں۔ پس چاہیے کہ جب وہ تکبیر کہے تو تکبیر کہو اور جب وہ قرآن پڑھے تو چپ ہو کر سنو۔ "(۳) امام مسلم نے ابی ہریرہ اور قتادہ سے روایت کی ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: واذا قرء فانصتوا کہ جب امام پڑھے تو چپ کرو۔ "(۴) امام مالک اور امام احمد اور ابوداؤد اور ترمذی اور نسائی اور ابن ماجہ نے ابوہریرہ سے روایت کی ہے کہ ایک جہری نماز میں نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے نماز سے فارغ ہو کر لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا کہ تم میں سے کسی نے میرے ساتھ کچھ پڑھا ہے؟ ایک شخص نے عرض کیا کہ ہاں۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ میں بھی کہتا تھا کہ مجھ سے قرآن پڑھنے میں کون جھگڑ رہا ہے۔ پس لوگوں نے یہ سنا (تو جن نمازوں میں کہ پکار کر قرآن پڑھا جاتا ہے ان میں) صحابہ امام کے پیچھے الحمد پڑھنے سے رک گئے۔ ان کے علاوہ اور بہت سی احادیث صحیحہ اس بارے میں وارد ہیں کہ جن کے ذکر کرنے کو ایک دفتر چاہیے، لیکن امام شافعی اور ظاہر یہ کہتے ہیں کہ گو امام کے ساتھ پڑھنا ممنوع ہے مگر جب امام دم لیتا ہے بالخصوص تین سکتوں میں مقتدی کو چاہیے کہ الحمد پڑھ لے۔ کس لیے کہ مسلم نے روایت کی ہے کہ جب میں نے ابوہریرہ (رض) سے پوچھا کہ امام کے پیچھے بھی الحمد پڑھیں تو انھوں نے فرمایا کہ اقرا بہا فی نفسک الحدیث "کہ اپنے دل میں پڑھ لے۔ "اس کا جواب یہ ہے کہ اس سے مراد مضمون الحمد کو دل میں تصور کر لینا ہے نہ پڑھنا۔ کس لیے کہ یہی ابوہریرہ پیشتر روایت کر چکے ہیں کہ جب امام پڑھے تو حضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فرماتے ہیں کہ چپ ہو کر سنو۔ پس یہاں خلاف حکم حضرت کے کیونکر ابوہریرہ (رض) فتویٰ دیتے اور چپ کرنا مطلقاً حضرت نے فرمایا خواہ الحمد ہو یا کوئی اور سورۃ ہو سب

سے چپ کرنا چاہیے۔ امام شافعی کے اور بھی دلائل ہیں مگر وہ دلائل سابقہ کے مقابلہ میں کچھ وقعت نہیں رکھتے اس لیے ان کا بیان کرنا بے فائدہ سمجھتا ہوں۔ ازان جملہ یہ ہے کہ ابو داؤد اور ترمذی اور نسائی نے جہاں امام کے پیچھے پڑھنے سے ممانعت کی روایت کی ہے وہاں الحمد کو بھی مستثنیٰ کر لیا ہے۔ لا تقرؤا الا بفاتحۃ الکتاب فانہ لا صلوۃ لمن لم یقرء بھا واضح ہو کہ فریق اول کے (اعنی جو کہ امام کے پیچھے الحمد پڑھنا نماز میں درست نہیں جانتے) دو قول ہیں حضرت امام ابو حنیفہ اور ابو یوسف تو مطلقاً منع کرتے ہیں خواہ امام پکار کر پڑھے یا آہستہ کیونکہ جو دلائل کہ امام کے پیچھے الحمد پڑھنے سے منع کرتے ہیں وہ عام ہیں سریہ اور جہریہ کی کوئی قید نہیں اور امام محمد وغیرہ یہ کہتے ہیں کہ جب امام چپکے پڑھے (یعنی صلوۃ سریہ میں) تو مقتدی الحمد پڑھ لے۔ کس لیے کہ اب امام سے وہ منازعت نہیں پائی جاتی اور فضیلت الحمد پڑھنے کی ملتی ہے اور ان احادیث مخالفین پر بھی عمل ہو جاتا ہے اور یوں خالی کھڑے رہنے سے کیا فائدہ۔

بحث دوم: الحمد کے بعد آمین کہنا مسنون ہے خواہ اکیلا الحمد کو پڑھے خواہ امام کے پیچھے خواہ نماز سے باہر ہو کس لیے کہ مسلم نے ابو موسیٰ اشعری سے روایت کی ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ہے واذ قال غیر المغضوب علیہم ولا الضالین فقولوا آمین۔ ”کہ جب امام غیر المغضوب علیہم ولا الضالین کہہ چکے تو تم آمین کہو“۔ اور بخاری اور مسلم نے ابوہریرہ (رض) سے روایت کی ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ہے کہ جب امام آمین کہے تو تم بھی آمین کہو۔ کس لیے کہ جس کی آمین ملائکہ کی آمین کے موافق پڑتی ہے تو اس کے گزشتہ گناہ معاف کئے جاتے ہیں اور یہ بھی ہے کہ سورۃ الحمد میں خدا کی ثناء اور صفت کے بعد دعا ہے اور دعا کے بعد آمین مہر الٰہی ہے کہ جس سے قبولیت کی امید زیادہ ہوتی ہے چنانچہ ابو داؤد نے ابو زبیر نمیری سے روایت کی ہے کہ ہم نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ باہر نکلے تو ایک شخص کو دعا میں نہایت تضرع کرتے دیکھا۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ اگر اس نے تمام کیا تو پالیا۔ ساتھیوں میں سے کسی نے پوچھا کہ یا حضرت کاہے کے ساتھ تمام کرے؟ فرمایا آمین کے ساتھ۔

آمین اسم ہے اس فعل کا کہ جو استجب ہے، یعنی قبول کر۔ صحیح بخاری میں ہے کہ عطا کا قول یہ ہے کہ آمین دعا ہے۔ الغرض آمین کے معنی (قبول کر) ہیں۔ یہ لفظ مد الف اور قصر الف دونوں سے جائز ہے اور بالاتفاق یہ لفظ قرآن کا جزو نہیں بلکہ جس طرح عام دعاؤں کے بعد یہ لفظ بولا جاتا ہے اسی طرح الحمد کے بعد بھی آمین کہنا بالاتفاق سنت ہے۔

لیکن صرف اس بات میں اختلاف ہے کہ اس کو آہستہ یا خفیہ کہنا بہتر ہے یا آواز سے ؟ امام ابو حنیفہ اور امام مالک اور سفیان ثوری وغیرہم اکابر علمائے تابعین اور تبع تابعین خفیہ کہنا اولیٰ سمجھتے ہیں چند دلائل سے :

(۱) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً، اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ کہ "اپنے رب سے تضرع اور خفیہ دعا مانگو اس کو حد سے بڑھنے والے پسند نہیں آتے۔ "اس آیت سے دعا کا خفیہ کرنا بہتر معلوم ہوتا ہے کس لیے کہ تضرع وزاری آہستگی میں خوب پائی جاتی ہے اور یہی بات دعا میں اصل الاصول ہے اور آمین دعا ہے جیسا کہ عطاء نے فرمایا اور دیگر مواضع سے بھی ثابت ہوتا ہے۔

(۲) بخاری اور مسلم کی احادیث مذکورہ (کہ جب امام غیر المغضوب علیہم ولا الضالین کہے تو تم آمین کہو) اخفا پر دلالت کرتے ہیں۔ کس لیے کہ اگر امام پکار کر آمین کہتا تو مقتدیوں کو معلوم ہوتا ہے کہ غیر المغضوب علیہم کا پتا دینا اور ملائکہ کے ساتھ موافقت بتلانا کچھ مفید نہیں (ابو داؤد اور ترمذی اور ابن ماجہ اور دارمی وغیرہ نے سمرہ بن جندب (رض) سے روایت کی ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) دو سکتہ کرتے تھے۔ سکتۃ اذا کبر وسکتۃ اذا فرغ من قرئۃ غیر المغضوب علیہم ولا الضالین "ایک سکتہ جب کرتے تھے کہ جب تکبیر تحریمہ کرتے تھے (اس سکتہ میں تعوذ و ثنا پڑھتے تھے اور ایک سکتہ (یعنی چپ کرنا) اس وقت کہ جب غیر المغضوب علیہم ولا الضالین پڑھ کر فارغ ہوتے تھے " (اس سکتہ میں آمین کہتے تھے) پس اگر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پکار کر آمین کہتے غیر المغضوب علیہم ولا الضالین کے بعد چپ نہ کرتے بلکہ آمین پکار کر کہتے۔ امام شافعی اور احمد بن حنبل وغیرہما علماء یہ فرماتے ہیں کہ ذرا آواز سے آمین کہے تو بہتر ہے کیونکہ وائل بن حجر سے ترمذی اور ابو داؤد اور دارمی اور ابن ماجہ نے روایت کی ہے کہ میں نے نبی صلی اللہ کو غیر المغضوب علیہم ولا الضالین پڑھ کر آمین کہتے سنا اور اپنی آواز کو بلند کیا اور اسی طرح ابوہریرہ (رض) سے مروی ہے کہ آمین سے مسجد گونج جاتی تھی۔ (رواہ ابن ماجہ) لیکن اس قسم کی احادیث کا یہ جواب ہے کہ درصورت معارضہ پہلی حدیث کے معارضہ کے ان میں صلاحیت نہیں کیونکہ ادھر قرآن اور صحیح احادیث ہیں اور ادھر صرف ایسی احادیث ہیں کہ جن میں محدثین کو کلام ہے اور اسی لیے امام بخاری نے باوجودیکہ جہر آمین کا باب باندھا مگر ان احادیث میں سے کسی کو بھی درج نہ کیا، ان کے نزدیک ان کی صحت پر وثوق نہ تھا فقط قولوا آمین کو روایت کرکے بس کر گئے اور قولوا سے کسی طرح جہر ثابت نہیں ہوتا ورنہ التحیات للہ الخ و قولوا ربنا لک الحمد (متفق

علیہ) میں بھی جہر کا قائل ہونا پڑے گا۔ ولم یقل باحد من العلماء۔ دوم اگر ان کی صحت بھی تسلیم کی جائے تو ان کی یہ توجیہ ہو سکتی ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے احیاناً تعلیم کے لیے آمین کو آواز سے کہہ دیا ہو گا تاکہ لوگوں کو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا آمین کہنا معلوم ہو جائے چنانچہ بخاری و مسلم نے قتادہ (رض) سے نماز ظہر کی بابت یہ روایت کی ہے کہ یسمعنا الآیۃ احیانا الحدیث "کہ کبھی آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کوئی آیت ہم کو سنا کر پڑھ دیتے تھے" حالانکہ ظہر کی نماز میں خفیہ پڑھنا سب کے نزدیک متفق علیہ ہے۔ پس صرف تعلیم کے لیے کہ میں ظہر میں فلاں سورت پڑھتا ہوں بعض آیات کو سنا دیتے تھے۔ اسی طرح آمین ہو تو بعید نہیں۔ پس جنہوں نے اس موقع کو دیکھ لیا انھوں نے آمین کا باآواز بلند کہنا اولیٰ سمجھ لیا، وہ اپنے مشاہدہ کے موافق سچے ہیں۔

سوم: اگر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہمیشہ پنجگانہ میں دم اخیر تک آمین پکار کر کہتے تو یہ فعل ایسا نہ تھا کہ عبداللہ بن مسعود (رض) جیسے جلیل القدر صحابہ پر مخفی رہتا حالانکہ وہ اس کا انکار کرتے ہیں۔ آج کل بعض صاحبوں نے ان خفیف مسائل میں بہت غلو کر کے مسلمانوں میں تفرقہ ڈال دیا اور باہمی نفاق اور کینہ کو بجائے مردہ سنت کے جلا دیا۔

بحث سوم: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰہِ الآیۃ۔ یعنی جب تو قرآن پڑھے تو شیطان سے خدا کی پناہ مانگ۔ اس لیے تمام علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ قرآن کو بغیر اعوذ کے نہ پڑھنا چاہیے پھر اعوذ مختلف طور پر پڑھتے ہیں زیادہ مشہور تو یہ ہے اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم۔ مصر کے قراء اس میں اور کلمات بھی ملاتے ہیں اور سر اس کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو مختلف قویٰ سے مرکب بنایا ہے جس طرح روحانی قوتیں کہ جو امور فطرت کی طرف اس کو رہنمائی کرتی ہیں اور جن کو قوائے ملکیہ کہتے ہیں اس کو ملے ہیں اسی طرح جسم کے متعلق ظلمانی قویٰ بھی اس کے پاس موجود ہیں جو کجی اور شہوت اور توہمات باطلہ کی طرف رہنمائی کرتے ہیں کہ جن کو قوائے بہیمیہ کہتے ہیں پس قویٰ ملکوتیہ تو ملائکہ اور روحانی اور لطیف اور نورانی اشخاص کے آثار کے آنے کا ذریعہ ہیں اور ان قوائے بہیمیہ کے گھوڑے پر شیطان رجیم سوار ہو کر آتا ہے اور گمراہ بناتا ہے۔ اسی لیے کبھی ان قوائے بہیمیہ کو بھی شیطان کہہ دیتے ہیں اور جس میں یہ قویٰ زیادہ پائے جاتے ہیں اس پر بھی اسی علاقہ سے شیطان کا اطلاق ہوتا ہے اور دراصل شیطان وہ ایک شخص خاص ہے کہ جو حضرت آدم (علیہ السلام) کو سجدہ نہ کر کے نافرمان ہوا۔ (چونکہ بعض کم فہم اس امر کو نہیں

سمجھتے انھوں نے ان قوائے بہیمیہ اور ملکیہ کو کہ جن پر اس علاقہ سے شیطان اور ملک کا اطلاق قرآن اور حدیث میں ہوا ہے اصل شیطان اور فرشتہ سمجھ کر وجود شیطان اور فرشتہ کا انکار کر دیا۔) حاصل کلام یہ کہ انسان کے اندر ان قوائے بہیمیہ کے لحاظ سے ہر رگ وریشہ میں شیطان پھر تا ہے اور قرآن مجید ایک نورانی اور ملکی چیز ہے تو پیشتر جب تک گندی چیزوں سے تصفیہ نہ ہولے یہ رنگ ملکوتی نہیں چڑھتا اور ان قوائے بہیمیہ کو فرو کرنے کا بشر کو مقدور نہیں، اس لیے ضرور ہوا کہ خدا سے پناہ مانگے اور جب اس سے کوئی بصدق دل پناہ مانگتا ہے تو اس کے قوائے بہیمیہ کو اس خیر میں خلل انداز نہیں ہونے دیتا، نہ شیطان کچھ خلل ڈال سکتا ہے۔ جس طرح عالم خواب میں وہم عقل کا معارض ہو کر ادھر ادھر بہکاتا اور کسی ادنیٰ مناسبت سے اصل شے کو دوسری چیزوں کی صورت میں دکھاتا ہے اسی طرح اس عالم میں انسان کے قوائے بہیمیہ اور ان کا سوار شیطان آدمی کی راہ میں ہر طرح سے خلل انداز ہوتا ہے بری چیزوں کو سجا کر آگے لاتا ہے، بھلی باتوں کو برا بنا کر دکھاتا ہے اور یہی تو وجہ ہے کہ اس عالم میں انسان مذاہب کے بارے میں گونا گوں اور ہر ایک غرض میں بنی نوع بو قلموں ہیں۔ کوئی اپنے ہاتھ کے تراشے ہوئے بت کے آگے دست بستہ کھڑا ہے۔ کوئی اپنی کسی دھن میں اڑا ہے کل حزب بمالدیھم فرحون ع ہر قوم راست راہے دینے و قبلہ گاہے۔ اللھم اھدنا الصراط المستقیم۔

(تفسیر حقانی۔ ابو محمد عبد الحق حقانی)

"اھدنا الصراط المستقیم "، ہمیں سیدھا راستہ دکھا۔ "صراط الذین انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم ولا الضالین"۔ ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام فرمایا ہے۔ جن پر غضب نازل نہیں ہوا اور وہ جو بھٹکے ہوئے نہیں ہیں۔ صراط کن کا۔ الذین ان لوگوں کا۔ یہاں یہ نہیں کہا کہ راستہ اس کتاب کا۔ صراط القرآن بھی تو کہا جا سکتا تھا۔ لیکن کیا کہا۔ صراط الذین۔ قرآن کا راستہ دیکھ کر تھیوری تو پتہ چل گئی۔ کیا کوئی کہتا کہ تھیورٹیکلی تو بہت اچھا ہے لیکن پریکٹیکلی نہیں ہے۔ قابل عمل نہیں ہے۔ بات بہت پیاری عمل نہیں ہو سکتا۔

تو پتہ چلا کہ با عمل ہے راستہ جو اللہ نے بتایا۔ اور لوگوں نے عمل کیا۔ کوئی بات نہیں کہ چند نے کیا۔ لیکن بہر حال کیا۔ ان کا کرنا اس بات کی گواہی ہے کہ یہ انسانی طور پر ممکن ہے اس راستے پر چلنا۔ رائٹ برادرز جو تھے جو ان کی پہلی فلائیٹ تھی۔ پہلا جہاز بنایا تھا انھوں نے۔ چند منٹ اڑا تھا۔ مگر یہ بات اس نے ثابت کر دی کہ heavier than air

flight ممکن ہے۔ ہوا سے زیادہ بھاری چیزیں اڑ سکتی ہیں ثابت کر دیا۔ ان لوگوں نے چل کر۔ ٹھیک ہے کہ یہ میجورٹی میں نہیں تھے۔ اکثریت میں نہیں تھے۔ اقلیت میں تھے لیکن یہ ثابت کر دیا کہ انسان چل سکتے ہیں اس پر۔ تو ان لوگوں کا راستہ مانگا جا رہا ہے جن پر تو نے انعام فرمایا۔

اب یہ کون لوگ ہیں جن کا راستہ مانگا جا رہا ہے۔ جو انعام یافتہ لوگ ہیں۔ خود قرآن ہی نے اس کا جواب دیا ہے۔ سورۃ النساء 69 میں فرمایا: "و من یطع اللہ و رسولہ "اور جو کوئی اطاعت کرے گا اللہ اور اس کے رسول کی "فاولئک الذین انعم اللہ علیھم "تو وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام فرمایا: جو اللہ اور رسول کی اطاعت کریں گے۔ وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام فرمایا۔ "من النبیین و صدیقین والشھداء والصالحین "یعنی انبیاء اور صدیقین اور شھداء اور صالحین کیسے لوگ ہیں یہ۔ یہ اللہ کا elite club ہے۔ یہ اللہ کے ارسٹوکریٹس ہیں۔ یہ رول ماڈلز میں جو اللہ نے دیئے۔ دنیا میں جنھیں ہم elite سمجھتے ہیں جو ہماری نظر میں ارسٹوکریٹس ہیں۔ جو ہماری نظر میں رول ماڈلز ہیں۔ ان کے ساتھ تو ایک لمحہ گزارنے کو ہم اپنی زندگی کا سرمایہ سمجھتے ہیں۔ فخر کرتے ہیں۔ ہم اس کو تصویر کے ذریعے محفوظ کر لینا چاہتے ہیں۔ تاکہ سب دیکھیں کہ فلاں celebrity کے ساتھ ہم نے دو منٹ گزارے تھے۔ یا کم از کم ایک فلپس بلب جلنے جتنی دیر ہم نے ساتھ گزارا تھا۔ اور اس کو ہم اہتمام سے سجا دیتے ہیں۔ تو یہ بھی تو celebrities ہیں۔ ان کے ساتھ وقت گزارنا چاہتے ہو تو ان کے راستے پر چلو۔ ان کی تعظیم کرو۔ لیکن تعمیل بھی کرو۔ respect بھی کرو ان کی اور ان کو obey بھی کرو۔ تو ان کے ساتھ کیا ہو گا۔ اللہ تمہیں ان کے ساتھ کر دے گا۔ چند سیکنڈ کے لیے نہیں۔ خلدین فیھا۔ ہمیشہ ہمیشہ رہنے والے ہوتے ہوئے۔ ہمیشہ ہمیشہ ان کے ساتھ رہو گے۔ اور فرمایا۔ "وحسن اولئک رفیقا "کتنے اچھے ہیں رفیق جو کسی کو ملیں۔ کیا اچھی کمپنی ہے۔ جو کسی کو میسر آ جائے۔ کیا خوش قسمت ہوں گے وہ لوگ جن کو یہ کمپنی ملے۔ صرف انبیاء کی بات نہیں ہوئی۔ جیسے ابھی ہم نے بات کی۔ انبیاء دنیا میں ہمیشہ نہیں رہتے۔ اور نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بعد تو نبوت رسالت کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔ ہر نبی کی امت میں کچھ لوگ ہوتے ہیں جو صدیق کہلاتے ہیں۔ سچے لوگ۔ نبی کی تعلیمات پر اور ان کے بتائے ہوئے طریقوں پر عمل کرتے ہیں۔ شہید ہوتے ہیں۔ گواہی دینے والے لوگ۔ اور شہید وہ بھی ہوتے ہیں جنھوں نے دین کی حفاظت کے لیے جان دے دی ہو۔ صالحین۔ نیک لوگ۔ قیامت تک یہ تین کیٹیگریز تو موجود

رہیں گی۔ صدیقین۔ شھداء اور صالحین۔ جو انبیاء کے بتائے ہوئے راستے کو تازہ رکھیں گے۔ تاکہ قیامت کے دن کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ اللہ ہم تو چلنا چاہتے تھے سیدھے راستہ پر۔ راستہ گم ہو گیا۔ ہمیں پتہ ہی نہ چلا کہ وہ گم ہو گیا۔ تو ہم کیسے چلتے اس راستے پر۔ نہیں۔ وہ راستہ اللہ تعالیٰ نے محفوظ رکھا ہے۔ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ہمیں یہ خوشخبری سنائی ہے کہ مسلمان امت کبھی پوری کی پوری گمراہ نہیں ہوئی۔ بلکہ ایک گروہ ہر دور میں ہمیشہ حق پر قائم رہے گا۔ اب ہم نشاندہی point out کر کے نہیں کہہ سکتے کہ یہ گروہ حق پر ہے۔ ہم صرف اپنے لیے دعا کر سکتے ہیں کہ اللہ مجھے اس گروہ میں شامل کر لے۔ اور گروہ کا مطلب یہ نہیں کہ کوئی خاص ان کا نام ہو گا۔ کوئی خاص ان کا نشان ہو گا۔ گروہ کا مطلب ہے ایک جیسا عمل کرنے والے لوگ۔

ہو سکتا ہے کہ کوئی ایک پاکستان میں ہو، ایک سعودی عرب میں ہو، کوئی ایک افریقہ میں ہو، کوئی ایک امریکہ میں ہو، کہیں بھی ہو سکتے ہیں۔ scattered ہو سکتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی کسی گاؤں میں رہتا ہو۔ کوئی کسی جنگل میں رہتا ہو۔ لیکن عمل ان کا کیا ہو گا۔ عمل ان کا common factor ہے۔ عمل ان کا انبیاء کے نقش قدم پر اور صدیقین شہداء اور صالحین پر ہو گا۔ حدیث میں یہ مضمون بھی ہمیں ملتا ہے کہ بگاڑ اور فساد کے زمانے میں۔ کرپشن کے زمانے میں ایک سنت کو زندہ کرنے کا بہت بڑا اجر ہے۔ مبارکباد کے مستحق ہیں وہ لوگ۔ تو ہدایت مانگی گئی ہے یہاں پر۔

ہدایت کے بھی بڑے درجے ہیں۔ مثال کے طور پر آپ کو راستے کی تلاش ہے۔ آپ گاڑی میں جا رہی ہیں۔ کہیں رک کر ہم پتہ پوچھ لیتے ہیں تو ایک سب سے بنیادی درجہ ہدایت کا یہ ہے کہ کوئی آپ کو تھوڑا سا سمجھا دے آپ یوں جائیے۔ یوں جائیے۔ آپ فلاح جگہ پہنچ جائیں گی۔ وہ بھی ہدایت ہے۔ زبانی کلامی بتا دینا۔ اور مزید تھوڑا سا درجہ یہ ہو گا کہ وہ اور آپ کو مزید explain کرے۔ کہ آپ جائیں گی تو ایک سائن بورڈ آئے گا یا فلاں جگہ اس رنگ کا مکان آئے گا۔ یہ لکھا ہوا آئے گا تو آپ وہاں سے مڑ جائیں۔ مزید وہ سمجھاتا ہے اور بتاتا ہے۔ کامل ہدایت یہ ہو گی کہ وہ کہے کہ میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔ میں اپنی گاڑی میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔ آگے آگے میں ہوں گا گاڑی میں آپ میرے پیچھے پیچھے آ یئے گا۔ اور وہ منزل تک خود پہنچا دے۔ اب تو غلطی کا اور بھٹکنے کا کوئی گمان ہی نہیں۔ الا یہ کہ کوئی خود اپنی مرضی سے اس کو follow کرنا چھوڑ دے۔ اب یہ اس کی اپنی مرضی اس نے تو ہدایت دینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ تو انبیاء نے یہ کام کیا۔ انگلی پکڑ کر ہمیں چلایا آگے آگے lead کیا اور کہا میرے پیچھے پیچھے آؤ۔ اب جو

اپنی مرضی سے اس راستے کو چھوڑ دے یہ اس کی اپنی choice ہے۔ تو اپنے بھٹکنے کا الزام قیامت کے دن کسی اور پر رکھ نہ سکے گا۔ منزل تک پہنچنے کے لیے انسان کو ہدایت کی ضرورت رہتی ہے۔ جو ہمارا سفر ہے زندگی کا وہ موت پر ختم ہو گا۔ تو مرنے تک۔ مرتے دم تک انسان کو سیدھے راستے پر چلنا ہے۔ imagine کریں کہ ساری زندگی چلتے رہے۔ اور آخر میں بھٹک گئے۔ پورا دن صحیح راستے پر چلتے رہے۔ آخر میں کہیں ادھر ادھر مڑ گئے۔ راستہ گم کر بیٹھے۔ تو ٹائم بھی ضائع ہوا۔ محنت بھی ضائع ہوئی۔ آپ نے وہ دیکھا ہو گا snakes n ladders کا جو game ہوتا ہے لوڈو کا گیم۔ کہیں تو سیڑھیاں بنی ہوئی ہوتی ہیں۔ اور 99 پر انھوں نے ایک بڑا سا سانپ بٹھایا ہوتا ہے۔ جب ہم کھیلتے تھے تو اس سانپ سے سب سے زیادہ ڈر لگتا تھا۔ اگر اس پر گوٹ آتی تو گئے بالکل نیچے۔ تو بالکل اسی طرح ہے۔ زندگی کا اختتام بھی بڑا اہم ہے۔ کوئی یہ نہ سوچے کہ ساری عمر تو نیکیاں کرتے رہے۔ اب ہو گئے 80 سال کے۔ اب کہاں بھٹکیں گے۔ بالکل بھٹک سکتے ہیں۔ بہت محتاط ہونے کی ضرورت ہے۔ ایسا نہ ہو کہ سب کی کری کرائی محنت جو ہے وہ ضائع ہو جائے۔ تو آخری سانس تک ہدایت مانگنی ہے۔ جب لوگ جنت میں پہنچیں گے انشاء اللہ تعالیٰ اور دعا کریں کہ ہم ان لوگوں میں سے ہوں۔ و قالوا۔ جنتی کہیں گے۔ الحمد للہ الذی ھدانا لھذا وما کنا لنھتدی لولا ان ھدانا اللہ۔ لقد جاءت رسل ربنا بالحق ونودوا ان تلکم الجنۃ التی اور ثتموھا بما کنتم تعملون۔

وہ کہیں کے سب تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے ہم کو یہ راستہ دکھایا۔ الحمد للہ سے سفر شروع ہوا تھا۔ سورۃ الفاتحہ الحمد للہ سے شروع ہوئی ہے۔ جنت میں پہنچ کر جب سفر ختم ہو جائے گا۔ جب بھی یہی کہیں گے الحمد للہ۔ کہ اللہ نے ہم کو یہ راستہ دکھایا۔ ہم خود راستہ نہ پا سکتے تھے اگر اللہ ہماری راہ نمائی نہ فرماتا۔ ہمارے رب کے بھیجے ہوئے رسول حق لے کر آئے تھے۔ اور ان کو پکارا جائے گا یہ جنت ہے جس کے وارث تم آج بنے ہو۔ بما کنتم تعملون۔ بوجہ اس عمل کے جو تم کرتے رہے تھے۔

اب دیکھیں کہ سیدھے راستے کی تڑپ بہت زیادہ ہے۔ طلب بہت زیادہ ہے۔ تو مزید وضاحت کے ساتھ اس کو بیان کیا گیا۔ جب چیز انسان کو بہت شدت کے ساتھ چاہیے ہوتی ہے۔ وہ صرف ایک دفعہ کہنے پر اکتفا نہیں کرتا۔ بلکہ وہ اس بات کو بار بار دہراتا ہے۔ مختلف انداز سے بیان کرتا ہے۔ تاکہ اگلا سمجھ جائے کہ میں مانگ رہا ہوں۔ جیسے بعض دفعہ بچیاں ان کو کوئی doll چاہیے ہوتی ہے۔ تو وہ خالی یہ نہیں کہتیں آپ سے آ کر کہ ہمیں doll چاہیے وہ کہتی

ہیں۔ وہ doll اس دکان پر رکھی ہے blue eyes ہیں۔ اس نے پنک ڈریس پہنا ہے۔ کس طرح explain کرتی ہیں۔ سمجھاتی ہیں۔ کیوں اتنا سارا بولتی ہیں وہ اس پر۔ اس لیے کہ ان کو craving ہے نا۔ طلب ہے اس کی۔ تو یہ جو دعا مانگی جا رہی ہے سیدھے راستے کی۔ اس میں آپ کو وہ طلب محسوس ہو رہی ہے۔ craving ہے سیدھے راستے کی۔ اھدنا الصراط المستقیم کافی تھا کہنا۔ لیکن نہیں۔ اب اور explain کیا۔ صراط الذین انعمت علیھم۔ اللہ راستہ ان لوگوں کا جن پر تونے انعام فرمایا۔ جن کو تونے نعمت دی۔ ان کا راستہ چاہیے۔ اب کبھی اپنے معاشرے میں لوگوں سے پوچھیں۔ random کہ آپ کے پاس کیا کیا نعمتیں ہیں تو وہ کیا بتائیں گے۔ کیا گنوائیں گے نعمتوں میں۔ وہ بتائیں گے کہ اللہ نے تو بڑا اکرم کیا ہمارے اوپر۔ اللہ نے ہم کو اولاد دی۔ دولت دی۔ عزت اقتدار پوزیشن پاور۔ آرام۔ سوشل سٹیٹس۔ یہ سب گنوائیں گے نا آپ کو۔ اس کو ہم نعمت کہتے ہیں۔ اب اس جواب کو ذہن میں رکھ کر ایک تصور کریں فرعون کے دربار کا۔

فرعون کا دربار ہے۔ بڑی شان و شوکت ہے۔ کسی کے پاس ہے سوشل سٹیٹس فرعون سے زیادہ؟ کسی کے پاس نہیں۔ بے تحاشا دولت۔ اپنے قیمتی تخت پر بیٹھا ہے۔ خدام۔ نوکر چاکر۔ اولاد۔ کوئی کمی نہیں۔ ہر وہ چیز جس کو نعمت سمجھا جاتا ہے اس کے پاس اس کی کمی نہیں۔ سامنے اس کے موسیٰ کھڑے ہیں۔ کوئی پوزیشن نہیں۔ کوئی دولت نہیں۔ کوئی قیمتی لباس نہیں۔ نہ دنیا والے کوئی عزت کر رہے ہیں۔ تو فرعون میں سے اور موسیٰ میں سے۔ نعمت والا کون ہے؟۔ ہمارے حساب سے جو ہمارے معاشرے میں تصور پایا جاتا ہے اس حساب سے تو فرعون نعمتوں والا ہوا۔ تو کیا ہم فرعون کا راستہ مانگ رہے ہیں۔ انعمت علیھم۔ نہیں۔ ولید بن مغیرہ کا جو مشرک تھا۔ ایمان نہ لایا۔ اس کے بہت سارے بیٹے تھے۔ ہم بیٹوں کو نعمت سمجھتے ہیں۔ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا کوئی بیٹا نہیں تھا۔ تو دونوں میں سے نعمت والا کون ہے؟ ولید بن مغیرہ یا نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)۔ تو ہم نے کہا کہ موسیٰ پر اللہ نے انعام فرمایا۔ ہم کہتے ہیں کہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر اللہ نے انعام فرمایا ان کو نعمت دی۔ تو ہر نعمت کیا ہوئی۔ ہدایت۔ کتنے لوگ ہیں جو ہدایت کو نعمت کے طور پر بیان کریں۔ شاید ہی کوئی آپ کو ملے۔ اگر ہدایت ہے اور اس کے ساتھ بادشاہت ہے۔ اسٹیٹس ہے۔ نعمت ہے۔ داؤد سلیمان (علیہم السلام) کے لیے بادشاہت نعمت تھی۔ اس لیے کہ ان کے پاس ہدایت تھی۔ فرعون کے پاس بھی بادشاہت تھی لیکن اس کے پاس ہدایت نہیں تھی۔ تو اس کی

بادشاہت نعمت نہیں رہی۔ صحت ہے۔ فرحت ہے۔ اگر ہدایت نہیں تو یہ نعمت نہیں ہے۔ بلکہ مزید گناہ کمانے کے ذرائع بن جائیں گے۔ اولاد ہے۔ سیدھے راستے پر ہے صدقہ جاریہ ہے۔ اولاد ہے اور اگر اولاد ہدایت پر نہیں ہے۔ قیامت کے دن سخت نقصان کا سبب بنے گی۔ کسی بھی چیز کو ہم اس فارمولے پر اپنا سکتے ہیں۔ اس پر رکھ کر دیکھ لیں کہ وہ چیز اصل میں نعمت ہے یا نہیں۔ تو ہدایت وہ میجک touch stone ہے۔ کہ جس چیز کو یہ touch کر جائے وہ چیز نعمت بن جاتی ہے۔ اور ہدایت کے بغیر کوئی نعمت نعمت نہیں ہے۔ نہ دولت نعمت ہے۔ نہ خوبصورتی نعمت ہے۔ نہ intelligence نعمت ہے۔ کوئی چیز نعمت نہیں اگر ہدایت نہیں ہے۔ اور ہدایت ہے۔ ہدایت کے ساتھ دولت ہے۔ ہدایت کے ساتھ خوبصورتی ہے۔ ہدایت کے ساتھ intelligence ہے۔ اولاد ہے۔ سوشل پوزیشن ہے۔ سب چیزیں نعمت ہیں۔ جس طرح سے راستے پر ہم چلتے ہیں۔ کوئی نہ کوئی اس کے land marks آتے ہیں۔ سنگ میل آتے ہیں۔ جس سے کہ ہم judge کرتے ہیں کہ ہم سیدھے راستے پر ہیں یا نہیں۔

بالکل اسی طرح جو انعام پانے والے لوگوں کا راستہ ہے اس کے بھی کچھ سنگ میل آتے ہیں۔ کچھ اس کے نشان راہ آتے ہیں۔ اور وہ حالات ہوتے ہیں۔ جو حالات انبیاء صدیقین پر گزرے جس قسم کی مجبوریوں سے وہ گزرے۔

صراط مستقیم پر چلنے والا ہر انسان کم یا زیادہ اس قسم کے حالات سے گزرتا ہے۔ اس پر صبر کے مراحل آتے ہیں۔ اور بعض دفعہ آزمائشیں اس پر آتی ہیں۔ کیوں۔ اس لیے کہ انبیاء پر بھی آئیں۔ شھداء پر بھی آئیں۔ اس لیے اللہ نے قرآن میں انبیاء کے قصے بار بار بیان کئے ہیں۔ تاکہ لوگ اپنا رخ ٹھیک کر لیں۔ یہ قصے compass کی طرح ہیں۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد کوئی قصہ آجائے گا کسی نبی کا۔ self analysis کی دعوت دیتے ہیں کہ تم اپنا رخ دیکھ لو۔ تم صراط مستقیم پر ہو یا نہیں۔ ایسا تو نہیں کہ تم سیدھے راستے پر سمجھو اپنے آپ کو اور تم بھٹک رہے ہو۔ تو پھر دیکھو یہ حالات تم پر آرہے ہیں۔ یہ صبر کے مراحل آرہے ہیں۔ اگر آرہے ہیں تو اس کا مطلب یہ کہ تم سیدھے راستے پر ہو۔ اب جو سیدھے راستے پر آ گئے۔ اب اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ضروری سیدھے راستے پر رہیں گے ساری زندگی۔ اس وقت سیدھے راستے پر رہیں گے جب تک آیت کو follow کرتے رہیں گے۔ نشانیوں کو follow کرتے رہیں گے۔

باہر کے ملکوں میں آپ جائیں۔ signs لگے ہوتے ہیں۔ ایک sign آپ نے miss کر دیا۔ آپ کہیں سے کہیں نکل جائیں گے۔ کہاں سے کہاں پہنچ جائیں گے۔ انسان بالکل ہی بھٹک جاتا ہے۔ لہٰذا signs کو follow کرنا نہایت

ضروری ہے۔ بعض لوگ غلط turn لے لیتے ہیں۔ کہیں اور چلے جاتے ہیں۔ تو یہ ہوا۔ کہ کچھ لوگ تھے جو سیدھے راستے پر آ گئے۔ لیکن یہ جو سیدھا راستہ ہے یہ branch off کر جاتا ہے تین طرح سے۔ سیدھا راستہ تو ہے۔ لیکن آگے جا کر کیا ہوا۔ تین شاخیں بن گئیں۔ ایک جو کہ سیدھا راستہ سیدھا ہی چلتا چلا گیا۔ یہ ہے صراط مستقیم۔ ایک ہے وہ extreme right پر چلا گیا۔ ایک extreme left پر چلا گیا۔ دوسری انتہا پر چلا گیا۔ تھے پہلے سب ایک ہی سیدھے راستے پر۔ لیکن کیا ہوا۔ صحیح نشان follow نہ کرنے کی وجہ سے غلط پگڈنڈیوں پر چلے گئے تو بھٹک گئے۔ بہت دور چلے گئے۔ اب ان ہی کا ذکر آ رہا ہے اس آیت کے اندر۔ ان extreme groups کا ذکر آ رہا ہے۔ ایک میں مغضوب علیھم۔ ایک میں ضالین۔ مغضوب علیھم کون ہیں۔ مغضوب۔ غ ض ب۔ غضب سے بنا ہے یہ لفظ۔ جن پر اللہ کا غصہ نازل ہوا۔ اللہ کا غضب جن لوگوں پر نازل ہوا۔ تو یہ بھی کہا positive انداز میں کہ اللہ ہمیں انعام یافتہ لوگوں کا راستہ چاہیے۔ ساتھ ساتھ یہ بھی کہہ دیا کہ اللہ ان کا نہیں چاہیے جن پر تیرا غضب نازل ہوا۔ یہ کون لوگ تھے جن پر اللہ کا غضب نازل ہوا۔ اور رحمان ور حیم کا راستہ۔ رحمان ور حیم اللہ اور پھر وہ غضب کرے کسی پر۔ کوئی وجہ ہوگی نا۔ ہو نہیں سکتا کہ اللہ بلا وجہ کسی پر غضب کرے۔ تو ہم اس کو بھی مثالوں سے سمجھتے ہیں۔

کسی بھی آپ سڑک کو ذہن میں لے کر آ جائیے۔ ایک راستہ ہے سیدھا منزل پر جا رہا ہے۔ اب کیا ہوا۔ اس راستے پر چلنے والوں سے کچھ لوگوں کو چڑ ہو گئی۔ ان کو ضد ہو گئی۔ ایک وہاں پر کوئی پریشر گروپ ایسا بن گیا کہ وہ کھڑا ہو گیا راستے میں۔ اب جو اس راستے پر چل رہا ہے۔ سیدھے راستے کی طرف جانا چاہ رہا ہے۔ وہ اس کو برا لگنے لگ گیا۔ کہتے ہیں یہاں مت چلو۔ تنگ کرنا شروع کر دیا۔ مارنا شروع کر دیا۔ جو اس راستے پر چل رہے تھے اور جو بھی سیدھے راستے کے نشانات تھے۔ sign board تھے ان کو بھی بدل دیا۔ حالانکہ وہ خود جانتے تھے کہ ہم برا کر رہے ہیں۔ ہم غلط کر رہے ہیں۔ ہمیں ایسا کرنا نہیں چاہیے۔ لیکن شرارت کی وجہ سے۔ تکبر کی وجہ سے۔ ڈھٹائی کی وجہ سے کرتے چلے گئے ایسے ہی۔ خود بھی بھٹک گئے اور جو بعد میں آنے والے لوگ تھے ان کو بھی بھٹکا دیا۔ اب جن لوگوں نے انھیں منع کیا کہ تم یہ کام مت کرو۔ تم غلط کام کر رہے ہو تم سیدھے راستے پر چلنے والوں کو کیوں تنگ کر رہے ہو۔ کیوں اتنا harass کرتے ہو۔ تم ان signs میں کیوں تبدیلی کرتے ہو۔ یہ تو ہلاک ہو جائیں گے۔ تو ایسے لوگوں کو مارنا پیٹنا شروع کر دیا انھوں نے۔ دشمن ہو گئے۔ کتنوں کو تو جان سے ہی مار ڈالا۔ قتل ہی کر دیا۔ اگر آپ کسی کو ایسا کام کرتے

دیکھیں تو آپ کو اس پر غصہ آئے گا یا پیار۔ لازماً غصہ آئے گا۔ بالکل یہ یہی حال ہوا۔ بنی اسرائیل کا۔ یہودیوں کا۔ اللہ نے ان کو صراط مستقیم صاف دکھا دی۔ اللہ تعالیٰ نے انبیاء ان میں بھیج دیئے۔ نبیوں کا راستہ اپنا بھی لیا انھوں نے۔ اس کے بعد پھر ان کو چڑ ہو گئی۔ اور ضد ہو گئی اس راستے پر چلنے والوں سے۔ اس راستے سے ہی چڑ ہو گئی۔ راستے کے جو signs تھے۔ آیات تھیں انھوں نے اس میں تبدیلی کر دی۔ اللہ کی کتاب میں تحریف کر دی۔ جب نبیوں نے ان کو منع کیا۔ نبیوں نے ان کو روکا۔ نبیوں کو قتل کر دیا۔ اور جو اچھے لوگ تھے ان کی مخالفت کر ی۔ لہٰذا ان پر اللہ کا غضب نازل ہوا۔

سورۃ البقرہ 61 میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے بنی اسرائیل کے بارے میں وباؤ بغضب من اللہ۔ اور وہ لوٹے اللہ کا غضب لے کر۔ آیت 90 میں فرمایا۔ فباؤ بغضب علی غضب۔ تو وہ لوٹے غضب پر غضب لے کر۔ غضب پر غضب کے مستحق ہو گئے۔ تو مغضوب علیھم۔ ان کو معلوم تھا کہ ہم غلط کام کر رہے ہیں۔ تب بھی انھوں نے یہ کام کیا۔ دین کو ضرورت سے زیادہ سخت بنا دیا۔ ضرورت سے زیادہ مشکل بنا دیا۔ سخت دل لوگ تھے۔ سنگدل لوگ تھے۔ ان کے دلوں کو پتھروں سے تشبیہ دی گئی ہے۔ ہم انشاء اللہ آگے پڑھیں گے۔

یہ ایک extreme ہو گئی۔ extreme left مغضوب علیھم۔ ایک ہے extreme right دوسری انتہا۔ وہ کیا ہوئی۔ کچھ لوگ تھے۔ اچھے خاصے سیدھے راستے پر تھے۔ لیکن کیا تھا۔ تھے بڑے نرم دل۔ بڑے محبت کرنے والے۔ لوگوں کے ساتھ بہت پر خلوص۔ پہلے کون سے تھے؟۔ لوگوں کو تنگ کرنے والے۔ مارتے تھے۔ پیٹتے تھے۔ قتل کر دیتے تھے ان کا کیا تھا۔ یہ نہ مارتے تھے۔ نہ پیٹتے تھے۔ یہ لوگوں سے بہت ہی محبت کرتے تھے۔ ان کے دل بہت ہی نرم تھے۔ یہ دیکھتے تھے کہ سیدھے راستے پر چلنے میں تھوڑی مشکلات ہو رہی ہیں لوگوں کو۔ ان کو بہت ترس آیا۔ انھوں نے کہا کہ کوئی بات نہیں۔ تم سیدھے راستے پر نہیں چل سکتے۔ چلو چھوڑ دو۔ جو راستہ تمہیں آسان لگے تم آسانی کے ساتھ چلو۔ it' s ok everything is fine۔ سب ٹھیک ہے۔ تم اس راستے پر چلو اس پر چلو جہاں مرضی چلو۔ ان کو اتنی ہمدردی ہو گی۔ feel free۔ جو مرضی کرو۔ اللہ تو ہر جگہ ہے۔ جس راستے پر بھی تم چلو گے تم کو جنت مل جائے گی۔ تم کو اللہ مل جائے گا۔ بس محبت ہی محبت کہتے رہو تم۔ کہ اللہ ہمیں تجھ سے محبت ہے۔ صرف تم یہ زبان

سے کہتے رہو۔ تمھیں اللہ مل جائے گا۔ نیت کتنی اچھی ہے۔ جذبہ کتنا اچھا ہے۔ محبت کتنی ہے۔ تو کیا اچھی نیت کی وجہ سے۔ کیا بہت محبت کی وجہ سے انسان کبھی بھٹک سکتا ہے۔ بالکل بھٹک سکتا ہے۔

مثال کے طور پر آپ کسی کے گھر پہنچنا چاہتے ہیں۔ اور میں آپ سے کہوں کہ راستہ ہے تو مشکل مگر آپ جس راستے سے مرضی چلے جائیے۔ آپ جہاں جی چاہے مڑ جائیں۔ بس آپ کہتی رہیں کہ آپ کو فلاں سے محبت ہے۔ فلاں سے محبت ہے۔ فلاں کے گھر پہنچنا چاہتی ہوں۔ آپ پہنچ جائیں گی۔ آپ کو ہنسی نہیں آئے گی اس بات پر۔ آپ کہیں گی نہیں کہ آپ ہمیں بھٹکانا چاہتی ہیں۔ تو اس طرح انھوں نے نرمی کی وجہ سے کچھ کو بھٹکا دیا خود بھی بھٹک گئے۔ اور پھر یہ الضالین ہو گئے۔ بھٹکنے والے۔ صرف ارادہ کر لینے سے۔ صرف خواہش کر لینے سے۔ کوئی سیدھے راستے پر چل نہیں سکتا۔ کوئی منزل پر پہنچ نہیں سکتا۔ جب تک کہ address اس کے پاس نہ ہو۔ جو اللہ تک پہنچنا چاہتا ہے جنت تک پہنچنا چاہتا ہے اس کا ایک خاص طریقہ اللہ نے اپنی کتابوں میں بتا دیا ہے۔ address جنت کا قرآن کے اندر ہے۔ نہیں ہے اس کے علاوہ اور کہیں بھی۔ کتنی حماقت کی بات ہے۔ یہ سوچنا کہ یہ ایڈریس وہ ایڈریس ہے جہاں میں پہنچنا چاہتی ہوں۔ کیسے ہو سکتا ہے وہ تو ایک خاص ایڈریس ہے۔ جہاں آپ کو پہنچنا ہے۔ ایک خاص گھر ہے جہاں آپ کو پہنچنا ہے۔ تو اللہ کا تو ایک ہی ایڈریس ہے۔ اللہ کا پتہ قرآن میں لکھا ہوا ہے۔ یہ یہ کرو گے اللہ تک پہنچ جاؤ گے۔ صراط مستقیم پر چلتے ہوئے مقامات آتے ہیں واقعی مشکل ہوتے ہیں ایسے موقعوں پر لوگوں کی ہمت بندھانی ہے۔ یہ نہیں کرنا کہ راستہ مشکل ہے چلو چھوڑ دو۔ کوئی بات نہیں۔ کبھی ہم نے اپنے بچوں کو بھی یہ کہا کہ اچھا مشکل ہو رہی ہے چلو چھوڑ دو یہ امتحان رہنے دو۔ تم۔ اولیول کی جگہ ایسا کرو کلاس ٹو کا امتحان دے دو۔ امتحان ہی تو ہے۔ چلو چل کر تم 2 کا ٹیبل یاد کر لو۔ نہیں آتا تم کو ad math چلو رہنے دو۔ 2 کا ٹیبل تو آتا ہے نا۔ 2 کا ٹیبل لکھ کر بھی تم کو لیولز میں A مل جائے گا۔ کبھی کہا۔ بھٹکا دینا اگر ایسے کبھی مشورہ دیا تو۔ آپ نے اپنی طرف سے آسانی کی تو۔ اس کو تو نقصان میں ڈال دیا اپنے بچے کو۔ تو انھوں نے ایسی آسانیاں کر دیں۔ یہ نصاریٰ تھے۔ عیسائی۔ حد درجہ نرمی تھی ان کے دلوں کے اندر۔ رافت و رحمت تھی ان کے دلوں کے اندر۔ لیکن حد سے زیادہ تھی۔ اس کا بھی بڑا نقصان ہوا۔ ہمیں ایسی محبت نہیں کرنی لوگوں سے۔ سیدھے راستے پر مشکلات آتی ہیں۔ لوگوں کی ہمت بندھانی ہے۔ خود بھی جمے رہنا ہے۔

استقامت دکھانی ہے۔اس سیدھے راستے پر چلتے رہنا ہے۔۔ آہستہ آہستہ ہی سہی۔ تھوڑا تھوڑا ہی سہی۔ لیکن چلنا اسی راستے پر ہی ہے۔choice ہی نہیں ہے۔ کوئی اور راستہ ہی نہیں ہے۔ جو جنت کی طرف لے کر جاتا ہو۔

پھر کیا ہوتا ہے۔ اس راستے پر چلنے والا پہلے تو تنہا ہوتا ہے۔ پھر وہ دوسرے کو دعوت دیتا ہے۔ تیسرے کو دعوت دیتا ہے۔ اور چھوٹا سا قافلہ بن جاتا ہے۔ ایک گروپ بن جاتا ہے۔ اور یہ قافلہ اس کے لوگ ایک دوسرے کو سپورٹ کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں کوئی گر جاتا ہے اس کی مدد کرتے ہیں۔ کوئی حوصلہ ہارنے لگتا ہے اس کی ہمت بندھاتے ہیں۔ دوستی کا تقاضہ ہے ناتواس راستے پر جب انسان آتا ہے تو اپنے دوستوں کو ضرور لانا چاہتا ہے۔ اپنے گھر والوں کو ضرور لانا چاہتا ہے۔ مشکلات کی وجہ سے یہ مشورہ نہیں دیتا کسی کو کہ تم یہ راستہ چھوڑ دو راستہ بدل لو۔ اس راستے کا۔ صراط مستقیم کا یہ چھوٹا سا قدم ہے جو اس وقت آپ لوگوں نے اٹھایا ہے۔ آپ نے اس کتاب ہدایت کو ابھی صرف کھولا ہے۔ ہو سکتا ہے کسی کو مشکل لگے۔ تو کوئی بات نہیں۔ ابھی مشکل ہے پھر آسان ہو جائے گا۔ زندگی کا تو کچھ پتہ نہیں۔ کوئی اپنی expiry date لے کر پیدا نہیں ہوتا۔ کچھ نہیں پتہ چلتا کسی کا۔ تو اگر کوئی مشکلات کی وجہ سے راستہ چھوڑنے کا سوچے۔ اور آپ اس کو مشورہ بھی چھوڑنے کا دے دیں تو یہ ہمدردی کے روپ میں دشمنی بہت بڑی کی۔ منزل گم کر دی اس کی۔ تو یہود نے رسول دشمنی کی وجہ سے اپنے آپ کو مغضوب علیھم بنایا۔ سیدھے راستے سے ہٹ گئے۔ عیسائی رسول کی محبت میں سیدھے راستے سے ہٹ گئے۔ حد سے بڑھی ہوئی محبت میں سیدھے راستے سے ہٹ گئے۔ یہودیوں نے انسانیت سے نفرت کی۔ عیسائیوں نے انسانیت سے محبت کی۔ وہ نفرت میں حد سے بڑھ گئے۔ یہ محبت میں حد سے بڑھ گئے۔ دونوں ہی سیدھے راستے سے ہٹ گئے۔ حد سے بڑھی ہوئی محبت بھی گمراہ کر دیتی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ محبت محبت تو بس اچھی ہی ہے۔love ہی love ہونا چاہیے۔ محبت اچھی ہے۔ مگر ایک خاص حد تک ہی اچھی ہے۔ تو محبت کی بھی limitations ہوتی ہیں۔ موقع محل ہوتا ہے۔ کب کرنی ہے اور کتنی کرنی ہے۔ ہمیں کون سکھائے گا کہ رسول سے کتنی محبت کرنی ہے۔ کتنی تعظیم کرنی ہے رسول کی۔ کون بتائے گا خود رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ہمیں بتایا ہے کہ تم لوگ مجھ سے کتنی محبت کرو۔ تم میری کس طرح تعظیم کرو۔ میری respect کا طریقہ کیا ہونا چاہیے۔ یہ سب کچھ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بتایا ان میں سے ہدایت ہی ہے۔ تو کہیں ایسا نہ ہو کہ اپنے دل کو اپنی خواہش کو اپنے نفس کو ہدایت کا ذریعہ ہدایت کا source بنا لیں۔

سمجھیں کہ میرا دل چاہتا ہے کہ میں یہ کروں۔ تو سمجھیں کہ دل چاہنے سے دنیا میں کچھ نہیں ملا۔ آخرت میں کیسے ملے گا۔ تو تین راستے ہمارے سامنے آ گئے۔ ایک انعمت علیھم والا راستہ۔ جو ہمیں چاہیے۔ ایک ان کا راستہ جن پر اللہ کا غضب نازل ہوا۔ یہ ہم کو نہیں چاہیے۔ اور ایک وہ جو سیدھے راستے سے بھٹک گئے۔ ان کا راستہ بھی نہیں چاہیے۔ یہ دعا ہے۔ اس کے آخر میں آمین کہا جاتا ہے۔ یعنی اللہ ایسا ہی ہو۔ آمین قرآن میں لکھا ہوا تو نہیں ہے۔ لیکن چونکہ سنت ہے ہمیں پتہ چلا اس لیے ہم بھی آمین کہتے ہیں۔ اب آگے جو پورا قرآن ہے اس میں ان ہی تین راستوں کی تفصیل ہے۔ اس کے بارے میں بتایا گیا۔ کہ یہ کروگے تو انعام پاؤ گے۔ یہ کروگے تو غضب آئے گا اللہ کا۔ یہ کروگے تو بھٹک جاؤ گے۔ پوری شریعت قرآن کے اندر۔ شریعت کا مطلب بھی دراصل راستہ ہی ہوتا ہے۔ آپ صراط مستقیم کہہ لیں یا آپ شریعت کہہ لیں۔ صراط مستقیم مانگی۔ اللہ نے شریعت دکھا دی۔ صحیح کام کرنے کا طریقہ راستہ۔ پورا قرآن اس کی تفصیل ہے۔ سورۃ البقرہ ہم پڑھیں گے۔ اس میں مغضوب علیھم لوگوں کی بات ہوئی۔ یعنی بنی اسرائیل اور منافقین۔ ان پر اللہ کا غضب بھڑکا۔ سورۃ البقرہ کے بعد سورۃ آل عمران پڑھیں گے انشاء اللہ اس میں ضالین کا ذکر آیا۔ یعنی جو سیدھے راستے سے بھٹک گئے۔ اور بیچ بیچ میں انعام پانے والوں لوگوں کا ذکر آئے گا۔ ان کی باتیں۔ ان کے کام۔ یہ کرو۔ یہ نہ کرو۔ جو دنیا میں صراط مستقیم پر چل پڑا وہ پل صراط پر سے بھی خیرت سے گزر جائے گا۔ effort کرنی ہے۔ محنت کے بغیر کچھ نہیں ملتا۔ دعا کریں کہ اللہ استقامت دے صرف ایک قدم اٹھا کر کون پہنچا ہے جنت میں۔

(تفسیر تنویر۔ زاہدہ تنویر)

ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام فرمایا، جو معتوب نہیں ہوئے اور جو بھٹکے ہوئے نہیں ہیں۔"

صحیح مسلم میں حضرت علاء رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے روایت کرتے ہیں: "اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں نے نماز کو اپنے اور بندے کے درمیان پورا پورا تقسیم کر دیا ہے۔ نصف اپنے لیے اور نصف بندے کے لیے اور میرے بندے کے لیے وہ سب کچھ ہے جو وہ طلب کرے۔ جب بندہ کہتا ہے الحمد للہ رب العالمین تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "میرے بندے نے میری حمد اور تعریف کی "اور جب بندہ الرحمن الرحیم ادا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے " میرے بندے نے میری ثناء کی "جب وہ مالک یوم الدین پڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "میرے بندے نے

میری بڑائی بیان کی۔ اور جب وہ کہتا ہے "اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ "تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ میرے اور میرے بندے کے درمیان مشترک ہے اور میرے بندے کے لیے وہ کچھ ہے جو اس نے طلب کیا اور جب وہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ۔۔وَلَا الضَّالِّينَ "تک پڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ میرے بندے کے لیے ہے اور اس کے لیے وہ کچھ ہے جو اس نے مانگا۔"

اس بیان اور تفسیر کی روشنی میں وہ حکمت کھل کر سامنے آجاتی ہے جس کی بناء پر اللہ تعالیٰ نے اس سورت کو کم از کم سترہ مرتبہ نماز کے دوران پڑھنا فرض قرار دیا ہے 'اور اگر کوئی اس سے زیادہ پڑھتا ہے تو یہ اس سے بھی زیادہ مرتبہ دہرائی جاتی ہے۔ (تفسیر فی ظلال القرآن۔ سید قطب شاہ)

سورۃ فاتحہ کا خلاصہ

سورۃ فاتحہ اپنے مفہوم اور انداز بیان کے اعتبار سے بارگاہ الٰہی میں بندہ کی ایک درخواست ہے جس میں پہلے بندہ اپنے آقا کے القاب وآداب یعنی حمد وثنا بیان کرتا ہے پھر اس کے بعد اپنا نیاز مندانہ بندگی اور عبدیت کا تعارف پیش کرتا ہے پھر اس کے بعد دلی مقصد اور مدعا عرض کرتا ہے اس کے بعد اطاعت شعار اور خاصان خدا کے ساتھ اپنی دوستی اور محبت کا اظہار کرکے ان کے ساتھ اپنی وابستگی اور نامقبول وناپسندیدہ اور لوگوں کے ساتھ اپنی بیزاری اور ان سے علیحدگی کا اعلان کرتا ہے۔

آمین کہنا: اس سورۃ کے ختم پر آمین کہنا مسنون ہے، آمین کے معنی ہیں "اے اللہ ایسا ہی کر، اے اللہ تو قبول فرما" پس سورۃ فاتحہ کے خاتمہ پر آمین کہنے کا مطلب یہ ہوا کہ اے اللہ جو ہم نے تجھ سے مانگا ہے وہی کر دے یعنی ہم کو صراط مستقیم کی ہدایت فرما، اور اہل انعام کے راستہ پر چلا اور اہل غضب اور اہل ضلال کے راستہ سے الگ رکھ، لفظ آمین کے بارہ میں تمام مفسرین اور علمائے محققین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ لفظ نہ جزو قرآن ہے اور نہ جزو سورۃ فاتحہ ہے اسی لیے قرآن شریف میں اس سورۃ فاتحہ کے بعد آمین لکھی نہیں جاتی بلکہ تمام دعاؤں کے بعد آمین کہنا مسنون ہے اور اجابت دعاء کے لحاظ سے ضروری ہے اسی طرح سورۃ فاتحہ کے بعد بھی مسنون ہے اختلاف صرف اس میں ہے کہ نماز میں آمین آہستہ کہنا بہتر ہے یا آواز سے، جمہور صحابہ وتابعین کا یہی مذہب ہے کہ آہستہ کہنا بہتر ہے اور یہی مسلک امام ابو حنیفہ کا ہے۔

ہر حاجت کیلئے اسم اعظم

سورۃ فاتحہ ہر مطلب کیلئے اسم اعظم ہے اور اس کا طریق یہ ہے کہ فجر کی سنت اور نماز فرض کے درمیان اکتالیس مرتبہ چالیس روز تک اس طرح پڑھے کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم کی میم کو الحمد کے لام کے ساتھ ملائیں (یعنی اس طرح پڑھیں بسم اللہ الرحمن الرحیم الحمدللہ رب العلمین تا ختم) جو مطلب ہو حاصل ہو گا، اور اگر شفا مریض کی یا تندرست ہو جانا جادو کئے ہوئے کا منظور ہو پانی پر دم کر کے اس مریض کو پلا دیں (یعنی وہی ۴۱ مرتبہ روزانہ فجر کی سنت و فرض کے درمیان بطریق مذکور بالا پڑھ کر ۴۰ یوم پانی پر دم کر کے پلائیں) اور لکھنا اس سورت کا چینی کی پلیٹ یا پیالہ پر گلاب، مشک اور زعفران سے، اور دھو کر چالیس روز تک پلانا بیماریوں کے لیے مجرب ہے، اور درد سر اور پیٹ کے درد اور دوسرے دردوں کے اوپر پڑھ کر دم کرنا بھی مجرب ہے۔

آخر شب میں ۴۱ بار سورہ فاتحہ پڑھنے سے بے مشقت روزی ملتی ہے۔

دعا کیجئے: اللہ تبارک وتعالیٰ اس سورۃ فاتحہ کے انوار و برکات سے ہم سب کو نوازیں اور اس سورت کے ذریعہ ہماری درخواست و دعاؤں کو اپنی بارگاہ میں قبولیت بخشیں، یا اللہ ہمیں اپنے مقبولین یعنی انبیاء صدیقین، شہداء صالحین کے نقش قدم پر چلنا نصیب فرما، اور گمراہ، باغی اور نافرمانوں کے راستہ سے ہم کو بچا کر ان سے علیحدہ رکھنا اور صراط مستقیم کی ہم کو ہدایت نصیب فرما۔ واخر دعوانا ان الحمدللہ رب العلمین۔

(درس قرآن۔ محمد اسحاق)

--

خلاصہ سورۃ

اس دعا پر یہ سورۃ تمام ہو جاتی ہے۔ اس کی تفصیلات اپنی ناچیز صلاحیت کے مطابق میں نے پیش کی ہیں۔ اب آپ پلٹ کر ان تفصیلات کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس مختصر لیکن مقتدر سورۃ کو دیکھئے کہ سات چھوٹے چھوٹے بول ہیں اور ہر بول پانچ لفظوں سے زیادہ نہیں اور ہر لفظ صاف اور دلنشین معنیٰ کا نگینہ ہے جو اس انگوٹھی میں جڑ دیا گیا ہے۔

پروردگار عالم کو مخاطب کر کے ان صفتوں سے پکارا گیا ہے جن کا جلوہ شب و روز انسان کے مشاہدے میں آتا رہتا ہے۔ اگرچہ اپنی جہالت اور غفلت سے انسان اس میں غور و فکر نہیں کرتا۔ اس کے بعد اس کی بندگی کا اقرار ہے، اس کی مدد

اور نصرت کا اعتراف ہے اور زندگی کی لغزشوں سے بچ کر سیدھی راہ پر چلنے کی طلب گاری ہے۔ کوئی مشکل خیال نہیں، کوئی انوکھی بات نہیں، کوئی عجیب و غریب راز نہیں۔ اب کے ہم بار بار یہ سورۃ پڑھتے رہتے ہیں اور صدیوں سے اس کے مطالب نوع انسانی کے سامنے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا ہمارے دینی تصورات کی ایک بہت ہی معمولی سی بات ہے لیکن یہی معمولی بات جس وقت تک دنیا کے سامنے نہیں آئی تھی اس سے زیادہ کوئی غیر معلوم اور ناقابل حل بات بھی نہ تھی۔ بظاہر یہ نہایت سلیس، سادہ اور دلنشین انداز بیان ہے۔ لیکن حقیقت میں اس کا ایک ایک لفظ دین حق کے کسی نہ کسی اہم مقصد کو واضح کر رہا ہے۔ جس کا اندازہ آپ کو کسی نہ کسی حد تک گزشتہ تفصیلات سے ہو چکا ہو گا۔ اس کے ساتھ ساتھ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس سورۃ کا پیرایہ دعائیہ ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر راست باز انسان جو خدا پرستی کی راہ میں قدم اٹھاتا ہے اس کے دل سے اٹھنے والی آواز اور اس کے انگ انگ سے اٹھنے والی امنگ اگر الفاظ کا قالب اختیار کرلے تو اس کا انداز یقینا اس سے مختلف نہیں ہو گا۔ یہ سورۃ بظاہر فصاحت و بلاغت کا نادر روزگار مرقع ہے۔ لیکن بباطن خدا پرستی کے فکر و وجدان کا ایک ایسا سرجوش ہے جو ایک طالب صادق کی زبان پر بے اختیار ابل پڑا ہے۔ اور اس سے بھی زیادہ سرخوشی سے جھوم اٹھنے والی بات یہ ہے کہ جیسے ہی ایک بندہ سوز و گداز میں ڈوب کر ان کلمات کے ذریعے اپنے رب سے صراط مستقیم کی دعا کرتا ہے تو اس کا رب اس کے جواب میں پورا قرآن اس کے سامنے رکھ دیتا ہے کہ یہ ہے وہ ہدایت ور ہنمائی جس کی دعا تو نے مجھ سے کی ہے۔

حدیث میں آتا ہے کہ جب بھی آدمی سورۃ فاتحہ کی صورت میں اپنے اللہ سے دعا کرے نماز کے اندر کرے یا نماز کے باہر تو آخر میں "آمین "ضرور کہے۔ یہ سورۃ فاتحہ کا حصہ تو نہیں لیکن اس کا کہنا سنت ہے۔ اس کے کہنے سے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ارشاد کے مطابق دعا کی قبولیت کا امکان بڑھ جاتا ہے۔ وَمَاعَلَيْنَآاِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ

(تفسیر روح القرآن۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی)

الہ العلمین! جس طرح آپ نے مجھے سورۃ فاتحہ کا ترجمہ اور تفسیر مکمل کرنے کی توفیق ' ہدایت اور سعادت عطا کی ہے ' اسی طرح باقی قرآن مجید کا ترجمہ اور اس کی تفسیر کی بھی توفیق ' ہدایت اور سعادت سے سرفراز فرمائیں اور اس تفسیر کو موافقین کے استقامت ' مخالفین کے لیے ہدایت اور میرے لیے نجات کا ذریعہ اور صدقہ جاریہ بنائیں ' مجھے '

میرے والدین ' احباب اور میرے قارئین کو دنیا اور آخرت کی ہر بلا اور عذاب سے محفوظ رکھیں اور دارین کی سعادتوں کو ہمارے لیے مقدر کر دیں۔

واخر دعوانا ان الحمد لله رب العلمين والصلوة والسلام على سيدنا محمد خاتم النبيين شفيع المذنبين قائد الغر الحجلين وعلى اله الطيبين الطاهرين وعلى اصحابه الكاملين الراشدين وعلى اولياء امته وعلماء ملته اجمعين۔